جینے کی اہمیت

(چینی فلسفے اور دانش و دانائی کے اہم مرقعے)

لین یوتانگ

مترجم

مختار صدیقی

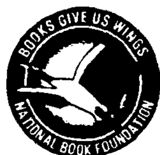


جینے کی اہمیت

لین یوتانگ

مترجم:

مختار صدیقی



نیشنل بک فاؤنڈیشن

اسلام آباد





نگران : ڈاکٹر انعام الحق جاوید
مرتب : لین یوتانگ
ترجمہ : مختار صدیقی

اشاعت اول : نومبر، 2017ء (تعداد 1000)
اشاعت دوم : فروری، 2019ء (تعداد 2000)
کوڈ نمبر : GNU-638
آئی ایس بی این : 978-969-37-1027-4
طابع : انٹر گرافکس پرنٹرز، راولپنڈی
:

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ: http/www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125
یا ای میل: books@nbf.org.pk

NBF

فہرست

پیش گفتار

(۱)

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی جانب سے نئی منصوبہ بندی کے تحت علم و ادب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، اسلامیات، اخلاقیات، طب، حالاتِ حاضرہ، حکمت و دانائی، بچوں کے ادب اور تراجم پر مبنی اہم موضوعات پر معلوماتی کتب کی اشاعت تسلسل سے جاری ہے۔ اس ضمن میں کوشش کی جاتی ہے کہ قارئین کے ذوقِ مطالعہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے مفید اور معیاری کتابیں شائع کی جائیں۔ موجودہ کتاب ''جینے کی اہمیت'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہوگیا کہ نامور قلمکار اور ادیب مختار صدیقی نے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ میں نے پہلی بار یہ کتاب 1977ء میں پڑھی تھی اور پھر بار بار پڑھتا رہا۔ ہر بار اس کے مندرجات نے مجھے ایک نیا لطف دیا۔ پھر یہ کتاب مجھ سے کہیں کھوگئی اور تلاشِ بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہوسکی۔ این بی ایف میں آنے کے بعد میں نے تلاشِ مکرّر کا سلسلہ شروع کیا اور بالآخر مجھے اس کے بہت عرصہ پہلے چھپے ہوئے دو الگ الگ پبلشرز کے نسخے دستیاب ہوگئے، جن کی مدد سے انتہائی تحقیقی انداز میں تصحیحِ متن کے ساتھ یہ نسخہ تیار کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسی حیات آمیز اور حیات آموز کتابیں ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ چھپنی چاہئیں کیونکہ یہ کتابیں ہماری زندگیوں اور زندگی کے بارے میں ہمارے رویّوں کو مثبت انداز میں بدلنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں اور یہی رویّے بالآخر ایک مثالی معاشرے کو جنم دیتے ہیں۔

چینی فلسفہ سادہ اور عام ہے۔ سامنے کی زندگی کا بیان فلسفیانہ موشگافیوں، نظری بحثوں اور ادق اصطلات سے پاک ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ آپ کے سوچنے کے انداز کو بدل دیتا ہے۔ وہی واقعہ جس پر آپ کا موڈ خراب ہوسکتا ہے اگر ذہن اور سوچ کی سمت ذرا سی صحیح کر لی جائے تو وہی واقعہ آپ کے لیے مُسرت کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔ مثلاً ''خوشی کا لمحہ'' کے عنوان سے لکھی گئی یہ تحریر دیکھیے: ''کیا یہ آپ کے لیے خوشی کا لمحہ

نہیں ہے اور شکر ادا کرنے کا مقام نہیں ہے کہ جونہی آپ اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں باہر موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے اگر یہی بارش دو منٹ پہلے شروع ہو جاتی، تو آپ کا سارا سوٹ بھیگ چکا ہوتا اور آپ بھاگتے دوڑتے اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے انتہائی منفی موڈ میں گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے نظر آتے۔'' گویا شکر کا بھی وہی لمحہ ہے جو شکوے کا ہے اور یہ صرف سوچنے کا انداز ہے جو ایک انسان کی مثبت یا منفی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کتاب میں اس طرح کی سینکڑوں باتیں ہیں جن سے پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ این بی ایف سے اس نوعیت کی دو اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں قاضی جاوید کی کتاب ''جینے کا سلیقہ'' اور ڈاکٹر امجد طفیل کی کتاب ''پُرسکون زندگی'' شامل ہیں، امید ہے این بی ایف کی طرف سے پیش کی گئی ان تینوں کتابوں کو قارئین پسند کریں گے اور ان سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

لین یوتانگ کی یہ کتاب چینی زبان میں پہلی بار 1937ء میں شائع ہوئی تھی جس کے دو برس بعد 1939ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہو گئی جس نے انسانی سوچ سے لے کر ملکوں کے نقشوں تک کو بدل کر رکھ دیا چنانچہ ڈاکٹر لین یوتانگ نے اس کتاب کے بعد کے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بھی بہت کُچھ لکھا جس میں سے ایک مضمون اس کتاب کے آخر میں دیا جا رہا ہے۔

امید ہے اپنے موضوع اور دلچسپ و سادہ طرزِ تحریر کے باعث یہ کتاب قارئین کے لیے مفید اور معلومات افزا ثابت ہو گی اور وہ اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

(۲)

ایک سال بعد اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن دو ہزار کی تعداد میں پیش کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ بے جا نہ ہو گا کہ قارئین این بی ایف کی کتابوں کے معیار کو وقار بخش رہے ہیں۔ موجودہ ایڈیشن کی قیمت بھی 425 روپے سے کم کر کے 300 روپے کر دی گئی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
مینیجنگ ڈائریکٹر

پہلا باب

طلوع

1- زندگی کا رشتہ

آئندہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا جائے گا وہ ایک چینی کا نقطہ نظر ہے۔ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ میں زندگی اور کائنات کے بارے میں وہی نقطہ نظر پیش کرنے پر مجبور ہوں جو بہترین چینی دماغوں اور داناؤں کا نقطہ نظر ہے اور جسے انھوں نے چین کی لوک کہانیاں اور چین کے ادب میں پیش کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ نقطہ نظر ایک بے عمل فلسفہ ہے جسے کاہل اور بے عمل زندگی نے جنم دیا تھا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ فلسفہ اس زمانے کا فلسفہ ہے جو ہمارے زمانے سے بہت مختلف تھا۔ پھر بھی مجھے احساس ہے کہ زندگی کے بارے میں یہ نقطہ نظر بنیادی طور پر درست اور سچا ہے۔ انسان ہر جگہ اور ہر دور میں ایک ہی ہے۔ رنگ اور نسل کے امتیازات محض ظاہری ہیں۔ جو بات ایک ملک میں بسنے والوں کے دلوں سے تعلق رکھتی ہے وہی بات دوسرے سب ملکوں کے باشندوں کے ''دلوں کی بات'' ہوتی ہے۔ میں آئندہ صفحات میں زندگی کا وہ نقطہ نظر پیش کروں گا جس کی تشکیل چینی شاعروں اور عالموں نے اپنی دانش، اپنی حقیقت پسندی اور اپنے ذوق سلیم سے کی تھی۔ میں کوشش کروں گا کہ دنیا کا وہ حصہ جو الہامی دین سے لاتعلق رہا اس کا سارا حسن آپ پر ظاہر ہو جائے۔ زندگی کا سارا سوز و گداز، زندگی کا سارا حسن، اس کی ساری ہیبت اور سارا مزاج آپ کے سامنے آ جائے۔ اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے نقطہ نظر سے لکھا جائے جنھیں انسانی زندگی کی مجبوریوں اور پابندیوں کا شدید احساس تھا مگر جو یہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی ایک باوقار چیز ہے اور جو باوقار انسانی زندگی کی عمدہ مثال بھی تھے۔

چینی فلسفی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں کے بجائے صرف ایک آنکھ بند کر کے سپنے دیکھتا ہے۔ وہ محبت بھری نظروں سے زندگی کا جائزہ لیتا ہے اور ایک میٹھے زہر خند سے زندگی پر نگاہ کرتا ہے۔ چینی فلسفی اپنی تلخ گوئی میں گہری رواداری کی آمیزش کرتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ زندگی کے سپنے دیکھتا دیکھتا جاگ

اٹھے، پھر سپنے دیکھنے لگے۔ چینی فلسفی اپنے آپ کو اس وقت زیادہ زندہ محسوس کرتا ہے جب وہ سپنے دیکھ رہا ہو۔ بیداری کے عالم میں وہ اپنے آپ کو اتنا زندہ نہیں سمجھتا۔ اس طرح وہ جیتی جاگتی زندگی کو بھی سپنوں کی دنیا بنا دیتا ہے۔ اس کی ایک آنکھ نیند میں بند رہتی ہے اور ایک آنکھ کھلی رہتی ہے۔ اپنی اس ایک بند اور ایک کھلی آنکھ سے وہ دیکھتا ہے کہ جو کچھ اس کے اردگرد ہو رہا ہے اس میں اکثر باتیں کتنی بے کار اور بے مصرف ہیں۔ اکثر معاملات میں اس کی اپنی کوششیں کس قدر بے سود ہیں۔ پھر بھی وہ اتنا ہوش مند ضرور رہتا ہے کہ اپنے کاموں اور اپنی کوششوں کو برابر جاری رکھے۔ چینی فلسفی کو شاذ و نادر ہی تلخیوں اور ناکامیوں سے واسطہ پڑتا ہے کیونکہ وہ زندگی کے بارے میں کوئی خوش فہمی رکھنے کا روادار ہی نہیں۔ اسے مایوسی کا سامنا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ لمبی چوڑی امیدیں اسے تھیں ہی نہیں۔ اس طرح وہ اپنی روح کو ہمیشہ آزاد رکھتا ہے۔

چینی ادب اور فلسفے کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چینی ثقافت کا نصب العین اس کی آنکھ کا تارا ایک ایسی ہستی ہے جس میں زندگی کے بارے میں ایک علیحدگی، ایک آزادہ روی ہو۔ ایسی آزدہ روی اور علیحدگی جو باطل وہموں اور خوش فہمیوں سے نجات پر مبنی ہو۔ جس میں لاگ اور لگاؤ کا شائبہ نہ رہے کیونکہ اسی سے انسان میں بلند خیالی پیدا ہوتی ہے۔ اور بلند خیالی کی بدولت ہی ہم زندگی کی منزل رواداری اور خوش طبعی سے طے کر سکتے ہیں۔ بلند خیالی ہی وہ شے ہے جس کی بدولت ہمیں شہرت اور کامرانی اور دولت کا نشہ آپے سے باہر نہیں کر سکتا۔ بلند خیالی کی بدولت ہی ہم جو کچھ سر پر پڑے خوشی سے جھیل لیتے ہیں۔ زندگی سے کوئی لگاؤ یا لاگ نہ رکھنے سے انسان میں آزادی کا احساس پیدا ہوتا ہے، آزادہ روی کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس آزادہ روی اور لاابالی پن سے آخر کار زندگی کی گہری مسرتیں وجود میں آتی ہیں۔

یہ کہنا بے کار ہو گا کہ میرا فلسفہ اہل مغرب کے لیے بھی درست ثابت ہو گا یا نہیں۔ اصل میں مغربی زندگی کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ مغربی ملکوں کے رہنے والے ہوں۔ آپ کی افتادِ طبع مغربی ہو اور آپ کا رویہ، آپ کے اعصاب وہی ہوں جو مغربیوں کے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ امریکی لوگوں کے اعصاب ایسی بہت سی باتیں برداشت کر سکتے ہیں۔ جنھیں برداشت کرنا چینیوں کے لیے ممکن نہیں۔ چینی لوگ بھی ایسی بہت سی چیزیں برداشت کر لیتے ہیں جو امریکیوں کے لیے ناقابل برداشت ہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ ہمیں پیدائشی اعتبار سے مختلف ہونا ہی چاہیے پھر بھی یہ سارا اختلاف اپنی جگہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا، یہ محض

اضافی بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ امریکی زندگی کی ساری بھاگ دوڑ اور مصروفیت میں یہ حسرت، یہ خواہش موجود ہے کہ کاش ہم بھی کبھی اونچے پیڑوں کے سایے میں، نرم گھاس پر آرام سے لیٹ سکیں اور کسی سہ پہر کو قطعاً کوئی کام نہ کریں۔ جب میں امریکہ میں یہ نعرہ سنتا ہوں کہ ''اٹھو اور کوئی کام کرو'' تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یہ نعرہ اس بات کی علامت ہے کہ امریکی لوگوں کا ایک عقلمند طبقہ خوابوں میں کھویا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اٹھ کر کام کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ یہ بڑی اچھی علامت ہے۔ گویا امریکہ کے لوگ ایسے برے بھی نہیں۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ امریکی اس مشغلے میں کم وقت صرف کریں گے یا زیادہ اور ان کے لیے یہ کیونکر ممکن ہوگا؟ شاید امریکہ کے لوگوں کو ''بیکار وقت گنوانے'' کے الفاظ سے ڈر لگتا ہے۔ وہ ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہر شخص مصروف رہتا ہے۔ پھر بھی امریکہ کے یہ مہذب اور مصروف لوگ حیوان بھی ہیں اور ہر حیوان کی طرح وہ بھی چاہتے ہیں کہ اپنے اعصاب اور رگ پٹھوں کو آسائش دے سکیں، ریت پر آرام سے لوٹ سکیں یا ایک ہاتھ کا تکیہ بنائے، ایک ٹانگ پھیلائے آرام سے لیٹ سکیں اگر یہ حقیقت ہے تو پھر متمدن امریکی کنفیوشس کے مشہور شاگرد سے کسی طرح مختلف نہیں کیونکہ اس میں بھی یہی خوبیاں تھیں۔ انھیں خوبیوں کی بدولت وہ کنفیوشس کو محبوب تھا مگر میں چاہتا ہوں کہ متمدن دنیا کے لوگ اپنی ان دلی خواہشوں کا دیانت داری سے اظہار بھی کریں اور اقرار کریں کہ یہی باتیں اچھی ہیں۔ وہ دفتر میں کام کرتے ہوئے نہیں، بلکہ ریت پر بیکار لیٹے لیٹے کہیں ''زندگی آخر کتنی حسین، کتنی دلاویز ہے!!''

اب ہمارے پیش نظر زندگی بسر کرنے کا وہ فن اور ڈھنگ اور وہ فلسفہ ہوگا جو مجموعی حیثیت سے چینی قوم کی دانش کا آئینہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی خوبیوں اور برائیوں دونوں اعتبار سے یہ فلسفہ دنیا میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ یہ زندگی کا ایک ایسا انوکھا فلسفہ ہے جسے چینیوں جیسی انوکھی قوم نے اپنایا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی قوم کی ثقافت اس کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایک مسلمہ حقیقت ہوتے ہوئے بھی یہ بات بڑی فرسودہ سی ہے۔ بہر حال چینی ذہن نسلی طور پر مغربی ذہن سے مختلف ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی چینی ذہن مغربی تمدن سے بہت الگ تھلگ رہا ہے لہٰذا ہمیں قدرتی طور پر یہ توقع رکھنی چاہیے کہ چینی ذہن زندگی کے مسائل کے بارے میں ہمیں نئے اور انوکھے جوابات مہیا کر سکے گا، زندگی کے مسائل کو سمجھنے کے لیے نئی راہیں سمجھا سکے گا۔ اور اس سے بھی خوب تر یہ بات ہوگی کہ چینی ذہن ان مسائل کو نئے انداز سے پیش کر سکنے پر قادر ہوگا۔ ہمیں

خوب معلوم ہے کہ چینی ذہن کی صلاحتیں کیا ہیں اور اس کے عیوب کیا ہیں۔ یہ باتیں چین کا تاریخی ماضی ہمیں بتا چکا ہے۔ چین کے آرٹ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ مگر چینی سائنس بے حقیقت ہے۔ چینی قوم عقل سلیم اور فراست سے مالا مال ہے مگر منطق سے قریب قریب کوری ہے۔ چینی قوم زندگی کے بارے میں بہت کچھ کہتی سنتی ہے مگر کوئی مشکلم فلسفہ آج تک ترتیب نہیں دے سکی۔ عام طور پر دنیا کے لوگ جانتے ہیں کہ چینی ذہن بڑا عمل پسند اور ٹھوس ہے۔ مگر چینی آرٹ کے مشتاقوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ چینی ذہن بے حد حساس اور نازک ہے پھر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ بھی جانتے ہیں کہ چینی ذہن نہایت درجہ شاعرانہ اور فلسفیانہ ہے اور یہ تو مشہور ہے ہی کہ چینی لوگ فلسفیانہ اور حکیمانہ طریقے پر واقعات کا اثر لیتے ہیں۔ گویا چینی لوگوں نے اگر نامور فلسفی پیدا نہیں کیے تو ساری کی ساری قوم فلسفی ضرور ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے اگر کوئی قوم چند ایک اعلیٰ پائے کے فلسفی پیدا کرلے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن اگر ساری کی ساری قوم کا انداز فکر حکیمانہ ہو تو اس کی مثال ملنی محال ہے۔ بہر حال یہ طے ہے کہ چینی قوم میں مستعدی کے مقابلے میں فلسفیانہ صلاحیت زیادہ ہے۔ اور اگر چینی لوگ بے حد مستعد اور کارکن ہوتے تو ہزاروں برس تک قوم کی حیثیت سے زندہ بھی رہ سکتے کیونکہ ہزاروں برس تک جو قوم مستعد اور چاق و چوبند رہتی ہے اسے اس کے خون کا دباؤ ہی تباہ کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی اقوام میں تو پاگلوں کو پاگل خانے میں رکھا جاتا ہے لیکن چین میں دیوانے اتنے نایاب اور اتنے غیر معمولی سمجھے جاتے ہیں کہ ہم چینی لوگ ان کی پرستش کرتے ہیں، (قارئین میں سے جو حضرات چینی ادب سے واقف ہیں وہ اس کی شہادت بھی دے سکتے ہیں)............ میرا مقصد اور مدعا بھی یہی ہے۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں، چینی لوگوں کا فلسفہ حیات واقعی بڑا ہلکا پھلکا اور نشاطیہ ہے۔ ان کا حکیمانہ انداز ان کے فلسفہ حیات ہی سے ظاہر ہے...... چینی فلسفہ حیات جو بڑا دانشمند اور بے حد نشاطیہ ہے۔

2- ایک نیم سائنسی فارمولا

آیئے اس چینی ذہن کا تجزیہ کیا جائے جس نے چین کے اس فلسفے کو جنم دیا۔ چینی ذہن بے حد حقیقت پسند ہے مگر نصب العین کا اتنا قائل نہیں، خوش طبعی کا شدت سے دلدادہ ہے اور زندگی اور فطرت کے سلسلے میں شاعرانہ احساس سے مالا مال ہے۔

عام طور پر دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں، ایک تو وہ جو حقیقت پسند ہیں، اور دوسرے جو کسی نصب

العین کے پرستار ہیں یا مثالیت پسند ہیں۔اصل یہ ہے کہ حقیقت پسندی اور کسی نصب العین کی پرستاری ہی سے انسانی ترقی نے شکل پائی ہے۔ یہی دو دو قوتیں، ذاتی، معاشرتی، قومی، غرض تمام انسانی سرگرمیوں میں ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتی ہیں۔ نوع انسان کی حقیقی ترقی انہیں دو قوتوں کے مناسب تعاون اور مناسب آمیزش سے ممکن ہے۔انسانیت کی عمارت میں نصب العین کی وہی حیثیت ہے جو مٹی کے بت بنانے میں پانی کی ہے۔ پانی کی بدولت مٹی میں نرمی اور لچک پیدا ہوتی ہے لیکن پانی کی مقدار کا حساب ضرور کھانا چاہیے اگر پانی کم ہوگیا تو بت ٹوٹ جائے گا اور اگر پانی زیادہ ہوگیا تو مٹی اس قابل نہ رہے گی کہ اسے کوئی شکل دی جاسکے، یہ بالکل کیچڑ بن کر رہ جائے گی۔ پانی اور مٹی کی بہترین آمیزش کی مثال انگریز قوم ہے۔انگریز قوم میں حقیقت پسندی اور نصب العین دونوں مناسب مقدار میں موجود ہیں۔اس کے برعکس ایسے ملکوں کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے جہاں آئے دن انقلاب بپا ہوتے رہتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خمیر میں بعض ایسے غیر ملکی اور اجنبی نصب العین راہ پا گئے ہیں جو پوری طرح قوم کے مزاج میں رچ بس نہیں سکے اور اس لیے اس قوم کا خمیر، تناسب اور اعتدال کی سطح قائم نہیں رکھ سکا۔ان کی مٹی بھی کیچڑ بن کر رہ گئی ہے۔

بغیر سوچی سمجھی، مبہم قسم کی مثالیت پسندی، ہمیشہ دوسروں کے مذاق کا نشانہ بنا کرتی ہے۔مثالیت پسندی اگر حد سے بڑھ جائے تو انسانیت کے لیے خطرہ بھی بن سکتی ہے کیونکہ اس طرح انسان کسی خیالی نصب العین کے پیچھے فضول سرگرداں رہتا ہے اور اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اگر کسی انسانی معاشرے میں یا کسی قوم میں خیالی نصب العین کے بہت سے پرستار موجود ہوں تو وہ انسانی معاشرہ آئے دن نت نئے انقلاب سے دوچار رہے گا۔ایسا انسانی معاشرہ ایسے مثالیت پسند میاں بیوی کی طرح ہے جو ہر تیسرے مہینے مکان بدلتے رہیں کیونکہ کوئی گھر مثالی نہیں ہوسکتا۔اکثر یہی ہوتا ہے کہ جہاں کہیں آپ کا قیام نہ ہو وہ جگہ ہمیشہ مثالی اور عمدہ سمجھی جاتی ہے، محض اس لیے کہ آپ وہاں نہیں رہتے، مگر خوش قسمتی سے انسان کو خدا نے ذوق سلیم اور خوش طبعی بھی عطا کی ہے اور میرے نزدیک ذوق سلیم کی قدرت نے کام یہ سونپا ہے کہ انسان کے خوابوں پر نکتہ چینی کرتا رہے اور ان خوابوں کو ذرا دنیا کے حقائق سے بھی روشناس کراتا رہے ____ ہوائی قلعے بنانا اور سپنے دیکھنا انسان کے لیے ضروری ہے مگر اہم تر بات یہ ہے کہ انسان اپنے خیالی پلاؤ اور اپنے سپنوں پر خود ہنس بھی سکے۔ یہ صلاحیت قدرت کا بہت بڑا عطیہ ہے اور چینی اس عطیے سے مالا مال ہیں۔

اس ذوق سلیم اوراس خوش طبعی کا احساس حقیقت یا حقیقت پسندی سے بڑا گہرا ناتا ہے۔ بعض اوقات ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی مسخرہ یا پھبتی باز مثالیت پسندوں کا بری طرح مذاق اڑاتا ہے اور بڑی بے رحمی سے ان کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا مذاق نظام عالم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کے اسی مذاق کی بدولت مثالیت پسند حقائق کی ٹھوس دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا تمسخر، پر جوش مثالیت پسند کے اعصاب کا تناؤ بھی دور کر دیتا ہے اور اس کی زندگی میں اضافہ کر دیتا ہے نصب العین کے پرستاروں کو مایوسی کا راستہ دکھا کر ظریف ان کی موت کو نسبتاً آسان بنا دیتا ہے۔ ظریف کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ مرتے ہوئے مریضوں کو بڑے قرینے سے ان کی موت کی خبر سنائے۔ بعض اوقات تو ظریف کی دھیمی سرزنش مرتے ہوئے مریض کی زندگی کو موت کے پنجے سے چھڑا بھی لیتی ہے۔ اس دنیا میں نصب العین پرستی اور زندگی سے مایوسی چولی دامن کا ساتھ رکھتی ہیں۔ اس طرح زندگی بے رحم قرار پاتی ہے نہ کہ وہ ظریف جس کا کام صرف یہ ہے کہ ہمیں زندگی کے حقائق کی تلخی اور بے رحمی کی یاد دلاتا رہے۔

میں نے بارہا غور کیا ہے کہ انسانی ترقی اور تاریخی تبدیلیوں کے اتار چڑھاؤ کا کوئی فارمولا، کوئی قاعدہ وضع کیا جائے۔ یہ قاعدہ کچھ اس طرح کا ہے:

اصلیت + خیالی پلاؤ = جانور

اصلیت + خیالی پلاؤ = دل کی خلش (جسے مثالیت پسندی یا نصب العین کی پرستاری کہہ لیجیے)

اصلیت + خوش طبعی = حقیقت پسندی (آج کل اسی چیز کو قدامت پسندی کہا جاتا ہے)

خیالی پلاؤ + خوش طبعی = تعصب اور کٹر پن

خیالی پلاؤ + خوش طبعی = حلقہ دام خیال

خیالی پلاؤ + حقیقت پسندی + جمع خوش طبعی = دانش مندی

گویا دانش مندی کو جو غور و فکر کی معراج ہے، یہ ہے کہ خیالی منصوبوں یا اپنی مثالیت پسندی کو خوش طبعی اور ذوق سلیم سے معتدل بنایا جائے اور اس میں حقیقت پسندی کی آمیزش بھی ہو۔

یہ فارمولا سائنسی نہیں، کچھ نیم سائنسی سا ہے۔ مگر اس کی روشنی میں ہم مختلف قوموں کے کردار کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔ میں نے دنیا کی بعض بڑی قوموں کے قومی کردار کے سلسلے میں کچھ ایسے فارمولے تیار کیے ہیں جیسے کہ علم کیمیا کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ یہ فارمولے ذاتی ہیں۔ ان کا کوئی ثبوت ہے نہ ثابت کرنے کا ذریعہ آپ چاہیں تو ان سے اختلاف کر سکتے ہیں، انھیں بدل سکتے ہیں۔ ان میں کچھ گھٹا بڑھا سکتے ہیں۔ ان فارمولوں کا اشاریہ یہ ہے:

ح...... حقیقت پسندی۔ خ...... خیالی منصوبے باندھنا...... ظرافت کو ظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اب اس میں احساس کا جزو ملایئے جسے س سے ظاہر کیا جائے گا۔ یہ تو ہوئے فارمولے کے اجزا اب ان کی مقداریوں ظاہر کی گئی ہے کہ 4 کا عدد اس جزو کی بہت زیادہ مقدار کو ظاہر کرے گا، 3 کا عدد کافی مقدار، 2 کا عدد خاصی مقدار اور 1 کا عدد کم مقدار کو ظاہر کرے گا۔ اس ہدایت کے پیش نظر مندرجہ ذیل قوموں کے قومی کردار کا نیم کیمیائی تجزیہ پیش خدمت ہے۔ یہ یاد رہے کہ انسان اور قومیں اپنے بنیادی عناصر کے تقاضے کے مطابق، ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں میرے لیے یہ مشاہدہ کرنا ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہا ہے کہ یکساں حالات میں مختلف قومیں، کس کس طرح، کیا کیا کرتی ہیں۔ اب قوموں کے کردار کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثلاً عرض ہے کہ حقیقت پسندی (3 تولے)، خیالی منصوبے (2 تولے)، زندہ دلی اور خوش طبعی (2 تولے) اور لطیف احساسات (1 تولہ) کو ملا دیا جائے تو ایک انگریز بنتا ہے۔

$ح_{3}$	$خ_{2}$	$ظ_{2}$	$س_{1}$	=	انگریز
$ح_{2}$	$خ_{3}$	$ظ_{3}$	$س_{3}$	=	فرانسیسی
$ح_{3}$	$خ_{3}$	$ظ_{2}$	$س_{2}$	=	امریکی
$ح_{3}$	$خ_{4}$	$ظ_{1}$	$س_{2}$	=	جرمن
$ح_{2}$	$خ_{4}$	$ظ_{1}$	$س_{1}$	=	روسی
$ح_{2}$	$خ_{3}$	$ظ_{1}$	$س_{1}$	=	جاپانی
$ح_{4}$	$خ_{1}$	$ظ_{3}$	$س_{3}$	=	چینی

مجھے اعتراف ہے کہ میں اطالویوں، ہسپانویوں اور ہندوستانیوں کو قریب سے نہیں جانتا۔ اس لیے میں ان قوموں کے بارے میں کوئی فارمولا نہیں بنا سکا۔ خود مندرجہ بالا فارمولے بھی کچھ مشکوک سے ہیں پھر بھی ان کی وجہ سے مجھ پر اعتراضوں کا طومار اُپڑے گا۔ شاید یہ فارمولے مستند ہونے کے بجائے اشتعال انگیز سمجھے جائیں گے۔ میں اتنا وعدہ کر سکتا ہوں کہ جوں جوں ان قوموں سے میری واقفیت بڑھتی جائے گی میں اپنے فارمولوں میں (اپنے لیے) کچھ ردوبدل، کچھ ترمیم کرلوں گا۔ اب تک جو کچھ ہے یہی ہے۔ یعنی یہ میرے علم اور میری جہالت دونوں کی یادداشت ہیں۔

مندرجہ بالا فارمولوں کے بارے میں کچھ باتیں واضح کرنی ضروری ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ میں نے (ان فارمولوں کے مطابق) چینیوں اور فرانسیسیوں کو بہت حد تک مماثل ٹھہرایا ہے۔ کم سے کم ان دونوں میں ظرافت اور شدت احساس یکساں ہیں۔ ذرا فرانسیسیوں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھیے اور یہ بھی دیکھیے کہ وہ کھانا کس طرح کھاتے ہیں تو آپ پر یہ مماثلت واضح ہو جائے گی۔ فرانسیسی قوم میں ذرا تلون زیادہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فرانسیسی نصب العین کے رسیا ہوتے ہیں اور اسی مثالیت پسندی کی بنا پر نظریات کے بھی بے حد دلدادہ (ذرا فرانسیسی قوم کی ادب اور فنون لطیفہ اور سیاست کے بارے میں وہ تمام تحریکیں ذہن میں لایئے جو آئے دن بنتی بگڑتی رہتی ہیں!)...... مگر چینی اور فرانسیسی کے کردار تجزیے میں آپ دیکھیں گے کہ میں چینی کردار کے عناصر میں حقیقت پسندی کو ''شدید'' یعنی چار کے عدد سے ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ چینی بہت زیادہ حقیقت پسند ہوتے ہیں۔ مگر ان کی زندگی کے طریقے یا معیار میں جو بہت کم تبدیلی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خیالی منصوبہ بندی کی مقدار صرف 1 ہے۔ چینی لوگوں میں احساس کی لطافت بھی بے حد زیادہ ہے اور چینی شاعری، چینی نثر اور چینی تصویریں اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ جاپانی اور جرمن لوگ ظرافت کی کمی کی وجہ سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان فارمولوں میں کسی قوم میں کسی خصوصیت کی مقدار صفر سے ظاہر نہیں کی جاسکتی (چاہیے چینی قوم کی خیال پرستی ہی کیوں نہ ہو) یہ سارا مسئلہ اضافی ہے کیونکہ کسی قوم کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں فلاں فلاں خصوصیت سرے سے موجود ہی نہیں۔ اسی لیے میں نے اپنے فارمولے میں لکھا ہے کہ جرمنوں اور جاپانیوں میں ظرافت کی مقدار صرف 1 ہے، صفر نہیں اور میرا خیال ہے کہ میں نے ٹھیک لکھا ہے اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ محض اسی کمی کے باعث جرمن اور جاپانی، دونوں قومیں آج

کل بھی اور ماضی میں بھی، سیاسی طور پر ہمیشہ تکلیف اٹھاتی رہی ہیں ''وقت کے تقاضے'' اور ''منطقی ضرورت'' پر کچھ اعتقاد رکھنا ضروری سہی مگر اپنے مقصد اپنی منزل کی طرف ناک کی سیدھ میں بھاگ اٹھنا، بعض اوقات منزل سے دوری کا موجب بھی بن جاتا ہے۔ جس چیز پر آپ کا اعتقاد ہو وہ اتنی ضروری نہیں ہوتی، اصل چیز یہ ہے کہ آپ کا اعتقاد کس نوعیت کا ہے اور آپ اس اعتقاد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ جاپانی کے قومی کردار میں مَیں نے خیالی منصوبوں اور تصورات کو (خ) سے ظاہر کیا ہے اور اس سے میری مراد یہ ہے کہ جاپانی قوم اپنے شہنشاہ اور حکومت کی اندھا دھند وفادار ہے۔ یہ اندھی وفاداری ظرافت کی کمی ہی سے ممکن ہو سکتی ہے! کیونکہ جس طرح خیالی منصوبہ بندی اور مثالیت پسندی، ہر ملک میں الگ الگ بہروپ میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح ظرافت بھی بے حد وسیع معنی کی حامل ہوتی ہے۔ اسی لیے میں نے دونوں کی مقدار کو اپنے فارمولے میں کافی شدید دکھایا ہے۔ اسی کش مکش کی بدولت ہی وہ مستعدی ظہور میں آتی ہے جو امریکیوں کا خاصہ ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ امریکہ والوں کی مثالیت پسندی کی نوعیت کیا ہے؟ تو اس کا فیصلہ میں امریکیوں ہی پر چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ امریکی لوگ نت نئی چیزوں کے بارے میں جوش و جذبہ کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ان کی مثالیت پسندی اکثر و بیشتر بڑی نجیب ہوتی ہے کیونکہ ان پر اعلیٰ قسم کے نصب العین یا اعلیٰ الفاظ بہت زیادہ اثر کرتے ہیں۔ امریکی لوگوں کے یہاں طبع سلیم اور ذوق ظرافت بھی وہ مفہوم نہیں رکھتے جو یورپ کے لوگوں کے یہاں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ امریکی لوگوں کا سب سے قیمتی سرمایہ یہی خوش مذاقی اور زندہ دلی ہے۔ امریکی لوگ ہنسی مذاق، کھیل کود کے بڑے دلدادہ ہیں اور ان میں قدرتی طور پر بڑی عملی سوجھ بوجھ بھی ہے۔ یہی گہری سوجھ بوجھ امریکی قوم کو آنے والے نازک دور میں سلامتی سے پار اتار سکتی ہے۔ امریکی لوگوں میں احساس کی لطافت کم ہے۔ کیونکہ میرا تاثر یہی ہے کہ امریکی خواہ مخواہ بہت سی غیر ضروری مصیبتیں جھیلتے رہتے ہیں اور اف نہیں کرتے۔ میرے نزدیک انگریز قوم سب سے زیادہ بے لاگ اور محکم قوم ہے۔ ذرا دیکھیے کہ انگریزوں میں حقیقت پسندی کتنی زیادہ ہے اور خیالی منصوبہ بندی اور تصور پرستی کا جزو بھی نسبتاً کم ہے (یعنی ح خ)۔ اس کے برعکس فرانسیسیوں میں حقیقت پسندی کم ہے اور تصور پرستی زیادہ ہے (ح خ)۔ میرا ووٹ انگریز کی طرف ہے کیونکہ اس میں کردار کا استقلال زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے، کرداری تجزیے کا مثالی فارمولا یہ ہو سکتا ہے کہ حقیقت پسندی اور ظرافت زیادہ مقدار میں اور نصب العین پرستی اور احساس کی لطافت ذرا کم ہو

کیونکہ ان کی زیادتی خرابی کا باعث ہوتی ہے تو ہمارا فارمولا یہ ہے:

ح$_{3}$ خ$_{2}$ ظ$_{2}$ س$_{1}$

انگریز قوم کے تجزیے میں نے، لطافت احساس کو دوسرے عناصر سے کم دکھایا ہے۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں، قصور انگریزوں کا اپنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ انگریز کچھ محسوس بھی کرتے ہیں یا نہیں! کوئی بات 1 میں خوش کرتی ہے؟ کسی چیز پر انھیں غصہ آتا ہے؟ وہ کبھی مطمئن محسوس کرتے ہیں؟ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں کیونکہ انگریز ہمیشہ سنجیدہ سے اور منہ تھتھائے ہی نظر آتے ہیں۔

اب اسی فارمولے کو دنیا کے عظیم شعرا پر منطبق کیجیے۔ مثال کے طور پر چند مشہور اور مخصوص نوع کے ادیب اور شاعر لیجیے تو نتیجہ یہ ہے:

اشاریہ

ح = حقیقت پسندی

خ = تصور پرستی اور خیالی پلاؤ

ظ = ظرافت

س = احساس کی نزاکت اور لطافت

شیکسپیئر (انگریز) = ح$_{4}$ خ$_{4}$ ظ$_{3}$ س$_{4}$

ہائنے (جرمن) = ح$_{3}$ خ$_{3}$ ظ$_{4}$ س$_{3}$

شیلے (انگریز شاعر) = ح$_{1}$ خ$_{4}$ ظ$_{1}$ س$_{4}$

ایڈگر ایلن پور (امریکی) = ح$_{3}$ خ$_{4}$ ظ$_{1}$ س$_{4}$

لی پو = ح$_{4}$ خ$_{3}$ ظ$_{2}$ س$_{4}$

تو فو = ح$_{3}$ خ$_{3}$ ظ$_{2}$ س$_{4}$

سوتنگ پو = ح$_{3}$ خ$_{2}$ ظ$_{4}$ س$_{3}$

یہ عرض کر دوں کہ یہ درجہ بندی محض ڈری ڈری تجویز سی ہے مگر اس سے یہ ظاہر ہے کہ تمام شاعروں میں احساس کی نزاکت اور لطافت حد درجہ پائی جاتی ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ شاعر نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ چینی قوم کے ذہن کا فارمولا میرے نزدیک یہ ہے کہ:

ح خ ظ س
4 1 3 3

گویا چینی قوم میں لطافت احساس بہت زیادہ ہے اور یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ چینی قوم اس ارضی زندگی کو خوبصورت عطیہ سمجھتی ہے اور اسی لیے زندگی سے بے حد محبت کرتی ہے لیکن اس سے محض یہی ظاہر نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اپنی لطافت احساس کی بدولت چینی قوم اور تو اور فلسفے کے لیے بھی فنکارانہ اور شاعرانہ انداز نظر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی فلسفی کا نقطہ نگاہ زندگی کے بارے میں عین بعین وہی ہے جو چینی شاعر کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں فلسفے اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حالانکہ مغرب میں فلسفہ اور سائنس ایک دوسرے کے قریب تر سمجھے جاتے ہیں۔ چینی قوم کی یہی لطافت احساس ہے جو اسے زندگی کی غمی، خوشی اور زندگی کے بدلتے رنگوں کا سچا اور گہرا شعور دلاتی ہے اور اس شعور کی بدولت ہی چین کا زندہ دل فلسفہ حیات وجود میں آیا ہے۔ انسان میں الم کا احساس یوں پیدا ہوتا ہے کہ جاتی بہاروں کے جانے کو وہ دیکھتی آنکھوں دیکھے اور اس کے دل کو تکلیف ہو۔ ہماری اس زندگی کے المیے کا احساس ہمارے اندر اس وقت جنم لیتا ہے جب ہم کل کی تازہ کلیوں کو آج مرجھاتا ہوا پاتے ہیں۔ ان مرجھائی کلیوں کے لیے ہمارے دل میں گداز پیدا ہوتا ہے۔ اس المناکی اور شکست کے احساس سے ہمارا دل بیدار ہوتا ہے۔ ہمارے دل میں مسرت کا چشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔ ہم ہنستے ہیں وہی ہنسی جو لا ابالی دانشمندوں کا خاصہ ہے۔

چینی کردار کے فارمولے میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے حقیقت پسندی کی مقدار بہت زیادہ دکھائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چینی لوگ زندگی کو اسی شکل میں قبول کرتے ہیں جس شکل میں وہ ہے۔ چینی کردار کا خاصہ ہے کہ جو ''مال گرہ میں ہو وہی مال اچھا ہے۔'' یہ حقیقت پسندی فنکاروں کے اس دعوے کی سب سے بڑی شہادت ثابت ہوتی ہے کہ انسانی زندگی بڑی حسین شے ہے مگر اس کے حسن کو بقا نہیں۔ اسی حقیقت پسندی کی بدولت چینی (دنیا کے دوسرے شاعروں اور فن کاروں کے برعکس) زندگی سے فرار ہونے سے بچے رہتے ہیں۔ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والوں کا یہ پرانا مقولہ ہے کہ ''زندگی ایک خواب

ہے''۔۔۔۔۔مگر حقیقت پسند کا جواب یہ ہوتا ہے!''مان لیا، زندگی ایک خواب ہی سہی۔ مگر اس خواب کو جتنے حسن و خوبی سے ممکن ہو سکے بسر کرنا چاہئے!'' جو شخص بیدار ہے اس کی حقیقت پسندی کاروباری قسم کی نہیں بلکہ شاعرانہ قسم کی ہوگی۔ زندگی کی مشکلات کے بارے میں اس کی ہنسی میں تجربے کی رمز پنہاں ہوگی۔ یوں محسوس ہوگا جیسے کوئی پرانا، تجربہ کار بڈھا اپنی سفید لمبی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کران مشکلوں پر ہنس رہا ہے اوران کے بارے میں بڑی ہلکی، بڑی تھپکانے والی آواز میں باتیں کر رہا ہے۔۔۔۔۔اس شخص کو سکون سے محبت ہے۔ اس لیے وہ سپنے دیکھتا ہے اور سپنوں کے لیے کوئی خون خرابہ نہیں کرتا۔ یہ وہ حقیقت پسند ہے جو اپنے ساتھی خواب کاروں کے ساتھ معقول طریقے پر زندگی بسر کرنے کا خواہشمند ہے اوراس طرح زندگی کی مشکلات اور تناؤ کو کم سے کم تر کیے جارہا ہے۔

اس قسم کی حقیقت پسندی سب سے پہلے زندگی کے فلسفے سے تمام غیرضروری باتیں نکال دیتی ہے۔ گویا یہ حقیقت پسندی، زندگی کو مضبوطی سے گرفت میں رکھتی ہے تاکہ زندگی، تخیل کے پروں پر اڑتی اڑتی، خیالی دنیاؤں کے حسن اور غیرحقیقی فضاؤں میں گم نہ ہو جائے۔ سچ پوچھیے تو دانش مندی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ زندگی سے غیرضروری باتیں الگ کردی جائیں۔ فلسفے کے مسائل کو چند ضروری باتوں تک محدود کردیا جائے مثلاً یہ کہ گھریلو زندگی کیسے خوشگوار بن جائے۔ (یعنی مرد عورت اور بچوں کے باہمی تعلقات کیا ہوں) زندگی سے کیسے لطف اٹھایا جائے، فطرت کے حسن اور تہذیب وتمدن کی نعمتوں سے کیسے حظ اٹھایا جائے۔ دانش کا تقاضا یہ بھی ہے کہ تنظیم کے سائنسی مسئلوں اور علم کی بے ثمر تلاش کو غیرضروری قرار دے کر فلسفہ زندگی کے دائرے سے نکال باہر کیا جائے۔ اس طرح چینی فلسفی کے لیے زندگی کے مسائل بہت ہی کم اور بہت سادہ نوعیت کے رہ جاتے ہیں۔ اس کے لیے تصوف اور مابعد الطبیعیات کا کوئی مصرف نہیں رہتا۔ ان سب علوم کے بارے میں تحقیق اور شوق دونوں ختم ہو جاتے ہیں جن کا زندگی سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں! اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہر انسانی کوشش اور سرگرمی کو اور حصول علم کو اس کسوٹی پر پرکھنا ہوگا کہ اس کا زندگی سے کیا واسطہ ہے اور زندگی بسر کرنے میں اس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ تمام انسانی کوششوں اور علم و دانش کے مفید ہونے کی ایک ہی کسوٹی ہے زندگی۔ اس ساری بحث کا بڑا واضح اور اہم نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی کا مقصد کسی مابعد الطبیعیاتی منزل تک پہنچنا نہیں ہے بلکہ زندگی بسر کرنا جینا ہے۔

چینی قوم کو خدا نے یہی حقیقت پسندی عطا کی ہے۔ چینی قوم منطق اور ذہن انسانی پر بالکل بھروسا نہیں کرتی، چینی کے لیے فلسفہ زندگی کے براہ راست اور گہرے احساس اور شعور کا نام ہے۔ اسی لیے چینی، کسی نظام فکر کا پابند نہیں۔ اسے حقیقت پسندی کا صحت مند شعور ملا ہے، ایسی سوجھ بوجھ، ایسی ''حس ازل'' ملی ہے جو خدا نے صرف حیوانوں کو دی ہے۔ چینی میں قدرتی طور پر بڑی معقولیت پسندی ہے۔ ایسی معقولیت پسندی، جو خود عقل کو بے دست و پا بنا دے! اسی لیے چینی فلسفی، کسی خاص نظام فکر کا پابند نہیں ہوسکا۔ اور چین میں کوئی سکہ بند فلسفہ سر اٹھا ہی نہیں سکا۔ چین میں تین مذاہب رائج ہیں کنفیوشس کا دین، تاؤ کا مذہب اور بدھ مت...... یہ تینوں اعلیٰ درجے کے مذہب ہیں۔ مگر چینی کی صحت مند سوجھ بوجھ ان تینوں میں گھل مل چکی ہے۔ اس نے ان کے کٹر پن کو کم کر رکھا ہے، اور ان تینوں کو ایک مسرت انسانی زندگی کی تلاش کا ذریعہ بنالیا ہے۔ کوئی پختہ خیال، تجربہ کار چینی گہری سوچ کا قائل نہیں ہوتا، کسی ایک خیال یا عقیدے یا نظام فکر کا دل سے پابند نہیں رہ سکتا۔

اہل چین کے اس تمدن اور اس فلسفے کا ثمر یہ ہے:

چین میں، انسان مغرب کے مقابلے میں کہیں زیادہ، فطرت اور بچپن سے قریب تر زندگی گزارتے ہیں۔ یہ زندگی ایسی زندگی ہے کہ اس میں جبلت اور جذبات دونوں کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ عقلیت پسندی کے مقابلے میں انہی پر زور دیا جاتا ہے۔ اس طرز زندگی میں انسانی جسم کے ساتھ گہرا لگاؤ بھی شامل ہے اور انسانی روح کی سربلندی اور عظمت بھی۔ حکمت اور احمقانہ خوش باشی، زبردست تکلفات اور بچپنے کی سی سادگی یہ سب عناصر۔ اس زندگی میں آمیز کیے جاتے ہیں۔ اس لیے میں عرض کروں گا کہ اس فلسفہ حیات کی خصوصیات یہ ہیں:

1- فنون لطیفہ میں زندگی کا پورا عکس دیکھنے کا شعور

2- فلسفے میں سادگی کی طرف شعوری میلان

3- زندگی بسر کرنے میں حقیقت پسندی کو نصب العین سمجھنا

اس فلسفے کا منتہا کیا ہے۔ اس کا منتہا اور اس کا نتیجہ بڑا عجیب ہے اور وہ یہ ہے کہ چینی قوم شاعر، کسان اور آوارہ گرد کی پرستش کرتی ہے۔

3- آوارہ گرد......مثالی انسان

میرے نزدیک جو خصوصیات انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں وہ یہ ہیں۔ اول تو انسان میں جاننے اور تحقیق کرنے کی خواہش اور صلاحیت ہے۔ دوم یہ کہ وہ خواب دیکھتا ہے اور کسی نہ کسی نصب العین کو سامنے رکھتا ہے (اگرچہ اکثر اوقات یہ نصب العین بالکل مبہم، غیر یقینی اور غلط سلط ہوتا ہے، پھر بھی ہوتا تو ہے) تیسرا اور زیادہ اہم شرف انسان کو یہ حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالی منصوبوں کو اپنی طبعی ظرافت اور زندہ دلی سے درست کر سکتا ہے اور اس طرح اپنی مثالیت پسندی کو صحت مند حقیقت پسندی کی بدولت قابو میں رکھتا ہے۔ انسان کا امتیاز یہ بھی ہے کہ ماحول اور فضا کے بارے میں اس کا ردعمل ہمیشہ یکساں اور لگا بندھا نہیں ہوتا جیسا کہ جانوروں کا ہوتا ہے...... بلکہ انسان کو یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ آزادی سے اپنا ردعمل معلوم کر سکے اور اگر چاہے تو اپنا ماحول بدل بھی سکے۔ اس آخری انسانی خصوصیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی شخصیت کسی مشینی قانون کی پابند نہیں ہو سکتی بلکہ انسانی ذہن کسی نہ کسی طرح میکانکی قوانین کی گرفت سے آزاد رہتا ہے اور اس کی راہ بھی متعین نہیں کی جا سکتی، اور یہ جو کچھ پاگل قسم کے ماہرین نفسیات اور نا آسودہ ماہرین اقتصادیات، انسانی ذہن پر مشینی اور مادی اور جدلی ضابطے عائد کرتے رہتے ہیں، انسانی ذہن ان کی جکڑ بندی سے بھی نکل بھاگتا ہے...... اسی لیے انسان ایک عجیب وغریب، خواب کار، زندہ دل، بے راہ بلکہ گمراہ سی مخلوق ہے۔

مختصر یہ کہ میں انسانی شرف اسی میں سمجھتا ہوں کہ انسان روئے زمین پر سب سے بڑا آوارہ گرد ہے۔ انسانی وقار اور شرف کو آوارہ گردی کے اس تصور کے ساتھ متعلق کرنا ضروری ہے۔ انسانی وقار کو ایک تابعدار، تنظیم وضبط کے پابند سپاہی کے ساتھ ہرگز متعلق نہیں کرنا چاہیے۔ اس نظریے کے مطابق غالباً آوارہ گرد سب سے شاندار قسم کا انسان ہے اور سپاہی سب سے گھٹیا قسم کا انسان قرار پائے گا۔ کم از کم اس کتاب سے یہ مفہوم لیا جائے گا کہ میں آوارہ گرد کو عظمت کی مسند پر بٹھانا چاہتا ہوں۔ میرا واقعی یہی مقصود ہے۔ موجودہ زمانے میں جمہوریت پسندی اور انفرادی آزادی کو ہر طرف سے خطرے درپیش ہیں۔ صرف آوارہ گرد اور آزادہ روی کا احساس ہی ہمیں ان باوردی قلیوں کے گروہوں میں گم ہو جانے سے بچا سکتا ہے جو نظم وضبط کے پابند ہیں، بے حد فرمانبردار ہیں اور ہر طرح منظم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آوارہ گرد ہی ڈکٹیٹر شپ یا آمریت کا سب سے آخری اور سب سے زبردست دشمن ثابت ہوگا۔ آوارہ گرد انسانی شرف و وقار اور فرد کی آزادی کا سب سے بڑا علم بردار

ہوگا اور اسی کی ذات کو آمریت سب سے آخر میں مغلوب کر سکے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ موجودہ تہذیب کی بقا کا دارومدار اسی کی ذات پر ہے۔

انسان کو تخلیق کرتے وقت شاید ہمارا خالق اکبر جانتا تھا وہ روئے زمین پر سب سے بڑا آوارہ گرد پیدا کر رہا ہے۔ یہ آوارہ گرد اعلیٰ پائے کی ذہانت ضرور رکھتا ہے، مگر ہے آوارہ گرد۔ اور اصل میں آوارہ گردی کی خوبیاں ہی انسان کی سب سے امید افزا خوبیاں ہیں۔ خالق اکبر کا پیدا کیا ہوا یہ آوارہ گرد بڑا ذہین ہے، وہ ابھی تک کچھ خودسر اور کچھ عجیب الخلقت سا بالغ بچہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت عظیم اور بہت دانشمند سمجھتا ہے مگر وہ ابھی اتنا عظیم اور دانش مند نہیں۔ ابھی تک وہ بہت شرارتی اور کھلنڈرا ہے اور ہر آزادی کو سب سے محبوب چیز جانتا ہے۔ پھر بھی اس میں اتنی خوبیاں باقی ہیں کہ قدرت اپنے مقاصد کی برآوری کے لیے اس کی صلاحیتوں پر بھروسا کر سکتی ہے۔ قدرت انسان سے اسی طرح امیدیں لگائے ہوئے ہے جس طرح بعض اوقات ایک باپ اپنے بیس برس کے ذہین مگر کچھ خودسر، کچھ بے راہ سے بچے کے ساتھ امیدیں وابستہ کیا کرتا ہے کیا کسی دن قدرت، اس نظام کائنات کو، اپنے پیدا کردہ اس غلط کار بیٹے کے سپرد کر دے گی؟ یہ کون جانے......!!

ایک چینی کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ کوئی تہذیب صرف اسی وقت مکمل کہلا سکتی ہے۔ جب وہ تکلفات اور نفاستوں سے ترقی کرتے کرتے، پھر سادگی تک آ جائے اور شعوری طور پر، فکر کی سادگی اور زندگی کی سادگی کی طرف لوٹ آئے! صرف وہی شخص، عقلمند کہلا سکتا ہے جو علم کی دانش سے ترقی کرتے کرتے ''حماقت کی دانش'' تک پہنچ جائے، اور ایک زندہ دل فلسفی بن جائے۔ جو پہلے تو زندگی کی المناکیوں کو محسوس کرے اور پھر زندگی کے طربیے پر ہنس سکے۔ قانون قدرت یہی ہے کہ ہنس سکنے سے پہلے ہم رونا سیکھیں۔ المناکی سے دل اور روح بیدار ہوتے ہیں، اور اس بیداری سے فلسفی کے اندر مسرت کا چشمہ پھوٹتا ہے اور وہ ہنستا ہے۔ وہ ہنسی جس میں حلم اور مہربانی اور رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں آج کی دنیا بڑی سنجیدہ ہے، اسی لیے میں آج کی بے حد سنجیدہ دنیا کو ایک خوش باش اور دانش سے بھرپور فلسفے کی سخت ضرورت ہے۔

چین کے فن زندگی کا فلسفہ یقینی طور پر ایک ''خوش باش سائنس'' کہلا سکتا ہے اور اصل یہ ہے کہ خوش باشی کا فلسفہ ہی گہرا اور سچا فلسفہ ہوتا ہے۔ مغربی دنیا کے سنجیدہ اور بھاری بھرکم فلسفیوں نے تو ابھی زندگی کی ابجد

کو بھی نہیں سمجھا۔ میرے نزدیک فلسفے کا کام صرف یہ ہے کہ ہمیں خوش باشی اور زندہ دلی سے زندگی بسر کرنا سکھائے۔ یہ محض میرا خیال ہی نہیں بلکہ میرے نزدیک یہ ایک عملی نظریہ ہے۔ اگر انسان، خوش باشی اور زندہ دلی کی یہ روح اپنالیں تو یہ دنیا، اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ دل کش اور معقول جگہ بن جائے گی۔ موجودہ زمانے کا انسان زندگی کو بڑی سنجیدہ چیز سمجھتا ہے اور چونکہ وہ اتنا سنجیدہ رہتا ہے اس لیے وہ دنیا بھی اس کے لیے مصائب اور مشکلات سے پر بن جاتی ہے۔ ہمیں اس ضابطے، اس رویے کا اصل اصول دیکھنا ہے۔ جس کی بدولت یہ زندگی زیادہ پرمزہ، زیادہ خوشگوار بنائی جا سکے، جس کی بدولت یہ زندگی زیادہ معقول اور زیادہ پرسکون اور کم طوفانی بنائی جا سکے۔

میرا خیال ہے میں اس فلسفہ حیات کو کسی ایک مدرسہ خیال کا فلسفہ نہیں، بلکہ ساری چینی قوم کا فلسفہ کہہ سکتا ہوں۔ یہ فلسفہ، کنفیوشس اور لاؤ کے فلسفوں سے عظیم تر ہے۔ کیونکہ یہ فلسفہ، ان کے فلسفوں اور دوسرے قدیم فلسفوں سے اعلیٰ منزل تک پہنچ گیا ہے۔ چینی قوم کا یہ فلسفہ پھوٹا تو دانش کے انہی قدیم سرچشموں سے ہے مگر اب یہ ان سب کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے۔ اور ان سب سرچشموں کی ہم آہنگی سے ایک پورا نظام وجود میں آ چکا ہے۔ اس فلسفے نے قدیم فلسفوں سے تصوراتی دانش جذب کی ہے اور اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ فن زندگی، ایک زندہ، جیتا جاگتا نظام حیات نظر آتا ہے، جو عام آدمی کی سمجھ میں بھی آ سکتا ہے۔ سارے چینی ادب، آرٹ اور فلسفے پر نظر ڈالنے سے مجھ پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ چینی ادب، آرٹ اور فلسفے کا پیغام کیا ہے۔

وہ پیغام اور تعلیم یہ ہے کہ زندگی کا جی بھر کر لطف اٹھایا جائے اور حقیقت پسندی سے اپنانا تا ہمیشہ مضبوط رکھا جائے۔ یہی وہ تعلیم ہے جو چینی فکر و ادب میں ہر جگہ اور ہمیشہ رواں دواں نظر آتی ہے۔



دوسرا باب

انسان کیا ہے؟

1- انسانیت کے بارے میں مسیحی، یونانی اور چینی نقطہ نظر

انسانیت کے بارے میں ایک تو مسیحی دینیات کا روایتی نظریہ ہے۔ دوسرے یونانیوں کا فرانہ نقطہ نظر ہے اور پھر چینی نظریہ ہے جو کنفیوشس اور تاؤ کی تعلیمات کا آمیزہ ہے۔ (میں نے عمداً بدھ مت کے نقطہ نظر کا ذکر نہیں کیا کیونکہ انسانیت کے بارے میں یہ نظریہ بے حد غم انگیز ہے) اجمالی طور پر دیکھا جائے تو یہ نظریے، ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں۔ خصوصاً آج کل حیاتیات اور علم الانسان کی روشنی میں تو ان نظریوں کی بڑی وسیع تعبیریں کر کے، انہیں ایک دوسرے کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اصل میں، ان نظریوں میں کافی اختلاف موجود ہے۔

انسانیت کے بارے میں مسیحی مذہب کا روایتی نظریہ یہ ہے کہ ابتدا میں انسان کو مکمل معصوم، بے شعور اور خوش باش پیدا کیا گیا تھا۔ یہ انسان ننگ دھڑنگ جنت عدن میں رہتا تھا۔ ہوا یہ کہ انسان کو علم و دانش ہاتھ آ گئے اور انسان جنت سے نکالا گیا۔ اور انسانی مشکلات اور مصائب کا آغاز ہو گیا۔ یہ انسانی مصائب کیا ہیں؟ اول: مردوں کے لیے یہ مقدر ہوا کہ وہ اپنا ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر روزی کمائیں گے۔ دوم: عورتوں کے لیے یہ مقدر ہوا کہ انھیں بچے جننے کی سخت تکلیف ہو گی۔ جنت عدن میں انسان مکمل اور کامل تھا۔ اب زمین پر اس کے ناقص ہونے کا یہ سبب پیش کیا گیا کہ اس کا ناقص ہونا، شیطان کی وجہ سے ہے۔ شیطان، انسانی جسم کے ذریعے سے اپنا کام نکالتا ہے اور انسان کی عالی فطرتی، اس کی ''روح'' کی دنیا میں سرگرم رہتی ہے۔ مسیحی دینیات میں ''روح'' کا لفظ کب سے رائج ہوا میں نہیں جانتا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ یہ ''روح'' ایک خصوصیت یا حالت کے بجائے ایک خاص چیز، ایک مخصوص وجود بن کر رہ گئی۔ اور اسی ''روح'' کو انسان اور حیوان کے مابین امتیاز قرار دیا گیا کیونکہ جانوروں کے پاس روح نہیں جس کی شیطان سے حفاظت کی جائے۔ اس مرحلے

پر اس نظریے میں کچھ منطقی مشکلیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً شیطان کے وجود کی تشریح ضروری ہوئی۔ چنانچہ جب قرونِ وسطیٰ کے مسیحی عالموں نے اپنی متکلمانہ منطق سے اس مسئلے پر ہاتھ ڈالا تو وہ عجب مخمصے میں پڑ گئے۔ وہ یہ تسلیم کیسے کرتے کہ شیطان (جو خدا کی ضد ہے) خود خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں مان سکتے تھے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے کائنات میں، خدا اور شیطان دونوں ایک ساتھ ہمیشہ سے موجود تھے۔ اسی لیے انھوں نے تھک ہار کر یہ رستہ نکالا کہ شیطان، شیطان نہیں تھا بلکہ ایک راندہ ہوا فرشتہ تھا۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بدی کا وجود کہاں سے آیا؟ (کیونکہ ایک فرشتے کو بہکا کر مردود بنانے کے لیے بھی تو ایک شیطان ہونا چاہیے تھا) مگر ان عالموں نے اس سوال سے پہلو بچایا۔ پھر بھی ان کی اس تعلیم سے جسم اور روح کا سارا جھگڑا شروع ہوا۔ بدقسمتی سے یہ خیالی نظریہ اب بھی رائج ہے اور اب بھی ہماری زندگی اور ہماری خوشی پر بے حد اثر انداز ہے۔

انسان کے جنت سے نکالے جانے کے بعد، مسیحی نظریے کے مطابق، نجات کا مرحلہ آتا ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی نجات حضرت مسیح کی شفاعت پر ہوگی اور انسان کو اس کا کفارہ دینا ہوگا۔ یہ کفارہ اصل میں بہت پرانی مذہبی رسم ہے۔ مثلاً بتوں کو خوش کرنے کے لیے گوشت کی قربانی ضروری ہے۔ اسی نجات شفاعت کی بدولت انسان کے ایک بار پھر کامل ہونے کا راستہ ڈھونڈ لیا گیا۔ کیونکہ کفارے کے بعد اس کے سارے گناہ یک قلم معاف ہو سکتے ہیں۔ انسان کے کامل ہو جانے کا یہ نظریہ مسیحی دین کا سب سے عجیب پہلو ہے۔ یہ نظریہ اس وقت رائج ہوا جب قدیم عہد ختم ہو رہے تھے۔ چنانچہ یہ رجحان ترقی کر گیا کہ حیات بعد الموت پر زور دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی سیدھے سادے جینے کے مسئلے اور خوش باشی کے بجائے، نجات پر توجہ دی جانے لگی۔ خیال یہ چلا کہ اس دنیا سے جو گناہوں کا گھر ہے اور جو اپنی ابتری کی وجہ سے مٹ کر رہے گی، کس طرح کنارہ کیا جائے۔ چنانچہ زندہ رہنے کے بجائے زندہ جاوید ہو جانے کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ یہ سب کچھ بائبل کے باب پیدائش کے اس بیان کے بالکل منافی ہے کہ خدا انسان کی بقا اور دائمی زندگی نہیں چاہتا تھا۔ باب پیدائش نے یہ نہیں کہا کہ آدم و حوا کو (عام خیال کے مطابق) دانہ گندم کی بدولت جنت سے نکالا گیا۔ بلکہ یہ لکھا ہے کہ یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ آدم و حوا اس شجرِ ممنوعہ کے بعد کہیں شجرِ زندگی کا پھل نہ چکھ لیں اور کہیں اس طرح زندہ جاوید نہ ہو جائیں۔ ملاحظہ ہو:

''اور خداوند خدا نے کہا: دیکھو، انسان ہم جیسا ہو گیا کہ گناہ وثواب میں امتیاز کر لیتا ہے، کہیں یہ نہ ہو جائے کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور شجرِ زندگی کا پھل اتارے اور کھا لے، اور اس طرح ہمیشہ زندہ رہے اس لیے خداوند خدا نے انسان کو جنت عدن سے نکال دیا اور اس زمین میں کھیتی کرنے کو بھیجا جہاں سے وہ اٹھایا گیا تھا چنانچہ خداوند خدا نے آدم کو نکال دیا اور جنت عدن کے مشرق کی سمت فرشتے تعینات کر دیے اور ایک شعلہ فشاں تلوار لٹکا دی جو ہر طرف گھومتی تھی تا کہ شجرِ زندگی کا راستہ بند رہے۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شجرِ ممنوعہ تو جنت عدن کے کہیں مرکز میں تھا مگر شجرِ زندگی جنت عدن کے مشرقی دروازے کے قریب ہے۔ اور آج تک فرشتے، انسان کو شجرِ زندگی تک پہنچنے نہیں دیتے۔

کچھ بھی ہو۔ یہ خیال آج بھی قائم ہے کہ زندگی کا لطف اٹھانا گناہ اور بدی ہے اور اپنے آپ کو دکھ دینا نیکی ہے۔ اور انسان ایک عظیم بیرونی قوت کی امداد کے بغیر اس بدی سے بچ نہیں سکتا گناہ کا عقیدہ آج بھی مسیحی دین کی بنیاد ہے اور مسیحی مبلغ آج بھی کسی کو عیسائی بنانے کے لیے یہی پرچار کرتے ہیں کہ انسان ازلی طور پر گناہ گار ہے اور انسانی فطرت کی بنیاد ہی بدی ہے۔ گویا جب تک کسی انسان کو یہ یقین نہ دلایا جائے کہ وہ گناہ گار ہے اسے عیسائی بنانا ممکن نہیں۔ اسی لیے تو کسی ستم ظریف نے کہا ہے:

''ہمارے مسیحی مذہب کو اتنا محدود کر دیا گیا ہے کہ گناہ مذہب کا مرکز خیال بن گیا ہے۔ اس لحاظ سے جو شخص ہر وقت گناہ کے خیال میں ڈوبا رہے وہی سچا مسیحی کہلا سکتا ہے۔ چنانچہ اب یہ عالم ہے کہ شریف لوگ جو گناہ کے بارے میں نہیں سوچتے کس منہ سے گرجے میں جائیں۔ وہ تو مسیحی ہی نہیں ہیں۔''

یہ تو تھا مسیحی نظریہ۔ اب انسانیت کے بارے میں یونانیوں کا نقطہ نظر ملاحظہ ہو یونانی دنیا اپنی ایک مخصوص دنیا تھی۔ اس لیے یونانیوں کا نظریہ انسانیت بھی مسیحی نقطہ نظر سے بے حد مختلف ہے۔ اہم بات یہ دیکھیے کہ یونانی، اپنے دیوتاؤں کو بھی انسان کا قالب دیتے تھے۔ اس کے برعکس مسیحی دین آدمی سے دیوتا بننے کی توقع کرتا ہے۔ یونانی دیوتاؤں کا مامن اولمپس پہاڑ ہے اور اولمپس کے یہ دیوتا، خوش باش اور عشق پیشہ لوگ ہیں۔ جو جھوٹ بولتے ہیں، آپس میں آئے دن لڑتے رہتے ہیں، عہد و پیمان توڑتے ہیں، نک چڑھے اور جھکی

ہیں یہ دیوتا بھی ساری یونانی قوم کی طرح ،رتھوں کے شیدائی ہیں، نیزہ بازی کے متوالے ہیں، شکار کے رسیا ہیں یونانیوں کی طرح یہ دیوتا بھی شادیاں کرتے ہیں اور کئی ایک کے تو ناجائز اولاد بھی ہے! یونانیوں کے نزدیک انسانوں اور دیوتاؤں میں فرق اتنا ہے کہ دیوتاؤں کو روئے زمین پر بجلیاں برسانے کا اختیار ہے، دیوتا زمین کو سرسبز بناتے ہیں، وہ انسانوں کی طرح فانی نہیں اور وہ شراب کے بجائے آبِ حیات پیتے ہیں جہاں تک پھلوں کا تعلق ہے وہ یکساں تھے۔ ان دیوتاؤں کا ذکر سن کر فوراً یہ خیال ہوتا ہے کہ اس ہجوم کے ساتھ تو گہری دوستی اور اپنایت بھی ہو سکتی ہے اور ہم آپ، دیوتا اپالو (سورج دیوتا) یا ایتھن یا دیوتا مرکری (پیغام رساں دیوتا) کے ساتھ کندھے پر ایک جھولا ڈال کر شکار کو جا سکتے ہیں اور راستے میں اس پیغام رساں دیوتا سے گھل مل کر باتیں کر سکتے ہیں اور وہ یکایک باتیں چھوڑ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ ”اچھا بھائی معاف کرنا میں ذرا لپک کر یہ خط فلاں جگہ پہنچا آؤں!“ یونانیوں کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یونانی لوگ تو دیوتا نہیں تھے۔ مگر یونانی دیوتا ضرور انسان تھے ذرا ان کا مقابلہ مسیحی خدا سے کیجیے۔ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ چنانچہ یونانی دیوتا انسانوں کی ہی ایک ذرا مختلف نسل تھی۔ گویا یہ لوگ آدم زاد نہیں، جن تھے۔ جنھیں دائمی زندگی ملی تھی اور جن کے برعکس زمینی انسانوں کو محض فانی زندگی عطا ہوئی تھی چنانچہ دیوتاؤں کی اس کہانی سے ایسی خوبصورت کہانیاں وجود میں آئیں۔ جن کا کوئی مقابلہ نہیں۔ ان دیوتاؤں پر یونانیوں کا اعتقاد راسخ تھا، اس سے کوئی مفر نہ تھا حتیٰ کہ سقراط جیسے فلسفی نے جب زہر کا جام پیا تو اس نے تھوڑا سا مشروب دیوتاؤں کی بھینٹ کے طور پر زمین پر چھڑکا تا کہ دیوتا اس کے ابدی سفر پر اس کی معاونت کریں کم و بیش کنفیوشس کا بھی یہی رویہ تھا۔ اصل میں وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ ایسی باتیں کی جائیں۔ آج کل کے زمانے میں یونانی روح، انسان اور دیوتاؤں کے سلسلے میں کیا یہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ یونانیوں کی یہ ملحدانہ دنیا، آج کی دنیا نہیں۔ اور آج کی مسیحی دنیا، قدیم یونانی دنیا نہیں اور افسوس اسی بات کا ہے۔

بہرکیف یونانیوں نے یہ عقیدہ تسلیم کر لیا تھا کہ انسان فانی ہے اور اکثر اوقات مقدر کی ٹھوکریں بھی اس کا حصہ ہیں۔ بس اتنی بات تسلیم کر لینے کے بعد انسان اپنے حال پر خوش تھا کیونکہ یونانیوں کو اس زندگی، اس کائنات سے، بڑی محبت تھی۔ یونانیوں کی ساری توجہ اس بات پر تھی کہ اس زندگی کے حسن، اس کی سچائی، اس کی خوبیوں کو سمجھ سکیں، ان کا احاطہ کر سکیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ کائنات کو سائنسی طور پر سمجھنے میں بھی پوری دلچسپی لیتے

تھے۔ یونانی تاریخ میں انسان کا ایسا کوئی ''سنہری زمانہ'' نہیں ملتا جیسا کہ مسیحی روایتوں کے مطابق ''جنت عدن'' کا دور تھا۔ اسی لیے انسان کے ہبوط اور زوال کی بھی کوئی داستان نہیں۔ یونانی محض انسان تھے۔ وہ انسان جنہیں (انہی کی روایتوں کے مطابق) عظیم طغیانی کے بعد ساحلوں پر آئے ہوئے ڈیوکیلین اور اس کی بیوی پائی رانے، کنکر سمجھ کر ادھر ادھر پھینک دیا تھا اور یہی کنکر بعد کو انسان بن گئے تھے۔

یونانیوں کا وطیرہ تھا کہ وہ بیماریوں اور تکلیفوں کا تذکرہ مزاحیہ انداز میں کرتے تھے۔ ایک نوجوان خاتون کو ایک صندوق میں جواہرات بند کر کے دیے گئے اور کہا گیا کہ وہ انہیں ایک خاص مدت تک نہ کھولے۔ وہ حسینہ صبر نہ کر سکی اور جواہرات بیماریاں بن کر دنیا میں پھیل گئے۔ یونانیوں کا تخیل بے حد خوبصورت اور شاداب تھا۔ وہ انسانی فطرت کو عام طور پر اسی طرح قبول کرتے تھے۔ جس طرح حقیقت میں وہ تھی۔ گویا مسیحیوں کے قول کے مطابق یونانی اس فانی زندگی پر پوری طرح شاکر تھے بلکہ ان کے نزدیک فانی ہونا بڑی خوش آئند بات تھی کیونکہ ان کی سوجھ بوجھ کو، ان کے تخیل کو اس صورت میں پوری آزادی ملتی تھی کہ اس کائنات کو جو چاہیں اور جس طرح چاہیں سمجھیں۔ مثلاً بعض سوفسطائی فلسفیوں کا خیال تھا کہ انسانی فطرت، نیک اور مجسم خیر ہے اور بعض یہ کہتے تھے کہ انسانی فطرت بدی کا دوسرا نام ہے مگر ان میں وہ تضاد اور تفاوت نہیں تھا جو مثال کے طور پر ہمیں انگریز فلسفی ہابز اور فرانسیسی انقلابی روسو کے نظریوں میں نظر آتا ہے۔ یہ تو سوفسطائیوں کا حال تھا۔ افلاطون کو دیکھیے تو وہ یہ کہتا ہے کہ انسان خواہشوں، جذبات اور خیالات کا مرکب ہے اور مثالی انسانی زندگی یہ ہے کہ انسان دانش یا سچے ادراک کی رہبری میں اپنے ان تینوں اجزا (خواہشات، جذبات اور خیالات) کو پوری طرح ہم آہنگ رکھے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ خیالات اور تصورات تو غیر فانی ہیں مگر انسانی فطرت اعلیٰ یا ادنیٰ ہو سکتی ہے اور اس کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان انصاف، علم، اعتدال اور حسن محبت کرتا ہے، یا نہیں۔ پھر سقراط کے فلسفے میں انسانی روح کو ایک مستقل اور خودمختار اور غیر فانی حیثیت دی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی روح کے غیر فانی ہونے کا نظریہ، مسیحی، یونانی، تاؤ اور کنفیوشس۔ ہر نقطہ نظر میں مشترک ہے مگر آپ جدید زمانے کے لوگ اس بات پر تاؤ نہ کھائیں۔ کیونکہ انسانی روح کی بقا میں سقراط کا عقیدہ، آج کے انسان کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وجہ یہ ہے کہ سقراط نے اس دعوے کے لیے جو دلیلیں دی ہیں (مثلاً آواگون یا تناسخ وغیرہ) وہ جدید زمانے

میں قبول نہیں کی جاسکتیں۔

اب تیسرا نظریہ سنیے چینی نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان، مخلوقات کا بادشاہ ہے (''وہ دس ہزار اشیا کی روح رواں ہے'') کنفیوشس کا تو یہ خیال ہے کہ عالم اسباب میں انسان کا مرتبہ آسمان اور زمین کے برابر ہے۔ اس نظریے کا پس منظر یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر شے زندہ ہے اور یا اس میں روح ضرور موجود ہے۔ مثلاً پہاڑ، دریا یا ہر وہ چیز جس پر بڑھاپے کا شاندار دور آجائے، ذی روح ہے، آندھی اور رعد تو خود روحیں ہیں۔ ہر اونچے پہاڑ اور ہر دریا پر ایک روح کی حکمرانی ہے بلکہ ان پر روحوں ہی کا قبضہ ہے۔ ہر قسم کے پھولوں کی ایک پری محافظ ہے جو ان کے کھلنے کی رت کی نگرانی کرتی ہے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔ پھر سارے پھولوں کی ایک ملکہ ہے جس کی سالگرہ سال کے دوسرے چاند کی، بارہویں تاریخ کو ہوتی ہے۔ بید مجنوں ہو یا دیودار یا سرو ہو، گیدڑ ہو یا کچھوا ان میں سے جو بھی پختہ عمر ہو کر کئی سو برس کا ہو جائے وہ امر ہو جاتا ہے اور ''وجود مطلق'' کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔

اس ذی روح اور جاندار پس منظر کے ساتھ، قدرتی طور پر، انسان کو بھی ایک روح کا مظہر سمجھا جاتا ہے، یہ روح، زندگی کی طرح، مردانہ، فاعلی، مثبت (چینی میں ''یانگ'') اور زنانہ، مفعولی، منفی (چینی میں ین) کے اتصال سے وجود میں آتی ہے، آپ یہ سمجھ لیجیے کہ چینی دماغوں نے مثبت اور منفی برقی رو کا سا اصول دریافت کر رکھا تھا! خیر، جب یہ روح انسانی جسم میں آتی ہے تو اسے ''پو'' کہتے ہیں اور جب تک یہ کسی جسم میں قید نہ ہو اسے (وین) کہتے ہیں۔ موت کے بعد یہ روح (وین) آوارہ پھرتی ہے اور عام طور پر کسی کو کچھ نہیں کہتی لیکن اگر مردے کو دفن نہ کیا جائے اور مرنے والے کی دعا نہ کرائی جائے تو یہی روح، بھوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی لیے چین میں ساتویں چاند کا پندرہواں دن روحوں کا دن قرار دیا گیا ہے تاکہ جو لوگ ڈوب کر مر گئے، یا دور دیس میں مرے اور نہ جانے کہیں دفن ہوئے یا نہیں، ان کے لیے دعا کی جائے اور ان کے لیے قربانی کی جائے۔ اس کے علاوہ اگر مرنے والا قتل کیا جائے یا ظلم سہتے ہوئے مرے تو اس کے بھوت کو ناانصافی کا یہ احساس آوارہ پھراتا ہے اور وہ لوگوں کو دکھ دیتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے ظلم کا بدلہ لیا جائے اور اس کی روح کو تسکین دلائی جائے۔ تبھی اس روح، اس بھوت کو سکون ملتا ہے۔

انسان جب تک زندہ رہتا ہے (یعنی جب تک روح، انسانی چولا اختیار کیے رکھے) اس وقت تک اس

میں لازمی طور پر کچھ خواہشات اور امنگیں اور ضروری طاقت جاری وساری رہتی ہے۔ اسے ''اعصابی طاقت'' سمجھ لیجیے۔ چیزیں، اپنی ذات میں نہ بری ہیں نہ اچھی۔ بلکہ یہ چیزیں تو محض زندگی کا لازمہ ہیں اور زندگی سے کسی طرح الگ نہیں کی جاسکتیں۔ تمام مردوں، عورتوں اور نفسانی خواہشیں بھی ہیں، قدرتی امنگیں بھی اور اونچے خیالات بھی ہیں، اور انہیں ضمیر بھی دیے گئے ہیں۔ ان مردوں عورتوں میں جنس کا احساس بھی ہے اور انھیں بھوک بھی لگتی ہے۔ ان میں خوف اور غصہ بھی ہے۔ یہ مرد، عورت، بیماری، درد، تکلیف اور موت کا شکار بھی ہوتے ہیں...... مگر تمدن اور تہذیب کا کام یہ ہے کہ خواہشوں اور جذبوں کا اظہار پوری ہم آہنگی سے ہو۔

یہ ہے کنفیوشس کا نظریہ: جس کا اعتقاد یہ ہے کہ اگر انسانی زندگی انسانی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی سے بسر ہو جائے تو انسان بھی آسمان اور زمین کا ہم پلہ ہو سکتا ہے۔

بدھ مت کا نظریہ ہے کہ جسمانی خواہشیں، فانی انسانوں کی نجات کے راستے میں سخت رکاوٹیں ہیں، جن پر غالب آنا ہی چاہیے۔ (یہ نظریہ عین بعین قرون وسطی کے مسیحیوں کی تعلیمات کے مطابق ہے) چنانچہ اکثر اوقات جو مرد عورتیں بہت زیادہ ذہین ہوں، یا جنہیں زیادہ سوچنے کی عادت ہو، وہ بدھ مت کے اس نظریے کو قبول کر لیتے ہیں اور پھر بھکشو اور راہبہ بن جاتے ہیں، لیکن مجموعی طور پر کنفیوشس کی سکھائی ہوئی عقل سلیم اس کی ممانعت کرتی ہے۔ اس کے علاوہ تاؤ کے خیال کے مطابق ماہ پیکر مگر بدنصیب لڑکیوں کو ''آسمان سے گری ہوئی پریاں'' سمجھا جاتا ہے، جنہیں فانی انسانوں کے سے خیالات رکھنے پر، یا آسمانوں پر کسی فرض میں کوتاہی کے جرم میں، زمین پر بھیج دیا گیا ہے، تاکہ وہ فانی انسانوں کی سی مصیبتیں جھیلیں۔

چینی نظریے کے مطابق انسانی ذہن کو قوت کا ایک دھارا سمجھا جاتا ہے۔ ذہن انسانی کے لیے جو چینی اصطلاح ہے اس کا قریب ترین مترادف ''اعصابی قوت'' کو سمجھ لیجیے۔ جو رات دن کے چکر میں ہر شخص کی زندگی کی گتھی بڑھتی رہتی ہے۔ ہر شخص اس دنیا میں کچھ نفسانی خواہشات، کچھ امنگیں اور اس قوت کی کچھ مقدار ساتھ لے کر آتا ہے اور لگے بندھے چکر کے ساتھ، اپنے بچپنے، اپنی جوانی اپنی پختہ عمری، اپنے بڑھاپے اور موت کے لمحے تک اپنا یہ حصہ ختم کر لیتا ہے۔ اسی لیے کنفیوشس نے کہا ہے:

''نوجوانی میں لڑنے بھڑنے سے خبردار رہو۔ اگر طاقت ور ہو تو جنسی خواہشات سے خبردار ہو۔ اور جب بوڑھے ہو جاؤ تو ملکیت کے جذبے سے ہوشیار رہو!'' اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑکوں کو لڑنا بھڑنا بھاتا ہے،

جوانوں کو عورتوں سے دلچسپی ہوتی ہے اور بوڑھوں کو دولت سے والہانہ پیار ہوتا ہے۔

گویا، جسمانی، ذہنی اور اخلاقی قدروں کے اس مرکب کے پیش نظر، چینی کو دوسرے مسائل کی طرح خود آدمی کے بارے میں ایک رویہ اختیار کرنا پڑ گیا ہے اور وہ رویہ یہ ہے کہ ''معقول بنو۔'' اس رویے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سے زیادہ امیدیں باندھو، نہ کم درجہ ہی تصور کرو۔ گویا انسان، زمین اور آسمان کے مابین، حقیقت پسندی اور مثالیت پرستی کے درمیان گھرا ہوا ہے۔ اسی کی ہستی، اونچے خیالات اور گھٹیا نفسانیت کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ یہی انسانیت کا اصل مفہوم اور نچوڑ ہے۔ علم کی تشنگی اور پانی کی پیاس دونوں انسانی خصوصیات ہیں۔ یہ بھی عین انسانیت ہے کہ انسان کو کوئی عمدہ خیال بھی پسند آئے اور کوئی لذیذ کھانا بھی من بھائے، اسے کوئی خوبصورت مقولہ بھی پسند آئے اور کسی حسین عورت پر بھی وہ ریجھ جائے۔ چنانچہ اسی لیے ہماری دنیا نا تمام اور نامکمل دنیا ہے۔ یہ تسلیم کہ انسانی دنیا کو اپنے قبضے میں لے کر، اس کی اصلاح کرنے کی گنجائش موجود ہے مگر چینیوں کو نہ تو کامل امن و سکون کی توقع ہے نہ مکمل مسرت کی امید ہے۔ اس نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے ایک کہانی سنیے:

ایک شخص دوزخ میں تھا۔ اس کے آواگون کا وقت آ چکا تھا۔ اس نے خدائے تناسخ سے کہا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں ایک بار پھر، آدمی کی شکل میں دنیا کو جاؤں تو میری چند شرطیں ہیں۔ خدائے تناسخ نے پوچھا، وہ کیا شرطیں ہیں بھائی؟ اس نے جواب دیا، شرط یہ ہے کہ اب کے میں ایک وزیر کے یہاں جنم لوں اور میرے یہاں جو بیٹا پیدا ہو، وہ ایک ''ادبی دھوکا'' ہو۔ یعنی وہ ایسا ہو کہ قومی امتحانات میں رٹ رٹا کر اول نمبر پر آئے۔ میرے گھر کے اردگرد اس ہزار ایکڑ زرخیز زمین ہو۔ گھر کے پہلو میں مچھلیوں کا تالاب ہو۔ پائیں باغ میں ہر قسم کے پھلوں کے درخت ہوں۔ مجھے ایک نہایت خوبصورت بیوی دی جائے اور میرے لیے ماہ پیکر کنیزیں ہوں جو سب کی سب مجھ سے والہانہ محبت کرتی ہوں۔ میرے گھر کے کمرے چھت تک سونے اور موتیوں سے بھرے ہوئے ہوں۔ میرے گودام اناج سے بھرپور ہوں۔ صندوق دولت سے پر ہوں۔ مجھے شاہی مجلس کے مشیر یا امیر الامراء کا رتبہ حاصل ہو اور میں اسی طرح باعزت اور خوشحال زندگی بسر کرتا سو برس کی عمر کو پہنچوں'' یہ شرائط سننے کے بعد خدائے تناسخ نے جواب دیا۔ بھائی اگر زمین پر ایسی زندگی ممکن ہو تو خود میں جا کر یہ زندگی اختیار کروں۔ تمھیں بھلا ایسی زندگی میں کیوں دینے لگا؟''۔

گویا معقول رویہ یہ ہے کہ چونکہ ہمیں یہی فطرت دی گئی ہے لہٰذا ہمیں اسی کے ساتھ زندگی کرنا ہے۔ کیونکہ اس سے کوئی مفر نہیں۔ نفسانی خواہشیں اور ہمارے جبلی تقاضے یا تو بنیادی طور پر برے ہیں یا بنیادی طور پر اچھے لیکن ان کے بارے میں زیادہ باتیں بنانے سے کیا فائدہ ہوگا بھلا؟ بلکہ الٹا یہ اندیشہ ہے کہ ان کی باتیں کرتے کرتے ہم انہی کے غلام ہو جائیں۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ بیچ کا راستہ (اعتدال) اختیار کر لیا جائے اس معقول رویے کی بدولت ایسا پرعفو فلسفہ وجود میں آتا ہے کہ ایک مہذب، وسیع الخیال اور معقول عالم ہر انسانی لغزش، ہر قسم کی بداخلاقی (چاہے اس کی نوعیت قانونی ہو، اخلاقی یا سیاسی) کو معاف کر سکتا ہے۔ عام طور پر یہی وہ چیزیں ہیں جنہیں انسان کی دون فطرتی یا انسان کی عام کمزوری کہا جاتا ہے! چینی تو اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ قدرت، یا خود خدا بے حد معقولیت پسند ہے۔ چینیوں کا یہ خیال ہے کہ اگر لوگ اپنی سمجھ کے مطابق، معقولیت سے زندگی بسر کریں، تو انھیں کوئی اندیشہ نہیں، کسی چیز کا ڈر نہیں۔ ضمیر کا سکون واطمینان سب سے بڑی نعمت ہے اور یہ کہ جس شخص کا ضمیر آئینے کی طرح صاف ہو، اسے کسی چیز کا ڈر نہیں۔ حتیٰ کہ اسے بھوت پریت سے بھی کوئی خدشہ نہیں۔ گویا جب تک ایک معقولیت پسند خدا، معقول اور کچھ نامعقول بندوں کے معاملات کا نگران ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ ٹھیک ہے۔ نامعقول لوگوں کو کیے کا پھل بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ ظالموں کو موت چین نہیں لینے دیتی۔ غدار خودکشی کر لیتے ہیں۔ اور غاصبوں کو آخر میں ہر چیز فروخت ہی کرنی پڑتی ہے۔ جس شخص نے عمر بھر نادرات جمع کیے اور ان نادرات کے لیے لالچ اور ناجائز قبضہ اور ہر برے ذریعے سے کام لیا، اس کے بیٹے یہ ذخیرہ۔ اتنی محنتوں اور مشکلوں سے جمع کیا ہوا یہ ذخیرہ ایک ایک چیز کر کے بیچ ڈالتے ہیں اور یہی ذخیرہ بکھر کر گھر گھر پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح قاتلوں کا جرم عیاں ہو جاتا ہے، وہ پکڑے جاتے ہیں۔ اور ان پر مرے مردوں اور مظلوم عورتوں کا صبر پڑتا ہے۔ اور ان کا بدلہ چکا دیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی مظلوم گھبرا کر پکار اٹھا کرتا ہے۔ ''شاید فلک کج رفتار کے آنکھیں نہیں'' (یعنی انصاف کی آنکھیں اندھی ہیں) مگر یہ پکار شاذ و نادر ہی سنائی دیتی ہے۔

گویا، کنفیوشس اور تاؤ دونوں کے نزدیک، اس فلسفے کا نتیجہ اور مقصد اعلیٰ یہ ٹھہرتا ہے کہ فطرت کو پوری طرح سمجھا جائے اور اس کے ساتھ پوری ہم آہنگی سے زندگی بسر کی جائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے میں ''معقول فطرت پرستی'' کہتا ہوں۔ ایک معقول فطرت پرست، حیوانوں کے سے اطمینان کے ساتھ اس زندگی کو بسر

کرنے پر کمر باندھتا ہے...... وہی بات جسے ایک ان پڑھ چینی عورت نے کہا تھا:

''ہمیں کسی نے جنا تھا، اور ہم نے دوسروں کو جنم دیا۔ اس کے علاوہ کیا بھی کیا جاتا؟''

اس فقرے میں بڑی گہری رمز پنہاں ہے، گویا اس کے مطابق زندگی محض ایک حیاتیاتی فعل ہے اور اس طرح بقا کا سارا مسئلہ ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ یہی جذبہ اس بڈھے چینی کا ہوتا ہے جو اپنے ننھے پوتے کا ہاتھ پکڑے بازار میں نکلتا ہے، دکان میں جاتا ہے کہ پوتے کے لیے کچھ مٹھائی خریدے لیکن اس کے دل میں خیال یہ ہوتا ہے کہ پانچ سات برس بعد موت اسے ابدی نیند سلا دے گی اور وہ بھی اپنے آبا کے ساتھ خاک میں مل کر خاک ہو جائے گا! زیادہ سے زیادہ ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ ہمارے بیٹے اور پوتے ایسے نہ ہوں کہ ہمیں ان کی وجہ سے شرمندگی اٹھانی پڑے، اور بس چنانچہ چینی زندگی کا سارا نظام، اسی ایک خیال اسی ایک تصور پر استوار کیا گیا ہے۔

2- خاک کا پتلا

تو سارا مسئلہ یہ ہے کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے مگر اسے اسی زمین پر زندہ رہنا پڑے گا اور اسے آسمانی زندگی کے سارے خیال ترک کرنے ہوں گے لہٰذا روح کو تخیل کے پروں پر اڑ کر دیوتاؤں کی روحانی بستی تلاش کرنی ہوگی اور اس زمین کو ہرگز بھلانا نہیں ہوگا۔ آخر ہم فانی ہیں، ہمیں ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔ ہمیں جینے کی ایک خاص مدت (مثلاً روایتی طور پر ساٹھ اور دس ستر سال) دی گئی ہے اگر ہماری روح بہت زیادہ مغرور ہو جائے اور ہمیشہ زندہ رہنا چاہئے تو یہ مدت خاصی کم ہے۔ لیکن اگر ہماری روح عاجزی اور فردتنی کو اپنائے رکھے، تو یہی عمر کافی طویل بھی ہے۔ ذرا خیال کیجیے کہ ستر برس کے عرصے میں زندگی کا کتنا لطف اٹھایا جا سکتا ہے اور کیا کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ تین نسلوں کے برابر عمر اتنا طویل عرصہ ہے کہ اس میں انسان کی ساری حماقتیں چکھی جا سکتی ہیں اور انسانی دانش بھی حاصل کی جا سکتی ہے جو شخص تین نسلوں کی مدت عمر تک، فیشن کی تبدیلیوں، ضابطہ اخلاق کی تبدیلیوں اور سیاسی تبدیلیوں کو خوب خوب دیکھتا رہا ہو اسے وقت آنے پر، بڑے اطمینان سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہونا چاہیے اور اس آخری رخصت کے وقت بڑی خوش دلی سے کہنا چاہیے، ''بس بہت ہو چکا، میں نے بہت کچھ دیکھ لیا، یہ تماشا بڑا دلچسپ، بڑا عمدہ تھا!''......

آخر ہم خاک کے پتلے ہیں، خاک سے پیدا ہوئے ہیں، اور خاک ہی کے زندانی ہیں، اور یہ کوئی

تاسف کی بات نہیں یہ غم فضول ہے کہ ہمیں اس حسین دنیا میں عارضی مہمانوں کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے۔ اگر یہ دنیا اتنی حسین نہ ہوتی اور محض ایک اندھیری کال کوٹھڑی ہوتی، تب بھی ہمیں یہاں بری بھلی بسر کرنا ہی تھی، لیکن اگر یہ دنیا کال کوٹھڑی کے بجائے ایک خوبصورت جگہ ہے اور اس میں ہمیں ایک صدی کا بڑا حصہ رہنے کی اجازت مل گئی ہے تو زندگی اچھی طرح نہ گزارنا سخت ناشکری ہوگی!...... یہ سہی کہ اکثر اوقات ہم ذرا اونچا اڑنے لگتے ہیں اور ان قدموں سے لپٹی ہوئی مگر نہایت فراخدل دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پھر بھی اگر ہمیں روحانی سکون مطلوب ہے تو ہمیں اس دھرتی ماتا کے لیے، اپنے دل میں سچی محبت اور سچا لگاؤ پیدا کرنا ہوگا۔ جو ہماری روح اور ہمارے جسم کا گھر ہے۔

لہٰذا ہمیں اس دنیا کی زندگی کو اچھی طرح قبول کر لینا چاہیے جس طرح وہ ہے۔ یہ سرزمین، یہ کرہ ارض جنت کے مقابلے میں بڑی ٹھوس اور حقیقی چیز ہے۔ انسان کی خوش نصیبی ملاحظہ ہو کہ وہ اس حقیقی دنیا اور اس جنت کے مابین پیدا کیا گیا ہے۔

گویا عملی فلسفہ وہ ہے کہ جو شروع ہی میں یہ تسلیم کر لے کہ ہم روح کے ساتھ ساتھ ایک جسم بھی رکھتے ہیں۔ اور اب تو ہم میں سے کسی نہ کسی، جرات مند کو یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ بھائی آخر ہم ہیں تو حیوان ہی!!...... ڈارون کے نظریہ ارتقا اور حیاتیات کی زبردست ترقی اور کیمیا کی ترقی کے پیش نظر، یہ سچائی ثابت ہو چکی ہے اور اب یہ ماننا ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم حیوان ہیں بدقسمتی سے ہمارے استاد اور ہمارے فلسفی، نام نہاد دانشوروں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جس طرح موچیوں کو اپنے چمڑے پر غرور ہوتا ہے اسی طرح انھیں اپنی ذہانت اور عقل پر بڑا غرور ہوتا تھا۔ ہمارے روحانی پیشوا بھی روح کے بارے میں اتنے ہی مغرور تھے۔ بعض دفعہ جب ''روح'' بھی اتنی دوراز کار چیز ثابت نہ ہوتی تھی تو ان حضرات کو ''تصور'' اور ''بروز'' اور ''جوہر مطلق'' جیسے لفظوں کا سہارا لینا پڑتا تھا، تاکہ ہم لوگوں پر رعب طاری ہو جائے! چنانچہ اسی ''روحانی مشین'' کے ذریعے سے انسانی جسم کا گویا جوہر کھینچا گیا اور اسے ''روح'' قرار دیا گیا اور پھر اس ''روح'' کو مقطر کر کے اسے ''جوہر'' کہا گیا۔ اور ہم غریبوں سے امید کی گئی کہ اس جوہر کا پیالہ پی لیں اور سب کچھ بھول جائیں۔ ''روح'' کو اتنی اہمیت دینا بڑا مہلک ثابت ہوا۔ اس کی بدولت ہمیں خواہ مخواہ اپنی جبلت سے لڑنا پڑا چنانچہ مجھے سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس ''روحانیت'' کی بدولت، انسانی فطرت کو بطور کل، نہیں پرکھا جا سکا۔ یہ نظریہ حیاتیات

اور نفسیات کے نہایت قلیل علم پر مبنی تھا۔ اس نظریے کے رائج کرنے والوں کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمارے حواس، ہمارے جذبات اور ہماری جبلی خواہشیں ہماری زندگی میں کیا مقام، کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ انسان، گوشت پوست اور روح دونوں سے مل کر بنا ہے۔ یہ دیکھنا فلسفے کا کام ہے کہ جسم اور روح دونوں ہم آہنگی سے پروان چڑھیں اور ان دونوں میں پورا سمجھوتا، مکمل مفاہمت رہے۔

3- جسم اور روح

سب سے موٹی بات جو فلسفیوں کو نظر نہیں آتی وہ یہ ہے کہ انسان جسم بھی رکھتا ہے ہمارے مذہبی رہنما فانی انسان کی خامیوں سے تنگ آ کر اور ہماری حیوانی خواہشوں سے اکتا کر بعض دفعہ یہ آرزو کرتے ہیں کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح ہوتا۔ مگر یہ بات انسانی سمجھ سے بالا ہے کہ یہ نوری فرشتوں کی زندگی بھلا کیا زندگی ہوتی ہوگی۔ یا تو ہم یہ سمجھیں کہ فرشتوں کا بھی جسم ہوتا ہے اور ان کی شکل وشمائل ہم جیسی ہوتی ہے۔ صرف پروں کا اضافہ ہوتا ہے اور یا یہ کہ ان کی کوئی صورت شکل ہی نہیں ہوتی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عام طور پر فرشتے کا تصور یہی ہے کہ اس کا جسم انسان کا سا ہے مگر اس کے پر بھی ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جسم اور پانچوں حواس رکھنا فرشتوں کے لیے فائدہ مند سودا ہے۔ اگر میں فرشتہ ہو جاؤں تو میں چاہوں گا کہ میرا چہرہ نوخیز لڑکیوں کا سا ہو مگر جب تک جلد نہ ہوگی نوخیز لڑکیوں کا سا چہرہ کہاں سے آئے گا؟ اور پھر فرشتہ بن کر تو میں سنگترے کا ٹھنڈا شربت پینا چاہوں گا مگر جب تک پیاس نہ ہوگی۔ اس کا کیا مزہ آئے گا؟ اور اگر بھوک ہی نہ ہو تو کھانے کا کیا مزہ ملے گا؟ آخر ایک فرشتہ، رنگوں کے بغیر کیا تصویر کشی کرے گا؟ قوت سماعت کے بغیر کیا گا بجا سکے گا؟ اور ناک کے بغیر، شمیم صبح سے کیا لطف اٹھائے گا۔ اور جب کھجلی نہ ہوگی، تو کھجانے میں جو مزہ ملتا ہے وہ کیسے محسوس کر سکے گا؟ ایسے سکھ اور ایسے اطمینان پر خاک یا تو یہ کہ ہم جسم رکھتے ہوں اور جسم کی خواہشیں پوری ہو سکیں یا پھر ہمیں محض روح ہی عطا ہوتا کہ اسے کسی سکھ یا کسی اطمینان کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ہر اطمینان کی تہ میں ''طلب'' کا ہونا لازمی ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ کسی بھوت یا فرشتے کے لیے یہ کتنی بڑی سزا ہے کہ اس کے پاس ''جسم'' نہیں۔ وہ کسی ٹھنڈے چشمے کو دیکھتا ہے۔ مگر اس میں کودنے کے لیے اس کے پاؤں نہیں۔ اسے پانی کی خوشگوار ٹھنڈک سے کوئی خوشی کی لہر محسوس نہیں ہو سکتی۔ وہ بھوت یا فرشتہ، بھنی ہوئی مرغابی دیکھے گا مگر اسے چکھنے کے لیے اس کے

پاس زبان نہیں ہوگی۔ وہ اسے چبا نہیں سکتا۔ کیونکہ اسے دانت نہیں دیے گئے! وہ اپنے محبوب چہرے دیکھے گا مگر وہ کچھ محسوس نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ جذبات سے عاری ہے! ذرا دیکھیے یہ کتنی المناک بات ہے کہ ہم روحیں بن کر پھر اس دنیا میں آئیں اور اپنے بچوں کے کمروں میں چپ چاپ داخل ہوں۔ اپنے کسی بچے کو بستر پر کھیلتے ہوئے دیکھیں، مگر ہمارے ہاتھ نہیں کہ اسے پیار کرسکیں، بازو نہیں کہ اسے گلے لگا سکیں، ہمارا سینہ نہیں کہ اس کے جسم کی پیاری گرمی اس میں سرایت کر سکے، شانے اور گلے کے درمیان کوئی جگہ نہیں کہ اس کا ننھا سا سر وہاں ٹک سکے اور کان بھی نہیں کہ اس کی پیاری آواز بھی سن سکیں۔

رہا یہ جواز کہ فرشتوں کا جسم ہوتا ہی نہیں، تو اس کی تشریح بڑی مبہم ہے اور پھر یہ جواز اور بھی غیر تسلی بخش ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ''بھائی روحوں کی دنیا میں ہمیں ایسی انسانی خوشیوں اور اطمینان کی ضرورت نہیں ہوتی!'' میں کہتا ہوں ''اچھا نہ سہی، مگر ان کی جگہ فرشتوں کی دنیا میں اور کیا ہے؟'' اس کا جواب کچھ نہیں ملتا زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ ''ہماری روحوں کی دنیا میں مکمل خلا ہے، پورا سکون ہے پورا اطمینان ہے!'' میں سمجھتا ہوں ''اس سے کیا حاصل؟''

جواب ملتا ہے ''روحوں کی دنیا میں ہمیں کام نہیں کرنا پڑتا، وہاں درد والم مفقود ہیں!''

میں مانتا ہوں اس دنیا میں مشقت کرنے والے غلاموں کے لیے تو بڑی دلکشی ہوسکتی ہے! مگر یہ ایک منفی نصب العین ہے۔ خوشی کا یہ تصور بدھ مت کے پیروکار بھکشوؤں کو تو بھا سکتا ہے اس زمانے میں انسان کے لیے اس میں کوئی کشش نہیں۔

یہ قیاس آرائیاں بیکار سہی مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ''بے حواس روح'' کا تصور بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ ہم روز بروز یہ محسوس کر رہے ہیں کہ خود کائنات بھی ایک ذی حس وجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سکون کے بجائے حرکت ہی روح کی لازمی خصوصیت قرار دی جانی چاہیے۔ بے جسم کے فرشتے یا روح کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ ایک مرکز کے گرد چاہے تو 30 ہزار چکر فی سیکنڈ کے حساب سے گھوم سکے۔ ہوسکتا ہے کہ اس حرکت میں ہی اس روح کے لیے بے پایاں مسرت پنہاں ہو۔ اتنی مسرت جو ہمیں کسی خوبصورت جزیرے کی سیر میں حاصل نہیں ہوسکتی۔ یقیناً یہ حرکت، ایک قسم کی سنسنی، ایک قسم کے احساس کے مترادف ہوگی۔ یہ نہیں تو شاید یہ بے جسم فرشتہ، روشنی کی لہروں کی طرح خلاؤں میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کے حساب سے سفر کر

سکے گا۔ گویا اس طور سے فرشتے بھی کسی نہ کسی طرح کا کام کر کے مسرت پائیں گے۔ علوی اور روحانی رنگوں اور صداؤں کو محسوس کر سکیں گے اور آسمانی ہوائیں ان کے بے وجود گال تھپتھپا سکیں گی اگر یہ نہیں تو روح بھی بند پانی کی طرح باسی اور بری ہو جائے گی اور یا اتنی گھٹن محسوس کرے گی جتنی ہم آپ کسی نہایت گرم سہ پہر کو محسوس کرتے ہیں کہ جب ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی حدت اور تمازت کو کم کرنے کے لیے میسر نہیں آتا گویا زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ حرکت اور جذبات اور تحریک لازمی طور پر موجود رہیں چاہے ان کی شکل کچھ ہو کیونکہ زندگی مکمل سکون اور کامل بے حسی کا نام ہرگز نہیں ہے۔

4- انسانیت کے بارے میں حیاتیاتی نظریہ

اگر ہمیں اپنے جسم اور جسم کے اعضا کی حرکتوں کا خوب علم ہو اور ہمیں اپنے دماغی افعال کا بھی علم ہو جائے تو ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح ہمیں اپنی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا سچا علم ہوتا ہے۔ اسی علم کی بدولت ہم انسان کے بارے میں حیوان سن کر بدکتے ہیں کیونکہ اس طرح اس لفظ کا روایتی مفہوم اور اس مفہوم کی تلخی باقی نہیں رہتی پرانا مقولہ ہے ''جس غلطی کی سمجھ آ جائے، اسے معاف بھی کر دیا جاتا ہے'' یہ مقولہ ہمارے دماغی اور جسمانی افعال پر بھی صادق آتا ہے۔

اپنے جسمانی افعال کو بہتر طور پر سمجھنے سے ہم ان افعال کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے، مگر ہے بالکل سچ۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ ہمارا نظام ہاضمہ اعلیٰ چیز ہے یا ادنیٰ۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ ہمیں اس نظام کو سمجھنا ہے اور یہی بات سمجھ میں آ جانے پر اعلیٰ بن جاتی ہے۔ ہمارے سارے جسمانی افعال کا یہی حال ہے۔ بلکہ ہر حیاتیاتی عمل کا یہی حال ہے۔ یہ چاہے جسم کے مساموں سے پسینے کا نکلنا ہو یا جسم سے فضلے کا خارج ہونا۔ ہمارے غدودوں اور اعصاب کا کوئی فعل ہو یا ہمارے جذبات و حسیات کی کوئی کروٹ، کوئی لرزش۔ ہم ان کے نظام، ان کی ماہیت کو سمجھنا چاہتے ہیں کہ گردوں کا کام کیا ہے۔ اس زمانے میں کسی خراب دانت کو جسم کی مجموعی کمزوری کی علامت نہیں سمجھا جاتا، جو یہ منادی کرتی ہے کہ اب جسمانی توجہ کا وقت بیت گیا، اب کچھ اپنی روح اپنے روحانی اعمال کی فکر کرنی چاہیے بلکہ اب خراب دانت کا احساس ہوتے ہی ہم اپنے دندان ساز کے پاس جاتے ہیں۔ وہ اس دانت کو ٹھیک کرتا ہے تو اس دانت کی قدر ہمارے دل میں بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ اب ہمیں سیب اور مرغیاں اور گودے والی ہڈیاں چبانے میں زیادہ مزہ ملے گا۔ پرانے

وقتوں کے نازک خیال فلسفی یہ کہتے تھے کہ انسانی دانت انسانی نہیں بلکہ شیطانی ہیں۔ پھر نو افلاطونی آئے جو انسانی دانتوں کے وجود ہی سے انکاری تھے۔ جب میں کسی فلسفی کو دانت کے درد میں تڑپتا دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کوئی نشاط پسند شاعر جب بدہضمی کے مارے کراہے تو بھی عجیب سماں ہوتا ہے۔ میں اس وقت سوچتا ہوں، یہ لوگ اب بھی شاعرانہ اور فلسفیانہ موشگافیوں میں کیوں مشغول نہیں؟ اور اب اپنے سوجے ہوئے گالوں کو کیوں سہلا رہے ہیں؟ یہ اسی طرح کیوں بے چین ہیں جس طرح ایک عام مرد، ایک عام عورت جو انسانی دانتوں کو حقیقی دانت سمجھتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، خوشی اور طرب کے ترانے گانے والا یہ شاعر اب کیوں لوٹ رہا ہے؟ اب وہ ترانے کہاں گئے؟ اسے پہلے پتا نہیں تھا کہ انسان کا پیٹ اور اس کی آنتیں بھی حقیقی وجود رکھتی ہیں؟ اس وقت یہ اپنے پیٹ اور آنتوں کے فعل سے بالکل غافل ہو کر روحانی مسرتوں کے گیت گایا کرتا تھا۔ یہ غفلت کتنی سخت ناشکری ہے۔

سائنس نے اگر ہمیں کچھ سکھایا ہے تو یہ کہ اس نے ہمارے دل میں ہمارے جسم کے لیے احترام کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ اس کی بدولت ہمارے دل میں تعجب اور سربستہ رازوں کا احساس پیدا ہوا ہے۔ سائنس نے ہمیں سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ ہم کیسے وجود میں آئے۔ سائنس نے ہمیں بتایا ہے کہ ہمارا وجود خاک سے نہیں ہوا بلکہ ہم حیوانوں کے ایک لمبے شجرے کی سرفہرست ہیں۔ گویا علم حیاتیات نے انسانی شرف کو اور بھی نمایاں کیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس روئے زمین پر ہم سب سے شاندار مخلوق ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ علم حیاتیات کی بدولت اب ہمیں انسانی جسم کے حسن اور اس کے اسرار کا پورا پورا احساس ہو چلا ہے۔

اب ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے جسم کے اندر کیا کیا اعضا اور حصے، کس کس طرح ایک دوسرے سے متعلق ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں، ہمیں پتا چل گیا ہے کہ اتنی پیچیدہ مشین کا اس طرح کام کرنا بے حد مشکل بلکہ محال ہونا چاہیے تھا مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ سارا تال میل کس سادگی اور کس آسانی سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ سائنس نے، انسان کے اندرونی کیمیاوی افعال کی تشریح کر کے، انھیں ہمارے لیے آسان نہیں بلکہ انھیں اور بھی تشریح طلب بنا دیا ہے اور اب یہ حال ہے کہ عام لوگ جنھیں انسانی جسم کے اعضا کا علم اچھی طرح نہ آتا ہو۔ وہ اس کی مشکلات کا تصور نہیں کر سکتا گویا باہر کی کائنات پر اسرار کا جو پردہ پڑا ہے وہ پردگی اور سربستگی، انسانی جسم کے اندرونی رازوں کے

بارے میں بھی موجود ہے۔

انسانی جسم کے ماہرین ہمارے اعضا اور ہمارے جسم کے مختلف انواع کی حرکات اور افعال کی تشریح کرنے میں جتنا زور لگاتے ہیں، جتنی کوشش کرتے ہیں، اتنا ہی ان کی حیرت بڑھتی ہے۔حتیٰ کہ بعض ماہرین تو (جنھیں کچھ وسیع خیالات ملے ہوں) رفتہ رفتہ صوفیوں کا نقطۂ نظر قبول کر لیتے ہیں۔اس کی ایک مثال علم الاجسام کے مشہور ماہر ڈاکٹر الیکس کیرل کی ہے۔جس نے اپنا نقطۂ نظر، اپنی کتاب ''انسان...... ایک سربستہ راز'' میں واضح کیا ہے۔ممکن ہے ہمیں ڈاکٹر موصوف سے اختلاف ہو، مگر انھوں نے صرف حقائق کو پیش کیا ہے۔ان کی کوئی تشریح نہیں کی اور نہ ان کی تشریح ہو ہی سکتی تھی۔وہ لکھتے ہیں:

> ''انسانی اعضا کو عضوی رطوبتیں اور اعصاب ایک دوسرے سے ملاتے ہیں۔جسم کا ہر عنصر، دوسرے عنصر کے ساتھ مطابقت اور موافقت پیدا کر لیتا ہے۔باہمی مطابقت کا یہ فعل ایک خاص غایت، خاص مقصد کے ماتحت ہوتا ہے اگر ہم یہ مان لیں کہ ہمارے جسم کے سارے خلیے بھی اسی طرح عقل کے مالک ہیں جس طرح خود انسان ہے تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ سارے حیاتیاتی افعال ایک خاص مقصد کے ماتحت عمل میں آتے ہیں گویا جسم انسانی کے اندر، تکمیل کا وجود، ناقابل انکار بن جاتا ہے ہمارے جسم کا ہر عضو یہ جانتا ہے کہ سارے جسم کی فوری ضروریات کیا ہیں اور سارے جسم کو آئندہ کیسی ضروریات درپیش ہوں گی۔ چنانچہ ہر عضو ان فوری ضرورتوں اور آئندہ ضرورتوں کی مطابق کام کرتا ہے ہمارے ذہن کے لیے زمان اور مکان کی اہمیت خاص ہے۔لیکن ہمارے خلیوں کے لیے یہ اہمیت مختلف ہے۔ ہمارا جسم، قریب کی اشیا اور تقاضوں سے باخبر ہوتا ہے لیکن اسے مستقبل کے تقاضوں کی بھی خبر ہوتی ہے۔گویا نزدیکی اور دوری اس کے لیے الگ الگ وجود نہیں رکھتیں۔''

ہمیں یہ انکشاف سن کر بڑی حیرت ہوگی کہ ہماری آنتیں اپنے زخموں کو ہماری شعوری کوششوں کے بغیر مندمل کر لیتی ہیں۔ملاحظہ ہو:

> ''آنتوں کا زخمی حلقہ پہلے پہل تو بے حرکت ہو جاتا ہے، گویا عارضی طور پر بیکار اور مفلوج

بن جاتا ہے۔اس طور رطوبتیں معدے میں نہیں جانے پاتیں۔ساتھ یہ ساتھ آنتوں کا کوئی اور حلقہ اس زخمی حلقے کے پاس پہنچ جاتا ہے اور اپنی خاصیت کے مطابق اس کے ساتھ چمٹ سا جاتا ہے۔کوئی چار پانچ گھنٹے کے اندر اندر یہ زخم سل جاتا ہے۔وہ زخم بھی جنھیں سرجن نے سوئی سے سیا ہو۔ان کا اندمال بھی انہی رطوبتوں کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔''

آپ نے دیکھا، انسانی گوشت میں کتنی ذہانت، کتنی عقلمندی پنہاں ہے؟ تو پھر ہمیں انسانی جسم سے نفرت کیوں ہے؟ ذرا دیکھیے کہ ہمیں ایسا جسم عطا کیا گیا ہے جو اپنی پرداخت آپ کرتا ہے۔جو خود بخود اپنے آپ کو منظم رکھتا ہے، اپنی مرمت آپ کر لیتا ہے یہ جسم کی مشین ایسی ہے جو خود بخود چلنے لگتی ہے اور اپنے آپ کو (یعنی اپنے ہی جیسا ایک جسم) پیدا بھی کر سکتی ہے۔یہ مشین پیدائش کے وقت سے چلنی شروع ہوتی ہے اور ایک اعلیٰ کلاک کی طرح کوئی ستر پچھتر سال چلتی رہتی ہے اور کسی خاص توجہ کی محتاج نہیں ہوتی۔یہ ایسی مشین ہے جسے بے تار برقی کی بصیرت اور سماعت دی گئی ہے۔اس کے اعصاب کا نظام اتنا پیچیدہ ہے کہ دنیا میں کسی ٹیلی فون یا تار کا سسٹم اتنا پیچیدہ نہیں۔انسانی اعصاب سب کچھ محسوس کر کے اس کا گوشوارہ بنا لیتے ہیں، یہ گوشوارے اور فائلیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ریکارڈ رکھنے کا طریقہ اتنا اعلیٰ ہے کہ ضروری گوشوارے اور فائلیں تو بالکل قریب رکھی رہتی ہیں اور غیر اہم گوشوارے اور فائلیں دور کے کسی گوشے میں محفوظ رکھ دی جاتی ہیں، سسٹم اتنا اچھا ہے کہ تمیں تمیں برس پرانی فائلیں چشم زدن میں حاضر کی جا سکتی ہیں۔انسانی مشین بڑے کمال سے چلتی ہے۔اعضا (کل پرزوں) کی حرکت مثالی ہے۔پھر یہ کہ چلتے وقت کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی۔اگر چلتے چلتے اس مشین کو کوئی حادثہ پیش آئے، مثلاً اس کا شیشہ (آنکھ وغیرہ) ٹوٹ جائے، یا کوئی پروزہ ٹوٹ جائے تو یہ مشین از خود اس ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کے لیے گوشت پوست، رطوبتیں وغیرہ حاضر کرتی ہے۔یا کم سے کم ایک دوسرے عضو کو ٹوٹے ہوئے عضو کی جگہ طاقتور بنا کر، اس کا کام سونپ دیتی ہے۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر ایک بیکار گردہ آپریشن کر کے نکال دیا جائے تو دوسرا گردہ پھول کر اپنی جسامت بڑھا لیتا ہے تا کہ پیشاب کی ضروری مقدار جسم سے خارج کر سکے انسانی جسم ایسی مشین ہے کہ ایک درجے کے دسویں حصے تک اپنا درجہ حرارت ٹھیک رکھ سکتی ہے۔یہ مشین اپنے لیے کیمیاوی چیزیں خود بناتی ہے تا کہ خوراک کو ان کیمیاوی اشیا کے ذریعے رگ، پٹھوں، خلیوں

اور اعصاب میں تبدیل کر سکے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسانی جسم کی مشین کو زندگی کے آہنگ، اس کی لے کا سچا شعور ہے۔ اسے وقت کا پورا ادراک ہے۔ یہ مشین محض گھنٹوں اور منٹ کا ہی نہیں بلکہ برسوں کے گزرنے کا واضح شعور رکھتی ہے۔ انسانی جسم اپنے بچپن، اپنے بلوغ، اپنی پختگی کو خود کنٹرول کرتا ہے۔ اس وقت بڑھنا، پھلنا پھولنا بند کر دیتا ہے۔ جب اس کی ضرورت نہ رہے، اور پھر ایک ''عقل داڑھ'' نکالتا ہے۔ یہ دانت اس وقت نکلتا ہے جب ہمیں اس خیال ہی نہیں ہوسکتا کہ اب بھی کوئی دانت نکل سکے گا۔ گویا ہماری شعوری عقل میں ابھی مزید عقل کے اضافے کی گنجائش تھی۔ انسانی جسم، زہر کے لیے مناسب تریاق بناتا رہتا ہے اور یہ سب کچھ ایسی کامیابی اور ایسی خاموشی سے کرتا رہتا ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ یہ انسانی مشین کسی کارخانے کی طرح دنیا جہان کا شور نہیں مچاتی۔ اور پھر ہمارے نکتہ رس روحانیت پرستوں کو اتنا وقت اور اتنا سکون اور خاموشی مہیا کرتی ہے کہ وہ اپنے ''جوہر ذات'' اور ''روح رواں کے بارے میں جی بھر کے سوچ سکیں اور جس جسم کی بدولت انھیں یہ فرصت میسر آئی ہے اسے کوس سکیں۔

5- حیات انسانی: ایک نظم

میں سمجھتا ہوں کہ حیاتیاتی نقطہ نظر سے انسانی زندگی بالکل ایک نظم کی طرح ہے۔ اس کا اپنا وزن، اور اپنی بحر ہے۔ اس کے بناؤ بگاڑ کے چکر اپنے ہیں! یہ نظم معصوم بچپنے سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد بلوغ کا کڈھب زمانہ آتا ہے جب پختہ کار سماج کے ساتھ پنپ سکنے کی کڈھب کوششیں کی جاتی ہیں پھر یہ بلوغ، پوری جوانی میں بدلتا ہے۔ جو گہری سرگرمی اور مصروفیت کا زمانہ ہے۔ جب تجربے سے سبق حاصل ہوتے ہیں اور انسان دوسرے انسانوں اور انسانی فطرت کے بارے میں بہت کچھ سیکھتا ہے۔ پھر ادھیڑ عمری کے دن آتے ہیں تو تناؤ میں کچھ آسودگی آ جاتی ہے اور آدمی کا کردار پکے ہوئے پھل، یا سالخوردہ شراب کی طرح کچھ دھیما پن، کچھ گہرائی، کچھ پختگی حاصل کر لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ انسان زیادہ روادار، زیادہ حقیقت بین ہو جاتا ہے اور زندگی کے بارے میں اس کے نظریہ میں حلم اور رواداری کا پہلو نمایاں ہونے لگتا ہے پھر زندگی کی شام آتی ہے اور ہمارے جوانی والے غدود اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں اور اگر ہمارے سامنے بوڑھے ہونے کا کوئی صحیح نظریہ رہا ہے اور ہم نے اپنی زندگی کو اس نظریے کے مطابق بسر کیا ہے، تو شام زندگی کا یہ وقفہ، یہ بڑھاپا، بڑے امن و

سکون، بڑے حفظ و امان، بڑی فرصت اور بڑے اطمینان کا زمانہ ہوتا ہے پھر زندگی کا شعلہ بجھ جاتا ہے اور آدمی ابدی نیند سو جاتا ہے جس سے وہ کبھی بیدار نہیں ہوگا۔

ذرا زندگی کے اس آہنگ، اس لے کا حسن ملاحظہ کیجیے۔ اس میں وہی حسن آہنگ ہے جو اعلیٰ پائے کے نغموں میں ہوتا ہے۔ بالکل ان نغموں کی طرح ایک مرکزی خیال، کشمکش کے تان پلٹے اور پھر اختتامیہ (سنچاری)...... عام انسانی زندگی میں بھی یہی چکر چلا کرتے ہیں البتہ یہاں گانے والا اور سننے والا ایک ہی ہوتا ہے۔ بعض انسانوں کے نغمہ زندگی میں بے آہنگ سر زیادہ ہو جاتے ہیں اور یہ اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ اصل نغمہ بھی دب کر رہ جائے۔ بعض اوقات سروں کی یہ بے آہنگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ نغمہ جاری نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ایسا شخص اپنے آپ کو گولی مار لیتا ہے یا دریا میں ڈوب کر خودکشی کر لیتا ہے مگر اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس نے اپنے مقصد حیات (نغمہ زندگی کے اصلی خیال) پر خود اختیاری کی کمی کو غلبہ پا لینے دیا تھا ورنہ عام انسانی زندگی ایک باوقار آہنگ کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔ ہم میں سے بعض دفعہ بعض لوگ بے صبرے اور جلد باز ثابت ہوتے ہیں اور چونکہ ان کی لے اور تال صحیح نہیں ہوتی۔ اس لیے ان کا نغمہ زندگی ہمارے کانوں کو بھلا نہیں لگتا ہمیں تو اپنے نغمہ زندگی کے لیے گنگا کا سا باوقار آہنگ چاہیے، جو آہستہ آہستہ اور ازل سے لے کر آج تک خاموشی سے بہتی ہوئی سمندر میں جا ملتی ہے۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ زندگی، اپنے بچپن، اپنی جوانی اور اپنے بڑھاپے کے ساتھ ایک خوبصورت ضابطہ نہیں ہے آخر دن کی بھی تو صبح، اور دوپہر اور شام ہوتی ہے۔ ہر سال کے اپنے بدلتے موسم ہوتے ہیں۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔ زندگی میں کوئی چیز اچھی یا بری نہیں۔ بات اتنی ہے کہ ہر چیز اپنے وقت اور اپنے موسم کے مطابق اچھی ہوتی ہے۔ اگر ہم اسی حیاتیاتی نظریے پر عمل کر کے وقت اور موسم کا لحاظ رکھیں۔ اور اس کے مطابق زندگی بسر کریں تو زندگی ایک نظم کی طرح بسر کی جا سکتی ہے۔ اس سے انکار کرنے والا یا تو کوئی خود پسند احمق ہوگا، یا کوئی کٹر تصور پرست جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ شیکسپیئر نے زندگی کی اس نظم کو اپنے ایک مشہور پیراگراف میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ اس میں اس نے زندگی کے سات حصے کئے ہیں...... کئی ایک چینی مصنفین نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ شیکسپیئر کو مذہب سے کوئی دلچسپی یا خاص سروکار نہیں تھا۔ یہ اس کی عظمت ہے کہ اس نے زندگی کے حقائق پر نظر رکھی اور نظام زندگی میں اتنی ہی کم

مداخلت کی جتنا کم دخل در معقولات وہ اپنے کرداروں کی تصویر کشی میں کرتا تھا۔ اصل میں شیکسپیئر خود فطرت کی طرح تھا جو اسباب اور اشیا پیش کرتی ہے لیکن اپنا آپ ان کے روپ میں ظاہر نہیں کرتی۔ غالباً ہم ایک ادیب یا ایک مفکر کی سب سے بڑی تحسین یہی کر سکتے ہیں کہ وہ فطرت کے مثل ہے گویا شیکسپیئر نے زندگی بسر کی، زندگی کا مطالعہ کیا، اور پھر وقت آنے پر اس دنیا سے چپ چاپ رخصت ہو گیا۔



تیسرا باب

ہمارا حیوانی ورثہ

1- بندر والی داستان

زندگی کا حیاتیاتی نظریہ، ہمیں زندگی کے حسن اور آہنگ کا احساس تو ضرور دلاتا ہے مگر ہمیں ہماری مضحکہ خیز حد بندیوں کا شعور بھی بخشتا ہے۔ یہ نظریہ ہمیں ہماری اصل تصویر دکھا کر بتاتا ہے کہ ہم حیوان کی حیثیت سے کیا ہیں۔ اور اس کی بدولت ہم اپنے آپ کو، انسانی معاملوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ہمیں انسانی فطرت کی بہتر سوجھ بوجھ اور انسانی فطرت کے لیے زیادہ گہری ہمدردی نصیب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس نظریے کی بنیاد ہماری حیوانی جبلت اور اصلیت پر ہے۔ حیاتیاتی نظریہ ہمیں چپکے سے یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ ہم وحشی انسانوں کے بیٹے ہیں اور یہ وحشی انسان وہ تھے جو ایک خاص قسم کے بندر کی اولاد تھے۔ چنانچہ س شعور سے ہمیں اپنی خامیوں اور اپنی کمزوریوں پر ہنسنے کا موقع ملتا ہے۔ ساتھ ہی ہمیں اپنی بندروں کی سی مستعدی اور چالاکی پر ناز سا بھی محسوس ہونے لگتا ہے۔ انسانی زندگی بھی کیا عجیب تماشا ہے اس خیال کو کلیرنس ڈے نے اپنے مقالے ''بندر نما انسانوں کی دنیا'' میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے بھائیوں، ان اشتہار بازوں، ان محتسبوں، فاشٹ قسم کے ایڈیٹروں، نازیوں، اسمبلی کے ممبروں ور قانون بنانے والوں، آمروں، اقتصادی ماہروں اور بین الاقوامی کانفرنسوں کے مندوبوں، غرضیکہ سب یسے لوگوں کو معاف کر سکتے ہیں جو دوسروں کے معاملات میں دخل دینا اپنا فرض گردانتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو س لیے معاف کر دیتے ہیں کہ ہم ان کی فطرت کو سمجھنے لگتے ہیں۔

ان معنی میں یہ عظیم چینی روایت اور بھی زیادہ معنی خیز بن جاتی ہے کہ انسانی عقل بندر کی ہے اور اس روایت کے لیے میرے دل میں زیادہ سے زیادہ جگہ پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس نقطہ نگاہ سے انسانی ترقی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس روایت کے مطابق بندر انسانی عقل اور ذہن کی علامت ہے۔ سؤر ہماری

حیوانی خصلت کا نمائندہ ہے۔ بھکشو ہماری سوجھ بوجھ کا نمائندہ ہے اور پروہت دانش اور آسمانی راستے کی علامت ٹھہرتا ہے۔ پروہت اس عجیب قافلے کے ساتھ چین سے ہندوستان گیا تھا تاکہ بدھ مت کے مقدس صحیفے حاصل کر سکے انسانی ترقی کی کہانی بھی اس بے ڈھنگے قافلے کی طرح ہے۔ یہ خام کار قافلے والے ہر قدم پر اپنی حماقت اور اپنی شرارتوں کی وجہ سے، نئے نئے خطرے مول لیتے تھے اور عجیب عجیب مشکلوں میں گھر گھر جاتے تھے، چنانچہ قافلہ سالار پروہت کو بار بار شرارتی بندر کو اور بندہ نفس سؤر کو سزا دینی پڑتی تھی۔ ان کی قدم قدم پر اصلاح کرنی پڑتی تھی۔ بندر اور سؤر دونوں اپنے نیم پخت ذہنوں اور سفلی جذبات کی وجہ سے طرح طرح کی مصیبتیں مول لیتے تھے۔ چنانچہ انسانیت اپنے کمال اور ولایت کی منزل کی طرف جو سفر کر رہی ہے، اس میں ہر گام انسانی خامیاں مثلاً غصہ، انتقام، بے صبری، نفس پرستی، کینہ پروری اور سب سے بڑھ کر خود پسندی اور تکبر انسان کے قدم پکڑتی ہیں، انسان کی کارکردگی بڑھتی جارہی ہے اور اس کارکردگی کے ساتھ ساتھ تباہی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ کیونکہ چینی داستان کے طلسمی بندر کی طرح ہم میں یہ قوت پیدا ہوتی جارہی ہے کہ ہم بادلوں پر چل سکیں، ہوا میں قلابازیاں لگا سکیں (اسے جدید زمانے میں ہوائی مشقیں کہا جاتا ہے) بندروں کی سی ٹانگوں سے بال نوچ نوچ کر دشمنوں کو زچ کرنے کے لیے ان سے نئے بندر بنا ڈالیں، جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور جنت کے داروغے رضوان کو ایک طرف ہٹا کر جنت میں داخل ہو کر دیوتاؤں کی محفل میں شریک ہونے کا حق مانگیں۔

یہ بندر چالاک تو ضرور تھا مگر خود پسند بھی تھا۔ اسے یہ ترکیب تو آتی تھی کہ زبردستی جنت میں جا داخل ہو لیکن اس میں اتنا توازن اور اتنا شعور نہیں تھا نہ اتنی رواداری تھی کہ جنت میں آرام سے رہ بھی سکے۔ یہ مانا کہ وہ جنت میں اس دنیا اور اس کی فانی زندگی سے کہیں بہتر حالت میں تھا مگر وہ ابھی جنت اور دیوتاؤں کی مجلس کی قابل نہیں تھا۔ اس میں ناپختگی، شرارت اور بغاوت تھی۔ سونے میں کچھ کھوٹ باقی تھا۔ چنانچہ جنت میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک اودھم مچا دیا اور ہر کسی کو خوف زدہ کر دیا۔ اپنی فطری شر پسندی کی وجہ سے اس نے اس سالانہ دعوت کو بھی پلٹ کر دیا جو مغربی ملکہ افلاک نے، سارے دیوتاؤں، ولیوں اور زندہ جاوید جنتیوں کی عزت میں کر رکھی تھی۔ اصل میں اسے یہ ملال تھا کہ اسے اس دعوت میں کیوں مدعو نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس نے ایک خدائی پیغامبر کا بہروپ بھرا اور جب ننگے پاؤں والی پری نے اس سے دعوت گاہ کا پتا پوچھا تو اس نے کہا

کہ دعوت گاہ تبدیل کر دی گئی ہے اور اس پری کو کسی دوسری جگہ بھیج دیا۔ پھر اس نے خود ننگے پاؤں والی پری کا بہروپ بھرا اور اس کی جگہ خود دعوت گاہ میں پہنچا تو وہ پہلا ''مہمان'' تھا جو دعوت میں آیا تھا ابھی اور کوئی مہمان نہیں پہنچا تھا۔ صرف نوکر چاکر موجود تھے جو غلام گردشوں میں طلسمی شراب کی حفاظت پر مامور تھے۔ یہاں پہنچ کر بندر میاں ایک کیڑا بن گئے جس کے کاٹنے سے غشی اور نیند طاری ہو جاتی ہے۔ کیڑا بن کر اس نے سب خادموں کو ڈس کر انھیں بے ہوش کر دیا اور ساری طلسمی شراب پی گیا۔ نشے میں چور ہو کر وہ دعوت کے بڑے ہال میں پہنچا اور سارے آسمانی پھل چٹ کر گیا۔ باقی مہمان جب آئے تو انھوں نے دیکھا کہ سارا معاملہ ہی چوپٹ ہے۔ اس وقت بندر میاں کسی اور کارنامے کے لیے جا چکے تھے، یعنی لاؤنس کے گھر جا کر، بقا کی مقدس گولیاں کھانے کی فکر میں تھے...... آخر میں وہ جنت سے رخصت ہو گئے۔ کچھ اس ڈر سے کہ نہ جانے ان سارے کارناموں کی کیا سزا ملے اور کچھ اس غصے کے مارے کہ اسے دیوتاؤں کے اس سالانہ عشائیے میں بلایا کیوں نہیں گیا۔ بندروں کی دنیا میں واپس آ کر یہ بادشاہ بن گیا اور اس نے جھنڈا بلند کیا جس پر یہ الفاظ تھے ''ہمارا قطب الاقطاب ہم پایہ خدا ہے!''...... چنانچہ آسمانی فوجوں اور بندروں کی فوجوں کے درمیان خونریز لڑائیاں شروع ہو گئیں، اور یہ بڑا بندر اس وقت گرفتار ہوا جب رحم کی دیوی نے اسے بادلوں میں سے پھولوں کی چھڑی ماری اور اسے بے ہوش کر دیا۔

گویا اس داستان والے بندر کی طرح ہم ہمیشہ بغاوت کرتے رہتے ہیں۔ ہم میں اس وقت تک کوئی امن کا جذبہ اور کوئی عاجزی پیدا نہیں ہوتی۔ جب تک رحم کی کوئی دیوی، پھولوں کی بارش کر کے ہمارے قدم ڈگمگا نہیں دیتی سچ تو یہ ہے کہ جب تک سائنس، اس کائنات کی ساری حدود نہ چھان لے۔ ہم میں فروتنی اور انکسار پیدا نہیں ہوگا۔ کیونکہ بندر کی اس چینی داستان میں کہا گیا ہے کہ جب یہ بندر پکڑا گیا تو اس وقت بھی وہ باغی تھا۔ اس نے شہنشاہ افلاک سے مطالبہ کیا تھا کہ اسے دوسرے دیوتاؤں کے مقابلے میں اونچا درجہ اور خطاب دیا جائے! اس نے عاجزی اسی وقت اختیار کی جب وہ مہاتما بدھ یا غالباً خود خدا سے وہ شرط ہار گیا شرط یہ تھی کہ اگر وہ اپنی طلسمی طاقتوں کے بل پر زمین کے آخری کونے تک جانے میں کامیاب ہو گیا تو اسے ''قطب الاقطاب'' ''ہم پایہ خدا'' کا لقب دیا جائے گا۔ لیکن اگر وہ ہار گیا تو پھر وہ پوری طرح ہتھیار ڈال دے گا۔ چنانچہ بندر نے ہوا میں ایک زقند لگائی اور ملکوں بجلی کی سی تیزی سے سفر کرتا رہا۔ آخر وہ ایک پہاڑ پر پہنچا

جس کی پانچ چوٹیاں تھیں۔ اسے یہ خیال آیا کہ شاید یہی وہ حد ہے۔ جہاں تک فانی مخلوق پہنچ سکی ہوگی۔ اس جگہ پہنچنے کا ثبوت دینے کے لیے اس نے درمیانی چوٹی کے قدموں میں پیشاب کر دیا اور اپنے کارنامے سے مطمئن ہو کر واپس ہوا تا کہ مہاتما بدھ کو اس کا حال بتائے۔ اس پر بھگوان بدھ نے اپنی ایک مٹھی کھولی اور کہا کہ میرے ہاتھ کی درمیانی انگلی کی جڑ کے قریب اپنے اس پیشاب کی بو سونگھو جو تم نے درمیانی چوٹی کے دامن میں کیا تھا۔ بھگوان بدھ نے اسے بتایا کہ تم تو سارا عرصہ میری اس مٹھی سے ہی باہر نہیں نکلے...... اس پر بندر کی سٹی گم ہوگئی اور اس نے عاجزی اختیار کی۔ اسے پانچ سو سال ایک چٹان کے ساتھ زنجیروں میں باندھا گیا اور آخر پروہت نے اسے چھڑایا اور اسے اپنے قافلے میں شامل کر لیا تا کہ ہندوستان سے مقدس صحیفے لائے جائیں۔

مگر یہ بندر جو ہمارا اپنا مظہر ہے، اپنی خود پسندی اور شرارت کے باوجود پیار کرنے کے قابل ضرور ہے۔ ہمیں انسانیت سے اس کی تمام تر کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود پیار کرنا چاہیے۔

2- انسان کی تخلیق

ہم بڑے چالاک اور طباع ہیں اور اپنی ذہانت پر ہمیں فخر بھی محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمیں شعور عطا کیا گیا ہے مگر اس مرحلے پر ہمیں حیاتیات کے ماہر بتاتے ہیں کہ شعور اور ذہن (نفس) ہمیں بہت بعد میں عطا ہوا اور ہم جسے نفس اخلاقی کہتے ہیں اس میں کچھ حیوانی یا بہیمی خواہشات بڑی قوی ہوتی ہیں۔ چنانچہ حیاتیات کی ان معلومات کی وجہ سے ہمیں انسانی ذہن کے بارے میں بہت کچھ پتا چلتا ہے۔ مثلاً ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ یہ ذہن انسانی جس پر ہم اتنا ناز کرتے ہیں، بڑی محدود اور ناکافی سی چیز ہے۔ پھر انسانی کھوپڑی کی ساخت میں صدیوں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ریڑھ کی ہڈی کا ایک بڑھا ہوا حصہ ہے اس لیے ریڑھ کی ہڈی کی طرح اس کا کام بھی یہ ہے کہ خطرے کا خدشہ محسوس کرے، خارجی حالات کا سامنا کرے اور زندگی کا جوہر محفوظ کرے تو گویا اس کا کام سوچنا نہیں۔ یوں بھی غور و فکر کا کام انسانی دماغ کے بس کا روگ نہیں۔ انگریز مدبر لارڈ بالفور کا یہ قول آئندہ نسلوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ''انسانی دماغ بھی کھانا ڈھونڈنے کا ایسا ہی ایک عضو ہے جس طرح سؤر کی تھوتھنی ہوتی ہے!'' یہ کوئی تلخ بات نہیں۔ بلکہ اس کی تہ میں تو یہ نظر آتا ہے کہ یہ کہنے والا انسانوں سے اچھی طرح واقف ہے!

جدید سائنس کی روشنی میں اب ہمیں آہستہ آہستہ معلوم ہوتا جا رہا ہے کہ انسان میں کتنی خامیاں موجود ہیں۔ مگر کیا کیا جائے، خدا نے ہمیں بنایا ہی خامکار اور نامکمل ہے چنانچہ یہ بات بحث طلب بھی نہیں رہتی۔ اصل یہ ہے کہ ہزاروں صدیاں پہلے ہمارے آباؤ جداد زمین پر رینگتے تھے یا ایک شاخ سے دوسری شاخ پر جھولتے پھرتے تھے۔ یا لنگوروں کی طرح ایک ہاتھ کے سہارے یا محض دم کے سہارے کسی درخت سے لٹکتے رہتے تھے انسانی ارتقا کی تاریخ کا یہ ہر دور اپنی جگہ مکمل تھا اور میں اسے حیرت انگیز طور پر مکمل سمجھتا ہوں مگر اب انسانی ارتقا کے نئے موڑوں پر پہنچ کر ہمیں پھر سے اپنی جگہ بنانے اور نئی نئی مفاہمتیں کرنے کا کٹھن کام ہر آن درپیش رہتا ہے۔

انسان جب ایک تہذیب کو جنم دیتا ہے تو وہ ترقی کے ایسے راستے پر چل نکلتا ہے، جہاں تک فطرت کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے اور فطرت سے سمجھوتا کر لینے کا تعلق ہے، ہر جاندار شے اس میں بڑا کمال رکھتی ہے، کیونکہ جو مخلوق فطرت سے ہم آہنگ نہ ہو سکے، فطرت اسے ختم کر دیتی ہے مگر یہ کام تو ہو لیا، اب ہمیں فطرت کے ساتھ ایک ہونے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہماری بنیادی ضرورت تو اب یہ ہے کہ ہم اپنے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ یعنی اس چیز سے مفاہمت کر سکیں جسے ہم ''تہذیب و تمدن'' کہتے ہیں جبلی تقاضوں کو لیجیے۔ اپنی جگہ ہر جبلت بڑی صحت مند تھی مگر آج کے متمدن معاشرے میں ہم ان فطری تقاضوں کو وحشیانہ تقاضے کہتے ہیں لیکن جانوروں کو دیکھیے۔ ہر چوہا کچھ نہ کچھ چوری کرتا ہے مگر وہ چوری کی وجہ سے بداخلاق یا بااخلاق قرار نہیں پاتا کیونکہ چوری اس کی جبلت کا تقاضا ہے۔ ہر کتا بھونکتا ہے اور ہر بلی شام کو گھر واپس نہیں آتی اور جو ہاتھ آئے، توڑ پھوڑ ڈالتی ہے۔ شیر خون کرتا ہے۔ گھوڑا خطرے سے بدکتا ہے اور کچھوا دن کا زیادہ حصہ سو کر گزارتا ہے پھر یہ کہ ہر چرندہ، ہر رینگنے والا جانور، ہر حیوان سب کے سامنے اپنے بچے جن لیتے ہیں۔ گویا ہماری تہذیب کے اعتبار سے ہر چوہا چور ٹھہرا، ہر کتا شوریدہ سری کا مرتکب ہوا، ہر بلی بے وفا ہوئی اور ہر شیر قاتل، ہر گھوڑا بزدل، ہر کچھوا کاہل قرار پایا۔ اسی طرح ہر پرندہ چرندہ بداخلاق ٹھہرا کیونکہ وہ اپنے قدرتی تقاضوں اور فطری کاموں کو سب سامنے پورا کرتا ہے ملاحظہ ہو ہمارے جانوروں سے انسان بننے میں ساری کی ساری قدریں کیسے یک دم بدل کر رہ گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہی سوچتے رہتے ہیں کہ خدا نے ہمیں اتنا خامکار اور غیر مکمل کیوں بنایا۔

3- انسان فانی ہے

انسانی جسم فانی ہے مگر اس کے فانی ہونے کے نتیجے بڑے دوررس ہیں۔ پہلا نتیجہ تو یہی ہے کہ ہم فانی ہیں، ہمیں بقا نہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ ہمارے ساتھ پیٹ لگا ہوا ہے، ہمارے رگ پٹھے مضبوط ہیں اور ہمارا ذہن تجسس اور کرید سے مالا مال ہے۔ ہماری ان خصوصیات نے ہماری تہذیب کی نہج اور نوعیت پر زبردست اثر ڈالا ہے۔ یہ باتیں بڑی عیاں ہیں۔ اسی لیے ہم نے ان کے بارے میں سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی مگر یہ یاد رہے کہ ہم جب تک ان نتائج پر غور نہیں کرتے انسان اور انسانی تہذیب کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

مجھے شبہ ہے کہ جمہوریت اور شاعری اور فلسفہ کبھی اس حقیقت پر مبنی نہیں کیے گئے کہ انسان چاہے بادشاہ ہو، یا فقیر، بس پانچ چھ فٹ کے ایک پتلے کا نام ہے جسے اس دنیا میں کوئی ساٹھ ستر برس زندہ رہنا ہے۔ بظاہر ہمارا یہ نظام بڑا سیدھا سادہ ہے۔ قد وقامت کے اعتبار سے انسان (جانداروں میں) نہ بہت چھوٹا ہے نہ بہت بڑا۔ کم سے کم میں تو اپنے پانچ فٹ چار انچ کے قد سے بے حد مطمئن ہوں پھر ساٹھ برس کی عمر میرے نزدیک بہت لمبی عمر ہے۔ اس دوران میں دو تین نئی نسلیں پروان چڑھ سکتی ہیں۔ یہ اہتمام موجود ہے کہ جب ہم پیدا ہوں تو ہم اپنے باپ دادا کو دیکھیں جو اپنا وقت آنے پر رخصت ہو جاتے ہیں۔ وقت آنے پر ہم بھی دادا بنتے ہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے نواسے پوتے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نظام بڑا باقاعدہ، بڑا مکمل ہے۔ اس چینی مقولے میں اصل دانش کی روح ہے کہ ''ہوسکتا ہے آپ ایک ہزار ایکڑ رقبے کے واحد مالک ہوں۔ پھر بھی آپ پانچ فٹ لمبے بستر ہی سوئیں گے!'' میں سمجھتا ہوں ایک بادشاہ کو بھی زیادہ سے زیادہ سات فٹ لمبے بستر کی ضرورت ہوگی۔ جہاں وہ رات کو لمبا لیٹ کر سو سکے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں بھی بادشاہ ہوں۔ یہ زندگی کی بات ہے۔ چاہے آپ کتنے امیر ہوں، انجیل مقدس کی رو سے تو آپ زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر برس جئیں گے۔ کم لوگ ہی ایسے ہیں جو اس حد کو پار کرتے ہیں اور ان بزرگوں کو چینی زبان میں ''نادر و قدیم'' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ چینی کا مشہور مقولہ ہے کہ ''قدیم زمانے سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ انسان ستر برس کی عمر کے بعد کم ہی جیا کرتا ہے۔''

یہی حال دولت کا ہے۔ اس زندگی سے ہر ایک کا کچھ حصہ ملتا ہے مگر کسی کے پاس زندگی کا رہن نامہ

نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ہم اس زندگی کو زیادہ اہم، زیادہ سنجیدہ نہیں سمجھتے۔ ہم اس روئے زمین پر موروثی اور دائمی مزارعین نہیں ہیں۔ ہم تو یہاں عارضی مہمان ہیں۔ گویا اصل میں زمین دار یا مالک کا لفظ وہ مفہوم نہیں رکھتا جو ہم سمجھتے ہیں۔ یہاں کوئی شخص حقیقت میں نہ کسی مکان کا مالک ہے نہ زمین کے کسی ٹکڑے کا۔ ایک چینی شاعر کہتا ہے:

دامن کوہ میں دیکھو یہ سنہری کھیتی
ہم نے جو بویا یہاں، دوسرے کاٹیں گے اسے
وہ بھی اس خرمن و حاصل پہ نہ اترائیں کہ یاں
دوسرے ان کی جگہ، جلد ہی آ جائیں گے

افسوس کہ موت کی جمہوریت کو کم کم ہی پہچانا گیا ہے اگر موت نہ آتی، تو نپولین کے لیے جزیرہ سینٹ ہلینا کی بھی کوئی اہمیت نہ ہوتی اور پھر نہ جانے یورپ کا کیا حال ہوتا اگر موت نہ آئے تو دنیا میں کسی نامور شخص، کسی فاتح کی سوانح حیات نہ لکھی جاتی اور اگر کوئی لکھتا بھی تو اتنی ہمدردی اور رواداری سے کام نہ لیتا جو آج کے سوانح نگاروں کا معمول بن چکی ہے۔ ہم اس دنیا کے بڑے آدمیوں کو اس لیے معاف کر دیتے ہیں کہ وہ مر چکے ہوتے ہیں اور ان کی موت کی وجہ سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ان کا معاملہ طے ہو چکا۔ سو اب انھیں معاف ہی کر دینا چاہیے۔ یوں سمجھیے کہ ہر جنازے کے ساتھ یہ جھنڈا ہوتا ہے کہ ''سب انسان برابر ہیں۔''

موت کی اسی جمہوریت سے انسانی زندگی کے ایک تماشا ہونے اور اس کی گہری شعریت کا، اس کے فلسفے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص موت کی بصیرت حاصل کر لے، اسے انسانی زندگی کے ایک تماشا ہونے کی بصیرت بھی مل جاتی ہے اور وہ سچا شاعر بن جاتا ہے۔ شیکسپیئر نے اپنے لافانی کردار ہملٹ کے منہ سے سکندر کی خاک کے بارے میں جو باتیں کہلوائیں، ان سے شیکسپیئر کی صداقت شعری پر مہر لگ جاتی ہے۔ ''سکندر مرا اور اسے زمین میں دفن کر دیا گیا، اس کا جسم خاک میں مل کر خاک ہو گیا۔ اس مٹی سے ہم ایک ڈھیلا بنا لیتے ہیں اور سکندر کی خاک کا یہ ڈھیلا، ایک ڈاٹ کے طور پر، شراب کے مٹکے کے منہ پر لگا دیا جاتا ہے!'' ذرا شیکسپیئر کے ڈرامے رچرڈ دوم کو دیکھیے۔ شاہ رچرڈ قبروں اور کیڑوں اور کتبوں اور اس تاج کے نگینے

کا ذکر کرتا ہے۔ جو بادشاہ کی فانی کنپٹیوں پر دھرا رہتا ہے یا پھر جب وہ ایک بہت بڑے جاگیردار کا ذکر کرتا ہے جو اب اپنے قوانین، اپنے اختیارات، مراعات، اپنے جرمانوں سمیت محض خاک کا ایک ڈھیر ہے۔ فارسی حکیم وشاعر عمر خیام اور اس کے چینی ساتھی چیانوشی کا یہی حال تھا۔ ان کی ساری دل لگی اور ان کے طربیہ احساس اور تاریخ کا مذاق اڑانے کی عادت نے اسی احساس فنا ہی سے جنم لیا تھا اور وہ یہی کہتے رہے کہ دیکھو یہ شاہوں کی قبریں ہیں جن میں اب گیدڑوں نے اپنے بھٹ بنا رکھے ہیں! چینی فلسفے میں تو گہرائی اور لطافت ہی چوانگ زے کی بدولت پیدا ہوئی، جس نے اپنے سارے فلسفے کی بنیاد انسانی کھوپڑی کے ذکر پر رکھی ہے ملاحظہ ہو:

''چوانگ زے شہر چاؤ گیا۔ وہاں اس نے ایک کھوکھلی اور پرانی کھوپڑی دیکھی۔ چوانگ زے نے اس کھوپڑی کو اپنی چابک سے ٹکورا اور پوچھا۔ ''تمہارا یہ حال اس لیے ہوا کہ تم عیش ونشاط کے بندے تھے اور تم نے زندگی بے اعتدالی سے گزاری؟ کیا تم کوئی فراری تھے جو قانون کی زد سے بچنا چاہتا تھا؟ یہ نہیں تو کیا تم نے کوئی ایسا کام کیا تھا جس سے تمہارے والدین اور تمہارے خاندان کی نیک نامی کو بٹا لگا؟ شاید تم فاقوں کی موت مرے؟ ہوسکتا ہے کہ تم پوری عمر کو پہنچ کر مرے اور تمہاری موت طبعی موت تھی؟ آخر بات کیا ہے؟''

ان سوالات کے بعد چوانگ زے نے کھوپڑی کو اٹھا کر اپنے سر کے نیچے بطور تکیہ رکھ لیا اور گہری نیند سو گیا۔

جب چوانگ زے کی بیوی کا انتقال ہوا، تو کوئی شخص اس کے پاس فاتحہ کے لیے گیا۔ اس نے دیکھا کہ چوانگ زے فرش پر مزے سے بیٹھا ہے اور دف بجا بجا کر گا رہا ہے۔ اس شخص کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے کہا۔ ''بھائی آخر مرنے والی ایک عمر تمہارے ساتھ رہی، وہ تمہارے بچوں کی ماں تھی۔ زیادہ سے زیادہ سنگدلی یہ ہوتی ہے کہ تم اس کی موت پر آنسو نہ بہاتے۔ لیکن یہ تو حد ہوگئی کہ تم مزے سے گا بجا رہے ہو!''

چوانگ زے نے جواب دیا۔ ''سنو میاں، تم غلطی پر ہو، جب میری بیوی مری تو پہلے پہل تو

مجھے بڑا صدمہ ہوا اور مجھ پر اس کی موت کا بڑا اثر ہوا۔ پھر میں نے سوچا، پیدا ہونے سے پہلے بھی تو اس میں کوئی زندگی نہ تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس کے جسم بھی نہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی روح، اس کا بھوت بھی نہ تھا...... پھر وہ اس دنیا کے چکر میں پھنس گئی۔ پہلے اس کی روح بنی، پھر اس نے جسم پالیا اور پھر وہ زندہ ہوگئی۔ اب مرنے کے بعد اس نے اپنا قالب پھر بدل لیا ہے۔ اب وہ مر چکی ہے اور مر کہ وہ پھر بہار و خزاں، اور گرما و سرما کے ابدی چکر کے ساتھ مل گئی ہے...... میں پھر کاہے کو شور و شیون کروں جب اس کا فانی جسم تو آرام سے لحد کی آغوش میں سو رہا ہے۔ اگر میں ماتم کروں گا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ازل اور ابد کے چکر کو سمجھا ہی نہیں۔ اسی لیے میں نے رونا دھونا موقوف کر دیا!''

گویا شاعری اور فلسفہ دونوں احساس فنا سے شروع ہوئے اور وقت کے بیتنے کے احساس نے انھیں جنم دیا۔ یہی احساس فنا، چینی شاعری کی پشت پناہ ہے۔ سچ پوچھیے تو مغرب کی بیشتر شاعری کا سرمایہ بھی یہی ہے۔ یہ احساس مغربی شاعری میں بار بار ملتا ہے کہ زندگی ایک خواب ہے۔ ہم کسی خوبصورت سہ پہر کے غروب آفتاب کے وقت دریا کے دھارے پر اپنی کشتی کھیتے چلے جاتے ہیں اور یہ سوچتے رہتے ہیں کہ یہ پھول ہمیشہ شگفتہ نہیں رہیں گے۔ پورا چاند گھٹتے گھٹتے ایک پتلی لکیر سی رہ جاتا ہے اور خود انسانی زندگی پودوں اور حیوانوں کی طرح، پہلے بچپن سے پختہ عمری تک پہنچ کر، ایک دن ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح بقا کے ساتھ مل کر نئے آنے والوں کے لیے جگہ بناتی ہے! اصل میں انسان نے فلسفی ہونا اس وقت سیکھا تھا۔ جب اسے دنیاوی زندگی کے بے حقیقت ہونے کا احساس ہوا۔ کہا جاتا ہے ایک دفعہ چینی فلسفی چوانگ زے نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک تتلی بن گیا ہے۔ اس خواب میں اس نے محسوس کیا کہ وہ تتلی کی طرح اپنے ننھے پنکھ نہیں بلکہ چوانگ زے ہے، سچ مچ چوانگ زے ہے۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ کون سی بات حقیقت ہے۔ کیا یہ خواب حقیقی ہے کہ وہ تتلی ہے؟ یا وہ ایک تتلی ہے جو یہ خواب دیکھ رہی ہے کہ وہ چوانگ زے ہے؟ گویا زندگی واقعی ایک خواب ہے اور ہم فانی انسان وقت کے ابدی دریا کے دھارے پر بہے جا رہے ہیں۔ ہم ایک خاص مقام پر کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور ایک خاص مقام پر زندگی کی کشتی سے اتر جاتے ہیں تا کہ دوسرے منتظر لوگ اس کشتی میں سوار ہو سکیں۔ اگر ہم یہ محسوس نہ کریں کہ ہماری زندگی ایک خواب ہے یا یہ کہ ہم اس دنیا میں

مسافر اور مہمان ہیں یا یہ کہ ساری دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم محض اداکار ہیں جو اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں تو اس زندگی کی آدمی سے زیادہ شاعری دم گھٹ کر رہ جائے۔ چینی عالم لیوشنگ نے اپنے دوست کو ایک خط میں یہی لکھا تھا:

''عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس دنیا میں سب سے اہم اور سنجیدہ بات یہ ہے کہ ہم سرکاری افسر ہو جائیں اور سب سے معمولی بات یہ سمجھی جاتی ہے کہ ہم کسی کھیل میں اداکاری کرنے لگیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ خیال بڑا احمقانہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ سٹیج پر اداکار گاتے ہیں، روتے ہیں، ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں، ہنسی ٹھٹھا کرتے ہیں اور یہ سب کچھ اتنی سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ گویا وہ حقیقی طور پر وہی ہیں جو وہ نظر آتے ہیں۔ مگر ڈرامے میں اصل چیز یہ نہیں کہ پرانے پرانے کرداروں کو کس طرح ان اداکاروں نے پیش کیا۔ اصل چیز یہ اداکار خود ہیں۔ یہ اداکارہ بھی کسی کی اولاد ہوتے ہیں۔ کسی کے شوہر کسی کے باپ ہوتے ہیں اور یہ سب اپنے اپنے اہل وعیال اور ماں باپ کا اسی طرح ناچ گا کر اور لڑ جھگڑ کر اور مسخرہ پن کر کے پیٹ بھرتے ہیں۔ گویا جن لوگوں کا یہ کردار ادا کرتے ہیں، وہ اصل میں یہی ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ان میں بعض ایکٹر کسی افسر کا پارٹ ادا کرتے ہیں اور سچ مچ کے افسروں کی طرح وردی میں سج سجا کر یوں سامنے آتے ہیں کہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ یہ محض پارٹ کر رہے ہیں اور سچ مچ کے افسر نہیں ہیں۔ ان اداکاروں کو یہ بات ذرا بھی اہم نہیں معلوم ہوتی ہے کہ وہ سٹیج پر افسروں کی طرح اکڑ اکڑ کر چل رہے ہیں اور قیدی ان کے سامنے کانپ رہے ہیں۔ اصل میں تو انھیں اپنے گھر والوں اور ماں باپ کا پیٹ ناچ گا کر اور لڑنے جھگڑنے کا پارٹ ادا کر کے پالنا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ بعض لوگ اس دنیا کے ڈرامے میں ایک ہی پارٹ ادا کرتے کرتے ایک ہی طرح کا مکالمہ ایک ہی خاص طرز میں بولتے بولتے اس میں اتنا کھو جاتے ہیں کہ یہ پارٹ ان کے جسم و جان (یعنی فطرت اور جذبات) پر پوری طرح چھا جاتا ہے اور انھیں ایک دفعہ بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اصل میں وہ محض اداکار ہیں۔''

4- ہمارا پیٹ

ہمارے حیوان ہونے کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے جسم میں ایک اتھاہ گڑھا ہے۔ جسے پیٹ کہتے ہیں۔ اس حقیقت نے ہماری ساری تہذیب پر اثر ڈالا ہے۔ چین کے مشہور نشاطی فلسفی، لی لی وِنگ نے اسی پیٹ کی شکایت لکھی ہے۔ اس نے فن زندگی کے بارے میں لکھی ہوئی اپنی کتاب کے خوراک والے باب میں لکھا ہے:

''میں لکھتا ہوں کہ سارے انسانی اعضاء، مثلاً کان، آنکھ، ناک، زبان، ہاتھ، پاؤں یہ سارا جسم اپنے اپنے مقررہ کام کرتے ہیں۔ مگر دو عضو ایسے ہیں جو بالکل غیر ضروری ہیں۔ اور وہ ہیں منہ اور پیٹ انہی دو کی بدولت صدیوں سے انسان طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ اس منہ اور پیٹ کی وجہ سے روزی کمانے کا مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور جب روزی کمانا مشکل ہو جائے تو چالاکی اور عیاری، جھوٹ اور بددیانتی انسانی معاملوں میں راہ پا لیتی ہے۔ انسانی معاملوں میں عیاری، جھوٹ اور بددیانتی کے آ جانے سے قانون وجود میں آتا ہے۔ اور اس قانون کی بدولت یہ حال ہو جاتا ہے کہ بادشاہ اپنے رحم و کرم سے کسی کی زندگی بچا نہیں سکتا۔ ماں باپ کی محبت بے دست و پا ہو جاتی ہے یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ خدا نے جب انسانی پتلا تیار کیا اسے منہ اور پیٹ لگا دیا۔ ذرا پودوں کو دیکھیے، منہ اور پیٹ کے بغیر کیسے مزے سے زندہ ہیں۔ چٹانیں اور زمین دونوں کچھ کھائے پیے بغیر موجود ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں منہ اور پیٹ دے دیا گیا ہے، یعنی دو فالتو عضو عطا کر دیئے گئے؟ اور اگر ہمیں یہ عضو دینے ہی تھے تو ہمارے لیے یہ بھی ممکن کر دیا ہوتا کہ ہم مچھلیوں اور گھونگھوں کی طرح پانی میں تیرتے تیرتے پیٹ بھر لیتے، یا ٹڈوں اور مکڑوں کی طرح شبنم سے افزائش حاصل کر سکتے۔ آخر یہ مخلوق اس طرح قوت اور زندگی حاصل کرتی ہے یا نہیں؟ ہم بھی ایسا کر سکتے تھے۔ ہم بھی تیرتے رہتے یا اڑتے رہتے اور ادھر ادھر کودتے پھاندتے پھرتے۔ اگر یہ ہوتا تو اس زندگی میں کوئی تگ و دو، کوئی کشمکش نہ ہوتی اور انسان کی ساری مشکلیں، ساری مصیبتیں غائب ہو جاتیں مگر ہے یہ کہ اس نے ہمیں نہ صرف دو عضو دیئے

ہیں بلکہ قسم قسم کی اشتہا اور قسم قسم کی رغبت دی ہے۔ گویا پیٹ کا غار ایسا ہے کہ اتھاہ سمندر یا گہری کھڈ کی طرح کبھی پر نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ کہ ہم زندگی بھر اپنے سارے اعضا کی طاقت کے ساتھ سخت محنت کرتے رہتے ہیں تاکہ ہمارا یہ منہ اور ہمارا یہ پیٹ کسی طرح مطمئن ہو سکیں اور یہ ہیں کہ کبھی ان کی طلب پوری نہیں ہوتی۔

لیکن اب کہ ہمارے جسم میں یہ اتھاہ غار موجود ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے؟ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس پیٹ نے ساری انسانی تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا ہے۔ کنفیوشس انسانی فطرت کے بارے میں بے حد وسیع النظر تھا۔ چنانچہ اس نے انسان کی صرف دو بڑی خواہشیں بیان کی ہیں، یعنی نان نفقہ اور اولاد پیدا کرنا۔ سادہ لفظوں میں یوں سمجھیے کہ انسان کی دو بڑی خواہشیں یا حاجتیں کھانا پینا اور عورت ہیں خیر، کچھ ولی قسم کے حضرات نے عورت کے بغیر بھی زندگی گزاری ہے مگر کھانا پینا کسی سے نہیں چھوٹ سکا۔ ایسے ایسے صوفی لوگ اس دنیا میں آئے ہیں جنھوں نے ساری زندگی تیاگ اور قربانی میں بسر کر دی مگر کوئی متقی سے متقی آدمی بھی چند گھنٹے سے زیادہ کھانے کو بھول نہیں سکا۔ ہر چار پانچ گھنٹے بعد ہمیں ہمیشہ یہی خیال آتا ہے کہ اب کھانا کب ملے گا؟ اور یہ واقعہ دن میں کم سے کم تین بار ضرور ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ چار پانچ دفعہ۔ بس یہ ہے اور ہم ہیں! بڑی بڑی بین لاقوامی کانفرنسیں بے حد نازک اور دلچسپ سیاسی مسائل پر بحث کرتے کرتے دوپہر کے کھانے کے لیے ملتوی ہو جاتی ہیں۔ دنیا جہان کی پارلیمنٹوں کو کھانے کے اوقات کے مطابق اپنے اجلاس طے کرنے پڑتے ہیں۔ اگر کسی بادشاہ یا ملکہ کی تاجپوشی کی رسم پانچ چھ گھنٹے کا طول پکڑ جائے اور لوگ دوپہر کا کھانا کھا نہ سکیں تو اس تاجپوشی کو عوام کے لیے ایک مصیبت قرار دے دیا جاتا ہے گویا ہماری سوچ، کھانے کے گرد گھومتی ہے چنانچہ جب ہمیں کسی بزرگ کی خدمات کا اعتراف بھی کرنا ہو تو ہم اس کے اعزاز میں ایک دعوت ٹکا دیتے ہیں۔

اس کی خاص وجہ ہے۔ دوستوں کی ملاقات اگر کھانے پر ہو تو گویا یہ ملاقات پر امن طور پر ہوئی۔ عمدہ کھانا بحث کی تندی دور کر دیتا ہے اور اختلافات میں کوئی تیزی تلخی نہیں رہتی۔ دو بہترین دوست بھوک کے وقت اگر اکٹھے ہوں تو ان کی ملاقات ضرور جھگڑے پر ختم ہو گی مگر عمدہ دعوت کا اثر دو چار گھنٹے ہی نہیں، دنوں اور ہفتوں قائم رہتا ہے۔ چینی قوم کو انسانی فطرت سے گہری واقفیت حاصل ہے اسی لیے سارے جھگڑوں اور

اختلافات کا فیصلہ عدالت کے بجائے کھانے کی میز پر کیا جاتا ہے۔چینی زندگی کا نہج ہی ایسا ہے کہ پرانے جھگڑے اور اختلاف بھی کھانے کی میز پر طے ہوتے ہیں اور کھانے ہی پر نئے جھگڑوں کی پیش بندی کر لی جاتی ہے۔چین میں عام دستور ہے کہ بار بار دعوتیں کھلا کر سب کی اچھی طرح رائے حاصل کی جائے۔گویا یہ ایک طرح کی رشوت ہے جو نیک نامی کے لیے دیتے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ دعوتیں دینا سیاست میں کامیابی کا بڑا بے ضرر راستہ ہے اگر کوئی شخص اعداد و شمار جمع کرے تو اسے پتا چلے گا کہ زید کی مرتبے کی ترقی کی رفتار کا تعلق، ان دعوتوں کی گنتی کے ساتھ کتنا گہرا ہے جو اس نے مختلف لوگوں کو دی تھیں۔

مگر ہماری تخلیق اسی طرح ہوئی ہے کہ دعوتوں کے بارے میں ہمارا رویہ یہی ہونا چاہیے اور یہ کوئی چینیوں ہی سے مخصوص نہیں۔امریکہ میں بھی کسی محکمے کا حاکم اعلیٰ، آپ کی کوئی درخواست کیسے رد کر دے گا۔ جب اس نے آپ کے ہاں چھ سات بار دعوت اڑائی ہے آخر امریکی بھی چینیوں کی طرح انسان ہی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ امریکیوں کو انسانی فطرت کی بصیرت حاصل نہیں اور انھوں نے اس بصیرت کے مطابق، اپنی سیاسی زندگی کو اچھی طرح منظم نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں، چینیوں کی طرح دعوتیں کھلانا، ہر ملک کی سیاسی زندگی کا حصہ ہے کیوں کہ انسانی فطرت تو ہر جگہ وہی ہے اور ہم کھال کے نیچے تو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔مثلاً میں نے سنا ہے کہ جو لوگ کسی سرکاری عہدے کے امیدوار ہوں اور اپنے ضلع کے ووٹروں کے لیے کھانے پکواتے ہیں۔اور ان کے بچوں کو آئس کریم کھلا کر اور سوڈا واٹر پلا کر ماؤں کو خوش کرتے ہیں۔ اس قسم کی رشوتوں کے بعد لوگوں کا یہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ ''بھائی وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔یہی خیال بعد میں ایک گیت بن جاتا ہے۔کوئی چار پانچ سو برس پہلے یورپ کے بڑے بڑے نواب اور جاگیردار اپنی شادی یا سالگرہ کے موقعوں پر اپنے تمام مزارعوں کو بہت بڑی دعوت دیا کرتے تھے اور انھیں کھلا کھلا کر ''نیک نامی'' حاصل کرتے تھے۔

ہم پر کھانے پینے کا اثر اتنا بنیادی اور اتنا اہم ہے کہ بڑے بڑے انقلاب، امن و آشتی کے دور، جنگیں، بین الاقوامی سمجھوتے، ہماری روزمرہ کی زندگی اور ہماری ساری کی ساری معاشرتی زندگی اس سے بری طرح متاثر ہے۔ذرا یاد کیجیے۔انقلاب فرانس کی وجوہ کیا تھیں؟ کیا انقلاب فرانس، والتیئر، اور روسو اور دیدرو کی وجہ سے ہوا؟ جی نہیں! اس کی وجہ صرف خوراک تھی۔انقلاب روس اور اس انقلاب کے بعد ملک بھر میں اشترا کی

تجربے کے اسباب کیا ہیں؟ یہی خوراک کا مسئلہ اور جہاں تک جنگ کرنے کا تعلق ہے، نپولین جیسے عظیم فاتح نے اپنی گہری دانش مندی کا اس قول سے ثبوت دیا تھا کہ ''سپاہی اور فوج تو پیٹ کے بل پر لڑتے ہیں۔'' ذرا سوچیے کہ ''امن امن'' پکارنے سے کیا حاصل جب حلق کے نیچے پیٹ میں امن قائم رکھنے کی کوئی صورت نہیں جاتی قوموں اور افراد دونوں کا یہی حال ہے۔ عوام جب بھوکے ہوتے ہیں تو بڑی بڑی سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں اور بڑے بڑے جابر حکمرانوں کے تخت و تاج خاک میں مل جاتے ہیں۔ بھوک کی وجہ سے افراد کام نہیں کرتے، سپاہی لڑنے سے انکار کر دیتے ہیں، بڑے بڑے گائیک گانے سے انکار کر دیتے ہیں، پارلیمنٹ کے ممبر بحث کرنا بند کر دیتے ہیں۔ اور ملک کے صدر تک حکومت کرنے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ ذرا خیال کیجیے ایک شوہر دن بھر دفتر میں کیوں سرتوڑ محنت کرتا ہے؟ صرف اس لیے کہ شام کو گھر پر بھر پیٹ کھانا مل جائے اسی لیے تو مثل مشہور ہے کہ شوہر کے دل پر اس کے پیٹ کی راہ سے قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ جب مرد کا جسم مطمئن ہو تو اس کا دل، اس کی روح زیادہ پرسکون ہوتی ہے پھر اسے پیار محبت کی سوجھتی ہے۔ اسے بیوی زیادہ اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ عام عورتوں کو شکایت ہوتی ہے کہ ان کے شوہر ان کے بناؤ سنگار اور ان کے نئے کپڑوں تک سے اندھے اور بے پروا رہتے ہیں۔ انھیں نظر ہی نہیں آتا کہ بیوی نے آج نئے اور اجلے کپڑے پہن رکھے ہیں مگر کسی بیوی نے کبھی یہ شکایت کی کہ میاں کو سالن یا پلاؤ یا آملیٹ نظر نہیں آیا؟ حب الوطنی کیا ہے، محض ان چیزوں کی محبت جو ہمیں بچپن میں کھانے کو ملی تھیں۔ امریکہ کے لوگ اس لیے امریکہ کے وفادار ہیں کہ وہ امریکی روٹی اور امریکی پھلوں کے وفادار ہیں۔ یہی حال جرمنی کے لوگوں کا ہے! جہاں تک بین الاقوامی مفاہمت کا سوال ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اطالوی سویوں نے مسولینی کی بہ نسبت اٹلی کو کہیں زیادہ ہر دلعزیز بنایا ہے۔ ستم یہ ہے کہ باہر کے لوگوں کے دلوں میں اطالوی سویوں نے اٹلی کے لیے جو قدر پیدا کی تھی، اسے مسولینی نے ختم کر کے دم لیا تو گویا ساری بات یہ ہوئی کہ موت کی طرح کھانے کے سلسلے میں بھی سب انسان بنیادی طور پر بھائی بھائی ہیں۔

ہر چینی ایک اچھی دعوت سے پھول کی طرح کھل جاتا ہے۔ جب اس کا پیٹ بھرا ہوا اور آنتیں مطمئن ہوں تو وہ کہہ اٹھے گا: ''یہ زندگی کتنی حسین اور طربناک ہے!'' گویا چینی کے بھرے پیٹ سے ایسی روحانی خوشی کی روشنی پھوٹتی ہے جو دنیا کو جگمگا دیتی ہے۔ چینی ہمیشہ جبلت پر اعتماد کرتے ہیں اور جبلت نے انھیں بتا رکھا

ہے کہ جب پیٹ بھرا ہو تو سب ٹھیک ہے! مسرت کا چینی نصب العین یہ ہے کہ ''جسم گرم ہو، پیٹ بھرا ہو، ذرا سی تاریکی ہو، ذرا سی نرمی ہو!'' آخری دو صفات کا تعلق سیر ہو کر کھانے کے بعد نرم اور گدگدے بستر سے ہے اس لیے تو چینی شاعر کہتا ہے:

''بھرا پیٹ بڑی چیز ہے۔ باقی سب کچھ تو عیاشی ہے''

مگر اس ساری موشگافی کے باوجود، چینی لوگ کھانے کے معاملے میں کسی بناوٹ کے قائل نہیں۔ کوئی چینی اگر اچھی یخنی کا ایک چمچہ پیے گا تو زور سے چٹخارا لے گا۔ اس کے برعکس مغربی ممالک اور بعض دوسرے ملکوں میں یہ بدتمیزی سمجھی جائے گی مگر میں سمجھتا ہوں کہ مغربی آداب خوراک (جن کا تقاضا یہ ہے کہ سوپ بغیر آواز پیا جائے اور کھانا اس طرح کھایا جائے گویا بالکل مزہ نہیں آ رہا) کی وجہ سے مغرب میں اچھا کھانا پکانے کا آرٹ پنپ نہیں سکا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مغربی لوگ کھاتے وقت کیوں اتنی تمیز اور آہستگی سے بولتے ہیں اور میز پر اتنے گم سم، بڑے باتمیز اور بڑے معزز کیوں بنے رہتے ہیں؟ میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے امریکیوں کو یہ خیال نہیں آتا کہ مرغی کی ٹانگ ہاتھ میں اٹھا کر مزے سے چبا لیں۔ وہ بیچارے اس پر چھری کانٹے سے شغل فرماتے رہتے ہیں اور دل میں سخت تنگ رہتے ہیں۔ اگر کھانا اچھا ہو تو مزے لے کر نہ کھانا میرے نزدیک بہت جرم ہے۔ جہاں تک دسترخوان کے ''آداب'' کا تعلق ہے تو میرے نزدیک بچے کو زندگی کی مصیبتوں کا احساس ہی پہلی دفعہ اس وقت ہوتا ہے جب اسے ماں کھاتے وقت چٹخارا لینے سے منع کرتی ہے۔ انسانی نفسیات ہی ایسی ہے کہ اگر اپنی دلی خوشی کا اظہار نہ کیا جائے تو پھر یہ خوشی محسوس بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے ہو کر سوءِ ہضم، مالیخولیا اور ضعف اعصاب جیسے امراض گھیر لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں فرانسیسیوں کی مثال پر چلنا چاہیے جب بیرا اچھا کٹلٹ لے کر آتا ہے تو ان کے منہ سے بے اختیار ''واہ'' نکلتی ہے۔ اور جب پہلا لقمہ منہ میں جاتا ہے تو ان کے دل کا اطمینان اور خوشی ایک لمبی ''ہوں'' میں بدل جاتی ہے! بھلا کھانے کا مزاہ لینے میں شرم کی کیا بات ہے؟ اور اگر بھوک اچھی ہو اور معدہ صحت مند ہو تو اس میں برا کیا ہے؟ اسی لیے تو چینی ساری دنیا سے مختلف ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کے نزدیک ان کے کھانے کے آداب اچھے نہ ہوں اور وہ بدتمیز ہوں، مگر وہ دعوتوں اور کھانوں کا لطف ضرور اٹھا سکتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں چینی لوگ پودوں اور حیوانات کا علم اس لیے نہ سیکھ سکے اور نہ اسے ترقی دے سکے کہ کوئی

چینی عالم ایک مچھلی کی طرف ٹھنڈے دل سے دیکھ ہی نہیں سکتا۔ مچھلی دیکھ کر اسے فوراً یہ خیال آئے گا کہ اس مچھلی کا مزہ کیسا ہوگا اور پھر اسے خیال آئے گا کہ اسے کھالینا ہی بہتر ہوگا۔ اسی وجہ سے مجھے کسی چینی سرجن پر اعتماد نہیں ہے کیونکہ اگر کوئی چینی سرجن میرا گردہ کاٹ کر اس میں پتھری نکالنا چاہیے تو وہ پتھر کو بھول جائے گا اور فوراً میرا گردہ بھوننا شروع کردے گا۔ اگر کوئی چینی کسی خارپشت کو دیکھے تو اسے فوراً خیال آئے گا کہ اس کا گوشت اس ترکیب سے پکا کر کھایا جائے کہ اس کا زہر جاتا رہے۔ زہر سے احتیاط کی شرط اس لیے ہے کہ یہی اس کام کا عملی اور اہم پہلو ہے ورنہ اس کام میں کوئی مزہ نہیں۔

خارپشت کے گوشت کا نمبر دوسرا ہے کہ اس کا ذائقہ کیسا ہوگا؟ باقی کی چیزیں چینی کے لیے دلچسپی نہیں رکھتیں۔ مثلاً خارپشت کے خار کیسے پیدا ہوئے؟ ان سے خارپشت کیا کام لیتا ہے؟ یہ خار اس کی کھال میں کیسے پیوست ہیں اور وہ انھیں خطرے کے موقع پر کیسے سیدھا کھڑا کر لیتا ہے؟ وغیرہ۔ یہ سوالات ایک چینی کے نزدیک قطعاً بیکار سوال ہیں۔ یہی حال باقی جانوروں اور پودوں کا ہے۔ چینی کے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ ان پودوں اور چینی وغیرہ سے کیسے اور کیا فائدہ یا حظ اٹھایا جائے۔ باقی رہا یہ کہ وہ خود کیا ہیں؟ اس سے چینی کو کوئی سروکار نہیں۔ گویا چینیوں کو تو صرف پرندوں کے نغمے پھول کے رنگ کلیوں کی پنکھڑی اور مرغی کے گوشت سے غرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مشرق کو، مغرب والوں سے پودوں کا علم اور جانوروں کا علم، پورے کے پورے سیکھنے پڑے ہیں۔ مگر مغرب کو بھی مشرق سے سیکھنا پڑے گا کہ درختوں، پھلوں اور مچھلیوں، پرندوں اور حیوانات سے کیسے حظ اٹھایا جائے، کیسے ان سے لطف اندوز ہوا جائے تاکہ ان انواع واقسام کے موجودات کے دلآویز خطوط اور حرکات کو مختلف انسانی جذبات اور کیفیات کے ساتھ ہم آہنگ محسوس کیا جاسکے۔

تو کھانا انسانی زندگی کی چند ٹھوس مسرتوں میں سے ایک ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ بھوک کی اس جبلت پر وہ پابندیاں اور سماجی حدیں عائد نہیں جس طرح دوسری جبلتوں مثلاً جنسی خواہش پر عائد ہیں۔ عام طور پر بھوک کے سلسلے میں کوئی اخلاقی قدریں بھی پیدا نہیں۔ خوراک کے بارے میں بناوٹ اور رکھ رکھاؤ بھی جنس کے مقابلے میں کم ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ فلسفی، شاعر، سوداگر اور فنکار کھانے پر جمع ہوں اور بغیر کسی شرم وحیا کے کھلے بندوں پیٹ پوجا کر سکیں۔ البتہ بعض وحشی اقوام ایسی ہیں جنھوں نے کھانے کے بارے میں کچھ عجب قسم کی شرم رائج کی ہے۔ وہ صرف اکیلے ہی میں کھا سکتے ہیں۔ غرض کم سے کم کھانے کی جبلت تو

ایسی ہے جس پر چونکہ کم حدیں عائد ہیں اس لیے اس میں کم گمراہیاں، اور کم خبط اور کم مجرمانہ افعال پیدا ہو سکے ہیں۔ بھوک کی جبلت اور جنسی خواہش میں فرق یہ ہے کہ دونوں اپنے سماجی معنی میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہ بات قدرتی ہے۔ بہرکیف بھوک ایسی چیز ہے جو ہماری جسمانی زندگی کو پیچیدہ نہیں بناتی۔ بلکہ انسانیت کے لیے ایک نعمت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ صرف اسی جبلت کے سلسلے میں ہر انسان آزادی سے بات کرتا ہے اور کھلے بندوں صاف صاف اس کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے اظہار میں کوئی شرم لحاظ نہیں برتا جاتا۔ اس لیے کوئی اعصابی مرض یا کوئی بے راہ روی پیدا نہیں ہوتی جس طرح جنسی جذبوں کے سلسلے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ مانا کہ کھانا ملنے میں کئی ایک مشکلیں ہوں گی مگر جونہی کھانا پیٹ میں گیا۔ باقی باتیں طے ہوگئیں ہم بڑی صاف دلی سے کھلے بندوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر شخص کو خوراک ملنی چاہیے۔ مگر یہ بات ہم جنسی خواہش کے سلسلے میں نہیں کہہ سکتے اور سچی بات یہ ہے کہ بھوک مٹ کر کوئی طوفان بھی تو نہیں اٹھاتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ لوگ زیادہ کھا کھا کر بدہضمی کا شکار ہو جائیں گے یا ان کی آنتوں میں سرطان ہو جائے گا، یا ان کا جگر بیکار ہو جائے گا۔ چنانچہ بعض لوگ اپنی قبریں گویا اپنے سے کھودتے ہیں۔ ایسی مثالیں میرے ہم عصر چینیوں میں موجود ہیں۔ انھیں شرمانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

نتیجہ یہ ہے کہ کھانے کی وجہ سے (جنسی جذبے کے مقابلے میں) بہت کم سماجی جرائم ہوتے ہیں۔ ضابطہ فوجداری میں مثلاً غیر قانونی، بدخلاقی یا بے وفا قسم کی شکم پری کے لیے کوئی قانون موجود نہیں مگر اس ضابطہ فوجداری میں زنا، طلاق عورتوں سے چھیڑ چھاڑ قسم کی باتوں کے لیے بیسیوں دفعات موجود ہیں۔ کھانے کے سلسلے میں شوہر زیادہ سے زیادہ یہ حرکت کر سکتا ہے کہ نعمت خانے کو چھان مارے مگر نعمت خانے کی تلاشی پر کسی شخص کو سزا نہیں دی جاتی اور اگر کبھی عدالت میں ایسا شخص پیش کر بھی دیا جائے تو جج مجسم رحم و کرم بن جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص صاف صاف تسلیم کیا کرتا ہے کہ میں بھوکا ہوں۔ اسی بنا پر ہم قحط زدہ لوگوں پر تو ترس کرتے ہیں لیکن الگ تھلگ رہنے والی راہباؤں پر توجہ نہیں دیتے۔

کھانے کے مضمون پر تو ہر شخص اچھی معلومات رکھتا ہے، ادھر ہماری دوسری جبلت یعنی جنسی جذبے کا یہ حال ہے کہ لوگوں کو جنس کے بارے میں الف کے نام بے تک معلوم نہیں۔ چین میں بعض خاندان ضرور ایسے ہیں جو اپنی لڑکیوں کو جنسی معلومات سے بھی بہرہ ور کرتے ہیں اور انھیں کھانا پکانا بھی سکھاتے

ہیں مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے؟ کھانے کے مضمون پر علم کی روشنی چمک رہی ہے اور جنس کے موضوع پر کہانیوں اور وہموں کی پر اسرار دھند چھائی ہوئی ہے۔ کھانے کا مضمون جتنا روشن ہے، جنس کا موضوع اتنا ہی بے نور اور اندھیر ہے۔

اگر پرندوں کی طرح پیٹ کے بجائے ہمارا بھی پوٹا ہوتا، یا جگالی کرنے والے جانوروں کی طرح ہمارے بھی چار چار معدے ہوتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انسانی معاشرہ اتنا بدل جاتا کہ صورت بھی پہچانی نہ جاتی۔ بلکہ ہم اور ہی نسل کے انسان ہوتے۔ پوٹے یا جانوروں کے سے معدے والی انسانی نسل، بڑی پر امن، بڑی مطمئن اور بڑی پیاری ہوتی، بالکل اسی طرح جس طرح کوئی چوزے یا لیلے ہوتے ہیں۔ ہم اس صورت میں یا تو ایک چونچ پیدا کر لیتے۔ جس سے ہمارا نظریہ حسن بالکل بدل جاتا۔ یا پھر تھوتھنی کے اندر جگالی کے دانت اگا لیتے۔ اس طرح ہمارے لیے بیج اور پھل ہی کافی ہوتے۔ یا کسی پہاڑی کی ڈھلان پر سرسبز گھاس ہمارے لیے کافی ہوتی۔ کیونکہ فطرت گھاس کے سلسلے میں بڑی فیاض ہے چنانچہ ہمیں خوراک کے لیے ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا نہ پڑتا اور اپنے دشمنوں کی بوٹیاں نوچنی نہ پڑتیں۔ گویا ہم ایک ایسی جنگجو اور خونخوار مخلوق نہ ہوتے جیسی آج کل ہیں۔

خوراک اور مزاج میں بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ قدرت کا قانون ہے۔ گھاس پھوس [illegible] نے والے سارے جانور فطرتاً پر امن ہوتے ہیں۔ مثلاً بھیڑ بکریاں، گھوڑا، گائے، بھینس، ہاتھی اور چڑیا وغیرہ گوشت کھانے والے تمام حیوان لڑاکا ہوتے ہیں۔ مثلاً بھیڑیا، شیر، چیتا، عقاب وغیرہ اگر ہمارا گزارا بھی گھاس پھوس پر ہوتا تو ہماری فطرت بھی کچھ کچھ فیل نما اور بھاری بھرکم ہوتی۔ قدرت کا یہ قانون ہے کہ جہاں لڑائی کی ضرورت نہ ہو وہاں لڑاکا فطرت پیدا نہیں ہوتی۔ آپ کہیں گے آپس میں تو مرغے بھی لڑتے ہیں مگر مرغے آپس میں دانے دنکے کے لیے نہیں لڑتے بلکہ مرغی کے لیے لڑتے ہیں۔ یہ جھگڑا تو گھاس پھوس کھانے والے انسانوں کے درمیان بھی چلے گا لیکن وہ اس مارا ماری سے بہت مختلف ہوگا۔ جو آج کل باہر سے آئی ہوئی خوراک کے سلسلے میں یورپ میں پیش آتی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کبھی بندر نے دوسرے بندر کو کھایا ہو مگر میں جانتا ہوں کہ آدمی، آدمی کو کھاتا ہے۔ انسان کی ارتقائی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ آدم خوری رائج رہ چکی ہے اور ہمارے اجداد ایک

دوسرے کا گوشت کھاتے رہے ہیں۔ پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ ہم اب بھی کئی لحاظ اور کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے کو کھاتے ہیں، مثلاً انفرادی طور پر، معاشرتی طور پر یا بین الاقوامی طور پر ایک دوسرے کو نوچ نوچ کر ہڑپ کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تو آدم خور ہم سے بہتر ہیں کیونکہ وہ عمداً دوسرے کو قتل کرتے ہیں کہ اسے کھا سکیں اور پھر وہ مرے ہوئے دشمن کے جسم کے عمدہ حصوں کا گوشت، کلیجی، گردے کھا کر کچھ حاصل بھی کرتے ہیں لیکن مہذب انسانوں کا حال دیگر ہے۔ آدم خوروں اور مہذب انسانوں میں فرق یہ ہے کہ آدم خور اپنے دشمن کو مار کر کھا جاتے ہیں لیکن مہذب انسان اپنے دشمن کو مار کر اسے دفن کر دیتا ہے۔ اس کی قبر پر ایک کتبہ لگاتا ہے اور اس کی نجات کے لیے دعا بھی کرتا ہے۔ گویا ہم انسانی خود پسندی اور بدمزاجی میں حماقت کا اضافہ بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ خود پسندی اور بدمزاجی کی وجہ سے ہم اپنے جیسے انسان کو جان سے مارتے ہیں۔ اسے مار کر اس سے زندگی چھین کر، پھر اس کے لیے دعائیں مانگنا، حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

میں جانتا ہوں کہ انسان تکمیل کی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہوا کہ ابھی ہم بہت ناقص ہیں اور واقعہ بھی یہ ہے۔ جب تک ہم میں حلیمانہ اور امن پسندانہ اوصاف پیدا نہیں ہوں گے ہم اپنے آپ کو مہذب کہہ ہی نہیں سکتے۔

میں دیکھتا ہوں کہ انسانوں کی موجودہ نسل میں گوشت خور اور نباتات خور دونوں قسم کے حیوان موجود ہیں۔ نباتات خور اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور گوشت خور دوسروں کے کام اور معاملوں کو بھی اپنا کام سمجھتے ہیں اور ہر طرح ان میں دخل دیتے ہیں۔ یہی ان کا ذریعہ معاش بھی ہے۔ اس لیے میں نے آج سے دس سال پہلے سیاسیات سے کنارہ کر لیا تھا۔ کیونکہ میں فطرتاً گوشت خور نہیں اگرچہ میں گوشت کے کباب اب بھی رغبت سے کھاتا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ آدھی دنیا تو اپنا وقت کام کرنے میں صرف کرتی ہے۔ باقی کی آدمی دنیا ایسی ہے جو دوسروں سے کام کراتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا کا یہ آدھا حصہ دوسروں کے لیے کوئی ذاتی کام کرنا، ناممکن کر دیتا ہے۔ گوشت خور کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے لڑنے بھڑنے سازشیں کرنے، چار سوبیسی میں مزہ آتا ہے۔ دشمن کو جل دینے اور پیش بینی کرنے میں لطف محسوس ہوتا ہے یہ سب کچھ بڑی گہری دلچسپی اور حقیقی قابلیت سے کیا جاتا ہے مگر میرے نزدیک یہ خصوصیات ہرگز قابل تعریف نہیں ہیں اور دراصل یہ سارا معاملہ جبلت اور جبلی تقاضے کا ہے۔ جن لوگوں کی فطرت ہی لڑنا جھگڑنا ہو وہ اسی میں لطف محسوس کرتے ہیں۔ ان کی

تخلیقی قوت، اپنا کام اچھی طرح سرانجام دینے کی صلاحیت، بہت کم پروان چڑھتی ہے۔ نباتات خوروں کی سی فطرت رکھنے والے کئی پروفیسروں کو میں نے دیکھا ہے۔ جنھیں حرص اور لالچ مطلق نہیں ہوتا۔ جن میں مقابلے کا اور دوسروں کو مات دینے کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ یہی لوگ قابل تعظیم ہیں۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ دنیا کے تمام تخلیقی فنکاروں دوسروں کے کام میں دخل نہیں دیتے، اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی فطرت نباتات خوروں کی سی ہے۔ انسانیت کا سچا ارتقا اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ نباتات خوروں کی سی فطرت کے پرامن انسان زیادہ ہوں اور گوشت خوروں کی فطرت کے انسانوں کی گنتی کم ہوتی جائے۔ فی الحال یہ گوشت خور فطرت کے لوگ ہی ہمارے حکمران ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج کی دنیا مضبوط اور بھری بھری مچھلیوں اور طاقت ور جسموں کی بڑی معتقد ہے۔

5- مضبوط جسم

ہم بنیادی طور پر حیوان ہیں اور ہمارے جسم فانی ہیں۔ اس کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں جان سے مارا جا سکتا ہے اور عام آدمی کو اس طرح جان سے جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ یہ مانا کہ ہم میں علم و دانش کی بڑی پیاس موجود ہے مگر علم ہی کے ساتھ نظریوں کا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ یہی اختلاف ہے جو بحث کو جنم دیتا ہے۔ اگر یہ دنیا ہمیشہ زندہ رہنے والے لوگوں سے آباد ہوتی ہے تو یہ بحث مباحثے کبھی ختم نہ ہوتے کیونکہ جب تک ایک غیر فانی انسان یہ نہ مان لے کہ وہ غلطی پر ہے، جھگڑا طے نہیں ہو سکے گا مگر فانی انسانوں کی دنیا میں صورت حال ذرا مختلف ہے۔ کسی سے اختلاف رکھنے والا شخص، اپنے حریف کی نظروں میں اتنا قابل نفرت ہو جاتا ہے (حریف جتنا قابل نفرت معلوم ہونے لگے، اس کی دلیلیں اتنی ہی درست ہوتی ہیں) کہ حریف سے جان سے مار کر جھگڑے اور اختلاف کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ الف، ب کو مار ڈالے تو الف حق پر ہے۔ اگر ب، الف کو مار ڈالے تو ب حق پر ہوا۔ ذرا خیال کیجیے کہ وحشیوں میں جھگڑے طے کرنے کے لیے یہی قدیمی طریقہ رائج ہے اور یہی حال جانوروں کا ہے۔ چونکہ شیر سب کو مار سکتا ہے لہٰذا وہی حق پر ہے۔

یہی بات انسانی معاشرے پر ایسی صادق آتی ہے کہ قدیم زمانے سے لے کر آج تک اسی نظریے سے انسان کی ساری تاریخ کو جانچا جا سکتا ہے۔ گلیلیو نے زمین کے گول ہونے اور نظام شمسی کے بارے میں کئی نئی باتیں دریافت کیں مگر کئی باتوں میں اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا اور کہی ہوئی باتیں بھی واپس لے لیں۔ وہ اس

لیے کہ وہ ایک فانی انسان تھا۔ جسے جان سے مارا جا سکتا تھا، یا طرح طرح کی ایذائیں بھی دی جا سکتی تھیں۔ اگر گلیلیو کا جسم لافانی ہوتا، تو اسے بحث مول لینے کی مصیبت اٹھانا پڑتی۔ آپ اسے کبھی یقین نہ دلا سکتے کہ وہ بعض باتوں میں غلطی پر ہے اور ایک دائمی مصیبت بن جاتی۔ مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ فانی انسان تھا اور جسمانی ایذائیں، جیل کی کال کوٹھڑی، یا شاید ٹکٹکی اور پھانسی نے اسے قائل کر دیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ اس زمانے کے پادری اور امرا دونوں طبقے گلیلیو سے فیصلہ کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ چنانچہ گلیلیو کو قائل ہونا پڑا کہ وہ غلطی پر ہے۔ اسی بات نے اس زمانے کے پادریوں کو یقین دیا کہ وہ راستی پر ہیں۔ چنانچہ یوں اس مسئلے کا فیصلہ بخیر و خوبی ہو گیا۔

جھگڑے طے کرنے کا یہ طریقہ بڑا فوری، اور سہل اور عمدہ ہے۔ لوٹ مار اور غارت گری کی جنگیں، مذہبی جہاد، صلاح الدین اور مسیحیوں کی صلیبی جنگیں، قرون وسطی میں ڈائنوں اور جادوگرنیوں کو زندہ جلانا اور پھر ہمارے زمانے میں مسلح جہازوں کی مدد سے وحشی قبائل کو عیسائی بنانا، سفید قوموں کا بزعم خود ہر جگہ، تہذیب، سکھانے کا کام اور مسولینی کا حبشہ میں ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے ''تہذیب'' پھیلانا، یہ سب کچھ اسی حیوانی منطق کے نتیجے ہیں جو انسان کو ورثے میں ملی ہے اگر اطالویوں کے پاس بہتر توپیں ہوں اور اطالوی سپاہی بہتر سپاہی ہوں اور زیادہ دشمنوں کو مار سکیں تو مسولینی حبشہ میں ''تہذیب'' کی روشنی پھیلانے میں کامیاب ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو پھر حبشہ کا بادشاہ ہیل سلاسی اٹلی میں بڑی کامیابی سے تہذیب و تمدن کا نور پہنچا سکتا ہے۔

ہم میں جنگل کے بادشاہ شیر کی سی شاہی خصلت بھی ہے کہ ہم بحث کو کچھ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم سپاہی کو اتنا اونچا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی اتنی قدر کرتے ہیں، کیونکہ سپاہی اختلاف کرنے والوں کا فوراً فیصلہ کر دیتا ہے۔ جو شخص بحث مباحثہ کرے اور اپنے آپ کو حق پر سمجھے اسے خاموش کرنے کا فوری طریقہ یہ ہے کہ اسے پھانسی دے دیجیے۔ بس قصہ پاک ہوا۔ انسان لمبی چوڑی باتیں جبھی کرتا ہے جب وہ دوسروں پر اپنا اعتقاد ٹھونس نہیں سکتا اور انھیں پوری طرح قائل نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس جو لوگ عمل کے رسیا ہیں اور انھیں کام کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی باتیں کرتے ہیں۔ انھیں بحث مباحثے اور حجت بازی سے نفرت ہوتی ہے۔ آخر ہم باتیں کس لیے کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ دوسروں پر اثر ڈال سکیں اور

اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ ہم دوسروں پر اثر ڈال سکتے ہیں، انھیں کنٹرول کر سکتے ہیں تو باتوں کی کیا ضرورت باقی رہی؟ آخر بین الاقوامی انجمنیں اور کیا کرتی ہیں۔ باتیں اور خالی مباحثے مگر جھگڑوں اور اختلافات کو زبردستی اور قوت کے بل پر طے کرنے کی بھی ایک حد ہے اور اگر ذوق اور زندہ دلی نہ ہو تو یہ طریقہ بالکل مہمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی زمانے میں جاپانیوں کا خیال تھا کہ وہ چینی آبادیوں پر مشین گنوں سے گولیاں برسا کر اور بمباری کر کے ان کے دل سے جاپانیوں کی نفرت نیست و نابود کر دیں گے! یہی وجہ ہے کہ میں ذرا مشکل سے اس بات کا قائل ہوتا ہوں کہ انسان ''حیوان معقول'' بھی ہے۔

میں ہمیشہ سے یہ سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی انجمنیں، جدید زبانوں کے سیکھنے کے لیے نہایت اچھے سکول ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بھی سکھایا جاتا ہے۔ مثلاً ایسی انجمنوں میں پہلے کوئی نہایت فصیح مقرر نہایت عمدہ انگریزی میں ایک تقریر کرتا ہے۔ چند منٹ بعد، یا ساتھ ہی ساتھ ایک نہایت قابل مترجم انگریزی کی اسی تقریر کو بڑی رواں، شستہ اور فصیح فرانسیسی میں ادا کرتا ہے۔ تلفظ اور لہجے کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی انجمنیں زبان دانی کے سکولوں سے کہیں بہتر ہیں کیونکہ ان میں نہ صرف جدید زبانیں سکھائی جاتی ہیں بلکہ تقریر کرنے کا فن بھی سکھایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ میرے ایک دوست نے (جو ایک بین الاقوامی انجمن میں اپنے ملک کی نمائندگی کر رہا تھا) مجھے بتایا کہ چھ مہینے کی قلیل مدت میں اس نے اپنے تتلانے پر قابو پا لیا حالانکہ اپنے ملک میں اس نے برسوں بیکار اس عیب پر قابو پانے کی کوشش کی تھی مگر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ بین الاقوامی انجمنیں جو عام طور پر تبادلہ رائے کے لیے بنائی جاتی ہیں اور ان اداروں میں بھی، جو محض بات چیت کے لیے قائم کیے جاتے ہیں، ''بڑے بولنے والوں'' اور ''چھوٹے بولنے والوں'' کا امتیاز باقی ہے۔ ''بڑے بولنے والے'' وہ ہیں جن کے ''ملک'' بڑے ہیں اور ''چھوٹے بولنے والے'' وہ ہیں جن کے ''ملک'' بھی چھوٹے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ہر بین الاقوامی انجمن، اگر محض دھوکا نہیں تو حماقت کا اڈا ضرور ہے۔ گویا چھوٹے ملک والی قوم کا نمائندہ جسے چھوٹا مقرر قرار دیا جاتا ہے بڑے مقررین کی طرح اتنی تیزی سے اور وضاحت سے تقریر کر ہی نہیں سکتا۔ میں یہی کہوں گا کہ ''بڑے ملک والے'' کی فصاحت میں یہ یقین، یہ اعتماد، اسی حیوانی ورثے کا ایک حصہ ہے جس کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے (میں نے قصداً وحشی درندے کا لفظ استعمال نہیں کیا حالانکہ مناسب لفظ یہی تھا)

مختصر بات یہ ہے کہ انسان کو باتیں بنانے کی صلاحیت بھی اسی طرح دی گئی ہے جس طرح اسے لڑنے بھڑنے کی جبلت عطا کی گئی ہے۔ انسان کی ارتقائی تاریخ کے لحاظ سے ہمارا یہ عضو یہ زبان بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا ہمارا مکا ہے، اور اتنا ہی قوی ہے جتنے ہمارے بازو ہیں۔ انسان اور حیوان کا فرق یہ ہے کہ انسان بات کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی انجمنیں، ملکی پارلیمنٹیں، یا دوسری انجمنیں، مستقل طور پر قائم رہتی ہیں تاکہ انسان مل بیٹھ کر باتیں بنا سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کا مقدر یہ ہے کہ باتیں کرتے رہیں اور یہ معلوم کرتے رہیں کہ کون حق پر ہے اور کون جھوٹا ہے۔ باتیں کرنے میں کوئی عیب نہیں یہ تو فرشتوں کی خصوصیت ہے۔ اس سلسلے میں انسانی خصوصیت یہ ہے کہ ہم ایک حد تک ہی بات چیت کرتے ہیں۔ ہم گرما گرم بحث کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک فریق جس کے بازوؤں میں زیادہ طاقت ہوتی ہے، پریشان ہو کر غصے میں آ جاتا ہے۔ جیسا کہ مشہور چینی مقولہ ہے کہ ''پریشانی قدرتی طور پر غصے کا پیش خیمہ ہوتی ہے'' اور اس فریق کو یکا یک یہ خیال آتا ہے کہ باتیں بہت ہوئیں اب کچھ اور ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ ناراض اور طاقت ور فریق میز پر زور سے مکا مارتا ہے۔ فریق مخالفت کی گردن ناپتا ہے اور اس کی خوب مرمت کرتا ہے پھر پلٹ کر حاضرین سے پوچھتا ہے۔ ''لوگو بتاؤ کیا میں حق پر تھا یا یہ نامعقول سچ کہتا تھا؟'' اور جواب لازمی طور پر یہی ملتا ہے کہ ''بھائی صاحب، آپ ہی سچے ہیں۔'' یہ صرف انسانوں کا خاصا ہے کہ اختلافی بحث کا فیصلہ یوں کرتے ہیں۔ حیوان تو اپنے اختلافات محض طاقت کے بل پر طے کر لیتے ہیں۔ یہ انسان ہی ہے کہ اپنے اختلافات کا فیصلہ بک بک جھک جھک اور طاقت کے ایک عجیب آمیزے کے ساتھ کرتا ہے۔ فرشتوں کا اعتقاد یہ ہے کہ حق، حق ہے، جانوروں کا اعتقاد صرف قوت پر ہے۔ یہ صرف انسان ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قوت کا دوسرا نام حق ہے۔ بہر حال باتیں کرنے اور طاقت کے استعمال میں سے باتیں کرنے کی خواہش اعلیٰ تر ہے۔ شاید کوئی زمانہ ایسا آ جائے کہ ہم باتیں تو کیا کریں لیکن طاقت استعمال نہ کریں اسی میں انسانیت کی نجات اور فلاح ہے۔ فی الحال تو ہم میں چائے خانوں کی نفسیات رچی ہوئی ہے کہ ہم باتیں کرتے ہیں اور آپس میں الجھ پڑتے ہیں۔

مجھے دو دفعہ چائے خانوں کی جنگوں سے سابقہ پڑا ہے۔ 1931ء یا 1932ء کا ذکر ہے۔ ہم لوگ ایک چائے خانے میں بیٹھے تھے کہ ایک جھگڑا پیش ہوا اور ہمیں ثالث قرار دیا گیا۔

الزام یہ تھا کہ ایک شخص نے دوسرے کی جائیداد ہتھیالی ہے۔ یہ شخص بڑا اکڑیل جوان تھا۔ اسی نے بحث کا آغاز کیا تھا۔ اس نے ہمارے سامنے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس میں اس نے بتایا کہ میں نے اپنے ہمسائے (فریق مخالف) کے ساتھ بڑے صبر وسکون سے گزارا کیا ہے، ہمیشہ فراخدلی کا برتاؤ کیا ہے اور بڑی بے غرضی سے اس کی خدمت خاطر کی ہے۔ مزہ یہ کہ اس نے ہم ثالثوں کو بھی بحث میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا اور جب ہم آپس میں بحث میں الجھے ہوئے تھے تو وہ چپکے سے اٹھا اور باہر جا کر، اس زمین کے اردگرد باڑ لگا دی۔ جس کے بارے میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ پھر اس نے ہم سے آ کر کہا: ''آپ لوگ خود چل کر دیکھ لیجیے کہ میں ٹھیک کہتا ہوں یا نہیں۔ ہم لوگوں نے باہر جا کر دیکھا کہ اس وقت بھی اس کے کارندے نزاعی رقبے کے گرد باڑ لگا رہے تھے! اس نے ہم سے پوچھا۔ ''کیوں بھائیو! حق پر میں ہوں یا یہ شخص؟'' ہم تو اپنی آنکھوں اس کی بدذاتی دیکھ چکے تھے۔ ہم نے فیصلہ دیا کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔ بس یہ کہنا غضب ہو گیا۔ اس نے ہمارے فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اس نے کہا: ''ساری پنچایت نے میری توہین کی ہے۔ میری غیرت، میری عزت پر حملہ کیا ہے اور میری آبرو پر پانی پھیر دیا ہے'' اس کے بعد وہ غصے میں پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا اور ہماری طرف مڑ کر حقارت کی نظر بھی نہیں ڈالی ذرا خیال کیجیے کہ ایسے آدمی کو یہ شکایت ہوئی کہ ہم نے اس کی توہین کی ہے۔

دوسرا واقعہ 1936ء کا ہے۔ فریقین میں سے ایک شخص (حسب سابق) بڑا طاقتور تھا۔ اسی نے اپنا جھگڑا پنچایت کے سامنے فیصلے کے لیے پیش کیا، اور پنچایت سے ''انصاف'' طلب کیا۔ ہماری پنچایت کو اپنی آن، اپنی عزت کا پاس تھا۔ اس لیے ہم نے متفقہ فیصلہ دیا کہ ''قصور سراسر تمہارا ہے اور تم زبردستی اور سینہ زوری کرتے ہو'' اس شخص نے بھی اس فیصلے کو اپنی توہین گردانا اور اس کی بھی عزت اور آبرو پر اس فیصلے نے کالک پوت دی چنانچہ اس نے اپنے حریف کی گردن دبوچی اور کمرے سے باہر جا کر اسے قتل کر دیا۔ واپس آ کر اس نے ہم سے پوچھا: ''بتاؤ! میں حق پر ہوں یا وہ؟'' ہم لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا: ''نہیں بھائی

تم ہی حق پر ہو' وہ اس فیصلے پر بھی مطمئن نہ ہوا۔ اس نے پوچھا ''میں اچھا آدمی ہوں یا نہیں؟'' ہم نے پھر یک زبان ہو کر کہا۔ ''تم نہایت عمدہ آدمی ہو' قاتل ہم سے اپنے لیے کس طریقے سے یہ کلمات کہلوا رہا تھا؟

یہ واقعہ 1936ء میں انسانی تہذیب کا ایک نمونہ ہے۔ قانون اور انصاف انسانیت کی ابتدا سے اب تک ایسے کئی مراحل سے گزر چکے ہیں۔ پنچایتوں میں تو ملزم یہ احتجاج کرتا ہے کہ اس کی توہین کی گئی ہے مگر ہائی کورٹ میں جب الزام ثابت ہو جائے تو ملزم ایسا احتجاج نہیں کرتا۔ یہ ترقی دیر میں ہوئی ہے ہم نے پنچایتیں شروع کیں تو الگ بھگ دس برس ہم یہ سمجھتے رہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں لیکن قدرت کو آئندہ کا حال بھی معلوم تھا۔ قدرت جانتی تھی کہ ہمیں اس تجربے میں ناکافی ہوگی کیونکہ ابتدا میں ناکامیاں ہی انسان کا مقدر ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ پنچایتیں ختم ہوگئی ہیں اور ہم لوگ پھر وحشیوں کی طرح ایک دوسرے کے بال نوچ رہے ہیں اور جانوروں کی طرح ایک دوسرے کی بوٹیاں اڑا رہے ہیں مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ شرم و حیا اچھی خصلتیں ہیں اور یہی حال باتیں کرنے کا ہے۔ میرے نزدیک تو اب انسان بالکل بے شرم اور بے حیا ہو چکے ہیں۔ آیئے! ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم میں ابھی حیاداری باقی ہے اور باتیں بنانے میں لگ رہیں۔ شاید اسی طرح باتیں کرتے کرتے ہم فرشتوں کے اعلیٰ رتبے پر پہنچ جائیں جو آپس میں باتیں تو کرتے ہیں لیکن ایک دوسرے کی تکا بوٹی نہیں اڑاتے۔

6- ذہن انسانی

غالباً انسانی ذہن، تخلیق کا سب سے بڑا اعجاز ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس دعوے سے اتفاق ہوگا۔ خاص طور پر اس صورت میں حکیم آئن شٹائن اور موجد ایڈیسن جیسے لوگوں کے ذہن سامنے رکھے جائیں کیونکہ آئن شٹائن نے کائنات کے قوسی خلا کو حساب کے ذریعے سے ثابت کیا اور ایڈیسن نے گراموفون اور سینما کی مشین جیسی چیزیں ایجاد کیں۔ یہ دعویٰ ان ماہرین طبیعیات کے ذہنوں کے پیش نظر اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے جو کسی ستارے کی راہ و رفتار ناپ لیتے ہیں۔ ایٹم کی ترکیب جانتے ہیں اور ایٹم سے کیا کیا کچھ بنا سکتے ہیں اور ایسے کیمرے بنا سکتے ہیں جو رنگین تصویریں لے سکیں! گویا بندروں کی بے مقصد اور فضول کرید اور الٹ پلٹ کے مقابلے میں، انسانی ذہن ایک عظیم الشان چیز ہے۔ ایسی وسیع اور ارفع کہ اس میں کائنات کے رازوں کو

سمجھنے کی اہلیت موجود ہے۔

مگر عام ذہن ایسے نہیں ہوتے۔اس لیے میں ذہن انسانی کو عظیم الشان نہیں، ایک دلفریب چیز کہوں گا کیونکہ اگر سب انسانوں کے ذہن ایسے ہی اعلیٰ ہوتے تو ہر انسان معقولیت کا پتلا ہوتا۔ وہ گناہوں اور کمزوریوں اور بداخلاقی سے مبرا ہوتا اور اس طرح یہ مخلوق نہایت غیر دلچسپ ہوتی۔ میں انسان پرست ہوں اور انسانیت کا دلدادہ ہوں۔ مجھے انسان سے دلچسپی ہے کہ وہ سخت غیر منطقی، نہایت متلون ہے۔ وہ مستقل مزاج نہیں ہے۔ وہ بڑی دلچسپ حماقتیں کرتا ہے۔جشن مناتا ہے، اودھم مچاتا ہے، اس میں سخت تعصب اور کٹر پن ہے اور وہ نسیان کا پتلا ہے اگر ہمارے ذہن ایسے ہی مکمل ہوتے تو ہمیں ہر نئے سال کے شروع میں لمبے چوڑے پروگرام نہ بنانے پڑتے کہ اس سال ہم یہ کریں گے اور وہ نہیں کریں گے۔ انسانی زندگی کی دلفریبی تو یہی ہے کہ انسان ہر سال نئے نئے منصوبے باندھتا ہے اور ہر سال کے آخر میں اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے منصوبوں کا زیادہ سے زیادہ تیسرا حصہ پورا کیا ہے۔ باقی کے دو حصوں میں سے ایک حصے پر تو عمل نہیں ہو سکا۔ اور ایک حصہ وہ بالکل بھول جاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ منصوبہ جس پر عمل یقینی ہو اپنی دلچسپی کھو بیٹھتا ہے اگر کسی جرنیل کو یہ معلوم ہو کہ اس نے ایک جنگ لڑنے کے لیے جو نقشہ بنایا ہے۔ اس پر عمل کرنے سے فوج کے کتنے آدمی مارے جائیں گے، کتنے زخمی ہوں گے اور دوسرا نقصان کیا ہوگا تو اس کے لیے اس لڑائی میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہے گی اگر آپ کو یہ معلوم ہو کہ شطرنج میں آپ کے مقابل جو شخص ہے اس کا ذہن غلطی اور بھول چوک سے مبرا ہے تو آپ اس کے ساتھ کبھی شطرنج نہیں کھیلیں گے اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ ناولوں میں جو کردار موجود ہیں ان کا ذہن کیا سوچے گا اور ناول کا انجام کیا ہوگا تو ہر ناول کو چھونا تک گوارا نہ کریں۔ ہم تو ناول اس لیے پڑھتے ہیں کہ ایک ذہن کسی مقرر وقت پر کسی قسم کا فیصلہ کرے گا اور کن حالات میں کیا کچھ عمل پذیر ہوگا۔ اگر ہمیں کسی کتاب میں ایسے سخت گیر باپ سے سابقہ پڑے، جو کسی وقت بھی اپنی سخت گیری چھوڑ کر ہماری طرح ایک انسان نظر نہ آئے تو ہمیں اس سے دلچسپی نہ رہے گی۔ اسی طرح وہ بے وفا خاوند بھی سخت غیر دلچسپ کردار بن جائے گا جو ہمیشہ اپنا لگا بندھا انداز اور گھڑا گھڑایا طور ہی قائم رکھے۔ انسان اسی لیے دلچسپ ہے کہ وہ انسان ہے۔ ذرا ایک مشہور موسیقار کا خیال کیجیے۔ جو ایک حسین عورت کے لیے کوئی نغمہ ترتیب دینے سے ہمیشہ انکار کرتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا رقیب موسیقار

ایسا کرنے پر تیار ہو گیا ہے تو وہ بھی فوراً اپنا نغمہ ترتیب دینا شروع کر دے گا اور اس طرح اپنے اصول کے خلاف عمل کرے گا۔ ایک سائنس دان کا تصور کیجیے جو اخباروں میں اپنے تحقیقی مقالے چھپوانے کی قسم کھا چکا ہے۔ یکا یک وہ یہ خبر پڑھتا ہے کہ اس کا حریف، اپنی تمام تحقیقات شائع کر رہا ہے۔ وہ اپنا اصول اٹھا کر طاق پر رکھ دے گا اور فوراً پبلشر کے گھر کا رخ کرے گا۔ یہی چیز انسانی تقاضا ہے اور انسانی ذہن کی یہی خصوصیت، یہی کمزوری اسے دلچسپ اور دل فریب بناتی ہے۔

گویا انسانی ذہن اس لیے دلچسپ ہے کہ وہ کہنہ تعصبات کا مارا ہوا ہے، سخت متلون اور ضدی ہے اور کوئی اس کے بارے میں پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ اب وہ کیا سوچے گا اور کیا کرے گا اور اگر نفسیات نے ہم پر یہ واضح نہیں کیا تو گویا ہم نے نفسیات سے ایک سو برس میں کچھ نہیں سیکھا۔ دوسرے لفظوں میں انسانی ذہن اب بھی بے مقصد ٹامک ٹوئیے مارنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو ہمارے اجداد، بندروں کے ذہن کا خاصہ تھی۔

انسانی ذہن کے ارتقا پر ذرا غور کیجیے۔ انسانی ذہن اصل میں ایک ایسا عضو تھا۔ جس کے ذریعے سے ہم خطرے کا احساس کرتے تھے اور اپنی زندگی کو محفوظ رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ذہن ترقی پا کر منطقی بنا اور حساب کتاب کی باریکیوں کو سمجھنے لگا۔ میرے نزدیک یہ ترقی محض اتفاقی تھی۔ انسانی ذہن اصل میں اس کے لیے بنایا نہیں گیا تھا۔ اس کی تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ خوراک کو سونگھ کر تمیز کر سکے، اور اب اگر حسابی فارمولوں کو ''سونگھ'' کر یہ ان میں بھی تمیز کر سکتا ہے، تو یہ مزید خوبی کی بات ہے۔ انسانی دماغ اور حیوانی دماغ کے بارے میں میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ اس کی مثال ایک تیندوے کی طرح ہے جو اپنا جال پھیلاتا ہے اور سچائیاں ٹٹولتا رہتا ہے۔ جب کوئی حقیقت اس جال میں آ پھنستی ہے تو وہ اسے کھا جاتا ہے۔ آج بھی ہم یہ کہتے ہیں۔ ''میں ''محسوس'' کرتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے۔ یعنی ہم حقیقت پر غور نہیں کرتے۔ صرف اسے ''محسوس'' کرتے ہیں! ...... گویا، ہمارا دماغ ہمارے حواس اور محسوس کرنے والے اعضا کے قبیل کا ایک عضو ہے۔ رہا یہ کہ دماغ، حقائق کو محسوس کیسے کرتا ہے؟ یہ ابھی تک طبیعیات دریافت نہیں کر سکی۔ جب کبھی انسانی دماغ، محسوس کرنے والے اعضا سے الگ ہو کر سوچنا شروع کرے اور اس کی سوچ غیر متعلق اور محض ''مجرد'' ہو کر رہ جائے تو ولیم جیمز کے قول کے مطابق اس وقت انسانی دماغ، واضح اور ظاہر حقائق سے ہٹ جاتا ہے اور نظریاتی دنیاؤں

میں ٹامک ٹوئیے مارنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ انسانی ذہن اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے، غیر انسانی ہو جاتا ہے اور اپنی تمام خوبیاں زائل کر دیتا ہے۔ ہم لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ انسانی ذہن کا کام ''سوچنا'' ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے فلسفے میں بھی سخت گھپلے کیے جا رہے ہیں۔ اس غلط فہمی کی بنا پر فلسفی کو اس وقت سخت صدمہ ہوتا ہے جب وہ انسانی ذہن کے بارے میں سوچتے سوچتے گھر سے باہر نکل کر بازار میں جاتا ہے اور وہاں ہر قسم کے لوگوں کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے روزمرہ کے کاموں اور طور طریقوں سے ''سوچنے'' کا بہت ہی کم تعلق ہے۔

مرحوم جیمز ہاروے روبنس نے اپنی کتاب ''انسانی ذہن کی تشکیل'' میں بتایا ہے کہ انسانی ذہن بتدریج، چار بنیادی تہوں سے بنا تھا۔ اور اب بھی یہ تعمیر جاری ہے۔ انسانی ذہن کی یہ چار بنیادیں یہ ہیں: حیوانی ذہن، وحشی ذہن، طفولیت کا ذہن اور قدیم تہذیبوں کا ذہن۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ اگر موجودہ انسانی تہذیب کو اپنی بقا منظور ہے تو انسانی ذہن میں زیادہ تنقیدی صلاحیت پیدا کرنی لازمی ہے۔ میں جب سائنس کے نقطہ نظر سے سوچوں تو جیمز ہاروے روبنس کے ساتھ پوری طرح متفق ہوتا ہوں لیکن دانشمندی کے لمحوں میں مجھے ان کی تعلیم پر شبہ ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی ذہن میں تنقیدی صلاحیتیں بڑھانے کا نظریہ کسی طور بھی قابل قبول نہیں۔ یہ انسانی ترقی میں بالکل ہاتھ نہیں بٹا سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ انسانی ذہن اسی طرح غیر معقول، اسی طرح دلچسپ رہے۔ ایسی دنیا بھلا کس کام کی جہاں ہر شخص بے حد عقل پسند اور معقولیت پرست ہو۔ آپ پوچھیں گے کیا میں سائنسی ترقی کے خلاف ہوں؟ جی نہیں، میں تو مقدس ہونے کے خلاف ہوں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں انسانوں کو دانشور اور ذہین تر بنانے کے خلاف ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا جواب ہاں میں دوں، یا نہیں میں صرف یہ کہتا ہوں کہ مجھے انسانی زندگی سے گہری محبت ہے اور چونکہ مجھے انسانی زندگی سے اتنی محبت ہے لہٰذا میں ''عقل وفراست'' پر بالکل اعتبار نہیں رکھتا۔ اگر دنیا مجسم ''عقل وفراست'' ہو جائے تو جانتے ہیں کیا حال ہوگا؟ اخباروں میں کوئی خبر، کسی کے قتل، چوری ڈاکے کی نہیں چھپے گی۔ ہر شخص اتنا غافل، کامل، اتنا حاضر وموجود ہوگا کہ کوئی کام خراب نہیں ہو سکے گا۔ کہیں کسی کو آگ نہیں لگے گی۔ ہوائی جہاز کا کہیں کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔ کوئی خاوند اپنی بیوی کو چھوڑ کر بھاگ نہیں جائے گا۔ کوئی پادری کسی معمولی لڑکی کو اغوا نہیں کرے گا۔ کوئی بادشاہ محبت کی خاطر تخت وتاج پر لات نہیں مارے گا اور کوئی شخص کسی وقت اپنا ارادہ نہیں بدلے

گا۔اس دنیا میں ہر شخص بڑی با قاعدگی کے ساتھ وہ زندگی اختیار کرے گا۔جس کا خاکہ اس نے غالباً دس برس کی عمر میں تیار کیا تھا اگر دنیا یہ ہو،تو ہمارا تو دور سے سلام ہے۔ کیونکہ یہ دنیا انسانوں کی دنیا نہیں،اس میں کوئی سنسنی،کوئی خروش،کوئی بے یقینی نہیں۔ایسی دنیا میں کوئی ادب نہیں پیدا ہو سکتا۔کیونکہ اس میں گناہ، بداخلاقی، انسانی کمزوری،طوفانی خواہشیں نہیں ہوں گی،تعصبات اور بے قاعدگیاں نہیں ہوں گی اور مصیبت یہ ہے کہ کوئی غیر متوقع بات نہیں ہوگی۔کوئی اچنبھا،کوئی حیرت نہیں ہوگی۔اس دنیا کی مثال ایسی گھڑ دوڑ کی ہوگی جس میں کوئی چالیس پچاس ہزار تماشائیوں کو پہلے سے ہی معلوم ہوگا کہ کون سا گھوڑا جیتنے والا ہے۔اصل یہ ہے کہ انسانی کمزوری ہی زندگی کی جان ہے،زندگی کا آب ورنگ ہے اگر ہم سب انسان سخت منطقی اور نہایت معقول ہو جائیں تو ہماری دانشمندی میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔الٹا ہم مشین بن کر رہ جائیں گے۔ایک ایسی مشین جس کا ذہن،جسم کی خواہشوں کو اسی طرح ظاہر کرے گا جس طرح بجلی کا میٹر بجلی کے خرچ ہونے کو خود بخود ظاہر کرتا رہتا ہے۔یہ صورت حال سخت غیر انسانی ہے اور جو چیز غیر انسانی ہو،وہ نہایت بری ہے۔

میرے قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں انسانی کمزوریوں اور خامیوں کا بڑی کاوش سے جواز پیش کر رہا ہوں اور ان خامیوں اور برائیوں کو خوبیاں بنا کر دکھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔اصل یہ ہے کہ اگر ہم اپنے ذہن کو ترقی دے کر پوری طرح منطقی اور معقول بنالیں۔تو ہم اپنے انداز واطوار کو تو درست اور صحیح بنا سکیں گے مگر ہم زندگی کے لطف اور جینے کے مزوں سے قطعی طور پر محروم ہو جائیں گے۔ یہ صورت حال بڑی غیر دلچسپ ہوگی اگر آپ کو اپنے شوہر یا ایسی بیوی کے ساتھ پوری زندگی بسر کرنی پڑے جو خوبیوں اور نیکیوں کا ہی مجسمہ ہو تو زندگی وبال ہو جائے۔ یہ مانا کہ ایسے مکمل اور معقول انسانوں کا ایک معاشرہ پنپ سکتا ہے اور زندہ بھی رہ سکتا ہے مگر ان حالات میں زندگی گزارنا بہت مہنگا سودا ثابت ہوگا۔گویا معاشرہ ایسا ہی قائم کرنا چاہیے جو خوب منظم اور مربوط ہو مگر بہت زیادہ منظم اور بہت زیادہ باقاعدہ بھی نہ ہو۔ذرا چیونٹیوں کا ایک قبیلہ دیکھیے جو اس دنیا میں ایک منظم اور سخت معقول معاشرے کی غالباً سب سے عمدہ مثال ہے۔ان چیونٹیوں نے ایسی مثالی اشتراکی ریاست قائم کر رکھی ہے کہ وہ کروڑوں برس سے اسی طرح زندہ ہیں۔اخلاق اور اطوار کی معقولیت کا جہاں تک سوال ہے وہ ان چیونٹیوں کو ہی مبارک ہو۔انسان کے لیے اس معاملے میں چیونٹیوں سے نچلے درجے پر قناعت کرنا ہی بہتر ہوگا۔چیونٹیاں بڑی محنتی، بڑی ہوشمند،نہایت کفایت شعار مخلوق ہیں۔ان کا

معاشرہ تنظیم میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، نظم وضبط اور ترتیب میں جواب نہیں رکھتا۔ لیکن انسان ایسا نہیں۔ چیونٹیاں، دن میں چودہ چودہ گھنٹے کام کرتی ہیں اور اپنے معاشرے یا اپنی ریاست کے لیے کسی محنت سے ہرگز گریز نہیں کرتیں۔ ان میں فرائض کا احساس بدرجہ اتم ہے۔ انھیں اپنے حقوق کا کوئی شعور نہیں ہوتا۔ ان میں مستقل مزاجی اور باقاعدگی ہے، تمیز اور جیوٹ ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں اپنے آپ پر قابو پانے کی زبردست صلاحیت ہے لیکن انسان ایسا نہیں ہے۔ وہ ان صلاحیتوں میں چیونٹیوں سے بہت پیچھے ہے۔

ذرا ''بقائے دوام کے دربار'' کی سیر کیجیے۔ ان لوگوں کو یاد کیجیے جنھیں ہم آپ عظیم شخصیتیں کہتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوگا کہ چیونٹیوں والی معقولیت اور اخلاق کی رفعت انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ یہ روما کا نامور فاتح جولیس سیزر ہے۔ عظیم جولیس جس کی معقولیت کا حال یہ تھا کہ اس نے ایک عورت کے لیے ساری سلطنت کو پس پشت ڈال دیا (انطونی کا حال اس سے بھی بدتر ہے) کنفیوشس ہیں جنھوں نے ایک دفعہ ملاقاتی سے کہا تھا کہ میں گھر پر نہیں ہوں اور ساتھ ہی گانا شروع کر دیا تھا کہ ملاقاتی کو یہ پتہ چل جائے کہ وہ ہیں گھر ہی میں۔ یہ عظیم ڈرامہ نگار شیکسپیئر ہیں۔ ان کی معقولیت کا یہ حال تھا کہ انھوں نے ایک گھٹیا درجے کا پلنگ اپنی بیوی کو ترکے میں دینے کی وصیت کی تھی۔ یہ عظیم شاعر ملٹن ہیں جن کا گزارا اپنی سترہ سالہ بیوی سے نہیں ہوتا تھا، اسی لیے انھوں نے طلاق کے مسئلے پر ایک مقالہ لکھا اور جب اس مقالے پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تو انھوں نے ایک کتاب میں آزادی گفتار پر زبردست خطبہ سپرد قلم کیا۔ یہ جرمنی کے عظیم شاعر، فن کار اور مفکر گوئٹے ہیں جنھوں نے شادی اس وقت کی جب اس عورت سے ان کا لڑکا سترہ سال کا ہو چکا تھا۔ یہ سوفسٹ ہیں جو اپنی عمر اور علم اور شہرت کو بھول کر ایک بالکل نوعمر لڑکی، لیڈی سٹیلا کے لیے خون کے آنسو روتے تھے۔ یہ ناروے کے عظیم تمثیل نگار ابسن ہیں جو...... مگر یہ فہرست تو کبھی ختم نہیں ہوگی۔

کیا یہ ظاہر اور واضح نہیں کہ اس دنیا پر عقل نہیں بلکہ طوفانی خواہشوں کی حکمرانی ہے؟ اور ان عظیم شخصیتوں کو جو چیز محبوب بناتی ہے، وہ انھیں انسان ثابت کرتی ہے، وہ ان کی معقولیت نہیں ...... ہرگز نہیں۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے کہ چین میں کسی کے مرنے پر جو مضمون نکلتے ہیں اور جو سوانح شائع ہوتی ہیں وہ بے حد غیر دلچسپ اور جھوٹی ہوتی ہیں کیونکہ ان میں مرنے والوں کو غیر معمولی طور پر نیکو کار اور برتر انسان دکھایا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے اپنی کتاب ''میرا ملک اور میرے ہم وطن'' شائع کی تو مجھ پر چینی عالموں نے یہ

اعتراض کیا کہ میں نے چینیوں کی صفات کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوریاں بھی گنوائی ہیں۔ مثلاً میرے ہم وطنوں، خاص طور پر چینی افسروں اور سرکاری ملازمین کا خیال تھا کہ اگر میں اس کتاب میں چین کو ایک ایسی جنت ظاہر کرتا جس میں نہایت پرامن اور عمدہ قسم کے ولی صفت لوگ رہتے ہیں تو میں اپنے ملک کے لیے نہایت تعمیری پراپیگنڈہ کرتا مگر میرے نزدیک سوانح حیات کی ساری دلچسپی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ بڑے آدمی کے کردار کے انسانی پہلو بھی دکھائے جائیں۔ ایسے پہلو جو ہم کمزور انسانوں جیسے ہوں۔ کسی سوانحی کتاب میں کوئی غیر معقول بات اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ سوانح نگار اپنے ممدوح کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہی وجہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر لٹن سٹریچی کی مشہور کتاب ''عہد وکٹوریا کے عظیم لوگ'' کو کمال فن سمجھا جاتا ہے۔

ایک نہایت ہوش مند ذہن کی عمدہ مثال، انگریز قوم کا ذہن ہے۔ بحیثیت قوم انگریزوں کو منطق سے چنداں واسطہ نہیں لیکن ان کا ذہن خطرے کو فوراً محسوس کر لیتا ہے اور زندگی کے تحفظ کا بھی فوراً اہتمام کرتا ہے۔ انگریزوں کے قومی کردار اور ان کی منطقی تاریخ میں مجھے کبھی کوئی معقول شے نظر نہیں آتی۔ ان کی یونیورسٹیاں ان کا کلیسا اور دوسرے اچھے ادارے محض اتفاقی امور ہیں۔ مگر برطانوی سلطنت کی قوت کا راز یہ ہے کہ انگریز کے دل میں دوسرے کی بات کبھی نہیں اترتی۔ نہ وہ دوسرے کے نظریوں کو قابل قبول ہی گردان سکتا ہے۔ انگریزوں کا عقیدہ ہے کہ انگریزی طرز کا سب سے بہترین اور انگریزی کھانا ہی سب سے عمدہ اور سب سے مناسب خوراک ہے۔ انگریزوں نے اگر کبھی منطق اور دلیل سیکھ لی تو اپنے اوپر ان کا اعتماد اٹھ جائے گا اور برطانوی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ کیونکہ کوئی ایسا شخص دنیا فتح نہیں کرتا پھرتا جسے اپنے بارے میں کچھ شکوک، کچھ شبہات ہوں۔ ذرا ملاحظہ ہو کہ انگریز قوم کا رویہ اپنے بادشاہ کے ساتھ کیسا ہے۔ وہ اس کے دل سے وفادار ہوتے ہیں۔ وہ دل سے اپنے بادشاہ کو چاہتے ہیں لیکن انھوں نے خود ہی اپنے بادشاہ کو تقریر کی آزادی سے محروم کر رکھا ہے۔ وہ اپنے بادشاہ سے من مانی کراتے ہیں۔ ورنہ بادشاہ کو تخت و تاج چھوڑنا پڑ جاتا ہے۔ ملکہ الزبتھ اول کے وقت انگلستان کو سمندری ڈاکو درکار تھے کہ وہ سپین کے خلاف اپنی سلطنت کی حفاظت کریں۔ انگلستان نے کافی تعداد میں ایسے سمندری لٹیرے پیدا کر لیے اور پھر انھیں قدر و منزلت کی آخری رفعتوں پر بھی چڑھایا۔ گویا ہر زمانے میں انگلستان نے ٹھیک لڑائی لڑی ہے اور جس کے خلاف بھی لڑی ہے وہ

واقعی دشمن تھا۔ اس کے جو حلیف تھے وہ واقعی حلیف تھے۔ اس لڑائی کا موقع محل بھی ٹھیک تھا مگر انھوں نے اس کا نام غلط رکھا تھا۔ یہ سب کچھ منطق کا کرشمہ نہیں تھا یہ تو محض ٹھیک بات ''محسوس'' کر لینے کا اعجاز تھا۔

انگریزوں کا چہرہ مہرہ نہایت سرخ وسفید ہوتا ہے اس کی وجہ غالباً انگلستان کا کہرا اور کرکٹ کا کھیل ہے۔ ایسی صحت مند کھال جیسی کہ انگریزوں کی ہے، آدمی کے فکر پر ضرور اثر ڈالتی ہے یعنی ان کی زندگی بسر کرنے کے طریقے پر اپنا اہم اثر چھوڑتی ہے۔ جس طرح انگریز اپنی صحت مند کھال کے ذریعے سے سوچتے ہیں، اسی طرح چینی اپنی آنتوں کے ذریعے سے سوچتے ہیں۔ یہ چین کا بڑا پرانا رواج ہے۔ ہم چینی جانتے ہیں کہ ہم اپنی آنتوں یعنی معدے اور پیٹ کے ذریعے سے ہر چیز پر غور وفکر کرتے ہیں۔ چینی زبان کا عام محاورہ ہے کہ فلاں شخص ''بھر پیٹ خیالات'' یا ''بھر پیٹ علم'' یا ''بھر پیٹ شعر وادب'' کا مالک ہے۔ یا فلاں شخص ''بھر پیٹ غم یا غصہ یا پشیمانی یا غضب یا آرزومندی'' سے دوچار ہے، چینی عاشق جب محبوبہ سے جدا ہو جائیں تو وہ اپنے محبت ناموں میں یہ لکھیں گے۔ ''میری غمگین آنتوں میں ہزار ہا گرہیں پڑ گئیں ہیں'' یا ''تم سے جدا ہو کر جیسے میری آنتیں کٹ سی گئیں'' جو چینی عالم کسی موضوع پر مواد اکٹھا کر لیں اور اپنے خیالات کو ترتیب دے لیں مگر انھیں کاغذ پر منتقل نہ کر پائیں، ان کے بارے میں مشہور چینی محاورہ ہے کہ فلاں صاحب کے پاس فلاں مقالے کا ''شکمی مسودہ'' موجود ہے۔ گویا چینی مفکر اپنے خیالات کو اپنے شکم میں ترتیب دیتے ہیں اور اب تو نفسیات کے جدید انکشافات نے اس کی شہادت دے دی ہے مگر چینی مفکروں کو اس جدید شہادت کی کوئی ضرورت نہیں۔

انسانی ذہن جب اس کائنات کے ٹھوس مظاہر کے بارے میں غور کر رہا ہو تو اسے ہیٹا نہ سمجھیے (انسانی ذہن، صرف انسانی تعلقات کو سمجھنے میں ہی کچھ نیاز مند ہے) میں سائنس کی ترقی کے بارے میں بہت پرامید ہوں مگر انسانی معاملات میں انسانی ذہن توازن اور تنقید اور معقولیت سے کبھی کام لے گا؟ یا انسانیت کبھی اس پرامن مفاہمت کی سطح پر پہنچ جائے گی۔ جہاں اس کی طوفانی خواہشوں کی یلغار نہ ہو سکے؟ مجھے اس میں شک ہے۔ ہو سکتا ہے انفرادی طور پر انسان بڑی اونچی بلندیوں کو چھو لے مگر انسانی گروہ اور انسانی معاشرے اسی طرح وحشیانہ جذبات کے غلام ہیں، اسی طرح رجعت کی راہ پر گہرائیوں میں پھسلتے جا رہے ہیں۔ ان میں وہی وحشیانہ جبلتیں کارفرما ہیں۔ جو ہمیشہ سے ہیں۔ ان میں کبھی نہ کبھی مذہبی جنون اور گہرے تعصبات اور اجتماعی

ہیجان کے وہی طوفان آتے ہیں جو ہمیشہ بنی نوع انسان میں آتے رہے ہیں۔

تو اپنی یہ انسانی کمزوریاں جانتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ اس منحوس شخص سے اور زیادہ نفرت کریں جو اپنی ''تعلیمات'' اور ''خطابت'' سے کام لے کر ہماری انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے اور ہمیں ایک نئی عالمگیر جنگ کی بھٹی میں جھونک دے۔ یہ وہ شخص ہوتا ہے جو نفرت کی پرورش کرتا ہے اور نفرت کا جذبہ ہم میں کافی موجود ہے۔ یہ شخص، فرد کی ناجائز ترقی اور فرد کی خودغرضی کو آسمان پر چڑھاتا ہے اور ان دو چیزوں کی پہلے ہی ہم میں بڑی بھرمار ہے۔ یہ وہ شخص ہے، جو ہمارے وحشیانہ تعصب اور ہمارے نسلی تعصب کو اپیل کرتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو نوجوانوں کی تنظیم کے لیے انجیل کے پانچویں حکم (تمھیں کسی کو جان سے مارنا نہیں ہوگا) کو منسوخ قرار دیتا ہے اور قتل و غارت اور خون ریزی اور جنگ کو اعلیٰ ترین کام قرار دیتا ہے۔ گویا ہم پہلے ہی کافی جنگ جو اور جھگڑالو نہیں تھے۔ یہ وہ شخص ہے جو ہمارے جنونی جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ گویا ہم پہلے ہی ان کی وجہ سے جانور نہیں تھے۔ ایسے شخص کا ذہن خود حیوانیت کا مظہر ہوتا ہے۔ چاہے عام معنی میں یہ شخص کتنا دانشمند، کتنا صاحب عمل اور کتنا چالاک اور مستعد ہی کیوں نہ ہو۔ اصل میں بے چاری دانشمندی کی نازک پری ہمارے وجود میں ایک وحشی جانور، ایک جن کے ساتھ بندھی پڑی ہے۔ یہ وحشی جانور، ہمارا وہ حیوانی ورثہ ہے جو ہم تک پہنچا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دانش کی یہ پری ایک پتلی اور پرانی سی رسی سے اس وحشی جانور، اس جن کو مقید رکھتی ہے۔ مگر یہ قید عارضی ہوتی ہے۔ کسی وقت یہ رسی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ جن، وہ وحشی جانور آزاد ہو جاتا ہے پھر یہ وحشی کھل کھیلتا ہے اور ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ہم ''مہذب'' ہوتے ہوئے بھی زندگی اور وحشت کے کتنے قریب ہیں اور تہذیب کا ملمع کتنا ہلکا ہے اور یہ تہذیب کتنی سطحی ہے۔ ایسے موقعوں پر ساری تہذیب دھری رہ جاتی ہے۔ عرب، عیسائیوں کے خون سے ہاتھ رنگتے ہیں اور عیسائی، عربوں کو مارتے ہیں۔ حبشی، سفید اقوام پر حملے کرتے ہیں اور سفید فام لوگ حبشیوں کو گولی سے اڑاتے ہیں۔ جنگلی چوہے، اپنے اپنے بلوں سے نکل کر انسانی لاشوں کی بوٹیاں نوچتے ہیں اور آسمان پر گدھ اس انسانی لاشوں کی ضیافت پر منڈلاتے ہیں اور یہ سب کچھ ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ جانور آخر ہمارے بھائی ہیں۔ یہی وہ تجربے ہیں جو قدرت ہمارے لیے عمل میں لاتی ہے۔

تجزیہ نفسی کا طریق علاج یہ ہے کہ دماغی مریضوں کو ان کا ماضی یاد دلایا جائے اور انھیں اپنی زندگی کو خارجی انداز سے دیکھنا سکھایا جائے اگر انسانیت بھی اپنے ماضی پر زیادہ غور کرے تو انسانوں کو اپنے اوپر زیادہ

قابو، زیادہ اختیار حاصل ہو جائے۔ شاید یہ احساس کہ ہم ایک حیوانی ورثے کے وارث ہیں اور حیوانیت سے اب بھی بہت زیادہ قریب ہیں، ہمیں وحشی جانوروں کی طرح برتاؤ کرنے بلکہ وحشی جانور بن جانے سے روک سکے!

مگر اس صورت حال کا علاج کیا ہے کہ ہمارا تنقیدی ذہن بڑا کمزور اور بے حس سا ہے۔ غور و فکر سے زیادہ امید لگانی فضول ہے۔ پھر معقولیت بھی کم ہی ہمارے کام آتی ہے۔ اصل میں ہمارے لیے راستہ یہ ہے کہ ہم معقولیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ہمارا تفکر، ہماری سوچ بچار جذبات سے عاری نہ ہو، ہمدردی اور حلم سے خارج نہ ہو۔ اس میں جبلت اور وجدان کا بھی پورا دخل رہے۔ یہی چیز ہے جو ہمیں اپنے اجداد کی طرح کا حیوان بننے سے بچا سکتی ہے۔ ہمیں زندگی کو اس طرح پروان چڑھانا ہے کہ وہ ہماری جبلتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ ہماری سلامتی بس اس میں ہے میرے نزدیک خیالات کی تہذیب و تعلیم کے بجائے ہمارے حواس اور ہمارے جذبات کی تہذیب و تعلیم کہیں زیادہ ضروری ہے۔



چوتھا باب

انسانیت پرستی

1- انسانی شرف اور وقار

گزشتہ باب میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ انسان کو اپنے آبا سے کیا ورثہ ملا ہے۔ حیوانوں اور انسانوں میں کیا کچھ باتیں مشترک ہیں اور ان کا انسانی تہذیب کے نہج اور نوعیت پر کیا اثر پڑا ہے۔ مگر یہ تصویر ابھی مکمل نہیں ہوئی...... انسانی فطرت اور انسانی شرف کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ابھی کچھ اور باتوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے...... شرف انسانی کیا دلفریب ترکیب ہے۔ اس کی اہمیت پر زور دینا ضروری ہے اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ یہ انسانی شرف ہے کیا۔ مبادا ہم ساری بحث ہی غلط اور مبہم بنا دیں۔ کیونکہ اس بیسویں صدی میں تو یہ خطرہ بڑا واضح نظر آتا ہے کہ ہم اپنی انسانی عظمت اور شرف کو یکسر کھو ہی بیٹھیں۔

آپ پوچھیں گے۔ ''اگر تم انسان کو حیوان ہی سمجھنے پر مصر ہو تو کیا انسان سب سے زیادہ حیرت انگیز حیوان نہیں؟'' ...... میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے۔ جس نے ایک تہذیب ایجاد کی اور یہ وہ ایجاد ہے جسے کسی طور بھی غیر اہم نہیں کہا جا سکتا۔ ہوسکتا ہے آدمی سے بہتر حیوان بھی اسی دنیا میں ہوں جن کا جسم اور جسمانی ساخت انسانوں سے کہیں بہتر ہو۔ جیسے گھوڑا ہے یا انسان سے بہتر اور مضبوط رگ پٹھے اور مچھلیاں ہوں۔ جس کی مثال شیر ہے۔ کتے میں بھی انسان سے کہیں زیادہ سونگھنے کی طاقت موجود ہے، اس میں وفاداری بھی زیادہ ہے۔ عقاب کی آنکھیں انسان کی آنکھوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ رخ اور سمت کا احساس کبوتروں میں انسان سے کہیں بہتر ہے۔ چیونٹیاں، انسان سے کہیں زیادہ محنتی، منظم اور کفایت شعار ہوتی ہیں۔ فاختہ اور ہرن انسان سے کہیں زیادہ حلیم اور خوش مزاج ہیں۔ گائے میں انسان سے زیادہ قناعت اور صبر ہوتا ہے۔ بلبل اور دوسرے گانے والے پرندے انسان سے زیادہ سریلے اور خوش آواز ہوتے ہیں۔ طوطے اور مور انسان سے کہیں زیادہ خوش پوش اور خوش لباس مخلوق ہیں ان سب باتوں کے

باوجود، بندر میں کچھ ایسی بات ہے کہ میں ان جانوروں پر بندر کو ترجیح دیتا ہوں۔ انسان میں جو بندروں کی ایسی چالاکی اور مستعدی اور کرید کا جذبہ موجود ہے، اسی کی وجہ سے میں انسان ہونا پسند کرتا ہوں۔ یہ مانا کہ چیونٹیاں بڑی منظم اور بڑی معقولیت پسند مخلوق ہیں اور ان کا طرز حکومت، آج کل کی کسی حکومت سے کہیں زیادہ مستحکم اور پائندہ ہے مگر کیا چیونٹیوں کے پاس لائبریریاں اور عجائب گھر بھی ہیں؟ جب کبھی چیونٹیاں یا ہاتھی دنیا کی سب سے بڑی دوربین ایجاد کرلیں گے یا کوئی نیا اور ہر آن رنگ بدلنے والا ستارہ دریافت کرلیں گے یا کبھی سورج گرہن کی پیش گوئی کرسکیں گے یا جب کبھی مچھلیاں ریاضی میں نئے فارمولے ایجاد کریں گی یا جب کبھی اود بلاؤ بھی نہر پانامہ جیسی نہر کھودنے میں کامیاب ہوجائیں گے تو میں اس دنیا کا نظام ان کے حوالے کردوں گا۔ انھیں کائنات کا مالک سمجھوں گا۔ اور انھیں ہر مخلوق سے اشرف مخلوقات قرار دوں گا۔

تو گویا انسان کو اپنے کارناموں پر فخر کرنا چاہیے مگر یہ تحقیق کرلیجیے کہ ہمیں کس چیز پر اترانا ہے؟ یعنی انسانی عظمت اور شرف کی روح، اس کی اصل کیا ہے؟

اس کتاب کے شروع میں، میں نے عرض کیا ہے کہ انسان کی عظمت میں ایک آوارہ گرد کی فطرت کے چار عناصر شامل ہیں۔ اسی آوارہ گرد کو چینی ادب نے آسمان پر چڑھا رکھا ہے۔ آوارہ گرد کے چار عناصر یہ ہیں؟ ہر دم جواں تجسس، خواب دیکھنے کی صلاحیت، زندہ دلی اور ظرافت جوان خوابوں کی اصلاح کرسکے اور آخری عنصر یہ ہے کہ مزاج میں تلون ہو۔ کچھ پتا نہ چلے کہ وہ کس موقع پر کیا کر بیٹھے گا۔ یہ وہ عناصر ہیں جو مل کر فرد کے بارے میں چینی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انفرادیت پسندی کا اس سے بہتر کوئی بیان دنیا میں موجود نہیں جیسا کہ چینی ادب نے آوارہ گرد کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود امریکی انفرادیت پسندی کے عظیم ترین ترجمان والٹ وٹمین کو ''دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے شاندار کاہل'' بھی کہا گیا ہے۔

2- تجسس اور انسانی تہذیب کی ابتدا

آوارہ گرد انسان نے تہذیب کے زینے پر کیسے قدم رکھا؟...... ابتدا میں اس میں اس صلاحیت کے کیا آثار نظر آئے ہوں گے، اس کی بڑھتی ہوئی ذہانت کے آثار کیا ہوں گے؟ اس کا جواب انسان کا شوخ تجسس ہے اس جذبے کی بدولت انسان نے شروع شروع میں ہاتھوں سے کام لینا شروع کیا، ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھا تاکہ اس کا معائنہ کیا جائے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج بھی بندر، فرصت کے لمحوں میں، اپنے

ساتھی کی آنکھ کا پپوٹا الٹ کر دیکھتا ہے یا اس کے کان کی لو مروڑ کر دیکھتا ہے کہ پیچھے جوئیں ہیں یا نہیں یا محض مروڑنے کی خاطر مروڑ کر دیکھتا ہے۔ کسی چڑیا گھر میں جا کر بندروں کا ایک جوڑا دیکھیے جو ایک دوسرے کے کان اینٹھتے رہتے ہیں اور یونہی ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ آپ کو فوراً کسی نیوٹن کسی آئن سٹائن کے پیدا ہونے کے آثار مل جائیں گے۔

چنانچہ جب انسانی ہاتھوں نے بے مقصد طور پر چیزوں کو الٹ پلٹ کرنا شروع کیا تو یہ بڑی اہم تبدیلی تھی اور یہ ایک سائنسی حقیقت بھی ہے کیونکہ تہذیب کی بنا اس وقت پڑی جب انسان (بن مانس) نے چار ہاتھ پاؤں پر چلنا چھوڑا، سیدھا کھڑا ہو گیا اور دو ٹانگوں والا حیوان بن گیا۔ گویا اس طرح انسان کے ہاتھ پہلی دفعہ کام کے لیے آزاد اور فارغ ہوئے۔ آج بھی ہم بلیوں میں دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے کے پنجے جب چلنے کے کام سے فارغ ہوں تو ہر چیز کو الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ تہذیب بندروں کے بجائے بلیوں سے شروع ہوتی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بلیوں کے اگلے پنجے بندروں کے پنجوں کی بہ نسبت بہت کم ترقی یافتہ ہیں۔ بندروں کے پنجے شاخیں پکڑنے اور درختوں سے جھولنے کی وجہ سے کافی ترقی یافتہ تھے۔ ان میں انگلیاں پوری طرح بن چکی تھیں۔ بلی کے پنجے، صرف پنجے ہیں جو رگ پٹھوں اور گوشت کے ایک لوتھڑے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔

اس وقت میں یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ میں سند یافتہ ماہر حیاتیات نہیں ہوں۔ میں انسانی ارتقا کی تاریخ کو انسانی ہاتھوں کی اس آزادی اس ''فراغت'' سے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے وہ باتیں کہنی ہیں جو ممکن ہے دوسروں نے نہ کہی ہوں، یا دوسروں نے ان کا مشاہدہ بھی نہ کیا ہو۔ خیر، انسان جب پنجوں کے بل چلنے کے بجائے سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کے ہاتھ چلنے کے بجائے دوسرے کاموں کے لیے فارغ ہو گئے تو اس کے بڑے دوررس نتائج نکلے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان نے ہاتھوں سے آوزاروں کا استعمال سیکھا۔ اسی سے حیا اور شرم کا احساس پیدا ہوا۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کو زیر کیا گیا۔ غالباً اسی کی بدولت زبانوں کا وجود ہوا۔ اور اسی کی بدولت انسان میں تجسس کی شوخی پیدا ہوئی اور دریافت کا مادہ پیدا ہوا یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اوزاروں کی ایجاد سے انسانی تہذیب شروع ہوتی ہے اور اوزاروں کی ایجاد اس لیے ممکن ہوئی کہ انسانی ہاتھ ترقی پاتے پاتے موجودہ صورت کو پہنچ چکے تھے۔ کروڑوں برس پہلے جب انسان نما بڑا بندر درخت سے اتر کر

زمین پر رہنے لگا تو غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا جسم بہت بھاری بھرکم ہو چکا تھا۔ زمین پر آ کر اس کے سامنے دو راہیں تھیں کہ یا تو لنگور کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا رہے اور یا بن مانس کی طرح صرف پچھلے پاؤں پر چلنا سیکھے۔ انسان کا جدِ اعلیٰ لنگور نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ چوپایہ ہے اور اس کے اگلے پنجے چلنے کے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے برعکس بن مانس نے اپنی پچھلی ٹانگوں پر چلنا سیکھ کر اپنے سامنے والے پنجے فارغ کر لیے تھے۔ چنانچہ بن مانس کی چال چل کر اس انسان نما بندر نے اپنے ہاتھوں سے (اپنے منہ سے نہیں) پھل توڑنے سیکھ لیے۔ اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا کہ اس نے ایک اونچی چٹان پر، ایک غار میں رہنا شروع کر دیا۔ اور جب کبھی کسی دشمن کا خطرہ ہوتا تو وہ اس بلندی سے پتھر لڑھکاتا اور دشمنوں پر اپنے اگلے پنجوں سے کنکروں، پتھروں کی بارش کرتا۔ غالباً یہ پہلا اوزار تھا جو انسان نے استعمال کیا۔ ممکن ہے اسے بے مقصد تلاش کرتے وقت تیز دھار والے پتھر، گول پتھروں کی بہ نسبت دشمنوں کو مارنے کے لیے زیادہ کارآمد ہیں۔ چیزوں کو الٹ پلٹ کرنے کے سادہ سے عمل نے (مثلاً کان کی لو کو آگے پیچھے دونوں طرف سے دیکھنے کی کم سے) اس انسان نما بندر میں یہ ملکہ پیدا کر دیا ہو گا کہ وہ چیزوں کو ایک کل کی حیثیت سے تصور میں لا سکے۔ چنانچہ اس کے ذہن میں مکمل چیزوں کی تصویریں بڑھتی گئیں اور اسی کی بنا پر دماغ کے سامنے کے حصے وجود میں آئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جنسی معاملوں میں شرم و حیا کی بنیاد بھی، انسانوں کے پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونے، اس سیدھے قد کی وجہ سے ہے۔ یہ شرم و حیا جانوروں میں بالکل مفقود ہے۔ انسان میں اس شرم و حیا کی ایک خاص وجہ یہ نظر آتی ہے کہ جب آدم نما بندر چوپائے کے بجائے دوپایہ ہو گیا تو اس کے جسم کے وہ حصے جو پہلے عقبی تھے اب اس کے جسم کے عین درمیان میں آ گئے۔ اور جو اعضا عین پیچھے ہوتے تھے اب وہ عین سامنے آ گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور بے ترتیبی بھی ہوئی۔ اس الٹ پھیر کا زیادہ اثر مادہ پر ہوا کہ کئی کئی دفعہ اس نئی قسم کی مادہ کا بچہ ضائع ہو گیا اور حیض وغیرہ بھی بے قاعدہ اور تکلیف دہ ہو گیا۔ کیونکہ ہمارے رگ پٹھے، مجھلیاں وغیرہ اس صورت میں تھے کہ ہم چوپایے رہتے۔ مثلاً سوریا کے پیٹ میں اس کے جنین (کچے بچے) اس صورت میں ہوتے ہیں کہ جنین کی یہ تھیلی حاملہ کی ریڑھ کی ہڈی سے لٹکتی رہتی ہے۔ مثال یہ ہے کہ جس طرح الگنی پر آپ نے کپڑے ڈال رکھے ہوں۔ اس صورت میں وزن اور لنگر دونوں مناسب طریقے پر بٹے رہتے ہیں۔ انسانی ماں کو حمل کی حالت میں سیدھا کھڑا کرنا قدرت کی ایسی ستم ظریفی ہے گویا کپڑوں کی الگنی کو ہم نے

زمین کے متوازی نہیں رکھا بلکہ اس کا رخ آسمان کی طرف کر دیا اور لطف یہ ہے کہ کپڑوں سے یہ امید بھی رہے کہ وہ اپنی جگہ ٹھیک لٹکے رہیں۔ اصل میں عورتوں کی یہ الگنی اس لیے بنائی نہیں گئی تھی اگر ہم روز ازل ہی سے دو پایے ہوتے تو اس کی یہ صورت کبھی نہ ہوتی اور یہ ہمارے شانوں کے ساتھ بہتر صورت میں واصل ہوتی اور پھر سارا کام ٹھیک رہتا۔ جن حضرات کو انسانی جسم، اس کے اعضا وغیرہ سے اچھی واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ انسانی رحم اور انڈے دانی کتنے عجیب اعضا ہیں۔ عقل نہیں مانتی کہ اس قسم کے اعضا اپنی جگہ رہ سکیں اور پھر کام بھی کر سکیں۔ زیادہ تعجب اس بات کا ہے کہ رحم اور انڈے دانی کی جو پوزیشن اس وقت انسانی جسم میں ہے، اس جگہ رہ کر یہ اعضا اب سے کہیں زیادہ گڑبڑ اور بیماریاں اور حیض کی ہزار گنا زیادہ خرابیاں کیوں پیدا نہیں کرتے؟ اصل میں ایام کا یہ مسئلہ ایسا ہے کہ آج تک پوری طرح نہ کسی کی سمجھ میں آیا ہے نہ اس کی وضاحت ہو پائی ہے۔ خیر یہ مانا کہ ایام، کا آنا اس لیے ضروری ہے کہ عورت بچے پیدا کر سکے۔ پھر بھی یہ سارا نظام کچھ بڑا طویل، بڑا تکلیف دہ اور ناقص ہے اور یہ ساری خرابی اس بات کی ہے کہ ہم پہلے چوپایے تھے مگر اب دو پایوں میں ڈھل گئے ہیں۔

مردوں کے عورتوں پر غالب آنے کی تہ میں یہی چیز ہے۔ اسی وجہ سے عورتیں مغلوب ہوئیں اور غالباً اسی کی وجہ سے ہمارا معاشرہ یہ صورت پا سکا جو اس کی اس وقت ہے۔ میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر انسانی ماں، دو پایے کے بجائے چوپایہ ہوتی تو کبھی خاوند سے مغلوب نہ ہوتی۔ خیر جب انسان نما بندر نے دو پیروں پر چلنا سیکھ لیا تو بیک وقت دو باتیں ظہور میں آئیں اور یہ دو باتیں انسانی معاشرے کی تاریخ میں نہایت اہم ہیں۔

پہلی بات یہ تھی کہ اب مادہ اور نر دونوں (چلیے عورت اور مرد ہی سہی) کچھ بیکار اور نکمے سے ہو گئے۔ ان میں کرید اور تجسس بھی بڑھ گیا اور انھیں چھیڑ چھاڑ اور چہل کا وقت بھی ملا چنانچہ پیار کے جذبات نے بھی نئی نئی راہیں ڈھونڈ لیں۔ اس وقت تک، چوما چاٹی کچھ ایسی خوش مزہ نہ تھی۔ غالباً ایک دوسرے کو چومنے میں اتنی آسانی بھی نہ تھی (اب بھی دیکھ لیجیے کہ انسان نما بندر کے جبڑے آگے کو نکلے ہوئے ہوتے ہیں اور ہونٹ کافی سخت ہوتے ہیں اور ایسے ٹھس ہونٹوں سے چومنا کیا معنی رکھتا ہے) مگر اگلے پنجے آزاد ہو کر اب ہاتھ بن چکے تھے اور اب ان ہاتھوں نے نئی نئی اور زیادہ لطیف اور زیادہ ہلکی پھلکی حرکات کرنا سیکھ لیا تھا۔ یہ ہاتھ اب دلار

سے تھپک سکتے تھے، سہلا سکتے تھے، گدگدیاں کر سکتے تھے، اور آغوش میں لے کر بھینچ سکتے تھے۔ اور یہ ساری حرکتیں ہاتھوں سے اتفاقاً ہی سیکھ لی تھیں، ورنہ شروع شروع میں تو ہاتھ ایک دوسرے کے جسموں سے جوئیں نکالنے میں ہی مصروف رہا کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر ہمارے ان اجداد کے جسموں میں جوئیں نہ ہوتیں تو ہماری عشقیہ شاعری کبھی وجود میں نہ آتی، یہ کبھی پروان نہ چڑھتی۔ بس ہاتھوں نے ایک دوسرے کے جسموں سے جوئیں نکالیں اور اسی کام کی بدولت جسموں کو سہلانا اور تھپکانا اور پیار کرنا سیکھ لیا۔ اس سے ہمارے نفسانی جذبات کی ترقی میں کافی مدد ملی۔

یہ تو ایک رخ تھا، دوسری بات جو اس وقت کے انسانی معاشرے میں در آئی، یہ تھی کہ دو پیروں پر چلنے والی انسانی مادہ کو اب حمل میں کافی مدت تک بیکار اور قریب قریب محتاج سا رہنا پڑتا تھا۔ شروع شروع میں جب انسان نما بندر پچھلے پیروں پر کھڑا ہوا اور ابھی اس صلاحیت کے حصول کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا تو حاملہ مادہ کے لیے پیٹ میں بچہ لے کر بوجھ اٹھائے اٹھائے چلنا پھرنا سخت دوبھر تھا۔ کیونکہ اس وقت تک ٹانگوں میں اتنی قوت نہ آئی تھی، نہ ایڑیاں اس طرح بنی تھیں کہ کوئی سیدھا کھڑا ہو کر چلے تو اس کا بوجھ اٹھا لیں۔ پھر کولے ابھی اتنے نہیں بھرے تھے کہ بڑھے ہوئے پیٹ کا بوجھ متوازن ہو جائے۔ چنانچہ شروع شروع کے دور میں اس دو پائے کی حالت یقیناً یہ ہوگی کہ جب کوئی نہ دیکھتا ہو تو بے چاری حاملہ مادہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر پھر چاروں ہاتھوں پاؤں پر چلتی ہوگی تاکہ ریڑھ کی ہڈی کو کچھ تو سکون ملے، کچھ تو کمر کی تھکن دور ہو۔ یہ تکلیفیں اور پھر عورتوں والی دوسری ''تکلیفیں'' ذرا ذہن میں رکھیے۔ ان کی وجہ سے انسانی ماں ہمدردی اور نگرانی کی محتاج ہوئی۔ اور اس نے ہر قسم کے چلتر کر کے یہ چیزیں حاصل کرنی شروع کیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی حیثیت سے عورت نے اپنی ابتدائی دور میں اپنی خود مختاری، اپنی آزادی، اپنے ہاتھ سے کھو دی۔ خدارا، ذرا انصاف کیجیے کہ بچے کی پیدائش کے ایام میں بھی عورت پیار بھرے ہاتھوں کے لمس، ان کی تھپک کی بھوکی رہتی ہے۔ ایک خرابی اور ہوئی۔ سیدھا کھڑا ہو جانے سے اب اس ماں کے جو بچہ پیدا ہوا اس کا بچپن بھی دوسرے حیوانوں کی بہ نسبت بہت لمبا ہو گیا۔ کیونکہ انسانی بچے کے لیے دو ٹانگوں کے سہارے چلنا سیکھنا کافی مشکل کام تھا۔ گائے کا بچہ اور ہاتھی کا بچہ قریب قریب پیدا ہوتے ہی چاروں پاؤں پر اچھلنا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر انسان کے بچے کو دو قدموں پر چلنے کے لیے کم سے کم دو تین سال چاہئیں اور بھلا اس بے بسی کے زمانے میں

اس بچے کی رکھوالی ماں نہ کرے تو کون کرے۔(1)

اب انسانی ترقی کی ایک بالکل نئی راہ نکلی......اصل میں انسانی معاشرے کی بنایوں ہوئی تھی کہ انسان کی روزمرہ کی زندگی کو مسئلہ جنس نے بالکل مختلف رنگوں میں رنگ دیا۔ حیوانوں کے مقابلے میں عورت کہیں زیادہ شعوری طور پر اور زیادہ مستقل طور پر مادہ بن گئی۔ چنانچہ حبشن، مادہ چیتے کے مقابلے میں اور شہزادی، شیرانی کے مقابلے میں کہیں زیادہ باشعور تھی۔

اس طرح مرد اور عورت میں وہ فرق، وہ نمایاں تفریق شروع ہوگئی، جواب ہماری تہذیب کا جزو ہے۔ مثلاً جانوروں میں قدرت نر کو بناتی سنوارتی تھی اور وہ خود بھی بنتا سنورتا تھا لیکن انسانوں میں مادہ نے بنتا سنورنا شروع کیا۔ غالباً سب سے پہلے اس نے اپنے چہرے اور اپنی چھاتی سے بال نوچ نوچ کر صاف کر دیے۔ یہ سب چالیں تھیں، بقا کے لیے اور ہم ہر روز جانوروں کو بھی یہی کچھ کرتے دیکھتے ہیں مثلاً ایک شیر حملہ اس لیے کرتا ہے کہ اپنے دشمن کے مقابلے میں وہ زندہ رہے۔ کچھوا چھپ جاتا ہے کہ جیتا بچا رہے۔ گھوڑا خطرے سے بھاگتا ہے کہ جان بچی رہے اسی طرح عورتوں کی محبت اور حسن چلتر، سب بچاؤ اور بقا کے حیلے ہیں۔ غالباً انسانی مادہ نے ابتدا ہی میں جان لیا تھا کہ مرد کے بازوؤں میں زور زیادہ ہے، اس سے لڑنے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس لیے کیوں نہ رشوت دو؟ کیوں نہ اس کے جی کو پرچایا جائے؟ کیوں نہ اسے خوش رکھا جائے؟ آج کی تہذیب کی اصل یہی ہے اور یہی آج کی تہذیب کا مقصد نظر آتا ہے کہ عورتیں مردوں کو لبھانے پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔ کیونکہ انسانیت کی ابتدا ہی میں، عورت نے جان لیا کہ مرد کو دھتکارنے اور اس پر حملہ کرنے کے بجائے اسے لبھانا چاہیے اور اپنا مقصد زور اور قوت سے حاصل کرنے کے بجائے نرمی سے حاصل کرنا چاہیے تہذیب کیا ہے؟ تہذیب بھی تو نرمی ہی کا نام ہے۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ تہذیب مردوں سے نہیں، عورتوں سے شروع ہوئی۔

میں تو یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ بے مقصد ٹرٹر میں بھی مردوں کے بجائے عورتوں نے کہیں زیادہ

1- انسانی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ والدین کی نگرانی کا یہ عرصہ بڑھتا گیا۔ وحشی اقوام میں آج بھی چھ سات سال کا لڑکا پوری طرح مالک ومختار ہے۔ لیکن تہذیب یافتہ ماحول میں ایک بچہ کم وبیش 25 سال میں روٹی کمانا سیکھتا ہے اور غالباً ساری عمر سیکھتا ہی رہتا ہے۔(مصنف)

حصہ لیا ہے۔ یہی وہ شے ہے جسے آج کل ہم زبان کہتے ہیں! عورتوں میں ٹیں ٹیں کرنے کی عادت اتنی راسخ ہے کہ یقیناً عورتوں نے مردوں سے کہیں زیادہ انسانی زبان کو ترقی دینے میں ہاتھ بٹایا ہوگا۔ میرا خیال ہے، ابتدائی مرد، کافی سنجیدہ اور خاموش ہی مخلوق تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی زبان اس طرح شروع ہوئی ہوگی کہ پہلے پہلے جب انسان نما نر باہر شکار پر ہوں گے تو دو ہمسائیاں اپنے اپنے غاروں یا گپھاؤں کے دروازوں پر بیٹھی، یہ باتیں کرتی ہوں گی کہ زید، عمر سے بہتر ہے یا عمر زید سے بہتر ہے۔ ایک یہ کہتی ہوگی کہ رات کو زید اختلاط میں کچھ زیادہ ہی حماقتیں کرتا رہا اور پھر وہ کتنی جلدی غصے ہو جاتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی باتوں سے انسانی زبان وجود میں آئی ہوگی۔ دوسری کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ اب انسانی جبڑے کو لیجیے۔ شروع میں چوپایوں کی حالت میں جبڑے کو دو کام کرنے پڑتے تھے۔ ایک تو یہ کہ خوراک اٹھائے اور دوسرے یہ کہ خوراک چبائے۔ اب جب ہاتھوں سے منہ میں لقمہ ڈالنے کا کام شروع ہو یا تو جبڑوں کو بھی کم محنت کرنے کی عادت ہوگئی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ جبڑا پیچھے ہٹتا گیا کچھ اور چھوٹا بھی ہوگیا۔ اس وجہ سے بھی انسانی زبان کے ارتقا میں مدد ملی۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جب ہم چار ہاتھ پاؤں پر چلنے کے بجائے دو پاؤں پر سیدھے کھڑے ہو گئے تو ہاتھ فارغ ہو گئے اور ان ہاتھوں کو چیزیں الٹ پلٹ کرنے اور انھیں اندر باہر سے دیکھنے کے لیے خاصی فرصت مل گئی۔ اس فرصت کا اظہار شروع میں ایک دوسرے کے جسموں سے جوئیں نکالنے کی صورت میں ہوتا تھا۔ جوئیں نکالنے سے ہی ہاتھوں کو تجسس کی عادت پڑی اور پھر علم کی کھوج کی بنیاد پڑی۔ آج بھی علمی ترقی اسی کا نام ہے کہ وہ ''جوئیں'' تلاش کی جائیں جو انسانی معاشرے کو پریشان کر رہی ہوں۔ لاکھوں سال کے عرصے میں اب یہ تجسس ہماری جبلت بن چکا ہے۔ یہ جبلت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ہر مضمون، ہر میدان اور ہر معاشرتی خرابی کی ٹوہ لگائے اور جس قدر بن پڑے تحقیق، تفتیش سے کام لے۔ یہ خالص ذہنی کام ہے اور اس کا روٹی کی تلاش سے کوئی واسطہ نہیں، یہ خالص انسانی روح کا تقاضا ہے۔ جس طرح بندر ایک دوسرے کے جسموں سے جوئیں اس لیے تلاش نہیں کرتے کہ انھیں کھا سکیں بلکہ اس کام میں ان کے لیے کھیل کا سا لطف اور مزہ ہے۔ اسی طرح یہ خصوصیت ان تمام انسانی علوم اور اس علمیت میں ہے جو انسان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ان علوم میں انسان کی دلچسپی، ان کی ذات سے ہوتی ہے۔ انسان کے دل کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان علوم کو

جانے۔ جس صورت میں بھی وہ علوم ہیں، ان پر حاوی ہو جائے۔ وہ ان علوم کو اس لیے حاصل نہیں کرتا کہ ان کی بدولت راہ راست یا فوری طور پر، روٹی کمانے اور پیٹ پالنے میں مدد ملے گی۔ بلکہ علم حاصل کرنا اب انسان کے لیے ایک جبلی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ علوم کے لیے اس تشنگی کا انسانی شرف اور وقار کی تعمیر میں بہت بڑا حصہ ہے۔ علم یا علم حاصل کرنے کی کوشش، ایک قسم کا کھیل ہے۔ دنیا کی تاریخ میں جن سائنس دانوں اور موجدوں نے کچھ کر کے دکھایا ہے وہ علم کو ایک کھیل، ایک جی بہلاوا سمجھتے رہے ہیں۔ یہی حال طبی تحقیق کرنے والے ڈاکٹروں کا ہے۔ وہ انسانوں کی بہ نسبت جراثیم میں کہیں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے ماہرین فلکیات کا بھی یہی حال ہے، وہ ایک ایسے ستارے کی گردش اور اس کی حرکات، سکنات کا صحیح نقشہ تیار کرنے میں جان لڑا دیتے ہیں، جو زمین سے کروڑوں میل دور ہوتا ہے اور جس کا زمین اور زمین کے باسیوں سے کوئی تعلق ہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ کسی طور انسانی زندگی پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ قریب قریب سب حیوانوں، خصوصاً تھوڑی عمر والے حیوانوں میں کھیلنے کا یہ مادہ ودیعت کیا گیا ہے۔ مگر یہ شرف صرف انسان کو حاصل ہے کہ اس شوخ اور تفریحی قسم کے تجسس سے کیا کیا کام لے، اور انسان ہی نے اس جذبے کو اتنی ترقی بھی دی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مجھے ہر قسم کی پابندی اور احتساب سے سخت نفرت ہے۔ مجھے ان اداروں اور ان حکومتوں سے بھی دلی بیر ہے جو ہمارے خیالات اور پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ احتساب اور یہ حکومت دونوں مل کر انسانی ذہانت کی جان بوجھ کر توہین کر رہے ہیں اگر خیال کی آزادی کو انسانی ذہن کی سب سے اعلیٰ سرگرمی مانا جائے تو اس آزادی پر کوئی قید لگانا، انسان کی حیثیت سے، ہماری سخت توہین ٹھہری۔ یونان کے مشہور ڈرامہ نگار 'یوری پی ڈیز' نے ایک جگہ غلام کی یہ تعریف کی ہے کہ غلام وہ شخص ہے جو خیال اور رائے کی آزادی کھو چکا ہو! اس حساب سے ہر جابر اور مطلق العنان حکومت کو ایسا کارخانہ سمجھیے جو دن رات سانچوں میں ڈھلے ہوئے غلام تیار کرتی رہتی ہے۔ ذرا مشرق و مغرب پر نظر دوڑائیے۔ جابر و قاہر حکومتوں کو کیسی کیسی خوبصورت مثالیں نظروں کے سامنے آتی ہیں اور یہ حکومتیں اس بیسویں صدی میں تہذیب و ثقافت کے کن کن گہواروں پر مسلط ہیں۔ جابر حکومت چاہے کسی طرح کی ہو، ذہنی لحاظ سے سخت پسماندہ اور رجعت پسند ہو گی۔ اس کی مثال قرون وسطیٰ کی ساری حکومتیں ہیں۔ خصوصاً ہسپانیہ کی مذہبی عدالت تو اس کی

بدترین تصویر ہے، جو مذہبی خیالات اور نیت پر بھی احتساب کیا کرتی تھی۔ تنگ نظر سیاست دان اور مذہبی رہنما یہی سمجھا کرتے ہیں کہ عقیدے اور خیال کی عام یکسانی امن وامان کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ مگر تاریخی اعتبار سے اس یکسانی کے نتیجے بڑے خراب ہوتے ہیں اور انسانی کردار اس کی وجہ سے بڑا گھٹیا ہو جاتا ہے۔ جابر حکمرانوں کے دل میں عام طور پر، عام لوگوں کے لیے تحقیر کا جذبہ ہوتا ہے اسی لیے وہ ایک قوم کے ظاہری کردار پر حکم چلانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ لوگوں کی نیتوں اور خیالوں اور جذبوں پر بھی پابندیاں عائد کر دیتے ہیں۔ وہ بڑے بھولپن سے یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی ذہن اس یکسانی، اس پابندی کو برداشت کر لے گا۔ انھیں یقین ہوتا ہے کہ عوام اسی کتاب، اسی فلم اور اسی موسیقی کو اچھا سمجھیں گے جسے سرکاری ڈھنڈورچی، یا حکومت کا کوئی اور نمائندہ اچھا کہے گا اور اس چیز کو برا سمجھنے لگیں گے جسے سرکاری پراپیگنڈے میں برا قرار دیا جائے گا۔ ہر جابر اور مطلق العنان حکومت نے ادب اور پراپیگنڈے کو خلط ملط کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، آرٹ کے ڈانڈے سیاست سے ملائے ہیں، انسان کے علم الارتقا کو حب الوطنی سے جا ملایا ہے اور مذہب کو حاکم کی پرستش کا مترادف قرار دیا ہے؟

مگر یہ اندھیرا کیسے ممکن ہے؟ خیالات کو کنٹرول کرنے والے یہ لوگ نہیں جانتے کہ اگر وہ انسانی فطرت کے خلاف دیر تک یونہی الٹی سیدھی کارروائیاں کرتے رہے تو وہ اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود لیں گے۔ قدیم یونانی فلسفی من سی اس کا قول ہے: ''اگر حکمران یہ سمجھے کہ رعایا خس وخاشاک ہے تو رعایا بھی یہ سمجھے گی کہ حکمران، یا تو ڈاکو ہے یا ان کا جانی دشمن!'' لہٰذا اس دنیا میں سب سے بڑا ڈاکو وہی ہے جو ہمارے خیال کی آزادی پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔ اگر خیال کی آزادی ہم سے چھین لی جائے تو ہمیں چاہیے کہ ایک بار پھر چوپائے بن جائیں اور دو ٹانگوں پر چلنے کے اس طویل انسانی تجربے کو ایک غلطی قرار دے کر اپنی پہلی حالت میں، چار ہاتھ پاؤں پر، آ جائیں جس طرح آج سے کم سے کم تین ہزار سال پہلے ہم چلا کرتے تھے۔ ڈاکو ہمیں جتنا لوٹتا ہے اتنی ہی ہمیں اس سے نفرت ہو گی۔ یہی حال اس جابر حکمران کا ہو گا۔ انسان کو اپنے ذہنی اور اخلاقی اور مذہبی عقیدے بڑے عزیز ہوا کرتے ہیں۔ یہ اس کی ذاتی دولت ہوتے ہیں۔ جو شخص اس دولت سے ہمیں محروم کر دے اور ہمیں خیال اور عقیدے کی آزادی کا حق نہ دے، اس سے ہماری نفرت کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ جابر حکمران عام طور پر کوتاہ اندیش اور احمق ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ انسانی کردار میں بڑی لچک ہے،

انسان کا ضمیر اتنا آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ اس پر کوئی طاقت غالب نہیں آ سکتی۔ چنانچہ انسانی کردار اور انسانی ضمیر، ہمیشہ جابر کی حکومت پر پوری طاقت سے وار کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں۔

3- انسان کے سپنے

کہا جاتا ہے کہ بے اطمینانی ایک روحانی چیز ہے۔ مجھے اتنا یقین ہے کہ بے اطمینانی، انسان کا خاصہ ضرور ہے اور بس......اس کائنات میں بندر پہلا غمگین جانور تھا۔ میں نے جانوروں میں افریقہ کے بڑے لنگور کے چہرے سے بڑھ کر رنجیدہ چہرہ کسی کا نہیں دیکھا۔ میں اسے فلسفی بھی سمجھتا ہوں کیونکہ تفکر اور اداسی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان لنگوروں کے چہروں میں کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ بڑا رنجیدہ لنگور نہ جانے کس سوچ میں کھویا ہوا ہے۔ باقی جانوروں میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ گائیں کبھی سوچتی نظر نہیں آتیں۔ وہ ہمیشہ اتنی مطمئن نظر آتی ہیں کہ ان کے سلسلے میں کسی تفکر کا گمان نہیں گزرتا۔ ہاتھیوں میں بڑا جوش اور قہر معلوم ہوتا ہے مگر وہ ہمیشہ اپنی سونڈ ہلاتے رہتے ہیں۔ گویا سونڈ کو بار بار جھٹکنے سے ان کا سارا غصہ، ساری بے چینی، دور ہوتی رہتی ہے اور انھیں کچھ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں رہتی مگر ذرا بندر کو دیکھیے تو وہ زندگی سے کتنا بیزار اور اکتایا ہوا نظر آتا ہے۔ اور اس اداسی میں بندر کی عظمت ہے۔

غالباً سارا فلسفہ، اکتاہٹ کے احساس سے شروع ہوا تھا۔ کم سے کم انسانوں کا یہی حال ہے کہ ان کے دل میں کسی نہ کسی نصب العین کا مبہم سا غم چٹکیاں لیتا رہتا ہے۔ یہ انسانی خاصہ ہے کہ اس ٹھوس اور حقیقی دنیا میں رہتے ہوئے بھی انسان، کسی اور دنیا کے خواب دیکھ سکتا ہے۔ غالباً انسانوں اور بندروں میں فرق یہ ہے کہ بندر صرف بیزار رہتے ہیں اور انسان میں اس بیزاری اور اکتاہٹ کے ساتھ ساتھ قوت تخیل بھی موجود ہے۔ ہر انسان کو یہ خواہش ستاتی رہتی ہے۔ کہ وہ اپنے کولھو کے چکر سے کسی طور نکلے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ جو نہیں ہے وہ بن سکے۔ یعنی ہر انسان دن رات خواب ہی دیکھتا رہتا ہے۔ سپاہی یہ خواب دیکھتا ہے کہ وہ حوالدار ہو جائے، حوالدار یہ خواب دیکھتا رہتا ہے کہ کپتان بن جائے اور کپتان، میجر یا کرنیل بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ کرنیل، اگر کسی قابل ہو تو وہ کرنیلی کو کوئی رتبہ، کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ذرا عمدہ لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ وہ اپنے رتبے کو اپنے بھائی بندوں کی خدمت کا ایک موقع تصور کرتا ہے اور اصل بات بھی یہی ہے۔ جون کرافورڈ اور ''جے نٹ گے نرجیسی بڑی ایکٹرسیں'' اپنے آپ کو وہ کچھ نہیں سمجھتیں جو دنیا انھیں سمجھتی ہے۔ دنیا عظیم انسانوں سے پوچھا

کرتی ہے: ''کیا آپ بے حد ممتاز اور عظیم نہیں ہیں؟'' اور جو لوگ حقیقی معنی میں عظیم شخصیت رکھتے ہیں جواباً یہ سوال کرتے ہیں: ''نہ معلوم عظمت سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' گویا ہماری آپ کی دنیا ایک ایسے ہوٹل کی مثال ہے جہاں ہر گاہک یہ سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے جو کھانا رکھا ہے وہ اتنا لذیذ نہیں، البتہ اسے ہر دوسرے گاہک کے سامنے جو کھانا لایا گیا ہے وہ بے حد لذیذ اور عمدہ معلوم ہوتا ہے۔ انسانی پسندیدگی کے بارے میں ایک چینی پروفیسر نے مزاحاً یہ فقرہ چست کیا تھا کہ ''بیویاں تو دوسروں کی اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر تحریر اپنی ہی دوسروں سے اچھی لگتی ہے!'' اس لحاظ سے اس دنیا میں کوئی شخص مطمئن نہیں۔ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا قالب اختیار کرلے اور وہ کچھ بن جائے جو کوئی دوسرا ہے لیکن فرض کیجیے کہ وہ ''وہ کچھ'' بن جاتا ہے۔ اب وہ ''کچھ اور'' بننے کی فکر میں رہنے لگے گا۔

انسانی فطرت کا یہ خاصہ، ہماری قوت تخیل کی بدولت ہے، ہم انسان ہوائی قلعے بنانے اور خوابوں کے محل تعمیر کرنے میں بڑے مشتاق ہیں۔ جس شخص کی قوت تخیل جتنی زبردست ہوگی اتنا ہی وہ اس دنیا سے غیر مطمئن ہوگا۔ اسی لیے تو جس بچے میں قوت تخیل زیادہ ہوتی ہے اس کی نگہداشت اور پرورش زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ وہ بندر کی طرح زیادہ وقت رنجیدہ اور ملول رہتا ہے، گائے کی طرح خوش خوش اور مطمئن نہیں رہتا۔ اسی بنا پر جو لوگ کسی نصب العین کے دیوانے ہوں، مثالیت پسند ہوں اور ان کی تخیلی قوت زبردست ہو، ان سے کسی کا نباہ دشوار ہوتا ہے۔ یہ لوگ اکثر یا تو عمر بھر اپنے مناسب جیون ساتھی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یا پھر طلاق پر طلاق دیتے لیتے رہتے ہیں۔ ایک نہایت خوش آئند زندگی کا خیالی نقشہ ان کی آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے۔ وہ ایک مثالی جیون ساتھی ڈھونڈ لینے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ وہ کسک ہے جو ان سے کم ذہن لوگوں کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ ویسے مثالیت پسندی نے انسان کو جتنا گمراہ کیا ہے اتنی ہی بلندی اور رفعت کی طرف اس کی رہنمائی بھی کی ہے۔ بلکہ تخیل کی قوت کے بغیر انسانی ترقی خیال میں آنا تو کجا، بالکل محال اور ناممکن ہے۔

کہا جاتا ہے، انسان امنگوں کا پتلا ہے۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کیونکہ امنگوں کو عام طور پر اعلیٰ اور ارفع چیزیں سمجھا جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، فرد ہو یا قوم، سبھی خواب دیکھتے ہیں، ہوائی قلعے بناتے ہیں اور پھر پانے ان خوابوں پر عمل بھی کرتے ہیں۔ بعض لوگ دوسروں کی بہ نسبت ہوائی قلعوں کے زیادہ قائل ہوتے ہیں۔ شاید

ہر، خاندان میں ایک بچہ ایسا ہوتا ہے جس میں (قوت تخیل کی بدولت) خواب دیکھنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ میرے دل میں ایسے بچے کے لیے بڑی جگہ ہے۔ عام طور پر یہ بچہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ مغموم رہتا ہے، مگر یہ کوئی فکر کی بات نہیں۔ یہی بچہ زیادہ گہری مسرت، گہرے اشتیاق اور گہرے احساسات پر قادر ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں ہمیں قدرت نے اس طرح بنایا ہے کہ ہم ریڈیو سیٹ کی طرح ہوا کی لہروں سے آواز جذب کر سکتے ہیں۔ بعض ریڈیو ایسے نازک اور عمدہ ہوتے ہیں کہ شارٹ ویو کے وہ پروگرام بھی ان پر سنے جا سکتے ہیں جو عام سیٹوں پر آتے ہی نہیں۔ یہ دور کے پروگرام ہماری نظر میں زیادہ قیمتی، زیادہ عزیز ہوتے ہیں کیونکہ ہر سیٹ پر انھیں نہیں سنا جا سکتا، اور ہر سیٹ پر ان کی خوبیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونا مشکل ہوتا ہے۔

بچپنے کے سپنوں کو یاد کیجیے، وہ اتنے غیر حقیقی نہیں ہوتے جتنے ہم سمجھتے ہیں۔ یہ سپنے زندگی بھر، کسی نہ کسی طرح، ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ اسی لیے اگر مجھے یہ اختیار ہوتا کہ میں جونسا ادیب چاہتا بن جاتا، تو میں امریکی مصنف اینڈرسن کا قالب اختیار کرتا۔ اس نے بچوں کے لیے ایک کہانی ''جل پری'' لکھی تھی۔ ایسی کہانی لکھ لینا، یا خود جل پری بن کر، جل پری کی سی باتیں سوچنا بہت بڑی چیز ہے۔ یہ سوچنا کہ ''میں جب بڑی ہو جاؤں گی تو پھر تیرتی ہوئی ان گہرائیوں سے نکل کر، سمندر کی سطح کو دیکھوں گی۔'' یہ کتنی بڑی چیز ہے۔ اتنی پیاری، اتنی گہری خوشی صرف انسان کو ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ ایک بچہ، باہر چلتے پھرتے، اپنے کمرے میں چپ چاپ بستر پر لیٹے ہوئے، یا دریا کے کنارے کھیلتے ہوئے ہمیشہ سپنے ہی دیکھتا ہے اور یہ سپنے حقیقی ہوتے ہیں۔ مشہور موجد ایڈیسن نے بھی سپنے دیکھے تھے۔ انگریزی کے نامور افسانہ نویس اور ناول انگریزی ناول نویس سٹیونسن نے بھی خواب دیکھے تھے۔ اسی طرح اپنے بچپن میں نامور انگریزی ناول نویس سر والٹر سکاٹ نے بھی سپنے دیکھے تھے۔ یہ سب طلسمی سپنے بچپن میں دیکھے گئے تھے اور ان کے تانے بانے سے وہ لطیف اور حسین داستانیں وجود میں آئیں جو ہم نے ان سے پہلی کبھی نہیں سنی تھیں۔ ان سے کمتر درجے کے بچے بھی اپنی بساط کے مطابق سپنے دیکھتے ہیں اور ان سپنوں سے اتنا ہی لطف اٹھاتے ہیں۔ ہر بچے کی روح انجانی چیزوں کی تمنا رکھتی ہے اور اپنی ان معصوم تمناؤں کی آغوش میں سو جاتی ہے اور ہر نئی صبح سے یہی امید رکھتی ہے کہ اس کے خواب حقیقت بن جائیں گے۔ یہ

سپنے کسی کو بتائے نہیں جاتے۔ یہ بالکل ذاتی چیز ہوتے ہیں۔ اسی لیے بچپن کے یہ سپنے، بچے کے پروان چڑھتے ہوئے ضمیر، اس کی روح کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ بعض بچوں کے سپنے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ ان میں وہ قوت بھی چھپی ہوتی ہے جو انھیں ایک دن حقیقت بنا دیتی ہے۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ یہ خواب ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ اور پھر ہم زندگی بھر یہی تگ و دو کرتے رہتے ہیں کہ دوسروں کو اپنے بچپن کے ان طلسمی سپنوں کا حال بتائیں لیکن بعض دفعہ موت اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ یہ سپنے زبان تک آ سکیں۔

یہ افراد ہی کا ذکر نہیں، قوموں کا بھی یہی حال ہے۔ ہر قوم کے حافظے میں اس کے خواب محفوظ رہتے ہیں۔ اور یہ خواب صدیوں نسل در نسل چلتے ہیں۔ ان میں اچھے اور اعلیٰ سپنے بھی ہوتے ہیں اور برے اور گھٹیا قسم کے بھی۔ دوسری قوموں پر فتح پانے اور غلبے کے خواب اور دوسری قوموں سے سبقت لے جانے کے خواب، ہمیشہ برے خواب ثابت ہوتے ہیں۔ جن قوموں کو ایسے خوابوں سے سابقہ ہوا نھیں، پرامن سپنوں والی قوموں کی بہ نسبت، کہیں زیادہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر اچھے خوابوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ بہتر زندگی اور بہتر دنیا کے سپنے امن وسلامتی کے خواب اور قوموں کے پرامن تعاون کے خواب، اچھے خواب ہیں۔ دنیا میں ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے، انصاف کا بول بالا کرنے، غربت اور محتاجی کو دور کرنے کے خواب، اچھے خواب ہیں مگر یہ یاد رہے کہ انسانیت کے برے خواب، اچھے خوابوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور دنیا میں ہمیشہ انہی برے اور اچھے خوابوں میں کش مکش ہوتی رہتی ہے۔ لوگ اپنے خوابوں کے لیے بھی اس طرح لڑتے ہیں جس طرح مادی چیزوں کے لیے دست و گریباں رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ سپنے، خیالی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں در آتے ہیں اور ہماری زندگی میں ایک زندہ قوت بن جاتے ہیں۔ کچھ یہ بھی قاعدہ ہے کہ ہمارے سپنے چاہے کتنے غیر واضح، کتنے مبہم کیوں نہ ہوں اور ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں چھپے رہتے ہیں اور جب تک ان خوابوں کو حقیقت نہ بنا لیا جائے یہ ہمیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ ان کی مثال بیجوں کی سی ہے جو زمین کا سینہ چیر کر روشنی اور گرمی کی تلاش میں باہر نکل آتے ہیں۔ اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ خواب بڑی حقیقی، بڑی ٹھوس چیزیں ہیں۔

البتہ ایک خدشہ ضرور ہے کہ ہمارے خواب کہیں بے حد الجھے ہوئے ہوں یا ایسے ہوں جن کا حقیقت

سے کہیں دور کا واسطہ نہ ہو۔ وجہ یہ ہے کہ سپنے فرار کی راہیں بھی ہیں اور اکثر اوقات سپنوں کے رسیا، اس حقیقی دنیا سے بھاگتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ بھاگ کر کہاں جا رہے ہیں۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ ہم جو کچھ اصل میں ہوں، اس سے مختلف بننا چاہتے ہیں۔ انسان، لگی بندھی راہوں سے ہمیشہ دور بھاگنا چاہتا ہے۔ لہٰذا جو چیز ذرا سی تبدیلی کا بھی امکان پیش کر دے، عام انسانوں کے لیے اس میں بڑی جاذبیت ہوتی ہے۔ عام لوگوں کو جنگ اس لیے اچھی لگتی ہے کہ جنگ کی بدولت ایک عام کلرک بھی فوج کی عمدہ وردی ڈالے، ہتھیار سجائے، مفت میں دور دراز کے سفر کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح تین چار برس کی بدولت تھکا ماندہ سپاہی گھر واپس آ سکے گا۔ فوج کی بے رنگ وردی اتار کر، صاف ستھرے سوٹ پہن سکے گا اور ایک بار پھر اپنی سب سے اچھی نکٹائی بھی باندھ سکے گا۔ ہم انسانوں کو اصل میں ایسے ہی کسی جوش، کسی سنسنی، کسی اشتعال کی ہمیشہ خواہش ہوتی ہے۔ اگر اب دنیا کا فیصلہ یہی ہے کہ جنگ سے ہر قیمت پر پہلو بچایا جائے تو میں بڑی بڑی حکومتوں کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ اپنے اپنے ملک میں ہر نوجوان کو جبری بھرتی کے قانون کے ماتحت فوج میں بھرتی کر لیں اور پھر ان نوجوانوں کو دوسرے ملکوں کے تعلیمی دورے پر بھیج دیں مگر حالت یہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ملک اپنی فوجوں کو مسلح کرنے پر جتنی رقم خرچ کر رہے ہیں، اس رقم سے ان ملکوں کا ہر فرد، فرانس کی سیر کر سکتا ہے۔ آپ یہ دلیل نہ لائیے کہ جنگ پر خرچ تو ایک ضرورت ہے اور سفر یا سیر و سیاحت عیاشی میں داخل ہے۔ میں آپ سے متفق نہیں ہو سکتا۔ میں تو سیر و سیاحت کو خرچ کی ضروری مد سمجھتا ہوں اور جنگ کو بہت بڑی عیاشی قرار دیتا ہوں۔

انسان کے ان سپنوں کے علاوہ اور سپنے بھی ہیں جن میں مثالی دنیا کے سپنے اور امر ہو جانے کے سپنے شامل ہیں۔ زندہ جاوید ہو جانے کے خواب دیکھنا عین انسانی تقاضا ہے (ساری دنیا یہی خواب دیکھا کرتی ہے!) مگر دوسرے انسانی سپنوں کی طرح یہ بھی بڑا مبہم اور غیر واضح خواب ہے۔ کسی کو پتا نہیں کہ اگر ازل اور ابد کا یہ چکر مٹ جائے اور ہم واقعی امر ہو جائیں تو پھر کیا ہوگا؟ اور اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ اصل میں زندہ جاوید ہو جانے کی خواہش، خودکشی کا عین الٹ ہے۔ اسی لیے دونوں کی نفسیات ایک سی ہے۔ دونوں کے سلسلے میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ یہ دنیا ہمارے لیے کوئی مناسب اور اچھی جگہ نہیں مگر کوئی پوچھے کہ آخر آپ نے اس دنیا کو کیوں ناپسند فرمایا؟ اور یہ سوال اس وقت بے حد حیرت انگیز اور صحیح معلوم ہوگا جب بہار کی کسی سہ پہر کو

آپ باہر کھیتوں کی سیر کرنے جا رہے ہوں اور ہر طرف ہریالی چھائی ہو اور پھولوں کے تختے بچھے ہوں۔

یہی حال ایک مثالی دنیا کا خواب دیکھنے والوں کا ہے۔ مثالیت پسندی ذہن کی ایک ایسی حالت کا نام ہے جو موجودہ نظام سے مختلف نظام پر اعتقاد رکھتی ہو۔ چاہے یہ خیالی نظام کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔ جو لوگ آزاد خیال کہلاتے ہیں اور مثالیت پسند بھی ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے ملک کو بدترین ملک گردانتے ہیں اور جس معاشرے کے وہ فرد ہوں اسے معاشروں کی تمام ممکن قسموں میں سے بدترین قسم سمجھا کرتے ہیں۔ یہی وہ شخص ہے جو ہوٹل میں جا کر یہ سمجھتا ہے کہ دوسرے گاہکوں کو جو کھانا دیا گیا ہے وہ اس کے کھانے سے کہیں بہتر ہے۔ ایسے ہی لوگ ''نیو یارک ٹائمز'' کے مزاج نگار کے بقول، یہ سمجھتے ہیں کہ روس میں دریائے نیپر پر جو بند باندھا گیا تھا، بس وہ ہے صحیح معنوں میں بند کہلانے کا مستحق۔ کسی جمہوریت پسند ملک نے تو کبھی کسی دریا پر کوئی بند تعمیر ہی نہیں کیا، یہ ''آزاد خیال'' لوگ کہا کرتے ہیں کہ صرف سوویت روس میں ''زیر زمین ریل'' نکالی گئی ہے۔ اس کے برعکس ذرا فاشسٹ ملکوں کے اخبار دیکھیے۔ یہ اخبار اپنے لوگوں کو یہی بتاتے ہیں کہ صرف انہی کے ملک میں انسانیت نے معقول اور عملی نظام حکومت ایجاد کیا ہے، باقی کہیں اس کا وجود ہی نہیں۔ اصل میں مثالی دنیاؤں کے خواب دیکھنے والوں اور فاشی ملکوں کے پراپیگنڈہ افسروں کا نہج ایک ہے۔ دونوں ایک ہی مرض میں گرفتار ہیں۔ ان کا علاج صرف یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اندر کسی طرح زندہ دلی اور ذوق سلیم اور ظرافت پیدا کریں۔

4- زندہ دلی اور ظرافت

غالباً زندہ دلی اور ظرافت کی اہمیت ابھی تک پوری طرح سمجھی نہیں گئی۔ شاید مہذب انسان نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ زندہ دلی اور ظرافت کے ذریعے ہماری تہذیبی زندگی کی خصوصیات تبدیل کی جا سکتی ہیں اور اس سے سیاست، علم و ادب اور عام زندگی میں کیا کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، ظرافت اور زندہ دلی دونوں کا فعل طبعی نہیں، کیمیاوی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ زندہ دلی سے ہمارے خیالات اور ہمارے تجربات کی ساری نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ کسی قوم کی زندگی میں زندہ دلی اور ظرافت بہت اہم ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت کی ایک مثال سنیے: جرمنی کے قیصر ولہلم میں یہی زندہ دلی مفقود تھی۔ اسی وجہ سے جرمنوں کو ایک پوری سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑے یا بقول امریکیوں کے، جرمنوں کو اربوں ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ شاید

قیصر ولیہلم، اپنی پرائیویٹ زندگی میں تو ہنسنے اور ٹھٹھول کا قائل ہو مگر پبلک زندگی میں وہ بے حد سنجیدہ نظر آتا تھا۔ اس کی چڑھی ہوئی مونچھوں سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر آن کسی نہ کسی چیز پر غصے سے بھرا رہتا ہے۔ رہا اس کا ہنسنا اور اس کی خوشی تو اس کی نوعیت بھی عجیب تھی۔ وہ صرف فتح، کامیابی یا دوسروں پر غلبہ پانے پر ہنس سکتا تھا۔ میرے نزدیک قیصر ولیہلم کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ کب ہنسنا چاہیے اور کس موقع، کس بات پر ہنسنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اس خوابوں پر اس کی ظرافت، اس کی ہنسی نے کبھی کوئی پہرہ نہ بٹھایا تھا، نہ ان خوابوں کو ذوق سلیم اور ظرافت نے فضول اور رائیگاں اور مضحکہ انگیز ثابت کیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ آمرانہ حکومت پر سب سے سخت اعتراض یہی ہے کہ جمہوریتوں کے صدر ہنس سکتے ہیں، مگر ڈکٹیٹر ہمیشہ سخت سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ کسی ڈکٹیٹر کو دیکھ لیجیے، جبڑا ہمیشہ سختی سے بھنچا ہوا ہوگا۔ ٹھوڑی آگے کو نکلی ہوگی اور نچلا ہونٹ، زور سے بند کی ہوئی تھیلی کی طرح ہوگا۔ دیکھتے ہی ایسا معلوم ہوگا کہ یہ بڑا اہم شخص ہے۔ جو بے حد اہم کام کرتا ہے اور دنیا صرف اسی کی کوششوں سے زندہ ہے ورنہ فنا ہو چکی ہوتی اس کے برعکس جمہوریتوں کے صدر حضرات پر نگاہ ڈالیے۔ امریکی صدر پبلک جلسوں اور اور عام صحبتوں میں مسکراتے نظر آتے ہیں۔ یہ بھلا یورپ کے ڈکٹیٹروں کی مسکراہٹیں کہاں گئیں؟ کیا ان کی رعایا انھیں مسکراتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی؟ کیا یہ ضروری ہے کہ یہ ڈکٹیٹر حضرات ڈرے سہمے نظر آئیں یا بہت بارعب بنتے دکھائی دیں۔ یا جوش میں بھرے رہیں یا بے حد سنجیدہ نظر آئیں......؟ کیا اسی صورت میں ان کی حکومت قائم رہ سکتی ہے؟ ان سب باتوں سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ڈکٹیٹروں کے لیے قہر کا مجسمہ نظر آنا یا انتہائی نخوت اور رعب کی تصویر بن جانا ضروری ہے تو پھر آمریت میں کچھ نہ کچھ بنیادی خرابی ضرور ہوگی۔ گویا اس کا مزاج اور اس کی سرگزشت ہی غلط ہے۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ ڈکٹیٹر لوگوں کی مسکراہٹ کا یہ تذکرہ دفع وقتی کے لیے کیا جا رہا ہے۔ یہ بڑی اہم اور سنجیدہ بات ہے۔ کیونکہ اگر ہمارے حکمران مسکرا نہ سکیں تو یہ ہم انسانوں کے لیے بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ وجہ یہ ہے حکمرانوں کے پاس ہی تو دنیا جہان کی توپیں اور دوسرے اسلحہ موجود ہوتے ہیں۔ وہ اگر ہنس نہیں سکتے تو لڑائی تو کر سکتے ہیں۔ آپ ذرا تصور فرمائیے کہ اگر سیاست میں خوش طبعی اور ظرافت کو دخل ہو جائے تو کیا سے کیا نہ ہو جائے۔ فرض کیجیے کہ کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اور اس میں مدبروں کے بجائے، دنیا کے چار

چھ بہترین ظریف اور ٹھٹھول لوگ حصہ لے رہے ہیں۔ اگر ان کے ملک انھیں فیصلے کے پورے اختیارات اور ہر قسم کی مراعات دے دیں تو میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کی فلاح اور بقا کا راستہ کھل جائے۔ میرے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ خوش طبعی اور زندہ دلی کے ساتھ سمجھداری اور معقولیت کا لابدی رشتہ ہے۔ گویا خوش طبعی، انسانی ذہن میں یہ ملکہ بھی پیدا کر دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی تضاد بیانی، غلط منطق، اور عام حماقت کو بہر طور، بہر رنگ سمجھ سکے۔ یہی انسانی ذہانت کی معراج ہے اگر ہر قوم بین الاقوامی کانفرنسوں میں اپنے ظرافت نگاروں کو نمائندہ بنا کر بھیجے تو مجھیے کہ معقول ترین اور زیرک ترین لوگ یہی ہوں گے۔ مثلاً جارج برنارڈ شا آئرلینڈ کی نمائندگی کریں۔ سٹیفن لی کاک کینیڈا کے نمائندے ہوں۔ چسٹرٹن فوت ہو چکے مگر پی جی وڈ ہوس، یا آلڈس ہکسلے، انگلستان کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ولیم روجر اگر زندہ ہوتے تو امریکہ کے بہترین نمائندے ثابت ہوتے مگر اب ان کی جگہ رابرٹ بنچلے یا ہے وڈ بروئن یہ فرض سرانجام دے سکتے ہیں۔ اسی طرح اٹلی، فرانس، روس اور جرمنی کے نمائندے آئیں اگر ان لوگوں کو اس وقت کسی بین الاقوامی کانفرنس میں جمع کیا جائے جب ایک عالمگیر جنگ کے بادل افق پر منڈلا رہے ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات جی جان سے بھی چاہیں تو بھی جنگ شروع نہیں کرا سکیں گے۔ تصور فرمایئے بین الاقوامی شہرت کے مالک یہ مزاح نگار کوئی جنگ شروع کرا سکتے ہیں؟ یا کسی جنگ کے لیے سازش بھی کر سکتے ہیں؟ یہ ان کی زندہ دلی، ان کی خوش مذاقی ان کے آڑے آتی رہے گی اور ہمیشہ انھیں خون ریزی اور فساد سے روکتی رہے گی۔ جب ایک قوم دوسری کے خلاف اعلان جنگ کرتی ہے تو وہ ساری قوم سخت سنجیدہ بلکہ نیم پاگل ہو جاتی ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ اور صرف وہ حق پر ہے اور خدا کی نصرت اس کے شامل حال ہے مگر ظرافت نگار ہوں یا ٹھٹھول لوگ، کوئی مرد معقول ہو یا محض زندہ دل شخص، اسے خدا نے عقل سلیم عطا کی ہے اور وہ جانتا ہے کہ حقیقت کچھ اور ہے گویا اس کانفرنس میں، جارج برنارڈ شا کھلے بندوں یہ کہہ دیں گے کہ بھائیو اصل غلطی میرے ملک آئرلینڈ کی ہے۔ ادھر برلین کے ظرافت نگار یہ کہتے ہوں گے کہ غلطی ہماری قوم کی ہے۔ امریکی نمائندہ ہے وڈ بروئن اٹھ کر صاف کہے گا کہ بھائیو، میرے ملک امریکہ نے معاملات کو خاصا بگاڑا ہے، اور اس نے کسی سے کم غلطیاں نہیں کیں! ادھر کانفرنس کے صدر سٹیفن لی کاک صاحب بڑے آرام سے اپنی صدارتی تقریر میں کہیں گے کہ انسان کافی احمق واقع ہوا ہے اور بحیثیت صدر میں انسان کی حماقتوں کی معافی چاہتا ہوں مگر یہ بھی عرض کر دوں

کہ حماقت اور کوتہ اندیشی میں کوئی قوم کسی دوسری قوم سے نہ تو کمتر ہے، نہ بہتر ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

آپ ہی فرمائیے، ان حالات میں کیسے کوئی جنگ چھڑ سکتی ہے؟ جنگ کون لوگ شروع کیا کرتے ہیں؟ ...... اس کا جواب صاف ہے۔ وہ لوگ جو جاہ طلب لوگ ہوتے ہیں اور اولوالعزم کہلاتے ہیں! وہ لوگ جو بڑے قابل، بڑے چالاک، بڑے سازشی ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو حزم و احتیاط کے پتلے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو عقل و دانش کے مجسمے سمجھے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو نخوت و تکبر سے آپے میں نہیں سماتے۔ وہ لوگ جو حب الوطنی میں حد سے زیادہ مبالغہ کرتے ہیں، وہ لوگ جو بزعم خود دنیا کی ''خدمت'' کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنی قسمت بنانا چاہتے ہیں یا دنیا کے جریدے پر اپنا ''نقش'' چھوڑنا چاہتے ہیں وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ کبھی ان کا بھی ایک مجسمہ بنے اور شہر کے بڑے چوک میں کانسی کے گھوڑے پر سوار، ان کا کانسی کا بت، اپنی بے نور آنکھوں سے آنے والی نسلوں اور صدیوں کو دیکھتا رہے۔ یہی لوگ جنگ کا موجب بنتے ہیں۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ بڑے عاقل اور فرزانہ لوگ بڑے اولوالعزم اور نخوت پسند لوگ اصل میں بے حد احمق اور بے حد بزدل ہوتے ہیں۔ ان میں وہ ہمت، وہ تہور نہیں ہوتا جو ظریف اور زندہ دل لوگوں کا حصہ ہے۔ ان میں ظریفوں کی سی گہرائی اور فہم کی تاریکی بھی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ ہمیشہ معمولی چیزوں سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ دوسری طرف ظریف اور زندہ دل لوگ اپنے ذہن کی وسعت اور براقی کی بدولت، بڑی چیزوں اور اونچی باتوں کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔ آج کل یہ حال ہے کہ جو سیاسی مدبر، پراسرار آواز اور رازدارانہ لہجے میں باتیں نہ کرے، چہرے پر خوف کے آثار پیدا نہ کرے اور ہر وقت لیے دیے نہ رہے، اسے مدبر سمجھا ہی نہیں جاتا مگر دنیا کو بچانے کے لیے ظرافت نگاروں کی کسی بین الاقوامی کانفرنس کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ آخر ہم سب میں خدا نے خاصی مقدار میں ظرافت کا ذوق، یہ سوجھ بوجھ پیدا کی ہے۔ اس لیے جب جنگ کے بادل سر پر منڈلا رہے ہوں تو ہر ملک بڑے شوق سے کانفرنسوں میں اپنے سکہ بند سیاسی مدبرین ہی کو نمائندگی کے لیے بھیجے اور ضرور بھیجے جو بڑے سنجیدہ، بڑے ''کار آزما اور کار آمد'' مشہور ہوں اور بنی نوع انسان کی ''خدمت'' کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں...... مگر کیا یہ جائے کہ ہر صبح سیاسی کانفرنس شروع ہونے سے پہلے دس منٹ تک، انھیں مشہور امریکی کارٹون تصویر ''مکی ماؤس'' دکھائی جائے اور اس شو میں ہر مدبر کی حاضری لازمی قرار دی جائے آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد جنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خوش طبعی اور زندہ دلی، ظرافت اور ٹھٹھول کا فعل کیمیاوی ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ یہ صلاحیت ہمارے خیالات کی نوعیت ہی کو تبدیل کر دیتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندہ دلی ہماری ثقافت اور تہذیب پر بنیادی طور پر اثر انداز ہو سکتی ہے اور ہمارے لیے کسی آنے والے زمانے میں، معقولیت پسندی کے دور کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ میرے نزدیک انسانیت کی معراج ہی یہ معقولیت پسندی کا دور ہے۔ انسانیت کے لیے اہم ترین شرف یہی ہے کہ انسانوں کی ایک ایسی نسل وجود میں آئے جس میں معقولیت پسندی کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہو جو نیک دلی اور حسن نیت کا پیکر ہو، سادہ خیالات امن پسندی اور تہذیبی جوہر سے مالا مال ہو۔ انسانیت کی معراج یہ نہیں کہ ساری دنیا منطقی ہو جائے۔ کیونکہ منطقی دنیا کسی صورت بھی ایک باکمال دنیا نہیں ہو گی۔ انسانیت کی معراج یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے عیب جلد از جلد سمجھ لیں اور اپنے جھگڑے معقولیت سے نمٹا لیں۔ صاف لفظوں میں، انسانیت کے لیے یہی کچھ اوج کمال ہے۔ جس کی ہم انسانی زندگی سے توقع رکھ سکتے ہیں۔ معقولیت ہی کی ذیل میں کئی اور صفات بھی آ جاتی ہیں جو انسانی دماغ کے لیے باعث فخر ہیں۔ اس معقولیت پسند دنیا میں سادہ خیالی کا دور دورہ ہو گا۔ اس دنیا کا فلسفہ، مسرت اور خوش مذاقی کا جوہر ہو گا۔ اس میں بڑی نازک سوجھ بوجھ ہو گی۔ ان سب صفات کی بنا پر، ایک نہایت معقول تہذیب وجود میں آئے گی۔ سادہ خیالی اور خوش مذاقی کا فلسفہ اور سوجھ بوجھ کی نزاکت، زندہ دلی ہی کی خصوصیات ہیں اور زندہ دلی کی بدولت ہی وجود میں آ سکتی ہیں۔

ایسی معقولیت پسند دنیا کا تصور کرنا خاصا مشکل ہے کیونکہ ہماری آج کی دنیا اس سے بہت مختلف ہے۔ آج کی زندگی مجموعی طور پر بہت پیچیدہ ہے۔ علمیت، بھاری بھرکم سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ چکی ہے۔ فلسفہ، بہت مغموم، بہت درشت ہے۔ ہمارے خیالات، بے حد الجھے ہوئے ہیں۔ یہ اسی سنجیدگی، اسی الجھاؤ اور پیچیدگی کا کرشمہ ہے کہ آج کی دنیا اتنی دکھی ہے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ سادہ زندگی اور خیالات کی سادگی، تہذیب اور ثقافت کی معراج ہے۔ جب کوئی تہذیب سادگی کا جوہر کھو بیٹھتی ہے اور تکلف کی بلندیوں سے اتر کر پھر بے تکلفی اور سادگی کی سطح پر نہیں آتی۔ تو یہ تہذیب، تکلیف کا منبع بن جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اسے زوال آ جاتا ہے۔ چنانچہ انسان ان تصورات اور خیالات، ان امنگوں اور ان معاشرتی نظاموں کا غلام ہو کر رہ جاتا ہے جو کبھی اس نے خود تخلیق کیے تھے۔ انسانیت ان

کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے اور ان تصورات اور معاشرت کے اس بارِ گراں سے سر نہیں اٹھا سکتی...... خوش قسمتی سے انسان کو ایک ایسا جوہر عطا ہوا ہے، جس کی بدولت وہ خیالات کی بھول بھلیوں اور امنگوں کے بوجھ سے اونچا بھی اٹھ سکتا ہے اور پھر ان پر ہنس بھی سکتا ہے۔ یہی جوہر زندہ دلی اور خوش طبعی ہے۔ اسی کو ظرافت اور بذلہ سنجی کہتے ہیں۔ چنانچہ ظریف اور بذلہ سنج لوگ، اونچے اونچے خیالات اور آرزوؤں کو یوں ہاتھ لگاتے ہیں، انھیں اس طرح ''نمٹاتے'' ہیں کہ ان کی ہر ہر حرکت سے چابک دستی کا اظہار ہوتا ہے، پتا چلتا ہے کہ یہ لوگ ان خیالات اور تکلیف دہ امنگوں کے غلام نہیں بلکہ آقا ہیں...... اور جو شخص اپنے خیالات پر قادر ہو وہ ان کا غلام بن کر نہیں رہ سکتا۔ چابک دستی، مہارت اور فنی کمال کا ثبوت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سنجیدگی، ہمیشہ سخت کوشش کی علامت ہے اور کوشش اس بات کا ثبوت ٹھہرتی ہے کہ کرنے والے کو اپنے کام پر پوری قدرت، پوری مہارت حاصل نہیں...... ایک بے حد سنجیدہ اور ٹھوس قسم کے ادیب کو لیجیے۔ وہ ہمیشہ کچھ اکھڑا اکھڑا نظر آئے گا۔ اس کی تحریر میں سبک روی نہیں ہوگی۔ خیالات سے وہ گھبرایا ہوا دکھائی دے گا اور ہمیشہ کچھ تصنع، کچھ بناوٹ اس کی تحریروں سے جھلکتی رہے گی۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ سنجیدہ ادیب، اپنے خیالات کے سامنے، ہمیشہ کچھ دبکا دبکا سا رہتا ہے۔

سادگی، خیالات کی گہرائی کی زندہ علامت ہوا کرتی ہے۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی مگر حقیقت یہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں سادگی وہ چیز ہے، جو علمیت اور تحریر میں بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ خیالات کی صفائی بڑی محال بات ہے مگر جب تک خیالات واضح اور صاف نہ ہوں گے، سادگی نہیں آئے گی۔ جب کبھی آپ دیکھیں گے کہ کوئی ادیب، بار بار، ایک ہی خیال کی ادھیڑ بن میں لگا ہے تو یہ سمجھ لیجیے کہ وہ خیال اس ادیب کی جان کا لاگو ہو گیا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کالج میں ایک نیا نیا پروفیسر آتا ہے جس نے تازہ تازہ، نہایت اعلیٰ نمبروں پر ڈگری حاصل کی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے لکچر ہمیشہ الجھے ہوئے ہوں گے اور اصل موضوع سے ہٹے ہوئے ہوں گے۔ خیالات کی باقاعدہ سادگی اور اظہار کی سادگی صرف ان پروفیسروں کے لکچروں میں ہوتی ہے اور پرانے ہوں اور کافی تجربہ کار ہوں۔

تو وہ کیا چیز ہے جس سے فنی باریکیاں، عام فہم سادہ بیانی میں بدل جاتی ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا انحصار اس علم کے ہضم کرنے پر ہے جو ہمیں حاصل ہو۔ میں اس عمل کو غذا کے تحلیل ہونے سے تشبیہ دیا کرتا ہوں

اگر کسی عالم نے اپنے علم کو پوری طرح ہضم نہیں کیا اور اسے زندگی کے مشاہدے سے مطابقت نہیں دی تو وہ ہمارے سامنے اپنا علم، قابل فہم طریقے پر کبھی نہیں پیش کر سکے گا۔ علم حاصل کرنے کی تگ و دو میں ایسے لمحے ضرور آتے ہیں جو سکون اور آرام کا پیغام لائیں۔ جیسے ایک لمبے سفر کے بعد شربت کا گلاس، روح کی ماندگی کو دور کر دیا کرتا ہے۔ انہی لمحوں میں، اس علم کے رسیا کو سوچنا چاہیے کہ ''آخر یہ سب کچھ کیا ہے...... اور میں کس بات پر اتنی مغز کاوی کر رہا ہوں...... میں کیا کہہ رہا ہوں......؟......'' یعنی سادگی کی اولین شرط یہ ہے کہ علم کو ہضم کیا جائے اور ہماری نظر بالغ ہو...... چنانچہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہمارے خیالات میں صفائی اور وضاحت آتی جاتی ہے۔ عمر کی پختگی کے ساتھ ہر مسئلے کے غلط اور غیر ضروری پہلو چھوٹ جاتے ہیں۔ ہم ان سے پریشان ہونا بھی ترک کر دیتے ہیں۔ خیالات واضح صورت اختیار کرتے ہیں اور خیالات کا ایک لمبا سلسلہ رفتہ رفتہ، ایک سہل سے قاعدے یا فارمولے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور ایک صبح ہم پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ ہم نے علم کی اصلی روح کو سمجھ لیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے حقیقی معنی میں دانش کہا جاتا ہے۔ اب تگ و دو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ حقیقت، عام فہم بن جاتی ہے کیونکہ اب حقیقت واضح تر ہو چکی ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ خود سچائی بڑی عام فہم، بڑی سادہ، بڑی قدرتی سی چیز ہے۔ خیالات کی اسی برجستگی اور اسلوب و اظہار کی اسی قدرتی سادگی کو چینی شاعروں اور نقادوں نے اتنا قابل تعریف قرار دیا ہے۔ چینی حکما اس عمل کو پختہ کاری کا عمل قرار دیتے ہیں اور یہ وہ پختگی ہے جس کے بعد ادیب کے اسلوب میں عبارت کے تکلف، الفاظ کے شکوہ، تصنع اور آورد یا علمیت کا رعب چھانٹنے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

قدرتی بات ہے کہ زندہ دلی اور خوش طبعی، خیالات کی سادگی کو پروان چڑھاتی ہیں۔ عام طور پر ظریف تو حقائق سے لگاؤ رکھتا ہے۔ لیکن نظریات کے رسیا، تصورات میں کھوئے رہتے ہیں، خیالات میں الجھ الجھ کر، بالکل کھو جاتے ہیں۔ ظریف، محض عملی سوجھ بوجھ اور مزاح کی چمک سے سروکار رکھتا ہے۔ وہ بجلی کی تیزی سے ہم پر ظاہر کر دیتا ہے کہ ہمارے خیالات حقائق سے کتنے مختلف یا ان کے برعکس ہیں۔ گویا وہ سارے الجھاؤ کو پل جھپکتے میں سلجھا کر رکھ دیتا ہے۔ حقائق سے مسلسل تعلق، اس کی طبیعت میں اپج، ایک نوع کا ہلکا پھلکا پن اور نزاکت احساس پیدا کرتا ہے ہر قسم کے تصنع اور بناوٹ یا بہروپ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ عقل و علم کی حماقتوں اور معاشرے کی فضولیات سے کوسوں دور رہتا ہے۔ گویا زندہ دلی اور خوش طبعی سے انسان نکتہ رس اور

خوش گفتار بن جاتا ہے، ہر چیز اس پر واضح ہو جاتی ہے، ہر بات سادہ اور آسان بن جاتی ہے۔

اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اگر معقولیت پسندی اور سادہ زندگی اور سادہ خیالی حاصل کرنا ہو تو اس کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ مزاحیہ خیالات اور ظرافت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔

5- مزاج کا تلون

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آوارہ گردی جو کبھی انسان کا سب سے بڑا کام تھی، (اور میرے خیال میں انسانیت کی معراج تھی) اب اس کی جگہ سپہ گری نے لے لی ہے۔ اب آوارہ گرد کے بجائے سپاہی کو مثالی آدمی سمجھا جا رہا ہے۔ گویا اب مثالی انسان وہ نہیں جس کا کچھ ٹھیک نہ ہو اور جو آزادہ رو اور آزاد منش ہو بلکہ اب تو اس آزادہ روی کی جگہ منطق کے غلام، نظم و ضبط کے پابند قاعدوں ضابطوں کے رسیا، بارودی قلیوں کا دور دورہ ہونے والا ہے۔ یہ لوگ اس حد تک منظم ہو سکتے ہیں کہ اب پانچ پانچ چھ چھ کروڑ انسانوں کی ایک پوری قوم کی قوم ایک عقیدے اور ایک خیال پر ایمان رکھ سکتی ہے اور منظم انسانوں کا یہ جم غفیر، اتنا پابند بنایا جا سکتا ہے کہ سب کے سب ایک ہی قسم کی باتیں سوچیں اور ذاتی پسند کو بالائے طاق رکھ کر ایک ہی قسم کے کھانے کو بھی مرغوب سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ ان دو آدمیوں، آوارہ گرد اور سپاہی میں کوئی بات مشترک نہیں، انسان کی عظمت کے بارے میں دو ہی خیال ہو سکتے ہیں یا تو آپ آزادہ رو اور آزاد منش آدمی کو انسانیت کا نصب العین سمجھیں، یا نظم و ضبط کے پابند ایک سپاہی کو مثالی انسان تصور کریں۔ پہلی صورت میں آپ کا نظریہ یہ ہوگا کہ جو شخص اپنی آزادی اور انفرادیت قائم رکھتا ہے۔ وہی اصلی معنی میں عظیم انسان ہے۔ دوسری صورت میں آپ کا اعتقاد یہ ہوگا کہ جس شخص نے رائے اور فیصلے کی آزادی کھو دی ہے اور شخصی معتقدات کا حق تج دیا ہے اور اب وہ اپنے حکمران یا اپنی حکومت نے نظریے اور فیصلوں کا سختی سے پابند ہے، وہی بہترین انسان ہے!...... ان دونوں نظریوں کی حمایت میں کافی کافی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ آزاد منشی اور انفرادیت کی حمایت میں عقل سلیم دلیلیں لائے گی اور سپاہی کے حق میں منطق بہت کچھ کہہ سن سکتی ہے۔

منطق کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں کہ ایسے مشینی انسانوں کی حمایت میں دلیلوں کے انبار لگا دے۔ جو فرد کو تو کچھ نہیں لیکن ریاست کو سب کچھ سمجھیں۔ منطق ایسے لوگوں کو مثالی شہری ثابت کر سکتی ہے۔ منطق یہ ثابت کر سکتی ہے کہ یہ افراد ایک خارجی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بڑے مفید ہیں۔ یہ خارجی مقصد کیا ہے؟ اپنی

ریاست اور اپنے ملک کا استحکام مگر یہ استحکام بجائے خود تو کوئی مقصد نہیں، اس کا وجود بھی تو ایک اور مقصد کے لیے ہوتا ہے۔ اپنی ریاست کی قوت اور استحکام، دوسرے ملکوں پر غلبہ حاصل کرنے کی ایک راہ ہوتی ہے منطق یہ سب کچھ بڑی آسانی سے ثابت کرسکتی ہے اور یہ منطق اتنی سیدھی سادی ہوگی کہ ہر احمق اسی کا کلمہ پڑھے گا مزہ یہ ہے کہ کافی ''مہذب'' اور ''روشن خیال'' ملکوں میں بھی اس نظریے کو جھنڈے پر چڑھایا گیا ہے مشینی انسانوں یا بقول منطق ان ''مثالی شہریوں'' کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں، قسم اول میں وہ بہتر قسم کے شہری آتے ہیں جنھیں حکومت یا بادشاہ دوسروں سے بہتر سمجھتا ہو۔ یہی لوگ وہ ہیں کہ جب انھیں کسی جگہ جنگ کرنے کے لیے بھیجا جائے تو وہ بڑے خوش ہوتے ہیں اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے انھیں بڑا کرم کر کے، عین اس جگہ بھیجا جہاں لڑائی کا زور بندھ رہا ہے اور جہاں وہ اپنے ملک کے لیے جانیں دے سکتے ہیں قسم دوم میں ایسے افراد ہوتے ہیں کہ جب انھیں محاذ جنگ پر بھیجا جائے تو ان کے دلوں میں از خود کچھ ناراضگی پیدا ہوتی ہے وہ اس طرح ہانکے جانے پر برا مانتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی خفیہ ناراضگی، یہ انسانی انحراف اور سرتابی، یہ ہٹیلا پن ہی انسانی وقار کی علامت ہے۔ یہی وہ امید ہے کی کرن ہے کہ جس سے ہمت بندھتی ہے کہ آئندہ کسی مہذب تر دنیا میں انسان زیادہ شائستگی اور تمیز سے زندگی بسر کر سکے گا۔

اب یہ واضح ہو گیا کہ منطق کی ساری دلیلوں کے باوجود، میں آزاد منش آدمی ہی کو پسندیدہ انسان سمجھتا ہوں انسان کی مخالفت پسندی اس کا اصل جوہر ہے اور غالباً تہذیب وتمدن اسی کی بدولت فنا ہونے سے بچ سکیں گے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ انسان کے اجداد بندر تھے، گائیں بھینسیں نہیں تھیں جو قناعت کی تصویر ہیں۔ انسان کی حیثیت سے میں یہی چاہتا ہوں کہ گائیں بھینسیں اسی طرح قناعت اور مزاج کی نرمی کا پیکر رہیں تا کہ انسان انھیں اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے چراگاہ میں چرنے کو بھیج دے اور جب چاہے انھیں مذبح میں ذبح ہونے کے لیے بھیج سکے۔ اور خدا کی یہ قانع مخلوق، اپنے مالک کی مرضی پر، ایک سی فراخ دلی اور رضا سے اپنے آپ کو قربان کر دے۔ انسان کی حیثیت سے میں یہ بھی چاہتا ہوں انسانیت گایوں بھینسوں کا گلہ نہ بن جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ انسان اپنے اجداد یعنی بندر کی طرح باغی اور چڑچڑا اور غیر مطمئن رہے۔ کیونکہ اگر کبھی گائیں بھینسیں اپنے مالک کے خلاف سرتابی کریں گی تو میں انھیں گائیں بھینسیں نہیں انسان سمجھنے لگوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہر قسم کی آمرانہ حکومت کے خلاف ہوں۔ کیونکہ یہ انسانی تخلیق کے اصول کے خلاف ہے۔

ڈکٹیٹر لوگ صرف گایوں بھینسوں کے ریوڑ کے ساتھ اچھی طرح نباہ کر سکتے ہیں۔ ان کا گزارا بندروں کے ساتھ ممکن نہیں کیونکہ بے چینی اور سرتابی تو بندروں کے خمیر میں ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ 1930ء کے بعد سے مغربی تہذیب کے لیے میرے دل میں جو عزت اور وقعت تھی وہ کافی حد تک کم ہوگئی ہے۔ اس سے پہلے مجھے چینی تہذیب پر شرم آتی تھی اور میں مغرب اور اس کی تہذیب کو بڑا وقیع جانتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ چینی تہذیب کا یہ پہلو بڑا شرمناک ہے کہ چین میں کبھی کوئی آئین رائج نہ ہو سکا اور نہ شہری حقوق کبھی فروغ پا سکے۔ میرا اعتقاد اس وقت یہ تھا کہ ایک آئینی حکومت، چاہے اس کا سربراہ صدر کہلاتا ہو یا بادشاہ، انسانی تہذیب کی ترقی کی دلیل ہے مگر اب میری آنکھیں کھل چکی ہیں۔ اب میں مغربی تہذیب کے گہوارے میں رہتا ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ انسانی حقوق اور انسانی آزادی کو مغربی تہذیب نے کتنا پامال کیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ تسلی ہوتی ہے کہ مغربی تہذیب نے انسان کو عقیدے کی آزادی نہیں بخشی حالانکہ میرے ملک چین میں عقیدے کی آزادی ہمیشہ رہی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی اطمینان سا ہوتا ہے کہ آئینی حکومت کو مغرب میں کوئی اعلیٰ قسم کی حکومت نہیں سمجھا جاتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ عین مرکزی یورپ میں کروڑوں ایسے انسان بستے ہیں جو یونانی ڈرامہ نگار یوری پیڈیز کی تعریف کے مطابق گھٹیا ترین غلامی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ غلاموں کی اتنی بڑی تعداد تو ''جاگیردار چین'' میں بھی نہیں تھی میں نے دیکھ لیا ہے کہ کئی ایک مغربی قومیں محض منطق کے بل پر جی رہی ہیں مگر وہ سوجھ بوجھ اور عقل سلیم کے معاملے میں ہم چینیوں سے بہت ہیٹی ہیں۔ اسی لیے تو میں اس جرات سے چینی فلسفے کا مثالی آدمی آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ یہ مثالی انسان، خوش باش، بے فکرا اور آزادہ رو، آوارہ گرد ہے۔ اسی کو چینی فلسفے کے مطابق، انسانی تہذیب کا سب سے اعلیٰ پیکر سمجھا جاتا ہے...... کیا مغرب اس کے مقابلے میں کوئی مثالی انسان پیش کر سکتا ہے؟ جب باوردی قلیوں اور مشینی انسانوں کو مثالی انسان سمجھنے کا یہ فیشن ختم ہو جائے گا تو کیا مغرب یہ ثابت کر سکے گا کہ شخصی آزادی اور شہری حقوق کے نظریے واقعی اہل مغرب کے دلوں میں جڑ پکڑ چکے ہیں اور مغرب ان پر واقعی اعتقاد رکھتا ہے۔ اگرچہ مجھے شک ہے کہ شاید یہ وقت کبھی نہیں آئے گا مگر میں پھر بھی اس وقت کا منتظر ہوں۔

یورپ نے شخصی آزادی کی روایت کیوں طاق پر اٹھا رکھی ہے؟ اس کے دو بڑے سبب ہیں، پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں اجتماعیت کے لیے جو اقتصادی تحریک چلی ہے اس کی وجہ سے انفرادی آزادی کو بھلانا

پڑا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں صنعتی انقلاب نے جو انسان کی آزادی کو مشین کا غلام بنانا شروع کیا تھا تو وہ روایت ابھی تک چل رہی ہے۔ ہمارا آپ کا زمانہ اجتماعیت کا ہے۔ معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی طور پر بھی اجتماعیت کے لیے ہر طرف سے تحریک کی جارہی ہے اسی لیے انسان سے یہ حق چھن رہا ہے کہ اسے کسی بات سے ناراض ہونے، کسی بات پر برا ماننے، کسی چیز سے غیر مطمئن ہونے کا فطری حق حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت فرد کے وقار اور شرف کو بھولتی جارہی ہے۔ آج کل کے زمانے میں اقتصادی مسائل الجھتے جارہے ہیں اور اقتصادی معاملوں پر سوچنے اور ان میں الجھے رہنے میں ہی انسان کا زیادہ وقت صرف ہورہا ہے۔ باقی ہر قسم کا غور و فکر اب اقتصادی سوچ بچار کے بوجھ میں دبا جارہا ہے۔ اسی لیے ہم لوگ ان علوم سے بے بہرہ رہتے ہیں، جو انسانیت سے قریب تر ہیں۔ ہم اس فلسفے سے بھی آنکھیں بند کیے رہتے ہیں جو انسانیت کا فلسفہ ہے جو ایک فرد کی زندگی کے معاملوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری یہ غفلت بالکل قدرتی ہے۔ جس شخص کے پیٹ میں پھوڑا ہو اس کے سارے خیالات اپنے پیٹ پر مرکوز رہتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ بھی ایسا ہی سماج ہے جس کی معاشیات، بیمار اور درد سے بے حال ہے۔ اسی لیے ہمارا معاشرہ ہمہ وقت اسی معاشیات کے چکر میں الجھا رہتا ہے اور ایک انسان، ایک فرد کے انفرادی مسائل سے بالکل بے توجہی برتتا ہے۔ ہمارا معاشرہ غالباً یہ بھول چکا ہے کہ انسان، بحیثیت ایک فرد کے بھی آج کل کی دنیا میں زندہ ہے۔ پہلے کبھی یہ دور تھا کہ انسان چاہے کچھ ہو وہ ایک فرد کی حیثیت سے ہی جانا پہچانا جاتا تھا لیکن اب اکیلے فرد کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا، اب اسے ایک مشین سمجھا جاتا ہے۔ اب وہ اقتصادی قاعدوں اور مادی قوانین کا غلام ہے اور بس۔ اب ہم آدمی کو آدمی نہیں سمجھتے، اسے مشین کا ایک پرزہ جانتے ہیں، اسے ایک یونین یا ایک طبقے کا رکن گردانتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو بورژوا ہے، فلاں سرمایہ دار ہے اور یہ دونوں طبقے مردود ہیں! ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص (انسان نہیں) مزدور ہے، گویا کسی انسان پر ''بورژوا'' یا ''سرمایہ دار'' یا ''مزدور'' کا لیبل لگا کر اس سے نفرت کرنا، اسے اچھا سمجھنا آسان تر ہو گیا ہے۔ اب ہم افراد یا انسان نہیں رہے، اب ہم صرف ''طبقے'' کی صورت میں زندہ ہیں مگر یہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ''آسان'' صورت حال ہے! اب آزاد منش انسان، مثالی آدمی کی حیثیت سے اس دنیا سے غائب ہو چکا ہے۔ اب کوئی شخص خارجی حالات کے سلسلے میں اپنے خیالات، اپنے ردعمل کا آپ مالک نہیں رہا۔ اب خیالات، ذاتی پسند ناپسند اور مزاج کے سنگ کا زمانہ لد گیا،

اب ہم نظریات کے غلام ہیں، طبقاتی روایت کے پابند ہیں۔ اب انسان کے کاموں اور اس کے مستقبل میں انسان کا کوئی دخل نہیں رہا بلکہ صرف کارل مارکس کی سکھائی ہوئی جدلی منطق ہی انسان کے تمام افعال اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں کوئی مناسب پیشگوئی کرسکتی ہے گویا اب انسان بڑے باقاعدہ طریقے سے بڑی رغبت سے، چیونٹیوں کے اجتماعی نمونے پر زندگی بسر کرنے کی طرف آتا جارہا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ آپ میرے خیالات کو پرانے فیشن کی 'جمہوری انفرادیت پسندی' قرار دیں گے مگر میں یہ عرض کردوں کہ خود کارل مارکس، جو آج کی اجتماعیات کا پیغمبر سمجھا جاتا ہے، اپنے سے ایک صدی پہلے فلسفی ہیگل اور وکٹوریہ کے زمانے کے انگریزی ماہرین اقتصادات کے ملاپ کی پیداوار تھا۔ آج کی دنیا میں ہیگل کی منطق اور وکٹورین عہد کے اقتصادی نظریے بھی پرانی باتیں سمجھی جاتی ہیں۔ چینی نقطہ نظر سے تو یہ سب بے حد مشکوک اور کافی حد تک سراسر غلط باتیں ہیں اور ان کا عقل سلیم سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب مشینی سائنس اپنے کارناموں، اپنی قدرت، اپنے غلبے پر ناز کررہی تھی تو عین اسی وقت انسان کے بارے میں یہ مشینی نظریہ وجود میں آیا۔ اصل میں یہ مشینی منطق سائنس سے چرالی گئی اور اس مشینی منطق کو انسانی سماج پر چسپاں کر کے دیکھا گیا چنانچہ اسے، انسانی مسائل کے ان طالب علموں نے ''قوانین فطرت'' کا رعب دار نام دے کر جھنڈے پر چڑھایا۔ یہ نظریہ رائج کیا گیا کہ 'ماحول'' انسان سے زیادہ بڑا ہے اور انسانی شخصیت کو حساب کی رقموں میں ڈھال کر ہر مسئلے کا حل تلاش ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے معاشیات کے اعتبار سے یہ کوئی اچھی اور مفید بات ہو۔ مگر حیاتیات کی رو سے یہ بالکل فضول ہے۔ حیاتیات تو یہ کہتی ہے کہ زندگی کے ارتقا میں جتنا ہاتھ خارجی ماحول کا ہے اتنا ہی فرد کے ذاتی ردعمل کا ہے۔ صاف لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ہر اچھا طبیب یہ مانتا ہے کہ مرض پر غلبہ پانے کے سلسلے میں مریض کی ذہنیت اور اس کے ذاتی ردعمل کا بڑا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اور یہ نہایت اہم بات ہے چنانچہ کئی ایسے مریض ہوتے ہیں کہ منطقی طور پر انھیں مرجانا چاہیے، اور ان سے پیشتر اسی مرض سے انہی حالات میں کئی لوگ جان سے جاچکے ہوتے ہیں مگر یہ مریض نہیں مرتے اور ڈاکٹروں کے لیے سخت حیرت کا موجب بن جاتے ہیں۔ اسی لیے جو ڈاکٹر دو مریضوں کو ایک ہی مرض کے لیے ایک یہ دوا، بلا کسی تبدیلی مقدار کے دے دے، اسے سماج کا دشمن قرار دینا چاہیے۔ اسی قسم کے سماج دشمن وہ معاشرتی فلسفی ہیں جو افراد کو بھلا دیتے ہیں جو یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر فرد یکساں حالات میں بھی دوسرے

فرد سے مختلف ردِعمل ظاہر کرے گا جو اس بات سے قطع نظر کر لیتے ہیں کہ انسان عام طور پر تلون کا پتلا ہے، اس کے مزاج کا کچھ ٹھیک نہیں اور پتا نہیں کہ کن حالات میں وہ کیا کر بیٹھے۔

آپ کہہ سکتے ہیں مجھے معاشیات کی سمجھ نہیں...... میں عرض کروں گا کہ معاشیات نے بھی مجھے...... ایک فرد کو...... بالکل نہیں سمجھا۔ اپنی اس ناسمجھی کی وجہ سے معاشیات ابھی تک بھٹک رہی ہے اور ایک سائنس کی حیثیت سے ذرا بھی وقیع نہیں۔ شکل یہ ہے کہ اگر معاشیات، محض اشیا تک محدود ہو جائے تو وہ سائنس نہیں کہلا سکتی اور اگر بچاری، اشیا سے آگے بڑھ کر، انسان کی نیت تک پہنچ جائے اور ''اعداد و شمار'' کا سہارا لے کر نقشے اور جدولیں بنا لے۔ تب بھی یہ سائنس نہیں بنتی۔ معاشیات نے انسانی ذہن کا جائزہ لینے کے لیے کوئی طریقہ وضع نہیں کیا۔ اگر یہ ریاضی کی سیڑھی لگا کر، انسانی ذہن کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی ہے اور اس میں اپنے ''اعداد و شمار'' کی پخ لگاتی ہے تو اس کا بے راہ ہو جانا اور بھی یقینی ہے۔ اسی وجہ سے جب کبھی کوئی اہم ''اقتصادی اقدام'' کیا جانے والا ہو تو وہ ماہرین، دو بالکل الٹ مشورے دیتے ہیں۔ آخر معاشیات بھی تو انسانی مزاج اور طبیعت کے خاصے پر ہی اپنی بنیاد رکھے گی لیکن ماہرین کو ان دونوں سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ ماہرین کی کچھ نہ پوچھیے ایک ماہر اقتصادیات کا خیال تھا کہ انگلستان نے اپنی کرنسی کا معیار، سونا نہ رہنے دیا تو انگلستان تباہ ہو جائے گا۔ دوسرے صاحب کہتے تھے کہ انگلستان بچ ہی اس صورت میں سکتا ہے کہ اس کی کرنسی، سونے کے معیار سے گرا دی جائے یہ تو خیر ذرا بڑا مسئلہ تھا، عام خرید و فروخت کا یہ حال ہے کہ اقتصادی ماہرین اس کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں کر سکتے۔ لوگ کب اشیا خریدتے ہیں اور کب بیچتے ہیں؟ اس کے بارے میں کوئی اقتصادی ماہر قابل قبول پیش گوئی نہیں کر پایا۔ اسی کی بدولت سٹہ اور سٹاک ایکسچینج کے تمام لین دین ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے اقتصادی اعداد و شمار اگر اکٹھے کر لیے جائیں تو بھی یہ بتانا مشکل ہوگا کہ کب سونے کا بھاؤ چڑھ جائے گا اور کب چاندی کا بھاؤ ٹوٹ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اس طرح کے اندازے ہو سکیں گے جس طرح موسمیات کا دفتر، اگلے چوبیس گھنٹوں کے موسم کے بارے میں ''پیشگوئیاں'' کیا کرتا ہے!...... اس کی وجہ سیدھی یہ ہے کہ دنیا کے ہر کاروبار میں انسان کا ہاتھ ہے چنانچہ اور ہر جگہ بشریت کے تقاضے کارفرما ہیں۔ اگر بہت سے لوگ کسی کمپنی کے حصے بیچنا شروع کر دیں تو چند ایسے لوگ بھی ہوں گے جو سارے حصے خریدنا شروع کر دیں گے۔ ہر بیچنے والا اپنے دل میں یہ سمجھ کر بیچے گا کہ اب اس کے خریدنے والا کوئی احمق ہی ہوگا۔ اور ہر خریدار یہ سوچ کر خریدے گا

کہ عجب احمق لوگ ہیں جو اتنے اچھے حصے بیچ رہے ہیں۔ آؤ ان کی حماقت سے فائدہ اٹھائیں۔

یہ انسانی مزاج کے تلون کی ایک مثال ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ہو، انسان کا کچھ ٹھیک نہیں۔ انسانی تلون کاروبار ایسے ٹھوس کام میں بھی اتنا ہی دخیل ہے اور انسان کی طبیعت کی یہ بے یقینی، یہی ''انسانی نفسیات'' تاریخ کے دھارے کو بدل دیتی ہے۔ انسان کی اسی نفسیات نے، اخلاق، رسم ورواج اور معاشرتی اصلاحات کے بارے میں، انسانی ردعمل کو ہمیشہ ایک معما بنائے رکھا ہے، کچھ پتا نہیں کہ کس چیز کے بارے میں انسان کا ردعمل کیا ہوگا۔ اور وہ کس موقع پر کیا کر بیٹھے گا۔

6- انفرادیت

آج کی دنیا میں انسان چاہے کسی جمہوری ملک کا باشندہ ہو جہاں کوئی معاشرتی انقلاب آنے والا ہو۔ چاہے کسی اشتراکی ملک کا شہری ہو جو رفتہ رفتہ جمہوریت کی طرف واپس آ رہا ہو۔ چاہے کسی آمرانہ حکومت کی رعایا ہو جو شاید اس کے جیتے جی ختم ہو جائے۔ بہرحال اس کی ذاتی زندگی اب بھی ایک سالم اور مکمل وحدت ہے۔ زمانے کی رفتار نے اسے ایک خاص صورت ضرور بخش دی ہے مگر اس کی انفرادیت جوں کی توں قائم ہے۔

فلسفہ، فرد کی ذات سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہو جاتا ہے کیونکہ فرد ہی زندگی کا حاصل ہے۔ فرد اپنی ذات میں مکمل ہے۔ فرد ہی زندگی کی منزل ہے، اور اسے کسی مقصد کا ذریعہ اور سبب نہیں بنایا جائے گا۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں، مثلاً برطانوی دولت مشترکہ کا وجود اس لیے ہے کہ انگلستان کے کسی کونے میں رہنے والا کوئی بھی انگریز، آرام اور آسائش کی زندگی بسر کر سکے۔ یہ فلسفے کا صحیح رخ ہے۔ غلط رخ یہ ہے کہ انگلستان کے اس کونے میں رہنے والا وہ انگریز اس لیے زندہ ہے کہ برطانوی دولت مشترکہ زندہ رہ سکے۔

سماجی فلسفے کے اچھے سے اچھے نظریے یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے مطابق ایک فرد، فلاں فلاں قسم کی حکومت کے زیر اثر بہتر قسم کی زندگی بسر کر سکے گا۔ جو سماجی نظریے یہ کہتے ہیں کہ انفرادی زندگی کی خوشحالی، تہذیب کا آخری مقصد اور اس کی منزل نہیں ہے وہ سرتا سر غلط ہیں اور ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہیں جو بیمار بھی تھے اور دماغی توازن سے بھی محروم تھے۔

اب ثقافت کو لیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی کسوٹی یہ ہے کہ اس ثقافت نے کس قسم کے مرد، عورت پیدا

کیے ہیں۔ امریکہ کے زندہ جاوید شاعر اور دانشور والٹ وٹمین نے بھی اپنے مضمون ''جمہوری راہیں'' میں ''انفرادیت'' ہی کو تہذیب کی آخری منزل قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ذرا سوچیے، خود تہذیب کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ تہذیب، جو اپنے مخصوص عقیدے، اپنے فنون، اپنے سکولوں، ہسپتالوں اور کالجوں سے مالا مال ہوتی ہے۔ آخر کیا مقصد رکھتی ہے؟ تہذیب کی بنیاد اور تہذیب کا مقصد ایک بھرپور اور ہمہ صفت انفرادیت کے سوا کچھ نہیں۔ ہر چیز اسی انفرادیت کی تابع ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتی ہے چونکہ صرف جمہوریت ہی بڑے پیمانے پر اس انفرادیت کو پیدا کر سکتی ہے لہٰذا جمہوریت کا حق سب پر فائق ہے۔ جمہوریت، قدرت کی طرح، بڑے لامحدود پیمانے پر انسانی ذہن کی بنجر وسعتوں میں انفرادیت کا بیج بوتی ہے اور اس کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا بھی انتظام کرتی ہے۔ کسی ملک کا ادب، اس کے گیت، اس کا ذوق جمال، اس کے فنون وغیرہ بڑے اہم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہی سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس ملک کے مردوں اور عورتوں کی شخصیت کیسی ہے اور کیا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے اس ملک کا ذہن اپنے اظہار کے لیے مؤثر راہیں ڈھونڈتا ہے۔''

والٹ وٹمین، انفرادیت کو آخری حقیقت مانتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

''فہم و عقل کے لمحوں میں ہماری ہستی میں ایک شعور جاگتا ہے۔ ایک خیال سر اٹھاتا ہے ...... سب سے الگ، بالکل خود مختار، باوقار، چمکتے تاروں کی طرح زندہ جاوید خیال ...... یہ خیال اپنی ہستی کا ہے۔ آپ کے بارے میں آپ کا اپنا خیال ہے۔ آپ کچھ بھی ہوں۔ میرے بارے میں میرا خیال ہے۔ چاہے میں کچھ بھی ہوں ...... اپنی ہستی کا یہ خیال سب سے بڑا اعجاز ہے۔ بیان سے بالاتر، اس دنیا کے مبہم ترین خوابوں میں سے ایک، نہایت انجانا اور لطیف خواب مگر یہی سب سے ٹھوس، سب سے بنیادی حقیقت ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو باقی تمام حقیقتوں کے لیے دروازے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان لمحوں میں زمین و آسمان کے عجائبات کے درمیان (یہ عجائبات بھی اس لیے اہم ہیں کہ

''میں'' ان کے درمیان ہوں) سارے عقیدے اور سارے رسم و رواج دھند کی طرح چھٹ جاتے ہیں اور صرف اپنی ذات کا شعور اپنا ''خیال'' ہی باقی رہ جاتا ہے۔ اس کی ضیا ہر شے پر چھا جاتی ہے اور ہماری ہستی کو اپنی منور گود میں لے لیتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہی ننھا سا خیال آزادی اور وسعت پاتا ہے اور گویا ساری زمین پر چھا جاتا ہے، آسمانوں تک پہنچ جاتا ہے......''

انفرادیت کی عظمت پر اسی امریکی مفکر نے کچھ اور بھی کہہ رکھا ہے۔ اس میں سے بھی کوئی اقتباس پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ والٹ وائمین انفرادیت کے بارے میں اپنے فصیح خیالات کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:

''خلاصہ یا نتیجہ یا سیدھی سچی بات یہ ہے کہ انسانیت ہی کو انسانوں کے لیے آخری اور سب سے اچھا سہارا ہونا چاہیے۔ اور انسانیت ہی کی پوشیدہ ترقی یافتہ اور بنیادی خوبیوں پر انسانوں کا بھروسا ہونا چاہیے...... ایسا بھروسا جس میں وہم و گمان کی لاگ نہ ہو۔
جمہوریت کا مقصد یہ ہے کہ ہر قسم کے رد و بدل کے باوجود، تضحیک، کج بحثی اور ناکامی..... غرض ہر قیمت پر دنیا کو دکھا دے کہ انسان کو معقولیت اور آزادی کی فضا میں تربیت حاصل کر کے اپنے لیے خود قانون بن جانا چاہیے۔ اس طرح انسان اس درجے پر پہنچ سکتا ہے جس درجے پر پہنچنا اس کے لیے ضروری ہے۔''

انسان کا ماحول اتنا اہم نہیں ہوتا۔ جتنی اہم بات یہ ہے کہ ماحول کے بارے میں انسان کا ردعمل کیا ہے؟ فرانس، جرمنی، انگلستان اور امریکہ یہ سب ممالک مشینی تہذیب میں زندگی بسر کر رہے ہیں مگر ان ملکوں کے زندگی بسر کرنے کے طریقے، اور زندگی کی بوباس ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے۔ یہ ممالک مختلف طریقوں سے اپنے اپنے سیاسی مسئلے حل کرتے ہیں...... یہ سمجھنا کہ مشینی دور میں انسانوں کے لیے لازمی ہے کہ وہ چیونٹیوں کی سی منظم زندگی بسر کریں، سراسر حماقت ہے۔ انسانی فطرت میں ایک باپ کو لیجیے جس کے دو بیٹے ہیں۔ وہ دونوں لڑکوں کی ایک جیسی تربیت کرتا ہے، انھیں ایک سی تعلیم دیتا ہے اور ایک ہی پیشے میں دونوں کو کام پر لگاتا ہے۔ اس تمام یکسانیت کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ دونوں لڑکے رفتہ رفتہ اپنی شخصیت کے پوشیدہ

قوانین کے مطابقت اپنی زندگی ایک دوسرے سے مختلف بنالیں گے۔فرض کیجیے کہ وہ دونوں لڑکے دو بینکوں کے منیجر ہو جاتے ہیں۔جن کا سرمایہ اور کاروبار بالکل ایک سا ہے۔اس مادی برابری کے باوجود زندگی کے ہر اہم شعبے میں ان کی زندگی مختلف ہوگی۔ان کی باتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوں گی۔دونوں مختلف چیزوں کو اہم گردانیں گے۔ان کی طبیعتیں مختلف ہوں گی۔وہ مختلف طریقوں سے کاروباری مسائل حل کریں گے۔ان کی پالیسی ایک دوسرے سے ملتی جلتی نہیں ہوگی۔ان کا سلوک اپنے ماتحتوں سے ایک سا نہیں ہوگا۔ممکن ہے ایک بھائی ماتحتوں سے سختی کا سلوک کرتا ہو اور دوسرا بہت زیادہ نرمی سے کام نکالتا ہو۔ممکن ہے ایک بھائی کو اس کے ماتحت دل سے پیار کرتے ہوں اور دوسرے بھائی کے ماتحت اس کی درشتی سے خائف ہوں۔دونوں بھائی مختلف طریقوں سے روپیہ جمع کریں گے۔خرچ کرنے کے طریقے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ان کی ذاتی زندگی بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوگی۔ان کے مشاغل، ان کے دوست، ان کے کلب، ان کے پڑھنے کی کتابیں، یہ سب کچھ ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ممکن ہے دونوں کا اپنی اپنی بیویوں سے سلوک بھی ایک جیسا نہ ہو۔گویا ایک سے ماحول میں بھی زندگی اتنی رنگا رنگ ہوسکتی ہے۔کسی اخبار کا ماتمی کالم اٹھا کر دیکھیے، ایک ہی تاریخ میں کتنے لوگ اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں مگر ایک ہی دن مرنے والے ان لوگوں کی زندگی ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔آج کی تاریخ میں مرنے والوں میں کچھ ایسے ہوں گے جو عمر بھر ایک ہی کام پوری تن دہی سے کرتے رہے اور اسی میں ان کی مسرت کا راز بھی پنہاں تھا۔اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنھوں نے دو چار، دس بیس کاموں میں ہاتھ ڈالا، ہمیشہ تھالی کا بینگن رہے اور اسی میں ان کے دن کٹ گئے۔پھر کچھ لوگوں کو اگر نت نئی چیزیں ایجاد کرنے کا خبط تھا تو کچھ نئی سرزمینوں کی دریافت کے متوالے تھے۔کچھ زندہ دل اور خوش باش تھے تو کچھ اتنے مقطع اور سنجیدہ کہ زندہ دلی سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ایک ہی دن میں مرنے والوں کی اس صف میں کچھ ایسے لوگ تھے جنھیں شہرت نے آسمان پر پہنچایا اور دولت نے ان کے قدم چومے مگر وہ گمنامی اور محتاجی کی موت مرے۔کچھ وہ تھے، جو عمر بھر چھوٹا موٹا بیوپار کرتے رہے۔مگر ان کے پاس گھروں کے تہ خانوں میں سونے چاندی کی اینٹیں دفن تھیں اور دولت کی اسی ہوس نے کسی ڈاکو کی چھری سے انھیں ہلاک کرایا۔

اسی لیے میں تو کہتا ہوں کہ اس صنعتی دور میں بھی، انسانی زندگی بڑی عجیب، بڑی ہمہ گیر ہے اور جب

تک انسان، انسان رہے گا یہ رنگا رنگی، یہ تنوع، یہ زندگی کی رونق، اس کا آب و رنگ باقی رہیں گے۔

انسانی معاملات حل کرنے کے لیے سانچے کام نہیں دے سکتے۔ خواہ یہ معاملات سیاسی ہوں یا معاشرتی۔ جو لوگ ''صاحب فردا'' اور ''اہل نظر'' بنتے ہیں اور نت نئی اصلاحات اور نظریے گھڑتے رہتے ہیں۔ اکثر ان کے سارے اندازوں اور اعداد و شمار پر پانی پھر جایا کرتا ہے۔ ان کے اندازے غلط نکلتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسان کی بشریت کو کبھی سامنے نہیں رکھتے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے قانون پاس کرنے والے، نئے نئے ادارے کھولنے والے اور سماج سدھار کے پرچارک مار کھا جاتے ہیں..... شادی اور طلاق کے بارے میں کوئی قانون اتنا اہم نہیں جتنی یہ چیز اہم ہے کہ دولہا، دولہن فی الحال کس ڈھب کے لوگ ہیں۔ اور آئندہ کسی قسم کے لوگ بنیں گے۔ اسی طرح امن عامہ کے تمام ضابطوں اور قاعدوں سے بڑھ کر وہ لوگ اہم ہیں جو ان قوانین پر لوگوں سے عمل درآمد کراتے ہیں اور ان کے محافظ ہیں۔

گویا فرد کی اہمیت کا حال یہ ہے کہ ساری تہذیب کا مرکز اور مقصد، انفرادی زندگی ٹھہرتی ہے مگر فرد کی اہمیت اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی، سیاسی زندگی اور بین الاقوامی تعلقات کی بہتری کا سارا دارومدار ان افراد کے کارناموں اور ان کی طبیعت پر ہے۔ جن سے کوئی قوم بنتی ہے۔ گویا ایک قوم کے مجموعی کام اور اس کی مجموعی طبیعت اصل میں ایک ایک فرد کے کام اور طبیعت سے مرکب ہوئی ہے۔ کسی قوم کی سیاست اور کسی ملک کے ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں داخل ہونے کا سارا دارومدار اس قوم کے کردار، اس کی طبیعت پر ہے کسی قوم کی صنعتی ترقی سے کہیں اونچا درجہ اس بات کو حاصل ہے کہ وہ قوم اپنے مسائل کس طرح حل کرتی ہے اور اپنے کام کاج کس طرح کرتی ہے۔ فرانسیسی مفکر روسو کے ذہن میں انقلاب فرانس کا نقشہ اور انقلاب فرانس کے بعد نپولین جیسے شہنشاہ کا عروج، ہرگز نہیں آیا تھا۔ اسی طرح اشتراکیت کے پہلے نکتہ دان، کارل مارکس کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کے اشتمالی نظریے، حقیقت کی دنیا میں کیا روپ دھاریں گے۔ اور کوئی استالین اس کے نظریوں کی کیا تعبیر دنیا کے سامنے پیش کرے گا۔ فرانس کے انقلاب کی روش اور رفتار کو، آزادی، مساوات اور اخوت کے نعرے نے معین نہیں کیا تھا بلکہ اس انقلاب نے جو صورت اختیار کی اس میں انسانی کردار کی بعض خصوصیات اور فرانسیسی لوگوں کی طبیعت کا ہاتھ تھا۔ کارل مارکس نے اشتراکی انقلاب کے بارے میں جو کچھ پیشگوئیاں کی تھیں وہ بری طرح غلط ثابت ہوئی ہیں اور اس

کی جدلی منطق اس کے کسی کام نہیں آئی۔ کارل مارکس کی پیشگوئی کے مطابق منطقی طور پر سب سے پہلے ان ملکوں میں مزدوروں کا انقلاب برپا ہونا ہونا چاہیے تھا۔ جہاں صنعتی تہذیب اپنے اوج پر ہو یعنی سب سے پہلے انگلستان، پھر امریکہ اور پھر جرمنی میں یہ انقلاب آنا چاہیے تھا کیونکہ انہی ملکوں میں مزدوروں کا ایک مضبوط اور بڑا طبقہ موجود تھا۔

مگر ہوا یہ کہ اشتراکیت کا تجربہ روس جیسے زراعتی ملک میں ہوا۔ جہاں صنعتی مزدوروں کا کوئی بڑا اور مضبوط طبقہ سرے سے موجود نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کارل مارکس نے انگلستان اور امریکہ جیسے ملکوں میں بسنے والے لوگوں کو اپنے اندازوں میں شامل نہیں کیا، وہ بھول گیا کہ انگریز اور امریکی اپنی اپنی طبیعت کے مطابق اپنے مسئلے حل کریں گے اور اپنے اپنے کردار کے مطابق ہر کام کاج کریں گے۔ ہر قسم کے نیم پختہ معاشیات میں یہی بات بھلا دی جاتی ہے کہ قومی کاموں اور انفرادی کردار کتنی بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریز کو لیجیے۔ انگریز کو طبعی طور پر نعروں اور نظریوں سے نفرت ہے۔ انگریز ان چیزوں کو فطری طور پر بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انگریز کا کردار یہ ہے کہ وہ بڑے اعتماد سے ہر کام کو الٹا سیدھا کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اپنا راستہ ہمیشہ نکال لیتا ہے۔ انفرادی آزادی انگریز کے خمیر میں ہے۔ انگریز عزت نفس، سوجھ بوجھ اور پابندی اور باقاعدگی کا بڑا رسیا ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو انگلستان (اور امریکہ) کے لیے حالات اور واقعات کی روش معین کرتی ہیں۔ اس مقام پر کسی کارل مارکس کی منطق کام نہیں آتی۔

تو گویا کسی قوم کے مسائل کا تعین اس ملک کی سماجی اور سیاسی ترقی کی بنیاد، اصل میں ان خیالات پر ہے جو اس قوم کے افراد پر حکمرانی کرتے ہیں کسی قوم کا "قومی کردار" جسے ہم نظری طور پر اس قوم کا "ذہن، اس کی قابلیت" کہتے ہیں، کیا چیز ہے؟ یہ اس قوم کے افراد کے کردار کا مجموعہ ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ "قومی قابلیت" کوئی فرضی چیز ہوتی ہے۔ یہ محض الفاظ کی ترکیب نہیں ہے۔ قومی قابلیت کسی قوم کے کردار کا آئینہ ہوتی ہے۔ قومی قابلیت ہی وہ جوہر، وہ روش ہے، جس کی بدولت کوئی قوم اپنے مسائل سلجھاتی ہے اور کرنے کے سب کام ایک مخصوص طریقے پر کرتی ہے۔ یہ "قومی قابلیت" عمل کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا وجود فرضی نہیں حقیقی ہے، یہ "قومی قابلیت" امتحان اور مصیبت کے وقت ٹھوس صورت ظاہر ہوتی ہے۔ اس وقت پتا چلتا ہے کہ کوئی قوم، اپنے کردار اور اپنی "قابلیت" کے جوہر کی بدولت کیا راستہ اپنے لیے منتخب کرتی ہے اور

کن کن باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتی اور کن کن باتوں کو دوسری زبانوں پر ترجیح دیتی ہے اور کن چیزوں کو دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتی ہے۔ یہی وہ باتیں ہیں جو امتحان یا آزمائش کے وقت کسی قوم کے پروگرام، اس کے لائحہ عمل کو متعین کرتی ہیں۔

پرانی چال کے تاریخ دان، جرمن فلسفی ہیگل کی طرح یہ کہیں گے کہ ایک قوم کی تاریخ محض ایک ایسے تصور کے ارتقا کا نام ہوتا ہے جسے ماحول کی ضرورتیں معین کرتی ہیں مگر تاریخ کا حقیقت پسندانہ اور وسیع تر نظریہ یہ ہے کہ کسی قوم کی تاریخ زیادہ موقع ملنے اور موقع سے فائدہ اٹھانے کی بات تھی۔ مثلاً ایک خاص نازک دور میں ایک قوم نے ایک خاص راستہ اختیار کیا۔ اس کی بدولت اسے متضاد قوتوں اور جذبوں کی کش مکش سے دوچار ہونا پڑا اگر اس موقع پر کسی مخصوص قسم کے جذبات کا پلڑا ذرا بھاری ہو جاتا اور کسی دوسری قسم کے تصورات کا پلڑا ذرا ہلکا ہوتا تو سارا پانسا ہی پلٹ جاتا۔ گویا اس امتحان میں اس قوم کی ''قابلیت'' اس طرح ظاہر ہوئی کہ اس قوم نے ایک خاص فیصلہ کیا کہ یہ کچھ کرنا ہے یا فلاں بات سے بچنا ہے! کیونکہ قوموں نے وہی کچھ کیا ہے جسے وہ پسند کرتی تھیں، یا ان کے جذبات جن کاموں سے آسودہ ہوتے تھے۔ اسی طرح ہر قوم نے وہ کام کبھی نہیں کیا جسے وہ برداشت نہیں کرسکتی تھی، ...... گویا قوموں کا یہ انتخاب اور یہ فیصلہ کسی تصور، کسی خیال کی تحریک پر مبنی تھا اور اس میں اس قوم کی اخلاقی قدریں اور سماجی تعصبات، دونوں برابر کے شریک تھے۔

ایک مثال۔ انگریز قوم کے اس امتحان کا وقت ہے۔ جس کے نتیجے میں اس نے اپنے بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کو تخت چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس امتحان میں انگریزوں کا قومی کردار عین عمل کے وقت نظر آتا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ انگریز کس چیز کو پسندیدہ سمجھتے ہیں اور انھیں کون سی بات بحیثیت قوم ناپسند ہے، اور اس قوم کے دماغ میں کیا کیا باتیں اور کیا مقاصد پنہاں ہیں۔ ظاہری اسباب یہ تھے کہ ہر انگریز ذاتی طور پر اپنے ہر دل عزیز بادشاہ (ایڈورڈ ہشتم) کا وفادار تھا لیکن انگلستان کا کلیسا اس بارے میں بڑا تعصب ہے کہ کوئی شخص (یا بادشاہ) طلاق شدہ عورت کے ساتھ شادی کرے۔ پھر انگلستان میں میں بادشاہت کا روایتی تصور بھی اس سارے سارے جھگڑے میں کارفرما تھا۔ یہ سوال اہم تھا کہ بادشاہ کے پرائیویٹ معاملات پرائیویٹ ہوتے ہیں یا نہیں۔ بادشاہ کے ذاتی معاملات ہونے بھی چاہئیں یا نہیں۔ یہ بات بلکہ یہ حقیقت بھی اس آزمائش کی تہ میں پنہاں تھی کہ ''شاہ برطانوی مندر میں اک مٹی کا بت'' اور آیا بادشاہ کو اس مٹی کے بت کے علاوہ بھی کچھ ہونا

چاہیے یا نہیں؟ یا کسی بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ اس کی ہمدردیاں، لیبر پارٹی کے ساتھ ہوں اگر ان جذبات، ان خیالات اور ان تعصبات میں کوئی اور بات شامل ہو جاتی تو سارا نقشہ ہی پلٹ جاتا اور اس مسئلے کا کوئی نتیجہ بالکل مختلف نکلتا۔

آج کی ساری تاریخ کا یہی حال ہے۔ چاہے روس میں زینوویف، کامے نف اور پیاتو کوف جیسے انقلابیوں کو قتل کر دیا جائے اور رادیک کو قید میں ڈال دیا جائے اور روس کے ڈکٹیٹر کے خلاف ''انقلاب دشمن'' عناصر کی سازشیں، اتنی ہی وسیع اور اتنی ہی عام ہوں جتنی بتائی جاتی ہیں چاہے جرمنی کے نازی حکمران، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ گرجوں کو اپنے خلاف سمجھتے پھریں۔ انگلستان ''قدامت پسندی'' چھوڑ کر واقعی مزدور پارٹی کے پروگرام پر جی جان سے چلنا شروع کر دے یا امریکہ کی کمیونسٹ پارٹی زیادہ ہر دلعزیز ہو جائے یا اب سے بھی کم ہر دلعزیز ہو۔ الغرض ہر واقعہ، ان ملکوں کے افراد کے ذاتی کردار خیالات اور جذبات سے معین ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ کی اس متحرک فلم میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ انسان نے ہمیشہ اپنے تلون سے کام لیا۔ پٹی ہوئی راہ کو پسند نہیں کیا۔ تبدیلی اور تنوع کو پسند کیا اور اپنے اسی کردار کی بدولت انسانی تاریخ کو وہ صورت دی جو ہمارے سامنے ہے۔

اسی لیے کنفیوشس نے عالمگیر امن کے سوال کو افراد کی ذاتی زندگی کی تربیت سے وابستہ کیا تھا۔ سونگ خاندان کے وقت سے آج تک کنفیوشس خیالات کے علماء اور استاد بچوں کو جو پہلا سبق پڑھاتے ہیں اس میں مندرجہ ذیل فقرے آتے ہیں اور بچے کو یہ سبق حفظ کرایا جاتا ہے:

> ''قدیم لوگوں کا دستور تھا کہ اگر دنیا میں اخلاقی ہم آہنگی کی تمنا کرتے، تو یہ کہتے کہ سب سے پہلے ہمیں خود اپنی قومی زندگی کی تنظیم کرنی چاہیے۔ قومی زندگی کی تنظیم کرنے والے سب سے پہلے گھریلو زندگی کو باقاعدہ بناتے۔ جو لوگ گھریلو زندگی کو منظم بنانا چاہتے، وہ سب سے پہلے ذاتی زندگی کی تربیت و تہذیب چاہتے۔ وہ سب سے پہلے اپنے دلوں کو پاک صاف کرتے...... دلوں کو پاک صاف کرنے کی خواہش کرنے والے سب سے پہلے نیتوں کو مضبوط بناتے۔ نیتوں کو مخلص بنانے والے سب سے پہلے سمجھ اور مفاہمت پیدا کرتے اور سمجھ، اشیا کے علم کی چھان بین سے پیدا ہوتی ہے۔ جب اشیا کا علم حاصل ہو

جائے تب سمجھ پیدا ہوتی ہے، اور سمجھ پیدا ہو جائے تو نیت اور ارادہ مخلص ہو جاتا ہے اور جب نیت صاف اور ارادہ مخلص ہو جائے تو دل صاف ہو جاتا ہے۔ جب دل صاف ہو جائے تو ذاتی زندگی کی تہذیب اور تربیت پوری ہو جاتی ہے۔ ذاتی زندگی کی تربیت اور تہذیب ہو جائے تو گھریلو زندگی منظم اور باقاعدہ ہو جائے گی۔ اور جب گھریلو زندگی منظم ہوگی تو قومی زندگی بھی منظم ہو جائے گی۔ اور جب قومی زندگی منظم ہوگی تو دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا گویا شہنشاہ سے لے کر ایک عام آدمی تک ہر چیز کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ذاتی زندگی کی تربیت اور تہذیب کی جائے یہ ممکن ہی نہیں کہ بنیاد باقاعدہ اور ٹھیک نہ ہو تو ساری عمارت ٹھیک اور باقاعدہ ہو۔ دنیا میں ایسا کوئی درخت موجود نہیں جس کا تنا تو کمزور اور نازک ہو اور اس کی اوپر کی ٹہنیاں بے حد بھاری بھرکم اور مضبوط ہوں۔ اس کائنات کی ہر چیز کی کوئی نہ کوئی علت موجود ہے اور ہر چیز کا دوسری کے ساتھ تعلق اٹل ہے۔ اسی طرح انسانی معاملوں میں بھی ابتدا اور انتہا دونوں موجود ہیں لیکن ان درجوں کا جاننا، ان کی تقدیم اور تاخیر کا علم حاصل کرنا یہی دانش مندی کی ابتدا، اس کی دہلیز ہے۔''



پانچواں باب

زندگی سے کون زیادہ حظ اٹھا سکتا ہے؟

1- اپنی تلاش......چونگ زے

آج کی دنیا میں اگر کسی شخص کی سب سے زیادہ عزت کی جاتی ہے اور اس پر کوئی توجہ نہیں نہیں دی جاتی تو وہ فلسفی ہے۔ اصل میں آج کل کسی کو ''فلسفی'' قرار دینا گویا اسے عزت کا ایک لقب دینا ہے۔ آج کل جو شخص اینڈی بینڈی باتیں کرے اور اس کی باتیں کسی کی سمجھ میں نہ آئیں اسے بھی ''فلسفی'' کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ پھر جو شخص حال سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور خیالات میں ڈوبا رہے اسے بھی ''فلسفی'' کہا جاتا ہے۔ ویسے یہ آخری بات کوئی ایسی خلاف حقیقت بھی نہیں۔ ایک معنی میں فلسفہ یہی ہے کہ زندگی اور اس دنیا کے بارے میں ایک ہمہ وقت حاضر و ناظر سا نقطہ نظر قائم رکھا جائے۔ ان معنی میں ہر شخص کا کوئی نہ کوئی اپنا فلسفہ ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جو روزمرہ کی حقیقتوں کو ان کی ظاہر حیثیت میں تسلیم نہ کرے، اسے بھی کم و بیش فلسفی کہنا چاہیے۔ کیونکہ وہ ایسا شخص ہے جو دھوکا کھانے سے انکار کر رہا ہے۔

فلسفی، زندگی کو اسی طرح دیکھے گا، جس طرح کوئی آرٹسٹ، کسی قدرتی منظر کو کسی خاص رنگ میں ڈوبا ہوا یا کہرے یا دھند میں لپٹا ہوا دیکھتا ہے۔ گویا اس طرح زندگی کی کھری تفصیلات کا کھردرا پن باقی نہیں رہتا اور ہمیں یہ دیکھنے کا موقع مل جاتا ہے کہ ان تفصیلات کا اصل مطلب اور معنی کیا ہے۔ اس صورت میں فلسفی، ٹھوس حقیقت پسندوں کے عین الٹ ہے۔ حقیقت پسند، اپنے روزمرہ کے کاروبار میں کھو کر یہ سمجھتا ہے کہ اس کی کامیابی اور ناکامی، اس کے نقصانات اور اس کا نفع حقیقی اور قطعی چیزیں ہیں۔ ایسے شخص کا کوئی علاج نہیں کیونکہ اس کے دل میں تو یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خود کیا چیز ہے! کنفیوشس نے کہا ہے ''اگر کوئی شخص اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھتا کہ، اب کیا کروں اب کیا ہوگا، تو اس شخص کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ''یہ شخص کیا کرے گا اس کا کیا ہوگا۔''

میں اس باب میں، آپ کے سامنے جینے کی ایک مخصوص روش کے بارے میں کچھ چینی فلسفیوں کے خیالات پیش کروں گا۔ان کا آپس میں جتنا اختلاف ہے اتنا ہی زیادہ اتفاق بھی ہے۔سب کا اتفاق اس بات پر ہے کہ انسان کو زیادہ دانشمند ہونا چاہیے اور اسے مسرت بھری زندگی بسر کرنے سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ایک فلسفی کا بڑا مثبت نقطہ نظر، دوسرے فلسفی کے نہایت امن پسندانہ فلسفے سے ٹکر کھاتا ہے اور اس ٹکراؤ سے یہ نظریہ نکلتا ہے کہ زندگی میں کشمکش اور امن پسندی، دونوں کا حصہ برابر برابر ہونا چاہیے۔اور میں سمجھتا ہوں عام چینی کا مذہب یہی ہے۔عمل اور بے عملی میں یہ تصادم ایک سمجھوتے پر ختم ہوتا ہے۔اس سمجھوتے کو قناعت بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس دنیا میں کسی صورت جنت بن سکے، بے شک وہ نامکمل اور ادھوری ہی ہو۔اسی سمجھوتے سے وہ دانائی اور وہ پر مسرت فلسفہ پیدا ہوتا ہے جو تاؤیوان منگ جیسے لوگوں کی زندگی بن گیا تھا، جسے میں چین کا سب سے بڑا شاعر اور سب سے متوازن شخصیت سمجھتا ہوں۔

سارے چینی فلسفیوں نے کم و بیش غیر شعوری طور پر یہ سوال حل کرنے کی کوشش کی ہے کہ:

ہمیں زندگی سے کیسے لطف اٹھانا چاہیے اور زندگی سے کون شخص زیادہ سے زیادہ حظ اٹھا سکتا ہے؟

اس کے جواب میں چینی فلسفیوں نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ انسان ناقص ہے اور اسے ''مکمل'' بنانے کی ضرورت ہے۔کسی نے یہ نہیں کہا کہ جو چیز حاصل نہیں ہو سکتی اس کے پیچھے دوڑنا چاہیے۔کوئی یہ نہیں کہتا کہ جس کے بارے میں کچھ علم نہیں اس کا علم حاصل کرو بلکہ ان کا کہنا ہے کہ انسانی فطرت جو کچھ ہے سو ہے۔ہمیں اسی فطرت کے پیش نظر، کسی طرح زندگی کی تہذیب کرنی چاہیے کہ ہم امن و آسائش سے کام کر سکیں، ہر مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کر سکیں اور خوشی خوشی زندگی گزار سکیں؟

اس مسئلے کو دیکھ کر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''ہم'' کون ہیں؟ ''ہم'' سے مراد کیا ہے؟......اس کا جواب دینا قریب قریب ناممکن سا ہے پھر بھی اس بات پر سب کو اتفاق ہوگا کہ ہمارا یہ نفس جو دنیا کے روزمرہ کے کاموں میں الجھا رہتا ہے، ہمارا نفس اصلی نہیں ہے۔ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے صرف زندگی بسر کرنے کی تگ و دو میں ہی کچھ نہ کچھ ضرور کھو دیا ہے۔کسی ایسے شخص کا خیال کیجیے جو کسی میدان میں کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈتا پھرتا ہے۔اسے دیکھ کر کوئی ہم سے یہ سوال کرے، ذرا بتایئے اس کی کیا چیز کھو گئی ہے؟......اس پر عجیب و غریب قیاس آرائی شروع ہو جائے گی۔ایک کہے گا، اس شخص کی گھڑی کھو گئی ہے۔دوسرا کہے گا۔

ہیرے کی انگوٹھی ہوگی...... تیسرا کچھ اور کہے گا...... یہ سب قیاس غلط ہوں گے ۔ چنانچہ سب سے آخر میں یہ شخص جوسب سے دانش مند ہوگا یہ کہے گا۔ ''میں یہ تو نہیں جانتا کہ اس شخص سے کیا کھویا ہے۔ اتنا ضرور ظاہر ہے کہ اپنا وقت فضول کھو رہا ہے...... !'' اور یہ حقیقت ہے کہ ہم زندگی کی تگ ودو میں کھو کر اپنا نفس صلی، اپنی حقیقی ذات کھو بیٹھتے ہیں۔ ویسے ہی جیسے کوئی پرندہ کسی کیڑے مکوڑے کو پکڑنے کی تگ ودو میں یہ بھول جاتا ہے کہ خود اسے کوئی خطرہ لاحق ہے اور یہ کیڑا اپنے شکار کی تلاش میں اپنے شکاری سے غافل ہو جاتا ہے۔ چونگ زے نے اس چیز کو بڑی خوبصورت کہانی سے واضح کیا ہے:

''جب چونگ زے ایک باغ میں گھوم پھر رہا تھا تو اس نے ایک عجیب پرندہ دیکھا جو جنوب کی طرف سے آیا تھا۔ اس کے پر سات فٹ لمبے تھے اور اس کی آنکھیں ایک انچ بڑی تھیں۔ یہ پرندہ چونگ زے کے سر کے قریب سے اڑتا ہوا ایک پیڑ پر جا بیٹھا۔

چونگ زے نے حیرت میں کہا۔ ''یہ کیا پرندہ ہے کہ اتنے مضبوط اور بڑے پروں کے ساتھ دور تک اڑ نہیں سکتا، یہ اتنی بڑی آنکھوں سے دور یہ دیکھ سکتا ہے کہ ایک انسان قریب ہی کمان لیے کھڑا ہے اور کسی وقت بھی اسے نشانہ بنا سکتا ہے۔

چنانچہ چونگ زے نے کمر کس لی، لبادے کے دامن سمیٹے اور تیر کمان لے کر اس کے قریب پہنچا کہ اسے نشانہ بنائے۔ عین اسی وقت چونگ زے نے پیڑ کے سائے میں ایک ٹڈے کو دیکھا جو غفلت کی نیند سوتا تھا۔ عین اسی وقت ایک بڑے سے کیڑے نے اس ٹڈے کو لپک کر پکڑ لیا اور ہڑپ کر گیا۔ فوراً اس بڑے پرندے نے اس کیڑے کو دبوچا اور کھا گیا...... گویا اس کیڑے کے لوبھ نے پرندے کو سب کچھ بھول جانے پر مجبور کیا تھا۔

چونگ زے نے ایک آہ بھر کر کہا۔ افسوس، ایک مخلوق دوسری کو کس طرح ستاتی ہے اور نفع کی امید کیسے کیسے نقصانات کا پیش خیمہ بنتی ہے!

اس نے اپنی کمان رکھ دی اور گھر کی طرف چل دیا کیونکہ باغ کے رکھوالے نے اسے اپنے باغ میں بے مقصد پھرتے دیکھ کر ڈانٹا تھا۔ اس واقعے کے تین ماہ بعد تک چونگ زے گھر سے نہیں نکلا۔ آخر لن شو نے اس سے پوچھا ''حضرت آپ کب تک باہر نہیں نکلیں گے؟''

چونگ زے نے کہا: ''بیٹا! اس ظاہری جسم کی قید میں، میں اپنے آپ کو بھول چکا تھا، اپنی حقیقی ذات سے غافل ہو گیا تھا۔ گدلے پانیوں کے نظارے نے میری آنکھوں سے گہرائیوں کو اوجھل کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے مرشد نے مجھے یہ بتایا تھا کہ جب دنیا میں رہو تو اس کے رسم و رواج کی پابندی بھی کرو مگر جب میں باغ میں پھر رہا تھا تو میں اپنے آپ کو بھول گیا۔ میرے سر سے اڑ کر جو عجیب سا پرندہ درخت پر بیٹھا تھا وہ بھی اپنی فطرت کو بھول گیا۔ باغ کے رکھوالے نے مجھے چور سمجھا اور مجھے باہر نکال دیا۔ اسی لیے میں گھر سے پھر باہر نہیں نکلا''

چونگ زے لاؤ تزے کا پکا ارادت مند تھا۔ وہ مین سی اس کا ہم عصر تھا جو کنفیوشس کا پیرو تھا مگر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انسان نے کچھ نہ کچھ کھو ضرور دیا ہے اور یہ کام فلسفے کا ہے کہ اس کھوئی ہوئی چیز کا سراغ لگائے اور اسے انسان کو پھر عنایت فرمائیے۔ اس کھوئی ہوئی دولت کو چونگ نے نفس اصلی یا حقیقی ذات قرار دیا تھا۔ مین سی اس اسے ''دل معصوم'' قرار دیتا ہے اور یہ کہتا ہے ''بڑا آدمی وہ ہے جس نے اپنے بچے کے سے دل، معصوم دل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔'' وہ کہتا ہے کہ تہذیب کی مصنوعی زندگی کا اثر ایک نوجوان دل پر وہی ہوتا ہے جو پہاڑوں پر سے جنگلات کاٹ دینے سے ان پہاڑوں پر ہوتا ہے:

''کوئی وقت تھا نیاؤ پہاڑ کے گھنے جنگل بڑے خوبصورت تھے......اب ان پہاڑوں کو کون خوبصورت کہہ سکتا ہے۔ یہ پہاڑ اور اس کے جنگل ایک بڑے شہر کے قریب تھے اور اب لکڑ ہاروں نے جنگل کاٹ کاٹ کر نابود کر دیئے ہیں۔ کبھی ان جنگلوں کی پرداخت، خود رات اور دن کیا کرتے تھے۔ بارش اور شبنم انھیں سینچا کرتی تھیں، اور اس سرزمین سے ہر آن زندگی کی نئی کونپلیں پھوٹتی رہتی تھیں پھر مویشیوں اور بھیڑ بکریوں نے، یہاں چرنا شروع کیا۔ اب پہاڑ کی ساری ڈھلان ننگی ہو چکی ہے اور اب لوگ یہی سوچتے ہیں کہ پہاڑ کی یہ ڈھلان ایسی بنجر اور ننگی تھی۔ یہاں درخت بھلا کہاں ہوں گے؟...... میں پوچھتا ہوں: کیا پہاڑوں کی اصلی فطرت یہی ہے؟ کیا انسان کا دل فطری طور پر سرسبز اور محبت سے معمور نہیں؟ مگر فطرت کب خوبصورت رہ سکتی ہے۔ کیونکہ ہر راز تو اس پر اسی طرح کلہاڑا چلتا

ہے۔ جس طرح نیاؤ پہاڑ کے شاداب جنگلوں پر چلتا ہے۔ انسانی فطرت پر دن اور رات پھاہار کھتے ہیں، نسیم سحری اس کے پھلنے پھولنے کا پیغام لاتی ہے مگر نسیم سحری کے لمحات مختصر ہوتے ہیں۔ اور اس کا کیا دھرا، ان کاموں اور ان باتوں سے نیست و نابود ہو جاتا ہے جو انسان دن بھر کرتا ہے۔ رات بھر میں انسانی روح کو جتنی تازگی اور بحالی نصیب ہوتی ہے وہ دن بھر کی کوفت سے برابر کم ہوتی رہتی ہے۔ انسانی روح کی اس مسلسل کانٹ چھانٹ سے، رفتہ رفتہ وہ وقت آ جاتا ہے کہ انسان اپنے مرتبے سے گر کر حیوان بن جاتا ہے۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ وہ حیوانوں کی طرح ہو چکا ہے اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس میں کوئی کردار تھا ہی نہیں۔ ویسے ہی جیسے نیاؤ پہاڑ کی چٹیل ڈھلانوں کو دیکھ کر سوچتے ہیں کہ یہاں کبھی سبزہ تھا ہی نہیں مگر کیا انسانی فطرت کے بارے میں یہ تصور صحیح ہوگا؟''

2- جذبہ دانش اور جرأت: مین سی اس

فلسفی مین سی آس کا خیال ہے کہ زندگی سے حظ اٹھانے کے لیے موزوں ترین شخص وہ ہے جس میں جذبے کی گرمی ہو، جو بے باک ہو، اور جسے کسی چیز کا ڈر نہ ہو۔ اس کے نزدیک مثالی انسان کی ''پختہ خوبیاں'' تین ہیں اور وہ ہیں دانش، رحمدلی اور جرات۔ میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتا ہوں اور بڑے آدمی کی یہ تین خوبیاں قرار دیتا ہوں۔ یعنی، جذبہ، دانش اور جرات۔ جذبے کی بنیاد شہوانی خواہشات سہی مگر جذبے کا لفظ خوش قسمتی سے بہت وسیع معنی کا حامل بھی ہے۔ ایک جذباتی شخص ہمیشہ عورتوں کا شیدائی ہوتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ جو عورتوں کا شیدائی ہو وہ جذباتی ضرور ہو یہ چانگ چاؤ کا قول ہے اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''شہوانی جذبات اس کائنات کی تہ ہیں اور دماغی جوہر اس کائنات کی چھت ہے'' گویا اگر جذبات نہ ہوں تو زندگی کا سفر شروع نہیں ہوگا۔ جذبات زندگی کی روح رواں ہیں، تاروں کی روشنی ہیں، موسیقی کا سحر ہیں، شعر کا جادو ہیں، پھولوں کا حسن، پرندوں کی خوبصورتی، عورتوں کی دلکشی ہیں اور انہی کے دم سے علمیت میں آب و رنگ اور جان ہے جذبات ہی انسانی دل میں وہ گرمی اور وہ ہمت پیدا کرتے ہیں جن کی بدولت ہم زندگی کا سامنا کر پاتے ہیں۔

میں نے ''جذبات'' کا لفظ جوش اور ولولہ اور انتہائے شوق اور ہیجان کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

احساسات کا لفظ غالباً بہتر ہوتا...... کیونکہ اس میں جذب وشوق کا ہیجان شامل نہیں ہوتا۔ احساسات نسبتاً نازک تر اور لطیف تر ہوتے ہیں، ان میں طوفانی کیفیت نہیں ہوتی ...... یہی وجہ ہے کہ چینی مزاج میں ہم ایسے ''جذبات'' کی کمی پاتے ہیں جو وفورِ شوق سے پُر ہوں۔ جن میں ایسی شدت اور ایسی طوفانی کیفیت ہو جیسی ہمیں، مغربی ادب کے بڑے بڑے المیہ ڈراموں میں ملتی ہے۔ اسی لیے یونانی معنی میں المیہ ڈرامے، چینی ادب میں سرے سے موجود نہیں چینی ڈراموں کا کلاسیکی دور یہ ہے کہ ان کے مرکزی کردار (المیہ ہیرو) المیے کے وقت رو پڑتے ہیں یا اپنی محبوبہ دشمنوں کے حوالے کر دیتے ہیں یا پہلے اپنی محبوبہ کے سینے میں چھری مارتے ہیں اور پھر خودکشی کر لیتے ہیں مغربی معیار اور مغربی تنقید کی رو سے یہ اونچے پائے کا المیہ بنتا ہی نہیں مغرب کے لوگ ایسے چینی ڈرامے سٹیج پر دیکھیں تو وہ ان کے انجام سے مطمئن نہیں ہوں گے مگر چینی زندگی مغرب کی زندگی سے بہت مختلف ہے اور جیسی چینی زندگی ہے ویسا ہی اس کا ادب ہے۔ چینی مزاج کا خاصہ اس سلسلے میں بالکل مختلف ہے۔ چینی مزاج کہتا ہے کہ انسان، تقدیر سے ٹکر لیتا ہے اور مار کھاتا ہے۔ چنانچہ المیہ، اس انجام کے بعد شروع ہوتا ہے، المیہ، یادوں کا وہ دلدوز ہجوم ہے جو انجام کاروں پر چھا جاتی ہے۔ المیہ اس بے کار پشیمانی اور تاسف کا نام ہے جو ہارنے والے کا حصہ ہوتے ہیں، اس سوچ کا نام ہے کہ ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا!'' المیے کے اس چینی تصور کی خوبصورت مثال، شہنشاہ منگ ہوانگ کی کہانی ہے۔ اس نے اپنے باغی لشکر کو خوش کرنے کے لیے یہ اجازت دے دی تھی کہ اس کی محبوب ملکہ خودکشی کر کے، اس دنیا سے اٹھ جائے تاکہ باغی لشکر کو ملکہ سے جو شکایات تھیں وہ ختم ہو جائیں۔ اس واقعے کے بعد شہنشاہ اپنی ساری عمر اسی محبوب ملکہ کی یادوں کی دنیا میں بسر کرتا ہے۔ گویا المیہ محبوب کی موت نہیں، بلکہ المیہ اس واقعے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ المیہ دکھوں کے ہر آن بڑھتے ہوتے انبار سے ملتا ہے اور یہ المیہ، ڈرامے کے زیادہ حصے پر چھایا ہوا ہے۔ شہنشاہ جلاوطن ہو جاتا ہے۔ جلاوطنی میں وہ سرگرداں، جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتا ہے۔ برسات کی ایک رات وہ ایک پہاڑی کے دامن میں دور سے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز سنتا ہے اور اپنی محبوبہ کی یاد میں ''برکھا رین کا گیت'' لکھتا ہے۔ ہر چیز اور ہر بات اسے کھوئی ہوئی محبوبہ کی یاد دلاتی ہے اس کا ننھا سا رومال جس میں ابھی تک خوشبوئے دلبری باقی ہے۔ اس کی بوڑھی خادمہ مقتول ملکہ کی دوسری چیزیں، سب کچھ، یادوں کا سہارا بنتی رہتی ہیں اور انجام کار جلاوطن شہنشاہ، پروہتوں اور پیروں کی دستگیری سے اپنی محبوبہ کی روح کو ڈھونڈنے میں لگ جاتا ہے۔

گویا چینی ایسے میں رومانی احساس، اور لطافت دو اصل چیزیں ہیں اور اگر ہمارے ہاں ''وفور شوق'' اور ''جوش جذبات'' کی اجازت ہے تو بس یہیں تک ہے۔ اسی لیے چینی فلسفی، انسان کی ''خواہشات'' کو تو اچھا نہیں گردانتے مگر وہ جذبات اور احساسات کے خلاف نہیں ہیں۔ بلکہ وہ انہی کو انسان کی عام زندگی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ چینی فلسفی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ''میاں بیوی کے درمیان جو شہوانی خواہشات کا رشتہ ہوتا ہے، وہی رشتہ روزمرہ کی عام زندگی کی بنیاد ہے!''......

بدقسمتی سے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جذبات ہر انسان کے حصے میں نہیں آتے۔ جس طرح انسان کو اپنے ماں باپ چننے کا اختیار قدرت نے نہیں بخشا۔ اسی طرح یہ بات بھی قدرت کے ہاتھ میں ہے کہ ہم جذباتی لحاظ سے گرم جوش یا سرد مہر پیدا ہوں۔ مگر مشاہدے کی بات یہ ہے کہ کوئی بچہ ماں کے پیٹ سے سرد مہر پیدا نہیں ہوتا۔ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ دل کی گرم جوشی کم ہوتی جاتی ہے اور ہماری روح کی گرمی بھی اسی نسبت سے گھٹتی جاتی ہے۔ بلوغت کے زمانے میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ماحول کی بے رحمی کی بدولت ہماری جذباتی زندگی ہمیشہ کے لیے مردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، یا یہ بالکل سرد ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں ماحول سے زیادہ خود ہمارا قصور ہوتا ہے کہ ہم اسے زندہ نہ رکھ سکے، ایسے ماحول سے دامن نہ بچا سکے جو اس کے لیے سخت مہلک تھا۔ دنیا جس چیز کو ''زندگی کا تجربہ'' کہتی ہے، اسے حاصل کرنے میں ہماری اصلی فطرت کے ساتھ بڑی بڑی زیادتیاں ہوتی ہیں۔ ہم کچھ کے کچھ بن کے رہ جاتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو ''سخت'' بنانا سیکھتے ہیں۔ تصنع اور بناوٹ سے کام لینا سیکھتے ہیں۔ سرد مہر اور سنگ دل، بلکہ ظالم بننا سیکھتے ہیں۔ دل میں یہ فخر ہوتا ہے کہ ہم نے زندگی کا بہت ''تجربہ'' حاصل کیا مگر اصل میں ہوتا یہ ہے کہ اس سارے زمانے میں ہمارے اعصاب بے حس ہو جاتے ہیں۔ ان میں لچک اور زندگی کی لہر ٹھنڈی پڑتی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ زندگی کے ہر میدان، خصوصاً تجارت اور سیاست میں تو آپ کے سامنے ہے۔ یہ اسی عمل، اسی ''تجربے کے حصول'' کا نتیجہ ہے کہ ہم میں ایسے آدمی پیدا ہوتے ہیں جو آپا دھاپی سے سب کچھ اپنے قبضے میں کر لینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ جو ہر جائز ناجائز طریقے سے زندگی میں کامیابی حاصل کر کے رہتے ہیں اور جو شخص ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے اسے ختم کر کے، چت کر کے دم لیتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہم میں وہ آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ جنھیں ''فولادی عزم کے انسان'' کہا جاتا ہے۔ جن میں جذبات کی رمق تک باقی نہیں رہتی، جو جذبات کو

فضول اور بے معنی سمجھتے ہیں۔ یہی اشخاص ہیں، جن سے نفرت کرنا بھی شریف آدمی کی توہین ہے مگر دنیا میں ایسے سخت دل حضرات کی کمی نہیں۔ کئی مہذب ملکوں میں یہ تحریک چلی ہے کہ جو لوگ لولے، اپاہج اور کوڑھی ہوں یا جسمانی لحاظ سے کسی ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہوں انھیں خصی کر دیا جائے۔ تاکہ قوم کی نئی نسل اچھی پیدا ہو۔ میرا خیال ہے اگر کوئی ملک اسے قانون بنا لے تو اسے سب سے پہلے ان لوگوں کو تولید کے ناقابل کر دینا چاہیے جو اخلاقی لحاظ سے بے حس ہوں، جن میں فنون لطیفہ کا احساس مردہ ہو چکا ہو، جن کا دل سخت ہو چکا ہو۔ جو کامیابی کے لیے ہر سخت گیری اور ظلم روا سمجھیں اور روا رکھیں، جو اپنے ارادے کی سنگینی کے آگے کسی چیز کی کوئی حقیقت نہ سمجھیں۔ گویا ہر شخص کو اس صف میں شامل کرنا ہوگا جو زندگی سے لطف، اٹھانا بھول چکا ہے۔ جس کے لیے زندگی کا ہلکا پھلکا پہلو، زندگی کی لطافت اور رنگینی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تپ دق اور کوڑھ کے مریضوں یا پاگل لوگوں کو اولاد پیدا کرنے کے ناقابل بنانے سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان مردہ دلوں کو باپ بننے کے شرف سے محروم کر دیا جائے۔ کیونکہ، ایک زیادہ جذباتی آدمی تو زیادہ سے زیادہ چند حماقتیں کر لے گا اور بس...... مگر جذبات و احساسات سے جو شخص سراسر کورا ہو وہ تو انسان ہی نہیں۔ وہ انسانیت کا چلتا پھرتا مذاق، جیتا جاگتا کارٹون ہے۔ وہ ایک کیڑا ہے، ایک مشین ہے۔ اس کا وجود، انسانیت کے لیے ننگ ہے۔ میں سمجھتا ہوں، بہت سی طوائفوں کی زندگی، جذبات سے عاری بڑے بڑے تاجروں کی زندگی سے کہیں ارفع اور اعلیٰ ہے...... طوائفیں زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ گناہ کی زندگی سے بسر کرتی ہیں لیکن طوائفوں میں محبت کرنے کی صلاحیت تو ہے اور یہ ہر مقدس کتاب میں ارشاد ہے کہ ''جو لوگ محبت کر سکتے ہیں، ان کے لیے عفو کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں'' جذبات اور احساسات بڑی بڑی غلطیاں بھی سرزد کراتے ہیں اور ان غلطیوں کی ہمیں، بعض دفعہ بڑی کڑی سزا بھی ملتی ہے پھر بھی محبت کی فراوانی اور جذبات کا وفور، ان غلطیوں کو دھو ڈالتا ہے۔ کئی مائیں دنیا میں ایسی ہوں گی جنھوں نے محبت کی خاطر گھر بار کو پس پشت ڈال دیا پھر بھی یہ مائیں بوڑھی ہو کر یہ محسوس کیا کرتی ہیں کہ ان کی زندگی مطمئن اور بھرپور گزری۔ انھیں کسی بات کا افسوس اور کسی چیز کی ہوس نہیں ہوتی۔ وہ ان ماؤں سے کہیں زیادہ اچھا بڑھاپا گزارتی ہیں جو عمر بھر تنے ہوئے رسوں پر چلتی رہیں اور سخت گیری کو جنھوں نے اپنا شعار بنائے رکھا۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک خاتون کا ذکر سنایا۔ اس معمر خاتون نے میرے دوست سے کہا تھا: ''دیکھو صاحب، میری عمر 78 برس کی ہے، اپنی زندگی میں مجھ

سے کئی گناہ سرزد ہوئے ہیں مگر مجھے ان گناہوں پر رنج نہیں ہوتا ہاں، جب مجھے خیال آتا ہے کہ ان 78 برسوں میں کئی بار میں نے بڑی بے وقوفی سے کام لیا تھا تو اپنی حماقتوں پر مجھے بڑا رنج ہوتا ہے اور میں اس عمر میں بھی اپنی گزشتہ حماقتوں کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔''

آپ کہیں گے، یہ زندگی تو بڑی سخت چیز ہے اور جو شخص دل کا نرم، طبیعت کا سخی اور جذبات کا سچا ہو، اسے اس دنیا کے عقلمند بڑی جلدی بیوقوف بناتے ہیں۔ فراخ دل لوگ اپنی فراخ دلی کی بدولت بڑی غلطیاں کرتے ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو دشمن نہیں سمجھتے اور اپنے دوستوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد رکھتے ہیں! یہ بھی ہوا ہے کہ فراخدل لوگوں کو بڑی تلخی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اپنے دل کی تلخی مٹانے کے لیے انھوں نے جل بھن کر کوئی بڑی تیز، تلخ نظم لکھ دی ہے۔ چینی ادب میں اس کی ایک مثال، مشہور چائے فروش چانگ تائی کی ہے۔ اس نے اپنی دولت، فیاضی اور فراخدلی کے باعث دنوں میں اڑا دی اور اس کے دلی دوستوں اور عزیزوں نے سخت دھوکا دیا۔ اس شاعر نے اپنے دل کی تلخی کا اظہار بارہ نظموں میں کیا ہے اگرچہ میرے نزدیک یہ دنیا کے تلخ ترین اشعار ہیں پھر بھی میں جانتا ہوں کہ شاعر چانگ تائی اپنی فراخدلی سے ہاتھ نہیں کھینچ سکا۔ وہ عمر بھر ویسا ہی فراخدل، فیاض اور سیر چشم رہا اور سخت محتاجی بلکہ فاقوں تک نوبت پہنچنے کے باوجود اس میں یہ وصف قائم رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تلخی کا طوفان جو اس کے دل میں اٹھا تھا وہ بہت جلد چھٹ گیا ہوگا اور اس نے باقی زندگی ہنس بول کر گزار دی تھی۔

چنانچہ یہ لازم ہوا کہ انسان کو اپنی فراخدلی کی حفاظت کرنی چاہیے تاکہ زندگی کی تلخی اس پر چھا نہ جائے۔ اس کے لیے ایک اصول، ایک فلسفے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی کے سنگین حقائق کا سامنے کرنے کے لیے محض دل گرم کافی نہیں اسی لیے جذبات کی شدت کے ساتھ، دانش اور جرات دونوں کا سہارا ضروری ہوگا میرے نزدیک دانش اور جرأت دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ جرأت زندگی کو سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جو شخص زندگی کو مکمل طور پر سمجھتا ہے اسی کے لیے بہادری ممکن ہے۔ زندگی سے ناواقف لوگ کبھی بہادر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی یاد رکھیے کہ جو دانش اور سمجھ آپ کو بہادری نہیں سکھاتی وہ کسی کام کی نہیں۔ دانش اس لیے بھی بہادری کا دروازہ ہے کہ دانش ہماری احمقانہ امنگوں اور ارادوں پر کڑا پہرا رکھتی ہے۔ انھیں حد سے بڑھنے نہیں دیتی، یہ معیار سے گرنے دیتی ہے۔ دانش ہی ہمیں اس دنیا کے تکلف اور تصنع کی فضولیات سے چھٹکارا دلاتی ہے۔ اس

لیے دانش ہی ہم میں جرأت اور حوصلہ پیدا کر سکتی ہے۔

جہاں تک فضولیات کا تعلق ہے اس زندگی میں فضولیات کی کمی نہیں۔ چین کے بودھ عالموں نے زندگی کی ان بے شمار چھوٹی چھوٹی فضولیات کو دو عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا ہے، یعنی شہرت اور دولت۔ چین کی ایک کہانی یہ ہے کہ ایک دفعہ ایک شہنشاہ جنوبی چین کا دورہ کرنے گیا۔ سمندر کے ساحل کے قریب ایک پہاڑی تھی جس پر چڑھ کر شہنشاہ نے دیکھا کہ بحر چین میں ہزاروں چھوٹے بڑے جہاز، کشتیاں اور بجرے ادھر ادھر آ جا رہے ہیں۔ شہنشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا، یہ اتنے سارے جہاز، کشتیاں، بجرے، کیوں اتنی پریشانی اور تیزی سے سمندر میں دوڑتے پھرتے ہیں؟ اور ان میں جو ہزاروں آدمی ہیں وہ کیا کرتے ہیں؟ اس کے وزیر نے جواب دیا۔ ''جہاں پناہ مجھے تو صرف دو جہاز نظر آتے ہیں، ایک کا نام شہرت ہے اور دوسرے کا دولت!'' اور حقیقت بھی یہی ہے۔ دولت کی ہوس سے تو بہت سے باذوق لوگ دامن بچا سکے ہیں مگر ''شہرت'' کی ہوس سے بچنے کے لیے بہت زیادہ عظیم الشان ہونا ضروری ہے ایک پروہت اپنے چیلوں کو شہرت اور دولت کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا، اس نے اپنے وعظ کے دوران میں بڑے کام کی بات کہی ہے: ''دولت اور شہرت، دنیاوی تکلیفوں کے دو بڑے سرچشمے ہیں۔ دولت کی ہوس سے نجات پانا آسان ہے مگر شہرت کی ہوس کو تج دینا بہت ہی مشکل ہے۔ اوروں کا ذکر تو چھوڑیے، پروہت، علما اور پروہت بھکشو تک یہ چاہتے ہیں کہ اپنے اپنے حلقے میں شہرت کے مالک ہوں، وہ چاہتے ہیں کہ ان کے عقیدت مندوں کا گروہ بہت بڑا ہو اور وہ اپنے پرہجوم جلسہ عام میں وعظ و تلقین کریں۔ وہ نہیں چاہتے کہ چپ چاپ کسی چھوٹی سی خانقاہ میں حجرہ نشین ہو جائیں اور صرف ایک شاگرد کو پڑھانے پر اکتفا کریں.....'' اس پر شاگرد نے کہا: ''میرے مشفق! آپ ہی شاید اس دنیا میں تنہا شخص ہیں کہ شہرت کی ہوس پر بھی غلبہ پانے میں کامیاب ہوئے ہیں'' اس پر استاد مسکرا دیا۔

بدھ مت کے ان رشیوں نے زندگی کی فضولیات کو جن دو گروہوں میں بانٹ دیا ہے وہ میرے نزدیک مکمل نہیں۔ میرا یہ دعویٰ ذاتی مشاہدے پر مبنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے دھوکے اور فضولیات، دو کے بجائے تین عنوانات میں آتے ہیں۔ یعنی، شہرت، دولت اور حکومت یا اختیار۔ امریکہ میں ایک ہی لفظ، ان تینوں کے معانی پر حاوی ہوتا ہے اور اسے زندگی کا سب سے بڑا دھوکا سمجھیے۔ یہ ہے کامیابی مگر ایک بات ظاہر ہے۔ گمنامی کے ڈر کا دوسرا روپ ہوتی ہے اور ناکامی کا ڈر، غربت کا ڈر اور گمنامی کا ڈر، انسانوں کی زندگی پر نسل

درنسل چھائے رہتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو شہرت اور دولت دونوں چیزوں کے مالک ہیں پھر بھی وہ دوسروں پر حکومت کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی اپنے ملک کی خدمت کے لیے ''وقف'' کر دیتے ہیں مگر اس کی قیمت بڑی بھاری ہے۔ کوئی دانش مند شخص اس بات پر ہرگز تیار نہیں ہوگا کہ اسے دن میں سات سات دفعہ تقریر کرنی پڑے اور پبلک جلسوں میں بار بار بولنا پڑے۔ آپ اسے جمہوری حکومت کی صدارت بھی دے دیں پھر بھی وہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہوگا بلکہ وہ ملک کی ''خدمت'' ہی سے انکار کر دے گا۔ امریکی جیمس برائس نے کہا تھا کہ امریکہ میں جس قسم کا جمہوری نظام حکومت رائج ہے وہ اس قسم کا ہے کہ ملک کے بہترین لوگ سیاسیات میں آنے سے ہمیشہ کتراتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، امریکہ میں صدارتی انتخاب کے لیے جن دوروں، تقریروں اور انتخابات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اتنے کٹھن ہیں کہ امریکہ کے دانشمند لوگ ان کے تصور ہی سے کانپ اٹھتے ہیں پھر پبلک عہدوں کی ایک مصیبت اور بھی ہے۔ جمہوری ملک کے ان وزرا یا صدر کو بعض بعض دفعہ ایک ہفتے میں چھ چھ سات سات دفعہ پبلک دعوتوں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ محض اس لیے کہ یہ لوگ اپنی زندگی ملک کی ''خدمت'' کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں یہ بھلا مانس ''قوم کا خادم'' اپنی زندگی، اپنے گھر کے کھانے اور اپنے گھر کے سیدھے سادے مگر آرام دہ بستر کے لیے کیوں وقف نہیں کرتا؟ مگر حضرت انسان کی ہوس نرالی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ شہرت اور اختیار کے دھوکے میں پھنسنے کے بعد آدمی خواہ مخواہ دوسری فضولیات میں بھی جا پھنستا ہے۔ کیونکہ یہ کام ہی ایسا ہے۔ شہرت اور اختیار کے بعد انسان کو شیطان یہ انگلی دکھاتا ہے کہ ''اسے سماج سدھار'' کرنا چاہیے۔ چنانچہ اب اس پر معاشرتی اصلاح کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے ''اخلاق بلند تر'' کرنے کی پڑ جاتی ہے۔ ''دین کی حفاظت'' بدی اور گناہ کی بیخ کنی کا سودا سر میں سماتا ہے۔ انسان بہت جلد ایسے پروگرام بنانے لگتا ہے جن پر اس کے خیال کے مطابق دردوسروں کو عمل کرنا چاہیے لیکن دوسروں کے بنائے ہوئے پروگراموں میں وہ اب ہر ممکن رکاوٹ ڈالے گا۔ وہ کمیٹیوں اور سالانہ کانفرنسوں میں لمبی چوڑی رپورٹیں پڑھے گا کہ اس نے اور اس کے ماتحت دوسروں نے اس کے دور حکومت میں لوگوں کے لیے کیا کچھ کام کیا۔ وہ عمارتوں کے سنگ بنیاد رکھتا پھرے گا۔ اور پاگل خانوں تک کا افتتاح کرے گا۔ (ذرا ڈھٹائی ملاحظہ ہو) گویا وہ دوسروں کی زندگی میں بے جا دخل دیتا ہی رہے گا۔ وہ بہت جلد یہ بھول جائے گا کہ اس نے خواہ مخواہ جو دنیا بھر کی ذمہ داری سنبھال لی ہے،

دوسروں کی ''اصلاح'' کا بیڑا اٹھالیا ہے، اپنی سکیموں پرعمل درآمد کرانے اور اپنے مخالفین کی سکیموں کو تلپٹ کرنے کی جولم نکالی ہے۔وہ سب فضول ہے۔اصل میں یہ کیڑا اس کے دماغ میں بالکل حال کی پیداوار ہے۔ پہلے سے یہ فکرنہیں تھی، غالباً ان باتوں کا پہلے اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا لیکن اب وہ اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھنے لگا ہے۔ جیسے دنیا کا کاروبار اسی کے دم سے ہے!!......آپ کسی انتخاب میں ہارے ہوئے وزارتی صدارتی امیدوار کو دیکھئے۔ ناکامی کے دو ہفتے بعد ہی ملک کے بڑے بڑے مسائل، مزدوروں کے معاملات، بے روزگاری کا مسئلہ،محصولوں اورٹیکسوں کا مسئلہ، گویا ہر چیز اس کے ذہن سے بالکل نکل جاتی ہے۔دو ہفتے پہلے یہی چیزیں اس کے ذہن پرسوار تھیں اور وہ اپنے آپ کو ان مسائل کا حل کرنے والا واحد شخص سمجھ رہا تھا۔

ہارنے کے بعد وہ سوچتا ہے، میں کون ہوں کہ اوروں کی 'اصلاح' کا بیڑا اٹھاؤں؟ ان کے اخلاق ''سدھارنے'' کا ٹھیکہ لےلوں اور پھر جو اشخاص بدقسمتی سے پورے حواس میں نہیں اور دنیا انھیں پاگل کہتی ہے انھیں پاگل خانے بھجواتا پھروں؟

اس کے برعکس اگر یہی شخص الیکشن میں کامیاب ہو جاتا تو یہی چھوٹی چھوٹی بیکار باتیں، دوسروں کی زندگی میں یہی دخل اندازی، اس کی زندگی کا مقصد بن جاتی۔اسے یہ خیال ہو جاتا کہ وہ بہت اہم شخصیت ہے۔اور واقعی کوئی اہم کام کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور مفت کی دردسری ہے۔جو ہماری معاشرتی زندگی کے لیے بڑی مصیبت ہے۔ اسے فیشن کہتے ہیں۔اس دنیا میں کسی طرح کی بناوٹ کے بغیر، اپنے اصلی روپ میں نظر آنا بڑا مشکل ہے اور اس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔یونانی فلسفی ڈیموکریٹس (جو جمہوری نظریوں کا بانی کہا جاتا ہے) نے اپنے خیال میں بہت بڑا کام یہ کیا تھا کہ اس نے انسان کو دو بنیادی خدشوں سے نجات دلوائی تھی د ایک تو خدا کا ڈر اور دوسرے موت کا ڈر مگر یہ دونوں ڈر دل سے نکال بھی دیے جائیں تو مسئلہ حل نہیں ہوتا اور انسان ایک بہت بڑے عالمگیر خوف کا پھر بھی غلام رہتا ہے۔یہ اپنے ہم چشموں، اپنے ساتھیوں، اپنے ہم سایوں کا ڈر ہے۔اول تو بہت ہی کم لوگ خدا کے ڈر اور موت کے ڈر کو اپنے دل سے نکال سکے ہیں اور جو یہ کر بھی گزرے ہیں وہ بھی انسان سے بہرحال ڈرتے رہے ہیں۔اسی لیے ہر شخص کو زندگی بھر ایک مقرر کردار، ایک لگا بندھا پارٹ ادا کرتے رہنا پڑتا ہے۔اور یہ کردار، یہ پارٹ ایسا ہوتا ہے جسے وہ خود نہیں بلکہ دوسرے

پسند اور معین کرتے ہیں۔

انسان میں اداکاری کا فطری جوہر ہوتا ہے۔ انسان میں نقل کا مادہ بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ اداکاری اور نقل کا آپس میں بڑا تعلق ہے کیونکہ نقل، اداکاری ہی کا ایک حصہ ہے۔ یہ جبلی خاصہ ہمارے ان اجداد سے ہم تک پہنچا ہے جو بندر تھے...... تماشا، اداکاری اور بناوٹ کے کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ تو تماشائیوں کی داد ہے مگر یہ نہ بھولیے کہ تماشائیوں کی داد جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی اسٹیج کے پیچھے اداکاروں کا دل دھڑکے گا، تماشا دکھانے کے خیال سے اتنے ہی زیادہ پسینے چھوٹیں گے۔ بہر حال اداکاری ایسا جوہر ہے جس سے انسان روزی بھی کما سکتا ہے۔ اس لیے تماشائیوں کے کہنے پر اگر آپ ان کا پسندیدہ پارٹ ادا کرتے رہیں تو آپ کو کوئی الزام نہیں دے گا۔ فیشن یہی چیز ہے۔ یہ تماشائیوں، آپ کے دیکھنے والوں کا پسند کردہ کردار ہے جو آپ کا ادا کرنا پڑتا ہے۔

اس میں ایک اعتراض کا پہلو نکلتا ہے۔ آپ بیشک یہ پارٹ نبھاتے رہیے مگر ایسا نہ ہو کہ آپ محض اداکار ہو کر رہ جائیں اور اداکاری آپ کی حقیقی ذات پر بری طرح چھا جائے۔ کیونکہ اداکاری چیز ہی ایسی ہے۔ دنیا میں وہ لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جو اپنے بلند مرتبے اور شہرت کے باوجود انسان پہلے ہیں اور پھر کچھ اور ہیں۔ ہر کوئی اس طرح آپے میں نہیں رہ سکتا۔ یہ گنے چنے لوگ ہر وقت یاد رکھتے ہیں کہ وہ محض ایک پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ رتبے، جائداد اور دولت، یا خطاب کی چمک ان کی آنکھیں اندھی نہیں کرتی، نہ ان کے دماغ پر نشے کی طرح چھاتی ہے۔ رتبے کی بلندی اور دولت کی فراوانی اگر انھیں حاصل ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو بھول نہیں جاتے۔ وہ بے نیازی کی شان سے ان چیزوں کو قبول کر لیتے ہیں مگر یہ کبھی نہیں بھولتے کہ وہ ایک معمولی انسان ہیں اور بس...... یہی لوگ صحیح معنی میں عظیم انسان ہوتے ہیں۔ وہ عمر بھر اپنی سادہ مزاجی اور سادہ دلی کو قائم رکھتے ہیں۔ طنطنہ اور طمطراق ان کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ اسی لیے سادگی، صحیح معنی میں عظیم انسانوں کو ہمیشہ سے لازمی خصوصیت مانی جاتی ہے۔ چھوٹے آدمیوں کی پہچان ہی ان کی کم ظرفی ہے۔ ذرا معمولی سے بھی سرکاری اہل کار کو دیکھیے۔ جسے اپنے اختیار اور رتبے کے بارے میں کئی طرح کی غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ اسے دیکھتے ہی آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ شخص ظرف کا ہلکا ہے۔ کسی نو دولتیے کو دیکھیے کہ وہ کس شان سے اپنے زر و جواہر کی نمائش کرتا ہے۔ کسی نو آموز اور گھٹیا قسم کے ادیب کو دیکھیے۔ وہ ہمیشہ یہی ظاہر کرے گا کہ چونکہ وہ زندہ

جاوید عظیم ادیبوں کی صف سے تعلق رکھتا ہے اس لیے وہ عام لوگوں سے کوئی الگ مخلوق ہے۔ یہ لوگ سادگی اور فطری پن سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور ان کی بناوٹ، ان کا تصنع ہی ان کے گھٹیا پن کی دلیل ہوتا ہے۔

انسان میں اداکاری کی یہ جبلت اتنی گہری اور شدید ہے کہ وہ اکثر اوقات یہ بھول جاتا ہے کہ جو پارٹ وہ ادا کر رہا ہے اس کے علاوہ بھی اس کی کوئی حقیقی زندگی، کوئی اصلی روپ ہے۔ بس اس ''پارٹ'' کی خاطر ہم انسان اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں اور زندگی بھر اس طرح رہتے ہیں جس طرح سماج ہمیں جینے کو کہتا ہے۔ ہم اس طرح زندگی بسر نہیں کرتے جس طرح ہمارا نفس اصلی ہمیں زندگی بسر کرنے کو کہتا ہے ایک مشہور چینی مقولہ ہے کہ ''خود تو بیگم صاحبہ اس امید میں بوڑھی ہو گئیں کہ کسی مرد سے شادی ہو جائے مگر نہ ہو سکی۔ اور اب بیچاری دن رات محنت کر کے دوسری عورتوں کے لیے سہاگ کے جوڑے تیار کر رہی ہیں!!'' یہی حال ہمارا ہے۔

3- لاؤ تزے کی تعلیم ...... ''کلبیت، نادانی اور فریب نظر''

چینی فلسفی لاؤ تزے کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی کو ''پرانا پاپی'' بننا چاہیے۔ یہ نظریہ بظاہر شرافت سے دور معلوم ہوتا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہی فلسفہ، امن، رواداری، سادگی اور قناعت کی مثال بن جاتا ہے۔ اس کی تعلیم میں یہ کہا گیا ہے کہ نادانی میں بڑی دانش مندی پنہاں ہے۔ اصلی بات کو چھپائے رکھنے اور اسے کچھ کا کچھ دکھانے میں بڑا فائدہ ہے۔ کمزوری میں بڑی طاقت ہے، اور تکلف اور تصنع کی انتہا میں، بڑی سادگی ہوتی ہے۔ یہ فلسفہ چینی مزاج کی جان ہے۔ خود چینی آرٹ، اس فلسفے سے الگ کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ چینی آرٹ میں شاعرانہ نظر فریبی، بنیادی چیز ہے اور اس کے علاوہ چینی آرٹ میں لکڑ ہارے اور مچھیرے کی سادہ زندگی کو ہمیشہ معراج کمال سمجھا جاتا ہے۔ چینی امن پسندی کی تہ میں یہ جذبہ ہوتا ہے کہ زندگی کے عارضی نقصانات کو صبر سے برداشت کیا جائے اور مناسب وقت اور موقع کا انتظار کیا جائے۔ اس امن پسندی کی تہ میں یہ شعور بھی پنہاں ہے کہ قدرت کا کارخانہ عمل اور ردعمل کے اٹل قانون پر چلتا ہے۔ اس لیے دنیا میں کسی کو نہ تو ہمیشہ کے لیے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور نہ کوئی شخص ہمیشہ کے لیے ''احمق اور نادان'' ہوا کرتا ہے۔ مشہور قول ہے کہ:

> ''دانش کے بہت بڑے نکات سراسر نادانی کی باتیں نظر آتی ہیں اور فصاحت کی معراج، لکنت معلوم ہوا کرتی ہے۔ حرکت، سردی پر غالب آتی ہے۔ مگر سکون، گرمی پر غالب آتا

ہے۔اسی لیے وہ (ذات باری) اپنے صاف اور واضح سکون سے ہر چیز کو اس کائنات میں صحیح اور درست رکھتا ہے......''

گویا قدرت کا قانون یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسروں پر نہ تو کوئی مستقل ترجیح حاصل ہے نہ اسے دوسروں کے مقابلے میں مستقل طور پر فائدے ہی حاصل ہوتے ہیں۔اسی طرح قدرت کا قانون یہ بھی ہے کوکوئی شخص دنیا میں سراسر اور ہمہ وقت ابلہہ اور نادان نہیں۔اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ لڑنا جھگڑنا بیکار ہے۔ لاؤتزے کا قول ہے:''دانا لوگ کبھی کسی سے جھگڑتے نہیں، نہ مقابلہ کرتے ہیں۔لہٰذا اس کل کائنات میں کوئی شخص ان کے ساتھ مقابلہ نہیں کرسکتا'' ایک جگہ یہی فلسفی کہتا ہے:''تشدد سے کام لینے والے کسی ایک شخص کا نام لیجیے جس کا انجام ٹھیک ہوا ہو میں اس کو اپنا مرشد، اپنا استاد ماننے کو تیار ہو جاؤں گا۔''

آج کل کا فلسفی اس قول کو یوں بھی پیش کرسکتا ہے:''کسی ایک ڈکٹیٹر کا نام لیجیے جو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے خفیہ پولیس سے کام نہ لیتا ہو۔یا وہ خفیہ پولیس کی خدمات سے بے نیاز رہ سکتا ہو۔میں اس ڈکٹیٹر کا سب سے پرجوش حامی بن جاؤں گا!'' یہی وجہ ہے کہ لاؤتزے نے کہا تھا:''جب تاؤ (صراط مستقیم، سچائی، قانون فطرت، مذہب وغیرہ) بے اثر ہو کر رہ جائے، تو دنیا، گھوڑوں کو لڑائی کے لیے سدھانا شروع کر دیتی ہے اور جب تاؤ کا اثر اقتدار قائم ہو تو گھوڑوں سے صرف گاڑیاں کھینچنے کا کام لیا جاتا ہے!'' ملاحظہ ہو:

''بہترین سوار وہ ہیں، جو سرپٹ گھوڑا اڑاتے ہوئے اندھا دھند نہیں جاتے۔بہترین جنگجو وہ ہیں جو اپنے غصے اور غیظ وغضب کا مظاہرہ نہیں کرتے۔بہترین فاتح وہ ہیں جو جھگڑے میں پڑنے کے بغیر جیت جاتے ہیں۔بہترین لیڈر وہ ہے جو اپنے لوگوں سے اس طرح کام لیتا ہے گویا وہ ان سے بہتر نہیں کمتر ہے یہی وہ چیز، وہ طاقت ہے جو لڑائی جھگڑے مناقشے، اور مقابلے سے دامن بچانے کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔

یہی وہ صلاحیت ہے جس کی بدولت ایک شخص دوسروں سے جو کام چاہے لے سکتا ہے۔یہی وہ جوہر ہے جس کی بدولت انسان قدیم زمانے کی طرح، ایک بار پھر آسمانی نور سے ہم آہنگ ہوسکتا ہے۔''

قدرت میں عمل اور ردعمل کا جو قانون کارفرما ہے، اس کی بدولت تشدد وجود میں آتا ہے اور تشدد سے

تشدد ہی پیدا ہوتا ہے:

''جو شخص، سچائی اور قانون فطرت (تاؤ) کے ذریعے سے کسی بادشاہ کی مدد کرے گا وہ ہتھیاروں اور فوجی طاقت کے بل پر ہر جنگ اور ہر فتح کی مخالفت کرے گا کیونکہ جنگ سے جنگ ہی پیدا ہوتی ہے اور جہاں کہیں فوجیں ہوں گی وہاں اناج نہیں اگ سکتا، صرف کانٹے اور جھاڑیاں اگ سکتی ہیں...... بہت بڑی فوج جمع کرنے سے ملک میں ہمیشہ قحط سالی ہوگی۔

اسی لیے اچھا جرنیل وہ ہے جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے اور اپنے کام کو جھنڈے پر نہیں چڑھاتا۔

اچھا جرنیل وہ ہے وہ جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے اور اپنے کام کی ڈینگ نہیں مارتا۔

اچھا جرنیل وہ ہے، جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے اور اپنے کام پر فخر نہیں کرتا۔

اچھا جرنیل وہ ہے، جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے، صرف اس لیے کہ ایسا اقدام ناگزیر تھا، اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔

اچھا جرنیل وہ ہے جو اپنا مقصد حاصل کرتا ہے مگر تشدد کے بغیر حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ جو چیز ایک وقت میں دوسروں پر چھا جائے گی اس کے انحطاط کا بھی وقت آئے گا اور دوسروں پر چھا جانا قانون فطرت (تاؤ) کے خلاف ہے۔

اور جو چیز تاؤ کے خلاف ہے وہ بہت جلد مٹ جائے گی!''

مجھے لاؤزے کے اس فلسفے پر اتنا یقین ہے کہ میرے خیال میں اگر وہ پہلی جنگ عظیم کے بعد صلح کی ورسائی کانفرنس کا صدر ہوتا تو دنیا میں ہٹلر کبھی وجود میں نہ آتا۔ ہٹلر کا دعویٰ یہ تھا کہ اس پر اور اس کے کام پر خدا کی ''خاص رحمت'' کا سایہ ہے۔ اس کا ثبوت اس کے نزدیک یہ تھا کہ اسے جو اقتدار حاصل ہے وہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ میں سمجھتا ہوں، ہٹلر بیچارے پر خدا کی رحمت تو کیا ہوگی البتہ فرانسیسی وزیراعظم کلے من شو کی دعائیں ضرور اس کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ اس نے ورسائی کی صلح کانفرنس میں جو کچھ کیا، جرمنی میں اسی کی وجہ سے ہٹلر جیسا شخص عروج حاصل کر سکا مگر چین کی صلح پسندی اور امن جوئی ''انسانیت'' کے اصول پر مبنی نہیں۔

چین کی صلح پسندی کی تہ میں ''عالمگیر محبت'' کا جذبہ کارفرما نہیں۔ اس کی تہ میں تو لطیف قسم کی دانائی کارفرما ہے۔ وہ دانائی ہر چیز کے جاننے سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ دانائی جو اس زمانے میں ''پرانے پاپیوں'' کا حصہ ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

''آخر میں جس چیز کو سیکٹرنا ہو، اسے پہلے کھینچ کر بڑھانا پڑے گا۔
جس چیز کو کمزور کرنا ہو، اسے پہلے مضبوط بنانا ہوگا۔
جس چیز کو ختم کرنا ہو، اسے پہلے قائم کرنا ہوگا۔
جو شخص کچھ لینا چاہے، اسے پہلے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ دینا پڑے گا۔
جو یہ نہیں جانتا سمجھیے کہ اس کی روشنی بصیرت کم ہوگئی۔
چنانچہ اسی وجہ سے نرم چیز، سخت چیز پر غالب آجاتی ہے اور کمزوری، طاقت پر غلبہ پاتی ہے۔
اسی وجہ سے مچھلیوں کو وہیں رہنے دیجیے جہاں وہ ہیں اور ملک کے اسلحہ کو وہاں رکھیے جہاں کسی کی نظر اس پر نہ پڑے!''

کمزوری کی بے پناہ قوت، صلح جوئی کی فتح یابی اور خاکساری کے فوائد پر کسی اور فلسفی نے اتنی مؤثر تعلیم نہیں دی۔ ان باتوں میں لاؤ تزے حرف آخر ہے اور وہ بار بار پانی کی مثال دیتا ہے۔ وہ اپنی تعلیمات میں جگہ جگہ پانی کے استعارے سے اپنی بات ثابت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پانی اس کائنات میں کمزور کی طاقتوری کا بہترین مظہر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پانی کا ایک قطرہ بڑی نرمی، بڑی آہستگی سے ٹپکتا رہتا ہے اور چٹان جیسی سخت چیز میں سوراخ کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پانی میں وہ دانائی ہے جو تاؤ کی دانش سے بھرپور ہے۔ کیونکہ پانی ہمیشہ نشیب اور نیچی سطح تلاش کرتا ہے۔ لاؤ تزے کا قول ہے:

''بڑے بڑے دریاؤں اور اتھاہ سمندروں نے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے ندی نالوں پر یہ سرداری، یہ بادشاہت کیسے حاصل کی؟
اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بڑے بڑے دریاؤں اور اتھاہ سمندروں نے چھوٹے ندی نالوں کی نسبت زیادہ نشیبی، زیادہ نیچی جگہ ڈھونڈی۔ اور یہی ان کی سرداری کا راز ہے۔''

لاؤ تزے کے اقوال میں ''وادی'' کی علامت اور مثال کو بہت جگہ ملتی ہے۔ وادی سے اس کی مراد خالی اور گہری جگہ اور ماں کا رحم ہے۔ اسے چینی میں ین یعنی عورت یا مادہ کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

''وادی کی روح کبھی مر نہیں سکتی۔ یہ وہ جذبہ ہے جسے پراسرار عورت بھی کہا جاتا ہے۔
پراسرار عورت کے دروازے ہی سے زمین و آسمان پیدا ہوئے...... یہ جذبہ ہماری ہستی میں
ہر وقت موجود ہے، اس سے جتنا چاہو کام لو، یہ سرچشمہ کبھی خشک نہیں ہوگا، نہ کبھی اس میں
کوئی کمی واقع ہوگی!''

اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی تہذیب، نسوانی اصول کی مظہر ہے اور مغربی تہذیب مذکر کی نمائندہ ہے۔ چین کی قوت سراسر انفعالی ہے، فاعلی نہیں اور یہ انفعالی قوت، وادی اور رحم مادر سے بے حد مشابہ ہے۔

''پہاڑوں کے درمیان، ایک گہری وادی (یا رحم) ہر وہ آسمانی نعمت جمع کر لیتی ہے، جو اس میں سما سکے اور چونکہ یہ وادی ہے اس لیے زمین پر اس کی اپنی قوت ہے جو اس کے وجود کے لیے ہر لحاظ سے کافی ہے!''

لاؤ تزے نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ ''دنیا میں سب سے اشرف اور ممتاز انسان کبھی نہ بنو۔'' شہرت اور امتیاز کے خطرات پر چونگ زے نے بڑی خوبصورت چیز لکھی ہے۔ جو اصل میں، کنفیوشس اور ان کے مظاہرہ علمیت کی ہجو ہے چونگ زے کی کتابوں میں، کنفیوشس کے خلاف ایسی بہت سی توہین آمیز نظمیں ملتی ہیں کیونکہ چونگ زے سے پہلے ہی کنفیوشس کا انتقال ہو چکا تھا اور ویسے چین میں ہتک عزت کے بارے میں کوئی قانون بھی نہیں اور وہاں ازالہِ حیثیت عرفی کوئی چیز نہیں۔ چونگ زے لکھتا ہے:

''ایک دفعہ کنفیوشس نے سات دن کا روزہ رکھا کیونکہ وہ ایک کش مکش میں گرفتار تھا۔
اس پر وزیر جین اس کی عیادت کے لیے گیا اور وہ بولا، ''حضرت آپ تو بالکل موت کے منہ
میں تھے''
کنفیوشس نے کہا: ''ہاں ایسی ہی بات ہے۔''
وزیر نے پوچھا: کیا آپ موت سے خائف ہیں؟
کنفیوشس نے جواب دیا۔ 'ہاں میاں، موت سے میں خائف ہوں۔'
وزیر نے کہا: تو سنیے، میں آپ کو وہ طریقہ سمجھاتا ہوں کہ آپ کبھی مر نہیں سکتے۔ بات یہ ہے

کہ مشرقی سمندروں کی طرف ایک خاص قسم کا پرندہ ملتا ہے۔ یہ پرندہ بڑا سیدھا، بڑا بھولا بھالا اور سادہ ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پرندے میں ذہانت نام کو نہیں۔ تیزی اور چالاکی سرے سے نہیں۔ ان پرندوں کا غول ہمیشہ ایک وقت میں اڑتا ہے اور ایک وقت میں کسی جگہ بسیرا کرتا ہے۔ اڑتے وقت غول میں سے کوئی دوسرے سے آگے نہیں بڑھتا۔ پرواز سے واپسی پر کوئی پرندہ دوسرے سے پیچھے نہیں رہتا۔ کھاتے وقت کوئی پرندہ اپنے ساتھیوں سے پہلے کھانا شروع نہیں کرتا۔ بلکہ اچھا یہی سمجھتا ہے کہ دوسرے ساتھیوں کے چھوڑے ہوئے دانے کھائے۔ اس لیے یہ پرندے آپس میں بڑے امن و آشتی سے رہتے ہیں اور باہر کی دنیا انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اسی وجہ سے ان پر آج تک کوئی مصیبت نہیں آئی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سیدھے اور تناور درخت دوسروں سے پہلے کاٹے جاتے ہیں۔ میٹھے پانی کے کنوؤں میں سے پانی پہلے ختم ہوتا ہے مگر آپ ہیں کہ احمقوں کی حیرت کے بارے بھونچکا کرنے کے لیے اپنی علمیت کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ آپ ہیں کہ اوروں کی ذلت کے مقابلے میں اپنی تہذیب اور اپنی رفعت میں مصروف ہیں اور آپ بزعم خود زندگی کی راہوں پر اس طرح روشنی پھیلاتے جا رہے ہیں گویا سورج اور چاند دونوں آپ کی بغل میں ہیں اسی لیے دنیا جہان کی مصیبتیں اور زحمتیں آپ کو درپیش رہتی ہیں، آپ ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے''

ساری بات سن کر کنفیوشس نے کہا: ''واقعی میاں تم ٹھیک کہتے ہو اور کنفیوشس نے فوراً اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہا، اپنے شاگردوں کو چھٹی دے دی اور جنگلوں میں چلا گیا۔ ان بیابانوں میں وہ جانوروں کی کھالوں سے اپنا تن بدن ڈھانپتا اور پھل پھول کھا کر گزر اوقات کرتا۔ پرندے اور دوسرے جنگلی جانور اس کے آس پاس سے گزرتے اور اسے بالکل کچھ نہ کہتے۔ اس سے کوئی تعرض نہ کرتے!''

گویا یہ ثابت ہوا کہ تاؤ قانون فطرت یا ازلی سچائی کی رو سے نادانی میں بڑی دانائی مضمر ہے۔ کم رفتاری،

بانکپن کا نام ہے۔ حماقت میں بڑی دوررسی پنہاں ہے اور خاکساری میں بڑا فائدہ ہے۔

لاؤ تزے نے یہ بھی کہا ہے کہ ''نادان اور ناتواں لوگوں پر خدا کی رحمت ہے کیونکہ وہ دنیا میں سب سے مسرور لوگ ہیں'' لاؤ تزے کی تعلیمات کا اثر یہ ہے کہ ہر صدی کے چینی مفکروں نے اسی کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی اپنی باتیں کہی ہیں اور ان کی باتوں میں اسی کا فلسفہ جھلکتا ہے۔ نادانی اور سادگی کی تعریف میں چینی ادب کے ہر دور میں سینکڑوں تحریریں مل جاتی ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں چنگ پنجاؤ نے یہ مشہور فقرہ کہا تھا: ''بیوقوف بننا مشکل ہے۔ چالاک بننا بھی مشکل ہے۔ لیکن چالاکی سے ترقی کرتے کرتے بیوقوفی تک پہنچنا کہیں زیادہ مشکل ہے۔'' چونگ زے نے کہا تھا: ''چالاکی تھوک دو۔'' غرض ہر صاحب فکر چینی نے انسانی عقل اور عقل کی براقی اور چالاکی کو ہمیشہ مشکوک سمجھا ہے اور ہمیشہ اس شخص کو ''دانائے راز'' قرار دیا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہو کہ میں سخت احمق ہوں۔

گویا چینی ثقافت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذہانت اور ذہن کی براقی پر شک کرتی ہے اور نادانی اور کچھ نہ جاننے کے عقیدے کو ایک اعلیٰ درجہ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی قرار دیتی ہے کہ اصلی روپ کو بہروپ میں چھپانا، زندگی کی لڑائی میں فتح پانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ احمق لوگ بڑے ہردلعزیز ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے ہر ملک میں اس شخص سے بڑی نفرت کی جاتی ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ سخت چالاکی سے برتاؤ کرے اور اپنا کام نکالے۔ چینی ادیب، یوآن چنگ لانگ نے ایک پورا مقالہ یہ بتانے کے لیے لکھا تھا کہ اس کے بھائیوں نے باقی لوگوں کو چھوڑ کر بے چار بے حد احمق اشخاص کو نوکری کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ احمق نوکر، حماقت اور وفاداری دونوں باتوں میں بے مثال تھے۔ اس سے قطع نظر، آپ خود اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو ذہن میں لائیے۔ ہمارے پسندیدہ لوگ وہ نہیں جن کی ہم اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے عزت کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ہم قابلیت کی وجہ سے عزت کرتے ہیں۔ انھیں ہم دل سے پسند نہیں کرتے۔ گویا ہم آپ، سبھی لوگ، احمق نوکروں کو ہی پسند کر سکتے ہیں کیونکہ ایسے نوکروں پر ہمیں اعتماد ہوتا ہے اور ان کے سامنے ہمیں اپنی برتری جتانے کے لیے قسم قسم کے حیلوں سے کام نہیں لینا پڑتا۔ اسی وجہ سے اکثر دانا مرد رفیق زندگی کے طور پر زیادہ، بانکی، تیکھی عورت کو منتخب نہیں کریں گے۔ اسی طرح عقلمند عورتیں، بہت زیادہ چالاک مردوں سے شادی کرنا ہرگز پسند نہیں

کرتیں۔

چین کی تاریخ میں چند مشہور احمق گزرے ہیں۔ان کی نادانی حقیقی تھی یا محض وہ بنتے تھے۔یہ کون جان سکتا ہے مگر یہ سب کے سب بڑے ہردلعزیز تھے۔ان میں ایک سونگ شہنشاہوں کے دور کا مشہور مصور می فائی ہے جسے باؤلا کہا جاتا تھا اور باؤلے کا لقب اسے یوں ملا کہ ایک دفعہ وہ پوجا کے لباس میں ایک چٹان کے پاس پہنچا اور یہ کہہ کر اس کی پرستش شروع کر دی کہ ''یہ چٹان نہیں میرا خسر ہے!'' می فائی کو صفائی کا بھی بڑا خبط تھا اور گردوغبار سے اسے سخت الجھن ہوتی تھی۔یہی حال یوآن دور کے مشہور مصور نی یون لین کا تھا۔اسی طرح کا ایک دیوانہ ہان شان تھا جو پجاری اور مشہور شاعر تھا۔اس نے کئی خانقاہوں میں باورچی کا کام کیا، دوسروں کا بچا کھچا کھا کر عمر گزاری اور خانقاہوں اور ان خانقاہوں کے باورچی خانوں کی دیواروں پر اپنے زندہ جاوید شعر لکھتا رہا۔ان کے علاوہ سب سے بڑا باؤلا جس نے چین کے لوگوں کو اپنا دیوانہ بنایا، وہ پجاری چی تھا۔اس کی شخصیت کے گرد ایک لمبی چوڑی کہانی بن جی گئی ہے۔اس کہانی کی ساری فضا طلسمی ہے۔پجاری، جی، اس کہانی کے مطابق طلسمات اور طبی معجزوں، بدمعاشی اور شراب خوری کی رسیا دنیا میں رہتا ہے۔اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک ہی دن میں وہ ایسے ایسے شہروں میں آ موجود ہوتا ہے جن میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہو اس کی یاد میں ایک مندر بھی بنایا گیا ہے۔یہ مندر ہانگ چاؤ کی مغربی جھیل کے پاس، ہو پاؤ کے شہر میں اب تک موجود ہے۔

چین میں سولہویں اور سترہویں صدی میں یہ دستور تھا کہ اس زمانے کے اعلیٰ ترین دماغ کے مالک، اپنی سادگی اور اپنے برتاؤ سے لوگوں پہ ظاہر کیا کرتے تھے گویا ان کا دماغ ٹھیک نہیں اور عقل، دانش اور جذبات کا وہ اعلیٰ معیار نہیں چھو بھی نہیں گیا جس کے وہ اصل میں مالک تھے۔

4- سی سی کی تعلیم......توازن اور اعتدال

میں جانتا ہوں کہ جو فلسفہ، خوش باشی اور غیر ذمہ دار زندگی کی تعلیم دیتا ہے اس کی وجہ سے ہمیں مصروفیت کی زندگی اور زندگی کی زیادہ ذمہ داریاں سنبھالنے سے نفور ہو گا۔اور اس فلسفے کی بدولت ہم میں عمل کی خواہش کم ہو جائے گی مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آج کی بے حد مصروف دنیا کو اس فلسفے کی ضرورت ہے کہ آخر کام کر کے آپ کیا لیں گے؟ عمل کے فلسفے نے آج کی مصروف دنیا کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے کیونکہ اس کی بدولت

انسان ہزار ہا قسم کے بیکار اور لایعنی کاموں میں مصروف رہتا ہے۔لہٰذا عمل کی بے مائیگی کے فلسفے نے دنیا کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا عمل کی اہمیت اور حد سے بڑھی ہوئی اہمیت نے ہمارے لیے مصیبتیں پیدا کی ہیں...... عمل کی بے مائیگی کا فلسفہ اس لیے بھی نقصان دہ نہیں کہ انسان میں عمل کی جسمانی تحریکیں موجود ہیں۔یہی وجہ ہے کہ چینی، آزادہ روی اور بے کاری کے فلسفے کے قائل ہوتے ہوئے بھی بے حد محنتی اور جفاکش قوم ہیں۔

لہٰذا خاطر جمع رکھیے۔عمل کی بے مائیگی کا یہ طلبی فلسفہ کبھی اتنا ہر دلعزیز نہیں ہوسکتا کہ ایک زمانہ اسی پر عامل ہو جائے خود چین سیاسی کو دیکھ لیجیے۔تاؤ کے قانون فطرت کے لیے ہر چینی کے دل میں فطری طور پر جگہ ہے۔یہ فلسفہ چین میں ہزاروں برس سے نفوذ کر رہا ہے۔چینی ادب و شعر کے لفظ لفظ سے اس فلسفے کی جوتیں نکلتی ہیں۔چینی تصویروں کے ہر رنگ سے اس کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔پھر بھی چین میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دولت شہرت اور حکومت کے بھوکے ہیں اور جنھیں یہ خبط بھی ہے کہ اپنے ملک کی ضرور ''خدمت'' کریں (یعنی دوسروں کی زندگی اور معاملوں میں ضرور دخل انداز ہوں!)......اگر یہ رنگا رنگی اور تضاد نہ ہوتا تو انسانی زندگی چل نہ سکتی......اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ چینی لوگ، کلبی فلسفے کے اس وقت قائل ہوتے ہیں اور شاعری بھی اسی وقت کرتے ہیں، جب انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔تاؤ کے قانون فطرت نے ان پر صرف یہ اثر کیا ہے کہ زندگی کی رفتار چین میں دھیمی ہے، اعصاب کا تناؤ کم ہے اور جب چینی لوگوں کو آسمانی مصیبتوں اور انسانی بدانتظامی سے واسطہ پڑتا ہے تو قانون فطرت، عمل اور ردعمل کے اٹل قانون پر ان کا اعتماد پختہ تر ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے مطابق آخر انصاف کا بول بولا ہو کر رہتا ہے۔

یہ خیال پچھلی فصل میں بیان کیا جا چکا ہے۔چین میں اس کے عین الٹ، ایک اور مکتب فکر بھی ملتا ہے جو خوش باشی اور آزادہ روی کے اس فلسفے کا جواب ہے۔پہلی قسم کا فلسفہ، فطری انسان کو مثالی بنا کر پیش کرتا ہے۔دوسرے خیال کے مطابق مجلسی انسان مثالی قرار دیا گیا ہے۔گویا پہلا فلسفہ اگر تاؤ (قانون فطرت۔صراط مستقیم، ازلی سچائی) کا پرچار کرتا ہے، تو دوسرا فلسفہ کنفیوشس سے تعلق رکھتا ہے۔اگر تاؤ کے فلسفے اور کنفیوشس کے فلسفے کو محض زندگی کے بارے میں منفی اور مثبت نقطہ نظر سمجھا جائے تو ان کا تعلق صرف چین سے نہیں، ساری انسانیت سے ہے۔ہر انسان، اسی مثبت اور منفی فلسفوں کا میل ہوتا ہے۔مگر جو شخص تاؤ کے فلسفے پر پوری طرح عامل ہو اس کے لیے لازم ہے کہ دنیا کو چھوڑ کر کسی پہاڑ کی چوٹی پر غار میں بسیرا کرے اور جہاں تک ممکن ہو سکے

لکڑ ہارے یا ماہی گیر کی سادہ زندگی کی مثال سامنے رکھے۔ وہ اپنے اردگرد نگاہ دوڑائے اور دیکھے کہ لکڑ ہارے اور ماہی گیر پہاڑی ڈھلانوں اور ندیوں پر کس خوشی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور پہاڑیوں کے جنگل اور پہاڑیوں کے ندی نالے ان کے وجود سے کس قدر بے نیاز رہتے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ تاؤ کے عامل، فلسفی اور تارک، انہی خیالات اور انہی نظاروں سے دل کا سکون، روح کی شانتی اور آنند حاصل کرتے ہیں۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ جو فلسفہ ہمیں انسانی معاشرے سے دور بھاگنے کی تعلیم دے۔ وہ کیا فلسفہ ہوا؟ چنانچہ اس رہبانیت سے ایک عظیم تر فلسفہ وجود میں آیا۔ جس کا نام فلسفہ انسانیت ہے۔ اس کے مطابق چینی فکر کا نصب العین یہ ٹھہرتا ہے کہ انسانی معاشرت سے دور رہنے کی کوشش نہ کی جائے۔ انسانی زندگی سے گریز کی کوشش نہ کی جائے۔ اس کے مطابق تارک گھٹیا قسم کے لوگ ہیں جو دنیا چھوڑ کر ویرانوں میں پناہ لیتے ہیں تا کہ اپنی جھوٹی موٹی روح کا جوہر قائم رکھ سکیں۔ ''اصلی درویش وہ ہے جو شہر میں رہتا ہو!'' کیونکہ یہی وہ شخص ہے جسے اپنے آپ پر پوری قدرت حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے ماحول، اپنے گردوپیش سے خائف نہیں ہوتا۔ چنانچہ سب سے بڑا درویش وہ ہے جو انسانی معاشرے میں رہنے کے لیے لوٹ آتا ہے۔ جو سب کچھ کھاتا پیتا ہے۔ عورتوں کی محفل سے بھی لطف اٹھاتا ہے مگر اس کی روح۔ ملوث نہیں ہونے پاتی۔

گویا مندرجہ بالا دو فلسفوں کو آپس میں ملا دینے کی کافی گنجائش ہے۔ یہ دونوں فلسفے، تاؤ ازم اور کنفیوشس کا فلسفہ، انتہا کے دو متقابل نقطوں، دو متضاد رایوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان، اعتدال اور توازن کے کئی راستے موجود ہیں، بیچ کی کئی راہیں کھلی ہیں۔

خشک مزاجی بھی حد کے اندر ہی اچھی لگتی ہے۔ اسباب عیش سے سراسر نفرت بھی نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرح اگر آپ نوع انسان کی نیکی کے منکر ہیں تو آپ کو حد کے اندر ہی رہنا چاہیے کیونکہ زندگی کا اعلیٰ اصول یہی ہے کہ انسان معقولیت کی حد میں زندگی بسر کرے۔ کنفیوشس کے پوتے سی سی نے اسی بات کو اپنی کتاب ''اعتدال کے سنہری راستے'' میں پیش کیا ہے۔ انسانی زندگی کے کسی ایک قدیم یا جدید فلسفے نے اتنی بڑی حقیقت کو پیش نہیں کیا کہ اچھی زندگی، دو انتہاؤں کے درمیانی راستے پر چلنے کا نام ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جسے توازن (نصف اور نصف کا کانٹا) کہا گیا ہے۔ گویا معقولیت کی مدد سے ہمیں، عمل اور بے عملی کے درمیان مکمل

توازن کا مقام اپنانا ہوگا۔ اس لحاظ سے مثالی آدمی وہ ہے جو نیم شہرت اور نیم گمنامی میں زندگی گزارے۔ جو نیم کاہلی سے رہتا ہو اور نیم مصروفیت سے کاہل رہ کر وقت گزارے۔ جو اتنا غریب بھی نہ ہو کہ گھر کا کرایہ تک ادا نہ کر سکے، اتنا امیر بھی نہ ہو کہ اسے ہاتھ پاؤں ہلانے اور جدوجہد کرنے کی ضرورت نہ پڑے یا یہ خواہش اس کے دل میں پیدا ہی نہ ہو کہ کاش میرے پاس اور روپیہ ہوتا تاکہ میں اسے دوستوں کی مدد کے لیے صرف کر سکتا اگر وہ گانے کا شوقین ہو تو صرف ایسا گا سکتا ہو کہ اس کے دوست اس کا گانا سن کر خوش ہو جائیں اور وہ خود بھی اپنا جی بہلا سکے اگر اسے عمدہ چیزیں جمع کرنے کا شوق ہو۔ تو صرف اتنی چیزیں جمع کرے جو دیوان خانے کی انگیٹھی پر آ سکیں۔ اگر وہ پڑھتا ہو تو اتنا کہ کام چل سکے، وہ دنیا سے بہت زیادہ کام کی باتیں سیکھے مگر کسی کام یا علم یا فن کا ماہر نہ بن جائے۔ اگر لکھتا ہو تو ایسا کہ آدھی چیزیں چھپتی ہوں اور باقی کی آدھی واپس کر دی جاتی ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ چینی قوم نے عام زندگی کا یہ معقول ترین نصب العین مقرر کیا ہے۔ اس نصب العین کو چینی شاعر لی می آن نے اپنے گیت ''نصف اور نصف کا توازن'' میں خوب ظاہر کیا ہے:

عمر آدھی سے زیادہ گزری!
''نصف'' کا لفظ بھی کیا چیز ہے،
معنی کے طلسمات نہاں ہیں اس میں!
''نصف'' کا لفظ ہے اک دعوت پنہاں گویا
''نصف'' کا لفظ اشارہ ہے کہ جو دیکھا نہیں ہے، دیکھو
''نصف'' کا لفظ یہ کہتا ہے کہ جو چکھا نہیں ہے چکھو،
''نصف'' کا لفظ بھی کیا ہے!
معنی کے طلسمات نہاں ہیں اس میں!
زیست کا آدھا سفر طے کر کے،
زیست کے سب سے حسیں دور کا آغاز ہوا کرتا ہے،
نرم سیر، اور سبک رو بھی ہوئی جاتی ہے رفتارِ حیات!
عرش اور فرش کے مابین ہی مل سکتی ہیں

وسعتیں کون ومکاں، عالم امکاں کی یہاں!
شہرودیہات سے ہوقربت ودوری میں برابر جومقام
اس جگہ رہتے،......وہی کھیت ہیں سب سے بہتر
ندیوں اور پہاڑوں کے جومابین ملیں!
نیم عالم بنو، اور نیم امیر اور تجارت بھی کرو،
کچھ امارت سے، تو کچھ عام طریقے سے بھی جینا سیکھو،
نیم سادہ بھی ہو اور نیم امیرانہ بھی، رہنے کا مکاں۔
نیم آراستہ بھی، خالی بھی۔

وہ لباس اچھے ہیں جو آدھے نئے، آدھے پرانے ہو جائیں،
کھانا وہ اچھا ہے جو نیم رئیسانہ بھی ہو، نیم غریبانہ بھی۔
خادم اچھے ہیں وہی، جو نہ ہوں چالاک تو احمق بھی نہ ہوں،
بیوی اچھی ہے وہی، جو نہ ہو طرار، تو سادہ بھی نہ ہو
میں بھی ہوں دل میں جو کچھ بدھ کے تو کچھ تاؤ کے انداز لیے
نصف میرا ہے، سپرد خالق
نصف باقی ہے، مرے بچوں کی میراث......یہی سوچتا ہوں
اپنے بچوں کے لیے، کیا کروں اور کیا نہ کروں۔
یہ بھی ہے فکر......کہ خالق کو بھی دینا ہے جواب!
نیم مستی ہے سہانی مستی،
ادھ کھلے پھولوں کا جوبن نہیں دیکھا جاتا،
جس کے پاس آدھے سے تھوڑا سا زیادہ ہو......وہ اندیشہ ہے
جس کے پاس آدھے سے تھوڑا سا کم ہو۔ ہے وہی گرم عمل

زندگی، تلخی وشیرینی کا آمیزہ ہے،
جو اسے نصف ہی چکھ کر چھوڑے
اسے دانا کہیے

اس گیت میں، تاؤ کے فلسفے کا لاابالی پن، بے نیازی، اور مزاج کا استغنا بھی ہے اور کنفیوشس کی تعلیمات کا عملی پہلو بھی سمویا گیا ہے۔ گویا ان دو متضاد نظریوں کو آپس میں ملا کر ایک نیا فلسفہ، زندگی کے بارے میں ایک نیا نقطہ نظر، پیش کیا گیا ہے جو ''نصف و نصف'' کا فلسفہ ہے۔ میں جانتا ہوں یہ نظریہ، مغربی ذہنوں کو پسند نہیں آئے گا۔ کیونکہ مغرب کے لوگ عمل اور جدوجہد کے ضرورت سے زیادہ ہی قائل ہیں لیکن میرے خیال میں یہ زندگی کا بہترین فلسفہ ہے کیونکہ اس میں انسانی پہلو بہت زیادہ ہے۔ یہ مانا کہ قوموں کو غیر معمولی افراد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ قومیں چاہتی ہیں کہ ان میں بڑے بڑے سیاح، بڑے بڑے فاتح پیدا ہوں قومیں چاہتی ہیں کہ اس کے افراد، بڑے بڑے سائنس دان اور موجود ہوں۔ قومیں عظیم قسم کے لیڈر پیدا کرنے کی خواہش کرتی ہیں۔ ایسے جلیل اور عظیم فرزند چاہتی ہیں جو تاریخ کے دھارے کا رخ بدل کر رکھ دیں مگر یہ ظاہر ہے کہ مسرت سے بھرپور زندگی، درمیانے درجے کے ایک آدمی کی ہوگی۔ ایک ایسے شخص کی زندگی، جس نے معاشی اعتبار سے کچھ فارغ البالی حاصل کر لی ہو، جس نے عام انسانوں کے لیے بھی تھوڑا سا کام، تھوڑی سی خدمت کی ہو جو اپنے ہم چشموں میں تھوڑا سا ممتاز ہو مگر زیادہ ممتاز نہ ہو۔ اس نیم شہرت، نیم گمنامی، ہلکی سی فارغ البالی اور تھوڑی سی عشرت میں ہی زندگی، دکھوں سے کافی حد تک آزاد رہتی ہے مگر ان کے چنگل سے بالکل آزاد بھی نہیں ہوتی یہی ماحول ہے جس میں انسان کی روح کو بالیدگی ملتی ہے اور انسان، اپنی زندگی کو کامیاب بناتا ہے۔ زندگی ہر حال میں بسر کرنی لازم ہے اور اگر اچھی زندگی بسر کرنی ہے تو ہمیں فلسفے کو آسمانی بلندیوں سے کھینچ کر زمین پر لانا ہوگا اور اس کا طریقہ یہی ہے جو اوپر عرض ہوا ہے۔

5- زندگی کا شیدائی......یوآن منگ

پچھلی فصل میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ زندگی کے بارے میں مثبت اور منفی نظریوں کو بڑی آسانی سے آمیز کیا جا سکتا ہے اور ان کے ملانے ہی سے توازن کا فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جو عمل اور بے عملی کے درمیان اعتدال کا راستہ سمجھاتا ہے۔ اسی کے مطابق ہم نہ تو بالکل مجبور ہو کر اور اپنی مجبوری کی بنا پر دنیا سے

فرار اختیار کر سکتے ہیں، نہ دن رات سخت تن دہی اور محنت کے غلام ہو سکتے ہیں۔ گویا یہ فلسفہ ہمیں سخت محنت اور دنیا کو تج دینے کے درمیان کا راستہ بتاتا ہے اگر دنیا بھر کے فلسفوں کی چھان پھٹک کی جائے تو ہمیں توازن یا اعتدال اسی فلسفے میں نظر آئے گا اور یہی توازن اس دنیا میں انسان کی زندگی کو معقول زندگی اور مسرت بھری زندگی بنا سکتا ہے۔ ایک اور بات بھی اہم ہے۔ توازن اور اعتدال کے اسی فلسفے کے مطابق انسانی شخصیت کے متضاد عناصر ہم آہنگی اور باہم ربط پاتے ہیں اور ہم آہنگ اور متوازن شخصیت پیدا کرنا ہی دنیا جہان کے کلچر اور تعلیم کا سب سے بڑا معتقد ہے۔ زندگی کا لطف اٹھانا اور زندگی کو ایک نعمت سمجھنا ایک ہم آہنگ شخصیت، ایک متوازن شخص کے لیے ہی ممکن ہے کیونکہ جس شخص کی زندگی میں توازن اور ہم آہنگی نہ ہوگی وہ زندگی سے نہ لطف اٹھائے گا، نہ اسے اچھا سمجھ سکے گا۔

زندگی سے محبت رکھنے اور زندگی کو نعمت سمجھنے کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی خصوصیات کیا ہیں؟...... میں سمجھتا ہوں زندگی کے ایک سچے شیدائی کی کہانی آپ کو سنانے سے یہ مفہوم واضح ہو سکتا ہے۔ اس سے آپ کو پتا چل جائے گا کہ زندگی کے اس شیدائی نے اپنی زندگی کس طرح گزاری!...... یہ کہانی، چین کے سب سے بڑے شاعر یوآن منگ کی کہانی ہے۔ اس کی شخصیت چینی کلچر کی سب سے متوازن شخصیت ہے۔ میرے اس انتخاب پر چین میں کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ کیونکہ یوآن منگ چین کی ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ ہم آہنگ شخصیت، سب سے بھرپور کردار مانا جاتا ہے۔ اس نے کوئی بڑا سرکاری رتبہ حاصل نہیں کیا، اس نے زندگی میں کوئی نمایاں کارنامے سرانجام نہیں دیے، کوئی بڑی ادبی یادگار نہیں چھوڑی۔ اس کی زندگی کا سرمایہ نظموں کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے اور تین چار مضامین ہیں...... اس کے باوجود صدیوں سے اس کی شخصیت مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر صدی کے چھوٹے بڑے شاعر اور ادیب اس کی ہستی کو انسانی کردار کی عظمت کی زندہ و پائندہ مثال سمجھتے رہے ہیں۔ اس کی زندگی اسی سادگی کا اعجاز ہے جو اس کے ادبی اسلوب میں ہے۔ یہ سادگی اتنی پر عظمت، اتنی بلند ہے کہ تکلف اور تصنع کا اوج کمال اس کے سامنے بالکل ہیچ اور بے مایہ نظر آتا ہے...... اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی وہ ہمیں زندگی کے ایک سچے شیدائی کی حیثیت سے مثالی شخص نظر آتا ہے۔ کیونکہ دنیوی خواہشات کے خلاف اس کے دل میں جو نفرت کا جذبہ تھا اس کی بدولت اس نے دنیا سے مکمل فرار اختیار نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس اس نے حواس اور شعور کی زندگی کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگی

پیدا کی تھی......اس کی پیدائش سے پہلے چین کے ادب پر دو سو سال تک رومانی تحریک چھائی رہی۔ چین کی عام زندگی پر، ان دو سو برسوں میں، تاؤ فلسفہ کی بے عملی اور تساہل کی تعلیم کا غلبہ رہا۔ اس تعلیم نے جب کنفیوشس کے فلسفے کے ساتھ ناتا جوڑا تو یوآن منگ ایسی متوازن اور مکمل طور پر ہم آہن شخصیت وجود میں آسکی۔ گویا اس کی شخصیت زندگی کے نہایت عملی فلسفے اور زندگی کو ہیچ، کاردنیا کو فضول سمجھنے کے فلسفے کا سنگم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عملی فلسفے کی خود پسندی اسے چھو بھی نہیں گئی اور کاردنیا کو ہیچ سمجھنے کی تلخی اس کے پاس تک نہیں پھٹکی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی شخصیت میں انسانی دانائی اپنے عروج پر نظر آتی ہے اور رواداری اور ظرافت کا بڑا نادر امتزاج ملتا ہے۔

یوآن منگ کی ہستی میں چینی کلچر کی ایک عجیب خصوصیت نظر آتی ہے۔ یعنی وہ بیک وقت جسم اور جسمانی خواہشات کا بندہ بھی ہے اور روحانیت کی عظمت کا قائل بھی ہے۔ یہ روحانیت ایسی ہے جس میں ترک دنیا اور سخت ریاضتوں کا کوئی دخل نہیں۔ ادھر جسمانی خواہشات کی قبولیت میں شہوانیت کا شائبہ نہیں...... گویا، حواس اور روح دونوں، پوری ہم آہنگی، پورے اعتدال، پورے توازن کے ساتھ اس کی شخصیت میں سمائے تھے یعنی اصل فلسفی اور صاحب نظر وہ ہے جو عورتوں کے حسن اور ان کی دل کشی اور دلبری کا قائل ہو مگر عامیانہ اور گھٹیا نہ ہو جائے۔ جو زندگی سے محبت رکھتا ہو مگر اس لگاؤ میں ضبط سے کام لے۔ جو عمل کی متوالی دنیا کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے واقف ہو اور جانتا ہو کہ یہ سب کچھ بے حقیقت ہے۔ سب مایا کا کھیل ہے، اس لیے وہ اس سے کنارہ کشی اختیار کر لے مگر اس کا مخالف اور دشمن نہ ہو جائے۔ یوآن منگ نے روحانی ارتقا کی یہ اعلیٰ منزل حاصل کر لی تھی۔ اس لیے اس کی زندگی، روح اور نفس کی کش مکش سے بالکل منزہ تھی۔ اس کی زندگی بڑی فطری اور بڑی سادہ، بے حد برجستہ تھی۔ اسی طرح فطری اور برجستہ تھی جس طرح اس کی شاعری تھی۔

یون آن منگ کی زندگی کا خاکہ یہ ہے کہ وہ چوتھی صدی عیسوی کے آخر میں پیدا ہوا۔ اس کا دادا بہت بڑا عالم اور بڑا صاحب رتبہ شخص تھا (کچھ کرتے رہنے کی دھن میں، یہ حضرت، صبح کو اینٹوں کا ایک ڈھیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تھے، اور شام کو پھر اسی جگہ ساری اینٹیں پہنچا دیتے تھے) یوآن منگ نے اپنی نوجوانی میں معمولی سی سرکاری ملازمت کر لی تھی تاکہ بوڑھے ماں باپ کے لیے روزی کمائی جاسکے مگر بہت جلد اس نے اس نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور گاؤں چلا گیا۔ جہاں اس نے کسانوں کی طرح خود کھیتی باڑی شروع کر دی۔

اس کی وجہ سے اسے ایک مرض بھی لاحق ہو گیا۔ ایک روز اس نے اپنے عزیزوں سے کہا: ''کیا خیال ہے، میں اپنے باغ کا خرچہ پورا کرنے کے لیے بھاٹ کے طور پر گاؤں گاؤں نہ پھر لیا کروں؟'' اس پر اس کے چند دوستوں نے اسے ایک علاقے کے مجسٹریٹ کا عہدہ دلوا دیا۔ یوآن منگ شراب کا بڑا شائق تھا چنانچہ اس نے اپنے علاقے میں پہنچ کر یہ حکم دے دیا کہ ساری زمینوں میں صرف ایسے چاول بوئے جائیں جن سے شراب تیار کی جا سکے مگر اس کی بیوی نے بڑا سخت احتجاج کیا، اور اس نے اپنے حکم میں یہ ترمیم کی کہ کل رقبے کے چھٹے حصے میں عام قسم کی دھان کی کاشت بھی کر لی جائے تو مضائقہ نہیں ایک دفعہ کوئی بہت بڑا سرکاری افسر دورے پر اس علاقے میں آیا۔ یوآن منگ کے سیکرٹری نے اسے بتایا کہ آپ کو اپنے منصب کا پورا لباس پہن کر اور پیٹی فیتے سے آراستہ ہو کر اس افسر کا استقبال کرنا چاہیے یوآن منگ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''یہ مشکل ہے میں آٹھ دس من چاولوں کی خاطر، اس طرح جھکنے اور کورنش بجالانے سے رہا!'' چنانچہ اس نے پھر استعفیٰ دے دیا اور اپنی مشہور نظم ''سوئے وطن جاتا ہوں میں'' لکھی۔ اس کے بعد اس نے تمام عمر کھیتی باڑی میں گزاری۔ جب بھی اسے کوئی سرکاری عہدہ پیش کیا گیا اس نے ہمیشہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی زندگی غربت میں بسر ہوئی۔ اس کے ساتھی بھی غریب لوگ تھے۔ اپنے بیٹوں کے نام ایک خط میں اس نے افسوس ظاہر کیا کہ میرے بچوں کو ایسے برے کپڑے پہننے پڑتے ہیں اور عام مزدوروں والا کام کرنا پڑتا ہے مگر ایک دفعہ جب اس نے ایک کسان لڑکے کو اپنے لڑکوں کے پاس بھیجا کہ کنوئیں سے پانی نکالنے اور ایندھن جمع کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائے تو اپنے لڑکوں کو خاص طور پر یہ ہدایات کی: ''اس بچے کے ساتھ اچھا سلوک کرنا کیونکہ یہ بھی کسی کا بیٹا ہے!'' (یہ وہ قول ہے جسے چینی، سب سے عظیم ضرب المثل سمجھتے ہیں۔)

یون آن منگ کی واحد کمزوری یہ تھی کہ اسے شراب سے بڑی محبت تھی۔ اگرچہ اس کی زندگی گوشہ نشینی میں گزری اور مجلسوں کے ہنگاموں سے اسے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ پھر بھی جب شراب کا دور ہو تو وہ محفل میں بھی نظر آ سکتا تھا، چاہے صاحب خانہ سے اس کی ملاقات ہو یا نہ ہو اگر وہ خود صاحب خانہ ہو اور سب سے پہلے نشے اور سرور کی کیفیت اس پر چھا جائے تو وہ شرکائے محفل سے صاف صاف کہہ دیتا تھا: ''بھائیو! میں نشے میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ سو جاؤں آپ حضرات تشریف لے جائیں!''

وہ بڑا منکسر اور سادہ مزاج آدمی تھا۔ اس کا بڑا جوہر اس کی خود مختاری تھی۔ شناسائی کرنے اور مجلسی

زندگی کے بارے میں وہ سخت محتاط تھا۔ ایک مجسٹریٹ جس کا نام وانگ تھا۔ ایک بار اسے ملنا چاہتا تھا۔ وہ اس کا بڑا مداح بھی تھا۔ مگر کسی عنوان ملاقات نہیں ہوتی تھی کیونکہ یوآن منگ کا جواب یہ ہوتا تھا: ''میں مجلسی آدمی نہیں، اسی لیے میں تنہائی پسند ہوں۔ گھر میں بند رہتا ہوں کہ بیمار ہوں۔ اس لیے ملاقات مشکل ہے مگر ماشاءاللہ یہ نہ سمجھیں کہ میں اپنے آپ کو کوئی بڑا آدمی سمجھتا ہوں'' مگر مجسٹریٹ وانگ کو تو اپنے محبوب شاعر سے ملاقات کی دھن تھی۔ اس نے ایک چال چلی۔ اس نے اس کے ایک دوست سے کہا کہ یوآن منگ کو ایک دعوت میں بلائے، وہاں اتفاقی طور پر ملاقات کا بندوبست ہو جائے گا۔ یوآن منگ بصد مشکل اپنے دوست کی دعوت میں شرکت کے لیے گھر سے نکلا۔ راستے میں ایک جگہ دم لینے کے لیے رکا تو کسی نے شراب کا ایک جام پیش کیا۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ وہیں شراب پینے بیٹھ گیا۔ مجسٹریٹ وانگ پاس ہی چھپا تھا وہ فوراً نکل آیا اور دونوں کی ملاقات ہوئی۔ باتیں شروع ہوئیں تو سارا دن وہیں گزر گیا اور اس دوست کی دعوت رکھی رہ گئی ملاقات کی یہ صورت بعد میں بھی قائم رہی جب کبھی وانگ، یوآن منگ سے ملنا چاہتا تو جنگل یا جھیل کے کنارے انتظار کرتا رہتا کہ شاید وہ گھومنے نکلے تو ملاقات ہو جائے۔ سادگی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ دوستوں کی محفل شراب چھاننے کے لیے کپڑا نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے یوآن منگ کی نہایت عمدہ پگڑی سے شراب چھاننا شروع کر دی۔ جب کام ختم ہو گیا تو اس نے بڑے آرام سے پھر وہی پگڑی سر پر باندھ لی۔

لوشان کے پہاڑوں کے دامن میں شاعر یوآن منگ کا گھر تھا۔ ان پہاڑوں میں ایک خانقاہ تھی جس میں بدھ مت کی مشہور مجلس قائم تھی۔ اس کے صدر نے ہزار کوشش کی کہ کسی طرح شاعر یوآن منگ اس کنول سبھا کا رکن بن جائے چنانچہ جب اسے ایک جلسے میں بلایا گیا تو اس نے شرط پیش کی کہ میں اگر وہاں آ کر شراب پی سکوں، تو آؤں گا۔ بڑی مشکل سے بدھ پروہتوں نے اپنا مذہبی اصول توڑ کر اسے اپنے سامنے شراب نوشی کی بھی اجازت دی مگر جب مجلس کی رکنیت کا سوال آیا تو وہ فوراً دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور منہ لٹکائے چپ چاپ گھر چلا گیا۔ خیال رہے کہ یہ مجلس کوئی معمولی مجلس نہ تھی۔ ''سائی لنگ یوں'' جیسے عظیم شاعر کو زندگی بھر یہ خواہش رہی کہ کنول سبھا کی رکنیت کا اعزاز مل جائے مگر یہ اعزاز اسے حاصل نہ ہو سکا۔ یوآن منگ کے انکار کے باوجود، صدر پروہت اس کی دوستی پر فخر کرتا رہا اور اسے اپنے ہاں بلاتا رہا اور خود شراب پلاتا رہا۔

گویا، یوآن منگ نے ایک خوش باش، آزاد منش، صاف دل انسان کی زندگی بسر کی اس نے عسرت اور

تنگ دستی میں دن گزارے۔ کسان رہ کر شاعری کی۔ نہایت معمولی مگر دانشمندی سے لبریز اور مسرت سے بھرپور زندگی گزاری۔ اپنی یادگار نظموں کی ایک نہایت مختصر کتاب چھوڑی جس میں زیادہ نظمیں شراب پینے اور دیہاتی زندگی پر ہیں۔ تین چار مختصر سے ادھورے سے مقالے ہیں۔ اپنے بیٹوں کے نام ایک خط ہے اور دو تین دعائیں ہیں۔ بس یہی اس کی کل کائنات ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ یا کچھ اقوال ہیں جو سینہ بہ سینہ ہم تک آئے ہیں مگر ان نظموں اور مقالوں اور اقوال سے متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی ایک بے مثال تصویر سامنے آتی ہے۔ ایک ایسی زندگی ان سے جھلکتی ہے جو اعتدال اور خوش آہنگی کی معراج تھی۔ سادگی اور حسن فطرت کا ایسا مرقع تھا۔ جو آج تک اپنی نظیر پیدا نہیں کر سکا زندگی سے محبت اور زندگی کو نعمت سمجھنے کا یہی اعجاز ہے اور اسی جینے کے گہرے لگاؤ کو اس نے اپنی بے مثال نظم (سوئے وطن جاتا ہوں میں) میں ظاہر کیا ہے۔ جو اس نے نومبر 205ء میں، مجسٹریٹ کے عہدے سے استعفیٰ دینے پر لکھی تھی یہ نظم فو کی صنف میں لکھی گئی ہے، یہ تضاد کی صنعت کہلاتی ہے۔ کبھی اس میں قوافی آتے ہیں کبھی نہیں آتے۔ اس میں آہنگ ہی آہنگ ہوتا ہے، وزن نہیں ہوتا۔

اب سوئے وطن جاتا ہوں میں ...... میری کھیتی ہے اجاڑ، میری پھلواری بھی ہے ویراں،
کیوں نہ میں اپنے وطن جاؤں؟ میں نے خود اپنی روح کو اپنے جسم کا چاکر بنایا تھا، اب
پشیمانی ہو کیوں؟ اور ماتم ہو تو کیسا؟
ہر چہ بادا باد...... گزری بات پر پشیمانی کیا کیا فائدہ؟...... اب تو میں سفر پر رواں ہوں۔ اپنی
منزل کی طرف رواں ہوں...... سیدھے راستے سے میں زیادہ نہیں بھٹکا...... اور اگر کل میں
غلط راستے پر تھا بھی تو میں جانتا ہوں کہ آج میں بالکل ٹھیک راستے پر چل رہا ہوں......
کشتی بڑی نرم روی سے پانی پر بہتی جارہی ہے۔ اور میرے دامنوں کو ہوا بڑی سبک رفتاری
سے تھپکاتی ہے۔ میں ایک مسافر سے راستہ پوچھتا ہوں۔ اور پریشان بھی ہوں کہ صبح اتنی
دھندلی کیوں ہے؟ اور پھر مجھے اپنے گھر کی جانی پہچانی چھت دور سے نظر آئے گی۔ میرے
قدم خوشی سے اور بھی تیز ہو جائیں گے۔ پھر کے دروازے میرے ملازمین اور میرے بچے
میرے انتظار میں چشم براہ ہوں گے۔

شاید اب تک میرے باغوں میں گھاس پھوس اگ آئی ہوگی۔ راستے کائی میں چھپ گئے ہوں گے اور کچھ ہو نہ ہو گل داؤدی تو ضرور کھلے ہوں گے اور میں اپنے سب سے چھوٹے بچے کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں داخل ہوں گا۔ جہاں سامنے میز پر شراب کا لبریز جام رکھا ہوگا۔

جام ہاتھ میں لے کر میں دو گھونٹ پیتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ سامنے باغ میں پیڑوں کی ٹہنیاں اسی حسن و خوبی سے جھکی ہوئی ہیں جس طرح کبھی ہوا کرتی تھیں اور میں جنوبی دریچے میں جا کھڑا ہوتا ہوں۔ دل میں اطمینان موجیں مار رہا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرا چھوٹا سا گھر بڑا آرام دہ اور عمدہ ہے۔

اپنے باغ میں روز سیر کرتا ہوں۔ باغ جانا پہچانا معلوم ہوتا ہے۔ میری دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ کیا ہوا، جو میرا بند دروازہ کوئی کھٹکھٹانے والا نہیں آتا؟ میں ہاتھ میں چھڑی لئے باغ میں چہل قدمی کرتا ہوں اور نیلے آسمان کو کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتا ہوں۔

نیلے آسمان پر بادل اپنی پہاڑی پناہ گاہوں سے نکل نکل کر بے مقصد پھرتے ہیں۔ اور پرندے، پرواز سے تھک کر آشیانوں کو پلٹنے کی سوچتے ہیں۔ شام کے سائے بڑھتے آتے ہیں۔ میں گھر لوٹنے کی سوچتا ہوں۔ پھر چیڑوں اور دیوداروں کی متوالی خوشبوؤں میں کچھ اور گھومتا ہوں......

''ہاں! میں سوئے وطن جاتا ہوں۔ آج سے میں تنہا زندگی بسر کرنا سیکھوں گا۔ یہ دنیا اور میں، ہمارا آپس میں نباہ نہیں ہوتا۔ پھر کیوں مارا مارا پھروں؟ کیوں اس چیز کی تلاش میں سرگرداں رہوں جو ملے گی نہیں؟

ہاں، میں اپنے عزیزوں کی بات چیت سے دل بہلاؤں گا اور وقت گزارنے کے لیے کتابیں اور موسیقی کیا کم ہیں؟ ...... اور میرے ساتھی کسان میرے پاس آئیں گے اور بتائیں گے کہ اب تو بہار کا موسم آ گیا، مغربی کھیتوں کی بوائی شروع کرنی چاہیے۔

کچھ لوگ، سفر کے لیے عمدہ بگھیاں لیتے ہیں، کچھ کشتیوں میں جاتے ہیں۔ ہمارا رنگ یہی ہے۔ ہم انسان کبھی تو گہرے، انجانے پانیوں کی تھاہ لگاتے ہیں اور کبھی دشوار گزار گھاٹیوں

پر چڑھتے ہیں۔

یہاں سرسبز پیڑوں کے جھنڈ ہیں جو شادابی اور طراوت میں جھومتے ہیں اور صاف چشمے، ڈھلانوں سے پھوٹتے ہیں...... میں دیکھتا ہوں کہ اس دنیا میں موسموں کی رعایت سے کیا کیا چیزیں پھلتی پھولتی ہیں، پروان چڑھتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اسی طرح میری زندگی کا بھی ایک سفر مقرر کیا جا چکا ہے۔

اب بہت ہو چکی!...... یہ زندگی کب تک، یہ فانی جسم کہاں تک ساتھ دے گا؟ زندگی جس طرح ہے، اور زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے، اسی طرح ہو گا۔ پھر ایک ہرکارے کی طرح یہ دوڑ دھوپ کیسی؟

میری آرزو یہ نہیں کہ مجھے حکومت اور دولت ملے۔ باقی رہی خدائی تو وہ میرے بس کی نہیں۔ اسی لیے میں ایک دن چپ چاپ گھر سے نکل جاؤں گا۔ باغ کو جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کروں گا، اپنے کھیت میں ہل چلاؤں گا۔

یا چشمے کے کنارے بیٹھ کر نظم لکھوں گا۔ یا کہیں سفر پر نکل کھڑا ہوں گا۔ بس میں اسی طرح جینا چاہتا ہوں، اور میری آرزو ہے کہ اسی قناعت اور گوشہ نشینی میں مجھے موت کا پیغام آئے اور میں ہنسی خوشی اپنی جان موت کے فرشتے کے حوالے کر دوں۔

شاید اس سے آپ یہ سمجھیں کہ شاعر یو آن منگ کی ذہنیت فراری تھی، وہ دنیا سے بھاگنا چاہتا تھا۔ یہ بات نہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ سیاسیات سے بھاگتا تھا، زندگی سے نہیں اگر وہ منطقی ہوتا تو وہ زندگی سے مکمل طور پر بھاگ جاتا اور کسی خانقاہ میں جا کر بودھ بھکشو بن جاتا مگر وہ زندگی کا بڑا شیدائی تھا۔ وہ بھلا زندگی سے پوری طرح راہ فرار کیسے اختیار کرتا؟ اس کے بیوی بچے اس کے لیے ایک زندہ حقیقت تھے۔ اسے اپنا باغ عزیز تھا۔ باغ کی بیلیں اور چیڑ کے درخت اس کے لیے بہت زیادہ دل کشی رکھتے تھے۔ وہ منطقی آدمی نہ سہی، معقول آدمی ضرور تھا۔ اس لیے اس نے یہ سب کچھ تج نہیں دیا۔ بلکہ وہ اپنے بیوی بچوں، اپنے باغ، اپنے محبوب پیڑوں کے پاس رہا۔ زندگی کے لیے یہی محبت تھی جو اس کے دل میں موجزن تھی۔ زندگی کے بارے میں اس کی خیالات معقول اور اس کا رویہ عملی تھا۔ اسی لیے اس کی شخصیت زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ ہوئی اور یہ اس

کے مہذب ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔زندگی کے ساتھ اس ہم آہنگی کی بدولت چینی زبان کی عظیم ترین شاعری وجود میں آئی۔وہ جانتا ہے کہ ہم اس خاک دان سے ہیں اور اسی کے لیے ہیں۔اس لیے اس خاکدان سے بھاگنا کیا معنی؟اسی لیے اس نے کہا تھا:''میں ایک چمکیلی صبح کی چھڑی ہاتھ میں لے کر باغ میں جانکلوں گا اور جی چاہا تو چھڑی زمین میں گاڑ کر، باغ کو جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کرنا شروع کر دوں گا یا زمین میں ہل چلانے لگوں گا!''اسی لیے یوآن منگ نوکری چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں اور اپنے کھیتوں کو واپس آ گیا ...... یہ ہم آہنگی اور توازن تھا بغاوت نہیں تھی۔



چھٹا باب

زندگی کی نعمتیں

1- خوش رہنے کا مسئلہ

زندگی سے لطف اٹھانے میں بہت سی باتیں شامل ہیں، اپنے آپ سے خوش رہنا، گھریلو زندگی سے خوش رہنا، درختوں اور پھولوں، بادلوں اور ندیوں سے حظ اٹھانا، گرتے آبشاروں کا لطف لینا، غرض قدرت کے ہزار ہا مظاہر سے مسرت حاصل کرنا، اسی میں شامل ہے۔ پھر شعر اور آرٹ، غور و فکر، دوستی، گفتگو اور مطالعے سے لطف اٹھانا بھی اسی کا حصہ ہیں۔ کیونکہ یہ سب باتیں ہماری روح کی ترجمانی کرتی ہیں۔ گویا زندگی کا لطف کچھ تو ایسی چیزوں میں ہے جو ظاہر ہیں، مثلاً کھانے پینے کا لطف اور دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کی خوشی وغیرہ......اور کچھ ایسی باتیں ہیں جو اتنی عیاں نہیں۔ ان میں شعر وسخن اور فنون لطیفہ اور سوچنے کے مزے شامل ہیں۔ زندگی کے ان مزوں کو میں گھڑے گھڑائے دو حصوں میں نہیں بانٹ سکا۔ میں کیسے کہوں کہ زندگی کے کچھ مزے مادی ہیں اور کچھ ذہنی یا روحانی ہیں۔ اول تو یہ کہ میں اس کی تقسیم کا قائل نہیں کیونکہ یہ تقسیم میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ مثلاً ایک پکنک کے موقع پر میں دیکھتا ہوں کہ عورتیں اور بچے، جوان اور بوڑھے سبھی جمع ہیں اور ہنس بول کر وقت گزار رہے ہیں۔ مجھے کیسے معلوم ہوگا کہ ان کی خوشی کا کون سا حصہ مادی ہے اور کون سا ذہنی اور روحانی ہے؟ اس پکنک میں ہر شخص اپنے حال میں خوش نظر آتا ہے۔ ایک بچہ نرم گھاس پر دوڑتا پھرتا ہے۔ دوسرا بچہ پھول چن رہا ہے۔ ماں، توس کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لیے ہے۔ چچا، ایک بڑا سا سرخ سیب بڑے اطمینان سے کھا رہا ہے۔ باپ، گھاس پر دراز نیلے آسمان پر بادلوں کے گھومتے ٹکڑوں کو تک رہا ہے۔ دادا، بڑے اطمینان سے پائپ پی رہا ہے۔ ایک طرف کوئی گراموفون بجا رہا ہے۔ ریکارڈ کی موسیقی، دریا کی لہروں کے شور کے ساتھ کانوں میں آ رہی ہے۔ ان خوشیوں، ان مزوں میں کس کو مادی کہا جائے؟ ان میں کون سی خوشی، کون سا لطف روحانی اور ذہنی کہلائے گا؟ سیب یا توس کھانے سے جو مزہ ملتا ہے اسے آس پاس

کے منظر کے لطف سے کس طرح الگ کیا جائے گا؟ (اور منظر کا یہی لطف، یہی لطیف احساس وہ چیز ہے جسے ہم شاعری کہتے ہیں) کیا موسیقی سے لطف اٹھانے کو (اور یہ آرٹ کہلاتا ہے!) ہم پائپ پینے کے لطف سے اعلیٰ قسم کی خوشی قرار دیں گے۔ کیونکہ پائپ پینا اور پائپ پینے سے لطف اٹھانا، ایک مادی خوشی ہے؟...... اسی لیے، مادی خوشیوں اور روحانی لطف کی یہ تمیز، میرے نزدیک بے معنی اور مصنوعی ہے۔ میں سمجھتا ہوں روحانی اور مادی خوشیوں کا یہ امتیاز ایک جھوٹے فلسفے کی پیداوار ہے جس کے مطابق روح کو جسم سے الگ ایک چیز قرار دیا جاتا ہے۔ یہ تقسیم، انسان کی حقیقی مسرتوں کے گہرے اور سچے مطالعے پر مبنی نہیں ہے۔

ممکن ہے میرا نظریہ ٹھیک نہ ہو...... اور پھر آپ یہ پوچھ بیٹھیں کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے؟...... میں زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہوں کہ زندگی سے صحیح طور پر لطف اٹھایا جائے۔ اس کی وجہ نہ پوچھیے گا۔ یہ مقصد اس لیے زندگی کا مقصد اور جینے کا مدعا ہے کہ بس ہے!...... ''مقصد'' اور ''مدعا'' کے لفظ بھی شاید ٹھیک نہیں ہیں، کیونکہ ''مقصد'' ایک شعوری چیز ہوتی ہے۔ حالانکہ میرا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے سلسلے میں یہ ہمارا، آپ کا ''قدرتی رویہ'' ہونا چاہیے کہ زندگی سے لطف اٹھایا جائے۔ ''مقصد'' کا لفظ بڑی منصوبہ بندی، اور بڑی جدوجہد ظاہر کرتا ہے...... اور اس دنیا میں جو شخص پیدا ہوتا ہے اس کے سامنے یہ سوال نہیں ہوتا کہ اس کی زندگی کا ''مقصد'' کیا ہوتا کہ وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشش شروع کر دے۔ اس کے سامنے تو یہ سوال ہوتا ہے کہ اسے پچاس ساٹھ برس کی جو زندگی ملی ہے اس میں وہ کیا کرے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی ایسی ترتیب و تہذیب کرے کہ اسے زندگی میں زیادہ سے زیادہ خوشیاں نصیب ہو سکیں۔ یہ اپنی جگہ ایک عملی مسئلہ ہے۔ یہ اس طرح کا کوئی مابعدالطبیعیاتی سوال نہیں کہ اس کائنات میں انسانی زندگی کا روحانی مقصد کیا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ جو فلسفی، زندگی کے مقصد کا مسئلہ حل کرنے بیٹھتے ہیں وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ زندگی کا واقعی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہونا چاہیے۔ مغربی فلسفیوں نے اس سوال کو دنیا بھر کے ذہن پر سوار کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ محض دینیات ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم زندگی کے لیے ایک ''مقصد'' اور ''لائحہ عمل'' فرض کر لیتے ہیں۔ پھر ہم ہمیشہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور آپس میں الجھتے رہتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ لیکن اسے سمجھنے سے عاری رہتے ہیں۔ اسی سے پتا چلتا ہے کہ یہ سوال فضول ہے اور

بالکل بے مصرف بھی۔ اگر زندگی کا کوئی مقصد ہوتا تو اسے سمجھنا، اس کا پتا چلانا اور اس کا یقین کرنا، اتنا مشکل نہ ہوتا۔ یہ مقصد اپنا مبہم اور غیر یقینی ہرگز نہ ہوتا۔

یہ سوال دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے...... کیا خدا نے کوئی روحانی مقصد، انسانیت کے لیے قرار دیا ہے؟ یا کیا انسانیت کو خود اپنے لیے کوئی مقصد معین کرنا چاہیے؟ جہاں تک پہلے حصے کا تعلق ہے میں کچھ عرض نہیں کروں گا کیونکہ اول تو یہ سوال اپنی نوعیت کے لحاظ سے ٹھیک نہیں، اور اس معاملے میں ہم جو کچھ خود سوچتے ہیں۔ اسے خدا کے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسانی ذہن کے لیے یہ ممکن نہیں کہ خدائی ذہن کو سمجھ سکے۔ اس قسم کی دلیل بازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم خدا کو بھی اتنا تنگ نظر بنا دکھاتے ہیں جتنے ہم خود ہیں۔ ہم یہ قرار دے لیتے ہیں کہ خدا نے صرف ہمارے لیے فلاں مقصد قرار دیا ہے۔ اس قسم کا مقصد بھلا ہمارا خدا، باقی دنیا کے لیے کیوں قرار دے گا کیونکہ وہ تو ہمارا خدا ہے۔

اب اس سوال کے دوسرے حصے کو لیجیے...... سوال کی صورت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے، یہ نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے! اس سوال کے قالب میں ہر شخص اپنے نظریے اور اپنی قدریں ڈھالتا رہتا ہے۔ چونکہ ہماری قدریں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اس لیے اس سوال پر لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں...... میں اس سوال کا صرف عملی پہلو پیش کرتا ہوں۔ اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ ضروری نہیں کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد اور مفہوم ہو۔ امریکی شاعر والٹ وٹمین کہتا ہے کہ ''جو کچھ میں ہوں اور جس طرح ہوں، ٹھیک ہوں۔'' میں عرض کروں گا کہ یہی کافی ہے کہ میں زندہ ہوں اور غالباً بیس تیس برس اور جیوں گا۔ یہی کافی ہے کہ انسانی زندگی ہمارے سامنے موجود ہے اگر پیش نظر یہ حقیقت ہو تو انسانی زندگی کے مقصد کا سارا سوال بڑا سادہ بن جاتا ہے اور اس کا ایک ہی جواب سامنے آتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ زندگی سے پوری طرح لطف اٹھایا جائے! اور کوئی جواب ممکن ہی نہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ انسان کی خوشی اور غمی کے سوال پر غیر مسیحی مفکرین تو صدیوں سوچتے رہے ہیں مگر مسیحی مفکرین نے اس سوال سے ہمیشہ پہلو تہی کی ہے۔ مسیحی مفکرین یعنی دینیات کے عالموں کو انسانی مسرت کے سوال سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ وہ انسان کی ''نجات'' کے بارے میں سوچا کیے ہیں اور ''نجات'' میرے نزدیک بڑا المناک لفظ ہے۔ گویا اس دنیا سے صحیح سالم اٹھنے کا سوال تو ان کے نزدیک اہم ہے، یہ سوال ہرگز

اہم نہیں کہ اس دنیا میں زندہ کیسے رہا جائے۔ مگر ''نجات'' کی فکر اسے ہونی چاہیے جو یہ جانتا ہو کہ تباہی اور بربادی اس کا مقدر ہو چکی ہے۔ چنانچہ دینیات کے یہ ماہر، انسان کے مستقبل کے بارے میں صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ نجات پانے کی صورت میں وہ جنت میں جائے گا۔ یہ جنت کیسی ہوگی؟ کوئی واضح طور پر نہیں بتا سکا۔ اس جنت میں انسان کیا کرے گا؟ وہاں اس کا جی کیسے بہلے گا اور وہ کیسے خوش رہ سکے گا؟ اس کے بارے میں اور بھی مبہم اور گول باتیں ہیں کہ دن رات ہر جنتی حمد گایا کرے گا اور اسے پہننے کو سفید بہشتی حلے ملیں گے۔ عیسائیوں کے برعکس مسلمانوں میں کم سے کم جنت کا ایک واضح تصور ضرور ملتا ہے کہ اس میں شراب طہور ہوگی، میوے ہوں گے، اور حوریں ہوں گی۔ یہ باتیں، ہم عام آدمی آسانی سے سمجھ بھی سکتے ہیں۔ گویا جب تک جنت اور مرنے کے بعد کی زندگی کی تصویر، بڑی واضح طور پر پیش نہ کی جائے، ہمیں وہاں جانے کی کوشش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور نہ یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس دنیا کی اچھی بھلی زندگی کو چھوڑ کر، ایک نامعلوم جنت میں جانے کی کوشش کرتے پھریں۔ کسی نے کہا ہے کہ '' آج ایک انڈا مل جانا غنیمت ہے، کل کی مرغی کا انتظار کون کرے گا!'' پھر جنت کی زندگی کے بارے میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں: کیا ہمیں جنت میں جدوجہد اور کوشش کی زندگی بسر کرنی پڑے گی؟ مگر ہم تو پہلے ہی کامل انسان بن چکے ہوں گے، پھر جدوجہد کر کے ترقی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا؟ تو پھر کیا جنت کی زندگی محض بے کاری اور مکمل فارغ البالی کی زندگی ہے؟ اگر واقعی یہ بات ہے تو پھر ہمیں اپنی ابدی زندگی کے لیے یہیں اسی زندگی میں بے کار رہنا اور کاہل بننا بھی سیکھنا چاہیے؟

کائنات کے بارے میں اگر کچھ سوچنا ہی مقصود ہے تو آیئے، ہم اپنے آپ کو بھول جائیں اور کائنات کو انسانی زندگی تک محدود نہ سمجھیں، کائنات کے تصور میں ذرا وسعت پیدا کریں اور کائنات میں خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز کے مقصد پر غور کریں۔ ان میں پہاڑ، پتھر، درخت اور جانور، سبھی آجائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں ساری مخلوقات میں ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی مقام مخصوص ہے۔ اس مقام کے تعین کے بعد ہم ساری تخلیق کا مدعا سمجھ سکتے ہیں اور اس کائنات میں اپنے مقام کو بھی جان سکتے ہیں۔ فطرت کے بارے میں یہ نقطہ نظر اور فطرت میں اپنے مقام کا تعین دونوں فطرت کے مطابق ہونے چاہئیں۔ کیونکہ جیتے جی ہم اس فطرت کا لازمی حصہ ہوتے ہیں اور مر کر ہم اس کی طرف لوٹتے ہیں۔ فطرت کے بارے میں نقطہ نظر قائم کرنے میں فلکیات،

طبقات الارض کا علم، حیاتیات اور تاریخ ہماری کافی مدد کرتی ہیں۔ ہمیں صرف یہ احتیاط کرنی چاہیے کہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ نہ ماریں اور غلط سلط نتیجے نہ نکالیں اگر تخلیق کائنات کے اس اندازے میں انسان کا مقام کچھ کم نظر آتا ہو تو انسانی فکر کی بات نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کائنات میں اس کا کوئی اپنا مقام تو ہے اور اگر وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی سے زندگی بسر کرے گا تو وہ انسانی زندگی کے بارے میں بھی ایک قابل عمل اور قابل قبول نظریہ قائم کر سکے گا۔

2- انسانی مسرت

انسان کی ساری خوشیاں جسمانی ہیں۔ یہ بات بالکل سائنسی ہے۔ وضاحت کے لیے میں یہ عرض کروں گا کہ انسانی مسرتیں انسان کے حواس سے تعلق رکھتی ہیں۔ ممکن ہے روحانیت کے علم بردار میرا مطلب غلط سمجھیں کیونکہ مادہ پرست اور روحانیت کے علم بردار ہمیشہ سے ایک دوسرے کی بات کا غلط مطلب سمجھتے رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں کے الفاظ و کنایات میں بڑا فرق ہے اگر وہ ایک ہی ذخیرہ الفاظ سے کام لیں تو بھی مطالب مختلف ہوتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم روحانیت کے علم برادروں کی باتوں میں آجائیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ اصلی خوشی، روحانی خوشی کا نام ہے۔ میں یہی کہوں گا کہ انسانی خوشی کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان کا ہاضمہ ٹھیک کام کرتا رہے۔ اس موقع پر میں اپنی سند میں ایک مشہور امریکی کالج کے فاضل پریذیڈنٹ کا قول پیش کرتا ہوں۔ وہ نئے طلبہ کی ہر جماعت سے کہا کرتے تھے: ''آپ لوگوں کو دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ ایک تو آپ کو انجیل کی باقاعدہ تلاوت کرنی چاہیے اور دوسرے اپنا پیٹ صاف رکھنا چاہیے......'' یہ قول بڑی دانشمندی پر مبنی ہے۔ اس میں بڑا تجربہ اور بڑی زندہ دلی جھلکتی ہے۔ اگر پیٹ ٹھیک کام کرتا رہے تو آدمی خوش رہتا ہے اور اگر ہاضمے کا فعل درست نہ رہے تو زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ بس سو باتوں کی ایک بات یہی ہے۔

آیئے، خالی باتوں اور فطری بحث کو چھوڑ کر، حقائق سے کام لیں، اور یہ جائزہ لیں کہ ہم اپنی زندگی کے کن لمحات کو پر مسرت لمحات کہتے ہیں...... ہماری دنیا ایسی ہے کہ خوشی بڑی حد تک ایک منفی چیز ہے۔ یعنی اگر غم نہ ہو تو سمجھیے خوش ہیں۔ پشیمانی یا خلش نہ ہو تو سمجھیے خوش ہیں۔ کوئی جسمانی بیماری نہ ہو تو سمجھیے کہ خوش ہیں مگر مسرت منفی کے بجائے ٹھوس اور مثبت چیز بھی ہو سکتی ہے۔ مسرت کی اس صورت کو ہم عیش کا نام دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر میرے نزدیک، زندگی کے پُرمسرت لمحات یہ ہیں: میں صبح کو رات بھر کی گہری اور صحت مند نیند کے بعد اٹھ سکوں۔ صبح کی ہلکی، عطر بیز ہوا سونگھوں، اس ہوا سے پھیپھڑوں میں توانائی آتی محسوس ہو اور جی چاہے کہ خوب سینہ پھلا کر، لمبے لمبے سانس لوں۔ ان لمبے سانسوں سے سینے کے رگ پٹھوں اور کھال میں عجیب طرح کی سنسنی محسوس ہوتی ہے اور کام کرنے کو جی چاہتا ہے یا خوشی کے لمحات وہ ہیں جب میں اپنی ٹانگیں پھیلا کر سامنے کی کرسی پر رکھ لیتا ہوں اور اپنا پائپ عمدہ تمباکو سے بھر کر پینا شروع کر دیتا ہوں اور تمباکو آہستہ آہستہ جلتا جاتا ہے۔ وہ لمحہ بھی خوشی کا لمحہ ہے کہ میں گرما کی سخت دوپہر میں سفر کر رہا ہوں اور حلق میں پیاس کے مارے کانٹے پڑ گئے ہیں، یکا یک میں ٹھنڈے پانی کا ایک چشمہ دیکھتا ہوں، اس کی لہروں کا شور میرے کانوں میں رس گھولتا ہے، قریب پہنچ کر میں، بوٹ، جرابیں اتار کر، اس پانی میں اپنے پاؤں لٹکا دیتا ہوں میرے لیے خوشی کا لمحہ وہ بھی ہے۔ جب میں رات کا کھانا کھا کر آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہوں۔ کوئی ناپسندیدہ شخص میرے آس پاس نہیں ہوتا۔ ادھر ادھر کی گپ شپ شروع ہوتی ہے اور باتیں، نامعلوم منزل کی طرف ہی چلی جاتی ہیں میرے لیے وہ لمحات بھی مسرت کے لمحات ہوتے ہیں۔ جب میں، گرما کی سہ پہر کو کالے کالے بادل افق پر امنڈتے دیکھتا ہوں اور مجھے پتا ہوتا ہے کہ بس اب کچھ دیر میں چھاجوں پانی برسنے لگے گا۔ میں فوراً گھر سے نکل کر کھڑا ہوتا ہوں اور گھر سے دور جا کر کھیتوں میں بارش کا استقبال کرتا ہوں۔ پھر میں خوب بھیگ کر گھر لوٹتا ہوں، اور گھر والوں سے کہتا ہوں، کیا کروں چھتری لینی بھول گیا تھا، راستے میں بارش نے آلیا۔

میرے لیے یہ فیصلہ کرنا انتہائی دشوار ہے کہ مجھے اپنے بچوں سے جسمانی طور پر محبت ہے یا روحانی طور پر۔ یہ محبت ان کی ننھی ننھی آوازوں، بھولی بھالی باتوں کی بدولت ہے یا ان کے نازک اور صحت مند جسموں کی بدولت میرے دل میں موجزن ہے۔ میں اس طرح یہ امتیاز بھی کر سکا کہ ذہنی مسرتیں کون سی ہیں اور جسمانی کون سی۔ فرض کیجیے آپ کسی حسین لڑکی کو چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس کی خوبیوں، اس کے محاسن کا تجزیہ کر سکیں گے؟ کیا آپ کہہ سکیں گے کہ آپ کو اس کے تبسم کی ادا پسند ہے یا آپ اس کی ہنسی پر مرتے ہیں، یا اس کے سر کو جھٹکنے کی ادا آپ کے دل میں کھب گئی ہے؟ یا یہ کہ دنیا کی ہر چیز کے بارے میں وہ لڑکی ایک خاص نقطہ نظر رکھتی ہے جو آپ کو دل سے پسند ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ تجزیہ اور امتیاز ناممکن ہے۔ ایک مثال اور لیجیے۔ ہر لڑکی اچھے اچھے کپڑے پہن کر خوش ہوتی ہے۔ ہونٹوں اور گالوں پر سرخی لگا کر اسے گونہ اطمینان ہوتا ہے اور اس احساس

سے اس کے دل میں اعتماد بھری مسرت جاگتی ہے کہ میں اچھے لباس میں ملبوس ہوں۔ یہ خوشی اور یہ اطمینان ایک لڑکی کے لیے بڑی قطعی اور حقیقی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالانکہ اس مسرت کے بارے میں روحانیت پرستوں کو کچھ پتا نہیں ہوتا۔ فانی انسانوں کا وجود گوشت پوست سے ہے اس لیے جسم اور روح کے درمیان امتیاز کا پردہ بڑا ہلکا اور لطیف ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ روح کی دنیا لطیف جذبات اور حسن کے احساس کی دنیا ہے مگر اس دنیا کے دروازے ہمارے حواس ہیں۔ ہم اپنے حواس کے ذریعے سے ہی روح کی دنیا تک پہنچ سکتے ہیں ہماری زندگی میں چھونے، سننے اور دیکھنے کے حواس کی اپنی مستقل جگہ ہے۔ حواس اور اخلاق یا بداخلاقی میں باہم کوئی رشتہ نہیں۔ جب ہمارے حواس کند ہو جاتے ہیں، یا ہم پوری طرح ان سے کام لینا چھوڑ دیتے ہیں تو زندگی کے مزے اٹھانے کی صلاحیت بھی ہم میں کم ہو جاتی ہے۔

ذرا مشرق و مغرب کے ان لوگوں پر نظر ڈالیے جو زندگی کے شیدائی تھے۔ اور جنھوں نے زندگی کے مزے اٹھائے ہیں۔ ان کی تحریروں میں وہ لمحات بھی موجود ہیں۔ جو ان کی زندگی کے پرمسرت لمحات تھے۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ مسرت کے یہ لمحات، سننے، سونگھنے اور دیکھنے کے حواس سے گہرا تعلق رکھتے ہیں...... امریکی ناول نگار، تھوریو کی ایک تحریر سب سے پہلے پیش کرتا ہوں۔ مسرت کا یہ لمحہ، جھینگروں اور پپیہوں کے نغمے سن کر تھوریو کی زندگی میں آیا تھا۔

> ''پہلے جھینگروں کی ہلکی سیٹیاں سنئے جو چٹانوں میں سے آ رہی ہیں۔ مجھے اکیلے جھینگر کا نغمہ زیادہ پسند ہے۔ اس سے کچھ ایسا پتا چلتا ہے کہ بہت وقت گزر چکا ہے، اس سے کچھ ایسا پتا چلتا ہے کہ وقت ابدیت سے ہم کنار ہو گیا ہے۔ اس سے پختگی ٹپکتی ہے۔ وہ پختگی جو دانش سے پیدا ہوتی ہے، جو دنیاوی مکروہات سے بلند ہے۔ جو زمانے کے بدلنے سے ماورا ہے۔ اس نغمے میں وہی پختگی ہے جو خزاں میں ہوتی ہے کیونکہ خزاں میں نہ تو بہار کی چلبلاہٹ ہوتی ہے نہ گرمیوں کی گرم بازاری...... جھینگروں کا نغمہ، پرندوں سے گویا یہ کہتا ہے: ''تم یوں بولتے ہو جیسے جذباتی بچے بولتے ہیں۔ قدرت تمہارے نغموں کے ذریعے سے اپنا اظہار کرتی ہے۔ مگر ہم جھینگروں کا علم اور ہماری دانش پختہ تر ہے۔ موسم کا تلون ہمارے لیے کوئی چیز نہیں کیونکہ موسموں کو ہم اپنی لوریوں سے سلاتے ہیں......'' اسی لیے یہ

جھینگر، سدا گھاس کی جڑوں میں چھپے چھپے اپنا نغمہ الاپتے رہتے ہیں۔ جہاں وہ ہیں، جنت وہیں ہے۔ گرمیوں، سردیوں، کیا مئی میں کیا اکتوبر نومبر میں، ان کی نغمہ سرائی کا یہی عالم رہتا ہے۔ ان کا نغمہ گھمبیر ہے۔ اس میں نثر کی سی پختہ مقالی اور سلامت روی ہے۔ یہ جھینگر صرف شبنم کا بادہ پی کر مدہوش ہوتے ہیں۔ محض موسم کی امنگ انھیں گانے پر مجبور نہیں کرتی نہ موسم کا تقاضا ان کے دلوں میں محبت کا جوش پیدا کرتا ہے۔ بلکہ ان کا نغمہ تو بس خدائے برتر کی حمد ہے، اس کا شکرانہ ہے۔ وہ موسم کے انقلاب سے الگ رہتے ہیں۔ ان کا نغمہ اتنا ہی ابدی ہے اور تبدیلیوں سے اتنا ہی بلند ہے جتنی سچائی اور ازلی حقیقت ہر تبدیلی سے بلند ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان صرف گیان کے لمحوں میں ہی، جھینگروں کا نغمہ سنتا ہے۔''

یہ کانوں میں رس گھلنے کی جھلک تھی۔ اب ذرا سونگھنے اور دیکھنے کے حواس کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔ یہ امریکہ کا مشہور آزادہ رو شاعر والٹ وٹمین ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو کہ شامہ اور دید نے روحانی لطافتوں میں کیا حصہ لیا ہے:

''صبح کو برفباری کا طوفان آیا۔ یہ طوفان دن بھر جاری رہا مگر میں دو گھنٹے انہی راہوں اور انہی درختوں کے جھنڈ میں حسب سابق گھومتا رہا۔ اور برف گرتی رہی۔ برفباری کے وقت ہوا بند تھی مگر چیڑ کے بلند جھنڈ میں ہلکی سریلی گنگناہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ یہ نغمہ بار سرگوشیاں بڑی واضح اور عجیب سی تھیں، جیسے چھوٹے چھوٹے آبشار کبھی گرنے لگیں کبھی دم بخود ہو کر رک جائیں۔ سارے حواس پر آسودگی چھائی ہوئی تھی۔ دید، شامہ، سامعہ لطافتوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ برف کے گالے جہاں گرتے تھے، وہیں سو جاتے تھے۔ کبھی سدا بہار جھاڑیوں پر اور کبھی گھاس پر ان گنت پتے اور شاخیں سفید برف کے مرغولوں سے لد گئی تھیں، جن کی جدولوں پر زمردیں حاشیے تھے۔ سنہری چھتریوں والے سیدھے اونچے چیڑ کے درخت ستونوں کی مانند کھڑے تھے۔ ہوا میں برف کی باس کے ساتھ چیڑوں اور دیودار کی خوشبو رچی ہوئی تھی، (دنیا کی ہر چیز کی باس (خوشبو) اپنی ہے، برف کی بھی اپنی باس ہوتی ہے، اگر آپ اسے پہچان سکیں۔ ہر جگہ کی خوشبو اپنی ہوتی ہے۔ دو گھڑیوں کی خوشبو بھی

مختلف ہوگی، دو پہر کی باس، آدھی رات کی باس سے مختلف ہوگی، سرما کی خوشبو، گرما کی خوشبو سے الگ ہوگی۔ آندھیوں کی ایک گھڑی کی بو باس ایک سنسان لمحے کی بو باس سے بہت زیادہ مختلف ہوگی۔)

ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو سرما اور گرما، دوپہر اور آدھی رات، اور پرشور اور سنسان لمحوں کی بو باس میں یہ امتیاز کر پائیں گے؟ یہی وجہ ہے کہ انسان کھلی فضا کی بہ نسبت شہروں میں زیادہ ناخوش رہتا ہے۔ کیونکہ شہروں میں دید و شامہ کے یہ امتیازات اتنے واضح نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کا امتیاز شہر کے سنگین در و دیوار اور سیمنٹ کی سڑکوں کی بدولت بڑی حد تک مٹ جاتا ہے۔

خوشی کے لمحات کی خصوصیات کے سلسلے میں، چینی اور امریکی ذہنوں میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ میں آپ کے سامنے پہلے تو امریکی شاعر والٹ وٹمین سے ایک اور اقتباس پیش کرتا ہوں، اس کے بعد میں ایک چینی دانشور کے بتائے ہوئے خوشی کے 33 لمحات بیان کروں گا...... ان سے آپ کو امریکی اور چینی طبائع کی یکسانیت کا اندازہ ہوگا۔ پہلے والٹ وٹمین کا ارشاد ملاحظہ ہو:

"مطلع صاف ہے اور موسم بڑا کھرا، بڑا کرارا ہے۔ آکسیجن سے لدی ہوئی خشک اور نرم رو ہوائیں چل رہی ہیں...... میرے گرد قدرت کا اعجاز پھیلا ہوا ہے۔ یہ اعجاز میرے رگ و پے میں رچا جا رہا ہے، مجھ پر چھایا جا رہا ہے۔ یہ درختوں اور پانی، گھاس اور سورج کی روشنی اور ہلکی سی کہر کا اعجاز ہے۔ مگر آج میں دن بھر زیادہ تر قدرت کے سب سے بڑے اعجاز، آسمان کو تکتا رہا ہوں۔ آسمان کی رنگت بڑی ہلکی، بڑی شفاف نیلاہٹ لیے ہے جو صرف خزاں میں نظر آتی ہے۔ کہیں کہیں ابر کے چھوٹے بڑے سفید ٹکڑے ہیں۔ جو آسمان کی عظیم قوس پر اپنی خاموش اور لطیف حرکت کا عکس چھوڑتے ہیں۔ دن کے پہلے حصے میں (کوئی سات بجے سے 11 بجے تک) آسمان کی نیلاہٹ بڑی خالص اور اجلی تھی۔ دوپہر ہونے کے ساتھ، رنگت ہلکی ہو جاتی ہے۔ اور کوئی دو تین گھنٹے تک کافی اجلی سی رہتی ہے، کافی سفید نظر آتی ہے، پھر سورج کے غروب تک آسمان کا رنگ نیلا سا پڑ جاتا ہے۔ اور غروب آفتاب کو اب میں درختوں کے ایک جھنڈ میں سے دیکھتا ہوں۔ درختوں کی شاخوں میں سے

غروب آفتاب کی روشنی چکا چوند پیدا کر رہی ہے۔اس میں آگ کے شعلے ہیں۔ ہلکے پیلے رنگ کا گلزار کھلا ہے،خون کی قرمزی جھاڑیاں ہیں اور پانی پر، چاندی کی سیال چمک بچھ گئی ہے،سائے شفاف ہیں، روشنی کی برچھیاں چمک رہی ہیں، اجلے اور گہرے رنگوں کا ایک ایسا طلسم سامنے ہے، جو آج تک کسی تصویر میں کسی حدود میں گرفتار نہیں ہو سکا۔

میں نہیں جانتا کہ کیوں اور کس طرح یہ سکون میری زندگی میں در آیا لیکن خیال ہے کہ انہی آسمانوں کی وجہ سے (کئی دفعہ سوچتا ہوں کہ آسمانوں کو میں ہر روز دیکھتا ہوں۔ پھر بھی یوں لگتا ہے کہ میں انھیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں!) اس خزاں کے موسم میں بڑے سکون پرور لمحے میں نے گزارے ہیں۔ ان لمحات کو میں مسرتوں سے بھرپور لمحات کہوں گا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ مشہور روحانی شاعر لارڈ بائرن نے اپنی موت سے پہلے ایک دوست سے کہا تھا کہ میں نے ساری زندگی میں خوشی کے صرف تین لمحے دیکھے ہیں...... جب جنگل میں پیڑوں کے جھنڈ میں سے میں نے غروب آفتاب کا منظر دیکھا تو مجھے بائرن کا خیال آیا۔ پھر یکایک یہ خیال میرے دماغ میں کوندے کی طرح لپکا کہ میری زندگی کا یہ لمحہ مسرت سے کتنا بھرپور ہے! (میں اپنے اچھے لمحات کو کبھی تحریر میں نہیں لاتا، میں سوچتا ہوں ان لمحات کا جادو قلم اٹھانے کی بدولت ٹوٹ جائے گا۔ میں اپنے آپ کو مسرت کی لہر کے حوالے کر دیتا ہوں، میں خوشی کی موجوں پر بہتا رہتا ہوں۔ جہاں چاہیں وہ موجیں مجھے لے جائیں۔)

تو پھر مسرت ہے کیا؟ کیا یہ ایسا ہی ایک لمحہ ہے؟ کیا ایسے ہی لمحے مسرت کے لمحے کہلاتے ہیں؟ یہ لمحے جو پلک جھپکتے میں،ایک برق یا کیفیت کے ساتھ گزر بھی جاتے ہیں؟...... میں نہیں جانتا۔ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا،اس لیے میں بے یقینی اور شبہے کا فائدہ اٹھاتا ہوں اور ان نیلے آسمانوں سے پوچھتا ہوں کیا تمہاری نیلی گہرائیاں، مجھ جیسے بیمار کے ہر درد کا درماں بن سکتی ہیں؟ (ہائے، پہلے تین برس میرا جسم اور میری روح کن مصیبتوں کے بھنور میں رہے ہیں) اور کیا تمہاری نیلی گہرائیاں، میرے درد کا درماں،لطیف ہواؤں

کے قالب سے امرت رس کی طرح مجھ پر ٹپکائے جا رہی ہیں؟!''

والٹ وٹمین

3- مسرت کے 33 لمحات

اور اب میں آپ کے سامنے ان لمحات کا بیان پیش کرتا ہوں جو ایک چینی فلسفی کے پرمسرت لمحات ہیں۔ ان لمحات کا تعین، چن شنگ تان نے کیا ہے۔ چن سترہویں صدی میں چینی ادب کا مشہور اثر پرست نقاد مانا جاتا ہے۔ مسرت کی ان گھڑیوں کا بیان اس سے ڈرامہ ''مغربی گھر'' کی تفسیر میں کیا ہے۔ یہ لمحے اس نے ایک دفعہ اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھ کر معین کیے تھے جب چن اور اس کا دوست دونوں، سخت برسات کی وجہ سے ایک مندر میں دس دن تک پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے...... خوشی کی یہ 33 گھڑیاں وہ ہیں جن میں انسان کی روح، اس کے حواس کے ساتھ پوری طرح مربوط اور ہم آہنگ ہوتی ہے:

☆ جون کا ایک گرم دن ہے۔ سورج گویا سوا نیزے پر چمک رہا ہے۔ ہوا کا کہیں ایک جھونکا تک نہیں اور تا حد نظر بادلوں کا کوئی نام ونشان نہیں۔ گھروں کے آنگن بھٹی کی طرح تپ رہے ہیں اور تپتے آسمان پر کوئی پرندہ تک نظر نہیں آتا۔ میرا سارا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا ہے۔ میرے سامنے دوپہر کا کھانا رکھا ہے مگر مارے گرمی کے لقمہ نہیں اٹھایا جاتا۔ میں زمین پر ایک چٹائی بچھا کر لیٹ جاتا ہوں مگر بہت جلد چٹائی پسینے سے تربتر ہو جاتی ہے۔ مکھیاں تنگ کرنے لگتی ہیں۔ وہ میری ناک پر بار بار بیٹھتی ہیں اور اڑائے نہیں اڑتیں ...... میں گرمی کے بارے بے بس ہو رہا ہوں ...... یکا یک رعد کا کڑکا ہوتا ہے اور سارے آسمان پر کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ ابر سیاہ یوں گھر کر آتا ہے جیسے لشکر لڑائی کے لیے امڈے آتے ہوں۔ پھر بارش شروع ہو جاتی ہے۔ موسلا دھار مینہ کے جھالے برسنے لگتے ہیں۔ پسینے رک جاتے ہیں، زمین کی چپچپاہٹ دور ہو جاتی ہے۔ ساری مکھیاں بھاگ کر کہیں چھپ جاتی ہیں اور میں اٹھ کر کھانا (چاول) کھاتا ہوں...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ ایک دوست سے دس برس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یکا یک وہ ایک شام کو میرے گھر

آ جاتا ہے۔ میں دروازہ کھولتا ہوں اور اسے خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ نہیں پوچھتا کہ بھیا تم کشتی سے آئے، یا خشکی کا سفر کر کے یہاں تک پہنچے...... میں اسے یہ بھی نہیں کہتا کہ پلنگ پر بیٹھو یا آرام کرسی پر نیم دراز ہو جاؤ۔ میں کچھ کہے سنے بغیر، فوراً اندر جاتا ہوں اور اپنی بیوی سے بڑی لجاحت سے کہتا ہوں۔ ''ایک گیلن شراب کی ضرورت ہے!'' وہ چپ چاپ اپنی سونے کی جڑاؤ پن مجھے دے دیتی ہے۔ تاکہ میں اسے بیچ کر شراب لے آؤں......اور میں دل ہی دل میں حساب لگاتا ہوں کہ اس پن کو بیچ کر جو رقم ملے گی، وہ تین دن تک چل جائے گی...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ میں ایک خالی کمرے میں تنہا بیٹھا ہوں۔ میرے بستر کے سرہانے دوسرے کمرے میں کوئی چوہا کتر کتر کر رہا ہے۔ میں جھنجھلا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں یہ کھڑ بڑ کیسی ہے؟ یہ چوہا میری کون سی چیز کو کترے ڈالتا ہے؟ کون سی کتاب کتر رہا ہے؟...... میری جان سخت ضیق میں ہے۔ کچھ کئے بن نہیں پڑتا۔ یکا یک ایک بڑی خونخوار بلی نظر آتی ہے جو دم ہلاتی ہوئی ایک طرف نظریں جما دیتی ہے۔ میں اپنی سانس تک روک لیتا ہوں اور چپ چاپ بیٹھا رہتا ہوں۔ یکا یک ایک ہلکی سی چیخ کے بعد چوہے کی آواز ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہو جاتی ہے؟ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ میں نے اپنے مطالعے کے کمرے کے سامنے اگے ہوئے دو بیکار پیڑ اکھاڑ دیے ہیں۔ ان کی جگہ میں نے کیلے کے پندرہ بیس لہلہاتے پودے لگا دیے ہیں۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ بہار کی ایک رات میں اپنے رومانی مزاج کے ایک دوست کے ساتھ لب جوئبار بیٹھا، پی رہا ہوں۔ نشہ زیادہ نہیں، نہ کم ہے۔ نیم مخموری کا عالم ہے۔ پینا بند بھی ہو سکتا ہے اور پیتے جانا بھی مشکل ہے۔ میرا ایک سمجھدار نوکر فوراً دس بیس پٹاخے لاتا ہے۔ میں پینا چھوڑ کر، پٹاخے چھوڑنا شروع کر دیتا ہوں۔ گندھک کی تیز بو میرے نتھنوں میں

گھستی ہے اور دماغ میں پہنچ جاتی ہے۔ سارا بدن ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ اور عجیب سی راحت محسوس ہوتی ہے۔ کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ میں بازار میں جا رہا ہوں۔ دو آدمیوں کو دیکھتا ہوں کہ لال پیلے ہو کر ایک دوسرے سے الجھے پڑتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں غصے کی چمک لہرا رہی ہے گویا وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں وہ گالی گلوچ سے تو کام نہیں لے رہے، لیکن تمیز داری اور آپ، جناب کرتے کرتے ایک دوسرے کو کیوں اور کیسے کے پھیر میں ڈال رہے ہیں۔ لفظوں کا ایک دریا ہے کہ امڈ آتا ہے۔ یکا یک ایک طرف سے ایک پہلوان شخص آتا ہے اور دونوں کو بڑے طنطنے سے کہتا ہے۔ ''جاتے ہو یا لگاؤں دو دو''......کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ اپنے بچوں کو ادب کے شہ پارے، بڑی روانی سے پڑھتے دیکھ رہا ہوں۔ ان کی ننھی آوازیں یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے ایک صراحی سے برابر پانی نکل رہا ہے؟......کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ کھانا کھانے کے بعد فارغ وقت میں میں دکانوں کی سیر کرتا ہوں، چیزیں دیکھتا ہوں۔ کوئی ننھی سی چیز مجھے بہت پسند آ جاتی ہے۔ دکاندار سے مول تول پر تکرار ہوتی ہے۔ قیمت کی معمولی سی کمی بیشی پر بحث ہوتی ہے مگر دکاندار، قیمت کم کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ پھر میں اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی چیز نکالتا ہوں جو قیمت کے فرق کے برابر ہوتی ہے اور اپنے دکاندار کو پیش کرتا ہوں۔ دکاندار مسکرا دیتا ہے اور آداب بجالا کر کہتا ہے ''آپ تو بے حد فراخ دل واقع ہوئے ہیں!'' کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں۔

☆ کھانا کھانے کے بعد فارغ وقت میں، میں اپنا ٹرنک کھولتا ہوں اور پرانی چیزیں الٹ پلٹ کرتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ چند کاغذ کے پرزے ایک کونے میں ہیں۔ یہ کچھ پرونوٹ ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چند لوگ میرے خاندان کے مقروض

ہیں۔ ان مقروض لوگوں میں سے کچھ مر چکے ہیں، کچھ زندہ ہیں مگر کوئی ایسا نہیں جو ہمارا روپیہ لوٹا دے گا۔ ان لوگوں کی عدم موجوگی میں، میں ان کاغذوں کو جمع کر کے آگ دکھا دیتا ہوں۔ رفتہ رفتہ یہ ڈھیر جل جاتا ہے اور اس کا دھواں بھی ختم ہو جاتا ہے..... کچھ باقی نہیں رہتا..... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ بھری گرمیوں کا ایک دن ہے۔ میں ننگے پاؤں ننگے سر باہر نکلتا ہوں کہ رہٹ چلانے والوں کا لوک گیت سنوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ رہٹ کے چکر پر ٹھنڈا، پانی، سیال چاندی کی طرح پگھلتی ہوئی برف کی طرح گھوم رہا ہے اور نوجوان گیت گا رہے ہیں ..... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ صبح اٹھتا ہوں تو گھر میں کسی کو آہیں بھرتے اور یہ کہتے سنتا ہوں کہ کوئی مر گیا ہے۔ میں جلدی سے پوچھتا ہوں کہ کون مر گیا؟ دل میں یہ ڈر ہوتا ہے کہ اپنا ہی کوئی عزیز وفات نہ پا گیا ہو۔ پتا چلتا ہے کہ فلاں عالم فاضل فوت ہو گیا ہے..... جی کو تسلی ہو جاتی ہے..... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ میں صبح سویرے اٹھتا ہوں اور دیکھتا ہوں گرمیوں کی اس صبح کو کچھ لوگ ایک چھپر کے نیچے ایک لمبے بانس کو چیر کر اس سے پانی کا پائپ بنا رہے ہیں..... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ ایک رات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میں کسی کو اپنی یاد کرتے سن رہا ہوں۔ اگلے دن میں اس دوست سے ملنے جاتا ہوں۔ کمرے میں داخل ہو کر میں دیکھتا ہوں کہ میرا دوست میز پر بیٹھا جنوب کی طرف منہ کیے ایک دستاویز کو دیکھ رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ سر ہلا کر سلام کرتا ہے اور میری آستین کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیتا ہے۔ پھر کہتا ہے: اب آ گئے ہو تو یہ دیکھو..... ہم دونوں ہنس پڑتے ہیں اور پھر باتیں شروع ہوتی ہیں، ..... باتیں جاری رہتی ہیں حتیٰ کہ دیواروں پر سے سائے جاتے رہتے ہیں۔ وہ بھوک محسوس کرتا ہے اور چپکے سے مجھ سے پوچھتا ہے: کیوں کچھ کھاؤ گے؟..... کیا

یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟......

☆ سارا مہینہ بارش ہوتی رہتی ہے۔ صبح ہونے کو آئی ہے۔ میں بستر میں یوں لیٹا ہوں جیسے پی رکھی ہے یا بیمار ہوں۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ یکا یک پرندے چہچہانے لگتے ہیں۔ مطلع ضرور صاف ہو گیا ہو گا۔ میں پردہ کھینچ کر کھڑکی کھول دیتا ہوں۔ خوبصورت دھوپ ہر طرف چمک رہی ہے۔ جنگل نہایا دھویا کھڑا ہے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ میرا مکان بنانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اتفاق ہوا کہ غیر متوقع طور پر ایک جگہ سے کچھ رقم میرے ہاتھ آ گئی۔ اور میں نے مکان کی تعمیر شروع کر دی...... اس دن کے بعد سے ہر صبح اور ہر شام مجھے کہا جاتا تھا کہ مجھے مزید عمارتی لکڑی اور پتھر اور اینٹیں اور چونا اور کیل کانٹا خریدنا ہیں ورنہ عمارت مکمل نہیں ہو گی۔ مجھے روپے کی مزید ضرورت تھی۔ میں نے اس مکان کی خاطر ہر جگہ سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار تو میں ہمت ہار بیٹھا کہ شاید یہ گھر کبھی نہیں بن سکے گا مگر ایک دن یہ مکان مکمل ہو جاتا ہے، دیواروں پر سفیدی پھر جاتی ہے، فرش دھل دھلا کر صاف ستھرے ہو جاتے ہیں اور دیواروں پر رنگین تصویریں لٹکا دی جاتی ہیں۔ سارے معمار، مزدور جا چکے ہیں اور پھر میرے دوست آتے ہیں اور اس نئے گھر میں بیٹھ جاتے ہیں...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ سرما کی رات میں پی رہا ہوں۔ یکا یک محسوس ہوتا ہے کہ رات بے حد سرد ہو گئی ہے، کھڑکی کھول کر دیکھتا ہوں کہ برف گر رہی ہے اور تین چار انچ برف زمین پر پڑی ہے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ میں گرما کی تپتی ہوئی سہ پہر کو ایک بڑا شہیدی تربوز بڑے تیز چاقو سے کٹا کٹ کاٹ رہا ہوں...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ مدت سے آرزو ہے کہ بھکشو بن جاؤں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ بھکشو کو گوشت کھانے کی

ممانعت ہوتی ہے۔فرض کیجیے۔ مجھے بھکشو بننے کی اجازت مل گئی ہے اور میں سب کے سامنے گوشت بھی کھا سکتا ہوں۔اب میں فوراً گرم پانی کا ایک تسلا لے کر بیٹھ گیا ہوں اور گرما کے ایک مہینے میں اپنا سر، خود تیز استرے سے مونڈ ڈالا ہے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ مجھے پرانے ٹرنک یا الماری کے کونے میں کسی دوست کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط مل جاتا ہے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ جسم کے پوشیدہ حصے پر اکیزیما کے چند دھبے ہیں۔کبھی کبھی انھیں چھیل دیا جاتا ہے اور پھر غسل خانے میں بند ہو کر انھیں دھو دھا کر دوا لگا دی جاتی ہے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ ایک غریب ادیب یا عالم مجھ سے قرض مانگنے آتا ہے۔مگر مانگتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ اس لیے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ کچھ مضطرب سا ہے۔ میں اسے الگ ہو کر پوچھتا ہوں ''کیوں بھائی کتنے روپے چاہئیں آپ کو؟'' اور پھر میں اس کی مطلوبہ رقم اسے دے دیتا ہوں اور کہتا ہوں: ''اتنی جلدی گھر جا کر بھی کیا کیجیے گا، کچھ پی لیجیے۔''...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ میں ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا ہوں۔ہوا کا رخ ہمارے موافق ہے۔مگر ہماری کشتی میں کوئی بادبان نہیں۔اس لیے تیز نہیں چل سکتی۔ یکایک ایک بڑی بادبانی کشتی نمودار ہوتی ہے جو ہواؤں کے رخ پر برق کی تیزی سے چلی جا رہی ہے۔ میں اپنا رسا پھینکتا ہوں کہ اس بڑی کشتی سے اپنی چھوٹی کشتی باندھ لوں۔رسے کا سرا غیر متوقع طور پر بڑی کشتی کے لنگر کے ساتھ پھنس جاتا ہے اور ہماری کشتی اسی بڑی کشتی کے ساتھ بندھ جاتی ہے اور تیز تیز کھنچنے لگتی ہے۔ میں خوشی کے مارے، ملاحوں کا ایک گیت گانے لگتا ہوں...... اور سب لوگ خوشی سے تمتمانے لگتے ہیں...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ مجھے مکان کی تلاش ہے۔ مگر کوئی مناسب مکان نہیں ملتا...... پھر ایک دن ایک شخص آ کر بتاتا ہے کہ فلاں جگہ ایک مکان خالی ہے۔ جس میں کوئی درجن بھر کمرے ہیں۔ مکان، لب دریا واقع ہے اور اس کے اردگرد چاروں طرف سرسبز درخت ہیں۔ میں اسے کہتا ہوں کہ کھانا کھا کر مکان دیکھنے چلیں گے۔ مکان کے پاس پہنچ کر میں دیکھتا ہوں کہ مکان بڑا خوبصورت ہے اور چاروں طرف کافی زمین خالی پڑی ہے۔ جہاں سبزی، ترکاری اور تربوز خربوزے اگائے جا سکتے ہیں! ...... میں کہتا ہوں: اچھا! مکان کے ساتھ آئندہ سبزیوں کو بھی کوئی دقت نہ ہوگی! ......کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ چینی کا کوئی خوبصورت برتن ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے مرمت کرنے اور جوڑنے کی کوئی صورت نہیں۔ اسے دیکھ دیکھ کر اور افسوس ہوتا ہے کہ اتنا اچھا برتن ضائع ہو گیا۔ آخر میں سوچتا ہوں کہ جب یہ برتن اب ٹھیک نہیں ہوسکتا تو اس کے بارے میں یہ روز کا دکھ کیوں سہوں۔ میں یہ ٹوٹا ہوا برتن باروچی کے حوالے کرتا ہوں اور کہتا ہوں یہ برتن پھر میرے سامنے کبھی نہ آئے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ میں ولی نہیں، اس لیے مجھ سے گناہ بھی سرزد ہوتے ہیں رات کو کوئی ایسی بات ہوئی ہے کہ میں صبح اٹھ کر سخت بے چینی اور شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ یکا یک مجھے بدھ مت کی یہ تعلیم یاد آئی ہے کہ گناہوں کی پردہ پوشی نہ کرنا بھی توبہ کے برابر ہے۔ میں فوراً اپنے ہم صحبت لوگوں کو اپنے گناہ کے بارے میں تفصیل سے بتاتا ہوں۔ اس میں دوست اور اجنبی کا فرق نہیں کرتا۔ میرا دکھ ہلکا ہو جاتا ہے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ میں ایک خوش نویس کو ایک فٹ موٹے حروف لکھتے دیکھ رہا ہوں ...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ کھڑکی کھول کر میں نے ایک بھڑ کو کمرے سے باہر نکال دیا ہے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ

نہیں؟

☆ شہر کا حاکم منادی کر دیتا ہے کہ آج ہر شہری خوشی کے شادیانے بجائے گا اور جشن عام میں حصہ لے گا...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ پتنگ اڑ رہے ہیں۔آپ نے کسی کا پتنگ کاٹ دیا ہے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ دور کسی جنگل میں آگ لگی ہے...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ آپ اپنے تمام قرض اتار کر سب دوش ہو گئے ہیں...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

☆ آپ اس شخص کی کہانی سن رہے ہیں جس نے دو محبت کرنے والوں کے ملاپ کی راہ نکالی...... کیا یہ مسرت کا لمحہ نہیں؟

مسرت کے ان 33 لمحوں کا اندازہ کیجیے اور بچارے شاعر بائرن کا خیال کیجیے جس کی زندگی میں مسرت کے صرف تین لمحے آئے تھے۔ میرا خیال ہے یا تو وہ بے حد بیمار ذہن کا آدمی تھا یا پھر اس زمانے کے فیشن کے مطابق خواہ مخواہ غمگین اور افسردہ بنتا تھا۔ یہ بات نہ ہوتی تو وہ کم سے کم اپنی زندگی کے تیں ایسے موقعوں کا اقرار کرتا جو مسرت اور طمانیت سے بھرپور تھے۔

مسرت کے مندرجہ بالا موقعوں سے کیا یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زندگی واقعی ایک جشن کا نام ہے جو ہمارے لطف اور مزوں کے لیے برپا کیا گیا ہے...... یہ مسرتیں صرف انسانی حواس کے ذریعے سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور اس لیے ہمیں یہ موقع بھی حاصل ہوتا ہے کہ ہم ان مسرتوں کے بارے میں واضح طور پر اقرار کر لیں ...... مجھے یہ شک ہے کہ ہم اس دنیا کی مسرتوں سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں کیونکہ یہ دنیا حواس کی لذتوں کا نام ہے اور ہمارے روحانیت پرستوں نے ہمیں حواس کی مسرتوں کا لطف اٹھانے سے بہت زیادہ ڈرا رکھا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک اعلیٰ قسم کا فلسفہ ہمیں اپنے جسم کی لذت انگیز صلاحیتوں سے پھر روشناس کرائے، ان صلاحیتوں پر ہمارا اعتقاد اور اعتماد پختہ کرے اور حواس کے مزوں کو ہم حقارت کی نظروں سے نہ دیکھیں، ان سے ڈرنا بھی چھوڑ دیں...... ورنہ تیاگ کے مبلغوں کو چاہیے کہ ہم میں مادہ پرستی کا عنصر فنا کر کے، ہمارے جسموں کو محض روح بنا دیں۔ ہمارے جسم کے اعصاب، ذائقہ اور شامہ کی حسیات باقی نہ رہنے دیں۔ رنگوں کا امتیاز کرنے سے ہماری آنکھیں اندھی ہو جائیں۔ حرکت اور لمس سے ہمارے جسموں کو کوئی

واسطہ نہ رہے اور پھر ہم بھی ہندو بیرگیوں کی طرح اپنے جسم کو عذاب دے دے کر اسے مار سکیں مگر یہ کہاں ممکن ہے؟ اس لیے یہ نہیں تو پھر ہم جو کچھ ہیں اسی طرح رہنا ہمارے لیے بہتر ہے کیونکہ صرف وہی فلسفہ ہمیں سچی خوشی کی راہ سمجھا سکتا ہے جو حقائق سے واسطہ رکھتا ہو۔ کیونکہ صرف حقائق سے واسطہ رکھنے والا فلسفہ ہی صحت مند اور معقول فلسفہ ہوا کرتا ہے۔

4- مادہ پرستی...... چند غلط فہمیاں

پچھلی فصل میں، زندگی کے پر مسرت لمحات کا بیان آپ نے دیکھ لیا۔ اس سے آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ حقیقی زندگی میں، ذہنی اور جسمانی خوشیاں ایک دوسرے سے گہرے طور پر منسلک ہوتی ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا محال ہے۔ ذہنی یا روحانی خوشیاں صرف اسی صورت میں حقیقی خوشیاں ہوتی ہیں۔ جب انھیں جسم کے ذریعے سے محسوس کیا جا سکے۔ میں تو اخلاقی مسرتوں کو بھی انہی میں شامل کروں گا کیونکہ یہ بھی جسم کے ذریعے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں مگر ایک بات نکل آئی ہے جو شخص کسی عقیدے یا نقطہ نظر کی تعلیم دے، اسے اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ لوگ اس کی باتوں کا غلط مطلب سمجھیں گے۔ عیش پرستی کا فلسفہ کبھی یونانیوں میں مقبول تھا، مگر اس کا بھی مطلب لوگوں نے غلط سمجھا یہی حال رواقی فلسفے کا تھا جس میں زندگی کا مقصد یہ تھا کہ نیکی کی جائے اور راحت یا الم دونوں کے احساس پر قابو پا لیا جائے۔ رواقی فلسفے کا تو مطلب یہ لیا گیا کہ دل کو پتھر بنا لیا جائے (حالانکہ اس فلسفے کی بنیاد دلی نیکی پر تھی) اسی طرح ابی قورس کے نظریات سے جو دانش اور اختیار کا نچوڑ تھے مگر عام لوگوں نے یہی سمجھا کہ بس، جی کھول کر داد عیش دینا ہی زندگی کا مقصد ہے۔ یہی حال تقریباً میرا ہو گا کہ میں نے زندگی کے بارے میں بڑا مادی نظریہ پیش کیا ہے جو خود غرضی پر مبنی ہے اور یہ کہ اس نظریے میں سماجی ذمہ داری کا نام نشان نہیں اور یہ کہ میں نے یہ تلقین کی ہے کہ اپنی ذات کو سب سے مقدم سمجھو اور چین کرو! یہ اعتراضات ناسمجھی پر مبنی ہیں۔ معترضین نہیں جانتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ الم اور راحت کو ہیچ سمجھنے والے کا دل بھی بڑا نرم ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ زندگی کے شیدائی کا مزاج کتنا نرم اور کتنا اچھا ہونا چاہیے وہ نہیں جانتے کہ سارے انسانوں سے محبت کرنے کی تعلیم دینے کے لیے اگر دلیلیں دینی پڑیں اگر اسے ایک عقیدہ اور مذہبی فریضہ بنا دیا جائے تو ساری بات بیکار ہو جاتی ہے۔ جس محبت کو دلیلوں کا سہارا لینا پڑے وہ کبھی مخلصانہ اور سچی نہیں ہو سکتی محبت تو بالکل قدرتی ہونی چاہیے۔ یہ اتنا ہی

فطری جذبہ ہونا چاہیے جس طرح پرندے، قدرتی طور پر ہی پرواز کے لیے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں۔ انسانیت کی محبت کا جذبہ ایک سیدھا سادہ صحت مند جذبہ ہونا چاہیے جو اپنے آپ سے اپنے آپ صحت مند انسان کے دل سے پھوٹ پڑے! جو شخص ہرے بھرے پیڑوں سے محبت رکھتا ہو وہ کبھی جانوروں یا اپنے بھائی انسانوں پر ظلم نہیں کرسکتا کیونکہ قدرت کے ساتھ ہم آہنگی ہم کو یہی سکھاتی ہے۔ ایک صحت مند روح، جسے زندگی اور انسان کے بارے میں ٹھیک اور مناسب باتیں معلوم ہوں اور جو فطرت کے بھیدوں سے واقف ہو، ہمیشہ رحم سے بھرپور ہوگی کیونکہ لطف و کرم اس کا قدرتی حصہ ہوگا۔ روح کو ان الطاف و عنایات کے لیے کسی تعلیم یا مذہبی عقیدے یا فلسفے کی ضرورت نہیں جس شخص کی روح، جسمانی حواس کے ذریعے سے مناسب تربیت اور تہذیب پاتی رہے اور جو شخص مصنوعی زندگی اور انسانی سماج کے مصنوعی علم سے کچھ کچھ الگ تھلگ رہے صرف وہی شخص، ذہنی اور اخلاقی طور پر صحت مند رہ سکتا ہے۔

مادہ پرستی کو بڑا غلط سمجھا گیا ہے۔ بہت زیادہ غلط سمجھا گیا ہے۔ میں اس سلسلے میں موجودہ دور کے زبردست فلسفی جارج سنتیانا کو اپنا ترجمان بناتا ہوں۔ جو اپنے آپ کو مادہ پرست کہتے ہیں اور یہ قرار دیتے ہیں کہ ''شاید اس دنیا میں، میں آخری مادہ پرست زندہ رہ گیا ہوں!'' مگر ایک زمانہ جانتا ہے کہ جارج سنتیانا، دور حاضر کی خوبصورت ترین شخصیت ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''مادیت کے فلسفے کے خلاف ہمارے دل میں جتنے تعصبات ہیں، وہ سب اوپری ہیں۔ اصل میں مادیت میں ہمیں کچھ ایسی خامیاں نظر آتی ہیں جو ہمارے پرانے عقائد کی رو سے زیادہ بری معلوم ہوتی ہیں اور ان خامیوں کو دیکھ کر ہمیں بڑا سخت دھکا لگتا ہے۔'' مگر یہ یاد رہے کہ کسی نئے عقیدے، یا ملک یا مذہب کو باہر سے دیکھ کر کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ان سے پوری واقفیت حاصل کرکے اور ان کی روح سے ہم آہنگ ہو کر ہی ہم کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ نیا عقیدہ یا نیا ملک یا نیا مذہب کیسا ہے اور کیا ہے۔ میرے نزدیک مادیت میں خوشی کا عنصر مضمر ہے، ایک ایسی بھرپور کیفیت شامل ہے جسے ہم ظاہری طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ جو شخص حقیقت میں مادہ پرست ہوگا، وہ زندہ دلی اور مسرت کا پیکر ہوگا۔ صرف وہی لوگ مادہ پرستی کے نقائص دیکھتے ہیں۔ جنھیں مارے باندھے مادیت پر اعتقاد رکھنا پڑتا ہے۔ جنھیں اپنی زندگی تو بڑی خود غرضی اور اندھی مادہ پرستی میں گزارنی پڑتی ہے مگر ان کا دل غیر حقیقی روحانیت کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ جارج سنتیانا لکھتے ہیں:

''جو شخص حقیقت میں مادہ پرست ہے، یعنی جس کا خمیر ہی اس اعتقاد سے اٹھایا گیا ہے اور جسے طوعاً و کرہاً اس طرز زندگی کو اپنانا نہیں پڑا، وہ شخص، فلسفی ڈیموکریٹس کے سے اعلیٰ مقام کا حقدار ہے۔ وہ مسرت اور نشاط کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ مادیت جس حسن و خوبی سے ہزاروں طلسماتی شکلیں اختیار کرتی ہے اور جس وفور و شدت سے ہزاروں گہرے جذبوں کو فروغ دیتی ہے وہ بے مثال ہیں۔ ان شکلوں کو دیکھ کر ویسی ہی ذہنی آسودگی حاصل ہونی چاہیے جیسی حیاتیات کے ایک عجائب خانے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ جس میں ان گنت تتلیاں، شیشے کے بکسوں میں رکھی گئی ہوں اور جھینگا مچھلی سے لے کر گوریلا بندروں تک کے پیکر جہاں محفوظ کیے گئے ہوں۔ مادیت ایک صحت مند جسم میں، عمل اور عزم کے جذبات بیدار کرتی ہے۔ ان جذبات میں خودغرضی نہیں ہوتی۔ بلکہ خودغرضی کی امنگوں کے لیے حقارت اور نفرت کا احساس ہوتا ہے۔

مادیت کے ساتھ جو اخلاقی نظام وابستہ ہے۔ وہ ذی روح مخلوق کی حقیقی مصیبتوں اور دکھوں سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا، بلکہ دوسرے عمدہ اخلاقی نظاموں کی طرح، یہ نظام بھی انسانی دکھ درد پر اشک فشاں ہے۔ غم کی تحقیر صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو رجائیت پسندی کو دیوتا بنا کر اسے پوجتے رہتے ہیں۔ انسان کی خود پرستی اور خود پسندی سے کئی ایک خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور انسان اپنی لفاظی کی بدولت اپنے آپ کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ کل کائنات کا مرکز اور محور وہی ہے۔ اس خود پرستی کا علاج صرف یہ ہے کہ اس پر ہنسا جائے۔ ہنسی میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی ہمدردی اور مفاہمت کا بڑا رنگ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کی حماقتوں پر ہم ہنس سکتے ہیں، ان کی نیتوں یا ان کے افعال کا ہم مذاق نہیں اڑاتے۔ اس لیے مسرت حاصل کرنے کا راز یہ ہے کہ اسے معقولیت کی حد میں حاصل کیا جائے......''

(جارج سنتیانا از ''ایک مادہ پرست کے جذبات'')

تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ذہنی زندگی یا روحانی زندگی کیا چیز ہے۔ جس کے ہم اتنے ثنا خواں رہتے

ں؟اور جسے ہم حواس سے بھرپور زندگی پر ترجیح دینے کے عادی ہیں؟......آج کل حیاتیات کا علم بہت کچھ ترقی
ر چکا ہے اور حیاتیات ہمیں بتاتی ہے کہ روح، جسم کے رگ پٹھوں، کچھ رطوبتوں، اور کچھ اعصاب کا ایک
مجموعہ'' ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ رجائیت ہمارے اعصاب کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ تو پھر یہ ذہنی
رگی کہاں سے پھوٹتی ہے؟ اس کا وجود کس چیز سے ہے؟ اور اس کی غذا کیا ہے؟

فلسفیوں کا ایک مدت سے یہ خیال رہا ہے کہ سارا انسانی علم، حواس کے تجربے اور مشاہدے سے
مل ہوتا ہے۔ انسان کے پاس اگر لمس اور دیکھنے اور سننے کے حواس نہ ہوں تو اسے کوئی علم حاصل نہیں ہو
نا۔ جیسے کوئی کیمرہ، محدب شیشے اور فلم کے بغیر تصویر لے ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ کسی تیز فہم شخص اور کند ذہن شخص
ں یہ فرق ہوتا ہے کہ تیز فہم شخص کے وجود میں زیادہ طاقت کے محدب شیشے لگے ہیں اور دیکھنے اور اشیا کے عکس
محفوظ کرنے کا سامان، بہتر نوعیت کا ہے۔ اسی لیے اشیا کا عکس اس کے دماغ میں بہتر طور پر آتا ہے اور تا دیر
م رہتا ہے۔ یہ تجربے اور مشاہدے کا ذکر تھا۔ اب کتابی علم کو لیجیے۔ جب کتابی علم کو زندگی کے علم کے ساتھ
بقت دی جائے گی تو اس وقت صرف غور وفکر یا تطابق ہی کام نہیں آئے گا۔ زندگی میں ہمیں اپنا راستہ ٹٹول
ں کر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ ماحول کو اسی صورت میں دیکھنا پڑتا ہے جس صورت میں وہ ہے۔ زندگی میں جوان
ت باتیں ادھر ادھر بکھری ہوئی ملتی ہیں، ان کے بارے میں ایک صحیح اندازہ ذہن میں قائم کرنا پڑتا ہے۔
نی زندگی اور انسان کی فطرت کے حقائق کو الگ الگ، غیر مربوط طور پر نہیں۔ بلکہ ایک کل، کی حیثیت سے
کا ایک خاکہ اور جائزہ لینا پڑتا ہے۔ گویا زندگی کے بارے میں ایک اندازہ اور جائزہ کرنے کی ضرورت
، اور زندگی کا تجربہ کرنے میں ہمارے تمام حواس ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرتے ہیں۔
ں کے اسی تعاون اور دل کے ساتھ دماغ کے مل کر کام کرنے سے ہی ہم میں ذہنی گرمی پیدا ہوتی ہے۔ اور
گرمی زندگی کی دلیل ہے۔ اسی طرح انسان میں زندگی کی دلیل یہی ہے، جس طرح پودوں کی زندگی کی
ں ان کی سرسبزی ہے! کسی ایسے پودے کو دیکھیے جس پر شروع ہی میں کوئی آفت آ گئی۔ اب اس کے پھلنے
لنے کا اندازہ اسی بات سے کیا جائے گا کہ اس کے پتوں اور نئی کونپلوں میں سبزی کا نشان ملتا ہے یا نہیں۔ اس
چھال اور شاخیں، سبزی اور نمو سے بہرہ یاب ہیں یا نہیں یہی حال ہمارے خیالات کا ہے اگر ان میں گرمی
چائی ہے تو ہم زندہ ہیں، ورنہ نہیں۔

5- ذہنی یا روحانی مسرت

آیئے، اب ذہن اور روح کی مفروضہ مسرتوں پر نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ یہ مسرتیں کس حد تک، ہمارے حواس کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کا ہمارے ذہن سے کتنا اور کیا واسطہ ہے۔

وہ اعلیٰ روحانی خوشیاں کیا ہیں جنھیں ہم اپنے حواس کی ادنیٰ قسم کی مسرتوں سے الگ قرار دیتے ہیں؟ ...... کیا یہ بھی حواس کی مسرتوں کا ہی ایک حصہ نہیں؟ کیا یہ روحانی مسرتیں حواس کی مسرتوں سے نہیں پھوٹتیں؟ اور کیا ان کا منتہا انسانی حواس نہیں؟ کیا یہ روحانی مسرتیں، حواس سے الگ کی بھی جا سکتی ہیں؟

انسانی ذہن کی اعلیٰ مسرتیں، عام طور پر، ادب، آرٹ، موسیقی، مذہب اور فلسفہ سمجھی جاتی ہیں مگر ان پر گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مسرتوں کی پیدائش میں ذہن انسانی کا اتنا ہاتھ نہیں۔ ان کا تمام تر واسطہ انسان کے حواس اور انسان کے جذبات سے ہے۔ آرٹ کو لیجیے تصویر آخر کیا ہے؟ یہی نا کہ کسی قدرتی نظارے یا کسی کی شبیہ کا نام تصویر ہے...... اور یہ تصویر، کسی سچ مچ کے قدرتی منظر یا کسی حسین چہرے کی یاد ہمارے لیے تازہ کر دیتی ہے!...... اور ادب کیا ہے؟ ادب بھی ہر پھر کر زندگی کی ایک تصویر پیش کرتا ہے، زندگی کا ماحول، آب و رنگ، کسی وادی کی خوشبو یا شہر کی تیز بو، لفظوں میں ہمارے لیے محفوظ کرتا ہے...... ہم نے خود یہ معیار قائم کیا ہے۔ ہم خود کہتے ہیں کہ اچھا ناول وہی ہے جو حقیقی کردار اور حقیقی جذبات کی عکاسی کرے۔ یہ عکاسی جس قدر واقعیت کے قریب ہو گی اتنا ہی وہ ناول عمدہ سمجھا جائے گا۔ جو کتاب ہمیں انسانی زندگی سے دور لے جائے یا بڑی سرد مہری سے کسی واقعے کا تجزیہ پیش کر دے، وہ ادبی کارنامہ نہیں کہلاتی۔ جو کتاب انسانی لحاظ سے سچی ہو گی، واقعیت سے قریب تر ہو گی، صرف اسی کو ہم اچھا ادب پارہ کہیں گے۔ جو ناول، کرداروں کے بے جان اور سرد تجزیے پر اکتفا کرے گا، جس میں زندگی کا آب و رنگ نہیں ہو گا، اسے کون پڑھے گا۔

باقی ذہنی مسرتوں کو لیجیے تو شاعری سب سے پہلے آتی ہے۔ شاعری، ایک ایسی حقیقت ہے۔ جسے جذبات کا رنگ دیا جاتا ہے! موسیقی، بے لفظ جذبات کا نام ہے اور مذہب ایسی دانش و حکمت کا نام ہے۔ جسے تخیلی رنگ میں پیش کیا جائے! تصویروں کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان دیکھ سکتا ہے اور رنگوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شعر کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان، آوازوں میں تمیز کر سکتا ہے اور آہنگ اور لے کا احساس رکھتا ہے، جذباتی سچائی اس کے علاوہ ہے جو اسے انسان کے لیے مرغوب بناتی ہے۔ موسیقی کا

حال یہ ہے کہ موسیقی خالص جذبہ ہی جذبہ ہے۔ جسے زبان اور الفاظ کی ضرورت قطعی طور پر نہیں اور الفاظ اور زبان کا تعلق صرف ذہن سے ہوتا ہے۔ گویا موسیقی پر ذہن کا اختیار ہی نہیں۔ موسیقی میں یہ قدرت ہے کہ ہمارے لیے پرندوں کا نغمہ مچھلی منڈی کا بے ہنگم شور، یا میدان جنگ کا روح فرسا غوغا، جو چاہے پیش کر دے۔ بلکہ موسیقی تو پھولوں کی نزاکت، موجوں کی آہستہ خرامی، اور چاندنی رات کا حسن بھی سروں میں ظاہر کر سکتی ہے ......گویا موسیقی کا اول و آخر، حواس انسانی ہیں۔ اور جب موسیقی حواس کی حدوں سے نکل کر، کسی فلسفیانہ خیال کو ظاہر کرنے کا بیڑا اٹھائے گی تو سمجھ لیجیے کہ موسیقی موسیقی نہیں رہی بلکہ ایک زوال پذیر ذہن کا گھٹیا تجربہ بن کر رہ گئی اور بس۔

اب مذہب کی طرف آیئے۔ مذہب میں خرابیوں اور زوال کا آغاز اسی دن سے ہوا جب سے انسانی منطق نے مذہب میں دخل دیا۔ جارج سنتیانا نے کہا ہے: ''مذہب کے زوال کا باعث یہ ہے کہ مذہبی معاملوں میں بہت زیادہ منطقی دلیل بازی شروع کر دی گئی۔ چنانچہ مذہب، دانش و حکمت کی بلندیوں سے اتر کر محض اوہام کا ایسا مجموعہ بن گیا جس میں ہر طرف دلیلوں کی بھر مار تھی۔'' اصل میں مذہب کے زوال کا باعث یہ ہے کہ نظریہ پرستی نے مذہب کی آڑ لی۔ کئی قسم کی فرقہ بندیاں ہوئیں، عقائد اور رسوم کا زور ہوا، اصول اور احکام کا انبار جمع ہو گیا اور ہر بات کا جواز اور عذر گھڑا جانے لگا......قاعدے کی بات یہ ہے کہ انسان جوں جوں اپنے عقیدوں کو عقل کا تابع بناتا ہے اور ان کے لیے عقلی جواز تراشتا ہے، اس میں تقویٰ اور پرہیز گاری اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے کیونکہ وہ دلیلوں کے چکر میں پھنس کر اپنے آپ کو حق پر سمجھنے لگتا ہے۔ اسی خود بینی کی بنا پر کوئی مذہب، مذہب نہیں رہتا بلکہ ایک تنگ نظر فرقہ پرستی بن جاتا ہے جس کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ سچائی صرف اسی نے منکشف کی ہے۔ باقی سب کی راہ غلط ہے۔ اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ ہم اپنے عقیدوں کے لیے جس قدر جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اتنے ہی تنگ نظر اور کوتہ اندیش ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب عام طور پر سخت کٹر پن، تنگ خیالی، اور انفرادی زندگی میں شدید خود غرضی کا قالب اختیار کرتا ہے۔ گویا ایسا مذہب انسان کی خود غرضی کو پروان چڑھاتا ہے کیونکہ وہ اس کے دل میں دوسرے فرقوں کے لیے کوئی وقعت، کوئی جگہ نہیں رہنے دیتا۔ تعصب کی بنا پر اس شخص کے دل میں وسعت نہیں رہتی۔ مذہب، اس صورت میں فرد اور خدا کے مابین، ذاتی سودے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس ذاتی قسم کے سودے میں ایک فریق

(خدا) کو دوسرا فریق (فرد) عظمت کی بلندوں پر چڑھاتا ہے۔ اس کی حمد کے ترانے گاتا ہے اور ہر ممکن موقع پر اس کا نام لیتا ہے۔ اس کے جواب میں پہلا فریق (خدا) دوسرے فریق (فرد) کو اوروں کے مقابلے میں برکت و سعادت بخشتا ہے، دوسروں کے خاندانوں کے مقابلے میں اس فرد کے خاندان کو زیادہ سرفراز کرتا ہے۔

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں ہ جس چیز کو عرف عام میں ''مذہب'' کہا جاتا ہے وہ خود غرضی کا ایک قالب ہے اور جو لوگ بڑے ''دیندار'' بنتے ہیں، خود غرضی ان کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نام نہاد ''مذہب'' انسان میں اپنے آپ کو ''راہ حق'' پر ثابت کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ہر انسان سمجھتا ہے کہ صرف میں نے ہی سچائی کا حقیقی راستہ ڈھونڈ لیا ہے، باقی سب لوگ گمراہ ہیں۔ اس جذبے کی بدولت انسان کے سارے لطیف جذبات فنا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصل میں مذہب کی اساس انسان کے اعلیٰ اور لطیف جذبات پر ہوا کرتی ہے۔

میرے نزدیک آرٹ، شاعری اور مذہب کا وجود محض اس لیے ہوتا ہے کہ یہ انسان میں بصیرت پیدا کریں، اس کے جذبات میں حسن پیدا کریں اور اس میں زندگی کا صحیح جذبہ پیدا کریں۔ عمر زیادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے حواس، شعور اور احساسات پر رفتہ رفتہ بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ ہمارے جذبات، دکھوں اور بے انصافی اور ظلم کے سلسلے میں بے درد اور بے پروا ہوتے جاتے ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مکروہات کی بدولت زندگی کے بارے میں ہماری بصیرت ماند پڑتی جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے درمیان کچھ شاعر اور کچھ فنکار ایسے ہوتے ہیں جن کے احساس کی زندگی کند نہیں کر سکتی، جس کے جذبات مردہ نہیں ہوتے، جن کی بصیرت اور ادراک ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا یہ فرض ہے کہ ہمارے ضمیر کی آواز بن جائیں، ہمارے شعور اور ادراک کو آئینہ دکھائیں، ہمارے کند اعصاب کی تازگی کا سامان کریں۔ گویا آرٹ کو یہ چاہیے کہ وہ ہمارے مفلوج جذبات، ہمارے نیم مردہ خیالات، اور ہماری مصنوعی زندگی کے خلاف ہمیں متنبہ کرے، ان کا مذاق اڑائے، ان کی زندہ ہجو بن جائے۔ آرٹ ہمیں تصنع اور تکلف سے دبی ہوئی دنیا میں بے تکلفی اور آزادہ روی سکھاتا ہے۔ آرٹ کا یہ فرض ہے کہ ہماری زندگی میں صحت مندی اور معقولیت پیدا کرے اور حد سے بڑھی ہوئی ذہنی اور دماغی سرگرمیوں نے ہمیں جس بخار اور ہذیان سے دوچار کر رکھا ہے اس

سے ہمیں نجات دلوائے۔ آرٹ کا یہ فرض ہے کہ ہمارے احساسات کی دھار کو تیز کرے، ہماری عقل اور ہماری فطرت کے درمیان توازن کا ناتا پھر سے قائم کرے اور ہماری بکھری ہوئی منتشر زندگی کے برباد حصوں کو جمع کر کے ایک بار پھر اس زندگی کو مکمل صورت دے دے...... آرٹ کا یہ فرض ہے کہ انسان کی اصلی فطرت سے اسے پھر روشناس کرائے...... ورنہ آرٹ کے بغیر تو ہماری دنیا کا حال یہ ہے کہ علم کا ناتا سمجھ بوجھ اور عرفان سے ٹوٹ چکا ہے۔ تنقید نہ تو صحیح اندازے سے کوئی واسطہ رکھتی ہے نہ بصیرت سے۔ حسن موجود ہے مگر محبت عنقا ہے۔ سچائی سامنے ہے مگر جذبات کی گہرائی اور شدت کا کہیں پتہ نہیں، نیکی کا رحم سے کوئی تعلق نہیں۔ تمیز داری موجود ہے مگر دل کے خلوص کا نشان نہیں ملتا...... آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ کیا دنیا ہے!

اب تک مذہب، شاعری اور آرٹ پر بات ہو رہی تھی...... اب ذہن یا روح کی سرگرمیوں کی آخری منزل آتی ہے جسے فلسفہ کہا جاتا ہے۔ فلسفہ، ذہن انسانی کی سب سے اونچی سرگرمی سمجھا جاتا ہے مگر فلسفے کے سلسلے میں اس بات کا بہت زیادہ خطرہ ہے کہ خشک بحثوں میں الجھ کر فلسفے والے، زندگی سے دور ہو جاتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ممکن ہے یہ ویسی ہی مسرت ہو جو ریاضی کے کسی مشکل سوال کو حل کرنے کے بعد یا کائنات میں کسی نظام کی کارفرمائی کا احساس کر کے محسوس ہوتی ہے مگر یہ ذہنی مسرت کچھ ایسی وقیع نہیں۔ اصل میں اس قسم کی ذہنی مسرت ہماری دماغی مصروفیت کا ایک شاخسانہ ہے اور بس۔ اس کا مزہ اس لیے آتا ہے کہ اس پر کچھ خرچ نہیں آتا۔ یہ مفت ہی میں ہاتھ آتی ہے۔ یہ مسرت دوسرے ضروری کاموں کی سی اہم حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ اسی قسم کی آسودگی اور اطمینان کی ایک لہر ہے جو ہمیں ایک معما حل کرنے کے بعد محسوس ہوا کرتی ہے۔ اس میں ایک اور بھی خطرہ ہے۔ اس قسم کی ذہنی مسرتوں میں پڑ کر فلسفی لوگ، ذہنی اڑانوں کے قائل بن جاتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ چونکہ ہم نے کائنات میں ایک نظام کے وجود کا کھوج لگا لیا ہے لہٰذا اس کائنات میں منطقی طور پر بڑی تکمیل اور ترتیب ہونی چاہیے حالانکہ حقیقت اس کے عین برعکس ہوا کرتی ہے۔ یہ ذہنی اڑانیں حقیقت کا ایک جھوٹا عکس ہیں۔ ہم لوگ ایک فارمولا اور ویسی ہی ایک مصنوعی ترکیب ہے کہ حقائق کو تصنع کا تابع بنا دیا جائے۔ یہ مانا کہ تکمیل کے اس احساس کو اگر حد سے نہ بڑھنے دیا جائے تو اس میں بڑی آسودگی ملتی ہے مگر یہ یاد رہے کہ لاکھوں کروڑوں انسان، کائنات کے اس فرضی نظام سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں اور پھر بھی ہنسی خوشی زندگی گزارتے ہیں۔ گویا اگر اس نظام کائنات کا شعور نہ بھی ہو تو بھی زندگی کٹ سکتی ہے۔ اسی

لیے میں کسی ریاضی داں سے بات کر کے اتنا خوش نہیں ہوتا لیکن ایک معمولی خادمہ سے بات کر کے میری طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔اس سیدھی سادی خادمہ کی باتیں زیادہ فطری ہوتی ہیں۔اس کے الفاظ میں زیادہ جان ہوتی ہے۔اس کے قہقہوں میں زندگی کی حرارت زیادہ ملتی ہے۔اسی لیے اس سے باتیں کر کے مجھے انسانی فطرت کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔اسی لیے میں مادہ پرست ہوں، اور شعر کی بہ نسبت بھنے ہوئے گوشت کو ترجیح دیتا ہوں، فلسفے کے مقابلے میں چٹپٹی چاٹ کو زیادہ مرغوب جانتا ہوں۔

فلسفے نے زندگی میں جو باسی پن پیدا کیا ہے اس سے نجات اسی صورت میں ممکن ہے کہ جینے کو سوچنے پر ترجیح دی جائے۔صرف اسی صورت میں ہم وہ تازگی، وہ فطری انداز اور وہ بصیرت ایک بار پھر حاصل کر سکتے ہیں جو بچے میں نظر آتی ہے۔بچے کو دیکھ کر ہر وہ شخص جو سچا فلسفی ہے، کچھ شرمسار ہو جاتا ہے۔میں تو یہ کہوں گا کہ بچہ تو کیا، فلسفی اگر شیر کے بچے کو پنجرے میں دیکھے تو اسے نادم ہونا چاہیے۔قدرت نے اس بچے کو کتنا کامل بنایا ہے۔اس کے پنجے اس کے رگ پٹھے، اس کی خوبصورت کھال قدرت کے کمال کا کتنا اعلیٰ نمونہ ہیں۔اس کے نوکیلے کان، اس کی چمکدار گول آنکھیں کس قدر خوبصورت ہیں اور اس میں زندگی کا مزہ لینے کی کتنی زبردست صلاحیت موجود ہے...... فلسفی کے لیے یہ جائے ندامت ہے کہ خدا نے ہمیں جس احسن اور مکمل طریقے پر پیدا کیا تھا ہم نے اسے کس قدر نامکمل، ادھورا اور ادنیٰ کر دیا ہے۔خدا نے ہمیں ہاتھ پاؤں اور نظام جسمی کا ایک کامل نمونہ بنایا تھا اور ہم نے اپنے آپ کو کتنا گرا دیا ہے کہ اب یہی فلسفی ہے، کانوں سے اونچا سنتا ہے، آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینکیں لگاتا ہے، اس کا ہاضمہ بالکل خراب ہو چکا ہے، اس کا دل اور ذہن دونوں ماؤف ہو چکے ہیں اور اسے زندگی کی نعمتوں اور جینے کے لطف کا کوئی احساس ہی نہیں رہا، ہمیں اس قسم کے فلسفی سے کوئی کام کی بات حاصل نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ تو محض تخیل اور منطق کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے۔ہمارے لیے تو وہی فلسفہ کام کا فلسفہ ہے جو شاعری سے ہنستے کھیلتے ہم آہنگ ہو جائے اور ہم میں مظاہر فطرت اور انسانی فطرت، دونوں کو سمجھنے کی بصیرت اور شعور پیدا کرے۔

زندگی کے لیے مناسب فلسفہ وہی ہے جو ہماری جبلتوں کے متوازی ہو۔جو فلسفی مثالیت پسند ہوگا، بہت جلد قدرت اس کی ٹانگ کھینچے گی۔چین کے کنفیوشسی فلسفیوں کے نزدیک انسانی شرف کا تصور یہ ہے کہ انسان، فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کی زندگی گزارتا ہوا، کائنات کے سب سے اونچے درجے پر پہنچ جائے، وہ

درجہ جو آسمان اور زمین کے درجے کے برابر ہے...... چنانچہ کنفیوشس کے پوتے نے اسی درجے کو اپنے مقالے ''اعتدال اور توازن کا زریں راستہ'' میں یوں واضح کیا ہے:

''خدا نے ہمیں جو کچھ دیا، اسے فطرت کہتے ہیں، فطرت کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا تاؤ (صراطِ مستقیم) کہلاتا ہے اور اس سلامت روی کو پروان چڑھانا، ثقافت ہے...... خوشی، غصہ، غم، اطمینان جب تک اظہار نہیں پاتے، انسان کا نفس اصلی کہلاتے ہیں۔ جب خوشی، غصہ، غم اور اطمینان کا مناسب حد تک اظہار کیا جائے تو اسے ہم آہنگی اور توازن کہا جاتا ہے۔ یہی نفس اصلی، زندگی کی صحیح بنیاد ہے اور یہی ہم آہنگی اور توازن، زندگی کا زرین راستہ ہے۔ انسان جب اپنے نفس اصلی اور توازن کو پالیتا ہے تو زمین و آسمان، کائنات کی ہر چیز میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، ہر چیز کی نمو اور افزائش کے لیے راستہ کھل جاتا ہے۔

اپنے نفس اصلی سے، آگے نکل کر، سچی سمجھ بوجھ کی منزل تک پہنچنا فطرت کا ادراک کہلاتا ہے۔ اور سمجھ بوجھ کے راستے سے اپنے نفس اصلی کا شعور حاصل کرنا، ثقافت کہلاتا ہے۔ اس لیے جو شخص اپنے نفس اصلی کو پالیتا ہے، وہی عرفان حاصل کرتا ہے اور جسے عرفان حاصل ہو، وہی اپنے نفس اصلی کو پا سکے گا۔ جو لوگ اپنے نفس اصلی یا خودی کو پالیتے ہیں صرف وہی اس دنیا میں، اپنی فطرت کے تقاضوں کا پوری طرح حق ادا کرتے ہیں، اس کی تکمیل کر سکتے ہیں اور جو اپنی فطرت کی تکمیل کرتے ہیں، وہی دوسرے انسانوں کی فطرت کو مکمل بنا سکتے ہیں اور جو دوسروں کی فطرت کی تکمیل کر سکتے ہیں، وہی عالم اشیا کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور جو عالم اشیا کی تکمیل کرتے ہیں، وہی مادر فطرت کی مدد کر سکتے ہیں کہ وہ زندگی کی نمو اور افزائش کرے...... اور جو لوگ، زندگی کی نمو اور افزائش میں مادر فطرت کا ہاتھ بٹانے کے قابل ہیں وہ رتبے میں زمین و آسمان کے برابر ہیں......''



ساتواں باب

فراغت کے مزے

1- کائنات کا واحد کارکن جاندار

آپ دیکھ چکے ہیں کہ زندگی کی نعمتوں کا وسیع دستر خوان ہمارے سامنے پھیلا پڑا ہے۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ ان نعمتوں کا مزہ چکھنے کے لیے ہم میں اشتہا اور صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ اصل چیز یہی اشتہا ہے، نعمتوں کا نمبر اس کے بعد ہے کیونکہ انسان کے بارے میں سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز یہ ہے کہ اسے کام کرنے کا بڑا جنون ہے۔ اس نے اپنے آپ پر کاموں کا بہت بڑا انبار لاد رکھا ہے یا غالباً کاموں کا یہ انبار، تہذیب نے انسان کے سپرد کر رکھا ہے۔ انسان کے برعکس ذرا فطرت پر نظر دوڑایئے تو یہ معلوم ہوگا کہ جانداروں کی اس کائنات میں ہر چیز فراغت کے مزے لیتی ہے۔ کسی کو کچھ کام نہیں۔ صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جسے زندگی بسر کرنے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے...... تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ زندگی ناقابل فہم حد تک پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ انسان کے فرائض اور ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہے۔ ڈر اور نفسیاتی دباؤ کے موقع پر زیادہ ہوتے جاتے ہیں، امنگیں اور تمنائیں بڑھتی جاتی ہیں، اور یہ سب کچھ فطرت کی بدولت نہیں، انسانی معاشرے کی بدولت ہے۔

میں یہ سطور میز پر بیٹھا لکھ رہا ہوں لیکن ایک کتوبر گرجے کے مینار کے گرد برابر چکر لگا رہا ہے۔ اسے بالکل یہ فکر نہیں کہ دوپہر کو کیا کھائے گا مگر میرے لیے دوپہر کا کھانا بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ دوپہر کے کھانے پر، جو دو چار چیزیں میں کھاؤں گا ان کے لیے ہزاروں آدمیوں کو کام کرنا پڑتا ہے۔ ان کے لیے کئی کسان کھیتی باڑی کے بڑے پیچیدہ طریقوں سے کام کر چکے ہوں گے، ہزاروں آدمیوں کو لین دین اور بیوپار کرنا پڑا ہوگا، ہزاروں آدمیوں کو نقل و حمل میں مصروف ہونا پڑا ہوگا۔ میرے گھر پر یہ چیزیں پہنچائی پڑی ہوں گی اور پھر کہیں یہ کھانا تیار ہوا ہوگا۔ اسی لیے جانوروں کی بہ نسبت انسان کے لیے خوراک حاصل کرنا بہت زیادہ مشکل ہے

.....اس کے باوجود اگر جنگل کے کسی وحشی جانور کو شہر میں چھوڑ دیا جائے، اور اسے انسان کی مصروف زندگی کا اصل راز معلوم ہو جائے کہ انسان محض کھانا حاصل کرنے کے لیے اتنی مصیبت کرتا ہے تو جنگل کا یہ وحشی بھی انسانی سماج کے بارے میں بہت مشکوک رائے قائم کرے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ انسان اتنی تگ و دو آخر کیوں کرتا ہے۔

چنانچہ جنگل کے اس وحشی جانور کو سب سے پہلے یہ خیال آئے گا کہ جانداروں میں صرف انسان ہی ایسا جاندار ہے جو کام کا غلام ہے۔ چند لدو گھوڑوں یا بیلوں کو چھوڑ دیجیے، باقی پالتو جانوروں کو بھی کچھ کام کرنا پڑتا۔ بعض ملکوں میں پولیس جو کتے رکھتی ہے، انھیں بھی شاذ و نادر ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ پالتو کتے سے گھر کی رکھوالی کا کام لیا جاتا ہے مگر یہ پالتو کتا رکھوالی کے بجائے زیادہ وقت کھیل کود میں صرف کرتا ہے۔ صبح کو اگر موسم ٹھیک ہو تو یہ ضرور سوتا ہے اور بلی کا تو کہنا کیا ہے۔ بلی کا مزاج ہی رئیسانہ ہے۔ اسے روٹی کے لیے کبھی کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ بلی کو اپنی پابندی کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا۔ قدرت نے اس کے جسم میں ایسی لچک اور طراری بھر دی ہے کہ اس کے لیے ہمسائے کی دیوار پھاندنا کچھ بات نہیں۔ چنانچہ بلی جہاں چاہے گھومتی پھرتی ہے اور اسے کوئی پوچھتا نہیں گویا کام کی غلام صرف انسانیت ہے جو پنجرے میں بند بھی ہے اور جسے پالتو بھی بنایا گیا ہے مگر جسے مفت کا کھانا نہیں ملتا بلکہ تہذیب اور معاشرے کے نہایت پیچیدہ ضابطوں نے اسے مجبور کر رکھا ہے کہ وہ پیٹ بھرنے کے لیے کام کرے اور کام کے لیے سرگرداں رہے۔

میں مانتا ہوں کہ انسانیت کو جو فائدے حاصل ہیں اور وہ دوسرے جانداروں کو نہیں۔ انسان کے لیے علم کی خوشی اور باتوں کا لطف اور تخیل کی رنگا رنگی اور دید و شنید کے ہزاروں مزے موجود ہیں۔ جو دوسرے جانداروں کو حاصل نہیں پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ انسانی زندگی بڑی پیچیدہ ہو گئی ہے اور محض پیٹ بھرنے کے لیے جو کچھ انسان کو کرنا پڑتا ہے وہ انسانی سرگرمیوں کا کم و بیش 90 فیصدی حصہ ہے۔ تہذیب، زیادہ تر، روٹی کی تلاش کا نام ہے اور ترقی یہ ہے کہ روٹی حاصل کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے اگر انسان کے لیے روٹی حاصل کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا تو انسانیت کو اتنی سخت محنت کرنے کی کیوں ضرورت پیش آتی۔ مشکل یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ مہذب ہو گئے ہیں اور اب اس مرحلے پر پہنچ چکے ہیں کہ روٹی حاصل کرنے کے لیے اس قدر محنت کرنی پڑتی ہے کہ اس محنت کی وجہ سے روٹی کی اشتہا بھی مر جاتی ہے یہی وہ چیز ہے جو جنگل

کے وحشی جانور اور فلسفی، دونوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ بات ہی کچھ ایسی ہے۔

جب کبھی میں کوئی شہر دیکھتا ہوں تو پھیلی ہوئی چھتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ دیکھ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔ ہر شہر کا نقشہ لگ بھگ ایک سا ہوتا ہے۔ ہر شہر کا فضائی منظر بھی ایک سا نظر آتا ہے، وہی شہر کے واٹر ورکس کی دو چار بلند ٹینکیاں، کچھ گنبد، کچھ مینار اور چاروں طرف پھیلی ہوئی چھتیں ہی چھتیں، کوئی بلند، کوئی پست، کوئی ٹیڑھی میڑھی۔ کہیں کہیں وہ چار غلیظ سی فیکٹریوں کی چمنیاں، گھروں کی چھتوں پر چھوٹے بڑے ٹی وی کے ایریل کے تار، کہیں کہیں کپڑے سکھانے کی بڑی چھوٹی الگنیاں......اور بس......

نیچے بازار میں دیکھیں تو ہر طرف سرخ سرخ اینٹوں کی سوکھی بھاری دیواریں نظر آئیں گی۔ ہر دیوار میں ایک سی چند کھڑکیاں ہوں گی جن کے کچھ پٹ کھلے ہوں گے، کچھ بند ہوں گے۔ کہیں کہیں کھڑکیوں کی دہلیزوں پر سوکھے مارے پھولوں کے گملے رکھے ہوں۔ کہیں کوئی بچہ چھت پر آ نکلے گا اور اگر دھوپ ہوئی تو تھوڑی دیر آرام سے تاپتا رہے گا۔ ہر شہر اسی طرح چھتوں اور دیواروں اور کھڑکیوں کا ایک انبار ہوگا اور یہی وہ جگہیں ہیں جہاں انسان بستے ہیں۔ ہر خاندان انہی دو تین کھڑکیوں کے پیچھے زندگی بسر کرتا ہے۔ کیسے؟ اور روٹی کمانے کے لیے یہ ان گنت خاندان کیا کرتے ہیں؟ ہر دوسری تیسری کھڑکی کے پیچھے، ہر رات، میاں بی بی، خواب گاہ میں سونے کو جاتے ہیں، جس طرح ہر شام کبوتروں کا جوڑا کابک میں گھس جاتا ہے صبح کو یہ جوڑا اٹھتا ہے، ناشتہ کرتا ہے، خاوند گھر سے باہر روٹی تلاش کرنے نکل جاتا ہے، بی بی گھر کی صفائی میں جٹ جاتی ہے۔ چار پانچ بجے جا کر ذرا فراغت ہوئی تو ہمسایوں سے دو باتیں کر لیں اور تازہ ہوا کا کچھ مزہ لے لیا، ورنہ کچھ نہیں۔ پھر رات آجاتی ہے اور میاں بی بی دونوں تھک جاتے ہیں اور ایک بار پھر سو جاتے ہیں۔ بس یہی ان کی زندگی ہے۔

یہ ایک عام جوڑے کی زندگی ہے۔ اس سے ذرا بہتر حال کے لوگوں کو دیکھیے یہ ذرا بہتر قسم کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ ان مکانوں کے کمرے نسبتاً سجے سجائے رہتے ہیں، زیادہ صاف ستھرے رہتے ہیں۔ ان میں گنجائش بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسانوں کے نزدیک سات کمروں کا مکان کرایے پر لینا (مول لینا نہیں) بڑی عیاشی سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے بعد زندگی بھی مسرتوں سے بھرپور ہوگی۔ یہ مانا کہ اس طبقے کو مالی پریشانیاں کم ہوں گی، ان پر قرضوں کا بار بھی کم ہوگا لیکن اس طبقے کو کہیں زیادہ جذباتی

پیچیدگیوں کا سامنا ہوتا ہے۔اس طبقے میں طلاق زیادہ ہوگی۔زیادہ بے وفا خاوند ملیں گے جو راتوں کو گھر نہیں آئیں گے، اسی طبقے میں بہت سے جوڑے ایسے ملیں گے جو راتوں کو گھومتے پھریں گے تا کہ کوئی نہ کوئی عیاشی، کسی نہ کسی لہو ولعب میں وقت گزاریں اور اس عیاشی کی تلاش کو ''دل بہلاوا'' کہا جائے گا۔گویا انھیں گھروں کی دیواروں اور کمروں سے، فرش کی یکسانیت سے بیزاری ہو چکی ہے اور وہ اس بیزاری اور اکتاہٹ کو دور کرتے پھرتے ہیں۔چنانچہ یہ جوڑے قسم قسم کے ہوٹلوں اور کلبوں میں جائیں گے اور ننگی عورتوں کو دیکھیں گے اس ساری فضولیات کا نتیجہ کیا ہوگا؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس طبقے میں اعصاب کی کمزوری کی شکایتیں زیادہ پیدا ہوں گی، زیادہ سے زیادہ اسپرین کھائی جائے گی۔ایسی بیماریاں ملیں گی، جن کا علاج بڑا مہنگا ہوگا۔اسی طبقے میں زیادہ لوگ، قولنج اور کانی آنت کے ورم اور ضعف معدہ میں مبتلا ہوں گے۔انہی لوگوں میں دماغ کمزور ہو گا، جگر خراب ہوں گے، آنتوں میں ناسور پیدا ہوں گے۔معدوں کو کبھی آرام نہیں ملے گا، گردوں پر ناحق کا بوجھ رہے گا، مثانے سوزش سے ماؤف ہو جائیں گے، تلی بڑھ جائے گی، دل پھیل جائیں گے اور اعصاب مارے تھکن اور بوجھ کے تباہ ہو جائیں گے۔اسی طبقے میں سینے سپاٹ ہوں گے۔خون کے دباؤ کا ہر کوئی مریض ہوگا۔زیادہ سے زیادہ ذیابیطس کی شکایتیں سنی جائیں گی۔عرق النساء، گٹھیا، بے خوابی کے عارضے زیادہ ہوں گے۔زیادہ سے زیادہ لوگ اپنڈے سائی ٹس، ضعف گردہ کے مریض ہوں گے، بواسیر، مزمن پیچش، پرانے قبض، ناسور اور دنبل کے مرض عام ہوں گے۔بھوک کسی کو نہیں لگے گی۔زندگی سے ہر کوئی نالاں ہوگا۔ہر کوئی مرنے کا آرزومند ہوگا! اور یہ تصویر یوں مکمل ہوگی کہ اسی بدنصیب طبقے کے لوگوں کے یہاں بچے تو کم ہوں گے۔لیکن کتے زیادہ پلیں گے۔

گویا، مسرت کا دارومدار محض ان عورتوں اور مردوں کی طبیعتوں پر ہے جو ایسے اچھے اچھے اور فیشن ایبل گھروں میں رہتے ہیں۔ان میں بعض کی زندگی اچھی خاصی گزارتی ہے لیکن بعض کا جینا اجیرن ہوتا ہے۔مجموعی لحاظ سے یہ لوگ محنت کش لوگوں کی بہ نسبت کم شاد ماں اور خوش باش ہوتے ہیں۔انہی کو زیادہ بیزاری اور اکتاہٹ سے واسطہ پڑتا ہے لیکن ان لوگوں کے پاس موٹریں ہوتی ہیں اور کئی ایک کے پاس تو کھلے دیہات میں مکان بھی ہوتے ہیں اور دیہات کے یہ مکان اکثر ان کے سکون اور مخلصی کے مامن بن جاتے ہیں۔یہ چکر بھی کتنا خوبصورت ہے کہ انسان پہلے دیہات سے شہروں میں آتا ہے تا کہ زیادہ پیسہ کمائے اور زیادہ روپیہ کما

کر پھر دیہات میں واپس آجاتا ہے۔

کسی شہر میں گھومئے، پھریئے۔ آپ دیکھیں گے کہ سب سے بڑے بازار میں تو آرائش حسن کی دوکانیں ہیں، پھول والوں کے سٹال ہیں اور بڑی بڑی جہاز ران کمپنیوں کے دفتر ہیں۔ اس بازار کے عقب میں ایک اور بازار ہوتا ہے جس میں بساطی کے سامان کی دکانیں، سبزی فروش، ہیر کٹنگ سیلون، لانڈریاں، سستے ہوٹل اور اخبار فروشوں کے سٹال ہوتے ہیں۔ آپ ایک گھنٹے تک گھومئے۔ اگر یہ شہر بڑا ہے تو بھی ہر جگہ یہی چیزیں آپ کو ملیں گی۔ صرف بازار مختلف ہوں گے۔ ہر جگہ وہی دواؤں اور بساطی کی دکانیں، وہی باربر شاپ، وہی لانڈریاں، لوہے کے سامان کی دکانیں، سستے ہوٹل اور وہی اخبار فروشوں کے سٹال...... آپ کے دل میں یہ سوال چٹکیاں لے گا کہ یہ لوگ روزی کیسے کماتے ہیں؟ اس کا جواب بڑا آسان ہے۔ لانڈری والا، باربر اور ہوٹلوں کے بیروں، خانساماؤں کے کپڑے دھوتا ہے۔ ہوٹل کے بیرے، باربر اور لانڈری والوں کو کھانا کھلاتے ہیں اور باربر، ان سب کے بال تراشتا ہے...... بس تہذیب یہی ہے اور یہی اس کا محدود چکر ہے۔ یہ لانڈری والے اور باربر اور بیرے، زندگی بھر اسی مختصر سے بازار میں کام کرتے ہیں۔ کہیں ادھر ادھر نہیں جاتے۔ البتہ یہ شکر ہے کہ فلموں کی بدولت وہ پرندوں اور درختوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ترکی اور مصر اور ہمالیہ پہاڑ کے نظارے، طوفانوں کے مناظر، جہازوں کی غرقابی۔ کسی کی تاجپوشی، چیونٹیوں کے گھروندے، جھینگر اور ٹڈے، چھپکلیوں اور بچھوؤں کی لڑائی، پہاڑیاں اور سمندر کی طوفانی لہریں، ریگستان اور بادل بھی دیکھ لیتے ہیں، حد یہ ہے کہ وہ چاند کی ٹھنڈی روشنی سے بھی فلم کے پردے پر ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔

سبحان اللہ، تہذیب بھی کیا چیز ہے کہ کچھ اس کی تھاہ نہیں۔ اور یہ کیا جادو ہے کہ انسان، زندگی بھر سخت محنت کرتے رہتے ہیں، کام کے غلام بن جاتے ہیں، اندیشوں میں سر کھپاتے ہیں، صرف اس لیے کہ روزی کما سکیں اور اس سرگرمی میں انسان زندگی کے کھیلوں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔

2- فراغت کا چینی نظریہ

مشہور بات ہے کہ امریکہ کے لوگ بڑے دھانسو قسم کے ہوتے ہیں اور چینی، بڑے بیکار لوگ ہوتے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ متضاد شخصیتیں ایک دوسرے کو پسند کرتی ہیں۔ اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ امریکہ کے دھانسو لوگ، بیکار اور کاہل چینیوں کے مداح ہیں اور سست الوجود چینی، امریکیوں کی دھکم پیل کو بڑا پسند کرتے

ہیں۔قومی کردار کی دل کشی کا راز یہی خصوصیات ہوتی ہیں۔آج رسل و رسائل کی آسانی اور وسعت کی بدولت مشرق اور مغرب ایک ہوتے جارہے ہیں اور تہذیب دونوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لا رہی ہے۔مشرقی ملکوں اور خاص طور پر چین کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہے کہ مشرق اور مغرب کی الگ الگ ثقافت کیسے ایک دوسرے سے ملے گی۔زندگی کے بارے میں چین کا قدیم فلسفہ آج کل کی موجودہ مشینی تہذیب سے کیسے لگا کھائے گا اور ان دونوں کو ملا کر، زندگی گزارنے کا ایک نیا ڈھنگ کیسے پیدا کیا جائے گا۔شاید مغرب کے لیے بھی کبھی ایسا مسئلہ پیدا ہو جائے کہ مغربی زندگی میں مشرقی فلسفے کو کیسے لایا جائے مگر ابھی یہ مسئلہ وہاں کے لوگوں کے پیش نظر نہیں ہے۔

مشینی تہذیب بڑی تیزی سے ہمیں فراغت کے دور کی طرف لا رہی ہے اور یہ وہ دور ہوگا جس میں انسان کو کام کرنا پڑے گا اور اسے تفریح کا وقت زیادہ ملے گا۔جب انسان یہ دیکھے گا کہ اس کے پاس فرصت کافی ہے تو اسے لامحالہ یہ سوچنا پڑے گا کہ فراغت کے ان لمحوں سے کیسے لطف اٹھائے۔فراغت کا وقت زیادہ اس لیے ہوگا کہ صنعتی پیداوار کے طریقوں میں روز بروز اصلاح ہوتی جارہی ہے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال تیار کرنے کی طرف توجہ دی جارہی ہے۔اس صورت میں کام کا وقت کم اور فرصت کا وقت زیادہ ہوتا جائے گا......مگر ایسا کب ہوگا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اگلے تیس برس میں ہم اس منزل تک پہنچ جائیں گے یا ابھی ایک صدی اور لگے گی؟ اور آج سے تیس برس بعد کی زندگی کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔پھر بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب ترقی کے لیے جو سرتوڑ کوشش کی جارہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان، اس ترقی کی کوششوں سے تنگ آجائے گا، اور پھر دم لے کر یہ جائزہ لے گا کہ اس نے مادی دنیا پر کیا کیا فتح حاصل کر لی ہے......اور پھر وہ کچھ فرصت کے مزے لینا چاہیے گا۔کیونکہ یہ میں مان نہیں سکتا کہ جب انسان کے مادی حالات اب سے بہت بہتر ہو جائیں گے۔بیماریاں کم ہو جائیں گی، غربت اور محتاجی کا نام نہیں ہوگا اور زندگی سے انسان کو زیادہ امیدیں ہوں گی تو اس وقت بھی انسان اتنا ہی کام کرنا چاہئے گا، جتنا وہ اب کرنے پر مجبور ہے۔میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس نئے دور اور نئے ماحول میں انسان مزاجاً بھی کاہل اور آرام طلب ہو جائے گا۔

خیر اس امر سے قطع نظر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان معاملوں میں داخلی پہلو بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا خارجی

ماحول۔ اس لیے ذرا فلسفے کا بھی دھیان کیجیے جو انسان کا نظریہ ہی نہیں بدلتا بلکہ اس کا کردار بھی بدل دیتا ہے۔

گویا مشینی ترقی کے انتہائی دور میں مشینی تہذیب کے بارے میں انسان کا ردعمل جو کچھ ہوگا، اس کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ انسان کیسا ہوگا۔ حیاتیات کے مطالعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ کسی تحریک یا ہیجان کے سلسلے میں حواس کیا کریں گے، ان کا ردعمل، سست ہوگا یا شدید اور تیز ہوگا؟ اور یہ کہ مختلف جانور ایک یہ ماحول میں، ایک ہی چیز کے بارے میں، کیا رویہ ظاہر کرتے ہیں؟ بعض حیوان، دوسروں کی بہ نسبت سست ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ اس مشینی تہذیب کے ملکوں میں بھی (جن میں امریکہ، انگلستان، فرانس، جرمنی، اٹلی اور روس شامل ہیں) ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مشینی دور کے بارے میں لوگوں کا ردعمل مختلف ہے۔ یہ اختلاف ان ملکوں کے بسنے والوں کی مختلف طبائع کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ یہ امکان باقی رہتا ہے کہ ایک ہی قسم کے ماحول میں ہر انسان کا ردعمل الگ ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مشینی ترقی سے چین میں جس قسم کی زندگی رائج ہوگی۔ وہ جدید فرانس کی زندگی سے بہت مشابہ ہوگی کیونکہ چینی اور فرانسیسی ذہنیتوں میں بہت چیزیں ملتی جلتی ہیں۔

آج کل مشینی تہذیب، امریکہ میں سب سے زیادہ عروج پر ہے۔ قرائن یہ بتاتے ہیں کہ اب ساری دنیا میں امریکی قسم کی مشینی تہذیب اور امریکی طرزِ زندگی کا دور دورہ ہوگا مگر مجھے اس اندازے سے اختلاف ہے کیونکہ یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ امریکی ''مزاج'' کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ مزاج ایسا کہا جا سکتا ہے جو بڑی سرعت سے بدل رہا ہے۔

میرے نزدیک ثقافت یا کلچر، فراغت کی پیداوار ہے لہٰذا ثقافت کا فن لازمی طور پر بیکاری کا فن قرار پاتا ہے۔ چینی نقطہ نظر یہ ہے کہ جو شخص دانشمندانہ طور پر بیکار اور فارغ آدمی ہو وہ سب سے مہذب آدمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مصروف رہنے اور دانائی میں حکمی طور پر تضاد ہے۔ دانا لوگ، مصروف نہیں رہتے اور جو لوگ سخت مصروف رہیں، دانائی ان کے پاس نہیں پھٹکتی! اس صورت میں دانا لوگ وہی ہیں جو بڑے حسن و خوبی سے بیکار رہیں۔

میں اس موقع پر یہ نہیں بتاؤں گا کہ بیکار رہنے اور کچھ نہ کرنے کی کیا کیا قسمیں ہو سکتی ہیں اور اس بیکاری کی تکنیک کیا ہے۔ میں بیکاری کے فلسفے پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ یہ فلسفہ چین میں بیکار رہنے، کچھ نہ کرنے اور بالکل فراغت کی زندگی گزارنے کی تحریک کرتا ہے۔ اسی سے وہ کاہلی اور خوش باشی اور

وہ بے غم بلکہ شاعرانہ طبیعت ظہور میں آتی ہے جو چینی عالموں کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ خصوصیات عام چینی قوم میں بھی نظر آتی ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ یہ مخصوص چینی مزاج کیسے پیدا ہوا؟ آخر چینی لوگ کامیابی اور کارکردگی کو مشکوک کیوں گردانتے ہیں؟ اور زندگی کا مزہ لینے کی یہ صلاحیت زندگی سے یہ پیار ان میں کن باتوں کی بدولت پیدا ہوا؟

سب سے پہلے تو یہ سنیے کہ فراغت کے بارے میں چینی نظریہ کیا ہے۔ یہ اٹھارہویں صدی کے ایک نیم گمنام سے مصنف، شو پایا سیانگ کا نظریہ ہے۔ وہ کہتا ہے: ''وقت اس لیے مفید ہے کہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جاتا۔ اور فراغت وقت کا وہ لمحہ ہے جو کسی کمرے کے خالی فرش کی طرح ہے''...... یوں سمجھیے کہ اگر تنخواہ کم ہو تو آپ چھوٹا سا کمرہ کرایے پر لے لیں گے جس کا چپہ چپہ پورے طور پر استعمال میں آئے گا۔ لہٰذا اس کمرے میں بے آرامی کا سامنا ہوگا کیونکہ آپ تنگی سے گزر کریں گے۔ اس میں چلنے پھرنے کی کوئی جگہ نہیں ہوگی مگر جونہی تنخواہ بڑھی، آپ اس سے زیادہ بڑا کمرہ کرایے پر لیں گے۔ اس کمرے میں وسعت ہوگی، گویا فرش کا کچھ حصہ خالی بھی ہوگا اور باقی جگہ کو پلنگ، میز، کرسیاں وغیرہ گھیرے ہوں گی۔ بس یہ خالی جگہ وہ چیز ہے جو کمرے کو رہنے کے قابل بناتی ہے۔ اسی طرح فراغت کے لمحے ہی زندگی کو زندہ رہنے کے قابل بناتے ہیں۔

3- بیکاری......ایک مسلک

چینیوں کو فرصت اور فراغت سے جو محبت ہے، اس کی وجوہ کئی ہیں فرصت اور فراغت سے یہ گہرا لگاؤ، اصل میں چینی طبیعت کا خاصہ ہے۔ پھر اسے ایک ادبی مسلک بھی بنا دیا گیا اور انجام یہ ہوا کہ فراغت کے جواز میں پورا فلسفہ تیار کیا گیا۔ فراغت سے یہ لگاؤ، زندگی کے ساتھ گہرے لگاؤ سے پیدا ہوا۔ اسے ادب کی رومانی تحریک نے ہر صدی میں زندہ رکھا، اور آخر یہ دور آیا کہ زندگی کے ایک فلسفے نے اسے بالکل جائز اور معقول قرار دیا۔ زندگی کا یہ فلسفہ، تاؤ (قانون فطرت یا صراط مستقیم) کا فلسفہ تھا۔ زندگی کے اس نظریے کو چینی ذہن نے عام طور پر قبول کر رکھا ہے۔ اور یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ چینی مزاج میں، تاؤ کا خون شامل ہے۔

مگر پہلے ایک بات کی وضاحت ہو جائے۔ فراغت اور کاہلی کی زندگی، ایک رومانی مسلک ہے، اسے

ہم نے زندگی سے گہرے لگاؤ کی پیداوار قرار دیا ہے مگر یہ زندگی یقیناً امیر طبقے کے لیے نہیں تھی۔ زندگی کا یہ مسلک، غریب، ناکام اور خاکسار قسم کے علم دوست لوگوں کے لیے تھا جنھوں نے یا تو خود کاہلی کی زندگی اختیار کی یا کاہلی اور بیکاری انھیں مجبوراً اختیار کرنی پڑی دیں سمجھتا ہوں ان لوگوں کو اس زندگی میں بڑا چین آرام رہا ہوگا۔ اور انھیں روحانی خوشی بھی حاصل ہوگی، شہرت کے نقصانات، اور گمنامی کے فائدوں پر چینی ادب کی بحثیں ان لوگوں کے لیے بڑی دل خوش کن تھیں۔ کیونکہ یہ لوگ اعلیٰ عہدوں کے امتحانات میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ یہ لوگ اپنے گھر والوں کے لیے زیادہ روپیہ اور زیادہ عیش آرام کا سامان مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اس قسم کے مقولے ان کی پناہ گاہ ہوتے تھے کہ ''دیر میں کھانا کھانا گوشت کھانے کے برابر مزہ دیتا ہے۔'' اس طرح یہ نکھٹو لوگ اپنے گھر والوں کی نظروں میں کم معتوب ہونے کا راستہ نکالتے تھے۔ آج کل چین کے اشتراکی ادیب، پرانے شاعروں اور ادیبوں پر فقرے کستے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاعر سوتنگ پو اور یوآن منگ وغیرہ اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جسے کچھ کام نہیں تھا۔ یہ طبقہ چین کے جدید محنت کش ادیبوں کے نزدیک قابل نفرت ہے اور اندازہ بڑی سخت ناانصافی پر مبنی ہے۔ سو نے ''آب جو کی لہروں سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئی بادصبا'' کے گیت گائے تھے، اور یو پن منگ نے لکھا تھا کہ ''شبنم کی نمی میرے دامنوں کو تر کر رہی ہے۔'' ہمارے اشتراکی دوست غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ بادشمال، چاند، شبنم اور پرندے، گویا سرمایہ دار طبقے کی ملکیت ہیں۔ حالانکہ قدیم زمانے کی یہ عظیم شخصیتیں، مزدوروں اور سرمایہ داروں کے جھگڑوں سے بالاتر تھیں، کیونکہ یہ لوگ خود غریب کسانوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، اور اسی زندگی میں انھوں نے فطرت سے ہم آہنگی اور دلی سکون پایا۔

ان معنی میں بے کاری اور کاہلی کی زندگی کے اس رومانی مسلک کو بنیادی طور پر ایک جمہوری چیز سمجھا جا سکتا ہے۔ فرصت سے لطف اٹھانے پر عیاشیوں سے مزے لینے کے مقابلے میں بہت کم خرچ آتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ مزاج فنکارانہ ہو۔ ایسا مزاج جسے کسی فارغ سہ پہر کی تلاش ہوتا کہ وہ یہ سہ پہر بالکل بے مصرف طریقے پر بسر کر سکے۔ اصل میں کاہلی اور آرام طلبی کی زندگی پر کچھ خرچ نہیں آتا۔ یہ بات، امریکی ناول نویس تھوریو نے اپنے ناول والڈن میں بڑی خوبی سے ظاہر کی ہے۔

چین کے رومانی ادیب اور شاعر عام طور پر ایسے حضرات تھے جن میں احساس کی لطافت حد درجے کی

تھی۔فطرتاً یہ لوگ، آزاد منش اور آزادہ رو تھے۔ان کے پاس بنیادی مال و دولت کچھ نہیں تھا مگر جذبات اور احساس کی دولت سے یہ لوگ مالا مال تھے۔زندگی سے انھیں گہرا لگاؤ تھا اور زندگی کے ساتھ اس پیار کا مظاہرہ وہ یوں کرتے تھے کہ سرکاری عہدہ داری کی زندگی سے انھیں شدید نفرت تھی۔اور وہ اپنی روح کو جسم کا غلام بھی نہیں بناتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آرام طلبی اور بیکاری کی زندگی، امرا کے حصے میں آنے کے بجائے صرف ان لوگوں کا حصہ تھی جو عالی دماغ ہوں، (یہ عالی دماغی، مغرب کے پیشہ ور آوارہ گردوں کی شان سے بہت ملتی جلتی ہے جو اپنی خودداری کی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔اپنی خودی کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہیے۔اس لیے کام کرنے سے گریز کرتے ہیں لیکن ان میں خدا نے اتنی عقل ضرور دی ہوتی ہے کہ وہ دنیاوی کامیابی کو ہیچ سمجھیں) چینی داناؤں کی یہ عالی دماغی، آزادی رائے کی بدولت تھی۔وہ اپنے گرد پھیلے ہوئے زندگی کے وسیع ڈرامے اور اپنے ماحول سے متاثر نہیں ہوتے تھے اور سچ پوچھیے تو اس بے تعلقی ہی سے عالی دماغی وجود میں آتی ہے۔یہ لوگ انسان کی اونچی امنگوں اور حرص، اس کی حماقتوں اور شہرت اور دولت کی ہوس کو ہیچ سمجھتے تھے۔اسی لیے یہ عالی دماغ تھے......نتیجہ یہ تھا کہ یہی عالی دماغ عالم جو اپنی ذات اور اپنے کردار کو دنیاوی کامیابی سے زیادہ قیمتی چیز سمجھتے تھے اور جو شہرت اور دولت پر روحانی پاکیزگی کو ترجیح دیتے تھے، رفتہ رفتہ چینی ادب کا آدرش بن گئے۔چینی ادب کا یہ مثالی انسان سادہ زندگی کا پیکر تھا۔اس کے دل میں ہمیشہ دنیاوی ترقی کے لیے تحقیر کا جذبہ ہوتا تھا۔

اس طبقے کے عظیم ادیب یوآن منگ، سوتنگ پو، پوچری، یوآن چنگ لان، یوآن ست سائی عام طور پر زندگی کے ایک مختصر دور میں سرکاری عہدہ دار رہے تھے اور اس حیثیت سے وہ بے حد کامیاب افسر بھی تھے۔پھر اس سرکاری زندگی سے ان کا جی بھر گیا، وہ اپنی منصبی خوشامد اور ساتھی افسروں کی خاطر تواضع، ان کی مہمان نوازی سے سخت تنگ آ گئے۔چنانچہ انھوں نے نہایت عقلمندی سے کام لیتے ہوئے اپنے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دیا اور گوشہ نشین ہو گئے۔یوآن چنگ لانگ نے تو اپنے اعلیٰ افسروں کے نام سات دفعہ یہ عرضی لکھی کہ میں اپنے منصبی ادب آداب سے تنگ آ چکا ہوں (اس وقت وہ شہر سوچاؤ کا حاکم تھا) اور مجھے اب خدمت سے معاف رکھا جائے تاکہ میں ایک آزاد اور بے غم شہری کی حیثیت سے زندگی کے چار دن آرام سے بسر کر سکوں۔

بے مصرف اور بے کار زندگی کی شان میں ایک چینی شاعر یو یو چی آن یوں رطب اللسان ہے۔ یہ خیالات ایک کتبے کی شکل میں لکھے گئے تاکہ وہ انھیں اپنے دیوان خانے پر نصب کر سکے۔ اس دیوان خانے کو شاعر ''ایوان تساہل'' کہا کرتا تھا:

''تاؤ فلسفے کی کلاسیکی کتابیں پڑھنے کی ہمت کون کرے، کیونکہ تاؤ کا قانون فطرت کتابوں میں کہاں۔

اصل یہ ہے کہ تاؤ کے قانون فطرت کی روح رواں خلا ہیں، صاف اور ٹھنڈے خلا اور یہ خلا پن دن بھر کچھ نہ کرنے کے بغیر کہاں ملے گا۔

شعر بھی کون پڑھے۔ جہاں شعر پڑھتے پڑھتے رک جاؤں گا ساری شعریت فنا ہو جائے گی......

رباب بھی کون بجائے...... رباب کا نغمہ انہی تاروں میں فنا ہو جاتا ہے جن سے وہ پیدا ہوتا ہے۔

شراب بھی کون پیے۔ بوتل کے رسیا، نشے اور سرور کے باوجود بھی ان پہاڑوں اور دریاؤں تک نہیں پہنچ سکتے جو ان کی زد سے باہر ہیں۔

پہاڑوں اور چشموں کی طرف کون دیکھے۔ خود میرے دل میں، منظر قدرت کی نہایت شاندار تصویر موجود ہے۔

ہواؤں اور چاندنی کا سامنا کون کرے۔ خود میرے وجود میں (ایسی ہی) امر چیزوں کی ایک دنیا بستی ہے۔

دنیا کے کاموں پر توجہ کون دے۔ خود میرے اندر ہی، میرا گھر بار اور میری دولت موجود ہے۔

موسموں کے تلون سے کون متاثر ہو۔ میرے اندر آسمانی جلوس کی تصویریں رقصاں رہتی ہیں۔

تناور درخت گل سڑ کر مٹی میں مل جائیں گے۔ چٹانیں بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔

مگر میں جو کچھ ہوں وہی رہوں گا۔

کیا یہ میرے ''ایوانِ تساہل'' کے لیے موزوں کتبہ نہیں۔ کیا اس کمرے کو ''ایوانِ تساہل'' کہنا مناسب نہیں ہوگا؟......''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصروف زندگی اور کاہلی کا یہ مسلک، روحانی سکون کے ساتھ وابستہ تھا۔ اس کی بدولت ہر قسم کی ذمہ داری سے آزادی اور بے فکری ملتی تھی اور فطرت کے مظاہر سے جی بھر کر لطف اٹھانا اسی مسلک والے لوگوں کا حصہ تھا۔ اسی رعایت سے چینی شاعروں اور ادیبوں نے اپنے آپ کو عجیب وغریب ناموں سے یاد کیا ہے۔ تو فو اپنے آپ کو ''دریاؤں اور جھیلوں کا مہمان'' کہتا ہے۔ سوتنگ پو نے اپنے آپ کو ''مشرقی ڈھلوان کا زاویہ نشین'' کہا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو ''دھند میں لپٹی ہوئی جھیل کا خوش باش فرد'' کہتا ہے تو کسی نے اپنے لیے ''دھند میں لپٹے ہوئے مینار کے باسی'' کا خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

چونکہ بے مصرف اور بیکار زندگی کا مزہ لینے پر کچھ خرچ نہیں آتا، اس لیے اس کا لطف اٹھانے سے امیر طبقہ محروم ہے۔ اس طبقے میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ یہ صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو دولت کو بالکل ہیچ سمجھتے ہوں۔ بیکاری کی زندگی کا لطف اٹھانا صرف اس شخص کے بس کی بات ہے جس کا دل غنی نہ ہو، جو سادہ زندگی کا دلدادہ ہو اور جو روپیہ کمانے کے دھندوں سے دور بھاگتا ہو۔ جو شخص زندگی سے لطف اٹھانا چاہتا ہے اس کے لیے زندگی کے مزوں کا شمار نہیں۔ جو لوگ اس فانی زندگی کے مزے نہیں لے سکتے، ان کے دل میں زندگی کی سچی قدر نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ اپنی زندگی کو روزمرہ کی یکساں اور بیزار کن زندگی بنا دیتے ہیں۔ چینی شاعر اور فلسفی لاؤتزے پر یہ الزام غلط ہے کہ وہ زندگی کا دشمن تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے دنیاوی زندگی کی فضول مصروفیتوں کو تیاگ دینے کی تعلیم اس لیے دی تھی کہ اس کے دل میں زندگی کے لیے بڑا پیار، بڑی قدر موجود تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زندگی، اپنے اونچے مقام سے گر کر محض دم شماری اور وقت گزاری کا حیلہ بن جائے۔

یہ قاعدے کی بات ہے کہ جہاں محبت ہوگی وہاں رشک وحسد ضرور ہوں گے۔ جو شخص زندگی کو بڑی پیاری متاع سمجھتا ہو وہ اپنے فرصت کے چند بے بدل لمحوں کی بڑی حفاظت کرے گا۔ اسے اپنی آزادہ روی اور بے فکری کے مخصوص طنطنے اور اپنی عزت نفس کی پاسداری بھی کرنی ہوگی۔ اس کے یہاں کام کے لمحے جتنے

ضروری اور عزیز ہوں گے، مچھلی کا شکار کھیلنے کے لمحے بھی اتنے ہی گراں مایہ ہونے چاہئیں۔ فراغت اور تفریح کے ان لمحوں کا پاس کرنا رفتہ رفتہ ایک عقیدہ بن جائے گا۔ اس کی بڑی خوبصورت مثال انگریز قوم کی ہے جس نے اپنے کھیل کے وقت کو ایک مذہبی فریضے کی طرح مقدس بنالیا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں اگر کلب میں کوئی شخص آپ سے کاروبار کا تذکرہ شروع کر دے تو آپ اس کی گفتگو کو برداشت نہیں کریں گے۔ جس طرح ایک سائنس دان کو اگر اس کی تجربہ گاہ میں جا کر باتوں میں لگایا جائے تو وہ چڑ جاتا ہے۔ اسی طرح آپ کلب میں غیر تفریحی باتوں سے چڑ جائیں گے آپ رفتہ رفتہ اس مرحلے پر آ جائیں گے کہ آپ جاتی بہاروں کے باقی ماندہ دن پشیمانی اور افسوس کے ساتھ شمار کرنے لگیں گے۔ آپ کو تاسف ہوگا کہ آپ نے اس بہار میں، زیادہ سیر کیوں نہ کی۔ آپ کو اسی طرح کچھ کھونے کا احساس، کسی چیز کی کمی کا خیال ہوگا جس طرح اس دکاندار کو ہوتا ہے جس کی دن میں کم بکری ہوئی ہو۔

4- دنیا ہی ایک بہشت ہے

زندگی کو عزیز سمجھنے کے ساتھ ایک خلش موجود ہے۔ یہ خلش بڑی شاعرانہ ہے۔ اس کی تہ میں یہ حقیقت ہے کہ آخر کو انسانی زندگی فانی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ فانی زندگی کے اس غمناک احساس نے چینی دانشوروں میں، زندگی سے لطف اٹھانے کی خواہش کو زیادہ شدید اور گہرا کر دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر زندگی یہی ہے جو ہمیں ملی ہے۔ تو جب تک دم میں دم ہے ہمیں اس زندگی سے جی بھر کر لطف اٹھانا چاہیے۔ اس کے برعکس اگر انسان کے دل میں زندہ جاوید ہو جانے کی مبہم سی امید بھی رہے، تو اس ارضی زندگی کے مزے لینے پر اس کی توجہ نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ سر آرتھر کیتھ نے اس مخصوص چینی احساس کو بڑے خوبصورت لفظوں میں ظاہر کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔ ''اگر انسان کا عقیدہ یہ ہے (اور میرا تو یہی عقیدہ ہے) کہ ہماری یہ دنیا، یہ زمین ہی جنت ہے تو انسان اس کو جنت بنانے کی واقعی بھرپور کوشش بھی کریں گے!'' سوتنگ پو نے کہا ہے: ''زندگی، بہار کے خواب کی طرح گزر جاتی ہے، اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا!'' اسی لیے سوتنگ پو زندگی کے ساتھ اتنی گہری دل بستگی رکھتا ہے۔ فانی زندگی کے بارے میں یہی خیال ہمیں بار بار چینی ادب میں ملتا ہے۔ فنا ہونے اور مٹ جانے کا یہ احساس چینی شاعر اور دانشور کو ہمیشہ طرب اور انبساط کے لمحوں میں بار بار ہوتا ہے اور اس احساس کی خلش چینی شاعر کی زبان سے یہ کہلواتی ہے کہ:

چاند پورا نہ رہے گا ، ایسے!

پھول کھلتا نہ رہے گا ، ایسے!

یہ احساس اس وقت اور بھی شدید ہوگا جب وہ کھلتے پھولوں کے ساتھ پورے چاند کو دیکھے گا۔مشہور شاعر لی پو کی خوبصورت نظم ''شفتالوؤں کے غنچوں کے درمیان بہار کی ایک رات'' دیکھئے جو اس نے ایک شاندار جشن کی یاد میں لکھی تھی۔اس میں یہی خیال ملتا ہے جو چینی ادب میں ضرب المثل بن گیا ہے:

''عمر رواں خواب کی مانند ہے۔آخر،ہمیں اس زندگی سے لطف اٹھانے کا کتنی بار موقع ملے گا؟''

زندگی کے فنا ہونے اور مٹ جانے کا یہ احساس وانگ سی چی نے اپنے زندہ جاوید مضمون ''ایوانِ گل'' میں بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے۔یہ مضمون،اس نے اپنے خوش باش اور عالی مرتبت دوستوں کی ملاقات پر لکھا تھا۔وہ کہتا ہے:

> ''ینگ ہو کے جلوس کے نویں سال (353 عیسوی) بہار کے دورآخر کے آغاز میں ہم لوگ جشن آبی کے سلسلے میں ایوان گل میں جمع ہوئے تاکہ آبی جشن منا کر خبیث روحوں کو بھگا سکیں۔
>
> جشن میں ہم سب لوگ موجود ہیں بوڑھے بھی اور جوان بھی سامنے، بلند پہاڑوں کی شاندار چوٹیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں،تناور درختوں کی چھتر چھاؤں ہے، بانسوں کے اونچے پیڑ ہر طرف کھڑے ہیں۔یہاں صاف شفاف چشمے ہیں،شور مچاتے ہوئے آبشار باری باری پی رہے ہیں جو بہتے پانی کی قوس پر ناچتا ہوا ہر ایک کے پاس پہنچ جاتا ہے۔کوئی ساز موجود نہیں۔نہ تار کا ساز،نہ دم کا ساز جس کی موسیقی ہم سنیں۔پھر بھی ہم پی رہے ہیں اور گا رہے ہیں۔دل کی باتیں ایک دوسرے سے کہنے اور باہمی گفتگو کا مزہ لینے کے لیے سب تیار ہیں۔آسمان صاف ہے۔فضا میں تازگی ہے اور ہوا کے جھونکے ہلکے ہیں۔اوپر پھیلے ہوئے آسمان اور نیچے زمین پر ہزاروں مظاہر فطرت کو دیکھنے،ان کا لطف اٹھانے کا یہی وقت ہے۔سارے منظر پر نظریں دوڑانا کتنا فرحت بخش ہے۔اپنے احساس کو بندشوں سے آزاد کر کے،ان کی عنان ہاتھ سے چھوڑ دینا کتنا کیف آگیں ہے۔گویا چشم و گوش

دونوں کے لیے آسودگی، دونوں کے انبساط کا پورا پورا سامان موجود ہے۔

لوگ اکثر زندگی کے بارے میں بات کرنے کے لیے مل بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کا قاعدہ ہے کہ وہ دل کی باتیں کمرے کی مانوس چار دیواری کے اندر بیٹھ کر ہی سکتے ہیں۔ بعض لوگوں پر اس بات چیت میں جذبہ اتنا غالب آ جاتا ہے کہ وہ حقائق سے بہت اونچا اڑنے لگتے ہیں۔ ہم لوگ اپنے اپنے میلان کے مطابق، دل بہلاوے اور تفریح تلاش کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو شور شرابے اور ہلڑ بازی میں مزہ آتا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تفریح زیادہ متین اور سنجیدہ قسم کی ہوتی ہے اور جب ہم اپنی مسرت کے یہ ذریعے ڈھونڈ لیتے ہیں تو مطمئن ہو جاتے ہیں، اور اپنی مسرت میں یہ بھی بھلا دیتے ہیں کہ جوانی گزر کر بڑھاپا قریب آتا جا رہا ہے۔ پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ ان خوشیوں اور تفریحوں سے دل بھر جاتا ہے اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق ہماری پسند، ناپسند اور آرزوئیں تک بدل جاتی ہیں۔ اس وقت دل میں پشیمانی کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے...... پلک جھپکتے میں ہماری گزری ہوئی مسرتوں کے سرچشمے، دور کے ماضی کی دھندلی یادیں بن جاتے ہیں اور ان یادوں میں تاسف اور دلگیری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ چاہے زندگی مختصر ہو یا طویل، اس کا انجام ہر حال میں فنا ہے۔ قدیم داناؤں نے کہا تھا کہ ''زندگی اور موت دونوں عظیم ہیں!''...... کتنا المناک خیال ہے یہ!

میں قدیم زمانے کے لوگوں کی مسرتوں اور ان کے آلام کا اکثر مطالعہ کرتا ہوں۔ میں ان کی تصانیف پڑھتا ہوں اور مجھے فوراً یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل پر بھی، زندگی اور موت کا وہی اثر ہوتا تھا جو ہمارے دلوں پر ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میرے دل پر بڑی اداسی چھا جاتی ہے اور مجھے ان پر بڑا رحم بھی آتا ہے مگر بات واضح نہیں ہو پاتی۔ یہ زندگی کا معما ہے۔ جس کے بارے میں، میں اتنا جانتا ہوں کہ زندگی اور موت کو ایک کہنا اور ایک سمجھنا جھوٹ ہے۔ یہ بھی جھوٹ ہے کہ طویل زندگی اور دنیوی موت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ افسوس یہ ہے کہ آج جس طرح ہم قدیم داناؤں کے مرنے جینے کا خیال کر رہے ہیں۔ کل کو آئندہ نسلیں

یہی کچھ ہمارے بارے میں سوچیں گی۔

اسی خاطر میں نے یہ التزام کیا ہے کہ اس جشن میں جو جو معاصرین شریک ہیں، میں ان کا نام اور ان کے اقوال تحریر میں لا رہا ہوں اگر چہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات بھی بدل جائیں گے لیکن وقت اور حالات جس طرح مسرت اور رنج کے جذبات پیدا کرتے ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

خدا جانے مستقبل کے قاری اس تحریر کو پڑھ کر کیا خیال کریں گے، کیا محسوس کریں گے؟!''

میں سمجھتا ہوں کہ اگر انسان کو اپنے فانی ہونے کا خیال رہے اور اسے یہ احساس رہے کہ ایک نہ ایک دن اس کی زندگی کا شعلہ، شمع کے شعلے کی طرح بجھ کر رہ جائے گا تو یہ بڑی زبردست چیز ہے کیونکہ یہ احساس، ہماری آنکھیں کھول دیتا ہے۔ ہمیں کچھ کچھ غمگین کر دیتا ہے۔ اور ہم میں سے اکثر لوگوں پر شاعرانہ جذبات طاری کر دیتا ہے مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی فنا کے احساس کی بدولت ہم میں معقولیت سے زندگی بسر کرنے، سچائی کے راستے پر چلنے اور اپنی مجبوریوں کو ہمیشہ یاد رکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے دل کو بڑا سکون بھی ملتا ہے کیونکہ صحیح معنوں میں دل کا سکون اسی صورت میں ملا کرتا ہے کہ بدترین بات کو بھی بے چون و چرا مان لیا جائے اور بھیانک سے بھیانک حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے۔ میرا خیال ہے نفسیاتی لحاظ سے یہ سکون اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ اعصابی تناؤ دور ہو جاتا ہے اور جو قوت اس تناؤ پر خرچ ہو رہی تھی اس طرح وہ سکون میں بدل جانے کے لیے آزاد ہو جاتی ہے۔

چینی شعرا اور عام لوگ جب خوشیاں مناتے ہیں تو ان کے دل میں ہمیشہ یہ تحت الشعوری احساس رہتا ہے کہ یہ خوشی دائم و قائم نہیں ہے۔ اس لیے کسی ملاپ اور بڑی فرحت افزا ملاقات کے بعد ان کا یہ عام مقولہ ہوتا ہے: ''اچھا بھائی، بہت بڑا جشن بھی ہو جس کا پنڈال سینکڑوں میل میں پھیلا ہو تو اس کا انجام اور اس کی انتہا آخر کہیں نہ کہیں ضروری ہوا کرتی ہے......!'' گویا زندگی کا یہ جشن سوتے جاگتے کا جشن خواب ہے اور یہی اس کا اصل حسن ہے کیونکہ اس کی خواب نا کی ہی اس میں ایک روحانی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

زندگی کے ساتھ، اگر بقا اور دوام کا جھگڑا نہ رکھا جائے تو جینے کا مسئلہ بالکل ایک سادہ اور آسان مسئلہ بن جاتا ہے۔ ہم انسانوں کو اس زمین پر زندہ رہنے کے لیے محدود مدت دی گئی ہے۔ یہ مدت شاذ و نادر ہی ستر،

اسی برس سے زیادہ ہوا کرتی ہے۔ ہمیں کرنا یہ ہے کہ زندگی کی اس محدود فرصت کو اس طرح ترتیب اور تنظیم دے لیں کہ ایک خاص ماحول میں ہم جہاں تک ممکن ہو مزے سے زندگی گزاریں۔ یہ مسئلہ اس صورت میں عین بعین، کنفیوشسس کی تعلیمات کا ایک عکس بن جاتا ہے۔ اس میں وہی ٹھوس دنیاوی رنگ اور ارضی کیفیت ہے۔ چنانچہ اس سادہ حقیقت کو ماننے کے بعد انسان بڑے استقلال اور بڑی سوجھ بوجھ سے دنیاداری کے کام کاج کرنے لگتا ہے۔ اسی وصف کو امریکی دانشور اور حکیم جارج سنتیانا نے ''حیوانی اعتقاد'' سے تعبیر کیا ہے اور اس حیوانی اعتقاد کے ہوتے ہوئے ہمیں ڈارون کی اس شہادت کی ضرورت نہیں رہتی کہ حیوانوں سے ہمارا رشتہ بڑا محکم ہے۔ اسی ''حیوانی اعتقاد'' کی بدولت ہم زندگی کے رشتے سے وابستہ رہتے ہیں...... وہ زندگی، جو جبلتوں اور حواس خمسہ کی زندگی ہے اور اس وابستگی کی تہ میں بات صرف یہ ہے کہ چونکہ ہم سب حیوان ہیں لہٰذا ہم اسی صورت میں خوش و خرم رہ سکتے ہیں کہ ہماری عام جبلی ضرورتیں سیدھے سادے طریقے پر آسودہ اور مطمئن ہو سکیں۔ اس کا اطلاق زندگی کے ہر پہلو پر ہوتا ہے اور جینے کا مزہ لینے کا کوئی پہلو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

تو پھر کیا ہم لوگ، ہم چینی شدید طور پر مادہ پرست ہیں؟ سچ پوچھیے تو ایک چینی کو اس سوال کا جواب دینا نہیں آئے گا۔ اس کی ساری روحانیت ایک مادی اور ارضی حیات کی بنیاد پر مبنی ہے لہٰذا روح اور جسم کا فرق اور امتیاز اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر چینی، زندگی کے عام آرام اور ضروریات (مثلاً اچھا کھانا، پہننا وغیرہ) کا بڑا قائل ہے مگر یہ چیزیں بھی تو حواس اور احساس سے تعلق رکھتی ہیں۔ باقی رہا جسم اور روح کے امتیاز کا معاملہ، تو جسم اور روح کا فرق صرف ذہن کے ذریعے سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے حواس، جسم اور روح دونوں کے لیے دروازوں کا کام دیتے ہیں (جیسا کہ گزشتہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے)...... موسیقی ہمارے فنون لطیفہ میں سب سے اونچا فن ہے جس کا تعلق روح سے ہے اور جو انسان کو روحانیت کی بلندیوں کی سیر کرا سکتی ہے مگر اس کا سارا دارومدار بھی سننے کی قوت (سامعہ) پر ہے۔ اسی طرح ایک چینی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کھانے کے معاملے میں دو شخصوں کا مذاق ایک سا ہو تو یہ آوازوں کی ہم آہنگی (موسیقی) کی طرف ایک روحانی چیز کیوں نہیں ہے؟ آخر اس ہم مذاقی کا سارا دارومدار بھی تو ایک اور حس، یعنی چکھنے (ذائقہ) پر ہے...... اس حقیقی رنگ میں ہم اپنی محبوبہ کے لیے اپنے دل میں گہرا پیار محسوس کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کی روح اور اس کے جسم میں امتیاز کی ایک حد فاصل قائم کرنا، ناممکن ہے اگر ہمیں ایک

عورت سے محبت ہے تو اس کے خط و خال اور ان خط و خال کی اقلیدسی شکل ہی سے یہ محبت نہیں ہو گی بلکہ ہمیں اس کے انداز، اس کے اطوار، اس کی حرکات و سکنات، اس کے روپ اور چھب، اس کے تبسم سے بھی محبت ہو گی۔ اب کوئی پوچھے کہ محبوبہ کا تبسم ایک روحانی چیز ہے یا جسمانی تو اس کا جواب کون دے سکتا ہے؟

زندگی کی حقیقت اور زندگی کی روحانیت کا احساس، چینی انسان پرستی سے تقویت پاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چینی قوم کا انداز فکر، اور جینے کا ڈھب، دونوں ہی اس احساس کی پشت پناہ ہیں۔ اس لیے چینی فلسفے کی مختصر اور جامع تعریف یہ بتائی جا سکتی ہے کہ چینی فلسفہ، زندگی کے علم میں دلچسپی کا نام ہے۔ سچائی کے عرفان سے اس کا تعلق کچھ کم ہی ہے۔ چینی فلسفی، جینے اور زندگی گزارنے کے سلسلے میں سارے مابعدالطبیعیاتی اندازوں کو غیر متعلق سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ براہ راست زندگی سے ناتا جوڑتے ہیں اور ہمیشہ اپنے آپ سے یہی ازلی اور ابدی سوال کرتے ہیں ''ہمیں زندہ کیسے رہنا ہے؟'' اس لیے مغرب جس چیز کو فلسفہ سمجھتا ہے، چینی قوم کے نزدیک وہ بالکل بیکار چیز ہے۔ مغرب کا فلسفہ منطق کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا ہے اور منطق کا سارا کام یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے طریقوں کا سراغ لگائے۔ مغرب کا فلسفہ، منطق کے علاوہ اس سوال کے چکر سے بھی باہر نہیں نکلا کہ علم حاصل کرنے کے امکانات کیا ہیں۔ اس لیے ان دو چیزوں میں الجھ کر مغربی فلسفہ خود زندگی کے متعلق باتیں معلوم کرنا بالکل فراموش کر چکا ہے۔ زندگی کے حقائق اور زندگی کے عرفان سے مغربی فلسفے کا اب کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اسی لیے مغربی زندگی کو دیکھا جائے تو اس میں سوا مہمل باتوں اور فضول ہوحق مچانے کے اور کچھ نہیں۔ اس میں عشق بازی اور کورٹ شپ کی بھرمار ہے۔ شادی کا کہیں نام نہیں اور لطف یہ ہے کہ بچے بھی پیدا کیے جاتے ہیں اور یا پھر بڑی بڑی فوجیں ہیں، جو مارچ کرتی رہتی ہیں اور جنگ کا منہ نہیں دیکھتیں۔ یہی حال فلسفے کا ہے، اور اس سلسلے میں جرمن فلسفی سب سے بدتر ہیں، ان کی ہرزہ سرائی کا عالم تو یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ بڑے دل پھینک عاشقوں کی طرح اختلاط کرتے رہتے ہیں لیکن شادی کے دوامی ناتے کا نام نہیں لیتے۔

5- قسمت کیا ہے؟

چین میں تاؤ کے قانون فطرت نے بیکار زندگی کا جو درس دیا ہے، اس کا ایک مخصوص پہلو یہ ہے کہ بے مصرف زندگی بسر کرنے والی ذہنیت، بدنصیبی اور خوش بختی، دونوں کی قائل نہیں۔ تاؤ کی بڑی تعلیم یہ ہے کہ

''کرنے'' سے زیادہ اہم ''ہونا'' ہے۔ کام سے زیادہ اہم کردار ہے اور عمل سے اہم تر سکون ہے مگر دلی سکون اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ انسان کو تقدیر کے تھپیڑے نہ کھانے پڑیں اور تقدیر کا الٹا سیدھا چکر اس کی زندگی کو پریشان نہ کرے۔ تاؤ فلسفے کے عظیم مبلغ اور فلسفی لائت زے نے اس سلسلے میں ایک تمثیلی حکایت بیان کی ہے......

''ایک بوڑھا، اپنے بیٹے کے ساتھ ایک ویران قلعے میں رہتا تھا۔ یہ قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ ایک دن اس کا گھوڑا گم ہوگیا۔ اس کے ہمسائے، اظہار ہمدردی کے لیے آئے۔ ان سے بوڑھے نے پوچھا۔ ''بھائیو! آپ کو کیسے معلوم ہے کہ گھوڑے کا گم ہو جانا میری بدنصیبی ہے'' چند دن بعد اس کا گھوڑا، چند جنگلی گھوڑے ساتھ لے کر گھر واپس آ گیا۔ بوڑھے کے ہمسائے اس خوش بختی پر اسے مبارک باد دینے آئے تو بوڑھے نے پوچھا۔ ''آپ کو کیسے معلوم ہے کہ یہ میری خوش بختی ہے؟'' اب اتنے گھوڑوں کے ہوتے ہوئے اس کے لڑکے نے سواری سیکھی، اور ان گھوڑوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ ایک دن گھوڑے سے گر کر لڑکے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہمسائے پھر ہمدردی کا اظہار کرنے آئے تو بوڑھے نے پھر کہا: ''بھائیو! آپ کو کیسے پتا چلا کہ میرے لڑکے کی ٹانگ کا ٹوٹ جانا، بدبختی کی بات ہے؟'' اگلے ہی سال ملک میں جنگ چھڑ گئی۔ چونکہ بڈھے کا لڑکا چلنے پھرنے سے معذور تھا اس لیے اسے میدان جنگ میں نہ بھیجا گیا۔''

ظاہر ہے، یہی فلسفہ جو آدمی میں کچھ سختیاں سہنے کی قوت بھی پیدا کر دیتا ہے کیونکہ اس فلسفے کی بدولت انسان کو پتا چل جاتا ہے کہ ہر سختی اور ہر مشکل کے ساتھ کچھ آسانیاں اور کچھ فائدے بھی ضرور وابستہ ہوتے ہیں۔ ایسا شخص جانتا ہے۔ کہ تصویر کا ایک ہی رخ نہیں ہوتا بلکہ ہر چیز کے دو رخ ہوا کرتے ہیں۔ دل کا سکون حاصل کرنا، زندگی کی فضول بھاگ دوڑ سے گریز کرنا اور دنیاوی کامیابی کو ہیچ سمجھنا، اسی کے لیے ممکن ہے جو زندگی کے اس فلسفے کو پیش نظر رکھے، جو یہ مقولہ سامنے رکھے!

''اسے کچھ پروا نہیں ہوتی، جو کسی چیز کی پروا نہ کرے!''

جو شخص یہ احساس رکھتا ہو کہ ''جو بھی ہوتا ہے، کوئی خوف نہ کر، ہونے دے۔'' اسے دنیاوی کامیابی کی

خواہش نہیں رہتی کیونکہ دنیاوی کامیابی کی خواہش اصل میں ناکامی کے ڈر کا دوسرا رخ ہے۔ کوئی شخص جتنی زیادہ ترقی کرتا ہے اتنا ہی اسے اپنے تنزل کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ گویا ایک طرف شہرت اور کامیابی کے خیالی انعامات ہیں اور دوسری طرف گمنامی کے ٹھوس فائدے۔ آپ کو یہ دیکھنا ہے کہ دونوں میں کون سا پلہ بھاری ہے۔ تاؤ فلسفے کی رو سے تعلیم یافتہ آدمی وہ ہے جو کامیاب ہونے پر یہ یقین نہ کرے کہ اس نے کامیابی حاصل کر لی اور جب ناکام ہو تو اسے اپنی ناکامی پر بھی اعتبار نہ آئے۔ اس کے برعکس نیم خواندہ بلکہ نیم جاہل شخص کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے لیے ظاہری کامیابی یا ظاہری ناکامی، بڑی ٹھوس اور قطعی چیزیں ہوتی ہیں جن سے گویا مفر ہی نہیں چنانچہ بدھ مت اور تاؤ مت میں فرق یہ ہے کہ: بدھ مت کے پیرو کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ اسے کسی کی ضرورت نہ پڑے۔ تاؤ مت کے پیرو کا نصب العین یہ ہے کہ کسی کو اس کی ضرورت نہ ہو۔ کیونکہ جس شخص کی ضرورت پبلک کو نہ ہو وہی شخص رنج و آلام سے آزاد رہ سکتا ہے اور جو شخص رنج و آلام سے آزاد ہو گا وہی خوش باش انسان ہو سکتا ہے۔ اسی لیے تاؤ کے فلسفے کے قابل ترین اور عظیم ترین فلسفی چونگ زے نے برابر یہ تعلیم دی کہ زیادہ ممتاز کبھی نہ بنو۔ زیادہ کام کے آدمی بننے کی کبھی کوشش نہ کرو۔ زیادہ اچھے کارکن بننے سے لازمی طور پر گریز کرو! اس کی بڑی وجہ ہے کہ انہی جانوروں کو دیوتاؤں کی قربانی کے لیے چڑھاتے ہیں جو خوب موٹے تازے ہو جائیں۔ زیادہ خوبصورت پرندوں کو شکاری ضرور شکار کرتے ہیں تاکہ ان کے رنگا رنگ پردوں کو نوچ سکیں۔ اس سلسلے میں چونگ زے نے ایک حکایت بھی لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کفن چوروں نے ایک قبر کھودی کہ کفن اتار لیں اور مردہ نکال لیں۔ انھوں نے ہتھوڑا لے کر مردے کی کھوپڑی توڑی، پھر جبڑوں کی ہڈیاں بھی چور چور کر ڈالیں کیونکہ انھیں کسی نے بتایا تھا کہ اس قبر میں جو مردہ دفن ہے اس کے منہ میں ایک انمول موتی ہے۔ گویا مردے کی بے حرمتی کا سبب صرف یہ ہوا کہ اس نے ایک موتی منہ میں رکھ کر دفن ہونے کی حماقت کی تھی۔

اس سارے فلسفے اور بحث کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ بے کاری اور آزادہ روی کے مزے کیوں نہ لیے جائیں؟

6- تین امریکی عیوب

آپ نے دیکھا، چینی کا فلسفہ زندگی یہ ہے کہ ''جو شخص کسی بات کی پروا نہ رکھے، اسے کسی چیز کی پروا نہیں

ہوتی''، مگر امریکی اور اس چینی فلسفے میں بڑا عجیب تفاوت ہے۔ چینی فلسفہ بار بار یہ پوچھتا ہے کہ کیا زندگی اس زبردست تگ ودو کے قابل بھی ہے کہ ہم اپنی روح کو اپنے جسم کا غلام بنا کر رکھ دیں؟ آزادروی کے فلسفے میں جو اعلیٰ روحانیت پرستی پنہاں ہے۔ وہ اس غلامی کی سخت ممانعت کرتی ہے مگر امریکہ میں معاملہ برعکس ہے۔ اس موقع پر مجھے ایک مشہور امریکی کارخانے کا اشتہار یاد آتا ہے جس میں جلی حروفوں میں یہ لکھا تھا: ''جو چیز تقریباً ٹھیک ہو، وہ ٹھیک نہیں ہوتی'' گویا، امریکی زندگی سو فیصدی کارگزاری اور عمدگی پر جان دیتی ہے۔ میرے نزدیک کارگزاری اور عمدگی کی یہ شدید خواہش کوئی شریفانہ یا معقول بات نہیں۔ امریکیوں نے اپنی جان کو یہ روگ لگا رکھا ہے کہ اگر کوئی چیز ''تقریباً ٹھیک'' (اچھی خاصی) ہو تو وہ اس پر مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ اسے اور بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس چینی قوم کا شیوہ ہے کہ جو چیز ''تقریباً ٹھیک'' کے ضمن میں آتی ہو وہ بالکل ٹھیک سمجھی جاتی ہے۔

اس طرح امریکی قوم کے تین بڑے عیوب یہ ہیں کہ امریکی، اعلیٰ کارگزاری، وقت کی شدید پابندی اور دنیاوی کامیابی پر جان دیتے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے عام امریکیوں کی زندگی تلخ رہتی ہے اور ان کے اعصاب تباہ ہو جاتے ہیں۔ ان تینوں باتوں کی بدولت، امریکی قوم نے اپنے آپ سے فراغت کا ازلی حق چھین رکھا ہے اور فرصت کی خوبصورت اور بیکار شاموں سے اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔ دنیا میں ہمیں یہ سوچ کر زندہ رہنا چاہیے کہ اس دنیا میں کوئی بڑی بپتا، کوئی بڑے مصائب موجود نہیں اور اگر کام کرنا بڑا اعلیٰ فن ہے تو کام نہ کرنا اس سے بھی اعلیٰ فن کی حیثیت رکھتا ہے اگر آپ خطوں کا جواب بڑی پابندی اور باقاعدگی سے دیتے ہوں تو اس کا نتیجہ، مجموعی طور پر، اتنا ہی اچھا یا برا ہوگا جتنا کسی خط کا جواب نہ دینے سے ہو سکتا ہے۔ خط لکھنے نہ لکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خطوں کے باقاعدہ جواب نہ لکھنے سے زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ چند اچھی قسم کی ملاقاتوں اور بری تقریبوں سے بچ بھی تو جائیں گے۔ اصل میں زیادہ تر خطوط اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کا جواب لکھا جائے۔ اس آزمائش کی سادہ سی صورت یہ ہے کہ آپ ان خطوں کو تین ماہ تک اپنے میز کی دراز میں رکھا رہنے دیجیے۔ تین مہینے بعد انھیں نکال کر پھر پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کا جواب لکھنا محض وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ اصل میں، خط لکھنا بھی ایک عیب یا کمزوری بن جایا کرتا ہے کیونکہ خط لکھنے کی بدولت ہی اچھے بھلے ادیب سیلز مین بن جاتے ہیں اور کالجوں کے پروفیسر کاروباری بن

جاتے ہیں۔اسی بنا پر امریکی ناول نگار تھوریو کو ان لوگوں سے نفرت تھی جو بڑی باقاعدگی سے ڈاک خانے آتے جاتے رہتے ہیں۔

میں، کارگزاری اور مستعدی کے خلاف نہیں ہوں۔ اسی کارگزاری کی بدولت دنیا میں قابل اعتماد چیزیں بن سکتی ہیں۔مثلاً میں امریکہ کی ساختہ نل کی ٹونٹی کو زیادہ قابل اعتماد سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے پانی فضول ٹپکتا نہیں رہتا۔اور یہ بڑے اطمینان کی بات بھی ہے۔اصل میں جھگڑا دوسری بات کا ہے۔یہ ایک پرانی للکار ہے کہ ہر انسان کو مفید، کارگزار بننا چاہیے،اسے سرکاری ملازمت حاصل کر کے اختیارات پر قبضہ جمانا چاہیے۔ اس للکار کا جواب بھی اتنا ہی پرانا ہے کہ دنیا میں ایسے احمقوں کی کمی نہیں جو کارگزاری دکھانے پر تلے بیٹھے ہیں، جو مصروف رہنا چاہتے ہیں اور جو اختیارات حاصل کر کے بڑے خوش ہوں گے لہٰذا ہمارے بغیر بھی دنیا کا کام کاج چلایا جا سکتا ہے اور چلتا رہے گا۔نکتہ یہ ہے کہ دانا لوگ کون ہیں؟ وہ جو آزادہ رو اور آزاد منش ہیں یا وہ جو مصروفیت اور کارکردگی پر جان دیتے ہیں؟ گویا، مستعدی اور کارگزاری کے خلاف یہ اعتراض نہیں کہ اس کی بدولت دنیا کے کام کاج ہوتے ہیں۔اعتراض یہ ہے کہ مستعدی اور مصروفیت ہمارے وقت پر ڈاکا ڈالتی ہیں، ان کی بدولت ہمیں فراغت کا ایک لمحہ نصیب نہیں ہوتا، زندگی کا لطف اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی اور یہ معیار کی بہتری اور کام کی عمدگی ہمارے اعصاب تباہ کر دیتی ہیں۔امریکہ میں کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر کو لیجیے، وہ اس فکر میں بال سفید کر لیتا ہے کہ اس کے اخبار یا رسالے کے صفحوں پر طباعت کی کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں چینی ایڈیٹرز زیادہ دانشمند واقع ہوتے ہیں۔وہ اپنے پڑھنے والوں کو اس روحانی خوشی کا موقع دیتے ہیں کہ وہ ان کے اخبار یا رسالے میں کبھی کبھی طباعت کی چند غلطیاں بھی ڈھونڈ نکالیں۔چینی ایڈیٹر تو بعض دفعہ سلسلہ وار ایک ناول چھاپنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر عین درمیان میں ناول کی ایک قسط چھاپنی بھول جاتے ہیں اگر اس قسم کی فروگزاشت امریکہ میں ہو تو امریکی ایڈیٹروں کی شامت آ جائے مگر چین میں یہ کوئی اہم بات نہیں کیونکہ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔امریکی انجینئر کسی دریا کا پل بنائیں گے تو اتنی درستی اور محنت سے حساب لگائیں گے کہ انچ کے دسویں حصے میں بھی بال برابر کا فرق نہ رہ جائے اور اگر دو چینی انجینئر ایک پہاڑ میں دو طرف سے سرنگ کھودنا شروع کریں گے تاکہ درمیان میں آ کر مل جائیں تو دونوں کے دونوں پہاڑ کے آر پار دو سرنگیں کھود لیں گے چینی مزاج کا یہ اعتقاد ہے کہ پہاڑ میں سے سرنگ نکالنی مقصود تھی، سو اب ایک کی بجائے اگر

دوسرنگیں نکل آئیں تو اور بھی اچھا ہے کیونکہ اب ایک کے بجائے دوراستے بن گئے ہیں! اگر کام ختم کرنے کی جلدی نہ ہو تو دوسرنگیں بھی اتنی ہی مفید ہیں جتنی ایک سرنگ ہوسکتی تھی۔ شرط یہ ہے کہ کسی نہ کسی طور پر دوسرنگیں مکمل ہو جائیں اور ان میں سے گاڑی بھی گزر سکے پھر چینی قوم اتنی بے قاعدہ بھی نہیں اگر آپ انھیں کوئی کام کرنے کی کافی مہلت دے دیں تو ہر چینی وقت کی پابندی بھی کرلیتا ہے۔ چینی ہر کام کو گوشوارے کے مطابق ختم کرسکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ کام مکمل کرنے کا یہ گوشوارہ مختصر نہ ہو، ذرا طویل ہو۔

مصیبت یہ ہے کہ صنعتی تہذیب کی بدولت زندگی، شاندار فراغت اور سہل انگاری سے محروم ہوگئی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ صنعتی تہذیب نے وقت کے متعلق ایک مختلف نظریے کو ہم پر سوار کردیا ہے۔ جس کا پیمانہ انسان نہیں بلکہ کل پرزوں سے بنی ہوئی گھڑیاں ہیں۔ یہ گھڑیاں، رفتہ رفتہ انسان کو بھی ایک گھڑی بنا کر دم لیتی ہیں۔ مشرق میں صنعتوں کے پھیلنے سے یہ بات بھی ضرور آئے گی کیونکہ اگر چین میں کوئی ایسا کارخانہ قائم ہو جس میں پورے بارہ ہزار مزدور کام کرتے ہوں تو انھیں اپنی مرضی اور خوشی سے، جب ان کا جی چاہے، کام پر آنے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وقت کا یہ تعین اور یہی پابندی زندگی کو اتنا کٹھن اور اتنا طوفانی بناتی ہے اگر آپ کو ٹھیک پانچ بجے شام کہیں پہنچنا ہو تو آپ کی ساری سہ پہر غارت ہو جائے گی اور ایک سے پانچ بجے تک کا وقت کسی کام نہیں آئے گا مگر امریکی لوگ، دن اور رات کی گھڑیاں اسی طرح مخصوص اور معین کرتے رہتے ہیں، جس طرح ایک سکول کے بچے کا ٹائم ٹیبل بنتا ہے: تین بجے یہ کرنا ہے، پانچ بجے فلاں کام ہے، ساڑھے چھ بجے کپڑے بدلے جائیں گے، سات پچاس پر بس میں سوار ہونا ہے اور پورے سات بجے فلاں ہوٹل میں پہنچ جانا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ اگر جینا یہی ہے تو اس سے تو موت اچھی ہے۔

اس چکر میں امریکی لوگ یہاں تک گرفتار ہیں کہ نہ صرف ان کا کل کا دن بک ہے بلکہ پورے اگلے ہفتے بلکہ سارے مہینے کا پروگرام بھی بنا بنایا تیار ہے۔ چین میں اس کا تصور ہی مشکل ہے۔ چین میں آج سے تین ہفتے بعد ملاقات کا وعدہ ایسی چیز ہے جس کا ذکر کسی نے نہیں سنا۔ چین میں اگر کوئی شخص دعوتی رقعہ وصول کرے تو اسے یہ نہیں کہنا پڑتا کہ میں اس دعوت میں شریک ہوں گا یا نہیں۔ وہ امریکیوں کی طرح دعوتی رقعوں کی منسلکہ فہرست پر یہ لکھ سکتا ہوں کہ میں آؤں گا، یا میں نہیں آسکتا، شکریہ، مگر وہ صرف یہ لکھ دیتا ہے۔ ''اطلاع پائی''......

اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے دعوت مل گئی۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ دعوت میں شامل ہوگا یا نہیں۔ گویا اسے اپنی نیت اور ارادے کا اظہار نہیں کرنا پڑتا۔ ادھر امریکہ اور یورپ کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ آج اگر شنگھائی سے روانہ ہو رہے ہیں تو یہ بڑے یقین کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ آج سے اتنے عرصے بعد، 5 مئی 1955ء کو تین بجے سہ پہر پیرس میں ایک کمیٹی کے جلسے میں شامل ہوں گے، 15 مئی کو سات بجے شام کی گاڑی سے دلی آنا پہنچیں گے۔ میں پوچھتا ہوں اگر ایک سہ پہر کا خون کرنا ہی مطلوب ہے تو اتنی مدت پہلے اس کے خون کا اعلان کرنے کی کیا تک ہے؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک خدا کا بندہ اپنی مرضی سے سفر کرے، جب جی چاہے کہیں ٹھہر جائے اور جب جی چاہے پھر سفر پر روانہ ہو جائے۔

امریکہ کے لوگ، فراغت اور آزادہ روی سے محروم اس لیے ہیں کہ امریکہ میں ہر شخص کام کرنے پر تلا رہتا ہے اور عمل کو زندہ رہنے سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ہمارا مطالبہ تو یہ ہونا چاہیے کہ زندگی میں امتیاز کی شان ہو، اسی طرح جیسے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر عظیم فن پارے میں کوئی خصوصیت، کوئی امتیاز ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے امتیازی شان اور خصوصیت ایسی چیز نہیں جسے شب بھر کی فرصت میں تیار کر لیا جائے۔ پرانی شراب کے جوہر کی طرح زندگی میں امتیازی شان بھی وقت گزرنے سے پیدا ہوتی ہے، سکون سے پرورش پاتی ہے مگر امریکہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی عمر کے مردوں اور عورتوں کو بھی کام کرنے کی دھن سوار رہتی ہے۔ گویا اس طرح وہ اپنی عزت نفس، اور کم عمر لوگوں کا احترام حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یہ بات ایک مشرقی کو بے حد مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے اگر کوئی سن رسیدہ شخص زیادہ کام کرے تو اچھا نہیں لگتا۔ کچھ اس طرح کا احساس ہوتا ہے گویا فلمی گانے یا ناچ کی کوئی دھن شہر کی سب سے بڑی عبادت گاہ سے نشر کی جا رہی ہے کیا یہی کافی نہیں کہ کچھ بوڑھے آدمی دنیا میں موجود ہیں؟ کیا ان کے وجود کی شہادت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہیں؟ ادھیڑ عمر کے شخص کو بھی اگر فراغت اور بیکار زندگی کا سلیقہ نہ ہو یا وہ اس نعمت سے بالکل محروم ہو تو یہی کافی بڑا جرم ہے۔ بڑھاپے میں بے مشغلہ زندگی گزارنے سے محروم رہنا تو انسانیت کے خلاف بہت بڑا جرم ہے۔

اصل یہ ہے کہ کردار کے امتیاز اور خصوصیت کا تعلق ہمیشہ بڑھاپے سے ہوتا ہے۔ اس خصوصیت کو پروان چڑھنے میں وقت لگتا ہے۔ کسی ادھیڑ عمر کے شخص کا چہرہ دیکھئے، اس پر جو لکیریں ہیں وہی اس شخص کے

کردار کے مستقل نقوش ہیں مگر ان لکیروں کے واضح ہونے اور ایک دل کش صورت اختیار کرنے کے لیے کتنا وقت درکار ہوتا ہے؟ ہاں! ان لوگوں میں کردار کی کیا خصوصیت ڈھونڈیئے گا جن کی زندگی چیزوں کو تہ و بالا کرنے میں گزرتی ہے۔ جو ہر نئے سال کے آنے پر گذشتہ سال کی کار کو بیچ کر، نیا ماڈل خریدنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ہم جو چیزیں بناتے ہیں، ان کی ناپائیداری ہم میں بھی سرایت کر جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ 1937ء میں ہر مرد عورت 1937ء نظر آتا ہے اور 1938ء میں ہر شخص 1938ء کی طرح دکھائی دیتا ہے یوں کہنے کو ہمیں پرانی کتابوں، قدیم قلمی نسخوں، پرانے فرنیچر، پرانے چاندی کے برتنوں، پرانی تصویروں، پرانی تاریخی عمارتوں سے بڑی محبت ہوتی ہے مگر اس زندگی کی بھاگ دوڑ میں ہم نے پختہ عمری کے حسن کو بالکل فراموش کر رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں بڑھاپے میں جو حسن ہے، اس کا شعور ہماری زندگی کے لیے بڑا ضروری ہے کیونکہ میرے نزدیک حسن، پختگی، رسیلے پن اور پکے پن کا نام ہے۔

بعض اوقات، ایک پیغمبرانہ رویہ میرے سامنے آتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ آج سے ایک ہزار سال بعد ایک ایسا باسعادت دور آئے گا جب مصروف ترین شہروں میں زندگی کی رفتار سبک اور دھیمی ہو جائے گی اور دھکم پیل اور چھینا جھپٹی کی جگہ فراغت اور آزادہ روی آجائے گی۔ شرفا لمبی عبائیں پہنے، روشوں پر، آرام سے ٹہلتے پھریں گے۔ چوراہے میں جو سپاہی کھڑا ہو گا۔ وہ آہستہ چلنے والے ہر ڈرائیور سے دعا سلام کرے گا۔ خود گاڑیوں کے ڈرائیور، جگہ جگہ کھڑے ہوں کر، ایک دوسرے کی خیر خیریت پوچھا کریں گے اور ساری ٹریفک آرام سے رواں رہے گی۔ کوئی شخص اپنی دکان کے سامنے کھڑا ہو کر دانت صاف کرتا نظر آئے گا اور ساتھ ساتھ ہمسایہ دکاندار سے باتیں بھی کرتا جائے گا۔ کبھی کبھی کوئی عالم بھی آنکلے گا۔ جس نے ایک کتاب موڑ توڑ کر اپنی عبا کی آستین میں ٹھونس رکھی ہو گی۔ آج کی طرح اس باسعادت دور میں، ایسے سرراہ طعام خانے نہیں ہوں گے۔ جہاں لوگ کھڑے کھڑے دوپہر کا کھانا سخت جلدی میں نگلا کرتے ہیں۔ بلکہ مشینوں سے چلنے والے ہوٹل ہوں گے جہاں لوگ نرم اور آرام دہ کرسیوں میں آرام سے نیم دراز رہیں گے اور کھانے کی ہر چیز خود بخود ان کے پاس مشینیں پہنچائیں گی۔ لوگ اس وقت پورا پورا دن چائے خانوں میں آرام سے باتوں میں گزارنے کا فن سیکھ چکے ہوں گے۔ ہر شخص سنگترے کے رس کا ایک گلاس پینے میں پورا آرام دہ گھنٹہ صرف کیا کرے گا۔ لوگ یہ سیکھ جائیں گے کہ شراب، ہلکے ہلکے گھونٹ لے کر پینی چاہیے اور ہر گھونٹ کے بعد اچھی اچھی

باتیں کہنی سننی چاہئیں۔ اب کی طرح نہیں کہ جام اٹھایا اور حلق میں انڈیل لیا۔ اس دور میں ہسپتالوں میں نام لکھوانے کی بدعت نہ ہوگی۔ ہنگامی حادثوں کے لیے فوری امداد کے وارڈ کسی ہسپتال میں نہیں ہوں گے کیونکہ فوری حادثے ہوا ہی نہیں کریں گے اور مریض اپنے ڈاکٹروں کے ساتھ زندگی کے فلسفے پر باتیں کیا کریں گے۔ آگ بجھانے والے انجن، جوں کی چال چلیں گے اور ان انجنوں کا عملہ راستے میں رک رک کر آسمان پر اڑتی ہوئی مرغابیاں دیکھے گا اور آپس میں عملے کے لوگ، مرغابیوں کی تعداد پر بحث کیا کریں گے۔

مگر کیا کیا جائے۔ پرشور شہروں پر اس قسم کا دور سعید آنے کی بظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی اگر یہ دور آ جائے تو لوگوں کو کتنی فارغ اور بے مصرف سہ پہریں زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے مل جائیں!!



آٹھواں باب

گھر گرہست کے مزے

1- جسم کے تقاضے

میرے نزدیک کسی تہذیب کے پرکھنے کا فیصلہ کن امتحان یہ ہے کہ اس تہذیب نے کس قسم کے شوہر، کیسی بیویاں اور کیسے ماں باپ دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں؟ یہ سوال بے حد سادہ ہے لیکن اس کی اہمیت کے سامنے تہذیب کے باقی تمام کارنامے، آرٹ، فلسفہ، ادب، مادی ترقی، سب کے سب ماند پڑ جاتے ہیں۔

میرے جو ہم وطن، مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا مقابلہ کرنے میں سر کھپاتے رہتے ہیں، میں انھیں دوا کی یہی ایک خوراک پلاتا ہوں۔ اور اس سے انھیں فوراً سکون ہو جایا کرتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ مغربی زندگی کے مشرقی طالب علم، چاہے وہ مشرق میں رہتے ہوں یا مغربی ملکوں میں زیر تعلیم ہوں، مغرب کی خیرہ کن مادی ترقی سے بھونچکا رہ جاتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مغربی ملکوں نے طب، طبقات الارض اور فلکیات سے لے کر، آسمان بوس عمارتیں بنانے، شاندار سڑکیں تعمیر کرنے اور قدرتی رنگوں میں تصویریں لینے والے کیمرے تک بنا ڈالے ہیں۔ مشرقی طالب علم یا تو مغربی ملکوں کے ان کارناموں کے گن گاتا پھرے گا یا اسے یہ ندامت دامن گیر ہوگی کہ مشرق اس میدان میں مغرب سے کتنا پسماندہ ہے اور یا دونوں احساس باری باری اس پر غلبہ پاتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ کمتری کے احساس کا خواہ مخواہ شکار ہو جائے گا اور پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ بڑے غرور اور بڑی ہٹ دھری بلکہ سخت تعصب کے ساتھ مشرقی تہذیب کا ترجمان اور وکیل بن جائے گا۔ حالانکہ اسے کچھ پتا نہیں ہوگا کہ اسے کہنا کیا چاہیے اور یہ کہہ کیا رہا ہے اس کے ساتھ ہی ضمنی طور پر مغرب کی آسمان بوس عمارتوں، شاندار سڑکوں اور شاہراہوں میں سو سو کیڑے ڈالے گا۔ (اچھے کیمروں کو برا کہنے والا مجھے آج تک کوئی مشرقی یا چینی نہیں ملا) ظاہر ہے اس بچارے کی حالت قابل رحم ہوگی کیونکہ وہ ٹھنڈے دل سے اور معقولیت کے ساتھ نہ تو مغرب کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے نہ مشرق کے بارے میں کچھ کہہ سن سکتا ہے۔

بس اسے تو کمتری کے خیالات پریشان کریں گے،اس کی آنکھیں چندھیائیں گے،اس کے اندازوں میں رخنہ انداز ہوں گے۔یہی وہ شخص ہے جسے سکون دینے والی دوا کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اس کے دماغ کا بخار کم ہو۔

میں نے تہذیب کی خوبی کا جو امتحان تجویز کیا ہے،اس کا اثر بڑا عجیب ہوتا ہے۔اس امتحان کی بدولت تمام انسان برابر برابر ہو جاتے ہیں۔کیونکہ اس امتحان کی وجہ سے ایک تہذیب اور ثقافت کی تمام غیر ضروری چیزیں (کارنامے!) طاق پر رکھے رہ جاتے ہیں اور ساری انسانیت،اخوت اور برابری کی ایک سادہ سطح پر آ جمع ہوتی ہے۔تہذیب کے باقی تمام کارنامے صرف اسی ایک مقصد کو حاصل کرنے کے ذریعے بن جاتے ہیں کہ یہ تہذیب بہتر شوہر،بہتر بیویاں،بہتر باپ اور بہتر مائیں پیدا کر سکے۔کل انسانوں میں نوے فی صد سے زیادہ شوہر اور بیویاں ہیں اور سو فیصدی انسانوں کے ماں باپ ہوا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ شادی اور گھریلو زندگی کی ایک انسان کی زندگی کا سب سے دلچسپ پہلو ہوتا ہے۔اس لیے یہ ثابت ہوا کہ جو تہذیب بہتر قسم کے خاوند اور بیویاں اور ماں باپ پیدا کر سکے گی وہی،انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنا سکتی ہے۔لہٰذا وہی تہذیب اونچے درجے کی تہذیب گنی جائے گی۔لوگوں کے کام کاج کی اچھائی،برائی سے کہیں اہم بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ ہمیں زندگی بسر کرنی ہے وہ کس قماش اور کس معیار کے لوگ ہیں۔جو تہذیب،ایک نوجوان لڑکی کے لیے بہتر قسم کا شوہر مہیا کر سکے،لڑکی کو اس تہذیب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔میں مانتا ہوں کہ اچھائی ایک اضافی چیز ہے اور ہر زمانے میں ہر ملک میں مثالی قسم کے خاوند،بیویاں،مائیں اور باپ بھی ہوتے ہیں مگر بہتر قسم کے خاوند اور بہتر بیویاں ڈھونڈنے کا غالباً سب سے اچھا طریقہ انسانی نسلیات کا علم ہے کیونکہ اگر اس علم کے ذریعے سے جوڑے ڈھونڈے جائیں تو بیویوں کو تعلیم دے کر اچھی بیویاں بنانے اور شوہروں کو تعلیم دے کر اچھے شوہر بنانے کی زحمت نہیں ہوگی۔اس کے برعکس یہ بھی یاد رکھیے کہ ''نسل کشی'' کے اس انتظام کی بدولت گھریلو زندگی تو معدوم ہو جائے گی اور جو تہذیب گھریلو زندگی سے چشم پوشی کرے یا گھریلو زندگی کو بہت معمولی حیثیت دے وہ گھٹیا قسم کے افراد ہی پیدا کر سکتی ہے۔

مجھے احساس ہے کہ میں کچھ ''جسمانی'' قسم کی باتیں کر رہا ہوں مگر میرا تعلق ہی جسم اور حیاتیات سے ہے اور سچ یہ ہے کہ ہر مرد عورت کا تعلق انہی سے ہوتا ہے۔ہر شخص جسمانی طور پر ہی خوشی،غم،رنج،غصہ محسوس

کرتا ہے۔ ہم چاہے محسوس کریں نہ کریں، ہماری آرزومندی، جاہ طلبی یا حوصلے سبھی جسمانی چیزیں ہیں۔ ہماری مذہب پرستی اور امن پسندی بھی جسمانی ہوتی ہے۔ ہماری بشریت کا تقاضا یہی ہے اور اس حقیقت سے ہم آنکھیں نہیں چرا سکتے کہ ہم جسم اور حیاتیات کے چکر سے نکل نہیں سکتے۔ ہم اس جسم کے ساتھ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں، اس کی چھاتیوں سے دودھ پیتے ہیں۔ پھر بڑے ہو کر شادیاں کرتے ہیں اور اپنے بچے پیدا کرتے ہیں۔ ہر مرد، ایک عورت کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے اور لگ بھگ ہر مرد زندگی بھر ایک نہ ایک عورت کے ساتھ رہتا ہے، لڑکوں اور لڑکیوں کا باپ بھی بنتا ہے۔ ہر عورت بھی عورت کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے۔ قریب قریب ہر عورت، ایک نہ ایک مرد کے ساتھ زندگی گزارتی ہے اور بچے پیدا کرتی ہے۔ بعض لوگ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ماں باپ بننے سے گریز کرتے ہیں مگر اس کائنات میں ایسے درخت اور ایسے پھول بھی تو ہیں جو اپنی نوع کے درخت اور پھول پیدا کرنے کے لیے بیج نہیں چھوڑتے۔ آپ چاہیں تو اپنے بچے پیدا نہ کریں مگر آپ اس بات سے گریز نہیں کر سکتے کہ آپ کے ماں باپ کوئی نہ ہوں۔ کوئی درخت بھی یہ انکار نہیں کر سکتا کہ میں ایک بیج سے پیدا نہیں ہوں گا۔

اس ساری بات کا نتیجہ یہ بنیادی حقیقت ہے کہ زندگی میں سب سے ابتدائی اور بنیادی رشتہ، مرد عورت اور بچے کا رشتہ ہے۔ لہٰذا زندگی کا کوئی فلسفہ اس وقت تک موزوں اور مناسب فلسفہ نہیں کہلا سکتا جب تک وہ اس بنیادی رشتے پر ہر پہلو سے روشنی نہیں ڈالتا۔ بلکہ میں تو ایسے فلسفے کو فلسفہ ماننے سے بھی منکر ہوں۔

مرد اور عورت کا باہمی رشتہ ہی کافی نہیں۔ اس رشتے کی بدولت بچوں کی پیدائش لازمی ہے ورنہ میرے نزدیک مرد عورت کا یہ باہمی رشتہ ادھورا اور نامکمل ہے۔ دنیا کی کسی تہذیب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی مرد یا عورت کو بچے پیدا کرنے کے حق سے محروم کرے۔ مجھے بتایا جاتا ہے کہ آج کل کے زمانے میں بچے پیدا کرنے کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہو گیا ہے اور بہت سے مرد، عورت یا تو شادی ہی نہیں کرتے یا پھر شادی کرنے کے بعد، کسی نہ کسی وجہ سے بچے پیدا نہیں کرتے۔ میں اس بارے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ چاہے بچے پیدا نہ کرنے کی وجہ کچھ ہو اگر اس دنیا سے کوئی مرد یا کوئی عورت، بچے پیدا کرنے کے بغیر چل بسے تو وہ اپنے خلاف دنیا کے سب سے بڑے جرم کے مرتکب ہوں گے اس سلسلے میں بانجھ پن کا بہانہ پیش نہ کیجیے کیونکہ اگر یہ بانجھ پن جسمانی ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ انسانی جسم بیمار اور مفلوج ہے اور اگر یہ بانجھ پن مصنوعی ہے اور اس کی وجہ یہ

ہے کہ زندگی کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے بچے پیدا نہیں کیے جاتے تو پھر یہ مہنگائی غلط چیز ہے اور اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ شادی کا معیار بہت اونچا ہے تو پھر یہ معیار غلط ہے اگر یہ بانجھ پن انفرادیت پسندی کے جھوٹے فلسفے کا پیدا کردہ ہے تو یہ فلسفہ غلط ہے اور اگر یہ بانجھ پن سماجی نظام کا شاخسانہ ہے تو وہ سماجی نظام ہی سرے سے غلط ہے آج نہیں تو آج سے چار پانچ صدی بعد کا ترقی یافتہ انسان مرد اور عورت دونوں یہ اچھی طرح سمجھ لیں گے کہ انسان کی زندگی کا مقصد حیاتیات ہے۔ میں سمجھتا ہوں، یہ بیسویں صدی، حیاتیات کی صدی شمار ہوگی۔ اسی طرح جیسے انیسویں صدی، علوم طبعی کے تقابلی مطالعے کی صدی تھی۔ انسان جب ترقی کرتے کرتے اس منصب کو پہنچے گا کہ وہ اپنے آپ کو بہتر طور پر سمجھ سکے، اپنی جبلی خصوصیات کے خلاف برابر جنگ کرنا چھوڑ دے تو وہ اس قسم کی سیدھی اور موٹی عقل کی باتیں زیادہ آسانی سے سمجھ لیا کرے گا۔ ابھی سے آثار یہ ہیں کہ انسان نے سادگی کی دانائی کو سمجھنے کی کوشش شروع کردی ہے اور وہ حیاتیاتی اور طبی میدانوں میں کچھ ترقی کرنے لگا ہے۔ کیونکہ ہمارے آپ کے زمانے میں ہی مشہور ماہر نفسیات ژنگ امیر طبقے کی بیمار عورتوں کو یہ مشورے دیتا ہے کہ وہ کسی گاؤں میں جا کر رہیں، مرغیاں اور بچے پالیں اور سبزیوں کی کاشت کریں ان امیر عورتوں کا اصل مرض یہ ہوتا ہے کہ وہ جسمانی اور حیاتیاتی طور پر نکمی اور بے ثمر ہو جاتی ہیں یا یہ کہ ان کا حیاتیاتی فعل بہت ادنیٰ درجے کا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ طرح طرح کی اصلی اور خیالی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

مرد، تاریخ کی ابتدا سے لے کر آج تک عورتوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ڈھب نہیں سیکھ سکے۔ حالانکہ کوئی مرد، آج تک عورت کے بغیر اس دنیا میں نہیں رہا اگر ہر شخص یہ حقیقت ذہن میں رکھے کہ ماں کے بغیر وہ دنیا میں پیدا نہ ہوتا تو وہ کبھی عورتوں کے بارے میں حقارت آمیز باتیں نہیں کر سکتا۔ مرد، پیدائش سے لے کر موت تک، عورتوں ہی میں گھرا رہتا ہے۔ عورت کبھی ماں، کبھی بیوی، کبھی بہن، کبھی بیٹی کے روپ میں اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص شادی نہیں کرتا تو بھی اسے انگریز شاعر ولیم ورڈز ورتھ کی طرح اپنی بہن کی رفاقت میں زندگی بسر کرنی ہوگی، یا فلسفی ہربرٹ سپنسر کی طرح اپنے گھر کی منتظمہ کا دست نگر رہنا پڑے گا۔ اگر کوئی شخص اپنی ماں یا اپنی بہن کے ساتھ اچھے تعلقات قائم نہیں کر سکتا تو دنیا کا کوئی فلسفہ اس کی مدد نہیں کر سکے گا اور اگر وہ اپنے گھر کی تنخواہ دار منتظمہ کے ساتھ بھی ٹھیک تعلقات استوار نہیں کر سکتا تو اس پر خدا ہی رحم

کرے۔

جو شخص، عورت کے ساتھ مناسب تعلقات قائم نہیں کر سکا اور جو انگریز ڈرامہ نگار اور شاعر آسکر وائلڈ کی طرح اخلاقی بے راہ روی میں زندگی گزارے، اس کی زندگی بڑی قابل رحم ہوتی ہے۔ آسکر وائلڈ نے کہا تھا: ''عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ناممکن ہے مگر عورت کے بغیر بھی زندگی نہیں گزاری جا سکتی'' اس قول سے مجھے خیال آتا ہے کہ سینکڑوں صدیوں پہلے ایک ہندو رشی نے جو تخلیق کی کہانی لکھی تھی، انسانی عقل و دانش اس کہانی سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ سکی۔ اس کہانی کے وقتوں میں انسانی دانش جس منزل پر تھی، آسکر وائلڈ کے اس مشہور فقرے کے وقت یعنی انیسویں صدی کے آغاز میں بھی، وہیں کی وہیں ہے کیونکہ چار ہزار برس پہلے اس ہندو رشی نے بالکل یہی بات ایک کہانی کے قالب میں کہہ دی تھی۔ تخلیق کی یہ کہانی یوں ہے:

''خدا نے عورت کی تخلیق کے لیے پھولوں کا نکھار، پرندوں کے نغمے، قوس قزح کے رنگ نسیم کی سبک روی، موجوں کی ہنسی، بکری کے بچے کی نرم دلی، لومڑی کی عیاری اور مکاری، بادلوں کی آوارگی اور پھواروں کا تلون، بہم پہنچایا اور ان چیزوں کے خمیر سے عورت پیدا کر کے اسے مرد کے حوالے کیا۔ کہ وہ اسے اپنی بیوی بنائے۔ یہ آدم، اپنی حوا کو پا کر بہت خوش ہوا اور یہ آدم و حوا دونوں خدا کی اس خوبصورت زمین پر سیر کرنے نکل گئے لیکن چند ہی دن بعد آدم خدا کے حضور میں حاضر ہوا اور بولا: ''یہ عورت مجھ سے واپس لے لیجیے۔ میں اس کے ساتھ اب ایک دن بھی بسر نہیں کر سکتا۔'' خدا نے آدم کی یہ عرضداشت سن لی اور حوا کو واپس بلا لیا۔ چند دن گزرے تو آدم پھر خدا کے پاس حاضر ہوا اور بولا: ''میری عورت مجھے پھر عنایت ہو کیونکہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔'' واقعہ یہ ہے کہ ان چند دنوں میں آدم بہت مغموم رہنے لگا تھا، خدا نے اس کی درخواست کو سنا اور اس کی حوا اسے واپس کر دی چند دن بعد آدم پھر خدا کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''مجھ پر کرم کیجیے۔ جس حوا کو آپ نے پیدا کیا ہے، اسے اپنے ہی پاس رکھے'' آپ کی قسم میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا'' خدا نے اپنی لامحدود دانش کے بل پر آدم کی درخواست پھر منظور کر لی۔ آخر چوتھی بار جب آدم خدا کے پاس حاضر ہوا اور یہ شکایت کی کہ وہ اپنے جیون ساتھی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو خدا

نے اس سے وعدہ لیا کہ اب کی بار وہ اپنے قول سے نہیں پھرے گا اور یہ کہ خواہ کچھ ہو اپنی عورت کے ساتھ نباہ کرے گا اور آئندہ دونوں اپنی عقل کے مطابق خدا کی زمین پر اکٹھے زندگی گزاریں گے!''

میں سمجھتا ہوں، آج بھی وہی حال ہے جو چار ہزار سال پہلے کی اس کہانی میں بتایا گیا ہے اور اس کیفیت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی!

2- تجرد اور کنوارپن:

تہذیب کا ایک غیر فطری شاخسانہ

انسانی زندگی کے بارے میں حیاتیاتی نقطہ نظر بڑا سادہ اور بڑا فطری ہے مگر اس کی قبولیت سے دو قسم کی کش مکش پیدا ہوتی ہے، ایک طرف انفرادیت پسندی اور گھریلو زندگی کی کش مکش ہے اور دوسری طرف عقل کی خشک فلسفہ طرازی اور انسانی فطرت کے فلسفے کی کش مکش ہے۔ اس کش مکش کی وجہ یہ ہے کہ انفرادیت پسندی اور خشک عقلی۔ فلسفہ دونوں، انسان کو گھر گرہست کے حسن اور دل کشی سے اندھا بنا دیتے ہیں۔ ان دونوں میں سے ''عقل پرستی'' زیادہ خطرناک چیز ہے۔ ہوسکتا ہے جو شخص انفرادیت کا قائل ہو، اس کے تمام منطقی نتائج پر بھی دسترس رکھتا ہو۔ وہ ساتھ ساتھ ذہن رسا بھی رکھتا ہو اور ذی فہم آدمی ہو مگر جو شخص قطعی طور پر عقل پرستی کا غلام ہو چکا ہو وہ بڑا احمق ہوتا ہے کیونکہ وہ دل اور دل کے جذبات اور ان کے خلوص اور گرمی سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک خاندان کی اجتماعی زندگی کے تو پھر بھی کچھ بدل پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن اگر انسان سے باپ کی شفقت اور ماں کی مامتا، اور بچے پیدا کرنے کی خوشی چھن جائے تو اس کا دنیا میں کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا۔

انسان اس دنیا میں تنہا نہیں رہ سکتا، نہ وہ تنہا رہ کر خوش رہ سکتا ہے۔ انسان زندگی بسر کرنے کے لیے گروہ ڈھونڈتا ہے۔ وہ گروہ جو تعداد کے لحاظ سے اس سے بڑا ہو۔ انسان کا نفس اصلی، اس کے جسم کے مطابق محدود نہیں کیونکہ اس کا ذہن اور اس کی معاشرتی سرگرمیاں محدود نہیں ہوتیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر دور میں، ہر ملک میں اور ہر قسم کی حکومت کے سائے تلے، انسان کی اصلی زندگی اپنے زمانے اور اپنے ملک کی وسیع اجتماعی زندگی کے مقابلے میں اس چھوٹے سے گروہ کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ جو اس کے شناساؤں کا گروہ ہے۔

یہی اس کی ذاتی سرگرمیوں کا حلقہ ہوتا ہے، اسی معاشرتی گروہ میں انسان چلتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اس کا وجود اسی گروہ سے ہے۔ یہ گروہ چاہے کوئی سکول ہو یا قید خانہ، کوئی کاروباری ادارہ ہو، خفیہ انجمن ہو یا کوئی کارخیر کا ادارہ۔ انسان اسی گروہ کی زندگی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ معاشرتی گروہ، گھر اور گھریلو زندگی کی جگہ لے لے یا گھریلو زندگی کو ایک الگ اور مستقل معاشرتی وجود کی حیثیت سے بالکل ہی ختم کر ڈالے۔ بعض اوقات مذہب کی لگن یا کوئی بڑی سیاسی تحریک انسان کی گھریلو زندگی، اس کی کایا کو بالکل نگل لیا کرتی ہے لیکن ان تمام معاشرتی گروہوں میں سے گھر ہی ایسی معاشرتی وحدت ہے جو حقیقی ہے، جس کا وجود فطری ہے، جو ہماری زندگی کا سب سے تسلی بخش، بامعنی اور سب سے درست حصہ ہے۔ گھر کا وجود فطری اس لیے ہے کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک گھر میں پاتا ہے اور پھر گھر ہی، زندگی بھر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ حیاتیاتی طور پر گھر بڑی حقیقی چیز ہے کیونکہ خون کا رشتہ، ایک بڑی برادری اور پھر ایک نفس واحدہ کا تصور سامنے لاتا ہے۔ جو شخص اجتماعی زندگی کے اس قدرتی ادارے میں کامیابی سے زندگی بسر نہیں کرتا، اس سے یہ امید کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ دوسرے معاشرتی گروہوں میں بھی کامیابی سے زندگی بسر کرے گا؟ اس لیے کنفیوشس نے کہا ہے:

> ''بچوں کو یہ سیکھنا چاہیے کہ گھر میں سعادت مندی سے رہیں سوسائٹی میں مہذب ہونا سیکھیں۔ بچوں کو راست باز اور دیانتدار ہونا چاہیے، ہر شخص سے محبت کرنی چاہیے اور اچھے لوگوں میں بیٹھنا اٹھنا چاہیے اگر ان باتوں پر عمل کرنے کے بعد بھی ان میں کچھ ہمت باقی رہ جائے تو پھر انھیں چاہیے کہ کتابیں پڑھیں!''

اجتماعی زندگی کی اس اہمیت سے قطع نظر، انسان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ دوسری جنس کے ایک مناسب فرد کے ساتھ رشتہ استوار کرتا ہے۔ مرد کی شخصیت اسی ہم رشتگی کی بدولت اظہار پاسکتی ہے اور مکمل ہوکر اپنے اوج کمال کو پہنچ سکتی ہے۔

عورتوں میں حیاتیات کا شعور مرد کی بہ نسبت گہرا ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اس حقیقت کو بخوبی جانتی ہیں۔ چنانچہ دنیا کی ہر لڑکی، چاہے چینی ہو یا امریکی، غیر شعوری طور پر اپنی شادی کے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ قدرت نے عورتوں کو اتنا زبردست مادرانہ جذبہ عطا کر رکھا ہے کہ کوئی بھی مصنوعی تہذیب اس جذبے کو پس

پشت نہیں ڈال سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قدرت، عورت کو صرف ماں کی حیثیت سے پیدا کرتی ہے، مرد سے ہم رشتہ ہونے کی حیثیت ثانوی ہے۔ اسی لیے قدرت نے عورت کو ایسی ذہنی اور اخلاقی خصوصیات سے نوازا ہے جو عورت کے ماں بننے کے لیے مفید ہو سکیں۔ یہ ذہنی اور اخلاقی خصوصیات، مامتا کے جذبے میں سموئی گئی ہیں اور یہی جذبہ، عورت کی ان خصوصیات کا سب سے بڑا جواز ہے۔ یہ خصوصیات کیا ہیں؟ حقیقت پسندی، صحیح اندازہ کرنے کی صلاحیت، چھوٹی چھوٹی چیزوں پر پوری توجہ دینے کا ملکہ، چھوٹی اور بے سہارا چیزوں کے لیے ترس کا جذبہ، کسی نہ کسی شخص کو اپنے سایہ عاطفت میں لینے، اس کی خبر گیری کرنے کی شدید خواہش، جسمانی محبت کا وفور، نفرت میں شدت، جذباتی لگاؤ اور لگن دونوں میں من مانی کرنا اور ہر چیز کے بارے میں ذاتی نقطہ نظر قائم کرنا۔ یہ عورت کے مخصوص ذہنی اور اخلاقی امتیازات ہیں۔ کوئی فلسفہ اگر یہ کوشش کرے کہ عورت کے مادرانہ جذبے کا خیال کیے بغیر اس کی زندگی کو خوشگوار بنائے تو سمجھ لیجیے کہ یہ فلسفہ گمراہ اور غلط ہے کیونکہ مادرانہ جذبہ ہی عورت کے کردار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور یہی جذبہ عورت کے وجود کا عملی جواز بھی ہے۔ اسی لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو عورتیں بالکل پڑھی لکھی نہیں ہوتیں یا جن عورتوں کی تعلیم صحیح معنی میں معقول اور عمدہ نہیں ہوتی، ان میں مادرانہ جذبہ کبھی دبا دبایا نہیں ملتا۔ یہ مادرانہ جذبہ ان عورتوں کے بچپن ہی میں ظاہر ہو جایا کرتا ہے اور بلوغ سے لے کر پختگی اور جوانی کے برسوں میں واضح تر اور شدید تر ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس مرد میں پدری جذبہ ہوتا تو ضرور ہے لیکن کوئی 35/30 برس کی عمر تک مرد کو اس جذبے کا شعور نہیں ہوتا۔ کم سے کم جب تک مرد کا کوئی بچہ یا بچی پانچ چھ برس کی نہ ہو جائے، مرد میں شاید ہی پدری شفقت بیدار ہوتی ہو۔ 25 سالہ نوجوان کبھی باپ بننے کی نہیں سوچتا۔ وہ تو صرف کسی لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے اور پھر اس محبت کے بندھن کی بدولت اتفاقی طور پر بچے کا باپ بن جاتا ہے اور اس بچے کے بارے میں بھول جاتا ہے مگر بیوی کے خیالات کا مرکز یہی بچہ ہوا کرتا ہے پھر یکا یک ایک دن ایسا آتا ہے کہ نوجوان باپ 30 برس کی حد گزار چکنے کے بعد یکا یک اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ وہ ایک بچے یا بچی کا باپ بھی ہے جسے وہ اپنے ساتھ لے کر بازار جا سکتا ہے، اسے اپنے دوستوں کے سامنے پیش کر سکتا ہے، اس کی حرکتوں کی نمائش کر سکتا ہے۔ بس یہی وہ موقع ہے جب اس کے دل میں پدری جذبہ یا شفقت جاگتی ہے۔ بیس پچیس برس کے کسی نوجوان کے سامنے اس کے باپ بننے کا ذکر کیجیے تو وہ ہنس پڑے گا۔ وہ اپنے باپ بن جانے کے بارے میں کچھ زیادہ

خیال بھی نہیں کرے گا لیکن عورت کے لیے بچے کی پیدائش یا بچے کے پیدا ہونے کی توقع بھی بڑی اہم ہے۔ غالباً یہ عورت کی زندگی کی اہم ترین بات ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے عورت کی ساری زندگی، اس کا کردار، اس کی عادتیں تک بدل جایا کرتی ہیں اور اس کی ساری شخصیت اس ایک واقعے سے نہایت ہی دور رس اور گہرا اثر لیتی ہے۔ عورت جب ماں بننے والی ہو تو ساری دنیا اس کے لیے ایک مختلف دنیا بن جاتی ہے۔ اس مرحلے پر پہنچ کر اسے یقینی طور پر پتا چل جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اسے دنیا میں کیا کچھ کرنا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اب اس کی زندگی نہایت قیمتی ہے۔ اسی لیے وہ اپنا کام سرانجام دینے، اپنے مشن کو پورا کرنے پر تل جاتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ چین کے امیر خاندانوں کی اکلوتی بیٹیاں جو بے حد ناز ونعمت میں پلی تھیں اور لاڈ پیار نے انھیں کسی کام کا نہ رکھا تھا، حیرت انگیز طور پر عظیم عورتیں ثابت ہوئیں۔ انھوں نے اپنے بچے کی بیماری میں مہینوں پلک سے پلک نہ ملائی۔ کارکردگی کی یہ مثال صرف عورت کے ہاں ملتی ہے کیونکہ نظام فطرت میں پدری جذبہ ضروری نہیں سمجھا گیا نہ اسے مہیا کرنے کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں انسان بھی، بطخ اور راج ہنس کی طرح بس بچے پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنا کام کرتا ہے اور بس۔ اس کے بعد اسے بچوں کی دیکھ بھال میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر عورتوں کو اپنی ہستی کی اس مرکزی قوت، اس مادرانہ جذبے کو عمل میں لانے کا موقع نہ ملے اور اس سے کوئی کام نہ لیا جائے تو عورتیں نفسیاتی طور پر بہت زیادہ تکلیف برداشت کرتی ہیں۔ آپ یہاں امریکی تہذیب کی مثال نہ دیجیے کہ امریکی تہذیب نے عورتوں کو کتنے حقوق اور کتنی آزادی دے رکھی ہے کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ یہی امریکی تہذیب بے شمار اچھی لڑکیوں کو عمر بھر کنوارا رہنے پر مجبور کرتی ہے اور اس میں ان بے چاریوں کا اپنا کوئی قصور نہیں ہوتا۔

امریکہ میں شادیوں کی عدم مطابقت کی بڑی وجہ یہی فرق ہے جو عورت کے مادرانہ جذبے اور مرد کے پدری جذبے کے درمیان پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی نوجوان جذباتی لحاظ سے بڑے خام کار اور غیر پختہ واقع ہوئے ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ حیاتیاتی حقیقت ہے کہ امریکہ کے سماجی نظام میں نوجوانوں کی بڑی آؤ بھگت اور خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ اس لیے ان میں وہ قدرتی احتساب، وہ ضبط نفس نہیں ہوتا جو عورتوں میں مادرانہ جذبے کی بدولت قدرتی طور پر ہوتا ہے اگر ماں بننے والی عورت کو قدرت نے یہ سنجیدگی، یہ تدبر نہ بخشا ہو

تو دنیا تلپٹ ہو جائے اور قدرت نے عورت کو یہ وصف بڑی فیاضی سے بخشا ہے۔ پھر مردوں میں بھی دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ تو غریب خاندانوں کے نوجوانوں کا ہے۔ ان میں ذمہ داری کا جذبہ حالات کی سختی نے بری طرح پیدا کر رکھا ہے۔ دوسرا طبقہ امیر نوجوانوں کا ہے۔ یہی وہ نوجوان ہیں جو جذباتی اور سماجی، دونوں اعتبار سے نکمے لوگ بننے کی پوری صلاحیتیں رکھتے ہیں، اور زیادہ تر شادیوں میں عدم مطابقت انہی لوگوں کی وجہ سے ہے۔

بہرحال اصل سوال تو یہی ہے کہ ''خوشگوار زندگی کیسے بسر کی جائے۔'' یاد رکھیے، زندگی کی ظاہری کامیابیوں اور مصنوعی چمک دمک سے زندگی خوشگوار نہیں بنتی۔ جب تک کسی مرد یا عورت کے کردار اور شخصیت کے داخلی تقاضے آسودہ نہ ہوں اور ان تقاضوں کو زندگی میں موزوں اور مناسب ذریعہ اظہار نہ ملے، زندگی کبھی خوشگوار نہیں ہو سکتی۔ عمر بھر مجرد رہنا، ایک ایسا ذاتی ''کام'' ہے جس میں نہ صرف نمائشی انفرادیت پسندی جھلکتی ہے بلکہ اس کے ساتھ بڑی فضول سی ''عقل پرستی'' بھی وابستہ ہے اور اسی بنا پر، مجرد رہنے کو مردود قرار دینا اور بھی ضروری ہے جو مرد یا عورتیں اپنی خوشی سے عمر بھر کنوارے رہنے کا عزم کر چکے ہوں، میں انھیں ہمیشہ بڑے بیکار عقل پرست سمجھتا ہوں کیونکہ یہ لوگ، اپنے کام دھندوں میں بری طرح کھوئے رہتے ہیں اور بڑی بے وقوفی سے یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے گھریلو زندگی کا ایک تسلی بخش بدل ڈھونڈ لیا ہے۔ یا وہ کسی دماغی کام، کسی فنکارانہ شغل یا کسی کاروباری دلچسپی میں اتنے زیادہ کھو چکے ہیں جیسے اب یہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے اور گویا یہی ان کی زندگی کا واحد تسلی بخش راستہ تھا جو انھوں نے ڈھونڈ نکالا ہے۔

میں اس رویے اور اس خیال کی سختی سے تردید کروں گا۔ انفرادیت پسندی کا یہ نظارہ بے حد احمقانہ اور مضحکہ انگیز ہے کہ کوئی غیر شادی شدہ اور بے اولاد فرد، بھرپور اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے بجائے اس کے ''بدل'' ڈھونڈتا پھرتا ہے، کبھی کام کاج کی پناہ لیتا ہے، کبھی ذاتی کارناموں کی آڑ ڈھونڈتا ہے۔ کبھی جانوروں کو ظلم سے بچانے کو اپنی زندگی کا واحد مقصد قرار دیتا ہے۔ اس کا نفسیاتی کرشمہ اس وقت دیکھیے کہ کنواری بڑھیا عورتیں، سرکس کے شیر کو چابک سے پٹتے دیکھ کر، سرکس کے منیجر پر ''حیوانوں پر ظلم'' کے قانون کے تحت مقدمہ دائر کرنے کی سوچتی ہیں۔ اصل میں ''ظلم'' کے خلاف یہ احتجاج، اس مادرانہ جذبے کا پیدا کردہ ہے جو نہ ٹھیک جگہ میں کام لایا گیا نہ اسے شیر کے سلسلے میں جوش میں آنا چاہیے تھا۔ اس مادرانہ جذبے کا صحیح حقدار سرکس کا شیر

نہیں، انسان کا بچہ (بوڑھی خاتون کا اپنا بچہ) ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ سرکس کے شیر کو دو چار چابک کے تڑاقوں کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ یہی وہ عورتیں ہیں جو زندگی میں ایک غیر مناسب جگہ حاصل کرنے کے لیے ٹامک ٹوئیے مارتی رہتی ہیں اور پھر اس مقام کو اپنے لیے اور دوسروں کے لیے جائز اور مناسب ثابت کرنے کی ناکام کوشش بھی کرتی ہیں۔

اپنے سیاسی، ادبی اور فنی کارناموں کو دیکھ کر، ان کے خالق، دل میں تھوڑا بہت ضرور خوش ہوتے ہیں اور خوشی کی یہ لہر بڑی عقلی قسم کی ہوتی ہے مگر اپنے بچوں کو بڑے ہوتے اور ہاتھ پاؤں نکالتے دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے وہ ناقابل بیان بھی ہے اور بے حد حقیقی بھی۔ کتنے فن کار اور ادیب، بڑھاپے میں بھی اپنی زندگی کے کارناموں سے مطمئن ہوتے ہیں؟ ان میں سے اکثر یہی سمجھتے ہیں کہ ان کی تحریریں، ان کے فنی ''کارنامے'' محض فرصت کے لمحوں کا دل بہلاوا تھے، اور ان کی بدولت چونکہ روٹی بھی ملتی رہی، اس لیے ان کا جواز محض یہی ہے اور کچھ نہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ انگریز فلسفی ہربرٹ سپنسر نے اپنی موت سے چند دن پہلے، اپنی مشہور کتاب ''ترکیبی فلسفہ'' کی اٹھارہ جلدیں بمشکل اپنی گود میں رکھیں، ان اٹھارہ جلدوں کے بے حس بوجھ سے یکا یک اسے خیال آیا اگر ان جلدوں کی جگہ اس وقت میری گود میں میرا پوتا بیٹھا ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ انیسویں صدی کے مشہور انشا پرداز چارلس لیمب کی بہن ایلیا نے اپنے بھائی کی خدمت میں زندگی گزاری۔ اسے بھی کئی بار یہ خیال آیا ہوگا کہ انشا پردازی کے ان شاہکاروں، اس ''اولادِ معنوی'' کے مقابلے میں صرف ایک بچہ، جیتا جاگتا بچہ کہیں گراں مایہ ہو سکتا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ فیاضی اور خدمت خلق کے کارناموں سے بھی دل کو سکون ہوتا ہو گا۔ مثلاً مشہور امریکی کروڑ پتی جان ڈی راک فیلر نے انسان کی بہبود کے لیے جو کچھ کیا ہے اس سے اسے کافی اخلاقی اور روحانی اطمینان حاصل ہوا ہوگا۔ پھر بھی میرے نزدیک یہ روحانی اور اخلاقی اطمینان نہایت معمولی قسم کا ہے۔ کیونکہ راک فیلر کے لیے اصلی اور سچے اور دلی اطمینان کا باعث اس کے بیٹے کی ذات تھی۔

اس نکتے پر ایک اور پہلو سے نگاہ ڈالیے۔ زندگی کی مسرت کا راز یہ ہے کہ آپ اپنے لیے ایسا کام، ایسا کاروبار ڈھونڈ نکالیں جو آپ کی تمناؤں اور صلاحیتوں کے عین مطابق ہو۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کی دنیا میں 90 فیصدی مرد عورت وہ کام نہیں کر رہے ہیں جو انھیں پسند ہے نہ یہ لوگ ایسا کام ابھی تک ڈھونڈ سکے ہیں جو واقعی دل کو محبوب ہو۔ یوں سننے کو ہم نے کئی دفعہ اچھے اچھوں کے منہ سے یہ بڑ سنی ہے۔

''بھئی مجھے تو اپنے کام سے دلی انس ہے'' مگر اس بیان میں سچائی ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ مگر ''مجھے اپنے گھر سے محبت ہے؟'' یہ کوئی نہیں کہتا سنا گیا۔ کیونکہ گھر سے تو ہر کسی کو محبت ہوتی ہی ہے۔ کام کے یہ متوالے اپنے کام پر اسی طرح جاتے ہیں، جس طرح چینی عورتیں بچے جنتی ہیں۔ ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ جب ہر ایک کام پر جا رہا ہے (یا بچے جن رہا ہے) تو پھر میں اور کیا کروں۔ اس کے باوجود ہر شخص یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ مجھے اپنے منصبی کام یا اپنے کاروبار سے شدید لگاؤ ہے۔ یہ بیان بہت سے پیشوں کے سلسلے میں تو بالکل جھوٹ ہے۔ مثلاً ٹیلی فون آپریٹر لڑکیوں اور دندان سازوں کے سلسلے میں یہ کہنا غلط ہے۔ رہا ایڈیٹروں اور جائداد کے بیوپاریوں اور سٹے کا کاروبار کرنے والوں کا معاملہ تو ان کے سلسلے میں اس بیان میں سچائی بہت کم اور مبالغہ بہت زیادہ ہے۔ بس ایک قطب شمالی یا قطب جنوبی کے سیاحوں، یا تجربہ گاہوں میں کوئی نئی ایجاد کرنے والے سائنسدانوں کو چھوڑ دیجیے۔ باقی ہر شخص کے لیے یہی ہوتا ہے کہ اپنے روزگار...... اپنے منصبی کام کو ''پسند'' کر سکے، اس سے اکتائے یا گھبرائے نہیں۔ بہرکیف اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بعض اصحاب اس دنیا میں ایسے بھی ہیں جنھیں اپنے کام کے ساتھ ''محبت'' ہوتی ہے پھر بھی اس محبت کا ماں کی محبت اور مامتا کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں۔ یوں دیکھا یہ ہے کہ عمر بھر بہت سے لوگ، ایک کام چھوڑ کر دوسرا کام اختیار کرتے رہتے ہیں، ایک پیشے سے اکتا کر دوسرے پیشے میں جی لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ انھیں عمر بھر اپنے اصلی کام اور پیشے کے بارے میں شک ہی رہتا ہے مگر کسی ماں کو اپنے منصبی کام کے بارے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ ہر ماں جانتی ہے کہ اس کا کام اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی نگہداشت اور پرورش ہے۔ دنیا میں کامیاب سیاستدان بعض دفعہ، سیاسیات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ کامیاب ایڈیٹر، رسالوں کی ادارت چھوڑ دیتے ہیں۔ اعلیٰ ہوا باز، پرواز سے دست کش ہو جاتے ہیں، اچھے اچھے باکسر، مکابازی ترک کر دیتے ہیں اور تو اور کامیاب ایکٹر اور ایکٹریس تک اپنا محبوب مشغلہ اداکاری چھوڑ دیتی ہیں مگر ذرا ماؤں کا خیال کیجیے، چاہے وہ ناکام مائیں ہوں یا کامیاب وہ ماں ہونا کبھی ترک نہیں کر سکتیں کیونکہ یہ بات ان کی اور دنیا کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی۔ ماں کو یہ پتا ہوتا ہے کہ اب دنیا کو اس کی ضرورت ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ اب اس پھیلی ہوئی زندگی میں اس نے اپنا مقام ڈھونڈ لیا ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ دنیا میں اور کوئی اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ یہ یقین ہٹلر جیسے ڈکٹیٹروں کے اس جنونی یقین سے کہیں پختہ تر ہوتا ہے کہ صرف وہی اپنے ملک کو بچا سکتے ہیں۔ آپ اندازہ کیجیے، اگر کسی مرد یا عورت کو

یہ معلوم ہو کہ زندگی میں اس کا مقام معین ہو چکا ہے تو اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہو گی؟......اس زندگی میں ویسے تو مشکل سے پانچ فی صد خوش نصیب لوگوں کو ایسا کام مل سکتا ہے جو انھیں دل سے بھاتا ہو مگر سو فیصد ماں باپ، اپنے بچوں کی نگہداشت کے کام کو سب سے اہم اور سب سے اولیں اور سب سے پسندیدہ مقصد حیات سمجھتے ہیں......تو پھر کیا یہ کہنا درست نہیں کہ اگر کوئی عورت، ماہر تعمیرات بننے کے بجائے ماں بن جائے تو اسے زیادہ سچی اور حقیقی مسرت مل سکے گی کیونکہ قدرت کا تقاضا یہی ہے اور قدرت کبھی دھوکا نہیں دیتی......اسی طرح کیا یہ دعویٰ بھی درست نہیں کہ عورت کے لیے شادی ہی سب سے بہتر کام ہے؟

میں جانتا ہوں کہ عورتوں کے معاشرتی ''حقوق'' کے حامی اب تک میرے عندیے کو بھانپ چکے ہوں گے۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے ''گھر'' اور گھریلو زندگی کی اہمیت پر اب تک جو جوش بیان صرف کیا ہے، اس سے یہ لوگ سخت پیچ و تاب کھا رہے ہوں گے۔ کیونکہ گھر اور گھریلو زندگی کی ذمہ داریوں کا زیادہ بوجھ عورت پر ہی ہوتا ہے...... میں نے عمداً یہ کہا ہے اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ عورتوں ہی کو گھر اور گھریلو زندگی کی زیادہ ذمہ داریاں اٹھانی چاہئیں! یہ فیصلہ تو بعد میں ہوگا کہ عورتوں پر زیادہ مہربان کون ہے۔ وہ یا میں؟ کیونکہ سارا سوال عورت کی خوشگوار زندگی کا ہے اور دیکھا یہ ہے کہ عورت کو معاشرتی امتیاز حاصل کر کے زیادہ خوشی ہوتی ہے یا اسے اپنی زندگی کے مقصد کی تکمیل سے زیادہ گہری اور پائیدار مسرت حاصل ہوتی ہے اور میرے نزدیک عورتوں کی زندگی کا مقصد گھر گرہست کی ذمہ داریوں کو نباہنا، گھر کو اپنے خاوند اور بچوں اور اپنے لیے راحت کدہ بنانا ہے۔ باقی رہا کام اور منصب کے لیے کسی کی صلاحیت اور موزونی تو اس کا ذکر نہ کیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑے بڑے کاروباری لوگ اور بینکوں کے اعلیٰ منتظم بھی اپنے کام کے لیے حقیقت میں موزوں نہیں ہوتے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ محکموں کے افسر، اکثر نالائق ہوتے ہیں اور کاروباری اداروں کے منتظم نااہل ہوتے ہیں۔ بینکوں والے اپنے کام کے لیے صحیح صلاحیت نہیں رکھتے اور تو اور ملکوں کے صدر بھی اپنے منصب کے لائق نہیں ہوتے مگر نااہل ماں کا وجود بہت ہی نادر ہے۔ یعنی عورتیں، ماں بننے کی پوری طرح اہل ہوتی ہیں اسی لیے وہ ماں بننا چاہتی ہیں اسی لیے میرے نزدیک مثالی عورت وہی ہے جو اپنے مقصد حیات کے ساتھ بھی اتنا ہی پیار رکھے جتنا اسے بناؤ سنگار سے ہوتا ہے اور جو نسائیت کا پیکر ہو، محض عورتوں کے حقوق کی علمبردار نہ ہو۔

یہ واضح رہے کہ ہم، عام مردوں، عورتوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض خواتین بھی

بے حد ذی فہم اور ممتاز شخصیت کی مالک ہوتی ہیں (اسی طرح جس طرح غیر معمولی قابلیت کے مرد بھی ہوتے ہیں) ایسے ہی مردوں، عورتوں کی تخلیقی قوتوں سے دنیا کی حقیقی ترقی ممکن ہوئی ہے مگر ان غیر معمولی لوگوں کو چھوڑ یے، میرا خطاب عام مردوں، عورتوں سے ہے۔ میں اسی لیے عام عورتوں سے کہوں گا کہ شادی ان کے لیے بہترین ''کام'' ہے، اور ان کا مقصد حیات بچے پیدا کرنا اور گھر کا کام کاج کرنا ہے مگر میں ساتھ ہی عام مردوں سے بھی یہ کہتا ہوں کہ آپ کا کام فنون لطیفہ سے سر کھپانا نہیں۔ آپ کا کام اپنے گھر والوں کے لیے روٹی کمانا ہے۔ چاہے آپ حجامتیں بنا کر، بوٹ پالش کر کے یا چور پکڑ کر یا برتنوں کی مرمت کر کے یا کسی طرح روٹی کمائیں۔ شادی شدہ جوڑے کو بچے جننا ہیں، ان کی پرورش کرنی ہے اور پیچش، خسرہ اور دوسری بیماریوں میں ان کی تیمار داری کرنی ہے۔ پھر انھیں اپنی تربیت سے اچھے اور عمدہ شہری بھی بنانا ہے۔ چونکہ مرد، بچے پیدا کرنے کے ناقابل ہیں اور بچوں کی نگہداشت، انھیں نہلانے دھلانے اور انھیں کھلانے پلانے میں بڑے نااہل واقع ہوئے ہیں، اس لیے میں ان کاموں کی توقع عورتوں سے رکھتا ہوں۔ رہا روٹی کا مسئلہ تو مرد روٹی کمائیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان دو کاموں میں سے اچھا اور بہتر کام کون سا ہے؟ بچوں کی پرورش یا لوگوں کے بال کاٹ کر بوٹ پالش کر کے، یا دربانی کر کے روٹی کمانا۔ اگر شوہر بڑی بڑی دکانوں میں دربانی کی خدمت پر مامور ہیں اور ہر آنے جانے والے کے لیے دروازہ کھولتے ہیں تو پھر بیویاں گھروں میں برتن دھونے کی شکایت کیوں کریں؟ کبھی دکانوں میں سیلز مین مرد ہوتے تھے، اب ترقی یافتہ شہروں میں یہ خدمت عورتوں نے سنبھالی ہے اور وہ سمجھتی ہیں کہ گھر کے کام کی بہ نسبت یہ اونچا اور ارفع کام ہے۔ اب بڑے بڑے ہوٹلوں میں لڑکیاں اس خدمت پر مامور ہوتی ہیں کہ گاہکوں کے کوٹ اور ہیٹ وغیرہ سنبھالیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اجنبی مردوں کے ہیٹ اور کوٹ سنبھالنا، اپنے خاوند کی جرابیں رفو کرنے سے کیوں اعلیٰ کام ہے؟ اصل میں جس کام سے روٹی ملتی ہو وہ گھٹیا یا بڑھیا ہوتا ہی نہیں۔ وہ تو محض روزگار ہے اور بس مگر گھر پر شوہر کے پرانے موزے رفو کرنے والی عورت اور ہوٹلوں میں دوسرے مردوں کے ہیٹ اور کوٹ سنبھالنے والی عورت میں بڑا فرق ہے۔ موزے رفو کرنے والی عورت، اپنے میاں کی قسمت کی مالک ہوتی ہے اور ہوٹل میں دوسرے مردوں کے ہیٹ اور کوٹ سنبھالنے والی عورت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ آپ کسی مرد کو دعا کے طور پر زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کرے ایسا قابل شوہر ہو کہ اس کی بیوی، اس کی جرابیں محنت اور محبت سے رفو کرے مگر آپ یہ اصول نہیں

وضع کر سکتے کہ شوہر کی جرابیں رفو کرنا، عورت کی شان کے شایان نہیں۔ آخر سب کے سب خاوند اتنے برے بھی نہیں ہوتے۔ گویا اصل بات یہ ہے کہ گھریلو زندگی نہایت اہم ہے اور اس کا مقدس کام، نئی نسلوں کی غور و پرداخت ہے۔ یہ فرض کر لینا کہ گھریلو زندگی اور بچوں کی پرورش کا مقدس فریضہ عورت کی شان کے شایان نہیں، کوئی معقول اور قابل قبول معاشرتی رویہ نہیں۔ یہ رویہ صرف اس تہذیب کا ہو سکتا ہے جو عورت اور گھریلو زندگی اور عورت کے ماں بننے کے حق کا کوئی احترام روا نہ رکھتی ہو۔

3- جنسی کشش

امریکہ میں عورتوں کے حقوق، اور ان کی معاشرتی مراعات کا بڑا چرچا، بڑا شور ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس دکھاوے کے باوجود جدید امریکہ میں عورتوں کو ان کے جائز حقوق و مراعات حاصل نہیں ہیں۔ خدا کرے میرا یہ اندازہ غلط ہو اور میری دعا یہ بھی ہے کہ خدا کرے عورتوں کے حقوق بڑھ جانے سے عورتوں کے لیے ہمارا احترام اور ہماری حمایت کم نہ ہو۔ امریکہ نے عورتوں کو اعلیٰ عہدوں پر متمکن کیا ہے، عورتوں کو روپیہ پیسہ خرچ کرنے کی آزادی دی ہے، انھیں گھومنے پھرنے اور ووٹ دینے کی آزادی اور حق بھی دیا ہے مگر یہ حقوق اور چیز ہیں اور عورتوں کے لیے دل میں سچا احترام اور چیز ہے۔ میں پرانی دنیا (مشرق) کا باشندہ ہوں۔ میرا نقطہ نظر بھی پرانی دنیا کا نقطہ نظر ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ زندگی میں ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو اہم نہیں ہوتیں اور ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جنھیں اہم کہا جاتا ہے۔ چنانچہ میں دیکھتا ہوں کہ امریکی عورتیں، پرانی دنیا کی عورتوں سے ان چیزوں میں کہیں آگے ہیں جو بالکل غیر اہم ہیں اور جو چیزیں اہم ہیں ان کے سلسلے میں امریکی عورتوں کا وہی حال ہے جو پرانی دنیا کی پسماندہ عورتوں کا ہے۔ یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ امریکہ میں مشرق کی بہ نسبت عورتوں کا احترام اور ان کی قدر زیادہ ہے۔ امریکی عورتوں کو حقیقی طور پر اگر کچھ اختیار حاصل ہے تو وہ ان کی روایتی مملکت یعنی گھر میں ہے اور گھر کے اندر ابھی تک امریکی عورت بھی فرشتہ رحمت ہے۔ میں نے امریکہ میں ایسے نسوانی پیکر دیکھے بھی ہیں مگر ان کا وجود صرف گھروں کی مقدس فضا کے اندر ملتا ہے جہاں عورت باورچی خانے اور دیوان خانے میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں وہ ایسے گھر کی مالکہ ہے جو محبت سے معمور ہے اور یہ گھر کی مالکہ اپنی شفقت اور لگن سے گھر کی فضا میں ایسی روشنی بکھیرتی ہے جو گھر سے باہر، مثلاً کسی دفتر میں، نظر نہیں آ سکتی اور شاید آنی بھی نہیں چاہیے۔

تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت گھریلو لباس میں دفتری لباس کی بہ نسبت دل کش اور پرکشش ہوتی ہے؟ یا یہ محض میرا خیال ہے؟ میں سمجھتا ہوں اس مسئلے کا خلاصہ یہ ہے کہ گھر میں عورت اسی طرح خوش ہوتی ہے جس طرح مچھلی پانی میں۔ آپ کسی عورت کو کاروباری یا دفتری لباس پہنا دیجیے، مرد اسے عورت نہیں، محض ایک ساتھی کارکن سمجھیں گے، اور اس کے کام کاج پر نکتہ چینی کو بھی اپنا حق جانیں گے مگر اسی عورت کو آپ نفیس جارجٹ یا شفون کا لباس پہن کر دفتر کے سات گھنٹوں میں صرف ایک گھنٹہ سامنے آنے دیجیے تو مردوں کی سٹی گم ہو جائے گی۔ وہ کام کے میدان میں اس سے مقابلے کا خیال چھوڑ دیں گے، ٹکر ٹکر دیکھیں گے اور دم نہ ماریں گے۔ دفتری نظام میں آ کر عورتیں دفتری نظم و ضبط کو آسانی سے قبول کر لیتی ہیں مگر جونہی دفتری کام کا ماحول ختم ہوا اور عورتیں، دفتری ماحول سے نکل کر اپنے مرد ساتھی کارکنوں کے ہمراہ کسی نیم سرکاری سی دعوت میں آئیں تو عورتیں دفتری کارکن نہیں رہتیں بلکہ عورت بن جاتی ہیں۔ وہ اپنے ساتھی مرد کارکنوں کو یا اپنے افسروں کو مشورہ دیتی نظر آتی ہیں کہ نئے بوٹ خریدیں، یا بال جلد کٹوا لیا کریں، یا سر کی خشکی دور کرنے کے لیے فلاں فلاں لوشن استعمال کیا کریں۔ گویا دفتروں میں عورتیں ادب آداب سے بات کرنے کی پابند ہوتی ہیں لیکن دفتر سے باہر وہ اختیار اور تحکم سے بات کر سکتی ہیں۔

صاف بات یہ ہے کہ عورتوں کا گھر سے باہر آ کر عام زندگی میں کھلے بندوں پھرنے سے زندگی کی دلکشی اور زندگی کی آسانیوں میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ میں نے یہ بات مرد کے نقطہ نظر سے عرض کی ہے اور سچ یہ ہے کہ یہ بات بحیثیت مرد کہی جا سکتی ہے۔ جب سے عورتیں دفتروں اور بازاروں میں نکل آئی ہیں، بازاروں کا شور و غوغا کم ہو گیا ہے۔ دفتروں میں میز کرسیاں زیادہ صاف رہنے لگی ہیں۔ لباس اور ماحول میں زیادہ نکھار سا پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرا یہ بھی دعویٰ ہے کہ جنسی کشش یا جنسی کشش کی خواہش میں شمہ برابر بھی فرق نہیں آیا اور امریکہ میں تو مردوں کے مزے ہیں۔ کیونکہ امریکی عورتیں، روز بروز مردوں کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کا مقابلہ ذرا چینی عورتوں سے کیجیے تو معلوم ہوگا کہ چینی عورتوں کی بہ نسبت امریکی عورتیں اپنی فطری جنسی کشش میں مزید دل کشی پیدا کر کے مردوں کو خوش کرنے کی سعی کرتی ہیں۔

اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مغرب کے لوگ، جنسی معاملات کے بارے میں تو بہت زیادہ سوچتے ہیں مگر عورتوں کا بہت کم خیال کرتے ہیں۔

مغربی عورتیں بھی بال سنوارنے میں غالباً اتنا ہی وقت صرف کرتی ہیں جتنا کبھی مشرقی عورتیں کیا کرتی تھیں۔ مغربی عورتیں، بڑی آزادی سے کھلے بندوں اپنا میک اپ کرتی ہیں، ہر وقت اور ہر جگہ چہرے کے بناؤ سنگار میں مصروف رہتی ہیں۔ مغربی عورتیں کھانے پینے میں سخت احتیاط کرتی ہیں۔ جسم کی مالش کراتی ہیں اور جسم کو ٹھیک رکھنے کے بارے میں دنیا جہان کے اشتہارات کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اپنی کمر پتلی رکھنے کے لیے صبح و شام بستر پر لیٹ لیٹ کر ٹانگیں چلاتی ہیں اور اس عمر میں پہنچ کر بھی اپنے چہرے ٹھیک رکھنے اور بالوں کو رنگنے کی کوشش کرتی ہیں جہاں ایک مشرقی عورت، ان آرائشوں کا خیال بھی نہیں کر سکتی مغربی عورتیں، دنیا کی ساری عورتوں کے مقابلے میں لوشن اور خوشبوؤں پر زیادہ روپیہ صرف کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ حسن کی آرائش، دن اور رات کو لگانے والی کریموں، جلد صاف کرنے والی کریموں، پاؤڈر کی تہ جمانے والی کریموں، فیس کریموں، ہاتھوں کی کریموں، مسام صاف کرنے والی کریموں، لیموں کی کریموں، سورج کی تمازت سے بچانے والی کریموں، جھریوں سے بچانے والی کریموں اور تیل اور ہر قسم کے خوشبودار تیل کا جتنا بڑا اور زبردست کاروبار امریکہ اور مغرب میں ہے، اور کہیں نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی عورتوں کے پاس ان آرائشوں پر خرچ کرنے کے لیے روپیہ اور وقت دونوں وافر ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ امریکی عورتیں، لباس پہنتی تو اس لیے ہیں کہ مردوں کو خوش کریں اور لباس اتارتی اس لیے ہیں کہ اپنے آپ کو خوش کریں۔ ہوسکتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو، یا یہ دونوں باتیں ہی تہ میں کارفرما ہوں۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ مشرقی عورتوں کو حسن کی آرائش کا اتنا سامان ملتا نہیں۔ کیونکہ جہاں تک مردوں کو لبھانے کی خواہش کا تعلق ہے یہ سب قوموں میں یکساں ہے۔ یہ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ ابھی پچاس ساٹھ برس ادھر کی بات ہے کہ چینی عورتیں اپنے پاؤں بچپن سے بندھوا دیتی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں ننھے منے پاؤں مردوں کو خوش کر سکتے تھے۔ لیکن اب یہی چینی عورتیں چھوٹے جوتے پہننے کے بجائے اونچی ایڑی کے مغربی جوتے پہنتی ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ بہت جلد چینی عورتیں بھی صبح کو دس منٹ ٹانگیں چلا چلا کر ورزش کیا کریں گی تاکہ ان کی زیادہ مناسب جسموں کو دیکھ کر ان کے شوہر خوش ہوسکیں یا وہ خود زیادہ خوشی محسوس کر سکیں۔

مگر اس کے باوجود، یہ حقیقت وہیں کی وہیں موجود ہے کہ آج کل امریکہ کی عورتیں، اپنے جسموں کی جنسی کشش میں اضافہ کر کے، مردوں کو خوش کرنے کی زیادہ سرتوڑ کوشش کر رہی ہیں۔ وہ جو لباس پہن رہی

ہیں، اس میں بھی جنسی کشش کے راز کا پورا شعور جھلکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پارکوں اور بازاروں میں جو عورتیں نظر آتی ہیں، ان کے جسم سڈول ہوتے ہیں، ان کے لباس بہتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ عورتیں دن کا بڑا حصہ اپنے جسم کی درستی اور آرائش پر صرف کرتی ہیں۔ مردوں کے لیے یہ بے حد دلخوش کن بات ہے مگر جنسی کشش کی ان مسلسل کوششوں سے عورتوں کے اعصاب پر کتنی تھکن سوار ہوتی ہوگی؟ اس کا اندازہ مشکل ہے پھر بھی جنسی کشش کو میں عورت کے ماں بننے کی کشش کے مقابلے میں ایک مخالف طاقت سمجھتا ہوں اور اسی طاقت نے موجودہ زمانے کی محبت اور شادیوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

آرٹ نے جدید زمانے کے انسان کو جنس کے معاملے میں زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔ پہلے تو آرٹ نے عورت کے جسم کے خطوط اور قوسیں بار بار پیش کیں، اب کاروباری دنیا نے بھی عورت کے جسم کے ہر ابھار، ہر گولائی اور ہر خط اور ہر حنائی ناخن تک کو اپنے اشتہار کے لیے پیش کیا ہے۔ عورت کے جسم کے ہر حصے سے کاروباری اشتہاروں نے ہر ممکن فائدہ اٹھایا ہے اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ امریکی عورتوں نے کس طرح ہنستے کھیلتے، اپنے جسم کو کاروباری اشتہار بازوں کی ہر جائز و ناجائز نفع اندوزی کے حوالے کر دیا ہے۔ مشرقیوں میں عورت اور عورت کے جسم کے لیے جو احترام موجود ہے اس کے پیش نظر ایک مشرقی یہ مشکل سے برداشت کرے گا کہ عورت کے جسم سے اشتہار باز اس طرح فائدہ اٹھائیں مگر عورت کے جسم کی اس حد سے بڑھی ہوئی نمائش اور پیش کش کو مغرب کے آرٹسٹ حسن سے تعبیر کرتے ہیں۔ تھیٹر دیکھنے والے اسی عریانی کو آرٹ کہتے ہیں۔ صرف تھیٹر کے منیجر اور پروڈیوسر اس چیز کو جنسی کشش کے سادہ نام سے یاد کرتے ہیں۔ باقی رہے عام مرد تو وہ اس نمائش جسم سے مزہ لیتے ہیں اور بس۔ مردوں کے بنائے ہوئے سماج، مردوں کے تابع سماج کا یہ خاصہ ہے کہ کاروباری اشتہارات کے لیے کاروبار کو چمکانے کے لیے عورتوں کو تو عریاں کر کے پیش کیا جائے اور چند بازی گروں کو چھوڑ کر، سارے کے سارے مرد کبھی کپڑے نہ اتاریں۔ سٹیج کا تماشا دیکھیے تو یہاں بھی عورتیں ہی قریب قریب نیم عریاں پیش ہوں گی۔ حالانکہ دیکھنے والے مرد پورے ڈریس میں کوٹ ٹائی کے ساتھ، بیٹھے تماشا دیکھیں گے اگر اس معاشرے پر عورت کی حکمرانی ہوتی تو آپ ہمیشہ مردوں کے نیم عریاں جسم دیکھتے اور عورتیں ہمیشہ پورے لباس میں نظر آتیں۔ ہمارے آرٹسٹ عورت اور مرد، دونوں کے جسموں کا مطالعہ کرتے ہیں مگر کسی مرد کے خوبصورت جسم کی تصویر بنا کر انھیں کاروباری لحاظ سے کوئی فائدہ اٹھانے میں بڑی دقت ہوتی

ہے۔ایسے تھیٹر بھی ہیں جن کے اسٹیج پر لڑکیاں آ کر ناچتے ناچتے اپنے جسم پر کا ایک ایک کپڑا اتارتی جاتی ہیں۔ سنا ہے کہ یہ تھیٹر لڑکیوں کے کپڑے اس لیے اتر واتا ہے کہ مردوں کو ذرا دق کیا جائے مگر یہ تھیٹر عورتوں کو دق کرنے کے لیے کسی مرد رقاص کے کپڑے اتر وانے کا اہتمام کیوں نہیں کرتے؟ آخر عورتیں بھی تو تھیٹر دیکھنے آئی ہوئی ہیں۔ خیر یہ ذرا عام پسند تھیٹر ہیں۔ اعلیٰ قسم کے تھیٹروں میں کھیل عام طور پر ایسا ہوتا ہے جس میں فنکارانہ حسن بھی ہو اور جو اخلاقی لحاظ سے بھی قابل اعتراض نہ ہو مگر ان کھیل تماشوں میں بھی فنکارانہ حسن عورت کے ذمے ہوتا ہے اور اخلاقی پہلو مرد کرداروں کے ذمے ہوتا ہے۔ یہ تھیٹر کبھی عورت کو اخلاقی پہلو کا ترجمان اور مرد کو فنکارانہ حسن کا مظہر بنا کر پیش نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورتیں بے چاری آرٹسٹک ہونے کو اپنا فرض سمجھنے لگی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنا جسم ٹھیک رکھنے کے لیے فاقے کرتی ہیں، مالشیں کراتی ہیں، اور بڑے نظم وضبط، کسرت اور پابندی کو اپنا شعار بناتی ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے کہ خوبصورت اور دل کش نظر آئیں اور دنیا کے حسن میں اضافہ کر سکیں۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ ذرا کم سمجھ بوجھ والی عورتیں یہ یقین رکھتی ہیں کہ مرد کو قابو میں رکھنے کا واحد طریقہ جنسی کشش ہے اور کچھ نہیں۔

میرے خیال میں جنسی کشش اور دلربائی پر حد سے بڑھی ہوئی یہ توجہ ظاہر کرتی ہے کہ عورت کی فطرت کے بارے میں انسانوں کا انداز نظر بڑا ناپختہ اور بے حد ادھورا ہے۔ اس انداز نظر کا اثر محبت اور شادی پر بھی پڑا ہے۔ چنانچہ شادی اور محبت دونوں کے بارے میں ہمارے خیالات بھی یا تو بالکل غلط ہیں یا بے حد ناپختہ ہیں۔ عورت اور جنسی کشش کو ایک چیز سمجھ لینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عورت کو گھر کی مالکہ تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ اسے محض زینت آغوش سمجھا جاتا ہے۔ عورت، بیوی اور ماں دونوں ہے لیکن جنس اور جنسی کشش پر جس طرح زور دیا جا رہا ہے اس کی بدولت، عورت کے ماں ہونے کا تصور دب جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ تصور رہ جاتا ہے کہ عورت، بس بستر کی زینت ہے۔ میں پھر عرض کروں گا کہ عورت اپنے اوج کمال کو اس وقت اور صرف اس وقت پہنچتی ہے جب وہ ماں بنتی ہے جو بیوی، ماں بننے سے انکاری ہو جائے وہ اپنے وقار، اپنی تمکنت کا بڑا حصہ کھو بیٹھتی ہے۔ وہ یہ خطرہ بھی مول لیتی ہے کہ اسے محض ایک دل بہلاوے کی چیز، ایک کھلونا سمجھا جائے میرے نزدیک، بچوں کے بغیر، ہر بیوی ایک داشتہ کے برابر ہے اور جو داشتہ آپ کے بچوں کی ماں ہو وہ بیوی کے رتبے کی حقدار ہے۔ چاہے قانونی پہلو کچھ ہو، بچوں کا وجود داشتہ کی ہستی کو بھی مقدس اور ارفع بنا دیتا ہے۔

اور بچوں کا نہ ہونا، ایک بیوی کو بھی اس کے رتبے سے گرا دیا کرتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ آج کل بہت سی عورتیں اس لیے بچے پیدا کرنے سے گریز کرتی ہیں کہ بچوں کی پیدائش سے ان کے جسم بگڑ جائیں گے۔

زندگی کو بھرپور بنانے میں، محبت اور اختلاط کے جذبے کا بھی ہاتھ ہوتا ہے لیکن یہی بات اگر حد سے بڑھ جائے تو خود عورت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو جنسی لحاظ سے پرکشش اور دل کش بنانے کا سارا بوجھ عورت کے اعصاب پر پڑتا ہے۔ مرد اس بار سے قطعی بے نیاز ہے۔ اس کے علاوہ جنسی دل کشی کی اس مارامار میں بڑا عیب یہ ہے کہ اس کی وجہ سے جوان اور خوبصورت عورتوں کو ہر لحاظ سے، ہر جگہ ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے، ادھیڑ عمر کی عورت کو جوان نظر آنے کے لیے سو سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔ سفید بالوں اور بڑھتی ہوئی عمر کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ مقابلہ کتنا بے سود ہوتا ہے۔ اسی لیے چینی شاعر کہتا ہے کہ ''جوانی ایک سراب، ایک دھوکا ہے اور کوئی شخص سورج کو رسی باندھ کر کھڑا نہیں کر سکتا نہ وقت کی گردش کو روک سکتا ہے'' گویا ادھیڑ عمر کی عورتیں اپنی جنسی کشش کو برقرار رکھنے کے لیے جو جتن کرتی ہیں، وہ گزرتی ہوئی عمر کو باندھ کر روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ وقت کی برق رفتاری پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو بالکل فضول اور بے کار ہے...... ایسے موقعوں پر تو صرف زندہ دلی اور خوش مذاقی آڑے آتی ہے اگر بڑھاپے کے خلاف بے کار جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں تو پھر سفید بالوں کو ہی کیوں نہ خوبصورت کہا جائے...... چنانچہ چوٹو کہتا ہے:

> ''میرے سر پر بہت سے سفید بال آ گئے ہیں، کئی دفعہ انھیں نوچ نوچ کر پھینکتا ہوں مگر ان کی جگہ اور سفید بال نکل آتے ہیں تو پھر سفید بالوں کا نوچنا چھوڑ کیوں نہ دوں؟ انھیں انہی کے حال پر کیوں نہ رہنے دوں؟ آخر سفید بالوں کا مقابلہ کرنے کا وقت کس کے پاس ہے؟''

اصل میں جوانی اور جنسی کشش برقرار رکھنے کی ساری کوشش فضول ہے۔ یہ ماؤں اور ذرا بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ سخت بے انصافی بھی ہے۔ آج کے چمپئن مکا باز کو کل کسی جوان تر حریف کے لیے میدان خالی کرنا پڑتا ہے۔ آج جو گھوڑا دنیا کی سب سے بڑی گھڑ دوڑ میں اول رہا، دو چار برس میں اس سے کم عمر گھوڑا اسے مات دے دے گا۔ بڑی عمر کی عورتیں بھی کم عمر عورتوں کے خلاف یہی ''ہار'' کی لڑائی لڑتی ہیں اور یہ تو

سوچیے کہ یہ حریفانہ مقابلہ وہ اپنی ہم جنسوں، اپنی بہنوں کے ساتھ ہی کرتی ہیں۔اسی لیے ادھیڑ عمر کی عورتوں کے لیے یہ بات بڑی خطرناک، بڑی احمقانہ اور بالکل بے سود ہے کہ وہ جسمانی دل کشی کے معاملے میں کم عمر عورتوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لیں۔ یہ بات اس لیے بھی احمقانہ ہے کہ عورت صرف جسمانی دل کشی اور جنسی کشش ہی کا نام نہیں۔عورت میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ پھر عورت کے دل کو جیتنا اور اسے اپنا بنانا یہ سب کچھ، جسمانی خواہشوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔اس میں جسم کی دلربائی ہی کارفرما ہے۔ چنانچہ پختہ کار مردوں اور سنجیدہ عورتوں کو تو جوانی کے اس کھیل سے بالاتر ہو جانا چاہیے۔

جانداروں کی دنیا میں، انسان ہی وہ جاندار ہے جس میں شہوانی جذبات سب سے زیادہ ہیں لیکن ان جذبات کے ساتھ ساتھ انسان کو بچوں کے ساتھ شدید محبت کا جذبہ بھی دیا گیا ہے۔یہی جذبہ انسان کی گھریلو اور خاندانی زندگی کی بنیاد ہے۔شہوانی جذبات اور بچوں کے ساتھ لگاؤ کی خصوصیت اور بھی کئی جانوروں میں موجود ہے مگر انسان کے سلسلے میں زیادہ خطرہ یہ ہے کہ انسان کی عاشق مزاجی گھریلو زندگی کے جذبے پر بری طرح چھا جائے کیونکہ ایک ایسی پرتکلف تہذیب اس کے اردگرد موجود ہے جو اپنے آرٹ، اپنی فلموں، اپنے تھیٹر کے ڈراموں کے ذریعے سے اس کے لیے ہر قدم پر جنسی ہیجان اور تحریک مہیا کرتی ہے۔ایسی تہذیب میں گھریلو زندگی کی مثالی زندگی سمجھنے کی ضرورت فراموش ہو سکتی ہے۔خصوصاً اس صورت میں کہ ہر طرف انفرادیت پرستی کا دور دورہ ہو۔اس لیے ایسے معاشرے میں ہمیں شادی کا عجیب تصور ملتا ہے۔ایسے معاشرے کے نزدیک شادی، نام ہے کورٹ شپ کی لمبی چوڑی چوما چاٹی کا، جو شادی کے شادیانوں پر ختم ہو۔ایسے معاشرے میں عورت کے بارے میں بھی عجیب تصور ہے کہ عورت، مرد کی جنسی ساتھی ہے اور بس۔عورت کو اس معاشرے کی نظر، ماں کے روپ میں نہیں دیکھ سکتی۔اس معاشرے کے نزدیک مثالی عورت وہ ہے جو بالکل نوخیز ہو جس کا جسم سانچے میں ڈھلا ہو اور جس میں جسمانی کشش کوٹ کوٹ کر بھری ہو مگر میرے نزدیک، عورت اسی وقت خوبصورت معلوم ہوتی ہے جب وہ بچے کے گہوارے کو جھلا رہی ہو۔عورت اسی وقت سنجیدگی اور وقار کا مجسمہ ہوتی ہے جب وہ بچے کو دودھ پلا رہی ہو یا چار پانچ سال کے بچہ کو انگلی سے لگائے جا رہی ہو۔ عورت، اسی وقت سچی مسرت کی تصویر ہوتی ہے جب وہ بستر پر لیٹ کر، اپنے دودھ پیتے بچے کے ساتھ کھیل رہی ہو۔یہی چیز میں نے ایک مشہور مغربی تصویر میں بھی دیکھی ہے۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں، ماں کے بارے

میں شدید قسم کے نفسیاتی الجھاؤ کا شکار ہوں۔ ممکن ہے یہ ٹھیک بھی ہو۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ نفسیاتی الجھاؤ، چینی لوگوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے آپ اگر یہ کہہ دیں گے کہ فلاں چینی فلاں فلاں نفسیاتی الجھاؤ کا مریض ہے تو مجھے اس بات پر ہنسی آئے گی۔ اسی لیے میں یہ عرض کروں گا کہ عورت کے بارے میں میرے یہ خیالات کسی نفسیاتی الجھاؤ کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ ان کی بنیاد وہ نصب العین ہے جو گھر گرہست کے سلسلے میں چینی قوم کے سامنے ہر وقت رہتا ہے۔

4- چینی گھر کی تصویر

کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ بائبل کی کتاب پیدائش میں کائنات اور انسان کی تخلیق کی جو کہانی بتائی گئی ہے اسے نئے سرے سے لکھا جانا چاہیے۔ چینی ناول ''سرخ شبستان کا خواب'' کا ہیرو ایک نوجوان لڑکا ہے جو بے حد جذباتی ہے۔ اسے عورتوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بڑا پسند ہے۔ اپنی خوبصورت رشتہ دار لڑکیوں پر وہ جان چھڑکتا ہے۔ اسے یہ افسوس کھائے جاتا ہے کہ میں لڑکی کیوں نہ ہوا۔ یہ لڑکا، ایک دفعہ انہی جذبات کی رو میں کہہ اٹھتا ہے۔ ''عورت، پانی سے تخلیق کی گئی اور مرد، مٹی سے'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے خیال میں اس کی رشتہ دار لڑکیاں، ساری کی ساری، بڑی اچھی، بڑی پاکیزہ اور بے حد زیرک ہیں اور وہ خود اور اس کے ساتھی لڑکے، اس کے خیال میں، بڑے کم رو، بڑے بدصورت اور سخت بدمزاج ہیں۔ چنانچہ چینی ناول نویس پاؤیو کے قول کی روشنی میں، کتاب پیدائش میں ''آدم وحوا'' کی تخلیق کی کہانی یوں ہونی چاہیے تھی:

> ''خدا نے مٹھی بھر کیچڑ لے کر اسے انسان کی شکل دی، پھر اس بت کے نتھنے میں خدا نے اپنی روح پھونکی اور آدم زندہ ہوا لیکن بہت جلد آدم ٹوٹنے پھوٹنے لگا۔
>
> خدا نے تھوڑا سا پانی لیا، اور آدم کے بت کی مٹی کو پھر سے پانی ملا کر گوندھا یہ پانی، جو آدم کے پیکر میں داخل ہوا تھا، حوا کہلایا اور حوا کو اپنے پیکر میں پا کر ہی آدم کی زندگی مکمل ہوئی!''

میرے نزدیک شادی کی کنایاتی اہمیت یہی ہے۔ عورت پانی اور مرد مٹی۔ پانی مٹی کے رگ وپے میں سرایت کرتا ہے، مٹی میں نرمی اور لچک پیدا کرتا ہے۔ مٹی پانی کو گرفت میں رکھتی ہے اور اسے وہ وجود عطا کرتی ہے جس میں پانی چلتا ہے، زندہ رہتا ہے اور اپنی ہستی کی تکمیل کرتا ہے۔

چینی مصور چاؤ منگ فو کی بیوی مادام کوآن نے (جو خود بھی مصور تھی) پانی اور مٹی کی اس مثال کو، انسانی

شادیوں کے ضمن میں بڑی خوبصورتی سے ایک نظم میں بیان کیا ہے۔ اس وقت اس کا شوہر مصور چاؤ ادھیڑ عمر کا ہو چکا تھا۔ مادام کی جوانی بھی رخصت ہو رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ چاؤ کا ذوق وشوق کچھ ٹھنڈا پڑ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب کہیں سے ایک داشتہ مہیا کرے۔ مادام کوآن نے یہ نظم لکھ کر شوہر کو دی جس سے اس کے دل پر بڑا اثر ہوا اور وہ اپنے ارادے سے باز رہا:

تم میں اور مجھ میں
بہت زیادہ پیار ہے
اس کی بدولت
دم گھٹنے لگا ہے
تھوڑی سی مٹی لو
اسے گیلا کرو، اسے تھپتھپاؤ
اپنا بت بناؤ
میرا بت بناؤ
پھر انھیں چھوڑ دو، انھیں توڑ دو
اور تھوڑا سا پانی ملاؤ
اسے گوندھو، اسے خوب گوندھو
اور اپنا بت بناؤ
اور میرا بت بناؤ
اب میرے بت میں تمہارے بت کی مٹی بھی شامل ہے
اب تمہارے بت میں میرے بت کی مٹی بھی شامل ہے
اب ہمیں کوئی جدا نہ کر سکے گا
جب تک زندہ ہیں، ہم ایک ہی لحاف اوڑھ کر سوئیں گے
جب مر جائیں گے تو ایک ہی قبر میں دفن ہوں گے۔

یہ مشہور بات ہے کہ چینی معاشرہ اور چینی زندگی کا نظام، گھرانے اور خاندان کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہ چیز چینی زندگی کی مجموعی طرز پر اثر ڈالتی ہے اور رہنے سہنے کے سارے طور طریقے اسی کے تابع ہیں مگر آپ پوچھیں گے کہ چینی قوم کے لیے گھریلو زندگی اور خاندان کا نصب العین کیسے معین ہوا؟...... یہ سوال کم کم پوچھا جاتا ہے کیونکہ چینی تو اپنے اس معاشرتی نظام کو طے شدہ بات سمجھتے ہیں۔ جس میں شک شبے یا سوال جواب کی گنجائش ہی نہیں اور باہر کے لوگ، جو چینی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں، وہ اس سوال میں الجھنے کی اہلیت محسوس نہیں کرتے۔ تاہم مشہور یہ ہے کہ کنفیوشس نے یہ کہنے کے لیے اپنی تعلیمات میں ایک فلسفیانہ بنیاد قائم کی تھی کہ گھریلو زندگی ہی معاشرتی زندگی اور سیاسی زندگی کی بنیاد ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بیوی اور شوہر کا رشتہ بے حد اہم رشتہ ہے اور یہی رشتہ سارے انسانی رشتوں کی بنیاد ہے۔ کنفیوشس نے یہ بھی تلقین کی تھی کہ ماں باپ کی مکمل فرمانبرداری بچوں کا فرض ہے، ہر سال اپنے بزرگوں کی قبروں پر جانا چاہیے، اپنے بزرگوں کی پرستش کرنی چاہیے اور ایک آبائی اور جدی ایوان بنانا چاہیے۔

بعض ادیبوں نے چینیوں کی، بزرگوں کی پرستش کی، ایک مذہب قرار دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ خیال کافی حد تک درست ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس سلسلے میں چینی کی پرستش میں مافوق فطرت کے عنصر کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی چینی، عیسائی، بودھ یا مسلمان بھی ہو۔ پھر بھی وہ اپنے اعتقادات کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی یہ پرستش جاری رکھ سکتا ہے۔ اس پرستش کے اپنے رسوم ہیں اور یہ اپنی جگہ ایک قسم کا دین ہے۔ یہ رسوم اپنی جگہ جو فطری بھی ہیں اور جائز بھی کیونکہ ہر عقیدے کے لیے کوئی ظاہری رسم اور قاعدہ ہونا لازمی ہے۔ چینی اپنے بزرگوں کے مزاروں پر پندرہ انچ لمبی لکڑی کی جو تختی لگاتے ہیں یہ احترام ہی کی نشانی ہے۔ یہ اسی طرح کا عقیدہ ہے جیسے برطانوی ٹکٹوں پر برطانوی بادشاہ یا ملکہ کی تصویر شائع کر کے ان کا احترام کیا جاتا ہے۔ بزرگوں کی روحوں کو دیوتا نہیں بلکہ بزرگ انسان سمجھا جاتا ہے اور ان کی اسی طرح خدمت کی جاتی ہے جس طرح ان کے بڑھاپے میں موت سے پہلے ان کے بال بچے کیا کرتے تھے۔ ان بزرگوں کی روحوں سے مال و دولت نہیں مانگا جاتا، نہ ان روحوں سے بیماروں کو اچھا کرنے کی منت مانی جاتی ہے۔ گویا عبادت گزار اور معبود کے درمیان جو سودا بازی عام طور پر ہوتی ہے وہ اس سلسلے میں بالکل نہیں ہوتی۔ پرستش کی یہ رسم محض اس قدر ہے کہ ایک مقررہ دن پر سارے کنبے والے اکٹھے ہوتے ہیں، مرحوم بزرگوں کو عقیدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں

اور اس بات کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ مرحوم نے خاندان کے لیے کیا کچھ کیا تھا۔ یوں دیکھنے میں یہ رسم، جیتے جی اس بزرگ کی سالگرہ منانے سے کہیں پھیکی نظر آتی ہے لیکن اس کی تہ میں وہی عقیدت اور احترام کا گہرا جذبہ کارفرما ہے جو مثلاً امریکہ میں ماں کا دن منانے کے سلسلے میں ہوتا ہے۔

بزرگوں کی پرستش کی اس رسم میں جو اجتماعی دعوتیں اور جشن ہوتے ہیں، مسیحی مشنریوں اور مبلغوں نے چینی عیسائیوں کو ان میں شامل ہونے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ انھیں یہی اعتراض ہے کہ اس رسم میں ہر شخص کو اپنے مرحوم بزرگ کی قبر کے چوبی کتبے کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکنا پڑتا ہے اور یہ عیسائیت کے دس احکام میں سے پہلے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ میرے نزدیک یہ عیسائی مشنریوں کی سخت بھول ہے۔ وہ اس رسم کی ماہیت سمجھ ہی نہیں سکے۔ اول تو یہ کہ چینی لوگوں کے گھٹنے اتنے ''قیمتی'' نہیں ہیں جتنے مغربی قوموں کے ہیں۔ چینی تو اسی طرح دوزانو ہو کر اپنے بادشاہوں، اپنے حاکموں کو سلام کرتے ہیں اور ہر نوروز کو اگر ماں باپ زندہ ہوں تو ان کے سامنے بھی دوزانو ہو کر آداب بجالاتے ہیں۔ اس لیے چینی گھٹنوں میں زیادہ لچک ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ لکڑی کی ایک کندہ تختی کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے سے کوئی کافر تو نہیں ہو جاتا پھر بھی گاؤں اور شہروں میں، چینی مسیحیوں کو اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ انھیں اجازت نہیں ہوتی کہ بزرگوں کی پرستش کے موقع پر اجتماعی دعوتوں اور جشن میں شرکت کر سکیں۔ اس موقع پر جو کھیل تماشے ہوتے ہیں، چینی عیسائی ان کے لیے چندہ بھی نہیں دے سکتے۔ گویا وہ بے چارے اپنے کنبے برادری سے خود بخود باہر ہو جاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اکثر اوقات اپنے خاندان کے لیے احترام اور روحانی عقیدت کا جذبہ، ایک مذہبی جذبہ بن جاتا ہے۔ اس کی مثال ین یوآن کی زندگی ہے جو سترہویں صدی میں کنفیوشس فلسفے کا سب سے بڑا رہنما تھا۔ بڑھاپے میں ین ایک لمبے سفر پر نکل کھڑا ہوا تاکہ اپنے گمشدہ بھائی کو ڈھونڈ نکالے۔ اس کا اپنا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس سفر کی صعوبتیں اس نے محض اس لیے اٹھائیں کہ شاید اس گمشدہ بھائی کا ہی کوئی لڑکا ہو۔ کنفیوشس فلسفے کا یہ عظیم علمبردار، شہرزی چوآن میں رہتا تھا۔ اس کا عقیدہ اور تعلیم یہ تھی کہ علم سے عمل ارفع ہے۔ اور اس کا بھائی کئی برسوں سے بے پتا تھا۔ کنفیوشس کی تعلیمات کا درس دیتے دیتے وہ ایک دن اکتا گیا اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے گم شدہ بھائی کا کھوج نکالے (صوفی لوگ اس خواہش کو خدائی امر کہیں گے)

مگر اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کا بھائی کہاں ہوگا اور وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ان دنوں سفر کرنا بڑا دشوار اور خطرناک کام تھا کیونکہ منگ خاندان کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور ملک میں ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی مگر یہ باہمت بڈھا اپنے اس ''مذہبی'' سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ جہاں جاتا، شہر کے دروازوں اور شہر کی سراؤں پر اپنی غرض کا اشتہار لگا دیتا۔ اسی طرح اس نے مغربی چین سے لے کر شمالی مشرقی چین کے علاقوں تک ہزارہا میل کا سفر طے کیا اور کئی سال اس تلاش میں گزر گئے۔ اتفاقاً اس کے بھائی کے بیٹے نے ایک عام پیشاب خانے میں جاتے وےئے ایک شخص کا چھاتا دیکھا جس پر اس کے خاندان کا نام لکھا تھا اور یہ نوجوان اس بوڑھے مسافر کو گھر لے آیا۔ اس کا بھائی عرصہ پہلے مر چکا تھا مگر فلسفی ین یوآن نے اپنی منزل پالی۔ اس نے آخر اپنے بزرگوں کے خاندان کو چلانے کے لیے اپنے اسلاف کا نام زندہ رکھنے کے لیے، ایک جانشین ڈھونڈ ہی لیا۔

کنفیوشس نے بزرگوں سے بچوں کی اس سعادت مندی پر اتنا زور کیوں دیا ہے؟ اس کا ٹھیک جواب شاید کوئی نہیں دے سکتا پھر بھی ڈاکٹر جان سی ایچ وو نے اپنے گراں پایہ مقالے ''حقیقی کنفیوشس'' میں یہ لکھا ہے کہ کنفیوشس چونکہ خود باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے اسے بزرگوں سے بچوں کی سعادت مندی میں بڑی بات نظر آتی تھی اگر کنفیوشس کے بچپن میں اس کا باپ زندہ ہوتا تو پدری منصب کے بارے میں اس کے خیالات اتنے رومانی اور اتنے پر احترام نہ ہوتے اور اگر اس کی جوانی میں بھی اس کا باپ زندہ ہوتا تو شاید نتیجہ اور بھی خراب ہوتا۔ اس صورت میں اسے اپنے باپ کے تمام نقائص اور سارے عیوب معلوم ہو جاتے اور اسے پتا چلتا کہ باپ کے سامنے ایسی بے چون و چرا سعادت مندی، عملی طور پر محال ہوگی خیر یہ تو خیالی باتیں ہیں، حقیقت اس قدر ہے کہ کنفیوشس کے پیدا ہونے سے پیشتر ہی اس کا باپ مر چکا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کنفیوشس کو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ باپ کی قبر کہاں ہے۔ اصل میں وہ اپنے ماں باپ کی جائز اولاد نہیں تھا۔ اسی لیے اس کی ماں نے اسے یہ بتایا ہی نہیں کہ اس کا باپ کون تھا۔ جب اس کی ماں کا انتقال ہوا تو کنفیوشس نے نہ معلوم کس جذبے کے ماتحت اسے ''پانچ بزرگوں کی شاہراہ'' پر دفن کیا پھر جب ایک بڑھیا نے اس کے باپ کی قبر کا نشان بتایا تو اس نے اپنے ماں باپ کو ایک جگہ ساتھ ساتھ دفن کرنے کا انتظام کر دیا۔

ڈاکٹر جان سی ایچ وو کا نظریہ آپ کے سامنے ہے۔ اس پر میں کچھ نہیں کہوں گا مگر چین میں گھریلو زندگی اور گھرانے کو جب نصب العین ٹھہرایا گیا ہے اس کے بارے میں چینی ادب میں دلائل اور وجوہ کی کوئی کمی

نہیں۔ پہلا قدم یہ ہے کہ انسان ایک خودکفیل فرد کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ گھرانے یا خاندان کے رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی زندگی کو سدا رواں چشمے سے تشبیہ دی جائے تو زندگی کے جاری و ساری رہنے کا نظریہ، اس نصب العین کی پشت پناہ ہے اور اس کے جواز کے لیے فلسفہ موجود ہے کہ انسان کی تکمیل کی منزل یہ ہے کہ اس کے فطری جذبات، اس کی جبلت کی تسکین ہو۔ یہی چیز ہے۔ جسے ساری اخلاقیات اور ساری سیاسیات کی آخری منزل قرار دیا گیا ہے۔

گھریلو زندگی اور خاندان کا یہ نصب العین فرد کی ذاتی انفرادیت کا سخت مخالف ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی شخص فرد کی حیثیت سے مکمل طور پر تنہا زندگی بسر نہیں کرتا۔ ایسے فرد کا وجود، خیالی ہے حقیقی نہیں اگر کسی فرد کو کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی یا کسی کا باپ یا کم سے کم کسی کا دوست نہ سمجھا جائے تو پھر وہ ہے کیا؟...... یہ فرد تو محض ایک تصور ہوگا لیکن چینی تو جسم اور حیاتیات کو ایک لحظے کے لیے بھی فراموش نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ ہر شخص کے حیاتیاتی رشتوں کا پہلے خیال کرتے ہیں۔ گویا خاندان اس صورت میں ہماری زندگی کی سب سے مقدم حیاتیاتی اکائی ٹھہرا۔ اس صورت میں ایک شخص کی شادی بھی اس کا ذاتی مسئلہ نہیں رہتی۔ بلکہ سارے خاندان کا ایک اجتماعی مسئلہ بن جاتی ہے۔

میں نے اپنی کتاب میرا وطن اور میرے ہم وطن میں یہ بھی بتایا ہے کہ زندگی پر چھا جانے والے اس گھریلو نظام زندگی میں خرابیاں کیا کیا ہیں۔ اس نظام کی غالباً سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ایک خاندان، ایسی اجتماعی خودغرضی کا قالب اختیار کر لیتا ہے جس سے ملک کو نقصان پہنچنے کا بڑا احتمال ہوسکتا ہے مگر اس قسم کی خرابیاں تو ہر انسانی نظام میں ہوں گی۔ یہ خرابیاں گھریلو نظام زندگی کے علاوہ انفرادیت پسندی اور مغربی وطن پرستی میں بھی موجود ہیں کیونکہ انسانی فطرت ہی ایسی ہے۔ چین میں آدمی کی ہستی، مملکت اور حکومت دونوں سے اعلیٰ اور اہم مانی جاتی ہے لیکن اسے ایک خاندان سے اعلیٰ اور اہم نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ خاندان سے علیحدہ ان کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہوتا۔ باقی رہی وطن پرستی، تو اس کی خرابیاں موجودہ یورپ میں دیکھ لیجیے۔ اسی جذبے کا کرشمہ ہے کہ ایک ملک ایسا عفریت بن جاتا ہے (جیسا کہ آج بھی بعض ملک ہیں) کہ فرد کی آزادی گفتار، اس کے مذہبی عقائد اور نظریات، اور آن اور عزت تک چھین لیتا ہے، حتیٰ کہ وہ فرد کے پاس اس کی مسرت بھی نہیں رہنے دیتا جو اس کا آخری سہارا ہے۔ ایسے اجتماعی نظریات کے جو نتیجے ہوسکتے ہیں وہ فاشزم اور اشتراکیت

دونوں نظریوں سے ظاہر ہیں۔ بلکہ اشتراکیت کے کارل مارکس نے تو یہ نتائج بڑے منطقی طریقے پر پیش بھی کر دیئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکسی ریاست کا آخری مقصد یہ ہے کہ پدری اور مادری جبلت کو سرے سے فنا کر دیا جائے۔ کمیونسٹ مینی فسٹو نے تو یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس مارکسی ریاست میں کنبے اور اعزہ کی محبت اور عزیزوں کی باہمی وفاداری کو بورژوا جذبہ قرار دیا گیا ہے، اس کی کھلے بندوں مذمت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ آج سے مختلف مادی حالات میں ایسے جذبات کا سرے سے وجود نہیں ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ کارل مارکس نے کس بنا پر یہ نتائج اخذ کیے اور اس نے یہ کیسے اندازہ کیا کہ حیاتیات انسانی میں یہ مرحلہ بھی کبھی آ سکتا ہے۔ اسے معاشیات ضرور آتی تھی مگر غالباً وہ عقل سلیم سے زیادہ بہرہ ور نہیں تھا۔ یہ تو کوئی سکول کا لڑکا بھی اندازہ کر سکتا ہے کہ انسان کی جبلت اگر لاکھوں برس سے ترقی کر رہی ہو تو اسے ختم کرنے کے لیے دو چار ہزار برس کی مدت بہت ہی کم ہے لیکن مارکس کی دلیل یہی تھی اور یہی عجیب سی دلیل، مغربی ذہنوں کو بالکل منطقی معلوم ہوتی ہے۔ یہ نظریہ کہ انسان کچھ مشینی قسم کے قوانین کے ماتحت طبقاتی کش مکش میں گرفتار ہے قدرتی طور پر انسان کو عملی آزادی اور عقیدے کی انفرادی آزادی سے محروم کر دیتا ہے۔ گویا آزادی کے اس انتہا پسندانہ نظریے کے مطابق بھی انسان کو اتنی آزادی نہیں ہوتی۔ جتنی گھریلو نظام میں مل سکتی ہے۔

لہٰذا مغرب کی انفرادیت پسندی اور وطن پرستی کے مقابلے میں گھریلو زندگی کا نصب العین موجود ہے۔ اس نظام کے ماتحت کسی شخص کو فرد نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک خاندان کا رکن گردانا جاتا ہے۔ یہ رکن، گھریلو زندگی کے عظیم دھارے کا ایک ضروری حصہ بھی ہے اور میں نے ''زندگی کے رواں دواں دھارے'' کے جس نظریے کا ذکر اوپر کیا ہے اس سے میرا مطلب یہی ہے۔ اس کے مطابق ساری انسانی زندگی کو ایک بڑا دریا سمجھیے جو مختلف نسلوں کی زندگی کی الگ الگ ندیوں پر مشتمل ہے۔ ایک انسان اس زندگی کے دھارے کا وہی حصہ دیکھتا ہے جو اس کے اپنے کنبے پر مشتمل ہو۔ اسی کو وہ بلاواسطہ محسوس بھی کر سکتا ہے۔ ''شجرہ نسب'' کا تصور، مشرق و مغرب دونوں جگہ ہے۔ اس شجرے میں ہر شخص کا وجود ایک شاخ یا ایک شاخ کی کونپل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شاخ، خود سارے شجرے کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہوتی ہے جس طرح درخت کی شاخ، اپنے تنے کے ساتھ پیوستہ رہتی ہے۔ شجرے کی یہ شاخ شجرے کے جاری رکھنے کی ضامن ہوتی ہے۔ اس کی افزائش اور پھلنے پھولنے میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس لیے انسانی زندگی کی مثال مستقبل نشو و نما یا تسلسل اور دوام سے دی جا سکتی ہے۔ ہر شخص

زندگی میں اپنے حصے کا کام کرتا ہے۔ یہ کام خاندان کی تاریخ میں ایک باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس باب میں وہ ذمہ داریاں شامل ہیں جو انسانی زندگی پر ایک کنبے کی مجموعی زندگی کی طرف سے عائد ہوتی ہیں اور انسانی زندگی اپنے کام یا اپنے نکمے پن کی بدولت، اپنے آپ کے لیے اور کنبے کی مجموعی زندگی کے لیے کلنک کا ٹیکا بنتی ہے یا دونوں کی عزت افزائی کا باعث بنتی ہے۔

چینی زندگی میں مل جل کر کام کرنے یا اجتماعی زندگی کے شعور کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہر چینی کو گھریلو زندگی کا بڑا پاس ہوتا ہے اور خاندان کی عزت اور ناموس اسے بے حد عزیز ہوتی ہے...... ایک خاندان ایک ٹیم ہے، کنبے کے ہر فرد کا یہ فرض ہے کہ زندگی کے اس کھیل کو اتنی اچھی طرح کھیلے جتنی کوئی اور ٹیم کھیلتی ہے۔ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنی ٹیم (کنبہ) کے کھیل کو ترقی دے۔ ایک نالائق بیٹا، اپنے کنبے کے لیے اسی طرح ندامت کا باعث بن سکتا ہے۔ جس طرح ایک ٹیم کا فل بیک جو گیند پاس آنے پر حریف کو روک نہیں سکتا اور اپنی کوتاہی کے باعث گیند آگے نکل جانے دیتا ہے۔ اور جو بیٹا سول سروس کے تمام امیدواروں میں اول رہتا ہے وہ اس کھلاڑی کی طرح ہے جو اپنی ٹیم کے لیے گول کرتا ہے اس میں اس کی اپنی کامیابی اور شان بھی ہے اور اس کے کنبے کی عزت افزائی بھی ہے۔ چین میں جو لڑکا، چوانگ یوآن (شاہی امتحانات میں اول رہنے) کا امتیاز حاصل کرتا تھا اس کی کامیابی پر اس کے کنبے والے، اس کے رشتے دار، اس کا قبیلہ، بلکہ اس کا سارا شہر اس پر جذباتی لحاظ سے اور مادی اعتبار سے بھی ناز کرتے تھے۔ ایک ایک اور دو دو سو سال تک اس شہر کے لوگ فخر یہ بیان کیا کرتے تھے کہ ہمارا لڑکا فلاں فلاں عہد حکومت میں شاہی امتحانات میں سارے ملک میں اول رہا تھا اور جب یہ لڑکا کبھی اپنے شہر واپس آتا تھا تو سارا شہر اور اس کا سارا قبیلہ، اس عزت افزائی پر پھولا نہیں سماتا تھا۔

گھریلو نظام زندگی میں بڑے تنوع اور بڑی رنگارنگی کی گنجائش ہے۔ خود انسان کو دیکھیے کہ ایک خاندان کے اندر وہ بچپن اور جوانی، پختہ عمری اور بڑھاپا، عموماً عمر کا ہر بوقلموں حصہ بسر کرتا ہے۔ پہلے پہل اس کی نگہداشت دوسرے کرتے ہیں۔ پھر وہ دوسروں کی نگہداشت کرتا ہے اور بڑھاپے میں پھر دوسرے اس کی نگہداشت شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے پہل وہ دوسروں کی ہر بات بلاچون و چرا مانتا ہے، ہر ایک کی اطاعت اور عزت کرتا ہے لیکن جوں جوں بڑا ہو جاتا ہے دوسرے اس کی بات ماننے لگتے ہیں اور اس کی اطاعت اور عزت

کرنے لگتے ہیں۔اس تصویر میں رنگ، عورت کے وجود سے آتا ہے۔کنبے کی زندگی میں عورت ایک آرائش، ایک کھلونے کے طور پر نہیں آتی۔ بنیادی طور پر وہ بیوی کی حیثیت سے بھی نہیں آتی بلکہ شجرہ نسب کے سب سے ضروری حصے یعنی ماں کی حیثیت سے آتی ہے کیونکہ ماں کے وجود ہی سے انسانی زندگی کا تسلسل قائم رہ سکتا ہے۔کسی خاندان کی شاخ کی قوت اور خوبی کا دارومدار ان عورتوں پر ہے جو اس خاندان کے مردوں کے ساتھ بیاہی جاتی ہیں۔انہی کے خون پر کنبے کی قوت وحیات کا انحصار ہوتا ہے۔اس لیے خاندان کے پرانے بزرگ، بہوئیں تلاش کرتے وقت اچھے خاندانوں کی لڑکیاں تلاش کرنے میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔یہ وہی احتیاط ہے جو ایک ہوشیار مالی ثمر دار درخت کو اچھا پیوند لگانے میں برتتا ہے۔کسی شخص کی زندگی کا بننا یا بگڑنا اس عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس سے وہ شادی کرے اور اس کے کنبے کا سارا ڈھانچا بھی اسی عورت کے بل بوتے پر بنتا بگڑتا ہے......آپ کے پوتوں کی صحت اور ان کی تربیت (جس پر بہت زور دیا جاتا ہے) کا سارا انحصار آپ کی بہو کی سلیقہ مندی اور سگھڑاپے پر ہے۔بہو کے انتخاب میں احتیاط کی بدولت نسل انسانی کو بہتر بنانے کے بارے میں ایک قاعدہ، ایک نظام سا رائج ہو جاتا ہے۔جس کی بنیاد، وارثت اور خاندانی مزاج پر ہوتی ہے اور جس میں شرافت اور عالی نسبی کو اہم سمجھا جاتا ہے۔ایک خاندان کے بڑے بوڑھے اور ماں باپ خاص طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی ہونے والی بہو صحت مند، خوبصورت اور سلیقہ مند ہے یا نہیں۔اور انہی باتوں پر ان کے انتخاب کا سارا دارومدار ہوتا ہے۔عام طور پر خاندانی تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور کفایت شعاری، محنت، خوش مزاجی اور تمیز داری کو اس تربیت کی خاص چیزیں سمجھا جاتا ہے۔بعض دفعہ جب کوئی لڑکا اپنی مرضی سے کسی بدتمیز اور پھوہڑ لڑکی سے شادی کر لے تو باپ اس لڑکی کے خاندان کو برا بھلا کہہ کر جی ٹھنڈا کرتا ہے کہ انھوں نے اپنی لڑکی کو اچھی تربیت نہ دی۔گویا ماں اور باپ دونوں پر، اپنی بیٹیوں کی تربیت کا بوجھ ہے تاکہ جب یہ لڑکیاں کسی اور کنبے میں بیاہی جائیں تو ماں باپ کی بدنامی کا باعث نہ بنیں۔مثلاً اگر لڑکیاں پرائے گھر میں جا کر کھانا نہ پکا سکیں یا نوروز کے موقع پر عمدہ قسم کی کھیر تیار نہ کر سکیں تو ماں باپ کی تربیت کو بٹہ لگ جائے گا۔

گھریلو یا کنبہ داری نظام کے اندر زندگی کے رواں دواں اور جاری وساری رہنے کا نظریہ ایسا ہے کہ انسان کو اپنی بقا، اپنا دوام بھی ایک ٹھوس اور ظاہر چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔دادا اپنے پوتوں کو بستہ بغل میں

دبائے سکول جاتے دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک بار پھر ایک بچے کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس پوتے کو پیار کرتے وقت اسے محسوس ہوتا ہے کہ بچے کا گوشت پوست اس کا اپنا گوشت پوست ہے، بچے کا خوان اس کا اپنا خون ہے۔ پوتے کی ہستی خاندان کے شجرے کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے رواں دواں دھارے کا ایک قطرہ ہے اور زندگی کا یہ دھارا ہمیشہ جاری وساری رہتا ہے۔ وہ وقت آنے پر ہنسی خوشی جان دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں ہر باپ کو سب سے بڑا خیال یہ ہوتا ہے کہ مرنے سے پیشتر اپنے لڑکے لڑکیوں کی مناسب شادیاں کر سکے۔ اس کے نزدیک بچوں کی شادی کا مسئلہ اپنی قبر کی جگہ کا انتخاب کرنے سے بھی زیادہ اہم ہوا کرتا ہے۔ جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے کہ اس کے بیٹے اور بیٹیاں کیسی بیویوں اور کیسے شوہروں کے ساتھ زندگی بسر کریں گے، اسے اطمینان نصیب نہ ہو گا اگر صورتِ حال تسلی بخش ہو گی تو وہ اپنے بستر مرگ پر بے فکر ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر سکے گا۔

زندگی کے بارے میں اس نظریے کا نتیجہ ہے کہ ہر چیز کے بارے میں انسان کا تصور وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کے ماتحت، زندگی کو ایک انسان کی پیدائش اور اس کی موت کے ساتھ نہ آغاز ملتا ہے نہ اس کا انجام ہو جاتا ہے بلکہ زندگی ایک کے بعد دوسرے انسانی پیکروں کی صورت میں ہمیشہ قائم و باقی رہتی ہے۔ گویا ٹیم کا سنٹر فارورڈ یا فل بیک اگر ختم بھی ہو جائیں تو بھی ٹیم کے دوسرے کھلاڑی کھیل جاری رکھتے ہیں۔ اس صورت میں کامیابی اور ناکامی کی بھی صورت بدل جاتی ہے اور زندگی کے بارے میں نصب العین یہ ٹھہرتا ہے کہ زندگی اس طرح بسر کرو کہ بڑوں کے نام کو بٹا نہ لگے اور اولاد ایسی پیدا کرو جس کی وجہ سے تمھیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ تقریباً ہر چینی عہدہ دار جب نوکری پوری کر چکتا ہے تو اس کے ذہن میں یہ فقرہ آتا ہے۔ ''اچھا ہوا کہ عہدے کا بوجھ سر سے اترا۔ اب زندگی آرام سے کٹے گی کیونکہ اپنے بہت سے بیٹے ہیں۔''

آدمی کی غالباً سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس کے بیٹے نالائق نکلیں جو خاندان کی عزت وآبرو قائم نہ رکھ سکیں۔ یا کم سے کم خاندان کی دولت بھی قائم نہ رکھ سکیں۔ جواری بیٹے کا لکھ پتی باپ جانتا ہے کہ اس کی ساری دولت کیسے چٹکیوں میں اڑ جائے گی، وہ دولت جو اس نے خون پسینہ ایک کر کے ساری زندگی میں جمع کی ہے۔ ایک بیٹا ناکام اور نکما نکلے تو خاندان کی تباہی قطعی اور یقینی ہو گی۔ اس کے برعکس اس بیوہ کا خیال کیجیے جس کا پنج سالہ بچہ بڑا سعید اور ہونہار ہے۔ وہ اس بچے کے بل پر دنیا جہان کی مصیبتیں، برسوں کی مشکلیں اور

دوسروں کے ظلم بھی برداشت کر لیتی ہے۔چینی تاریخ اور ادب ایسی دور اندیش بیوہ ماؤں کے تذکروں سے بھر پور ہے۔جنھوں نے سالہا سال ظلم اور مصیبتیں اس امید میں برداشت کیں کہ ایک دن ان کا بیٹا جوان ہوگا، لائق ہوگا اور دنیا میں بڑا آدمی بنے گا۔ ہمارے آپ کے سامنے کی مثال، نیشنلسٹ چین کے لیڈر، مارشل چیانگ کائی شیک کی ہے۔بچپن میں اس یتیم لڑکے اور اس کی بیوہ ماں کو اس کے ہمسایوں نے اتنا ستایا تھا کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے مگر بیوہ ماں کو اپنے بچے کی لیاقت پر بھروسہ تھا۔اس لیے اس نے بڑے صبر سے سارے ظلم وستم برداشت کیے ہیں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ وہ بیوہ مائیں اپنے بچوں کے کردار اور اخلاق کی بڑی کامیابی سے تربیت کرتی ہیں (اس کی وجہ غالباً عورتوں کی فطری حقیقت پسندی ہے) اس کے پیش نظر میں نے کئی بار سوچا ہے کہ جہاں تک بچوں کی پرورش اور تربیت کا تعلق ہے، باپ کا وجود بالکل غیر ضروری ہے۔ بیوہ کو جو مسرت اپنے بیٹے کے جوان ہونے پر ہوتی ہے وہ عام عورتوں کو نصیب نہیں ہوتی کیونکہ جو دکھ اور تکلیفیں بیوہ نے جھیلی ہیں وہ عام عورتیں نہیں جھیلتیں۔

تو مطلب یہ ہوا کہ کنبے کے نظام میں انسانی زندگی کا یہ مقام اور زندگی کی یہ ترتیب بڑی تسلی بخش ہے۔ گویا اس نظام میں ایک شخص کی زندگی کے تمام حیاتیاتی پہلو آسودہ ہوتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو کنفیوشس بھی چاہتا تھا۔اس لیے کنفیوشس نے مثالی حکومت کا جو خاکہ بتایا ہے وہ بھی سرتاپا حیاتیاتی ہے۔وہ کہتا ہے ''مثالی حکومت میں بوڑھے آدمیوں کو سکھ چین کی زندگی بسر کرنے کا موقع ہوگا،نوجوان سب سے محبت کرنا اور وفادار رہنا سیکھیں گے۔گھروں کے اندر لڑکیاں کنواری نہیں بیٹھی رہیں گی، اور گھروں کے باہر کنوارے مرد نہیں ہوں گے۔''

یہ الفاظ ملک کے کسی ضمنی مسئلے کے بارے میں نہیں کہے گئے بلکہ یہ ایک حکومت کی آخری منزل۔ایک حکومت کے نصب العین کو واضح کرتے ہیں۔ یہ انسانیت پرستی کا فلسفہ ہے جسے فلسفی حکما نے ''جبلتوں کی آسودگی'' سے تعبیر کیا ہے۔کنفیوشس یہ چاہتا تھا کہ انسان کے سارے فطری تقاضے تسلی بخش طریقے پر پورے ہو جائیں کیونکہ ان تقاضوں کے پورا ہو جانے سے ہماری زندگی مطمئن ہوگی، اور مطمئن زندگی سے شانتی اور اخلاقی سکون پیدا ہوتا ہے جو امن وآشتی کی روح ہے۔کنفیوشس نے جو سیاسی نصب العین بتایا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائی غیر ضروری بن جائے اور ساری دنیا میں ایسے پائیدار امن وآشتی کا دور دورہ ہو جائے

جس کی بنیاد انسان کے دلوں پر استوار کی گئی ہو۔

5- پروقار بڑھاپا

میں سمجھتا ہوں چین میں کنبہ داری نظام ایسا ادارہ ہے جو بچے اور بوڑھے دونوں کے لیے اچھی طرح زندگی بسر کرنے کا ضامن بن جاتا ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی صورتوں میں ہماری عمر گزرتی ہے لہٰذا یہ لازم ہوا کہ ایک کنبے میں بچے اور بوڑھے دونوں مطمئن زندگی بسر کر سکیں۔ بچے زیادہ بے دست و پا اور مجبور ہوتے ہیں اور خود اپنا خیال بھی نہیں رکھ سکتے لیکن بوڑھوں کی بہ نسبت بچوں کو مادی آرام کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کو مادی مشکلوں کا عام طور پر احساس بھی نہیں ہوتا۔ ایک غریب بچہ بھی اتنی ہی پرمسرت زندگی بسر کرتا ہے جتنی ایک امیر خاندان کے چشم و چراغ کی زندگی خوشبوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ ممکن ہے غریب بچے کی زندگی اس سے زیادہ پرمسرت ہو۔ غریب بچہ ننگے پاؤں رہے گا مگر یہ اس کے لیے آرام کا باعث ہوگا لیکن بوڑھے آدمی کے لیے ننگے پاؤں چلنا پھرنا بڑی تکلیف دہ بات ہوا کرتی ہے۔ بچے کو مادی تکلیفوں کا احساس اس لیے نہیں ہوتا کہ اس میں نیا خون اور نئی قوت ہوتی ہے۔ بچے کے سارے غم عارضی ہوتے ہیں اور وہ بہت جلد انھیں بھول بھی جاتا ہے۔ اسے روپے پیسے کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ اسے لکھ پتی بننے کا خبط نہیں ہوتا لیکن بوڑھے آدمیوں کو یہ دونوں احساس کھائے رہتے ہیں۔ بچہ زیادہ سے زیادہ یہ کرتا ہے کہ انعامی کوپن جمع کر لیے اور وہ بھی اس لیے کہ ان سے ایک ننھی منی بندوق خرید سکے لیکن بوڑھے آدمی تو گورنمنٹ کے قرضوں کے تمسک جمع کرتے ہیں لیکن کوپن جمع کرنے اور تمسک جمع کرنے میں کوئی مقابلہ نہیں۔ دونوں کا لطف ہی الگ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بچہ، بڑوں کی طرح زندگی سے ڈرتا نہیں۔ اس کی ذاتی عادات ابھی پختہ نہیں ہوئی ہوتیں۔ وہ خاص قسم کے سگریٹ یا خاص مارکے کی کافی پینے کا غلام نہیں ہوتا۔ چنانچہ جو کچھ ملتا ہے اور کچھ پیش آتا ہے بچہ اسے قبول کرتا ہے۔ اس کے دل میں کوئی نسلی تعصب نہیں ہوتا، اور مذہبی تعصب سے تو بچے کا دل بالکل پاک ہوا کرتا ہے۔ بچے کے خیالات اور اس کے تصورات کسی پٹی ہوئی لکیر کے فقیر نہیں بنے ہوتے۔ اس لیے یہ عجیب بات بالکل درست ہے کہ بوڑھے آدمی بچوں سے بھی زیادہ مجبور اور دوسروں کے سہارے کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اندیشے زیادہ واضح، زیادہ قطعی ہوتے ہیں اور ان کی خواہشات زیادہ وسیع ہوتی ہیں۔

چین میں ابتدائی زمانے ہی سے بڑھاپے کے ساتھ شفقت چلی آتی ہے۔ اس جذبے کا مقابلہ مغربی

اقوام کی اس شیفتگی اور احترام کے ملتے جلتے جذبات کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو مغرب میں ہمیشہ سے عورتوں کے سلسلے میں موجود ہیں۔ چین میں یہ شفقت اور یہ احترام، عورتوں اور بچوں کے لیے کم کم اور بوڑھے لوگوں کے لیے زیادہ رہا ہے۔ چنانچہ، یہی شفقت اور احترام، فلسفی مین سی آس کے اس مقولے میں دیکھیے کہ ''بوڑھے لوگ بوجھ اٹھا کر بازاروں میں چلتے نظر نہیں آنے چاہئیں''...... فلسفی مین سی آس نے عمدہ حکومت کا نصب العین قرار دیا جائے اور اس نے دنیا کے سخت مجبور اور بے سہارا لوگوں کے چار طبقے بتائے۔ ''بیوہ عورتیں، رنڈوے مرد، یتیم بچے، اور لاولد بوڑھے لوگ۔'' اس نے یہ بھی قرار دیا کہ ان طبقوں میں پہلے دو طبقوں یعنی بیوہ عورتوں اور رنڈوے مردوں کا انتظام تو ملک کے اقتصادی نظام کو کرنا چاہیے۔ جو ایسا بندوبست کرے کہ ملک میں، غیر شادی شدہ مرد عورتیں سرے سے باقی نہ رہیں۔ باقی رہے یتیم، تو ان کے بارے میں مین سی آس نے کچھ نہیں بتایا اگرچہ چین میں ہمیشہ سے یتیم خانے اور بوڑھے لوگوں کے لیے قیام گاہیں قائم رہی ہیں پھر بھی ہر شخص جانتا ہے کہ یتیم خانے اور بوڑھے لوگوں کے لیے قیام گاہیں، گھر کا نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ گھر ہی کی فضا بچوں اور بوڑھوں کی ضروریات کے تسلی بخش انتظام کی ضامن ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں جہاں تک بچوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں زیادہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایک چینی مثل کے مصداق ''پانی، نشیب میں مرتا ہے'' بچوں کے لیے والدین کی شفقت اور محبت تو بالکل فطری اور مصدقہ چیز ہے۔ ہاں اصل مسئلہ بوڑھے لوگوں کا ہے۔ بوڑھے ماں باپ اور دوسرے بوڑھے بزرگوں سے پیار کرنا اور ان کے ساتھ شفقت برتنا ایسی چیز ہے جو ہمیں تہذیب اور ثقافت ہی سکھا سکتی ہے، (حیوانوں اور وحشی انسانوں میں بڑھاپا قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ گلے یا قبیلے کے بوڑھے افراد کو بار سمجھ کر مارنا بہتر سمجھا جاتا ہے) گویا جو شخص فطرت سے باغی نہیں وہ اپنے بچوں کو تو پیار کرے گا ہی لیکن اپنے ماں باپ سے دلی لگاؤ صرف تہذیب یافتہ آدمی کو ہوا کرتا ہے۔ خیر، زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ چین میں بوڑھے لوگوں کا احترام اور ان کی محبت ایک مسلمہ اصول بن گیا اور بعض چینی ادیبوں کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ بوڑھے ماں باپ کی خدمت کا لوگوں کو جنون تک ہو گیا۔ ایک چینی شریف زادے کے لیے سب سے زیادہ تاسف کی بات یہ ہوتی تھی کہ وہ بوڑھے ماں باپ کی خدمت نہیں کر سکا اور ان کے بستر مرگ پر انھیں دوا اور یخنی نہیں پلا سکا یا جس وقت انھوں نے دم دیا تو وہ آخری دیدار کے لیے حاضر نہیں تھا۔ پچاس پچپن کے پیٹے کے کسی افسر کے

لیے یہ بہت بڑا اخلاقی گناہ شمار کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو گاؤں سے بلا کر اپنے پاس نہیں رکھ سکا اور خود ہر رات انھیں شب بخیر اور ہر صبح انھیں صبح بخیر نہیں کہہ سکا۔ اس اخلاقی کوتاہی کو کوئی معاف نہیں کرتا تھا اور جو شخص اس کا مرتکب ہوتا اسے اپنے دوستوں اور اپنے ساتھی افسروں کے سامنے ہمیشہ طرح طرح کی جوابدہی کرنی پڑتی تھی۔ اس تاسف کا اظہار ایک شخص نے دو سطروں میں کیا ہے۔ وہ نوکری سے واپس گھر آیا تو اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ وہ کہتا ہے:

پیڑ کہتے ہیں کہ آرام کریں
تند جھونکے نہیں دیتے تسکیں
بیٹا کہتا ہے کہ خدمت کر لوں
بوڑھے ماں باپ مگر زندہ نہیں

اگر کسی کو اپنی زندگی اس طرح بسر کرنی ہے جس طرح ایک نظم ہوتی ہے تو اسے اپنی زندگی کے غروب کے لمحات کو سب سے زیادہ خوشگوار اور پر مسرت زمانہ سمجھنا پڑے گا۔ اور بڑھاپے کو ملتوی کرتے رہنے کی کوشش کے بجائے وہ ان زریں لمحات کے انتظار میں چشم براہ رہے گا اور زندگی کے ان بہترین اور مسرت سے بھرپور دنوں کے لیے وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اور اپنی زندگی کو تیار کرتے رہے گا۔ میں نے مشرقی زندگی اور مغربی زندگی کا مقابلہ کرنے اور ان میں ایک دوسرے کے خلاف اور موافق باتیں ڈھونڈنے کے سلسلے میں جو کچھ کوشش کی ہے اس سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے بارے میں مشرق و مغرب کے رویے میں بڑا واضح اور قطعی فرق بلکہ اختلاف موجود ہے۔ باقی سارے اختلافات اتنے واضح اور قطعی نہیں۔ مثلاً جنسی معاملات، عورت، کام، تفریح، کارکردگی وغیرہ کے بارے میں مشرق و مغرب کے خیالات میں اختلاف ضرور ہے مگر یہ اختلاف اضافی حیثیت رکھتا ہے، بنیادی اور قطعی نہیں۔ چین میں عورت اور مرد کے جو تعلقات میاں بی بی کی حیثیت میں ہوتے ہیں وہ مغرب سے بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ یہی حال ماں باپ اور بچوں کے تعلقات کا ہے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ انفرادی آزادی اور جمہوریت کے بارے میں مشرقیوں کے تصورات اور حاکم و محکوم کے تعلقات بھی مغربیوں کے تصورات سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں لیکن جہاں تک عمر کے بارے میں انسانی رویے کا تعلق ہے مشرق اور مغرب کا اختلاف قطعی ہے اور اس بارے میں دونوں کے تصورات اور

نظریات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔اس کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب کسی سے اس کی یا کسی کی عمر پوچھنی پڑے یا خود اپنی عمر بتانی ہو۔چین میں اگر کوئی شخص رسمی طور پر کسی سے ملنے جائے تو وہ اس کا نام اور لقب پوچھنے کے بعد پہلا سوال یہی کرے گا۔''آپ کا سن شریف کیا ہوگا؟'' اگر دوسرا شخص، کچھ مؤدبانہ کچھ عذر خواہی کے لہجے میں جواب دے ''جناب میں تیئس برس کا ہوں'' یا ''میری عمر اٹھائیس سال کی ہے'' تو دوسرا شخص اس کی ہمت بندھائے گا۔ کہے گا۔''ماشاء اللہ! آپ کا مستقبل تو بڑا شاندار معلوم ہوتا ہے اور پھر خدا کرے آپ کی عمر دراز ہو!'' اگر جواب یہ ہو کہ میری عمر 35 سال یا 38 سال کی ہے تو ملاقاتی بڑے احترام سے کہے گا ''سبحان اللہ! خدا مبارک کرے'' گویا اگر عمر زیادہ سے زیادہ بتائی جا سکتی ہے تو دوسرے کا جذبہ شوق و احترام بڑھتا جائے گا اور اگر کوئی خوش نصیبی سے صاحب خانہ سے یہ کہہ سکے کہ میں پچاس بچپن کے پیٹے میں ہوں تو ملاقاتی کا سارا رویہ ایکا ایکی بدل جائے گا۔وہ احترام اور انکسار کے مارے اپنی آواز میں نرمی اور ملائمت پیدا کرلے گا۔اسی لیے میں کہتا ہوں کہ دنیا بھر کے بڈھے لوگوں کو اپنا بڑھاپا چین میں بسر کرنا چاہیے کیونکہ چین میں بڈھے گداگر تک کے ساتھ بھی بڑی نرمی اور رحم دلی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔چین میں ادھیڑ عمر کے لوگ واقعی اس دن کے لیے ہمہ تن انتظار رہتے ہیں۔ جب وہ بڑی دھوم سے اپنی پچاسویں سالگرہ منا سکیں گے۔ اگرچہ امیر سوداگر یا بڑے افسر تو اپنی اکیالیسویں (41) سالگرہ بھی بڑے اہتمام سے منا لیتے ہیں، پھر بھی آدھی صدی کا نشان یا پچاس برس کا ہو کر اپنی سالگرہ منانا تو ایسی چیز ہے کہ ہر طبقے کے لوگ اس ''بزرگی'' کا جشن مناتے ہیں۔ دس برس بعد اکسٹھویں (61) سالگرہ آتی ہے جو اوکانویں سالگرہ سے کہیں زیادہ خوشی کا موقع ہوتی ہے پھر دس برس بعد اکہترویں سالگرہ کا دن آتا ہے جو پہلے سے زیادہ شان کا جشن ہوتا ہے۔حتیٰ کہ جو شخص اپنی اکیاسویں سالگرہ بھی منا سکے، اس پر تو آسمانی رحمتوں کا سایہ سمجھا جاتا ہے۔ڈاڑھی بڑھانا ان لوگوں کا خاص حق سمجھا جاتا ہے جو یا تو دادا، نانا بن چکے ہوں اور ان کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی ہو۔ جو شخص چین میں ان خاص شرائط کے بغیر ڈاڑھی بڑھاتا ہے اس کی پیٹھ پیچھے اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ بزرگی کی اس عزت کا نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان لوگ بزرگوں کی چال ڈھال، رکھ رکھاؤ اور انداز نظر کی نقل اتار کر یہ ثابت کر دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ پختہ عمر ہیں۔ میں چین کے کئی نوجوان ادیبوں کی مثال دے سکتا ہوں۔ جن کی عمر 25 برس سے زیادہ نہیں۔مگر وہ چینی رسالوں میں اس بارے میں مضامین لکھتے ہیں کہ نوجوانوں کو کیا کتابیں پڑھنی

چاہئیں اور کون کون سی کتابیں بالکل نہیں پڑھنی چاہئیں۔ یہی (نوجوان) ادیب بڑے بزرگانہ اور مشفقانہ لہجے میں ''نوجوانوں'' کو یہ مشورہ دیتے نظر آتے ہیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے، لہٰذا جوانی کی لغزشوں سے خبردار رہنا چاہیے۔

چین میں کہن سالی اور بڑھاپے کے جو فوائد ہیں ان کے پیش نظر بوڑھا ہونے کی خواہش عجیب معلوم نہیں ہوتی۔ نہ یہ بات ہی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہر شخص بوڑھا ہو جانے یا کم سے کم ''بزرگ'' نظر آنے کا اتنا خواہشمند کیوں ہے۔ بڑھاپے کے حقوق اور فوائد ہی ایسے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ چین میں بات کرنا کہن سال بزرگوں کا حق ہے اور کم عمروں کا یہ فرض ہے کہ وہ چپ چاپ ان بزرگانہ باتوں کو سنتے رہیں۔ چین کی مشہور مثل ہے کہ ''نوجوانوں کے کان ہونے چاہئیں، زبان نہیں۔'' اس بزرگی اور خوردی کا رکھ رکھاؤ یہ ہے کہ اگر 30 برس کا شخص بات کر رہا ہو تو 20 سالہ نوجوان کو چپ چاپ اس کی بات سننی چاہیے۔ اسی طرح اگر 40 برس کا آدمی بات کرتا ہو تو 30 سالہ برخوردار کو اس کی بات چپ چاپ سنتے رہنا چاہیے۔ خود بات کرنا اور اپنی بات سنوانا، ایک عالمگیر خواہش ہے۔ لہٰذا پختہ عمری کے ساتھ ساتھ یہ مواقع زیادہ ہوتے جاتے ہیں کہ آپ جس محفل میں جائیں، لوگ احترام سے آپ کی باتیں سنتے رہیں۔ زندگی کا یہ ایک ایسا کھیل ہے جس میں زندگی کسی ایک شخص کے ساتھ خاص رو رعایت نہیں کرتی کیونکہ ہر شخص وقت آنے پر بوڑھا اور بزرگ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اگر آپ باپ اپنے بیٹے کو کسی بات پر لیکچر دے رہا ہو اور وہیں دادا میاں آنکلیں تو باپ فوراً چپ ہو جائے گا اور اس کا سارا انداز ہی بدل جائے گا کیونکہ یہ بات کرنے کا حق اب دادا کا ہے۔ باپ اور بیٹا اب صرف بات سننے کے اہل ہیں اور میری نظر میں عمر اور بزرگی کا یہ احترام ٹھیک بھی ہے کیونکہ ایک بزرگ کے وسیع تجربے کے سامنے ایک ناپختہ نوجوان کو بولنے کا کیا حق ہے؟

مغربی زندگی سے میری واقفیت کافی پرانی ہے۔ مغرب میں بڑھاپے کے بارے میں جو نظریہ اور رویہ ہے وہ بھی میرے لیے نیا نہیں۔ پھر بھی جب بالکل غیر متوقع طور پر اس رویے کا سامنا ہو جائے تو مجھے بڑا صدمہ ہوتا ہے کیونکہ اس کی مثالیں مغربی زندگی میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ ایک بڑی بی تھیں جن کے بہت سے پوتے پوتیاں تھیں۔ عمر کا ذکر آیا تو کہنے لگیں ''اب تو خیر کیا، مگر پہلے پوتے کی پیدائش پر مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی'' (یعنی اس کی پیدائش سے مجھے اپنے بڑھاپے کا یقین ہوا تھا!) یہ مانا کہ امریکی لوگ اپنے آپ کو بوڑھا

ظاہر کرنا اچھا نہیں سمجھتے۔ پھر بھی اس احساس کا یہ اظہار ایسی چیز ہے جس کی کم سے کم مجھے تو امید نہ تھی ادھیڑ عمر کے لوگوں کو تو یہ خواہش قدرتی طور پر ہوتی ہے کہ انھیں جوان اور مستعد سمجھا جائے، مگر کسی بوڑھی خاتون سے یہ توقع نہیں ہونی چاہیے کہ عمر کا ذکر آتے ہی وہ بدک اٹھے اور بات بدل کر موسم کی بات کرنے لگے۔ حالانکہ عمر کا تذکرہ کچھ میری ''بدتمیزی'' سے نہیں شروع ہوا تھا بلکہ یونہی بات میں بات نکل آئی تھی۔ مغربی فضا میں، میں یہ اکثر بھول جاتا ہوں اور بالکل غیر شعوری طور پر کسی بزرگ شخص کو گاڑی میں یا کسی لفٹ میں پہلے داخل ہونے کے لیے راستہ دیتا ہوں۔ پھر یکا یک یہ یاد آتا ہے کہ لوگ یہاں اس بات کا برا مانتے ہیں۔ ایک دفعہ اپنی اسی مشرقی عادت کے طفیل میں نے ایک نہایت معزز بزرگ کو گاڑی میں اپنی جگہ دی تو وہ کہن سال بزرگ مڑ کر اپنی بوڑھی بیوی سے کہنے لگے ''ذرا دیکھنا، یہ نوجوان سمجھتا ہے کہ وہ عمر میں مجھ سے بھی کم ہے۔''

بڑھاپے کے بارے میں مغرب کا یہ رویہ انتہائی نامعقول ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کی تک کیا ہے اگر نوجوان یا ادھیڑ عمر کی عورتیں جن کی شادی نہ ہوئی ہو اپنی عمر ٹھیک بتانے سے گریز کریں تو بات سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ شادی کے سلسلے میں جوانی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ چینی لڑکیاں بھی اگر بائیس برس کی ہو جائیں اور بیاہی ہوئی نہ ہوں یا ان کی منگنی تک نہ ہوئی ہو تو خوف زدہ ہو جاتی ہیں کیونکہ مہینے اور سال چپ چاپ گزرتے رہتے ہیں، کسی کی بپتا اور مجبوری پر رحم نہیں کھاتے اور ان لڑکیوں کے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب زمانے نے ہمیں پیچھے چھوڑ دیا۔ اسی لیے مثل مشہور ہے کہ عورت کی زندگی کا طویل ترین سال انتیسواں سال ہے کیونکہ ہر عورت تیس سال کی عمر سے ڈرتی ہے اور کئی برس تک لوگوں کے لیے انتیس سال کی ہی رہتی ہے۔ مگر اس کے باوجود لوگوں کو اپنی صحیح عمر نہ بتانا اور اس بات سے ڈرنا کہ کہیں لوگوں کو میری ٹھیک عمر کا پتا نہ چل جائے، بالکل نامعقول بات ہے اگر آپ کو پختہ عمر نہیں سمجھا جائے گا تو آپ کو دانشمند اور دانا کوئی کس طرح سمجھے گا؟ اور پھر بھلا نوجوان لوگوں کو زندگی اور شادی اور زندگی کی سچی اقدار کے بارے میں پتا ہی کیا ہے؟

مگر مغربی زندگی کا نہج یہ ہے کہ جوانی کو ہر حال میں ترجیح دی جاتی ہے۔ یہی ترجیح عورتوں اور مردوں کو اپنی صحیح عمر بتانے سے روکتی ہے۔ اسی کا یہ کرشمہ ہے کہ 45 برس کی ایک خاتون سیکرٹری جو بڑی مستعد اور کارکن مانی جاتی ہے، اپنی صحیح عمر کے انکشاف کے بعد فوراً نکمی سمجھی جانے لگتی ہے۔ اس الٹی منطق کی وجہ سے اگر یہ

بے چاری اپنی صحیح عمر چھپائے رکھنا چاہیے تو تعجب کی بات نہیں کیونکہ اس بے چاری کو اپنی نوکری قائم رکھنی ہے۔ میرے خیال میں زندگی کا یہ نہج اور جوانی کی یہ ترجیح دونوں باتیں نامعقول ہیں۔ میرے نزدیک اس کا کچھ حاصل نہیں مگر یہ سب کچھ، کاروباری زندگی کی برکت ہے کیونکہ دفتر کی بہ نسبت گھر میں، بوڑھے آدمیوں کی زیادہ عزت کرنی ممکن ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ امریکی لوگ مصروفیت، مستعدی اور کاروباری کامیابی کو کچھ کچھ تحقیر کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ عام امریکی باپ جب دفتر کے بجائے گھر کو مثالی جگہ سمجھنے لگے گا اور چینی باپ کی طرح فخر سے یہ کہہ سکے گا کہ اب میرا بیٹا دفتر میں میری جگہ کام کر سکتا ہے اور اپنے ساتھ میرا بھی پیٹ پال سکتا ہے تو وہ واقعی اس دن کا انتظار کرے گا جب وہ بوڑھا ہو جائے گا اور جوان بیٹا اس کا کام سنبھال لے۔

امریکہ میں تندرست اور توانا بوڑھوں کی زبان سے میں نے یہ سنا ہے کہ ابھی تو میں ''جوان'' ہوں یہ شاید زبان کی بدبختی ہے کہ جوان سے ان کی مراد ''صحت مند'' ہوتی ہے۔ سچ پوچھیے تو انسان کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ بڑھاپے میں بھی صحت مند ہو۔ گویا ''کہن سالی اور صحت مندی'' بیش بہا چیزیں ہیں۔ اب اسے ''جوانی اور صحت مندی'' سے تعبیر کرنا کتنی بڑی زیادتی ہے، ایک کامل چیز میں کئی عیب اور خامیاں اور خامکاریاں پیدا کر دینا کتنی زبردستی ہے۔ اس دنیا میں ایسے صحت مند، دانا بڈھے سے بڑھ کر کوئی چیز دلکش نہیں جو ''بھرے بھرے چہرے اور سفید بالوں کے ساتھ'' زندگی کے بارے میں پورے تیقن اور پوری دانش کے ساتھ بات کر سکتا ہو۔ چین میں یہ تصور بڑا عام ہے۔ اس لیے چینی لوگوں کے نزدیک زمینی خوشیوں کی زندہ علامت ایسا بوڑھا آدمی ہے ''جس کا چہرہ صحت مندی کی تصویر ہو اور جس کے بال برف کی طرح سفید ہوں۔'' آپ میں سے بعض حضرات نے درازی عمر کے چینی دیوتا کی تصویر دیکھی ہو گی جو اونچے ماتھے، سرخ و سفید چہرے، لمبی سفید ڈاڑھی اور اپنے تبسم کے ساتھ کتنا دلکش نظر آتا ہے۔ یہ تصویر حسن و دانائی کی ہے۔ دیوتا اپنی انگلیاں لمبی ڈاڑھی پر پھیرتا ہے، دلی طمانیت اور قناعت کے ساتھ تبسم افشاں ہے، وقار اور متانت کا مجسمہ ہے کیونکہ ہر کوئی اس کا احترام کرتا ہے اس کے چہرے سے خود اعتمادی ہویدا ہے۔ کیونکہ کوئی شخص اس کی دانائی میں شک نہیں کر سکتا۔ رحم اس کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے کیونکہ اس نے انسان کے ان گنت غموں کو دیکھا ہے۔

مگر لمبی سفید ڈاڑھیوں والے شاندار بڈھے امریکہ میں نہیں ملتے۔ غالبًا ایسے بزرگ موجود ضرور ہیں مگر وہ کسی سازش کے ماتحت اپنے آپ کو زمانے کی نظروں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ بس ایک دفعہ نیو جرسی کے

شہر میں میں نے ایک بڈھا دیکھا تھا۔ جس کی کچھ عمدہ ڈاڑھی تھی۔ ورنہ سب صفاچٹ نظر آتے ہیں۔ شاید یہ سیفٹی ریزر کا کرشمہ ہے کہ سفید ڈاڑھی کہیں نظر نہیں آتی۔ حالانکہ یہ بھی ویسا ہی احمقانہ اور کوتہ اندیشانہ فعل ہے جس طرح چینی کسانوں نے شمالی چین کی ساری پہاڑیاں، درخت اور جنگل کاٹ کاٹ کے چٹیل بنا ڈالی ہیں اور اب شمالی چین کے علاقے خوبصورت جنگلوں سے اسی طرح محروم ہیں جس طرح بڈھے امریکیوں کی ٹھوڑیاں سیفٹی ریزر کی بدولت خوبصورت سفید ڈاڑھیوں سے محروم ہیں۔ اب امریکہ کے شاندار بڈھے افسانہ بن چکے ہیں۔ چچا سام اپنی چگی ڈاڑھی کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا۔ کیونکہ اس نے سیفٹی ریزر لے کر یہ ڈاڑھی مونڈ ڈالی ہے۔ تاکہ صاف اور بنجر ڈاڑھی کی وجہ سے ''احمق نوجوان'' نظر آسکے۔ اس کی ٹھوڑی اندر کی طرف جھکی ہوئی نہ رہے بلکہ باہر کو نکلی نظر آئے اور موٹے شیشوں کے چشمے کے پیچھے اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک جھلکتی رہے۔ ایک شاندار بڈھے کے مقابلے میں یہ نقشہ کتنا حقیر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ امریکہ میں جو کہن سال لوگ بڑے مصروف رہنا چاہتے ہیں وہ محض انفرادیت پسندی کی ایک احمقانہ نمائش ہے اور بس۔ ان کا غرور اور خودمختاری کا جنون انھیں اپنے بچوں کے سہارے بڑھاپے کے دن کاٹنے نہیں دیتا۔ امریکی عوام نے اپنے ملکی آئین کی رو سے انسان کو بہت سے حقوق دے رکھے ہیں۔ مگر اس آئین میں یہ بات کہیں نظر نہیں آتی کہ بوڑھے ماں باپ کو اپنے بچوں کی دی ہوئی روٹی کھانے کا بھی حق ہے۔ یہ صحیح معنی میں ایک واضح حق ہے، ایک ایسی ذمہ داری ہے جو خدمت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بچے چھوٹے تھے تو جوان والدین نے خون پسینہ ایک کر کے ان کی پرورش کی۔ جب وہ بیمار تھے تو والدین نے اپنی راتوں کو نیند حرام کی، ان کا گوموت دھویا، لگ بھگ پچیس برس خرچ کر کے ان بچوں کو جوان کیا اور انھیں زندگی کی کش مکش کے لیے تیار کیا۔ اب جب کہ والدین بڈھے ہوگئے تو پھر کیا ان بڈھے والدین کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان کے بچے ان کی کفالت کریں؟ ان سے پیار کریں؟ ان کا احترام کریں؟ گھریلو زندگی کے اس نظام میں جہاں بچپنے میں آپ کی نگہداشت دوسرے کرتے ہیں اور پھر آپ اپنی باری آنے پر، اپنے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کرتے ہیں، کیا اپنے اس زعم خودی، اس جھوٹے غرور، اس انفرادیت پرستی کو بھولنا روا نہیں اور اپنے بچوں سے خدمت لینا جائز نہیں؟

چینی قوم میں فرد کی خودمختاری کا احساس بالکل نہیں ہے کیونکہ زندگی کا سارا انتظام گھر کی چاردیواری

میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے پر ہی استوار ہے۔ لہٰذا چین میں بوڑھے ماں باپ کے لیے یہ شرم کی بات نہیں کہ ان کے جوان بچے ان کی کفالت کریں۔ بلکہ یہ عین خوش نصیبی سمجھی جاتی ہے کہ آپ کے بڑھاپے میں آپ کے بچے جوان ہو جائیں جو آپ کا سہارا بن سکیں۔ چین میں زندگی کا مقصد اور منتہا یہی ہے۔

مغربی زندگی میں کہن سال لوگ اپنے آپ کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے کہن سال بچارے سماج کی دلچسپیوں سے دور، کسی گمنام ہوٹل میں زندگی کے باقی ماندہ دن گزارتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے بال بچوں کی گھریلو زندگی میں دخل انداز نہ ہوں۔ ان کی یہ خواہش از حد بے غرضی پر مبنی ہوتی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ بزرگوں کو اس مداخلت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ یہ مداخلت ناخوشگوار ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ زندگی مجموعی طور پر اور خاص طور پر گھریلو زندگی، نظم و ضبط کا نام ہے اور روک ٹوک ہی ضبط پیدا کر سکتی ہے۔ بچے چھوٹے ہوں تو ماں باپ ان کے ہر کام، ہر بات میں ان کے بھلے کو دخل دیا ہی کرتے ہیں اور بعض لوگوں کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ماں باپ کو چھوٹے بچوں کے بھی کسی کام، کسی سرگرمی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ میں پوچھتا ہوں اگر آپ اپنے بڈھے اور معذور ماں باپ کا وجود اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتے تو پھر کس کی موجودگی برداشت کریں گے؟ ہر شخص کے لیے ضبط نفس پیدا کرنا لابدی ہے۔ ورنہ خود شادی بھی نہایت ناکام ثابت ہوتی ہے اور پھر یہ بات بھی سوچنے کے قابل ہے کہ اولاد کی محبت بھری خدمت اور ذاتی احترام اور بے لوثی کا ان بیروں کی خدمت سے کیا مقابلہ ہے جو وہ ہوٹل میں رہنے والے ایک ضعیف جوڑے کے لیے کرتے ہیں؟

چین میں اس بات پر ہمیشہ زور دیا جاتا ہے کہ اولاد کو بڈھے ماں باپ کی خدمت خود کرنی چاہیے۔ اس خدمت کا جواز چینیوں کے نزدیک یہ ہے کہ دوستوں کے احسانات تو گنے جا سکتے ہیں مگر ماں باپ اولاد پر جو احسانات کرتے ہیں ان کا شکار ممکن نہیں۔ اولاد کی سعادت مندی کے بارے میں چینی زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ والدین بچوں کے پوتڑے تک اپنے ہاتھ سے صاف کرتے ہیں۔ اس معمولی سی بات کی اہمیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب اولاد بڑی ہو کر خود والدین بن جاتی ہے چنانچہ جب ماں باپ بوڑھے اور معذور ہو جائیں تو کیا ان کا یہ حق نہیں کہ ان کی اولاد انھیں ان کے مرغوب کھانے کھلائے اور ان کے آرام آسائش کا بہر نوع خیال رکھے؟ ماں باپ کی خدمت کرنے والے بیٹے کے فرائض کافی سخت

ہوتے ہیں لیکن ان خدمتوں کا مقابلہ ایک ہسپتال کے مریض کی خدمت سے کرنا، ماں باپ کے مقدس رتبے کی توہین کرنا ہے۔ تاعوسی شیہ نے اپنے ایک مقالے میں بتایا ہے کہ گھر میں ''خورد'' کے فرائض کیا کیا ہیں۔ پرانے مدرسوں میں اخلاقیات کی کتابوں میں یہ مقالہ ہر جگہ شامل نصاب ہے۔ وہ کہتا ہے:

''گرمی کے دن ہوں تو بیٹوں کو چاہیے کہ ماں باپ کو پنکھا جھلیں اور مکھیوں، مچھروں اور گرمی کو ان کے نزدیک نہ آنے دیں۔ سردیوں میں ان کا فرض یہ ہے کہ ماں باپ کے بستروں کے گدے اور توشک خوب گرم رکھیں۔ آتشدان میں آگ جلتی رہے اور وہ خود اس کمرے میں کھڑا رہ کر یہ اندازہ کریں کہ آگ اور گرمی ٹھیک درجے کی رہتی ہے۔ اولاد کو یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ماں باپ کے کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں ٹھیک ہیں یا نہیں۔ ان میں کوئی درز یا کوئی سوراخ تو نہیں جس سے ٹھنڈی ہوا اندر آتی ہو؟ گویا اولاد کا یہ فرض ہے کہ ماں باپ کو ہر موسم میں آرام ملے اور وہ خوش وخرم رہیں۔

دس یا دس برس سے زیادہ عمر کے بچے کو چاہیے کہ صبح ماں باپ کے جاگنے سے پہلے بیدار ہو جائے اور ضروری حوائج سے فارغ ہو کر ماں باپ کے پاس جا کر پوچھے کہ آپ کی رات تو آرام سے گزری؟ اگر ماں باپ بیدار ہو چکے ہیں تو بچے کو چاہیے کہ پہلے انھیں نہایت ادب سے سلام کرے اور پھر ان کی طبیعت کا حال پوچھے اور پھر سلام کر کے چلا آئے۔

رات کو اس بچے کا فرض ہے کہ پہلے ماں باپ کے بستر بچھائے اور جب تک وہ سو نہ جائیں ان کے پاس رہے۔ پھر جب وہ سو جائیں تو کمرے کے پردے چھوڑ کر خود چلا آئے۔''

آپ ہی انصاف فرمائیں۔ ان حالات میں چین میں کون نہیں چاہتا ہو گا کہ بوڑھا ہو جائے یا بوڑھا باپ یا دادا بن جائے؟

ادھر کچھ عرصے سے چین میں کچھ ترقی پسند قسم کے ادیب پیدا ہوئے ہیں جو اس قسم کے اخلاقی ضابطوں کو ''جاگیرداری کے چونچلے'' کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں مگر ان چیزوں میں کچھ ایسی دلکشی اور پائیداری سی ہے کہ پرانے لوگ، نئے زمانے کے چین سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں تاہم اصل بات یہ ہے کہ ہر شخص وقت آنے پر بوڑھا ضرور ہو گا (بشرطیکہ وہ اس وقت تک زندہ رہے اور تادیر زندہ رہنے کی خواہش کسے نہیں ہوتی؟)

انفرادیت پسندی کی بوالعجمی یہ کہہ سکتی ہے کہ ہر شخص خیالی دنیاؤں میں بالکل خودمختاری اور علیحدگی کی زندگی بسر کر سکتا ہے لیکن اس سے قطع نظر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہمیں اپنی زندگی کچھ اس طرح بسر کرنی چاہیے کہ ہماری عمر کا بہترین حصہ ہمارا مستقبل (بڑھاپا) ہو اور ہمارے نزدیک زندگی کا سنہری زمانہ وہ نہ ہو جسے ہم اپنی جوانی یا طفلی اور معصومیت کے روپ میں بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں کیونکہ اگر ہم اپنے ماضی (جوانی، یا طفلی کے دنوں) کو عمر کا سنہری زمانہ سمجھیں گے تو ہم غیر شعوری طور پر گزرتے ہوئے وقت کی بے رحم گردشوں کے ساتھ مصروف پیکار ہو جائیں گے۔ ہم ہر آنے والے دور سے ڈرتے رہیں گے اور یہ کہنا شاید ضروری نہیں کہ وقت کے ساتھ لڑ کر کون جیت سکا ہے؟ وقت کی گردش آخر میں ہر ایک کو مات دے کر چھوڑتی ہے۔ بڑھاپے کی امداد بوڑھا ہو جانے کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے کو یہ دھوکا دے سکتے ہیں کہ ہم اپنے آپ کو بوڑھا تسلیم نہ کریں۔

مگر قدرت کے ساتھ لڑنا بیکار ہے۔ اس لیے اگر بڑھاپا مقدر ہی ہے تو پھر پروقار طریقے سے اور نفاست سے بوڑھا ہونا بہتر ہے زندگی کے طویل نغمے کو سکون اور طمانیت، مادی آرام اور روحانی تسکین کی معراج پر پہنچ کر ختم ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ اس نغمے کا اختتام، شورو شین اور بے سری آوازوں پر ہو۔



نواں باب

جینے کے مزے

1- بستر

میرا خیال ہے کہ میں کچھ اشتہاری فلسفی بنتا جا رہا ہوں مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ یوں فلسفے کو دیکھئے تو فلسفہ ایسے علم کا نام ہے جو سادہ چیزوں کو مشکل بنا دے لیکن میرے ذہن میں علم کا یہ تصور آتا ہے کہ وہ مشکل چیزوں کو بھی آسان کر دے۔ فلسفے میں ''مادیت''، ''انسانیت پرستی''، ''ماورائیت'' اور ''ثنویت'' اور ایسی ہی کئی قسم کی ''امیتوں'' کو فروغ ملا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ سارے فلسفے کسی صورت میں بھی میرے فلسفے سے زیادہ گہرے یا مفصل نہیں ہیں...... زندگی آخر ہے کیا؟...... زندگی کھانے پینے، سونے جاگنے، اپنے عزیزوں کو الوداع کہنے اور عزیزوں سے پھر ملنے سے مرکب ہے۔ زندگی آنسوؤں اور قہقہوں کا آمیزہ ہے۔ زندگی یہ ہے کہ دو چار ہفتے میں ایک بار بال کٹوائے جائیں، اپنے پھولوں کو پانی سے سینچا جائے، اپنے ہمسایوں کا نقصان اور ان کی شماتت کی جائے زندگی کے بارے میں اپنے سادہ خیالات اور تاثرات کو عملی بحث کا بھاری بھر کم لباس پہنا کر پیش کرنا دھوکے کی ٹٹی ہے جس کی آڑ میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر اپنے بے حد مبہم خیالات کو یا اپنے عجز کو چھپاتے ہیں۔ گویا فلسفہ ایسا علم ہے جس کی بدولت ہم اپنے بارے میں ''کم سے کم سمجھنے'' کی طرف ''زیادہ سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں۔ فلسفیوں کی کامیابی صرف یہیں تک ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں جتنے زیادہ نکتے پیدا کرتے ہیں۔ اتنا ہی ہمارے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ الجھتے ہیں۔

اب بستر میں لیٹنے ہی کو لیجیے۔ بہت کم لوگ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ حالانکہ میرے خیال میں فلسفے اور سائنس کی کل اختراعات کا 90 فیصد حصہ اس وقت موجد یا فلسفی کے ذہن میں آیا تھا جب وہ رات کے دو بجے یا گجردم پانچ بجے آرام سے اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

بعض لوگ دن میں آرام کرتے ہیں اور کچھ لوگ رات کو بستر پر لیٹنے کے عادی ہیں۔ ''لیٹنے'' سے میری

مراد واقعی لیٹنا اور آرام کرنا ہے کہ جسم اور روح دونوں سکون سے ہم کنار ہوں۔ جو لوگ میری طرح اس آرام کرنے کے قائل ہیں اور اسے زندگی کی ایک بہت بڑی مسرت سمجھتے ہیں وہی شریف اور دیانت دار لوگ ہیں۔ اور جو لوگ اس کے مخالف ہیں انھیں دن بھر اخلاقی اور جسمانی طور پر کسی کل چین نہیں آتا۔

آپ پوچھیں گے آخر بستر پر پڑے رہنے کی جسمانی اور روحانی اہمیت کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں اس کی جسمانی اہمیت تو یہ ہے کہ بستر پر لیٹ کر انسان دنیا سے الگ تھلگ، اس کے شور و غوغا سے ہٹ کر، گوشہ عافیت میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں اور سارے اعضا کو اس طرح آرام دیتا ہے۔ جس طرح انھیں زیادہ سے زیادہ آرام ملتا ہے اور پھر عافیت اور دھیان میں مگن ہو جاتا ہے۔ بستر پر لیٹنے کا بھی ایک مناسب اور عمدہ طریقہ ہے۔ مثلاً زندگی بسر کرنے کا استاد، کنفیوشس کبھی بستر پر تیر کی طرح سیدھا چپ نہیں لیٹتا تھا۔ بلکہ کروٹ کے بل، ٹیڑھا ہو کر آرام کرتا تھا...... میرے نزدیک زندگی کی بہت بڑی راحت بستر پر لیٹ کر اپنی ٹانگیں بازوؤں کی پوزیشن صحیح یعنی دونوں بازو اس طرح رکھے جائیں کہ زیادہ سے زیادہ حظ حاصل ہو اور دماغ کو بھی تازگی اور فرحت اور قوت ملے۔ میرے خیال میں بستر پر لیٹنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بستر پر بالکل سیدھے نہ لیٹا جائے۔ بلکہ آپ نرم اور گدگدے، بڑے بڑے تکیوں کے سہارے پڑے ہوں، اور ایک بازو یا دونوں بازو، سر بلکہ گدی کے نیچے رکھے ہوں۔ یہ لیٹنے کا وہ انداز ہے کہ اس کی بدولت ہر شاعر لافانی شعر کہہ سکتا ہے۔ اس انداز میں لیٹنے سے ہر فلسفی انسانی فکر میں انقلاب برپا کر سکتا ہے اور ہر سائنس دان عہد آفرین ایجادات کر سکتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ بہت کم لوگ تنہائی اور غور و فکر کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ بستر پر لیٹنا صرف جسمانی آرام ہی کا نام نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دن بھر کی بک بک جھک جھک کے بعد لوگوں سے ملنے جلنے، دوستوں کی بے سرو پا باتیں سننے اور بھائی بہنوں کی ہدایات سننے کے بعد جب آدمی بستر پر لیٹتا ہے تو اس کا سارا جسم سکون و آرام حاصل کرتا ہے لیکن اس سے سوا بھی کچھ ہے اگر آپ کو بستر پر لیٹنے کا صحیح آرٹ آتا ہو تو اس سے دل و دماغ کی تازگی اور طہارت کا ہونا بھی لازمی ہے۔ میں نے بڑے بڑے کاروباری لوگوں کو دیکھا ہے کہ اپنی بھاگ دوڑ اور اپنے تین تین ٹیلی فونوں میں دن دن بھر لین دین کرتے ہیں اور اپنی اس محنت اور مصروفیت پر بڑے نازاں ہوتے ہیں مگر انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اگر وہ دن رات میں کسی وقت، صرف ایک گھنٹہ بھی بستر میں جاگتے ہوئے پرسکون طور پر گزار دیں تو شاید وہ اپنے کاروبار میں دگنا کما سکیں اگر کوئی

سات بجے اٹھ جانے کے بجائے سات بجے سے آٹھ بجے تک چپ چاپ بستر میں لیٹا رہے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ بلکہ اس سے بھی بہتر ہے وہ عمدہ سگرٹوں کا ایک ڈبا اپنے پاس رکھے اور بستر سے اٹھنے میں کافی دیر لگائے تا کہ بیداری کے ان پر سکون لمحوں میں بستر پر لیٹے لیٹے اپنے تمام مسائل غور و فکر سے حل کر لے۔ پھر آرام سے اٹھے اور منہ ہاتھ دھوئے۔ بستر پر لیٹے لیٹے یہ کاروباری شخص، ٹائی اور سوٹ بوٹ کے بندھنوں سے آزاد ہو گا۔ تنگ جانگیہ، یا چست پیٹی اسے ستاتی نہیں ہو گی۔ چمڑے کے چمکیلے اور سخت بوٹ اس کے پاؤں کو جکڑے ہوئے نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اس کا کاروباری ذہن آزادی سے کام کی بات سوچ سکے گا کیونکہ قاعدے کی بات یہ ہے کہ اگر پاؤں قید سے آزاد ہوں تو سر بھی آزاد ہوتا ہے اور سر کی آزادی پر ہی کام کی بات سوچنے کا سارا دارومدار ہے گویا بستر پر آرام سے لیٹ کر یہ کاروباری شخص گزرے ہوئے کل کی کامیابی اور ناکامی کا محاکمہ کر سکے گا اور آنے والے دن کے ضروری کاموں اور غیر ضروری باتوں کو چھانٹ کر الگ الگ کر سکے گا۔ نو بجے یا پونے نو بجے دفتر پر پہنچ کر، اپنے ملازمین اور ماتحتوں کو غیر ضروری کاموں میں بلاوجہ جوتے رکھنے اور ہر کام کی جلدی مچانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ یہ شخص، نو کے بجائے دس بجے آرام سے دفتر پہنچے اور پوری صفائی ذہن اور تحمل اور سکون سے کام کر سکے اور دوسروں سے بھی کام لے سکے۔

یہ ایک کاروباری شخص کا ذکر تھا۔ ایک مفکر یا موجد کے لیے تو بستر میں ایک آدھ گھنٹہ چپ چاپ لیٹے رہنا اور بھی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک ادیب اس وقفے میں اپنے مضمون یا اپنے ناول کے لیے وہ باتیں سوچ سکتا ہے جو وہ میز پر جم کر بیٹھ کر پورے دن میں بھی غالباً نہیں سوچ سکے گا۔ بستر پر لیٹے لیٹے وہ دنیا کے سب فضول کاموں سے آزاد ہو گا۔ وہ زندگی کو ایک رنگین پردے میں سے دیکھے گا۔ جو حقائق کو اپنی چھوٹ سے منور کر دے گا اور زندگی کی ہر معمولی سے معمولی چیز بھی اس شاعرانہ دنیا میں پہنچ کر طلسماتی حسن سے بہرہ یاب ہو جائے گی۔ زندگی کا ادھورا پن نظر نہیں آئے گا بلکہ اس کے سامنے ایسی تصویریں بن جائیں گی جو زندگی سے زیادہ صحیح اور جاندار اور خوبصورت ہوں گی۔

آپ پوچھیں گے، یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے؟ بات یہ ہے کہ بستر میں لیٹ کر جسم کے سارے پٹھے آرام پاتے ہیں۔ خون کا دوران زیادہ باقاعدہ، زیادہ معتدل ہو جاتا ہے۔ سانس ٹھیک آتا جاتا ہے سننے اور دیکھنے اور کام کرنے کے اعصاب کو کم و بیش مکمل آرام ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے سارا جسم راحت اور سکون پاتا ہے لہٰذا

دماغ کو زیادہ یکسوئی حاصل ہوتی ہے اور ہمارا ذہن کسی خیال یا کسی جذبے پر پوری توجہ سے مرکوز ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ سونگھنے کی حس ہو یا سننے کی، ایسے سکون کے لمحوں میں یہ بھی بہت تیز اور تیکھی ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ عمدہ موسیقی لیٹ کر سننی چاہیے۔ چینی ادیب لی لی ونگ نے اپنے مضمون بید مجنوں میں لکھا ہے کہ پرندوں کے نغمے، صبح کو بستر میں لیٹ کر سننے چاہئیں اگر ہم صبح سویرے نیند سے بیدار ہو کر، پرندوں کے آسمانی نغموں کو سننے کی عادت پیدا کر لیں تو حسن و موسیقی کی ایک نئی دنیا کے پٹ ہمارے لیے کھل سکتے ہیں۔ اس میں کھلی فضا کی تخصیص نہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں صبح کے وقت بے شمار پرندوں کی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ مشکل ہے کہ بہت کم لوگ انھیں سنتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ میں نے شنگھائی میں صبح کے وقت پرندوں کے نغمے سنے تو میں نے اپنے خیالات کو سپرد قلم کر کے محفوظ کر لیا تھا۔ اس کا ایک اقتباس اب پیش کرتا ہوں:

''آج صبح، رات بھر کی گہری نیند کے بعد میں پانچ بجے بیدار ہوا اور میں نے چہچہوں اور آوازوں کا ایک نہایت شاندار سنگیت سنا۔ اصل میں مجھے کارخانوں کی سیٹیوں نے نیند سے جگایا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے دور سے بہت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنیں۔ یہ غالباً رسالے کے جوان تھے جو یو آن روڈ سے گزر رہے تھے۔ پھر کچھ پرندوں کے چہچہے سنائی دیئے۔ مجھے معلوم نہیں یہ پرندے کون کون سے تھے کیونکہ مجھے پرندوں کے بارے میں بہت کم واقفیت ہے، پھر بھی ان چہچہوں سے میں نے بڑا لطف اٹھایا۔

ان آوازوں کے علاوہ اور بھی آوازیں تھیں۔ ایک غیر ملکی باشندے کا ملازم ''لڑکا'' رات بھر کی عیاشیوں کے بعد کوئی ساڑھے پانچ بجے کے قریب، پاس کے کسی دروازے کو کھٹکھٹانے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد، گلی سے مہتر کے جھاڑو دینے کی شر شر کی آواز آنے لگی۔ یکا یک آسمان پر ایک مرغابی اڑی اور اس نے موٹی آواز میں کنک ننگ کہہ کر فضا میں تھرتھری پیدا کر دی۔ چھ بج کر پچیس منٹ پر دور ''شنگھائی سے ہانگ چاؤ جانے والی گاڑی کی گڑ گڑاہٹ سنائی دی اور تھوڑی دیر میں آوازوں نے مجھے بتایا کہ یہ گاڑی اب جیس فیلڈ کے جنکشن پر پہنچ کر ٹھہر گئی ہے۔ ان آوازوں کے ساتھ ساتھ کے کمرے سے سوتے بچوں کی

ہلکی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ پھر زندگی بیدار ہو کر حرکت میں آنے لگی اور انسانی سرگرمیوں اور کام کاج کی گونج میرے پاس اور مجھ سے دور بڑھنے لگی۔ اس میں تیزی آ گئی۔ آوازیں اونچی ہو گئیں ...... خود میرے گھر میں نیچے کی منزل میں نوکر چاکر جاگے۔ انھوں نے کھڑکیاں اور دروازے کھولے۔ پھر ہلکی سی کھانسی کی آواز آئی اور پاؤں کی ہلکی چاپ کے ساتھ، چائے کی پرچ پیالی کھنکھنائی۔ اس آواز کے ساتھ ہی یکایک بچہ پکارا۔ امی ...... امی!......"

مجھے خوب یاد ہے۔ اس سال، بہار کے سارے مہینوں میں مجھے ایک پرندے کی آواز سن کر بڑی رحت ہوتی تھی۔ جسے غالباً تیتر یا چکور کہا جاتا ہے۔ سروں میں اس کا نغمہ کچھ اس طرح کا تھا (سا، مارے رے ں) رکھب کو خوب لمبا کر کے اور اس پر پورا ٹھہراؤ دے کر ادا کیا جاتا تھا اور آخری سر یعنی نکھار، یکا یک ختم کیا جاتا تھا اور یہ آواز بھی بہت ہی سویرے میرے گھر سے کوئی بیس گز دور ایک پیڑ کی شاخوں سے یہ نغمہ کوکتا تھا اور پھر کوئی سو گز سے مادہ، اس سے نچلی سپتک میں اسی نغمے کو الٹا دیتی تھی (نی رے۔ رے ماسا) کبھی کبھی اس میں کچھ تبدیلی آتی تھی۔ اس کی چال کچھ تیز ہو جاتی تھی اور اس تیز لے میں آخری سر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ میں نے پرندوں کے جتنے نغمے سنے ہیں ان میں یہ کوک سب سے زیادہ میرے ذہن میں جا گزیں ہے۔ میں ان تمام نغموں کو لفظوں میں نہیں لا سکتا۔ صرف آپ کے سامنے ان نغموں کو موسیقی کے سروں (جسے ورن کہتے ہیں) میں ظاہر کر سکتا ہوں مگر ان نغموں میں ہد ہد کی بولیاں تھیں، کبوتروں کا ہلکا اور گھمبیر نغمہ تھا، کھٹ بڑھئی کی کوک تھی اور کیا کیا نہ تھا۔ غالباً چڑیا ان سب سے بعد میں بیدار ہوتی ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جو عشرت پسند شاعر لی لنگ نے بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسرے پرندوں کو اس لیے منہ اندھیرے نغمہ سرائی کرنی پڑتی ہے کہ وہ شکاری انسانوں کی بندوقوں سے خائف ہیں اور دن بھر شریر لڑکیوں کے پتھروں سے بھی ڈرتے ہیں۔ اس لیے یہ پرندے ظالم انسانوں کی بیداری سے پہلے پہلے ہی آرام سے گانے گا سکتے ہیں۔ جونہی انسان نیند سے اٹھا ان غریب پرندوں کو چین سے نغمہ سرائی کرنی نصیب کہاں ہوگی مگر چڑیا کا معاملہ مختلف ہے۔ چڑیاں انسان سے ڈرتی نہیں اس لیے وہ دیر تک سوتی رہتی ہیں اور آرام سے اٹھتی ہیں۔ پھر چوں چوں سے اپنا دل بہلاتی ہیں۔

2- کرسی

کرسیوں پر بیٹھنے کے بارے میں مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ کرسیوں پر اینڈنے کے سلسلے میں میری شہرت خاصی ہے۔ اب تو میرے بہت سے دوست بھی کرسیوں پر اینڈنے میں کسی سے کم نہیں مگر چین کی ادبی دنیا میں، میں ہی اس سلسلے میں سب سے زیادہ معروف ہوں۔ میری گزارش ہے کہ اس گناہ کا مرتکب اکیلا ہی نہیں اور کہ میری شہرت میں مبالغے کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اصل میں قصہ یہ ہوا کہ میں نے ایک رسالہ جاری کیا۔ میں نے اس رسالے میں پے در پے کئی مضامین میں یہ لکھا کہ تمبا کو پینے کے نقصانات کا جو غوغا ہے وہ سب فضول ہے اور اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ لطف یہ ہے کہ میرے رسالے میں سگریٹ کا کوئی اشتہار نہیں چھپتا تھا مگر تمباکو کی تعریف میں ہر دفعہ مضامین چھپا کرتے تھے۔ چنانچہ میرے بارے میں یہ مشہور ہو گیا کہ میں کوئی بیکار آدمی ہوں جو سارا دن صوفے پر پڑا رہتا ہے اور سگار پیتا رہتا ہے۔ میں نے لاکھ کہا اور احتجاج کیا کہ میں چین کے محنتی اور مصروف ترین اشخاص میں سے ہوں۔ لیکن کون سنتا تھا؟ یہ ''کہانی'' مشہور ہو کر رہی اور تمباکو کی حمایت میں میرے مضامین کو اس بات کا ثبوت سمجھا گیا کہ میں اس مردود طبقے کا ایک فرد ہوں جو امیر ہے اور خواہ مخواہ ادب میں ٹانگ اڑاتا ہے۔

دو سال بعد میں نے ایک اور رسالہ جاری کیا جس میں صرف مضامین اور صاف سیدھی نثر شائع ہوتی تھی۔ اصل میں میرا مقصد یہ تھا کہ چینی نثر کو پر تکلف اسلوب اور ابہام سے پاک کیا جائے، (چینی نثر کی یہ گت اس لیے بنی ہے کہ آج سے کوئی دس بیس برس پہلے تک، چینی مدرسوں میں، لڑکے لڑکیوں سے ''ملک کی نجات کا راستہ'' اور ''استقلال کی خوبیاں'' وغیرہ جیسے عنوانات پر جواب مضمون لکھوائے جاتے تھے اور ان جواب مضمونوں کے لیے ضروری تھا نہایت پر تکلف اور مشکل عبارت میں ہوں) میں نے سوچا کہ کنفیوشس کے بتائے ہوئے اصولوں کی فرسودگی سے چینی نثر اسی طرح آزاد کی جا سکتی ہے کہ اس کا اسلوب زیادہ بے تکلف ہو اور اس میں باہمی بول چال کا انداز ہو۔ میری بدقسمتی کہ میں نے اسلوب کی بے تکلفی کے بارے میں جو چینی لفظ لکھا اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ بات کرنے کا انداز پر اطمینان ہو، اس میں فرصت اور فراغت جھلکتی ہو۔ بس پھر کیا تھا۔ کمیونسٹ ادیبوں کے کیمپ سے مجھ پر حملوں کا طومار شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ اب اس بات میں کسی کو ذرا سا شک نہیں کہ میں سارے چین کے ادیبوں میں سب سے زیادہ فارغ، اور بیکار محض ادیب ہوں۔ اس

، کشتی اور گردن زدنی ہوں کیونکہ باقی سارا چین ان حضرات کے بقول ''قومی ذلت کی گہرائیوں میں سسک ہے''

مجھے تسلیم ہے کہ میں جب کبھی اپنے دوستوں سے ملنے جاؤں تو ان کے دیوان خانوں میں آرام سیوں پر خوب بچھ بچھ کر بیٹھتا ہوں مگر باقی لوگ بھی یہی کرتے ہیں۔ آخر آرام کرسیاں اور کس لیے ہوتی ں؟ اگر اس بیسویں صدی میں بھی عورتوں اور مردوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ انیسویں صدی کی پرتکلف سائٹی کی طرح جب کسی سے ملنے جائیں تو بڑے ادب آداب سے کرسیوں پر تن کر سیدھے بیٹھیں تو پھر آج ، دیوان خانوں میں آرام کرسیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ ان کے بجائے سخت لکڑی کی سیدھی پشت والی اونچی ی کرسیاں ہونی چاہئیں جن پر بیٹھ کر اکثر خواتین کے پاؤں زمین سے کوئی ایک فٹ اونچے رہیں۔

تو گویا کرسیوں پر آرام سے بچھ کر بیٹھنے میں کوئی حکمت پنہاں ہے۔ پرانے لوگ کرسیوں پر اس لیے تن بیٹھتے تھے کہ بارعب اور باوقار نظر آئیں۔ آج کل کے لوگ کرسیوں پر اپنے آرام کے لیے بیٹھتے ہیں۔ ان اتوں میں بڑا فرق ہے۔ آج سے کوئی پچاس برس پہلے کے معاشرے کے نزدیک آرام گناہ تھا۔ آرام سے نا گویا دوسرے کے احترام کے منافی تھا۔ اسی لیے وہ لوگ وقار اور رعب داب پر زور دیتے تھے۔ انگریز ب آلڈس ہکسلے نے اپنے مضمون ''آرام'' میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جاگیردارانہ م کی بدولت آرام کرسی وجود میں نہیں آسکی۔ آج سے کوئی بیس ایک برس پہلے چین میں بھی یہی صورت حال مگر آج حالات بدل چکے ہیں۔ اگر آپ کسی کے دوست ہیں تو آپ اس کے کمرے میں اس کی میز پر ٹانگیں لا سکتے ہیں۔ یہ سوء ادب نہیں بلکہ بے تکلفی گنی جاتی ہے لیکن پرانے بزرگوں کے سامنے اگر آپ میز پر ٹانگیں لا کر بیٹھیں گے تو قیامت آجائے۔

فن تعمیر، اخلاق اور کمروں کی اندرونی آرائش کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ آلڈس ہکسلے نے لکھا ہے کہ لی خواتین صدیوں تک بہت کم غسل کیا کرتی تھیں کیونکہ وہ اخلاقی اعتبار سے اپنے آپ کو ننگا دیکھنا اچھا نہیں تی تھیں۔ چنانچہ اس اخلاقی بندش کی بدولت صدیوں تک غسل کا تام چینی کا چمکتا ہوا سفید سفید ٹب ایجاد نہ کا۔ صدیوں سے چینی فرنیچر کچھ اس قسم کا رہا کہ اس سے آرام و آسائش کا بہت کم تعلق تھا۔ اس کی وجہ بوشس کے اخلاقی نظریوں کی وہ فضا تھی جس میں چینی قوم سانس لیتی رہی۔ چینی کہتا تھا کہ بیٹھنے کا یہی

طریقہ مناسب ہے اور تو اور چینی شہنشاہ بھی اسے سخت اور بے آرام تخت پر بٹھائے جاتے تھے کہ میں تو ان پر پانچ منٹ بھی نہ بیٹھ سکوں۔ خیر یہی حال انگلستان کے بادشاہوں کا بھی رہا ہے مگر باقی قدیم تہذیبیں اس سے مبرا تھیں۔ قلوپطرہ کا یہ حال تھا کہ ایک ریشمیں اور زریں صوفے پر آرام سے نیم دراز رہتی تھی اور خادم وہ صوفہ اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے کبھی کنفیوشس کا نام بھی نہیں سنا تھا اگر کنفیوشس اسے اس طرح نیم دراز دیکھ لیتا تو اس کی شامت آ جاتی، وہ ضرور اس کی پنڈلیوں پر زور سے ڈنڈا مارتا کیونکہ ایک دفعہ کنفیوشس کا ایک شاگرد جو آن جانگ ذرا غلط طریقے پر بیٹھا دیکھا گیا تو کنفیوشس نے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ کنفیوشس معاشرے میں شرفا، مرد و عورت دونوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے میں تیر کی طرح سیدھے رہیں۔ کم سے کم رسمی تقریبوں میں تو اس کا خیال رکھیں اور اگر کوئی شخص ذرا سا ٹانگیں پسار کر یا ٹانگیں اونچی کر کے بیٹھتا تھا تو یہ اس کی بدتمیزی اور بازاری پن کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اپنے افسروں کے احترام کا زیادہ مظاہرہ کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان کے سامنے کرسی کے بالکل سرے پر بیٹھا جائے۔ اسے افسر کی عزت اور اپنی تمیز داری کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح کنفیوشسی روایات اور چینی فن تعمیر کے غیر آسائشی تکلفات میں گہرا تعلق ہے۔ مگر اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اس پر تکلف فضا میں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں رومانی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کی بدولت، زندگی کا یہ روائتی تکلف اور ادب آداب ختم ہو گیا۔ اب، اپنے آپ کو آرام دینا، گناہ شمار نہیں کیا جاتا۔ رومانی تحریک اور انسانی نفسیات کے بہتر شعور کی بدولت زندگی کے بارے میں اب حقیقت پرست رویہ رواج پا گیا ہے۔ رویے کی اس تبدیلی کا کرشمہ ہے کہ تھیٹر کے تماشوں سے لطف اٹھانے کو بداخلاقی نہیں سمجھا جاتا۔ نہ شیکسپیئر کو اب ''وحشی'' آدمی شمار کیا جاتا ہے۔ اسی رویے کی تبدیلی کا یہ بھی کرشمہ ہے کہ اب نہانے کے خاص لباس ایجاد ہو چکے ہیں، عمدہ اور چمکتے ہوئے غسل کے ٹب بن چکے ہیں، دیوان خانوں میں نہایت آرام دہ کرسیاں اور نشست گاہیں رواج پا چکی ہیں، زندگی اور تحریر دونوں کا انداز اب حقیقت پرستانہ اور بے تکلف ہے۔

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ آرام اور آسائش، گناہ نہیں تو ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ کوئی شخص اپنے دوست کے دیوان خانے میں جتنے زیادہ آرام سے ایک آرام کرسی میں پھیل کر بیٹھے گا، وہ اپنے میزبان کا اتنا ہی زیادہ

احترام کررہا ہوگا۔ آخر مہمانداری اور خاطر تواضع کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ مہمان زیادہ سے زیادہ آرام محسوس کرے۔ گویا آپ جتنے زیادہ آرام سے بیٹھیں گے اتنا ہی اپنے میزبان کا تواضع کے سلسلے میں ہاتھ بٹائیں گے۔ میں نے کئی میزبانوں کو دیکھا ہے کہ وہ کسی دعوت یا پارٹی کے سلسلے میں سخت آتش بجاں رہتے ہیں۔ کیونکہ اس پارٹی میں شامل ہونے والے مہمان بے حد تکلف برتتے ہیں اور ذرا سی بھی بے تکلفی سے کام نہیں لیتے۔ ایسے موقعوں پر میں نے کئی بار اپنے میزبانوں کی مشکل آسان کی ہے کہ اس پر تکلف اور گھٹے ہوئے ماحول میں فوراً اپنی ٹانگیں میز پر پھیلا دی ہیں۔ یا اسی طرح کسی اور بے تکلفی سے کام لیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہر مہمان کو فضول تکلف اور جھوٹے ادب آداب سے ہاتھ اٹھا کر میری طرح سے تکلف ہونا پڑا ہے۔

اچھا...... کرسیوں وغیرہ کے آرام دہ ہونے کے بارے میں ایک کلیہ میں نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ سادہ لفظوں میں کلیہ یہ ہے کہ کرسی جتنی نیچی ہوگی، اتنی ہی آرام دہ ہوگی۔ آپ نے کئی دفعہ تعجب کیا ہوگا کہ فلاں صاحب کے گھر میں جو کرسی تھی وہ اتنی آرام دہ اور گدگدی کیوں تھی۔ اس کلیے کے انکشاف سے پہلے میں بھی یہ سمجھا کرتا تھا کہ کمروں کی آرائش کے ماہرین ہی یہ بتا سکتے ہیں کہ کرسی کی اونچائی، چوڑائی اور اس کی ڈھلان میں کیا تناسب ہونا چاہیے تاکہ بیٹھنے والے کو زیادہ سے زیادہ آرام مل سکے۔ مگر اب میں جانتا ہوں کہ ایسے لمبے چوڑے حساب کی کوئی ضرورت نہیں مثلاً کوئی چینی کرسی لیجیے اور اس کی ٹانگیں چند انچ چھوٹی کر دیجیے۔ یہ کرسی زیادہ آرام دہ ہو جائے گی۔ اس کی ٹانگوں کو چند انچ مزید چھوٹا کر دیجیے تو یہ اور آرام دہ ہو جائے گی...... اس کا منطقی نتیجہ پھر یہ نکلا کہ جسم کو صحیح آرام اسی وقت جب بستر پر لیٹے ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔

اس بنیادی اصول سے ایک اور نتیجہ بھی نکلا کہ جب ہم کسی اونچی کرسی پر بیٹھیں اور ہم اس کی ٹانگیں کاٹ کر چھوٹی نہ کر سکتے ہوں تو ہم اپنے سامنے کسی ایسی چیز کو ڈھونڈتے ہیں جس پر ہم اپنی ٹانگیں رکھ سکیں اور اس طرح اپنے کولہوں اور اپنے پاؤں کے درمیان جو فرق ہے اسے کم سے کم کر سکیں۔ میں اس موقع پر کیا کرتا ہوں کہ میز کی ایک دراز باہر نکال لیتا ہوں اور اس پر اپنے پاؤں رکھ لیتا ہوں۔ ہر شخص اپنے فہم کے مطابق اس ترکیب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اپنے جسم کے رگ پٹھوں کو آرام پہنچانا، ان کے تناؤ کو ڈھیلا کرنا جرم نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ دن رات کے 24 گھنٹے ہم انھیں آرام ہی پہنچاتے رہیں یا یہ کہ ان کو ہمہ وقت آرام دینا طبی اعتبار سے بڑا مفید

ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں قطعاً نہیں ہے لیکن یہ یاد رہے کہ انسانی زندگی کا چکر، کھیل اور کام، اعصاب کے کھنچاؤ اور آسودگی دونوں سے مل کر پورا ہوتا ہے اور اب تو سائنس کہتی ہے کہ مرد کے دماغ کی قوت اور کام کرنے کی صلاحیت اسی طرح ایک ماہواری چکر کی تابع ہے جس طرح عورت کا جسم اس کا تابع ہوا کرتا ہے۔ ولیم جیمز نے ایک جگہ کہا ہے کہ اگر سائیکل کے چین کو بہت زیادہ کس دیا جائے تو سائیکل کے پہیئے آسانی سے نہیں چلتے اور یہی حال انسان کا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر کام اور ہر بات میں انسان عادت کا غلام ہے اور انسانی جسم میں حالات کے مطابق ڈھل جانے کی بے پایاں صلاحیت موجود ہے۔ جاپانی لوگ فرش پر چوکڑی مار کر بیٹھنے کے عادی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر انھیں دن رات کرسی پر بیٹھنا پڑے تو ان کے اعضا تشنج کے مارے اکڑ جائیں۔ گویا ہم دن بھر دفتروں میں جو سیدھے تن کر بیٹھ کر کام کرتے ہیں تو اس کی تھکن شام کو صوفے یا پلنگ پر لیٹ کر اتارتے ہیں۔ اسی امتیاز اور تفریق سے ہی زندگی کی حکمتوں کو سمجھنا اور ان کا شعور ممکن ہے۔

آخر میں ایک بات خواتین سے کہوں گا..... کرسی پر بیٹھے ہوئے اگر آپ کو سامنے پاؤں رکھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملے تو فوراً اپنے پاؤں بھی کرسی یا صوفے پر رکھ کر زانو تہ کر کے بیٹھ جائیے۔ اس میں شرمانے کی بات نہیں۔ خواتین اس طرح بیٹھی ہوئی بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

3- گفتگو

''تمہارے ساتھ پوری رات باتیں کرنا پورے دس برس کے مطالعے سے بہتر ہے'' یہ ایک چینی عالم کا قول ہے جو اپنے دوست سے جی بھر کر باتیں کر لینے کے بعد اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اس قول میں بڑی سچائیاں پنہاں ہے۔ چینی زبان میں اب ''گفتگوئے شبانہ'' ایک ایسی ترکیب ہے جس کا مطلب ہی دوست سے رات بھر دل کی باتیں کہنا سننا ہے۔ چاہیے یہ باتیں ہو چکی ہوں یا ہونے والی ہوں مگر دوست سے رات بھر عمدہ باتیں کرنے کی اعلیٰ ترین مسرت بڑی نایاب چیز ہے چنانچہ لی لی ونگ کہتا ہے کہ دانا لوگوں میں سے شاید ہی کوئی باتیں کرنا جانتا ہو اور جو لوگ باتیں کر سکتے ہیں شاید ہی ان میں سے کوئی دانا ہو۔

آج کل یہ عام شکایت ہے کہ آتشدان کے گرد بیٹھ کر باتیں کرنے یا محفل سرور میں گفتگو کرنے کا فن ختم ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ جدید زندگی کی رفتار اور مصروفیت بتائی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں جدید زندگی کی صبارفتاری اس کی ذمہ دار ضرور ہے لیکن میرا یہ بھی خیال ہے کہ جب گھروں کو ایسے دیوان خانے میں بدل دیا گیا جس میں

آتشدان نہ ہوتو فن گفتگو کا زوال شروع ہوا اور پھر موٹر کاروں کے اثر نے اس فن کی تباہی مکمل کر دی ہماری زندگی کی رفتار بالکل غلط ہے کیونکہ گفتگو کا فن صرف ایسے معاشروں میں پروان چڑھتا ہے جس کے پاس فراغت کا وقت ہو۔ اور اس معاشرے کے افراد، فراغت کی آسانی اور کشائش سے بہرہ ور ہوں اور اس کی قدر کرتے ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محض باتیں کرنے اور گفتگو کرنے میں بڑا فرق ہے۔ چینی زبان میں ان دونوں کے لیے الگ الگ الفاظ ہیں۔ ایک کا مفہوم صرف ''بولنا'' ہے اور دوسرے کا مطلب ''گفتگو'' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گفتگو ایک زیادہ بے تکلفانہ چیز ہے۔ اس کے موضوعات کاروباری نہیں ہوتے۔ بلکہ زندگی کی عام چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ اسی قسم کا فرق کاروباری خط و کتابت اور ادیب دوستوں کی خط و کتابت میں ہوتا ہے۔ ہم کسی شخص کے ساتھ بھی کاروباری معاملوں پر بات چیت کر سکتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن سے ہم ایک سہانی رات گفتگو میں گزار سکتے ہیں لہٰذا جب کبھی ہمیں ایسے شخص سے واسطہ ہو جو صحیح معنی میں خوش گفتار آدمی ہو تو اس ملاقات کا لطف ایک اعلیٰ مصنف کی کتاب پڑھنے سے اگر زیادہ نہیں ہوتا تو اس کے برابر ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ خوش گفتار آدمی کی باتیں سننے میں ایک اور مزہ ہے جو اچھے مصنف کی کتاب پڑھنے میں حاصل نہیں ہوتا کہ ہم اس کی خوش آئند آواز بھی سنتے ہیں اور اس کی حرکات و سکنات سے بھی لطف اٹھاتے ہیں۔ گفتگو کا مزہ بعض دفعہ ہمیں دوستوں سے پھر مل بیٹھنے میں حاصل ہوتا ہے، بعض دفعہ پرانے شناسا مل بیٹھتے ہیں اور پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں یا پھر جب کسی لمبے سفر پر نکلے ہوں تو رات کو گاڑی میں یا کسی سرائے میں۔ ایسے موقعوں پر ہر موضوع پر بات چیت ہوتی ہے۔ بھوت پریت اور جن پریوں کے قصوں سے لے کر مختلف تجربات کے تذکرے ہوتے ہیں۔ ڈکٹیٹروں اور غداروں کو جی بھر کر سنائی جاتی ہیں اور پھر دیکھتے دیکھتے ہی کوئی دانا اور خوش گفتار شخص یہ بتاتا ہے کہ فلاں فلاں ملک میں آج کل جو واقعات ہو رہے ہیں وہ آنے والی تباہی کا پیش خیمہ ہیں یا وہاں حکومت کا تختہ الٹنے کے سامان ہو رہے ہیں۔ ایسی گفتگو کی یاد زندگی بھر ہمارے دل میں تازہ رہتی ہے۔

گفتگو کا بہترین وقت رات کا ہے۔ دن کے وقت گفتگو میں کوئی خاص دل کشی نہیں ہوتی۔ وہ جگہ جہاں گفتگو ہو قطعی طور پر غیر اہم ہوتی ہے۔ ادب اور فلسفے کے بارے میں ایک لمبی بات چیت سے آپ کسی پرانی وضع کے دیوان خانے میں بھی لطف اٹھا سکتے ہیں اور باہر کسی کھیت کی منڈیر پر بھی ہو سکتا ہے کہ باد و باراں کی

ایک رات آپ دریائی کشتی میں سفر کر رہے ہوں اور دریا کے دوسرے کنارے پر لنگر انداز کشتیوں کی دھیمی روشنیاں دریا کے پانی میں جھلمل جھلمل کر رہی ہوں تو ملاحوں کی کہانیاں سننے کا لطف زندگی بھر کے لیے قیمتی یاد بن کر رہ جائے۔ اصل میں گفتگو کی ساری دل کشی کا راز یہ ہے کہ ہر دفعہ گفتگو کا ماحول اور موقع، مقام اور وقت بدلتے رہیں اور وہ لوگ بھی بدلتے رہیں جو گفتگو میں حصہ لے رہے ہوں۔ گفتگو کا لطف ہمارے ذہنوں میں مختلف ماحول اور مختلف مقامات کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ یہ یاد آتا ہے کہ چاندنی کھلی تھی اور ہلکی ہوائیں ہلکورے لے رہی تھیں تو فلاں شخص سے گفتگو کرنے کا بڑا مزہ آیا تھا۔ پھر یاد آتا ہے کہ رات اندھیری اور طوفانی تھی اور کچھ لوگ آتشدان کے گرد بیٹھے تھے تو بڑی اچھی باتیں ہوئی تھیں پھر یہ یاد آتا ہے کہ ہم کھلی چھت پر بیٹھے کشتیوں کو دریا کے بہاؤ پر آتا دیکھ رہے تھے اور باتوں کا مزہ آ رہا تھا اور ایک کشتی دریا کی طوفانی لہر سے الٹ گئی تھی۔ کبھی یہ یاد آتا ہے کہ صبح کے اندھیرے لمحوں میں کسی ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے کیا اچھی باتیں سنی تھیں۔ یہ ساری تصویریں ان گفتگوں کی یاد کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ کبھی ہمیں یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ ہم دو آدمی کمرے میں بیٹھے تھے یا ایک دفعہ ہم پانچ چھ دوست تھے اور فلاں شخص کو کچھ زکام بھی تھا جس سے اس کی آواز میں اور گہرائی پیدا ہو گئی تھی مگر یہ یادیں، یہ ہنگام بھی آئے گئے ہیں کیونکہ انسانی زندگی اسی چل چلاؤ کا نام ہے کہ ''چاند ہمیشہ کامل نہیں رہے گا، پھول ہمیشہ اتنے شگفتہ نہیں ہوں گے اور اچھے دوست ہمیشہ مل نہیں سکیں گے۔'' اس لیے اس نعمت سے جتنا بھی بہرہ ور ہوں اتنا ہی کم ہے۔

اچھی گفتگو لازمی طور پر اچھی انشاء، عمدہ ادب پارے کی طرح ہوتی ہے۔ اس کا اسلوب اور اس کا نفس مضمون دونوں، انشاء سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً روحیں، مکھیاں، انگریزوں کی عجیب عادتیں، مشرقی اور مغربی تہذیبوں کی ٹکر، دریائے سین کے کنارے کتابوں کے سٹال، اپنے حکمرانوں، سیاستدانوں اور جرنیلوں کی ذاتی زندگی کے قصے، وغیرہ یہ سب موضوع (انشاء کی طرح) اچھی گفتگو کے موضوع بن سکتے ہیں۔ گفتگو اور انشاء میں جو بات بہت زیادہ مشترک ہے وہ دونوں کا اسلوب ہے جو بڑا بے تکلف ہوتا ہے۔ موضوع چاہے کتنا بھاری بھرکم اور اہم کیوں نہ ہو، چاہے اپنے ملک میں حالات کی ناسازگاری اور ابتری پر بات کرنا ہو، یا آج کل کے جنونی سیاسی عقیدوں کی وجہ سے تہذیب کی موت پر اظہار خیال کرنا ہو۔ یا انسان کی آزادی، وقار اور خوشی کے چھن جانے کی بات ہو یا محض سچائی اور انصاف کے اصولوں کا تذکرہ ہو، کوئی چیز بھی ہو، پھر بھی اظہار خیال،

بڑے عام طریقے سے، بڑی دھیرج سے اور بڑی بے تکلفی سے کیا جائے گا۔ تہذیب کا تقاضا یہی ہے۔ تہذیب یہی سکھاتی ہے کہ دل، آزادی کے رہزنوں کے مظالم پر غصے سے جل رہا ہو پھر بھی زبان سے یا قلم سے بات کرو تو اس میں مسکراہٹ ضرور آنی چاہیے۔ طوفانی اور جذباتی باتیں جن میں ہم اپنے دل کی جھلاہٹ کا پورا پورا اظہار کرتے ہیں صرف چند خاص دوستوں کے کانوں کے لیے ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کے لیے نہیں ہوتیں۔ اس لیے عمدہ گفتگو کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم ایک کمرے کے پرسکون ماحول اور چار یاروں کی محفل میں بیٹھ کر اپنے خیالات کا اظہار کریں اور آس پاس کوئی ایسا شخص نہ ہو جس کی موجوگی ہمیں ناپسند ہو۔

اچھی گفتگو اور باتکلف تبادلہ خیال میں جو فرق ہے وہ ایک مثال سے واضح ہوسکتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عمدہ گفتگو تو اچھے انشاء کے نمونے یا مضمون کی طرح ہے۔ دوسری چیز کو آپ سیاستدانوں کے بیانات سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ یہ مانا کہ ان بیانات میں اعلیٰ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ان میں جمہور پرستی کے جذبات، قومی خدمت کی تمنا، غریبوں کی فلاح و بہبود میں دلچسپی، ملک کے ساتھ شدید محبت، مثالیت پسندی، نصب العین کی لگن، امن پسندی اور بین الاقوامی خیر سگالی کے جذبات، حرص و ہوس سے بیزاری، روپے اور شہرت سے کنارہ کشی کے اعلانات، غرض ہر اچھی بات ہوتی ہے لیکن ان بیانات سے ایسا تکلف اور تصنع ٹپکتا ہے کہ آپ ان سے بدکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیانات بہت ہی بنی سنوری اور سجی سجائی عورت کی طرح ہیں جس کے قریب پھٹکنا دشوار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم کوئی اچھا ادب پارہ پڑھتے ہیں یا عمدہ گفتگو کا مزہ اٹھاتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کسی الہڑ دیہاتی لڑکی کو دیکھ لیا ہے۔ جو بڑی بے پروائی سے بال بکھیرے، آستین چڑھائے، دریا کے کنارے کپڑے دھو رہی ہے۔ جو اپنے الہڑ پنے اور سادگی کے ساتھ بڑی اچھی اور پسندیدہ معلوم ہوتی ہے۔ گویا اچھی گفتگو اور عمدہ مضمون دونوں میں جو سادہ دل کشی اور بے تکلفی ہوتی ہے، وہی ان کی جان ہے۔

گفتگو کا مناسب طریقہ یہی ہوا کہ گفتگو بے تکلف اور آزاد ہو۔ گفتگو میں حصہ لینے والے اپنے آپ کو گفتگو کی رو میں کھو چکے ہیں، اس بات کو بھول چکے ہیں کہ وہ کیسا لباس پہنے ہیں، کیسے بولتے ہیں، کیسے کھنکارتے ہیں، بولتے وقت ہاتھ ہلاتے ہیں یا نہیں۔ انھیں اس بات کی بھی خبر نہیں ہونی چاہیے کہ گفتگو کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے...... اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح معنی میں لطف گفتگو اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب ہم

اپنے دلی دوستوں سے ملتے ہیں اور ان سے دل کی باتیں کہنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہی بے تکلفی اور دلی لگاؤ کی محفل ہوتی ہے۔ ایک دوست کھڑکی میں جما بیٹھا ہے تو دوسرے نے کرسی پر بیٹھ کر اپنی ٹانگیں پاس کی میز پر پھیلا رکھی ہیں۔ تیسرا فرش پر پھسکڑا مارے بیٹھا ہے، ٹیک اس گدی سے لگا رکھی ہے جو اس نے ابھی ابھی صوفے سے گھسیٹی تھی اور صوفا ننگا بچا کر دیا تھا...... دل کو سکون اسی وقت ملتا ہے جب ہاتھ پاؤں کو آرام ملے اور جسم کو عافیت اور راحت نصیب ہو۔

دوستوں کی محفل اور راحت کا ماحول، دونوں عمدہ گفتگو کے لیے بیحد لازمی شرطیں ہیں۔ عمدہ گفتگو میں موضوع کا تعین نہیں ہوتا۔ باتیں چل نکلتی ہیں اور کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہیں۔ ان میں کوئی سلسلہ یا ربط نہیں ہوا کرتا اس لیے جب محفل برخاست ہوتی ہے تو ہر شخص خوش خوش گھر کو لوٹتا ہے۔

فراغت اور لذت گفتار میں اور گفتار اور نثر کی ترویج و ارتقا میں بڑا گہرا تعلق ہے...... میرا نظریہ یہ ہے کہ کسی ملک کے ادب میں عمدہ نثر اسی وقت پیدا ہوئی جب اس ملک میں گفتگو ایک فن لطیف کی حیثیت سے بہت ترقی کر چکی تھی۔ چینی نثر اور یونانی نثر کے ارتقا سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے۔ کنفیوشس کے بعد کی صدیوں میں چینی فکر و نظر میں بڑی جان اور بڑی قوت تھی۔ ساری فضا ایسی مہذب اور شائستہ تھی کہ عالموں کی بہت بڑی جماعت ملک میں موجود تھی جس کا کام ہی فن گفتار کو ترقی دینا تھا۔ چینی تاریخ بتاتی ہے کہ یکے بعد دیگرے پانچ چینی امیر، عالموں کی سرپرستی کے لیے مشہور ہوئے ہیں۔ وہ سب کے سب اپنی سخاوت، اپنی دریا دلی اور اپنی مہمان نوازی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔ ان کے ڈیروں پر ہزارہا چینی علما رہا کرتے تھے مثلاً چی بادشاہوں کے امیر منگ چانگ کے یہاں تین ہزار عالموں کا ڈیرا تھا۔ جو ''موتیوں سے جڑی ہوئی مطلا جوتیاں پہنتے تھے اور اس کے ہاں کھانا کھاتے تھے۔'' ان محلات میں رونق اور گفتگو کی گونج کتنی ہوتی ہوگی؟ ان کے علاوہ پیشہ ور اہل گفتار مصاحبین کی بھی ایک جماعت موجود تھی جو گفتار کے ماہر تھے۔ ان لوگوں کو نازک حالات میں چین کی مختلف ریاستیں ملازم رکھتی تھیں اور یہ لوگ سفارتی نمائندوں کی حیثیت سے دشمن ریاستوں کو بھیجے جاتے تھے تاکہ ریاستوں کے باہمی تعلقات کو استوار کریں، کسی شہر کا محاصرہ کرنے والی فوجوں کو محاصرہ اٹھا لینے پر راضی کرلیں، دو ریاستوں میں باہمی معاہدہ کرادیں اور یہ گفتار کے غازی عام طور پر بڑے کامیاب ہوتے تھے کیونکہ ان کی خوش گفتاری، ظرافت، کہانیوں اور مثالوں کا ذخیرہ بے پناہ ہوتا تھا۔ ان میں کسی کو

منانے اور آمادہ کرنے کی زبردست صلاحیت ہوا کرتی تھی۔ ان باکمالوں کو گفتگو اور ان کے دلائل ایک کتاب چانک یوت سیہ میں محفوظ ہیں۔ بحث اور گفتگو کی ایسی ہی آزاد اور خوش مذاق فضا نے فلسفے کے بعض نامور ماہرین کو جنم دیا۔ ان میں مانگ چو بھی ہے جو اپنی تضحیک اور کلبیت کی بنا پر نام آور تھا۔ انہی میں ہان فی زے ہے جو حقیقت پسندی کا بادشاہ ہے۔ انہی میں وہ زبردست مدبرین زے ہے جو اپنی خوش طبعی کے لیے بے مثال تھا۔

چین میں یہ زمانہ کوئی تیسری صدی قبل مسیح کے لگ بھگ کا ہے۔ اس زمانے کی تہذیبی اور مجلسی زندگی کی ایک مثال ایک چینی عالم لی یو ین کی ہے جس نے اپنی باکمال بہن کو جو سلطنت کے وزیراعظم کی خدمت میں پیش کیا اور پھر اس مربی علم وزیر نے اس لڑکی کو بادشاہ کے حضور تک پہنچایا۔ وہ کہانی کچھ اس طرح کی ہے:

''بہت زمانہ گزرا کہ لی یوآن، شہنشاہ کے وزیراعظم شہزادہ چن شن کے ہاں ایک صیغے میں ملازم تھا۔ لی یوآن کی ایک بہن تھی جس کا نام نو ہوآن تھا، ایک دن بہن نے بھائی سے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ بادشاہ کا ولی عہد کوئی نہیں۔ اگر تم مجھے وزیراعظم کے حضور میں پیش کر دو تو میری رسائی بادشاہ تک ہو سکتی ہے۔ بھائی نے کہا: ''وزیراعظم بہت بڑے رتبے کے مالک ہیں۔ میری کیا مجال کہ ان سے اس مسئلے پر بات کر سکوں۔'' بہن بولی۔ تم وزیراعظم کے حضور میں جاؤ اور پھر ان سے فوراً گھر آنے کی اجازت مانگو۔ عذر یہ پیش کرو کہ گھر پر ایک معزز مہمان آیا ہے۔ وزیراعظم پوچھیں گے کہ وہ معزز مہمان کون ہے؟ تم کہنا کہ میری ایک بہن ہے جس کے سلیقے کی تعریف سلطنتِ لو کے وزیراعظم نے سنی، اب اس نے ایک امیر کو بھیجا ہے کہ مجھ سے بہن کے رشتے کی خواستگاری کرے اور یہ کہ ابھی ابھی گھر سے ایک ملازم آ کر اس مہمان کی آمد کی خبر دے گیا ہے۔ اس بات کو سن کر ہمارے وزیراعظم ضرور پوچھیں گے کہ تمہاری بہن کو کیا کچھ آتا ہے؟ تم کہنا کہ وہ ساز بجا سکتی ہے، لکھ سکتی ہے۔ پڑھ سکتی ہے اور علوم پر اسے عبور حاصل ہے۔ اس طرح وزیراعظم مجھے ضرور بلائیں گے۔''

لی یوآن نے اسی طرح کرنے کا وعدہ کیا۔ اگلی صبح وزیراعظم کے پاس حاضر ہو کر اس نے کہا: ''جناب

والا ابھی ابھی غریب خانے سے ایک نوکر نے یہ پیغام پہنچایا ہے کہ دور دیس سے ایک امیر مہمان آئے ہیں۔ مجھے اجازت مرحمت ہو کہ جا کر ان کی تواضع کروں''۔ وزیراعظم نے پوچھا۔''دور دیس کا یہ امیر کون ہے بھائی؟''...... لی نے جواب دیا۔''میری ایک بہن ہے، سلطنت لو کے وزیراعظم نے اس کے کمال کا شہرہ سنا اور ایک امیر کو پیغام بر بنا کر بھیجا ہے کہ وہ رشتے کی درخواست کرے۔''وزیراعظم نے کہا۔''میں بھی تمہاری بہن کو دیکھنا چاہتا ہوں۔اسے ہمارے حضور میں لی کے محل میں پیش کرو'' بھائی نے آ کر بہن کو بتایا کہ اگلی شام وزیراعظم نے اسے محل میں آنے کی دعوت دی ہے۔بہن نے کہا۔''تم بھی ضرور چلنا۔جب میں وہاں پہنچوں تو استقبال کو موجود رہنا۔''

اگلی شام مقررہ وقت پر وزیراعظم محل میں آئے اور نو ہو آن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔اسے حضور میں پیش کیا گیا اور پھر سب نے بہت سی شراب پی، اور نو ہو آن نے ساز بجا کر سنایا، اور وزیراعظم گیت کے ختم ہونے سے پہلے ہی وجد میں آ گئے، اور......''

اس زمانے کا معاشرتی پس منظر یہ ہے کہ جو میں نے عرض کیا۔اس فضا میں اہل کمال خواتین اور فارغ البال اہل علم پروان چڑھے اور انہی لوگوں نے چین میں نثر کی ترویج میں پہلا اہم اقدام کیا۔اس زمانے کی خواتین فن گفتگو کی ماہر تھیں، لکھ اور پڑھ سکتی تھیں اور کسی نہ کسی ساز کے بجانے میں بھی مہارت رکھتی تھیں۔ان میں وہ تمام مجلسی اور ادبی خوبیاں ہوتی تھیں جو مردوں اور عورتوں کی باہمی مجلسی زندگی کو خوش آئند بنا سکتی ہیں۔یہ معاشرہ اور اس کی فضا امیرانہ تھی کیونکہ جیسا کہ اوپر لکھی ہوئی کہانی سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا، وزیراعظم کے سامنے باریابی بہت مشکل تھی۔لیکن اسی وزیراعظم نے جب یہ سنا کہ فلاں خاتون موسیقی میں درک رکھتی ہے اور پرانے علوم کی بھی ماہر ہے تو اس نے باصرار تمام اس خاتون سے ملاقات کی۔یہ فراغت کی وہ زندگی ہے جو چین کے قدیم فلسفیوں اور مجلسی لوگوں نے بسر کی۔ان قدیم چینی فلسفیوں کی کتابیں اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان لوگوں نے باہم گر بحث مباحثہ کیا اور اسے بعد میں قلمبند کر لیا۔

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جس معاشرے کو فارغ البالی نصیب ہو گی اور جس کے پاس وقت کی فراوانی ہو گی۔صرف اسی میں فن گفتار پیدا ہو سکتا ہے۔یہ بھی ظاہر ہے کہ فن گفتار کے وجود ہی سے انشائے عالیہ کے فن پارے وجود میں آتے ہیں۔انسانی تہذیب کی تاریخ میں فن گفتار اور اچھی نثر لکھنے کا فن، دونوں کافی دیر میں

رواج پائے کیونکہ ان دونوں فنون کے لیے انسانی ذہن کی طراری اور چابک دستی کی ضرورت ہے اور یہ صرف فراغت کی زندگی میں ممکن ہے..... مجھے خوب احساس ہے کہ آج کل کمیونسٹوں کے خیال کے مطابق، فراغت کی زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس قابل نفرت طبقے کے فرد ہیں جو آسودگی اور امیری کی زندگی بسر کرتا ہے، اس لیے آپ انقلاب دشمن ہیں مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ سچی اشتراکیت اور سچی اشتمالیت کا مقصد ہی یہ ہے کہ دنیا کا ہر فرد، فراغت کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیا جائے، اور فارغ البالی سب کا حصہ ہو۔ اس لیے فراغت کی زندگی کا لطف اٹھانا کوئی جرم نہیں بلکہ ثقافت کی ترقی کا سارا دارومدار ہی اس بات پر ہے کہ فراغت سے موزوں اور مناسب فائدہ اٹھایا جائے اور فن گفتار ہی فراغت کے لمحوں سے موزوں اور مناسب فائدہ اٹھانے کی واحد صورت ہے۔ کاروباری لوگوں کو ایک لمحہ فراغت نصیب نہیں ہوتی۔ وہ دن بھر سخت مصروف رہتے ہیں اور شام کو کھانا کھاتے ہی بستر پر لیٹ کر گایوں بھینسوں کی طرح خراٹے لینے لگتے ہیں۔ ان لوگوں سے ثقافت کی خدمت کی بھلا کیا امید ہو سکتی ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کو فراغت کے لیے کوشش نہیں کرنی پڑتی بلکہ فراغت خواہ مخواہ اس پر ''ٹھونس'' دی جاتی ہے۔ مجبوری کی اس فراغت سے بھی اچھا ادب پیدا کیا گیا ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کوئی اعلیٰ پائے کا ادیب جس میں بڑا جوہر موجود ہے اپنا وقت فضول پارٹیوں اور سوشل تقریبوں میں خراب کر رہا ہے یا سیاسی معاملوں پر مقالے لکھ لکھ کر اس جوہر کو برباد کر رہا ہے تو ہمیں چاہیے کہ اسے جیل میں بند کر دیں۔ یہ اس پر بڑا احسان ہوگا کیونکہ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بادشاہ وین نے انسانی زندگی کے انقلابات پر فلسفے کی بہترین کتاب جیل میں لکھی تھی۔ اسی طرح سیماچی ان نے بھی چینی زبان کی بہترین تاریخ جیل ہی میں سپرد قلم کی۔ یہ بھی ہوا ہے کہ ادیب سیاسی زندگی میں مات کھا گئے یا یہ کہ ان کے وقت میں ملک کے سیاسی حالات بے حد ابتر تھے اور انھوں نے اس سے کنارہ کشی کر کے بہترین ادب پیدا کیا۔ چینی تاریخ میں اس کی مثال منگولوں کا عہد حکومت ہے جس میں عظیم ڈرامہ نویس اور عظیم مصور پیدا ہوئے۔ مانچو خاندان نے جب چین فتح کیا تو ابتر سیاسی حالات ہی نے شیہ تاعو اور پا تا شان جن جیسے اعلیٰ پایے کے مصور پیدا کیے۔ یہ عظیم شخصیتیں، حب وطن کے جذبے سے سرشار تھیں کیونکہ غیر ملکی حکومت کے جوئے تلے اپنے ملک کو کچلا ہوا دیکھ رہی تھیں اور انھیں اپنی قومی ذلت کا شدید احساس تھا اور اسی احساس نے انھیں آرٹ اور علم و ادب کے ساتھ ایسی والہانہ شگفتگی کا سبق

دیا۔ چین نے جو عظیم ترین مصور پیدا کیے ہیں۔ شیہ تاعوان باکمالوں میں سے ہے۔ مغرب میں اسے کوئی نہیں جانتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مانچو شہنشاہ ان فنکاروں کی ہرگز ہمت افزائی نہیں کرنی چاہتے تھے جو ان کی حکومت سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے عظیم ادیبوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے شاہی امتحانوں میں کامیاب نہ ہو سکے اور انھوں نے اپنی تمام تر دماغی صلاحیتیں ان کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ اس کی مثال شیہ نیا آن اور پولیوسین ہیں۔

شیہ نیا آن نے اپنے شاہکار ''سب انسان بھائی بھائی ہیں'' کے دیباچے میں دوستوں کی باہمی گفتار کے لطف کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے...... وہ لکھتا ہے:

''میرے سارے دوست اگر میرے گھر آئیں تو ان کی تعداد سولہ ہونی چاہیے لیکن سب کے سب ایک دفعہ میں کم ہی آتے ہیں مگر یہ بھی نہیں ہوتا کہ (بارش اور آندھی کے دنوں کو چھوڑ کر) کوئی میرے یہاں نہ آئے۔ اکثر دن چھ سات دوست آ جاتے ہیں۔ یہ دوست آتے ہی پینا شروع نہیں کر دیتے۔ وہ آرام سے بیٹھ جاتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے شراب کا ایک آدھ گھونٹ پی لیتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے نہیں پیتے کیونکہ وہ صحبت کا اصل لطف گفتگو کو سمجھتے ہیں، شراب کو نہیں۔ ہم لوگ آپس میں سیاسیات حاضرہ پر کوئی بات نہیں کرتے کیونکہ سیاسیات ہماری حد سے باہر ہے اور اس کی یہ بھی وجہ ہے کہ اس دوافتادہ مقام تک خبریں صحیح نہیں آتیں، محض سنی سنائی افواہیں سی ہوتی ہیں اور افواہوں پر بات چیت کرنا بالکل بے فائدہ ہے۔ ہم لوگ آپس میں دوسروں کے عیوب پر بھی بات چیت نہیں کرتے کیونکہ لوگوں میں عیوب نہیں ہوتے اور ہمیں کسی کی چغلی اور غیبت نہیں کرنی چاہیے۔ ہم ایسی باتیں نہیں کرتے جن سے کسی کو صدمہ پہنچے اس لیے ہماری باتوں سے کسی کو صدمہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ہم یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہیں لوگ اسے سمجھیں مگر لوگ پھر بھی نہیں سمجھتے کیونکہ جن معاملوں پر ہم بات کرتے ہیں وہ انسان کے دل کو گہرائیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور دنیا والوں کو اتنی فرصت کہاں کہ ایسی باتیں سن سکیں۔''

شیہ نے اپنی شاہکار کتاب، اسی اسلوب اور اسی پیرائے میں انہی جذبات کے ساتھ لکھی ہے اور یہ

کتاب صرف اس لیے لکھی جا سکی کہ مصنف کے پاس لامحدود فراغت تھی۔

یونانی نثر کی ترویج اور اس کا ارتقا بھی فراغت کے ایسے ہی معاشرتی ماحول میں ہوا۔ یونانی فکر نے جو سلاست اور جزالت پائی ہے اور یونانی نثر میں جو روانی موجود ہے وہ تمام تر فن گفتار کی بدولت ہے۔ اس کا بڑا ثبوت افلاطون کے مکالمات کے عنوان سے ملتا ہے۔ ''ضیافت'' والے مکالمے میں ہم دیکھتے ہیں کہ فرش پر چند اہل علم لیٹے ہیں اور شراب، پھلوں اور خوبصورت لڑکوں سے معمور فضا میں گفتار کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ یونانیوں نے گفتار کے فن کو عروج تک پہنچایا تھا اسی لیے ان کے خیالات اتنے واضح اور ان کا اسلوب اتنا سلیس ہے۔ ذرا اس کا مقابلہ آج کے علمی اسلوب سے کیجیے جو مشکل پسندی اور الجھاؤ کو اونچی علمی باتوں کے لیے ضروری سمجھتا ہے اور مشکل اصطلاحوں کے بغیر بات نہیں کرتا۔ اصل میں یونانیوں نے فلسفے کو خوش مذاقی کے ساتھ آمیز کرنا سیکھ لیا تھا۔ اسی لیے یونانی فلسفیوں کی کتابوں میں گفتگو کا اتنا دل کش انداز ملتا ہے۔ گفتار کی یہ دل کش فضا، گفتار کے لیے یونانی فلسفیوں کی دلی تمنا، حسن گفتار کی قدر اور گفتار کے لیے عمدہ جگہ کا انتخاب، یہ سب کچھ بڑے خوبصورت انداز میں فیڈرس کے ابتدائیے میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اسی سے ہمیں یونانی نثر کے ارتقا کا پس منظر معلوم ہوتا ہے۔

افلاطون کی کتاب ''ریاست'' بھی آج کل کی کسی ''جدید'' کتاب کے کسی اس طرح فقرے سے شروع نہیں ہوتی:

> ''انسانی تہذیب کے ارتقا کے مختلف مرحلوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی تہذیب، اختلاف نوعی سے اتحاد نوعی کی طرف ایک ارتقائے حرکی ہے...''

یا اسی قسم کی کوئی ناقابل فہم بکواس اس عظیم کتاب کا پیش خیمہ نہیں کیونکہ آج کل کی علمیت کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ بات کرو جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے۔ اس کے برعکس یہ عظیم کتاب اس خوش آئند فقرے سے شروع ہوتی ہے کہ:

> ''کل میں گلاؤکو کے ساتھ پائی اس گیا تاکہ دیوی کے سامنے اپنا سر جھکاؤں۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ دیوی کا جشن وہ لوگ کس طرح مناتے ہیں کیونکہ وہ لوگ یہ جشن پہلی بار برپا کر رہے ہیں......''

چینی فلسفے کے ابتدائی دور میں فضا ایسی ہی تھی کیونکہ اس وقت فکر و نظر دونوں صحت مند تھے۔ یونانی دانش و حکمت کی تصویر اس سے بے حد مشابہ ہے۔ ''ضیافت'' والے مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونان کے مرد ایسی ہی صحت مند فضا میں جمع ہیں اور بحث کا موضوع یہ ہے کہ المیہ ڈراموں کے ایک عظیم مصنف کو طربیہ تمثیلوں کا بھی مصنف ہونا چاہیے یا نہیں...... اس فضا میں سنجیدگی اور زندہ دلی، حسن مذاق اور فقرے بازی دونوں آمیز ہیں۔ لوگ سقراط کے شراب پینے کا مذاق اڑا رہے ہیں مگر وہ ایک طرف بیٹھا ہے، جب چاہتا ہے قدح (کٹورا) اٹھا کر چڑھا لیتا ہے اور جب چاہتا ہے شراب پینا بند کر دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے صراحی سے پھر جام کو لبریز کر لیتا ہے، کسی سے کوئی تعرض نہیں کرتا، کسی کی پروا نہیں کرتا۔ اس طرح وہ رات بھر باتیں کرتا رہتا ہے اور ارسطوفینس اور اگاتھان کے سوا حاضرین میں سے ہر شخص سو جاتا ہے۔ جب باتیں کرتے کرتے وہ ہر شخص کو سلا دیتا ہے اور صرف وہی ایک بیدار رہ جاتا ہے تو وہ جشن سے اٹھ کر چلا جاتا ہے اور لائی سی ام جا کر صبح کا غسل کرتا ہے اور سارا دن تازہ دم ہو کر گزارتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے دوستانہ گفتگو کے اسی ماحول میں یونان کا عظیم فلسفہ پیدا ہوا تھا۔

یہ بات پوچھنے کی نہیں اس لیے عرض کر دوں کہ مجلسی گفتگو کے باتمیز ماحول میں عورتوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے تاکہ گفتگو میں شگفتگی اور لطف پیدا ہو جائے جو گفتگو کی جان ہے۔ شگفتگی اور دل لگی کے بغیر بات چیت بڑی سنجیدہ اور بھاری بھرکم ہو جاتی ہے اور فلسفہ، زندگی سے دور ہو کر احمقانہ باتوں کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی جینے کے قرینے اور زندگی بسر کرنے کے فن کے بارے میں کسی ثقافت کو دلچسپی پیدا ہوئی تو عورتوں کو بھی مجلسوں میں شریک کرنے کا رواج پیدا ہو گیا۔ پیری کلیز کے عہد میں یونان کے شہر ایتھنز میں یہی ہوا اور پھر اسی کی مثال اٹھارہویں صدی کے فرانسیسی دیوان خانوں میں دیکھیے۔ چین میں عورتوں اور مردوں کی ملی جلی صحبتیں سخت ممنوع تھیں۔ پھر بھی چین کے اہل علم لوگ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ عورتیں بھی مجلس میں شریک ہوں۔ یہ عورتیں، بات چیت میں بھی حصہ لے سکتی تھیں۔ چین میں تین خاندانوں میں چن، سونگ اور منگ کے عہد حکومت میں ہی فن گفتگو کو زیادہ ترقی دی گئی تھی اور فن گفتگو ایک فیشن سا بن گیا تھا۔ ان زمانوں میں ہمیں سیہ تاؤیون، چاؤیون اور لیوجس ہیہ جیسی باکمال خواتین ملتی ہیں۔ چینی مرد ہمیشہ سے یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیویاں باعصمت ہوں اور دوسرے مردوں سے میل جول نہ

رکھیں۔ پھر بھی وہ ہمیشہ سے باکمال خواتین کی صحبت کے جویا رہے ہیں۔ چینی زبان کی تاریخ، ادب اٹھا کر دیکھیے، اس کا ڈیرے دار طوائفوں کی زندگی کے ساتھ کتنا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ گفتگو کے دوران میں محفل میں نسائی دل کشی اور دلنوازی کا مطالبہ ایک عالمگیر مطالبے کی حیثیت رکھتا ہے اور خواتین اس فن میں کسی سے پیچھے نہیں ہوتیں۔ میں ایسی جرمن خواتین سے ملا ہوں جو پانچ بجے شام سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک مسلسل باتیں کرسکتی ہیں۔ ایسی امریکی اور انگریز خواتین بھی ہیں جو معاشیات پر گھنٹوں بحث کرسکتی ہیں اور یہ وہ مضمون ہے جس کا مطالعہ کرنے کی ہمت مجھ میں تو پیدا ہی نہیں ہوئی۔ خیر اگر ایسی خواتین معاشرے میں نہ بھی ہوں جو کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز پر عالمانہ بحث کرسکیں۔ پھر بھی محفل میں چند خواتین کی موجودگی سے گفتگو میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خواتین اگر محض چپ چاپ باتوں کو سنتی ہی رہیں اور ان کے چہروں پر سوچ کے آثار ہویدا ہوں تو کافی ہے۔ بیوقوف مردوں کی بہ نسبت ایسی خواتین سے بات کر کے مجھے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔

4- چائے اور دوستی

میں سمجھتا ہوں کہ انسانی کلچر اور انسانی مسرت کے پیش نظر، انسان کی تاریخ میں تمباکو نوشی، شراب نوشی اور چائے نوشی سے بڑھ کر کوئی اہم ایجادات نہیں ہوئیں۔ یہ تینوں چیزیں انسان کے لیے بے حد اہم ہیں۔ اس کے فراغت کے لمحوں کا لطف انہی سے وابستہ ہے۔ دوستی اور یار باشی، ملنساری اور بے تکلفی، ان سب کا مزہ انہی تینوں چیزوں کی بدولت ہے...... تمباکو نوشی، شراب نوشی اور چائے نوشی، تینوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تینوں کی تینوں ملنساری اور معاشرتی تعلقات میں بہت ہاتھ بٹاتی ہیں۔ دوسری بات تو یہ ہے کہ ان تینوں سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا جس طرح کھانے سے بھرتا ہے اور اس لیے کھانے کے وقتوں کے درمیان میں ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ تیسری مشترک خوبی یہ ہے کہ تینوں کا مزہ نتھنوں کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے، یعنی یہ ہماری قوت شامہ پر براہ راست اثر کرتی ہیں۔ ان کا اثر کلچر پر اتنا زبردست ہے کہ مغربی ملکوں میں گاڑیوں میں کھانے کے ڈبوں کے ساتھ، تمباکو نوشی کے لیے بھی الگ ڈبے ہوتے ہیں اور عام ہوٹلوں کے ساتھ شراب پینے کے ریستوران اور چائے خانے بھی عام ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ چین اور انگلستان، دونوں ملکوں میں چائے نوشی ایک قومی عادت، ایک ملکی ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔

تمباکو، شراب اور چائے کا مزہ ایسی فضا میں حاصل ہوسکتا ہے جو فراغت اور اطمینان، دوستی اور بھائی

چارے سے معمور ہو۔ جن لوگوں میں بھائی چارے اور برادری کا جذبہ ہوگا اور جو دوست بنانے میں بڑے محتاط ہوں گے اور جن کو خدا نے فراغت کی زندگی کی صحیح قدر بخشی ہوگی۔ صرف وہی لوگ تمبا کو، شراب اور چائے سے مزہ لینے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ان چیزوں سے لطف سے بھائی چارے اور ملنساری کا عنصر نکال دیجیے تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟...... گویا ان چیزوں کا لطف مناسب لوگوں کی صحبت کے ساتھ وابستہ ہے۔ چاندنی کی سیر، برفباری کا نظارہ کرنا یا پھولوں کی شگفتگی سے لطف اٹھانا بھی اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم مذاقی اور ہم مشربی میسر ہو۔ یہی حال ان تینوں کا ہے۔ فن زندگی کے ماہر چینی مفکروں نے محفل کی مناسبت پر اسی لیے بڑا زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ فلاں قسم کے پھولوں سے خاص خاص قسم کے لوگوں کی صحبت میں لطف اٹھانا چاہیے۔ ان کا قول ہے کہ خاص قسم کے قدرتی مناظر کا لطف صرف خاص قسم کی عورتوں کی معیت میں حاصل ہوسکتا ہے۔ وہ اصرار کرتے ہیں کہ اگر برستی بوندوں کے ساز و آواز سے پورا پورا لطف اٹھانا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ساون کے دن، پہاڑوں سے گھرے ہوئے ایک خاموش مندر میں اکیلے، بانس کی کھری چارپائی پر لیٹے ہوں۔ مختصر یہ کہ ہر چیز کا لطف اٹھانے کا ایک مخصوص موڈ ہوتا ہے اور یہ موڈ غلط لوگوں کی موجودگی سے تباہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے جو شخص زندگی بسر کرنے کے فن کا ماہر بننا چاہتا ہے یا جو شخص زندگی کے مزے لینے کا خواہشمند ہے اس کے لیے ابتدائی بات بلکہ اولین شرط یہ ہے کہ وہ اپنے ہم مذاق اور ہم مشرب دوستوں کی تلاش کرے۔ ان کی دوستی قائم رکھنے کے لیے اتنی جانکاہی اور کوشش کرے جتنی اچھی بیوی اپنے شوہر کو اپنا بنانے کے لیے کرتی ہے یا جس طرح شطرنج کا رسیا، کسی دوسرے شاعر سے محض ملاقات کی خاطر ہزاروں میل کا سفر طے کرنے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔

گویا اصل چیز ماحول وفضا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ایک علم دوست شخص کے ماحول زندگی کو سمجھ لیں اور یہ بھی جان لیں کہ وہ فضا کیا ہوگی جس میں زندگی کے مزے اٹھائے جاسکتے ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو وہ دوست ہیں جن کے ساتھ آپ زندگی کے مزے لیں گے۔ یہ لازمی ہے کہ مختلف قسم کی تفریحوں اور لذتوں کے لیے آپ مختلف قسم کے دوست انتخاب کریں اگر آپ گھوڑے کی سواری کے لیے جائیں اور اپنے ساتھ ایک کتابی اور نہایت سنجیدہ قسم کے دوست کو لے جائیں تو یہ بڑی حماقت ہوگی۔ اسی طرح اگر موسیقی کا کوئی کانسرٹ سننے جائیں اور آپ کا ساتھی موسیقی سے بالکل نابلد ہو تو آپ کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔

اس لیے ایک چینی ادیب نے لکھا ہے:

''پھولوں کی شگفتگی کا لطف اٹھانے کے لیے فراخ دل دوست تلاش کرو..... اگر ڈیرے دار طوائفوں کے کوٹھے پر جانا ہے تو اپنے لیے نہایت اعتدال پسند دوست ڈھونڈو..... اونچے پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے بڑے رومانی مزاج کے دوست ہونا ضروری ہیں اگر کشتی کی سیر کو جانا ہے تو ایسے دوست ساتھ ہونے چاہئیں جن کے مشرب وسیع اور دل آزاد ہوں۔ چاند کا سامنا کرنے کے لیے ایسے دوست چاہئیں جو ٹھنڈے فکر و نظر کے مالک ہوں۔ برفباری کا لطف اٹھانا مقصود ہے تو خوبصورت دوست بناؤ۔ اور مے نوشی کی محفل کے لیے ایسے دوست ہونے چاہئیں جن میں ذوق سلیم اور دلنوازی موجود ہو۔''

مختلف موقعوں پر مختلف قسم کی تفریحوں اور زندگی کی لذتوں کا مزہ لینے کے لیے آپ نے مختلف قسم اور مزاج کے دوست چن لیے اور ان کی دوستی حاصل بھی کر لی..... اگلا مرحلہ یہ ہے کہ آپ مناسب ماحول تلاش کریں..... اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپ کا گھر دلہن کی طرح آراستہ ہو۔ صرف اتنا ہو کہ گھر خوبصورت جگہ واقع ہوتا کہ آس پاس کھیتوں میں جایا جا سکے اور یا دریا کے کنارے گھنے درختوں کے سائے میں آرام سے لیٹا جا سکے۔ گھر کی اپنی ضروریات بہت سادہ ہیں۔ مثلاً ایک مکان کا نقشہ یہ ہے:

''گھر میں کئی کمرے ہوں اور اس کے اردگرد کھیت پھیلے ہوں۔ ایک چھوٹا سا تالاب بھی ہو۔ گھر کی کھڑکیاں (روشندان) ٹوٹے ہوئے مٹکوں کے خالی جوف سے بنی ہوں۔ منڈیریں کندھے تک بلند ہوں۔ فراغت کے لمحوں میں روئی کے گدوں اور سبزی کی غذا کا لطف اٹھانے کے بعد روح اتنی وسیع، اتنی لطیف ہو جاتی ہے کہ ساری دنیا، کل کائنات اس کی پہنائی میں سما جاتی ہے۔ ایسے خاموش مکان کے لیے ضروری ہے کہ مکان کے سامنے، ولونگ کے پیڑ ہوں اور عقب میں ہرے بانس کے جھنڈ۔ مکان کے جنوبی چھجے بڑھے ہوئے ہوں اور شمالی طرف چھوٹی کھڑکیاں ہوں جنہیں بہار اور سرما میں بارش اور ہواؤں سے بچنے کے لیے بند کیا جا سکے اور گرما اور خزاں میں ہوا کے لیے کھولا جا سکے۔ ولونگ کے پیڑ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے پتے بہار اور سرما میں گرتے ہیں۔ اس طرح ان موسموں میں

دھوپ خوب آ سکتی ہے مگر گرما اور خزاں میں اس کی چھاؤں مکان کو ٹھنڈا رکھ سکتی ہے۔"

ایک اور مصنف نے مکان کا یہ نقشہ کھینچا ہے:

"مکان ایسا بنانا چاہئے جس کی کئی شاخیں ہوں۔ اس کے گرد، جن درختوں کی باڑ ہو، ایک برآمدہ ہو جس پر گھانس پھونس کی چھت ڈال دی جائے۔ باغ میں بانس کے پیڑ پھولوں کے پودے اور پھلوں کے درخت لگائے جائیں اور باقی حصے میں سبزیاں ترکاریاں بوئی جائیں۔ کمرے کی دیواریں آرائش سے خالی ہوں۔ سبزیوں کی رکھوالی کے لیے ایک کسان بچہ رکھا جائے، اچھی کتابیں رکھی جائیں، تار کا ساز ہو، شطرنج ہو تا کہ دوست آئیں تو محفل کا لطف آئے......"

ایسے ماحول میں گھریلو پن ہوگا" میرے گھر میں ہر تکلف کو طاق پر رکھ دیا جائے گا اور صرف وہی لوگ آ سکیں گے جو میرے دلی دوست ہوں گے۔ ان کو میں وہی اچھا یا معمولی کھانا کھلاؤں گا جو میں خود کھاتا ہوں۔ ہم باتیں کریں گے، ہنسیں بولیں گے اور اپنے وجود تک کو فراموش کر دیں گے۔ ہم دوسرے لوگوں کی اچھائی برائی کی بات نہیں کریں گے۔ اور دنیوی شان و شوکت یا دولت و حشمت سے بالکل بے نیاز ہوں گے۔ فرصت کے لمحوں میں ہم قدیم اور جدید ادیبوں اور فلسفیوں کی باتیں کریں گے اور سکون کے لمحوں میں پہاڑوں اور دریاؤں کے ساتھ جی بہلائیں گے۔ پھر ہم ہلکی مصفا چائے پیئیں گے اور اس خوشگوار خلوت کو اچھی شراب سے گرمائیں گے۔ یہ ہے دوستی کے بارے میں میرا نظریہ۔"

اس خوشگوار فضا میں ہم اپنے حواس کو آسودہ کر سکتے ہیں۔ اسی سے رنگ، مشام اور آواز کی حس آسودگی حاصل کرتی ہے۔ گویا تمبا کو اور کچھ پینا دونوں مزے لینے کے لیے ضروری ہیں اور اس ماحول میں بقول شخصے:

"ہم چاندنی رات میں عود و عنبر جلاتے ہیں اور کسی قدیم ساز پر کوئی راگنی بجاتے ہیں۔ آن کی آن میں ہمارے سینوں سے غموں کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ ساری احمقانہ خواہشیں اور بڑائی کی فضول امنگیں رخصت ہو جاتی ہیں۔"

پھر ہم پوچھتے ہیں۔ "اس خوشبو کی ماہیت کیا ہے؟ اس کے دھوئیں کا رنگ کیسا ہے؟ اور کھڑکیوں کی جھلملیوں سے وہ سایہ سا کیسا گزرتا جا رہا ہے؟ میری انگلیوں کی پوروں میں سے کیسی آواز چھن چھن کر آ رہی ہے؟...... یہ لطف، یہ مسرت کیا ہے جس نے ہمارے دلوں کو چونچال کر دیا ہے اور دنیا کی ہر چیز ہمیں بھلا دی ہے؟......

اور اس لامحدود کائنات کی حقیقت کیا ہے؟''

روح کی اس طہارت اور دل کے اس سکون کے بعد مناسب دوستوں کی محفل میں، انسان چائے کا لطف اٹھانے کے قابل بنتا ہے۔ چائے پرسکون محفلوں کے لیے ہی ایجاد کی گئی تھی ویسے ہی جیسے شراب ہنگامہ پرور مجلسوں کے لیے ایجاد ہوئی تھی۔ چائے کی خاصیت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ ہمیں زندگی کے بارے میں پرسکون غور وفکر پر مائل کرتی ہے۔ اگر آس پاس روتے بچوں کا غل غپاڑا ہو یا عورتوں نے شور مچا رکھا ہو یا سیاسی ہنگامہ آراؤں نے بک بک لگا رکھی ہو تو چائے پینے کا سارا لطف تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات اتنی ہی خطرناک ہے جتنی یہ کہ برستی بارش میں یا ابر آلود دن میں چائے کی پتیاں کھیتوں سے چنی جائیں۔ چائے کی پتیاں صاف دنوں میں علی الصبح چنی جاتی ہیں۔ جب پہاڑوں کی ڈھلانوں اور چوٹیوں پر نسیمِ سحر، صاف اور شفاف ہوتی ہے اور ان پتیوں پر شبنم کی بھینی باس (خوشبو) باقی ہوتی ہے۔ اسی لیے چائے کا لطف ابھی تک شبنم کی طلسمی خوشبو اور لطافت کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ تاؤ فلسفے کی تعلیم ہے کہ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ رہنا چاہیے اور یہ کہ کائنات کی زندگی اور بقا، نر اور مادہ قوتوں کے باہمی ملاپ پر منحصر ہے۔ اسی فلسفے کے مطابق، شبنم ''آسمان اور زمین کا جوہر'' قرار پاتی ہے کیونکہ رات کو یہ دو قوتیں (زمین و آسمان) مل جاتے ہیں چنانچہ یہ خیال عام ہے کہ شبنم ایک طلسماتی غذا ہے جو بڑی لطیف، بڑی شفاف اور بڑی ہلکی ہے اور جو شخص یا جو حیوان کافی مقدار میں اس شبنم کو پی لے وہ امر ہو سکتا ہے۔ انگریز مصنف ٹامس ڈی کونسی نے تو یہ کہا تھا کہ ''چائے اہل دماغ لوگوں کا محبوب مشروب رہے گی۔'' لیکن چینی اس سے بھی آگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چائے کا تعلق اس عالی دماغ صاحب کمال کے ساتھ لازم ہے جو دنیا سے الگ تھلگ گوشہ نشین ہو۔

اس اعتبار سے چائے زمین پاکیزگی کی زندہ علامت بن جاتی ہے۔ اس کے لیے یہ لازمی شرط ہے کہ اس کی تیاری میں بڑی زبردست صفائی اور پاکیزگی سے کام لیا جائے۔ ٹہنیوں سے چائے کی پتیوں کے چننے، ان پتیوں کو مناسب گرمی میں پکانے اور پھر انہیں ڈبوں میں بند کرنے سے لے کر چائے کا رنگ نکالنے اور چائے پینے تک اگر کسی مرحلے پر بھی انتہائی صفائی سے کام نہ لیا گیا تو چائے برباد ہو جائے گی۔ اگر کسی مرحلے پر بھی ناصاف چکنے ہاتھوں یا چکنے پیالوں کو چائے کے قریب لایا گیا تو چائے چائے نہیں رہے گی چنانچہ چائے کا لطف ایسے ماحول ہی میں آ سکتا ہے جو عیش و عشرت کے شائبے سے پاک اور منزہ ہو اور جہاں خیالات بھی

بالکل مطہر اور پاکیزہ ہوں کیونکہ اگر آپ کو کسی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منانی ہیں تو آپ کی رفیق بزم چائے نہیں، شراب ہوگی اور جب کوئی طوائف اس قابل ہوجائے کہ س کے پاس بیٹھ کر انسان چائے پی سکے تو وہ طوائف نہیں رہے گی۔ وہ اس طبقے کی فرد بن جائے گی جسے چینی شاعروں اور عالموں نے اتنا اچھا سمجھا ہے۔ سونگ پؤ نے ایک بار چائے کو ایک معصوم دوشیزہ سے تشبیہ دی تھی مگر بعد کے ایک نقاد اتی ان پی ہنگ نے کہا کہ اگر چائے کو کسی عورت ہی سے تشبیہ دینی ہے تو اسے ماکو پری کے ساتھ نسبت دینی چاہیے اور یہ کہ ''چمپئی رنگ اور لچکتی ہوئی کمر والی نازنینوں کو حریری پردوں والے بستروں کی زینت رہنے دیجئے۔ انہیں، چٹانوں اور چشموں کو چھونے کیوں دیتے ہیں؟'' اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ''دنیا کے شوروشغب کو بھولنے کے لیے چائے پینی چاہیے۔ چائے ان لوگوں کے لیے نہیں جو مرغن غذائیں کھاتے ہیں اور ریشمی کپڑے پہنتے ہیں۔''

چائے کے بارے میں مشہور کتاب قدیم چاءلو میں لکھا ہے کہ چائے کا مزہ لینے کا راز یہ ہے کہ اس کے رنگ، اس کی باس اور اس کی خوشبو سے حظ اٹھایا جائے اور چائے تیار کرنے کے تین اصول، لطافت، خشکی اور صفائی ہیں'' چائے کی ان خوبیوں کو پہچاننے اور ان سے حظ اٹھانے کے لیے سکون ضروری چیز ہے اور یہ اسی کو سزاوار ہے جو ''دنیا کی گرمیٔ ہنگامہ کو ٹھنڈے دل سے دیکھ سکے'' سونگ خاندان کے عہد حکومت سے لے کر آج تک چائے کے ماہرین کا یہ خیال رہا ہے کہ ہلکی پیلی چائے کا پیالہ بہترین ہوتا ہے۔ اس کی باس اتنی نازک اور لطیف ہوتی ہے کہ پینے والا اگر خیالات میں کھویا ہویا آس پاس لڑائی کا غل مچ رہا ہو یا نوکر آپس میں جھگڑ رہے ہوں تو اسے یہ باس بالکل محسوس نہیں ہوگی یہاں تک کہ اگر یہ چائے کوئی بدصورت خادمہ پیش کرے تو بھی یہ باس بالکل محسوس نہیں ہوگی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ محفل محدود اور مخصوص ہو کیونکہ یہ لکھا ہے کہ ''چائے پینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مہمان بہت کم ہوں۔ مہمان زیادہ ہوں گے تو شور زیادہ ہوگا اور شور سے چائے کی لطافت اور دلنوازی جاتی رہے گی۔ اکیلے چائے پینے کو ''گوشہ گیری'' کہا جاتا ہے۔ دو آدمی پئیں تو اسے ''پرسکون'' قرار دیا جائے گا۔ تین چار کی محفل میں چائے کا دور چلے تو اسے ایک ''دلنواز'' شے قرار دیا جائے گا۔ پانچ چھ اشخاص کے ساتھ چائے پینے کو ''عامیانہ'' کہا جائے گا اور سات آٹھ آدمیوں کے ساتھ چائے پینے کو تحقیر کے لہجے میں ''فیاضی برتنا'' قرار دیا جائے گا۔''

ایک اور مصنف کا قول ہے کہ ''بڑی سی چائے دانی سے پیالہ در پیالہ انڈیلنا اور سارا پیالہ غٹاغٹ ایک

گھونٹ میں خالی کر دینا یا چائے کو پھر تھوڑی دیر بعد گرم کرنا، یا بہت تیز چائے بنوانا کسانوں اور مزدوروں کا شیوہ ہے جو محنت کے بعد اپنا پیٹ بھر لینے کے لیے چائے پیا کرتے ہیں۔ اس صورت میں چائے کا ذائقہ اور اس کی خوشبو تلاش کرنا لاحاصل ہے......''

چینی مصنفوں نے چائے بنانے میں بڑی صحت اور صفائی پر زور دیا ہے۔ اسی لیے وہ مصر رہتے ہیں کہ چائے دم کرنے میں ذاتی توجہ دینی چاہئے۔ چائے عام طور پر باورچی خانے سے دور کسی کمرے میں یا باہر الگ چولہے پر ابالی جاتی ہے۔ ملازم لڑکوں کو چائے بنانے کی تعلیم آقا کو خود دینی چاہیے۔ انہیں لازم ہے کہ صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ پیالیوں کو ہر صبح اچھی طرح دھوئیں (صرف تولیے سے صاف نہ کر دیں) اپنے ہاتھ دن میں کئی بار دھوتے رہیں اور اپنے ناخن صاف رکھیں۔ ''اگر تین مہمان ہوں تو ایک ہی چولہا کافی ہوگا۔ اگر مہمانوں کی تعداد پانچ چھ تک ہو تو دو الگ الگ چولہے اور کیتلیاں درکار ہوں گی اور دونوں چولہوں پر الگ الگ ملازم چائے کے دم ہونے کا خیال رکھیں گے کیونکہ اگر ایک ہی کو دونوں طرف دھیان دینا پڑا تو دیر بھی ہوگی اور کچھ نہ کچھ گڑبڑ بھی ضرور ہوگی۔''

تاہم چائے کے رسیا، خود چائے بنانے میں بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو چائے کا آدھا مزہ اس کی تیاری میں ہے جس طرح، تربوز اور خربوزے کے بیج کھانے کا آدھا مزہ یہ ہے کہ انہیں دانتوں میں توڑا جائے۔

عام طور پر چائے کا چولہا کھڑکی کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس میں خوب سرخ کوئلے ہوتے ہیں۔ میزبان جب کوئلے دہکاتا ہے اور کیتلی سے ہلکی ہلکی بھاپ نکلنے لگتی ہے تو بڑی اہمیت محسوس کرتا ہے۔ بڑے سلیقے سے وہ چھوٹی سی چائے دانی اور چائے کے چار ننھے ننھے پیالے ٹرے میں رکھتا ہے۔ یہ پیالے کافی کے پیالوں سے کچھ چھوٹے ہوتے ہیں۔ چائے کی پتیوں کا مرتبان، اس ٹرے کے قریب ترتیب سے رکھتا ہے اور س دوران میں مہمانوں سے کچھ باتیں بھی کرتا جاتا ہے لیکن اتنی باتیں نہیں کہ وہ اپنے فرض کو فراموش کر دے۔ پھر مڑ کے چولہے کی طرف دیکھتا ہے اور جب کیتلی میں پانی سوں سوں کرنے لگتا ہے تو پھر چولہے کی ہ میں ننھے ننھے بلبلے اٹھ رہے ہیں، وہ بلبلے جنہیں اصطلاح میں ''چشم ماہی'' کہا جاتا ہے۔ وہ کیتلی کو پھر سے ڈھک دیتا ہے...... یہ پانی کا ''پہلا ابال'' ہے۔ پھر وہ کان لگا کر سنتا ہے کہ پانی کی سوں سوں بڑھ کر ہلکی سی

گڑگڑاہٹ بن گئی ہے اور ننھے ننھے بلبلے اب کیتلی کے چاروں طرف ابھر رہے ہیں۔ اسے اصطلاح میں ''دوسرا ابال'' کہتے ہیں...... یہی وہ مرحلہ ہے جس پر وہ بڑی احتیاط سے کیتلی کی ٹونٹی کی طرف دیکھتا ہے۔ ان بخارات کو دیکھتا ہے جو اس ٹونٹی سے نکلیں گے۔ بس اس ''تیسرے ابال'' سے ذرا پہلے جب پانی ابلتی ہوئی لہروں کی طرح کیتلی میں کھولنے لگے گا، وہ کیتلی کو آگ سے اتار لے گا اور چائے دانی کو اندر اور باہر دونوں طرف سے کھولتے ہوئے پانی سے دھوڈالے گا پھر فوراً پتیوں کی مناسب مقدار اس میں ڈال کر پانی ڈالے گا اور چائے کا رنگ تیار ہو جائے گا...... اس قسم کی چائے کا قوام بہت گاڑھا ہوتا ہے۔ چھوٹی سی چائے دانی میں مشکل سے ننھی منی چار پیالیوں کی گنجائش ہوتی ہے لیکن اس چائے دانی کا تیسرا حصہ چائے کی پتیوں سے بھرا ہوتا ہے۔ چونکہ چائے کی پتی زیادہ ڈالی جاتی ہے اس لیے چائے فوراً پیالیوں میں ڈال دی جاتی ہے اور فوراً پینی شروع کر دی جاتی ہے...... یہ چائے ختم ہو جاتی ہے تو کیتلی میں تازہ پانی ڈال کر اسے پھر آگ پر رکھ دیا جاتا ہے تاکہ دوسری بار چائے تیار کی جا سکے۔ اصل میں چائے کی اس دوسری کشید، اس دوآتشہ کو بہترین چائے سمجھا جاتا ہے۔ پہلی کشید کو 13 سالہ لڑکی سے تشبیہ دی جاتی ہے مگر دوسری کشید کو سولہ برس کی میٹھی عمر کی دوشیزہ کہا جاتا ہے اور تیسری کشید کو پوری عورت کے مشابہ قرار دیا جاتا ہے...... ویسے اہلِ ذوق اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ انہیں پتیوں سے تیسری بار بھی چائے کشید کی جائے مگر آخر ''عورت'' (تیسری کشید) کے ساتھ بھی تو لوگ زندگی بسر کرتے ہی ہیں۔

چائے تیار کرنے کا جو طریقہ میں نے اوپر بیان کیا ہے اس کا رواج میرے صوبے میں ہے۔ شمالی چین میں تو یہ فن کسی کو نہیں آتا۔ ویسے عام طور پر چین میں بڑی بڑی چائے دانیاں استعمال کی جاتی ہیں اور چائے کا عمدہ رنگ وہ سمجھا جاتا ہے جو نہایت صاف زردی مائل سنہری ہو۔ انگریزی چائے کی طرح یہ رنگ کبھی گہرا بھورا یا گہرا قرمزی نہیں ہوتا۔

یہ یاد رہے کہ چائے بنانے اور پینے کا جو طریقہ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ صرف اہل ذوق کے لیے مخصوص ہے۔ دکاندار اس طرح چائے بنا کر نہیں بیچتے۔ اس کے علاوہ عام لوگوں سے بھی ایسی نفاستوں کی امید نہیں کی جا سکتی۔ نہ یہ شرائط ایسی صورت میں پوری ہو سکتی ہیں جب چائے منوں کے حساب سے استعمال کی جاتی ہو اسی لیے چاءآسو کے مصنف سی ایس شو نے کہا ہے: ''جب بہت بڑی پارٹی ہو اور مہمان آ جا رہے

ہوں تو انھیں صرف شراب پلائی جاسکتی ہے۔ جن لوگوں سے نئی نئی ملاقات ہو یا جو لوگ عام ملنے والے ہوں انھیں ہلکی قسم کی چائے پلانی چاہیے۔ اصل چائے کا موقع صرف اس وقت ہوتا ہے جب دلی دوستوں کی محفل ہو، ہم مذاقی اور ہم مشربی نے رنگ جمایا ہو، سب لوگ خوش و خرم ہوں اور نہایت اچھی اچھی باتیں ہو رہی ہوں۔ اس وقت ہمیں ملازم سے کہنا چاہیے کہ آگ روشن کرے اور تازہ پانی کیتلی میں رکھے، اور پھر یہ دیکھا جائے کہ حاضرین کا لحاظ رکھتے ہوئے، کتنی پیالیاں اور کتنی چائے دانیاں چاہئیں اور کتنے چولہوں پر چائے دم کی جائے'' ...... چائے کی ایسی ہی محفل کا ذکر ایک اور جگہ یوں ملتا ہے: ''رات کا وقت ہے اور ہم ایک پہاڑی بنگلے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چولہے پر پہاڑی چشمے کا پانی چائے کے لیے ابالا جا رہا ہے۔ آگ پانی کو گرم کرنے کے لیے جب بڑھتی ہے تو ایسی ہی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے دیوار کے درختوں میں ہلکی ہوا کی سرسراہٹیں ہوں۔ ہم چائے پیالیوں میں ڈالتے ہیں اور اس کی ہلکی تابانی چاروں طرف پھیلتی ہے۔ ایسے لمحوں میں دل کو جو آنند ملتا ہے اسے عام آدمیوں کے ساتھ کسی طرح بانٹا ہی نہیں جاسکتا۔''

چائے کے سچے پیاروں کو چائے کی تیاری اور ساز و سامان میں اتنا لطف ملتا ہے کہ وہ صرف اسی لیے جیتے ہیں۔ اس کی مشہور مثال سائی سیا نگ کی ہے جو بڑھاپے کی وجہ سے خود چائے نہیں پی سکتا تھا لیکن عادت سے مجبور ہر روز اسی طرح چائے تیار کرتا تھا۔ ایک اور باذوق عالم چاؤ وین فو صبح سے شام تک، مقررہ وقت پر چھ بار چائے بناتا تھا۔ اسے اپنی چائے دانی سے اتنی محبت تھی کہ مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق یہ اس کے ساتھ دفن کی گئی۔

گویا چائے کا مزہ لینے کا فن اور اس کی ترکیب یہ قرار پائی کہ:

''اول: چائے بڑی نازک چیز ہے۔ اس کی باس (خوشبو) اور مزے کے کسی بھی چیز سے آلودہ ہو جانے یا خراب ہونے کا سخت خطرہ ہوتا ہے۔ اس لیے چائے کی تیاری میں ہر مرحلے پر ہر ممکن صفائی سے کام لیا جائے۔ چائے کی پتی کو شراب، خوشبو اور دوسری باس والی چیزوں سے دور رکھا جائے۔ ان لوگوں کو چائے کی پتی کو چھونے نہ دیا جائے جو ایسی چیزوں میں ہاتھ ڈالتے رہتے ہیں۔

دوم: چائے کی پتی کو خشک اور ٹھنڈی جگہ رکھیے۔ مرطوب موسم میں استعمال کی تھوڑی سی

مقدار تو چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں رکھی جائے اور باقی ذخیرہ بڑے بڑے بند مرتبانوں میں رکھا جائے جنھیں اشد ضرورت کے بغیر کبھی نہ کھولا جائے اگر چائے کی ساری پتی مرطوب ہو کر سیل جائے تو اسے ہلکی آگ پر دھیرے دھیرے بھون لیا جائے یا پھر برتن میں پھیلا کر اسے پنکھے کی ہوا دی جائے تا کہ پتی بدرنگ اور بدہیئت نہ ہو جائے۔

سوم: اچھی چائے بنانے کا آدھا دارومدار اس بات پر ہے کہ ابالنے کے لیے عمدہ اور ستھرا پانی لیا جائے۔ اس سلسلے میں پہاڑی چشموں کا پانی سب سے عمدہ ہوتا ہے۔ دوسرے نمبر پر دریا کا پانی ہے۔ تیسرے درجے پر کنوئیں کا پانی ہے۔ پانی کے نلوں کا پانی اگر تالابوں سے آتا ہو تو اسے بھی اچھا سمجھنا چاہیے کیونکہ یہ بھی اصل میں پہاڑوں سے آتا ہے۔

چہارم: چائے کے نادر پیالوں کا مزہ اٹھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک وقت میں بہت سے دوست جمع نہ ہوں۔ اور جو دوست موجود ہوں وہ خاموش طبع اور سنجیدہ طبیعت کے ہوں۔

پنجم: چائے کا مناسب رنگ عام طور پر پیلا سنہری ہوا کرتا ہے۔ گہری بھوری یا گہری قرمزی چائے کو دودھ ملا کر پینا چاہیے۔ یا اس میں لیموں کا عرق ملا دیا جائے یا اس میں کچھ پیپر منٹ ڈال کر پیا جائے تا کہ اس کا کڑوا کسیلا ذائقہ کچھ ٹھیک ہو جائے۔

ششم: بہترین چائے وہ ہے جس کی باس اور ذائقہ پینے کے ایک آدھ منٹ بعد ہی کام و دہن کو سرشار کرنا شروع کر دیں۔

ہفتم: چائے ہمیشہ تازہ بنا کر پینی چاہیے اور اسے فوراً پی لینا چاہیے اور اگر کشید کو کافی دیر گزر چکی ہو تو اسے چائے دانی میں زیادہ عرصہ نہ رکھنا چاہیے

ہشتم: چائے، پانی کو ابال کے درجے تک لا کر بنائی چاہیے۔

نہم: چائے میں کسی چیز کی ملاوٹ سخت ممنوع ہے۔ ان لوگوں کے لیے البتہ کچھ رعایت کی جا سکتی ہے جو چائے کی باس کے علاوہ کسی اور باس کے بھی شیدائی ہوں، مثلاً اس میں چنبیلی وغیرہ کی خوشبو چاہتے ہیں۔

دہم: چائے کی بہترین باس وہ ہے جسے ''بچے کے جسم'' کی خوشبو کہا جاتا ہے۔

چینیوں کا عام دستور ہے کہ کسی چیز کا لطف اٹھانے کے مناسب موقع محل کا تعین کر دیتے ہیں اور اس ماحول کا بھی تعین کرتے ہیں جس میں اس چیز سے مزہ لیا جائے۔ اس سلسلے میں چائے پر ایک عمدہ رسالے پی آسٹو میں یوں لکھتا ہے:

i- چائے کب پینی چاہیے......

جب دل خالی ہو اور ہاتھ بیکار ہوں،
جب آپ شعر پڑھتے پڑھتے تھک جائیں،
جب خیالات پریشان ہوں،
جب گیت اور گانے سنے جا رہے ہوں،
جب ایک گیت مکمل کیا جائے،
جب کوئی شخص تعطیل کے دن گھر میں بند رہے،
جب آپ ساز بجا رہے ہوں اور تصویریں دیکھ رہے ہوں،
جب آپ، بھیگی رات، گفتگو میں محو ہوں،
جب آپ ایک روشن دریچے کے سامنے ایک صاف میز پر بیٹھے ہیں،
جب آپ دلنواز دوستوں اور نازک جسموں والی نازنینوں کے جھرمٹ میں ہوں،
جب آپ دوستوں کے ساتھ کہیں سے واپس آئیں،
جب دن صاف ہو اور ہوا ہلکی ہو،
جب بہت ہلکی پھواریں پڑ رہی ہوں،
جب آپ ایک مرصع بجرے میں ایک چھوٹے سے چوبی پل کے پاس ہوں،
جب آپ ایسے جنگل میں ہوں جس میں اونچے بانسوں کے ہرے جھنڈ ہوں،
جب آپ گرما کے ایک دن، ایسے بنگلے میں بیٹھے ہوں جہاں سے کنول کے پھول نظر آتے ہوں،
جب دعوت ختم ہو جائے اور مہمان جا چکیں،

جب بچے سکول جا چکے ہوں،

جب آپ نہایت خاموش اور تنہا مندر میں ہوں،

جب آپ مشہور چشموں اور عجیب وغریب قسم کی چٹانوں کے پاس بیٹھے ہوں،

ii- چائے کب نہیں پینی چاہیے

کام کے وقت،

ڈرامہ دیکھتے وقت،

خط کھولتے ہوئے،

سخت بارش اور برفباری کے وقت،

شراب نوشی کی ایک طویل محفل میں جہاں بہت سے لوگ ہوں،

کاغذات اور کتابیں دیکھتے وقت،

مصروف دنوں میں،

عام طور پر ان حالات میں، جو نمبر 1 کے بیان کردہ شرائط کے خلاف ہوں،

iii- چائے کے سلسلے میں کن باتوں سے پرہیز لازمی ہے

برا پانی،

برے اور گندے برتن،

پیتل کے چمچے،

پیتل کی کیتلیاں،

پانی کے لیے لکڑی کی بالٹی،

پانی ابالنے کے لیے لکڑیاں نہ جلائیں (تاکہ دھواں نہ لگ جائے)

کچے کوئلے،

بدتمیز نوکر،

پھوہڑ اور بدمزاج خادمہ،

گندی صافی،

ہر قسم کے بخارات اور دوائیں،

iv- کن چیزوں اور کن جگہوں سے الگ رہنا چاہیے

مرطوب کمرے،

باورچی خانے،

پرشور بازار اور گلیاں،

روتے جھنکتے بچے،

جوشیلے اور غصہ والے لوگ،

جھگڑالو نوکر،

گرم کمرے،

5- تمباکو اور خوشبو

دنیا آج کل تمباکو نوشوں اور تمباکو نہ پینے والوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یہ تسلیم کہ تمباکو پینے والوں کی وجہ سے نہ پینے والوں کو کچھ تکلیف ہوتی ہے مگر اس ''تکلیف'' کی نوعیت کچھ جسمانی ہے لیکن تمباکو نہ پینے والوں کی وجہ سے تمباکو نوشوں کو جو مزاحمتیں اٹھانی پڑتی ہیں وہ سراسر روحانی ہیں۔ پھر بھی تمباکو سے بہت سے پرہیز کرنے والے ایسے لوگ موجود ہیں جو تمباکو نوشوں سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔ بیچاری بیویوں کو بھی رفتہ رفتہ یہ عادت ہو جاتی ہے کہ ان کے شوہر آرام سے بستر میں لیٹ کر سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک خوشگوار اور کامیاب شادی کی سب سے یقینی علامت ہے۔ پھر بھی بعض اوقات یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ تمباکو نہ پینے والے لوگ اخلاقی لحاظ سے بلند تر ہوتے ہیں اور ان کے پاس کوئی بات ناز کرنے اور اترانے کی بھی ہوتی ہے مگر انھیں شاید یہ احساس کبھی نہیں ہوتا کہ تمباکو نوشی سے احتراز کر کے وہ نوع انسان کی ایک بہت بڑی مسرت سے محروم رہے ہیں۔ میں یہ تو شاید مان جاؤں کہ تمباکو پینا اخلاقی کمزوری ہے مگر میں یہ بھی کہوں گا کہ اس آدمی سے خبردار رہیے، جس میں کمزوریاں نہ ہوں! اس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا، وہ ہمیشہ باہوش رہے گا اور کبھی کوئی غلطی نہیں کرے گا۔ اس کی عادتیں باقاعدہ ہوں گی۔ اس کی زندگی مشینی انداز کی ہوگی اور اس کا

دماغ ہمیشہ اس کے دل پر حکمران رہے گا۔ اس قسم کے منطقی وجود سے مجھے بڑی نفرت ہے جو سراسر عقل اور منطق کے پتلے ہوں۔ اسی لیے میں ایسے گھر میں داخل ہونے سے ہمیشہ ڈرتا ہوں جس میں مجھے کہیں راکھ دان نظر نہیں آئیں۔ ان کے بغیر کمرہ ضرورت سے زیادہ صاف ستھرا اور بہت ہی بنا بنایا ہوتا ہے۔ ہر تکیہ ٹھیک اپنی جگہ پر ہوگا اور اس گھر کے لوگ بالکل غیر جذباتی اور بہت زیادہ صحیح سالم اور ''ٹھیک ٹھاک'' قسم کے لوگ ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے سامنے میں فوراً بہت عمدہ آدمی بن جاؤں گا۔ یعنی جب تک وہاں رہوں گا سخت تکلیف میں رہوں گا۔

جو لوگ اس دنیا میں بالکل غیر جذباتی اور غیر شاعرانہ دل و دماغ کے مالک ہیں اور نہایت پارسا اور بڑے متقی ہیں۔ وہ تمباکو نوشی کے اخلاقی اور روحانی فوائد سے کبھی آگاہ نہیں ہو سکتے۔ عام طور تمباکو نوشوں کے اخلاقی پہلو پر ہی حملہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے میں تمباکو نوشوں کے اخلاق کے بارے میں سب سے پہلے عرض کر دوں کہ مجموعی طور پر ان کی اخلاقی حالت تمباکو نہ پینے والوں سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ مجھے تو وہ آدمی بڑا پسند ہے جس کے منہ میں پائپ دبا ہوا ہو اور وہ آرام سے اسے پی رہا ہو۔ ایسا آدمی عام طور پر زیادہ یار باش، زیادہ ملنسار ہوتا ہے۔ اس کے پاس دوسروں کو بتانے کے لیے باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ وہ باتیں بھی نہایت اچھی کرتا ہے اور اسے دیکھ کر یہ احساس تو ضرور ہوتا ہے کہ وہ بھی میری طرح کا ایک آدمی ہے۔ پائپ کے سلسلے میں انگریز ناول نگار تھیکرے کا قول لکھ رکھنے کے قابل ہے کہ ''پائپ فلسفی کے لبوں سے حکمت و دانش حاصل کرتا ہے اور احمق کے ہونٹ سی دیتا ہے۔ پائپ ایسی گفتگو کو ترویج دیتا ہے جو مفکرانہ، خیال انگیز، وسیع النظر اور تکلف یا تصنع سے بالکل عاری ہوا کرتی ہے۔''

آپ کہہ سکتے ہیں کہ تمباکو نوش کے ناخن عام طور پر صاف نہیں ہوتے مگر یہ کوئی بات نہیں، اس کا دل زیادہ اچھا ہوتا ہے اور پھر اس کی گفتگو بقول تھیکرے ''خیال انگیز اور اس کی نظر وسیع، اس کی باتیں، تکلف اور تصنع سے عاری ہوتی ہیں۔ یہ بہت بڑی چیز ہے اور ان سے مزہ لینے کے لیے اگر کچھ زیادہ قیمت بھی ادا کرنی پڑے تو مضائقہ نہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ پائپ پیتا ہوا شخص ہمیشہ خوش و خرم ہوتا ہے اور یہ آپ کو ماننا پڑے گا کہ مسرت، انسانی خوبیوں کی معراج ہے۔ ڈبلیو مگن کا کہنا ہے کہ'' آج تک سگار پینے والے کی اپنی بیوی سے لڑائی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ آپ بیک وقت، اپنے دانتوں میں پائپ دبائے، اونچی

آواز میں کسی پر گرج برس نہیں سکتے۔ کسی شخص نے آج تک ایسا کیا ہی نہیں کیونکہ قدرتی بات ہے کہ پائپ پیتے ہوئے آدمی دھیمی آواز میں بات کیا کرتا ہے۔ تمباکو پینے والے شوہر کو جب غصہ آئے تو وہ عام طور پر یہ کرتا ہے کہ فوراً ایک سگریٹ یا پائپ سلگا لیتا ہے اور سخت رنجیدہ نظر آنے لگتا ہے، منہ لٹکا کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہتی کیونہ اس کے جذبات کو تسکین کی ایک راہ مل چکی ہوتی ہے اور اگرچہ وہ اپنے غصے کا جواز پیش کرنے کے لیے یا اپنی توہین کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے جھلایا ہوا نظر آنے کی کوشش کرتا ہے پھر بھی وہ یہ روپ زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ پائپ کے ہلکے دھوئیں کی لہریں اس کے غصے کی آگ پر پانی ڈالتی ہیں۔ اسے تسکین دیتی ہیں اور دھواں حلق سے باہر نکلنے کے ساتھ ساتھ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر سانس کے ہمراہ باگھٹا غصہ بھی باہر نکل رہا ہے۔ اسی لیے عقلمند بیویوں کا یہ طریقہ ہے کہ جونہی شوہر کو غصے میں آتا دیکھتی ہیں۔ بڑی نرمی سے اس کے منہ میں پائپ دے دیتی ہیں اور یہ کہہ دیتی ہیں: ''لیجیے پائپ پیجیے'' اور اس بات پر خاک ڈالیے۔'' یہ فارمولا ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے...... گویا شوہر کو منانے کے لیے بیوی ممکن ہے ناکام رہے مگر پائپ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔

اب تمباکو پینے کی فنکارانہ اور ادبی خوبیوں کی طرف آیئے۔ ان خوبیوں کا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کوئی تمباکو نوش، تھوڑے عرصے کے لیے تمباکو پینا بند کر دیتا ہے۔ عام طور پر ہر تمباکو پینے والا کسی نہ کسی احمقانہ لمحے میں تمباکو نوشی ترک کر دینے کی کوشش کیا کرتا ہے اور اپنے ضمیر کی فرضی آواز کے ساتھ کچھ عرصے کی کش مکش کے بعد پھر سیدھی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک بار میں نے بھی یہ حماقت کی تھی کہ تین ہفتے تک بالکل تمباکو نہیں پیا تھا۔ تین ہفتے کے بعد میرے دل نے پھر مجھے راہ راست پر لا ڈالا اور میں نے قسم کھائی کہ پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا اور ہمیشہ تمباکو کا پرستار رہوں گا۔ یہاں تک کہ میرا دوسرا بچپنا (کہن سالی) آ جائے گا۔ پھر شاید میں ان لوگوں کے چنگل میں پھنس جاؤں تو پھنس جاؤں جو ہر قسم کے نشے کو دنیا سے نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بہرکیف جب تک مجھ میں شمہ برابر قوت اداری موجود ہے اور اخلاقی جرات کا شائبہ تک ہے۔ میں پھر سے تمباکو ترک کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ آخر میں دیکھ ہی چکا ہوں کہ اسے چھوٹنے کی کوشش کتنی فضول اور احمقانہ ہے۔ اس مفید ایجاد سے انسان کو جو روحانی قوت اور اخلاقی اطمینان کا احساس ہوتا ہے اس سے ہاتھ اٹھانا بہت بڑی ناشکری ہے۔ باقی رہا تمباکو پینے کی اہمیت کا مسئلہ تو انگلستان

کے مشہور ماہر کیمیا پروفیسر ہالڈین کا قول اس بارے میں مسند ہے، وہ کہتے ہیں کہ تمباکونوشی انسان کی تاریخ میں ان چار اہم ایجادوں میں سے ایک ہے۔ جنھوں نے انسانی ثقافت پر بڑا گہرا حیاتیاتی اثر چھوڑا ہے۔

میرے تمباکونوشی ترک کرنے کے تین ہفتوں کی کہانی بڑی عبرتناک ہے۔ میں نے ان دنوں میں اپنے نفس اعلیٰ اور ذوق سلیم دونوں سے غداری کی اور اپنے آپ کو ایک نہایت روح پرور لذت سے محروم رکھا۔ اس بات کو عرصہ ہو چکا ہے اور اب میں اس قابل ہوں کہ اس واقع پر حقیقت پسندی سے نظر ڈال سکوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ پر غیر ذمہ داری کا یہ بھوت اتنے دن کیونکر سوار رہا؟...... اگر میں اس روحانی کش مکش، اس ذہنی رزمیے کو نظم میں قلمبند کروں تو یہ رزمیہ ہومر کی ''اوڈیسی'' کی طرح کوئی تین ہزار مصرعوں کا بن سکتا ہے۔ اصل میں اس ساری کش مکش کا مقصد ہی فضول تھا۔ کوئی پوچھے کہ انسانیت اور کائنات دونوں سے آپ کو واسطہ، بھلا تمباکونوشی چھوڑی کیوں جائے؟ مگر انسان پر ایسے موڈ، ایسی غیر معقولیت کی ترنگ اکثر طاری ہوا کرتی ہے۔ ان لمحوں میں انسان یہ چاہتا ہے کہ خواہ مخواہ کے لیے کسی مخالفت، کسی کش مکش پر غلبہ پائے۔ اس طرح انسان اپنی زائد اخلاقی قوت کا بھی مصرف ڈھونڈ لیا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، میں بھی اپنے آپ کو ایسے ہی اخلاقی امتحان سے دوچار کر رہا تھا جس طرح لوگ فضول کی جمناسٹک کیا کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ جسم کو ہلا رہے ہیں اور اس حرکت سے سماج کے لیے کوئی مفید کام نہیں کر رہے۔ میرا خیال ہے تمباکونوشی ترک کرنا ایسا ہی ایک اخلاقی تعیش تھا اور بس۔

میں نے تمباکو پینا چھوڑا تو پہلے تین دن معدے کی نالی کے اوپر کے حصے میں کچھ عجیب طرح کی ضعف کی سی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ اس کیفیت سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے پیپرمنٹ کی چیونگ گم کھائی، اعلیٰ درجے کی چینی چائے پی اور لائم فروٹ کی گولیاں چباتا رہا۔ اس کیفیت پر تین دن میں غلبہ حاصل ہوا اور یہ مٹ گئی۔ اپنے ساتھ کش مکش کا یہ دور جسمانی تھا اس لیے اس پر قابو پا لینا آسان بھی تھا اور میرے نزدیک بے حد معمولی بات بھی۔ عام لوگوں کا خیال یہ ہے کہ تمباکو چھوڑنے کے لیے جو ناپاک کوشش کرنی پڑتی ہے وہ بس اتنی ہی ہے مگر ان لوگوں کو کچھ پتا نہیں۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ تمباکو پینا ایک روحانی فعل ہے اور جو لوگ تمباکونوشی کی روحانی اہمیت سے واقف نہیں انھیں اس بات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ خیر، پہلے تین دن میں لڑائی کا پہلا دور ختم ہو گیا تو دوسرا دور شروع ہوا، جو اصل روحانی کشمکش کا دور تھا۔ اس دور میں میری آنکھوں کے

آ گے سے پردے ہٹے اور میں نے جان لیا کہ تمبا کو نوشوں کی دو الگ الگ نسلیں ہوتی ہیں جن میں سے ایک ایسی ہے کہ اس لقب کی ہرگز اہل نہیں کیونکہ ان لوگوں کے لیے تمبا کو نوشی ترک کرنے کی کش مکش کا دوسرا دور، روحانی کش مکش کا مشکل تر دور، کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ کیوں ''بہت سے'' ''لوگ'' ''اتنی آسانی'' سے تمبا کو پینا چھوڑ دیتے ہیں اور انھیں کسی کش مکش، کسی تکلیف کا سامنا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ دانتوں کے پرانے برش کی طرح اس عادت کو چھوڑ سکتے ہیں۔ بس اسی سے پتا چلتا ہے کہ صحیح معنوں میں تمبا کو پینا انھیں کبھی نہیں آتا تھا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی ''قوت ارادی'' کتنی مضبوط ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ صحیح معنی میں کبھی تمبا کو نوش نہیں تھے اور زندگی بھر یہ عادت ان میں راسخ نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک تمبا کو پینا محض جسمانی فعل ہے۔ اس طرح کا ایک جسمانی کام جس طرح ہر صبح وہ اپنے دانت مانجھتے ہیں اور منہ دھوتے ہیں۔ گویا ایک معمولی سا جسمانی کام، ایک حیوانی سی عادت جس میں روحانی اطمینان یا سکون کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو میرے خیال میں ذوق سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ جو شیلے کی نظم سکائی لارک یا شوپان کے نغمۂ شب پر کبھی وجد میں نہیں آسکتے۔ وہ اس کے اہل نہیں ہیں اسی لیے تمبا کو پینا چھوڑنے سے ان کی زندگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی!

لیکن جو لوگ صحیح معنی میں تمبا کو کے رسیا ہیں ان کا معاملہ مندرجہ بالا حضرات کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہم لوگوں کے لیے تمبا کو نوشی ترک کرنا، اپنے ساتھ سخت ناانصافی کرنا ہے اور اس کے علاوہ بالکل مہمل بھی۔ چنانچہ ہمارا ذوقِ سلیم بہت جلد اس پابندی کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور یہ سوال کرتا ہے کہ آخر کون کون سے ساجی، حیاتیاتی، اخلاقی یا مالی وجوہ سے بقائی ہوش وحواس اپنے آپ کو اس روحانی سکون اس بصیرت، اس تخلیقی قوت سے محروم کرنے کے لیے اپنی قوتِ ارادی سے کام لیا جائے جو تمبا کو پینے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تخیلی قوت، یہ بصیرت، یہ تخلیقی اپج، وہ چیز ہے کہ اگر آتشدان کے پاس بیٹھ کر ایک دوست کی باتوں سے لطف اٹھانا ہے تو یہ لازمی ہے اگر کوئی قدیم کتاب پڑھ کر دل میں گداز اور روح میں گرمی پیدا کرنی ہے تو یہ لابدی ہے اور اگر کچھ لکھنا ہے تو لفظ و معنی کے توازن، موزوں الفاظ کی تلاش، ان کی نشست، ان کے استعمال کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ان موقعوں پر انسان قدرتی طور پر سگریٹ کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے اور یہ بات اخلاقی لحاظ سے درست بھی ہے۔ اب اگر ان موقعوں پر سگریٹ کے بجائے منہ میں چیونگ گم کی ایک ٹکیا ٹھونس لی جائے تو

یہ کتنی بے وقوفی اور کتنی غلط روی ہوگی۔ میں تو اسے مجرمانہ شر پسندی کہوں گا۔ مثال کے طور پر میں ایسے چند لمحوں کا ذکر کرتا ہوں۔

میرا دوست، ''ب'' شہر پی ینگ سے مجھے ملنے کے لیے آیا۔ ہم نے تین برس سے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں پی ینگ کو پی کنگ کہا جاتا تھا اور وہاں ہر شام ہماری ملاقات رہتی تھی اور باتوں اور سگریٹ کے دھوئیں کی رفاقت میں شام گزرتی تھی۔ گفتگو کے عام موضوع سیاست، فلسفہ اور جدید آرٹ ہوا کرتے تھے۔ اب کی اس سے ملاقات ہوئی تو ہم دونوں نے پرانی ملاقاتوں کی یاد تازہ کی اور گزری باتیں دہرانے لگے۔ ان تمام پروفیسروں اور شاعروں اور سرپھروں کا ذکر ہوا جن سے پی پنگ میں ہماری ملاقات تھی۔ ہر اچھے فقرے پر میں ذہنی طور پر سگار کے لیے ہاتھ بڑھاتا تھا مگر گھٹ کر رہ جاتا تھا۔ میں اٹھتا تھا اور بیٹھ جاتا تھا مگر میرا دوست بڑے آرام سے سگار پی رہا تھا اور بڑے سکون سے سگار کے دھوئیں کے درمیان کھو کر باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے سگار اور سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔ اتنی خودداری مجھ میں تھی کہ اس کے سامنے اپنے عہد سے نہ پھروں اور لالچ کے مارے پھر سگار پینا نہ شروع کر دوں مگر دل میں جانتا تھا کہ بات بن نہیں رہی۔ چاہیے یہ تھا کہ میں اس ملاقات پر جذبات کی عنان ہاتھ سے جانے دیتا اور دو ہم مذاق روحوں کے مکمل ملاپ میں رکاوٹ پیدا نہ کرتا مگر میں عقل اور منطق کا پتلا بنا بیٹھا رہا۔ باتیں ہوتی رہیں لیکن یہ ساری گفتگو یک طرفہ سی رہی۔ میری آدھی ہستی اس گفتگو میں حاضر تھی اور آدھی غائب۔ آخر میرا دوست چلا گیا ...... میں نے اس ساری گفتگو میں بڑے ''صبر و سکون'' سے اپنے آپ پر قابو رکھا...... جو لوگ ''قوت ارادی'' کا ڈھونگ رچائے پھرتے ہیں وہ کہیں گے کہ میں نے ترغیب اور کشمکش پر ''قابو'' پالیا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا دل بہت رنجور تھا۔ چند دن بعد میرے دوست کا خط ملا۔ اس نے لکھا ''تم قوت و جذبات اور زندگانی کا وہ پیکر نہیں رہے جو کبھی تھے''...... اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ ''شاید شنگھائی میں رہنے کی بدولت تم میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے''...... چنانچہ میں نے اپنے آپ کو آج تک معاف نہیں کیا کہ اس رات میں نے اپنے فضول عہد کو توڑ کر کیوں سگار پینا شروع نہ کیا۔

ایسی ایک اور رات مجھے یاد ہے۔ ایک کلب میں دانشوروں کا اجتماع تھا۔ یہ اجتماع عام طور پر بڑی خوفناک تمباکو نوشی کا موقع ہوا کرتا ہے۔ نہایت عمدہ کھانے کے بعد کسی صاحب کو مقالہ پڑھنا تھا۔ اس دفعہ

ں'' کی باری تھی اور موضوع تھا ''مذہب اور انقلاب''...... مقالے میں بڑے بڑے چست اور عمدہ فقرے
تے تھے۔ ان فقروں پر کافی دلچسپ باتیں ہوئیں اور تمباکو کے دھوئیں کے بادل گہرے ہوتے گئے۔ ساری
نا عجیب وغریب انوکھے خیالات سے بوجھل معلوم ہوتی تھی۔ ایک کونے میں شاعر ''ح'' چپ چاپ بیٹھا تھا
ربڑے انہاک سے بوجھل ہوا میں دھوئیں کے گول گول حلقے پھیلانے کی کوشش کرر ہا تھا۔ غالباً وہ اپنے ہی
یالات میں کھویا ہوا تھا۔ ساری محفل میں اکیلا میں تھا جو تمباکو نوشی سے محروم تھا اور اپنے آپ کو سب سے الگ
ملگ، بالکل یکہ وتنہا محسوس کرر ہا تھا۔ اس وقت مجھے محسوس ہور ہا تھا کہ تمباکو چھوڑنے میں تک کیا ہوئی۔ پھر
یک مجھ پر یہ روشن ہوا کہ تمباکو نہ پینا بالکل بے وقوفی کی بات ہے۔ اس وقت میں نے لاکھ سوچا کہ آخر کن
ذں سے میں نے تمباکو نوشی چھوڑی تھی مگر ایک بات بھی یاد نہ آئی اور جو سب یاد آیا وہ بالکل بے وزن اور
ھوکھلا معلوم ہوا۔

اس کے بعد میرے ضمیر نے میری روح کو تنگ کرنا شروع کیا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ میں
نے بے خیالی میں ایسا فیصلہ کیوں کیا؟ اور بھلا تمباکو سے بچنے والا دل ودماغ کبھی تخیل کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے؟
رایک سہ پہر میں ایک خاتون سے ملنے گیا۔ میں ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا کہ پھر سے تمباکو پینا شروع کردوں۔
مرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ نوجوان خاتون سگریٹ پی رہی تھی۔ اس نے اپنا سڈول بازو گھٹنے
یک رکھا تھا۔ وہ ذرا سی آگے کو جھکی ہوئی تھی اور اس کا فکر مند، ارمان انگیز انداز بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ میرے
ں نے کہا، اب وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے سگریٹ کا ڈبا پیش کیا تو میں نے بڑی پامردی سے اور بڑی
ستگی سے ایک سگریٹ نکال لیا۔ مجھے محسوس ہور ہا تھا کہ میں عہد توڑنے کی اخلاقی ذلت کے نہایت عارضی
قفے پر غالب آ چکا ہوں۔

گھر واپس آکر میں نے فوراً ملازم کو بھیجا کہ کیپسٹن کا ڈبا لائے۔ میری لکھنے کی میز کے داہنی طرف ایک
یلکڑی کا کچھ حصہ جلا ہوا تھا کیونکہ میں کام کرتے وقت ہمیشہ جلتا ہوا سگریٹ وہیں رکھا کرتا تھا۔ میں نے ایک
یہ بھی حساب لگایا تھا کہ میز کا اوپر کا تختہ کوئی دو انچ موٹا ہے، اسے آر پار جل جانے کے لیے کوئی سات آٹھ
ل کی مدت درکار ہوگی۔ اب میں نے سگریٹ چھوڑے تو میں حسرت سے دیکھا کرتا تھا کہ جلنے کا نشان
یے کا ویسا ہے اور کوئی نصف سینٹی میٹر سے آگے نہیں بڑھا۔ چنانچہ مین نے سگریٹ پی کر اب جو جلتا ہوا ٹکڑا

اسی نشان پر پر پھر رکھا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی اور اب پیے ہوئے سگریٹوں کے جلتے ٹکڑے اسی نشان کو اس کی منزل کی طرف پہنچانے میں کوشاں رہتے ہیں۔

چینی ادب میں شراب کی بہ نسبت تمبا کو کی تعریف میں بہت کم چیزیں ملتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تمبا کو نوشی کی عادت تو کہیں سولہویں صدی میں پرتگیزی ملاحوں کی بدولت شروع ہوئی۔ میں نے سارے چینی ادب کو کھنگال ڈالا مگر تمبا کو کی تعریف میں محض چند پھیکے سیٹھے فقرے کہیں کہیں ملے جو ہرگز تمبا کو کی شان کے شایان نہیں تھے۔اس کے باوجود یہ یاد رہے کہ چینی قوم کی قوت شامہ بڑی تیز ہے۔اس کا ثبوت چائے او شراب کی مہک اور کھانے کی بو باس پر اس کے اقوال سے ملتا ہے۔اصل میں چین میں جب تمبا کو نہیں تھا چینی لوگوں نے بخورات جلانے کے آرٹ کی ترقی دی اور ان خوشبوؤں کا ذکر چینی ادب میں چائے اور شراب کے ساتھ ہر جگہ ملتا ہے اور ان کا شمار بھی انہی کے ساتھ ہوتا ہے۔قدیم چین میں کبھی ان خاندان کی حکومت تھی اور ہند چینی تک کا ملک ان کے زیر نگیں تھا۔ان دنوں بھی جنوبی ملکوں سے جلانے کی جو خوشبوئیں، عود، عنبر او دوسرے بخورات لائے جاتے تھے ان کا رواج شاہی دربار اور امراء کے گھروں میں عام تھا۔زندگی بسر کرنے کے آداب پر چینی میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں بخورات اور خوشبوؤں کی قسموں، ان کی تیاری او ان کی عمدگی پر الگ باب موجود ہیں۔تاؤ لنگ نے اپنی کتاب میں خوشبوؤں اور بخورات سے لطف لینے پر جو لکھا ہے اس کا ایک اقتباس میں درج کرتا ہوں:

''خوشبو سلگانے کے بہت سے فائدے ہیں۔اہل علم، گوشہ نشین لوگ جو تلاش حق میں مصروف ہوتے ہیں اور مذہبی مسائل کی الجھنیں دور کرنے میں لگے ہوتے ہیں، لوبان یا اگر کی ایک بتی کا خوشبودار دھواں ان کے ذہن کو صاف کر دیتا ہے اور روح کے لیے لطافت کا سامان بنتا ہے۔رات کے چوتھے پہر جب چاند آسمان پر اکیلا ہو اور آدمی اپنے آپ کو زندگی سے الگ تھلگ محسوس کر رہا ہو تو خوشبوؤں کا دھواں روح کو ہلکا کرتا ہے اور دل کو خوشی سے ہمکنار کرتا ہے اگر ایک روشن دریچے کے پاس آپ پرانے مخطوطات دیکھ رہے ہوں یا شعر گنگنا رہے ہوں یا رات کو چراغ کی روشنی میں مطالعہ کر رہے ہوں تو بخورات نیند کے غلبے کو دور رکھتے ہیں۔آپ خوشبوؤں کی دھونی کو ''چاند کی قدیم سہیلی'' کہہ سکتے ہیں

......اگر سرخ ملبوس والی ایک حسینہ آپ کے پاس کھڑی ہو اور آپ نے خوشبودان کے اوپر سے اس کا گداز ہاتھ پکڑ رکھا ہو، اس کے نازک کانوں میں آپ وفا کے رازوں کی سرگوشیاں کر رہے ہوں تو خوشبوؤں کی مہکتی لپٹ آپ کے دل میں گداز پیدا کر دے گی اور آپ کی محبت میں شدت پیدا ہو جائے گی۔اس لیے آپ خوشبو کو ''محبت کے جذبات کی قدیم محرک'' سے تعبیر کر سکتے ہیں......یا اگر آپ تیسرے پہر کی نیند سے بیدار ہوں اور برستی برسات کے دن، بند کھڑکی کے پاس بیٹھ کر خطاطی کی مشق کر رہے ہوں اور چائے کے ہلکے سرور اور سگندھ سے لطف اندوز ہو رہے ہوں تو خوشبودان سے بھینی خوشبوؤں کی ایک لپٹ اٹھتی ہے اور آپ کے جسم کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے، اور سارے کمرے میں ہوا کے دوش پر تیرتی پھرتی ہے۔

اس سے بھی بہتر وقت وہ ہے کہ مے نوشی کی محفل کے بعد اٹھیں۔ پورا چاند شفاف رات کے سینے پر چمک رہا ہو اور سرور کے عالم میں آپ اپنی انگلیاں ارباب کے تاروں پر چلائیں یا ایک خالی مینار میں ہلکی سی سیٹی بجائیں۔ دور، سرسبز پہاڑیاں صاف نظر آ رہی ہوں اور خوشبودان سے بخورات کے باقی ماندہ شراروں سے خوشبو کی لپٹ پردوں سے چھن چھن کر آنے لگے......خوشبو کی دھونی بدبو کو دور رکھتی ہے، دلدل کی گندی فضا کو پاک اور صاف کرتی ہے اور ہر جگہ اور ہر مقام پر کام آتی ہے......سلگانے کے لیے سب سے بہتر چیانان کی لکڑی ہے۔مگر یہ مشکل سے دستیاب ہوتی ہے اور پہاڑوں میں رہنے والوں کو میسر نہیں آ سکتی۔اس سے دوسرے درجے پر صندل کی لکڑی ہے۔اس کی تین قسمیں ہیں۔ اعلیٰ قسم میں خوشبو زیادہ تیز اور سخت ہوتی ہے اور سب سے گھٹیا قسم دھواں زیادہ دیتی ہے اور خشک بھی ہوتی ہے۔اس لیے درمیانے درجے کی صندل عمدہ ہوتی ہے۔اس کی خوشبو سکون پرواز اور نفیس ہوتی ہے۔ چائے بنانے کے بعد جو کوئلے بچ جائیں انھیں خوشبودان میں ڈال دیجیے اور خوشبو کو دھیرے دھیرے ابھرنے دیجیے......ایسے سکون کے لمحوں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ جنت میں ہیں اور زندہ جاوید لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر اس ارضی

زندگی سے بہت بلند ہو چکے ہیں۔

آج کل کے لوگوں کی صحیح خوشبو کی قدر کا مذاق نہیں۔ یہ لوگ نت نئی خوشبوؤں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے پر مختلف خوشبوؤں کی ملاوٹ کے سلسلے میں فوقیت جتاتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ صحیح خوشبو، صندل کی ہے جو بالکل قدرتی ہے اور اس کی بہترین قسم وہی ہے جس کی باس میں خاص قسم کی سکون پروری اور نفاست ہو۔''

ماؤپی چیانگ نے اپنی کتاب ''اپنی محبوبہ کی یاد میں'' میں ایک امیر شاعر اور اس کی باکمال اور ذہین محبوبہ کی زندگی کا حال بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان دونوں نے خوشبوؤں سے کیا کیا مزے لیے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اکثر میں اور میری محبوبہ مشہور خوشبوؤں کی دھونی اور بخورات کو پہچاننے کے لیے اس کے معطر شبستان میں بیٹھا کرتے تھے۔ جس خوشبو کو ''قصر کی خوشبو'' کہتے ہیں وہ بڑی ارمان انگیز ہے..... لوگ جس طرح عود سے خوشبو لیتے ہیں وہ طریقہ بڑا عامیانہ ہے۔ وہ یہ کرتے ہیں کہ عود کی لکڑی کو آگ پر رکھ دیتے ہیں اور اس طرح اس کی خوشبو جلتے ہوئے بروزے کی بدولت بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح نہ تو خوشبو پھیلتی ہے اور نہ کچھ حاصل ہوتا ہے بلکہ دھوئیں اور بوجھل ہوا سے کمرہ بھر جاتا ہے، جو جسموں سے چپک کر رہ جاتے ہیں۔ عود کی ایک قسم ہے جو بہت سخت ہوتی ہے اور اس کے دانے اور اس کی لکیریں سب سیدھی ہوتی ہیں۔ اس کی خوشبو بہت ہی عمدہ ہوتی ہے۔ ایک قسم اور بھی ہے جو پوری طرح پکی اور پختہ نہیں ہوتی۔ ہمارے یہاں اس لکڑی کی ساری قسمیں تھیں اور میری محبوبہ ان کو نہایت نفیس ریت اور ہلکی آگ پر جلاتی تھی کہ دھواں مطلق پیدا نہیں ہوتا تھا اور ہلکی خوشبو سارے کمرے میں بس جاتی تھی۔ یہ خوشبو ایسی تھی گویا شبنمی گلابوں کی میٹھی باس ہو یا عنبر کے ٹکڑے کو خوب رگڑا گیا ہو یا سینگ کے پیالے میں خوشبودار شراب انڈیلی جا رہی ہو۔ جب بستر کو اس طرح خوشبو میں بسایا جائے تو یہ خوشبو عورت کے جسم کی خوشبو کے ساتھ مل جاتی ہے جو خوابوں میں بھی بڑی خوشگوار، بڑی سرور آگیں ہوتی ہے۔''

6- شراب

میں پینے والوں میں کوئی پینے والا نہیں۔اس لیے شرابوں کے بارے میں بات کرنے کی بالکل اہلیت نہیں رکھتا۔میری بساط یہ ہے کہ چینی چاول کی ہلکی شراب کی تین پیالیاں کافی ہیں بلکہ میں تو بیئر کا ایک گلاس پی کر بھی مدہوش ہونے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔نشے میں یہ آسانی قدرت کا عطیہ ہے۔اصل یہ ہے کہ شراب یا چائے پینے کی صلاحیت اور تمبا کو نوشی کی صلاحیت ایک ساتھ کسی کو نہیں ملتیں۔میرے کئی دوست ایسے ہیں کہ بلا نوش ہیں لیکن آدھا سگار پی کر برداشت کرنا ان کے امکان سے باہر ہے۔میں دن رات کے جتنے گھنٹے جاگتا رہوں برابر تمبا کو پیتا رہتا ہوں۔مجھ پر اس کا ذرا اثر نہیں ہوتا مگر شراب کے معاملے میں میری کوئی ہستی نہیں۔ لی لی ونگ نے لکھا ہے کہ جو لوگ چائے بہت پی سکتے ہیں۔وہ شراب کے زیادہ شائق نہیں ہوتے اور جو شراب کے رسیا ہوں وہ چائے نہیں پی سکتے۔یہ اس کی حتمی رائے ہے۔وہ چائے کا بڑا نقاد اور متوالا تھا مگر خود کہتا تھا کہ مے نوشی میں میری کوئی بساط نہیں۔مجھے چین کی ادبی تاریخ میں ایسی ہستیوں کا حال پڑھ کر بڑی خوشی اور بڑا سکون ہوتا ہے کہ میری طرح وہ بھی شراب زیادہ نہیں پی سکتے تھے اور یہ کہ اس کا اعتراف انھوں نے صاف صاف لفظوں میں کر دیا ہے۔مجھے ان مشہور ہستیوں کے خطوط اور دوسری تحریروں سے یہ اعترافات جمع کرتے کچھ وقت لگا ہے۔پھر بھی اب مجھے معلوم ہے کہ اس قبیل کے لوگوں میں آتی بھی تھا، یوآن ست سائی، وانگ یو آنگ اور یوآن چنگ لانگ جیسے لوگ بھی تھے۔سب کے دلوں میں شراب کا ذوق تھا مگر ان میں سے بلا نوش کوئی بھی نہ تھا۔

اپنی نااہلی کے باوجود میں اس موضوع سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کیونکہ ہر چیز سے زیادہ شراب نے ادب کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے۔تمبا کو نوشی کی طرح شراب نے بھی انسان کی تخلیقی قوتوں کو جلا دینے اور ان قوتوں کو دوام اور تازگی بخشنے میں بے حد اہم حصہ لیا ہے اور اس کے اہم نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔چینی ادب میں بار بار ''تھوڑی سی پینے'' کے سرور کا ذکر کیا گیا ہے۔میرے لیے یہ ہمیشہ ایک معمہ رہا۔آخر شنگھائی کی ایک مہ جبین نے جو خود پیے ہوئے تھی اس سرور کی خوبیوں کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا کہ مجھے قائل ہونا پڑا اور میں نے سوچا کہ سرور کی جس حالت کا ذکر میں نے بار بار پڑھا اور سنا ہے واقعی حقیقی چیز ہے۔مجھے خوب یاد ہے کہ اس متوالی حسینہ نے کہا تھا۔''نیم مستی میں انسان باتیں کرتا جاتا ہے، کرتا جاتا ہے، رکتا نہیں اور نیم مستی ہی

سب سے خوشگوار حالت ہوتی ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پی کر مسرت اور شادمانی کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ آدمی میں یہ زبردست خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا کی ہر مشکل پر غالب آ سکتا ہے، اس کا احساس اس کا شعور بہت نازک اور تیز ہو جاتا ہے۔ آدمی کی تخلیقی فکر بڑھ جاتی ہے کیونکہ قوت فکر، حقیقت اور تخیل کی سرحد کے آس پاس ملتی ہے اور نشہ اس کی تیزی اور اس کی براقی میں بہت زیادہ اضافہ کر دیتا ہے۔ پی کر جو اعتماد اور آزادی کا احساس پیدا ہوتا ہے وہ تخلیق کے لیے بہت معاون اور ضروری ہوتا ہے۔ اعتماد اور آزادی کے اس احساس پر بنے بنائے قاعدوں اور ہیئت کے بندھنوں سے چھٹکارے کے اس احساس پر تفصیل سے اس وقت بات ہوگی جب ہم آرٹ والے باب پر پہنچیں گے۔ ابھی اس کا موقع نہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ڈکٹیٹر، انسانیت کے لیے اس وجہ سے خطرناک ہیں کہ وہ پینے سے احتراز کرتے ہیں۔ اس خیال میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے۔ میں یہاں چارلس ڈبلیو فرگوسن جیسے اقتباس پیش کروں مگر جگہ کی کمی مانع ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''سٹالن، ہٹلر اور مسولینی تینوں کے تینوں نشہ آور چیزوں سے احتراز کرنے کے سلسلے میں مثالی انسان تھے۔ وہ یہ لوگ تھے جو ایک بالکل جدید طریقے پر انسانیت پر مظالم کرنے میں، انسانوں پر حکومت کرنے کے جدید ترین انداز میں بھی اپنی مثال آپ تھے مگر ان کی زندگی ایسی تھی کہ ہر وہ نوجوان جو دنیا میں ترقی کرنا چاہتا ہے اسے ان کی زندگی کی مثال پر عمل کرنا چاہیے۔ ان میں سے ہر ایک کسی شریف آدمی کا بہت اچھا داماد اور کسی شریف زادی کا مثالی شوہر بن سکتا تھا۔ یہ لوگ اخلاقی اعتبار سے اتنی مقطع زندگی بسر کرتے تھے کہ کٹر سے کٹر مذہبی شخص ان کی گرد کو نہ پہنچے ہٹلر نہ گوشت کھاتا تھا، نہ شراب پیتا تھا، نہ سگریٹ پیتا تھا یہی نیکیاں کیا کم مصیبت ہیں مگر ان کے ساتھ ان میں پارسائی اور پرہیز گاری کی بھی مصیبت موجود تھی۔ رہا مسولینی تو وہ کھاتا ضرور گھوڑے کی طرح تھا لیکن ہر قسم کی تیز شرابوں سے بڑی سختی سے احتراز کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار ہلکی شراب کا ایک سرور آگیں گھونٹ لیتا تھا اور بس۔ کوئی کام ایسا نہ کرتا تھا جس سے کسی ادنیٰ قوم پر غلبہ پانے کے ارفع اور اعلیٰ مقصد میں رکاوٹ ہو۔ اب سٹالن کی طرف آیئے تو وہ بڑی سادگی سے تین کمروں کے ایک گھر میں رہا کرتا تھا۔ بہت غیر نمایاں کپڑے پہنتا تھا جس سے کوئی مذاق یا بد مذاقی بالکل ظاہر نہ ہو۔ خطرناک حد تک سادہ غذا کھاتا تھا اور کبھی کبھار برانڈی کی ہلکی چسکی یوں لیتا تھا جس طرح شرابوں کے ذائقے کے ماہر چسکی لیتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے اس سارے بیان کی اہمیت ہمارے لیے کیا ہے۔ فرگوسن لکھتا

ہے کہ ''کیا ان باتوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ دنیا ایسے لوگوں کے چنگل میں گرفتار ہے جو بنیادی طور پر آدمیت سے بیزار و تباہ کن حد تک پارسا ہیں؟ جن کو بڑی مہیب حد تک یہ شعور ہے کہ وہ بے کراں ضبط نفس کے مالک ہیں۔ اس لیے یہ لوگ آدمیت کے لیے سخت خطرناک ہیں اور اگر یہ لوگ اپنی پارسائی اور ضبط نفس کا جامہ تار تار کر کے، نشے میں دھت ہو کر ہوحق مچاتے پھریں تو دنیا کو بڑا آرام نصیب ہو جائے۔ یاد رکھیے جس شخص کو نشے کے اتار، خمار کی اعضاشکنی سے واسطہ پڑتا ہو وہ کبھی ڈکٹیٹر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس حالت میں اپنے دیوتا ہونے اور اپنے قادر مطلق بننے کا احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے اگر ڈکٹیٹر کو نشے کے اتار کی حالت سے واسطہ پڑے تو وہ اپنے محکوم بندوں، اپنی رعایا کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل اور بازاری محسوس کرے گا۔ وہ اس حالت میں عوام میں سے ایک معمولی شخص بن جائے گا۔ بلکہ عوام میں سے بھی سب سے گھٹیا قسم کا شخص ہوگا اور یہ تجربہ اس ڈکٹیٹر کے حد سے بڑھے ہوئے تکبر اور تکلیف دہ پندار کو سخت ٹھیس پہنچائے گا۔''

فرگوسن کا خیال ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ایک کاک ٹیل پارٹی کی جائے جس میں ہر ملک کے عوام کے چنے ہوئے رہنما بلائے جائیں۔ اس پارٹی کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیے کہ ''ان معزز ہستیوں کو بڑی سادگی اور بڑی صفائی سے استری کر دیا جائے تاکہ کل صبح جو یہ لوگ نیند سے اٹھیں تو آج کی طرح خطا اور عیب سے پاک فوق البشر نہ ہوں بلکہ بالکل عام آدمی بن جائیں۔ اپنے گھٹیا سے گھٹیا محکوم کی طرح عجیب اور کمزوری کے پتلے ہوں چنانچہ وہ آدمی بن کر، انسانیت کے مسئلے سلجھائیں، دیوتا نہ بنے رہیں۔''

مجھے ڈکٹیٹروں سے اس لیے چڑ ہے کہ یہ لوگ انسان نہیں ہوتے اور ہر وہ چیز جو غیر انسانی ہو بری ہوا کرتی ہے۔ جو مذہب غیر انسانی ہو وہ مذہب کہلانے کا مستحق نہیں۔ جو سیاست غیر انسانی ہو وہ احمقانہ ہوتی ہے۔ غیر انسانی آرٹ برا آرٹ ہوتا ہے اور غیر انسانی طرز زندگی، جانوروں کی طرز زندگی ہے۔ ہر چیز کی کسوٹی یہی ''بشریت'' یہی آدمی پن ہے۔ زندگی کے ہر شعبے اور فلسفے کے ہر نظام کو اسی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ آدمی کے لیے سب سے بڑا نصب العین یہ نہیں کہ وہ نیکیوں کا جیتا جاگتا نمونہ بن جائے بلکہ یہ ہے کہ خوش مزاج اور ملنسار ہو، لوگ اسے پسند کریں اور وہ ہر لحاظ سے معقول انسان ہو۔

چائے کے بارے میں مغرب کے لوگ چین سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں لیکن شراب کے معاملے میں مغرب کے لوگ چینی قوم کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔ ایک چینی جب پہلی بار شراب کی امریکی دکان میں داخل

ہوتا ہے تو وہ شراب کی مختلف قسموں کی بوتلوں اور ان کے رنگا رنگ لیبلوں کو دیکھ کر بھونچکا رہ جاتا ہے۔ اس کے اپنے ملک میں تو صرف ایک شراب ہے اور وہ جہاں جاتا ہے وہاں شاؤ سنگ شراب سے ہی اس کا سابقہ پڑتا ہے۔ کوئی چھ سات دیسی قسمیں اور بھی جوار وغیرہ سے بنائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ طبی ضرورتوں کی ایک شراب بھی ہے مگر یہ ساری قسمیں جلد ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ چینی تہذیب میں یہ تکلف پیدا نہیں ہو سکا کہ مختلف کھانوں کے ساتھ مختلف قسم کی شرابیں پیش کی جائیں مگر ساؤ سنگ شراب کی ہر دلعزیزی کا عالم یہ ہے کہ اس شہر میں جس کے نام پر یہ شراب مشہور ہے ہر لڑکی کے پیدا ہونے پر شراب کا ایک مٹکا الگ کر دیا جاتا ہے چنانچہ اس لڑکی کے جوان ہونے تک اور اس کی شادی کے وقت تک یہ شراب کم سے کم بیس سال ضرور پرانی ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ کہنہ شراب اس کے جہیز میں دی جاتی ہے۔

چین میں شراب کی قسموں کی جو کمی ہے اسے شراب پینے کے مناسب وقت اور مناسب ماحول پر زور دینے سے پورا کیا گیا ہے۔ شراب کا مذاق الگ ہے اور چائے اور شراب میں جو فرق ہے اسے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ ''چائے تارکِ دنیا سے مماثلت رکھتی ہے اور شراب کی مثال ایک بانکے امیر زادے کی ہے...... شراب، لطفِ صحبت کے لیے بے بہا چیز ہے اور چائے خاموش طبع شخص کی رفیق ہے''...... شراب پینے کے مناسب موقعوں اور مقامات کے بارے میں بھی صاف صاف لکھ دیا گیا ہے...... ایک مصنف کہتا ہے: ''تکلفاً اور رسماً جو شراب پی جائے وہ بہت دھیرے دھیرے اور سہج سہج پینی چاہیے۔ بلانوشی میں ایک طرح کا بانکپن اور رومان ہونا چاہیے۔ بیمار کو بہت کم شراب پینی چاہیے۔ غمگین شخص کو اس لیے پینی چاہیے کہ وہ نشے میں دھت ہو جائے۔ بہار کے موسم میں ایک کھلے صحن میں مے نوشی مناسب ہوگی۔ گرمیوں میں شہر کے مضافات میں اور خزاں میں کشتی میں بیٹھ کر پینی چاہیے۔ سردیوں میں مکان کے اندر بیٹھ کر مے نوشی کرنی چاہیے۔ رات کو صرف چاند کی موجودگی میں پینی چاہیے۔''

ایک اور مصنف لکھتا ہے ''پی کر دھت ہونے اور بہکنے کے بھی خاص موقعے ہوا کرتے ہیں۔ دن میں پی کر بہکنا ہو تو پھولوں کے تختے کے پاس بیٹھ کر پیو تاکہ ان پھولوں کی تاب اور ان کا رنگ تم میں رچ جائے۔ برف کے دنوں میں رات کو پی کر دھت ہونا چاہیے تاکہ خیالات میں سلاست اور وضاحت پیدا ہو جائے۔ کامیابی پر جو شخص مسرور ہو اسے پی کر گانا چاہیے تاکہ اس کی روح وجد کر اٹھے۔ کسی الوداعی دعوت میں جو شخص

شخص بہت زیادہ پینا چاہیے اسے سرچھیڑنے چاہئیں تا کہ اس کی روح کو قوت مل سکے۔ پی کر ایک باعلم شخص کو بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مبادا وہ کوئی ایسی بات کر بیٹھے جس میں اس کی سبکی ہو۔ ایک مخمور فوجی کو اور زیادہ شراب کا آرڈر دینا چاہیے اور اعزازی نشانات لگانے چاہئیں تا کہ اس کی شان بڑھے۔ برج میں بیٹھ کر مے نوشی صرف گرمی میں کرنی چاہیے تا کہ فضا کی ٹھنڈک سے لطف اٹھایا جا سکے۔ خزاں میں کشتی میں بیٹھ کر شراب پینی چاہیے تا کہ آزادی اور دل کی کشادگی کا احساس زیادہ ہو۔ شراب پینے کے موقعوں پر مقام کے سلسلے میں مناسب قاعدے یہی ہیں اگر ان قاعدوں سے انحراف کیا جائے تو مے نوشی کا سارا لطف تباہ ہو سکتا ہے۔''

شراب کے بارے میں چینی لوگوں کا رویہ اور مے نوشی کی محفل میں ان کا رکھ رکھاؤ ایسا ہے جو کچھ تو میری سمجھ میں نہیں آتا، اور کسی حد تک قابل ملامت بھی ہے اور کچھ کچھ تعریف کے لائق بھی ہے...... قابل ملامت بات تو یہ ہے کہ چینی ہر شخص کو اس کی بساط اور ظرف سے کہیں زیادہ پی جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس سے انھیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ مغربی معاشرے میں اگر یہ رواج ہے تو مجھے اس کی خبر نہیں مگر چین میں تو شراب کی مقدار پر زور ہے، چاہے خود پئیں یا کوئی اور پی رہا ہو۔ بے شک اس کا تعلق خوش باشی سے بہت زیادہ ہے اور جس کسی کو بھی زیادہ پینے پر مجبور کیا جاتا ہے اسے بڑے دوستانہ اور بامذاق طریقے سے مجبور کیا جاتا ہے چنانچہ اس سے کافی شور مچتا ہے اور بہت گڑبڑ بھی ہوتی ہے جس سے محفل کی رونق بڑھتی ہے اور لطف محفل بھی زیادہ ہوتا ہے۔ دیکھنے کا سماں وہ ہوتا ہے کہ محفل میں ہر شخص پر نشے کا خاصہ گہرا رنگ چڑھتا ہے اور ہر شخص اپنے آپ کو بھول جاتا ہے کہ وہ کون ہے۔ ہر طرف سے ''اور لاؤ'' کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں یا ایک دوسرے کی جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور کسی کو یہ یاد نہیں ہوتا کہ میزبان کون ہے اور مہمان کون ہیں۔ اس سے اگلے مرحلے پر پینے کا مقابلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ بڑے فخر، بڑی لطافت اور بڑی چابک دستی سے جاری رکھا جاتا ہے۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ حریف کو دھت کر کے نیچا دکھائیں۔ اس لیے حریف کی طرف سے کسی دھوکے کے سلسلے میں چوکس رہنا پڑتا ہے، حریف کی چالوں سے خبردار ہونا پڑتا ہے۔ اور غالباً محفل مے نوشی کا سارا لطف اسی مقابلے کی فضا میں مضمر ہوتا ہے۔

رہا چین میں شراب نوشی کا قابل تعریف پہلو تو وہ ان محفلوں کی ہنگامہ آرائی اور شور ہے...... کسی چینی

ریستوران میں کھانا کھایئے تو شور سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ریستوران میں نہیں بلکہ فٹ بال کا میچ دیکھنے آئے ہیں۔ اس شور کی وجہ یہ ہے کہ مے نوشی کی محفلوں میں ''انگلیاں گننے'' کے ایک عجیب سے کھیل کا رواج ہے۔ کھیل یوں ہے کہ دو شخص بیک وقت ہاتھ کی انگلیاں پھیلاتے ہیں اور پھر بلند آواز سے یہ بتاتے ہیں کہ ان کے خیال میں اپنے اور حریف کے ہاتھوں کی انگلیوں کی کل تعداد کیا ہوگی۔ اس کھیل میں وقت کی مطابقت کا بڑا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، اس لیے جب انگلیوں کی تعداد بتائی جاتی ہے تو یہ تعداد شاعرانہ ترکیبوں میں ڈھل کر ایک خاص آہنگ اختیار کر لیتی ہے۔

مے نوشی کی محفل کے بارے میں چینی لوگوں کا جو نظریہ ہے اب اس کے اصل مقصد کی طرف آیئے۔ کیونکہ یہی نکتہ ہے جو چینی دعوتوں کی طوالت کی تشریح کر سکتا ہے۔ اس کی بدولت پتا چل سکتا ہے کہ چینی دعوتوں میں کتنے کھانے پیش کیے جاتے ہیں اور کھانا کس طرح کھلایا جاتا ہے۔ چینی دعوتوں کا اصل مقصد یہ نہیں ہوتا کہ آپ جم کر بھر پیٹ کھانا کھالیں اور بس۔ اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ مختلف قسم کے کھانوں کے درمیان جو کہانیاں کہی جاتی ہیں، جو مذاق ہوتا ہے، جو چیستان اور کہہ مکرنیاں ہوتی ہیں ان سے پورا پورا لطف اٹھایا جائے اور محفل کے مزے لیے جائیں۔ یہ دعوتیں اصل میں دماغی کھیلوں کی محفلیں ہوتی ہیں۔ جن میں ہر پانچ سات منٹ کے بعد کوئی کھانے کی چیز میز پر آجاتی ہے یا مہمان کچھ وقفے کے بعد تھوڑا کھا لیتے ہیں اور پھر باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے دو اثرات ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان دماغی کھیلوں میں سوال اور جواب کے سلسلے میں جو شور مچتا ہے اس کی بدولت نشہ آور مشروب اور شراب کے اثرات جسم سے زائل ہونے میں مدد ملتی ہے۔ دوسرا اثر یہ ہے کہ عام طور پر یہ دعوتیں ایک گھنٹے سے زیادہ جاری رہتی ہیں۔ ان کے ختم ہونے تک کچھ نہ کچھ کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جتنا آپ کھاتے جاتے ہیں اتنی ہی اور بھوک معلوم ہوتی ہے۔ کھاتے وقت خاموش رہنا بڑے عیب کی بات ہے، یہ بات اس لیے اخلاق سے گری ہوئی ہے کہ یہ بے حد غیر صحت مند ہے۔ عام طور پر غیر ملکی لوگوں کے دل میں یہ شک جاگزیں ہوا کرتا ہے کہ چین کے لوگ خوش باش نہیں ہوتے۔ ان میں سے جن لوگوں کو یہ شبہ ہو کہ چینی بڑی سنجیدہ اور مقطع اور خاموش طبع قوم ہے انھیں چاہیے کہ چینیوں کو کھانا کھاتے ہوئے ایک بار دیکھ لیں کیونکہ اس وقت چینی لوگ موج میں ہوتے ہیں اور ان کے طبع کمالات کا عروج اسی وقت نظر آ سکتا ہے اگر کھانا کھاتے وقت بھی چینی خوش باشی کے پتلے نہیں تو یوں سمجھیے کہ خوشی ان کی

قسمت میں ہی نہیں۔

معموں اور چیستانوں کے سلسلے میں چینی لوگ بڑے مشہور ہیں مگر شراب پیتے وقت ان کے دماغی کھیلوں کے بارے میں کم لوگ جانتے ہیں۔چین میں بے شمار کھیل رائج ہیں اور یہ سب کے سب شراب پینے کے بہانے ہوتے ہیں......رات کے کھانے پر جو جو کھانے کھلائے جاسکتے ہیں ہر چینی ناول میں ان کا عین مین ذکر موجود ہوتا ہے۔ان ناولوں میں شعر گوئی کے ایسے مقابلے بھی مذکور ہیں جو ایسے موقعوں پر اکثر ہوتے رہتے ہیں۔مشہور نسائی ناول چنگ ہوا یو آن میں ادبی مذاق رکھنے والی لڑکیوں کی ایسی کئی تفریحات کا ذکر ہے(ان میں تلفظ کے کھیل بھی شامل ہیں)اور غالباً یہی چیز اس ناول کا اصل موضوع ہیں۔

سب سے سادہ کھیل شیہ فو کہلاتا ہے۔اس کھیل میں کسی ایک لفظ کا ابتدائی رکن اور دوسرے لفظ کا آخری رکن ملا کر ایک لفظ بنا دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو وہ رکن بتانا پڑتا ہے جو ان میں غائب ہوتا ہے۔اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو......حور کا ٹکڑا ''محسور'' اور ''حوروش'' دونوں میں مشترک ہے۔اس کا معمایہ بنا کہ ''مس وش'' کا لفظ دے دیا۔گویا مسحور کا پہلا رکن مس اور حوروش کا آخری رکن وش ملا کر ایک لفظ بنا دیا۔حریف سے کہا کہ ان میں سے جو رکن غائب ہے،وہ بتاؤ......مناسب طریقہ یہ ہے کہ جو شخص ان دونوں لفظوں کا درمیانی رکن بوجھ لے(حور)وہ اسے بتاتا نہیں بلکہ اس سے ایک جوابی معما بنالیتا ہے۔مثلاً حور کے لفظ سے وہ حور طلعت اور سحور(جمع سحر۔صبح)کے رکن ملا کر طلعتیں کا لفظ بنا کر جواب میں کہہ دے گا۔اصل معما بنانے والے کو معلوم ہو جائے گا کہ مخالف کو صحیح جواب معلوم ہے لیکن حاضرین کو کچھ پتا نہ چل سکے گا۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ حریف کا جواب اصل جواب سے بہتر ہے۔اس سے بہتر لفظ کو ماننا لازم ہوگا۔اس چیستان کو اور زیادہ پیچیدہ اور مشکل بھی بنایا جاسکتا ہے اور نہایت مشکل اور بعض اوقات نادر الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔جہاں اس کھیل میں کچھ اہل علم لوگ حصہ لے رہے ہوں تو بڑے بڑے نادر تاریخی نام بھی استعمال کیے جاتے ہیں جن کی بدولت دوسرے کی علمیت معلوم ہو جاتی ہے۔مثلاً شیکسپیئر کے ڈراموں میں کرداروں کے یا بالزاک کے کرداروں کے ناموں سے پہیلیاں بنائی جاتی ہیں جن کا حل کافی دشوار ہوتا ہے۔

ایسے ادبی کھیلوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔اہل علم لوگوں میں ایک کھیل عام ہے کہ ایک عالم شخص سات لفظوں کا ایک مزاحیہ سا مصرعہ کہتا ہے۔دوسرا اس گرہ لگاتا ہے اور پھر مصرعہ در مصرعہ نظم چلتی ہے۔شرط یہ ہے کہ

آخر میں اس کا کوئی مطلب اور مفہوم پیدا نہ ہو۔ مصرعوں میں عام طور پر کسی چیز، کسی شخص یا کسی منظر پر کچھ کہا جاتا ہے۔ ہر شخص دو مصرعے کہے گا۔ پہلے مصرعے میں تو اپنے سے پہلے والے شخص کے مصرعے پر گرہ لگا کر شعر بنا دے گا اور دوسرا مصرعہ بعد والے کے لیے ہوگا کہ وہ شعر پورا کرے۔ قافیے کی پابندی سب سے پہلے مصرعے سے شروع ہوگی۔ تیسرے، پانچویں، ساتویں مصرعوں میں (علیٰ ہذا القیاس) اس قافیے کا التزام کیا جائے گا ...... عالموں کی محفل میں (جن میں ہر شخص نے ''کتاب چہار گانہ'' یا ''کتاب النغمات'' کا ہر نام اور ہر فقرہ حفظ کر رکھا ہوتا ہے) میز بان یہ مطالبہ بھی کر سکتا ہے کہ حاضرین کسی خاص موضوع پر مناسب مقولے اور ضرب الامثال پیش کریں ...... مقبول عام گیتوں اور تانگ نظموں کے مصرعوں پر مناسب ''مقولے'' کہنے کا بھی مطالبہ ہو سکتا ہے۔ ان باکمال حاضرین سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے پھولوں یا دواؤں کے نام بتائیں جن کا تعلق عورتوں کے جسم، لباس یا ان کے استعمال کی چیزوں سے ہو ...... اس کی مثال پنجہ مریم (ایک بوٹی) گوکھرو (ایک خاردار بوٹی) وغیرہ ہیں ...... ایسے ذو معنی نام اسی صورت میں پیش کیے جا سکتے ہیں کہ ایک زبان میں پھولوں، دواؤں، درختوں وغیرہ کو کس قسم کے نام دیے گئے ہیں اور وہ نام خوبصورت بھی ہیں یا نہیں ...... ناموں کی کہہ مکرنیاں اور ان کا الٹ پھیر ہر زبان میں ممکن ہے اور اس کا سارا دارو مدار طباعی اور دماغ کی طراری پر ہے۔ اس کھیل کا سارا لطف برجستگی اور تیزی میں ہے۔ اور یہ ضروری ہے کہ ان ذو معنی لفظوں کے ساتھ عام معنی کے علاوہ دوسرے معنی بھی وابستہ ہوں جو بڑے نادر اور عجیب ہوں ...... کالج کے طلب علموں کو میرا مشورہ ہے کہ وہ اپنے پروفیسروں کے ناموں سے ایسی ترکیبیں بنا کر اور الٹ پھیر کر کے نہایت اچھا وقت گزار سکتے ہیں۔

ان کھیلوں کے علاوہ ایسے کھیل بھی ہیں جن میں کچھ ساز و سامان چاہیے، مثلاً لکڑی کے خاص وضع کے ٹکڑے چاہئیں ...... ناول ''پھولوں کا خواب'' میں ایسے ہی ایک کھیل کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس میں ٹکڑوں کے تین الگ الگ سیٹ (یہ ٹکڑے چاہے کاغذ کے ہوں) ہوتے ہیں۔ ان میں چھ آدمیوں کا یہ گروہ چھ مختلف کام، مختلف جگہوں میں کر رہا ہے:

بانکا	گھوڑے کی سواری کرتا ہے	بازار میں
پادری	نماز پڑھتا ہے	اپنے کمرے میں

خاتون	کشیدہ کاری کرتی ہے	اپنے حریم میں
قصاب	لڑ رہا ہے	گلی کوچوں میں
طوائف	ناز و انداز دکھاتی ہے	قحبہ خانے میں
گداگر	سوتا ہے	قبرستان میں

ان ٹکڑوں کو ملا دیا جاتا ہے۔ پھر ہر شخص ان تینوں سیٹ میں سے ایک ایک ٹکڑا اٹھاتا ہے، ان کو ملا کر ایسے عجیب فقرے بنتے ہیں کہ جی خوش ہو جائے۔ مثلاً آپ نے ہر سیٹ میں سے ایک ایک ٹکڑا اٹھایا۔ ان کو ملا کر یہ فقرہ بنا کہ ''پادری، خاتون کے حریم میں ناز و انداز دکھا رہا ہے۔'' یا ''گداگر قحبہ خانے میں نماز پڑھتا ہے۔'' یا ''قصاب، بازار میں کشیدہ کاری کرتا ہے!'' ...... یا ''خاتون قبرستان میں لڑ رہی ہے'' ......ان فقروں کو سامنے رکھ کر بتایئے کہ کیا یہ اخباروں کی نہایت عمدہ اور لرزہ خیز سرخیاں نہیں بن سکتیں؟ خیر ایک ایسی بات کو موضوع ٹھہرالیا جاتا ہے اور ہر شخص سے کہا جاتا ہے کہ وہ پانچ رکن کا ایک مصرعہ نظم کے لیے کہے۔ آخر میں نظم کا نام آئے۔ اور نظم کے آخر میں ''کتاب النغمات'' کا ایک موزوں اور برجستہ فقرہ آئے تا کہ اس موضوع پر ساری بات مکمل ہو جائے۔

اس کے پیش نظر، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مے نوشی کی ایسی دعوتیں دو دو گھنٹے چلتی ہیں۔ شریک محفل کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ کھائے اور پیے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تفریح میں شامل ہو اور جی بھر کر شور مچائے۔ اسی لیے جو شخص نیم مخمور رہے وہی اچھا رہے گا۔ پینے والے کے لیے اصل چیز شراب نہیں، جذبہ ہے۔ اس کا لطف ہے اور اگر آپ میں زیادہ پینے کی بساط نہ بھی ہو، پھر بھی آپ اس جذبے، اس مذاق کی بدولت لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے:

> ''ایسے بھی لوگ ہیں جو ایک لفظ پڑھ نہیں سکتے مگر ان میں شعر سے مزہ اٹھانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جنھیں ایک دعا یاد نہیں مگر مذہب کا صحیح شعور ان میں ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو شراب کا ایک قطرہ نہیں پیتے لیکن شراب کے کیف کا مذاق انھیں ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں کہ منظر کے بارے میں انھیں کچھ پتا نہیں ہوتا لیکن ان میں مصوری کا سچا جوہر موجود ہے۔''

یہی وہ لوگ ہیں جو شاعروں اور ولیوں، مے کشوں اور مصوروں کے ہم نشین ہونے کے قابل ہیں۔

7- غذا اور دوا

کھانے کی چیزوں کے بارے میں اگر ذرا وسعت نظر سے سوچیں تو ہر اس چیز کو ''غذا'' میں شامل کرنا ہوگا جو ہماری پرورش کرے یا ہمیں قوت پہنچائے...... ہم سب حیوان ہیں، اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ہم وہی کچھ ہیں جو ہم کھاتے ہیں۔ گویا ہماری زندگی دیوتاؤں کی گود میں نہیں بلکہ باورچیوں کے ہاتھوں میں ملتی ہے اسی لیے چینی شرفا اپنے باورچی کو دوست بنانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ زندگی کے مزے اسی کے اختیار میں ہیں۔ وہ چاہے تو زندگی کا لطف اٹھانے دے یا نہ دے۔ چینی ماں باپ، اور میرے خیال میں مغربی ماں باپ بھی بچے کی انا کو ہمیشہ بہت اچھی طرح رکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بچے کی صحت کا سارا دارومدار انا کے مزاج، اس کی خوشنودی اور اس کے رہن سہن پر ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں بھی یہ جاننا چاہیے کہ اپنے باورچیوں کو نہایت اچھی طرح رکھیں کیونکہ اگر ہمیں اپنی صحت کا اتنا ہی خیال ہے جتنا ہمیں اپنے بچوں کی صحت کا ہوتا ہے تو باورچی کے ساتھ شاہانہ سلوک روا رکھنا ہوگا۔ ایک معقول آدمی اگر صبح کے وقت بستر پر پڑے پڑے زندگی کی نعمتوں کا شمار کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ زندگی کے ان مزوں اور نعمتوں میں سب سے پہلے نمبر پر کھانا ہے۔ گویا عقلمند آدمی کی پہچان یہ ٹھہری کہ وہ گھر پر اچھا کھانا کھاتا ہے یا نہیں۔

جدید زمانے میں شہری زندگی کی رفتار اتنی برق وش ہے کہ ہم لوگ کھانا کھانے اور کھانے پینے کے مسئلے کو کم سے کم وقت دیتے ہیں اور اس کے بارے میں کم سے کم خیال کرتے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں بیوی، جو اعلیٰ پایے کی اخبار نویس بھی ہو، اپنے شوہر کو ڈبے کا شوربا اور سیم کی پھلیاں بھی کھلا سکتی ہے اور اس سے کوئی شکایت بھی نہیں کی جاتی مگر ذرا خیال کیجیے، یہ کیا زندگی ہے کہ ہم صرف کام کرنے کے لیے کھائیں اور اس لیے کام نہ کریں کہ ہمیں کھانا نصیب ہو سکے...... یہ اپنے ساتھ بڑا سخت ظلم ہے اور دوسروں پر رحم والطاف کرنا سیکھنے سے پہلے ہمیں اپنے اوپر رحم کرنا پڑے گا۔ آج کل کئی خواتین معاشرتی اصلاح کے لیے شہر کے غلیظ اور پسماندہ حصوں میں دن رات کام کرتی پھرتی ہیں لیکن یہی خواتین گیس کے چولہے پر دس منٹ میں کوئی معمولی سی چیز پکا کر کھا لیتی ہیں کیونکہ انھیں معاشرتی اصلاح کے کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی!...... میں پوچھتا ہوں یہ معاشرتی اصلاح کس کام کی ہے؟...... اگر کنفیوشس کو ایسی کسی خاتون سے واسطہ پڑتا تو وہ اسے

نوراً طلاق دے دیتا کیونکہ اس نے اپنی بیوی کو اچھا کھانا نہ پکانے کے قصور پر طلاق دے دی تھی۔

اب یہ واضح طور پر معلوم نہیں کہ کنفیوشس نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی یا وہ بے چاری خود، زندگی کے اس نہایت نازک طبع پرستار کے مطالبات سے تنگ آ کر گھر سے نکل گئی تھی۔ کنفیوشس کی لطافت ذوق کا یہ حال تھا کہ ''چاول کبھی اتنے سفید نہیں پکائے جا سکتے جتنے سفید ہونے چاہئیں، نہ قیمہ اتنا باریک ہو سکتا ہے جتنا ہونا چاہیے۔'' ...... اگر گوشت مناسب چٹنی کے ساتھ کے سامنے نہ رکھا جاتا تو وہ کھانے سے انکار کر دیتا تھا۔ یا 'جب اس کی بوٹیاں باقاعدہ اور عمدہ نہ ہوں یا جب اس کی خوشبو ٹھیک نہ ہو' تو وہ کبھی نہیں کھاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی بیوی کسی نہ کسی طرح اس کے ساتھ گزر بسر کرتی رہی۔ ایک دن اس نے اپنے بیٹے کو بازار بھیجا کہ کچھ شراب اور کچھ گوشت لے آئے تاکہ کھا پی کر سب فارغ ہوں۔ مگر کنفیوشس نے صاف کہہ دیا کہ ''میں وہ شراب نہیں پی سکتا جو گھر میں نہیں بنائی گئی نہ وہ گوشت کھاؤں گا جو گھر میں نہیں پکایا گیا۔'' اس پر، اس بچاری کے پاس گھر سے چلے جانے کے سوا کیا چارہ رہ گیا تھا؟ ...... یہ عرض کر دوں کہ کنفیوشس کی بیوی کی نفسیات کے بارے میں جو کچھ میں نے عرض کیا وہ میرا اندازہ ہے لیکن یہ طے ہے کہ اس نے اپنی بیوی پر جو شرائط عائد کر رکھی تھیں وہ بے حد کڑی تھیں۔ تمام کنفیوشسی کتابیں اس کی شاہد ہیں۔

چنانچہ یہ قرار پایا کہ غذا وہ چیز ہے جو ہمارے جسم کی پرورش کرے، اس لیے چینی لوگ غذا اور دوا میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھ سکے ...... جو چیز جسم کے لیے اچھی ہو وہ دوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ غذا بھی۔ جدید سائنس نے ابھی گزشتہ صدی میں یہ دریافت کیا ہے کہ بیماریوں کے علاج میں غذا کا بڑا اہم حصہ ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے آج اچھے ہسپتالوں میں غذا کے ماہر ڈاکٹر ضرور رکھے جاتے ہیں اگر یہ جدید ڈاکٹر ایک قدم اور آگے بڑھیں اور ان غذائی ماہروں کو چین میں ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے بھیجیں تو انھیں شیشے کی بوتلوں میں بند دواؤں کی بہت کم ضرورت ہوا کرے۔ چین کے ایک بہت قدیم ماہر طب نے لکھا ہے ''ایک ہوشیار طبیب سب سے پہلے تو بیماری کے اسباب معلوم کرتا ہے اور جب اصل سبب معلوم ہو جائے تو اسے غذا کے ذریعے سے ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب غذا کام نہ کرے تو پھر وہ کوئی دوا تجویز کرتا ہے!'' ...... چین میں غذا کے بارے میں سب سے پہلی کتاب منگول دربار کے شاہی طبیب نے کوئی 1330ء کے لگ بھگ لکھی تھی۔ یہ کتاب بنیادی طور پر غذا کو صحت کی بنا ٹھہراتی ہے ...... ابتدا ہی میں وہ عبارت ملتی ہے۔ ''جو شخص اپنی صحت کا

خیال رکھتا ہے وہ اپنی پسند، ناپسند میں اعتدال ملحوظ رکھتا ہے، فکر اور تشویش کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا، خواہشات پر ضبط کرتا ہے، جذبات پر قابو رکھتا ہے، قوت حیات کو سنبھالتا ہے، کم سخن ہوتا ہے، کامیابی اور ناکامی کا زیادہ خیال نہیں کرتا، غموں اور مشکلوں کی پروا نہیں کرتا، فضول امنگوں اور ارمانوں کو دل میں جگہ نہیں دیتا، باصرہ اور سامعہ کو سکون دیتا ہے اور اپنے اندرونی نظام اور غذا کی باقاعدگی کا پابند ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے قوا کو مضمحل نہیں کرتا اور روح پر بوجھ نہیں ڈالتا وہ بیمار کیسے ہو سکتا ہے؟ لہٰذا جو شخص اپنی پرداخت کرنا چاہیے اسے صرف اس وقت کھانا چاہیے جب اسے بھوک لگے۔ اسے کھانا چاہیے ٹھونسنا نہیں چاہیے۔ پانی اس وقت پینا چاہیے جب اسے پیاس لگے اور پیٹ کو پانی سے بھرنا نہیں چاہیے۔ تھوڑا کھانا چاہیے اور کھانوں کے درمیان لمبا وقفہ ہونا چاہیے۔ کھانا بہت زیادہ نہ ہو، اور یہ ہمیشہ کا دستور ہو۔ اسے چاہیے کہ جب وہ کھانے کی میز سے اٹھے تو اس کی بھوک باقی ہو اور جب وہ بھوکا ہو تو کچھ سیر بھی ہو۔ پیٹ کی سیری پھیپھڑوں کو تکلیف دیتی ہے اور بھوک، قوت حیات کی روانی میں رخنہ اندازی کرتی ہے''

یہ اقتباس کھانوں کی کتاب کا ہے اور چینی زبان میں کھانے کے بارے میں ہر کتاب اسی طرح ہوتی ہے کہ اس میں اور طب کی کتاب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

شنگھائی میں ہونان روڈ پر چینی دواؤں کی دکانیں ہیں۔ ان دکانوں کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دکاندار دوائیں زیادہ بیچتے ہیں یا کھانے کی چیزیں۔ ان دکانوں میں گوشت کی ران کے ساتھ آپ کو دارچینی رکھی ملے گی۔ شیر کی سوکھی نسوں اور اود بلاؤ کے گردوں کے ساتھ چھوٹی سمندری مچھلیاں ہوں گی اور ہرن بچے کے سینگوں کے ساتھ پیکنگ کی کھجوریں رکھی ملیں گی۔ یہ ساری چیزیں انسانی جسم کے لیے مفید ہیں اور سب کی سب انسانی جسم کی پرورش کرتی ہیں۔ اس لیے کھانے کی چیزوں اور دواؤں میں امتیاز ناممکن ہے۔ چین میں کوئی طاقت آور دوا، دواؤں پر مشتمل نہیں ہوتی بلکہ اس میں چوزے کا شوربا اور جڑی بوٹیوں کا عرق ہوتا ہے ...... اس کی ساری وجہ چینی طب کا دستور عمل ہے۔ مغربی طب کی دوائیں تو گولیوں اور ٹکنچر کی صورت میں استعمال ہوتی ہیں مگر چینی طب کی ''دوائیں'' عام طور پر دم پخت شوربے کی صورت میں ہوتی ہیں۔ تمام چینی دواؤں کا تصور اور ان کی تیاری عام شوربے یا یخنی کی طرح ہے اور ان کی تیاری میں بوباس، ذائقے اور اجزا کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ایسے شوربے میں عام طور پر سات آٹھ سے لے کر بیس تک اجزا ہوتے ہیں اور نسخے

کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف بیماری کو ٹھیک کیا جائے بلکہ جسم کو بھی تقویت پہنچائی جائے۔اس صورت میں چینی طب، جدید طب سے بالکل متفق ہے کہ جب ایک شخص کا جگر خراب ہو تو اس کا صرف جگر ہی خراب نہیں ہوتا بلکہ اس کا سارا جسم بیمار ہوتا ہے۔آخر دوا کا اور مقصد اور منتہا کیا ہے۔یہی نا کہ انسانی جسم کے پیچیدہ نظام، مختلف اعضا، رطوبتوں وغیرہ کو تقویت دے کر ہمارے جسم کو مضبوط بنائے اور اس طرح انسانی جسم، اپنی مدافعت کی قوت کی بنا پر، بیماری سے نجات حاصل کر لے۔چنانچہ چینی ڈاکٹر مریض کو درد وغیرہ کے لیے کبھی اسپرین کی ٹکیا نہیں دیں گے۔وہ ان کے لیے خاص قسم کی چائے کا بڑا پیالہ تجویز کریں گے۔جس میں چائے کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہوں گی اور جس سے مریض کو کھل کر پسینہ آجائے گا۔ممکن ہے جب بیماری کا علاج کرنے میں غذا کی اہمیت پوری طرح جان لی جائے گی تو مریض کا بخار اتارنے کے لیے کونین کی ٹکیا نہ دی جائے بلکہ اسے سبز کچھوے اور کھمبی کا نہایت عمدہ سوپ دیا جائے جس میں سنکونے کی چھال کے کچھ ٹکڑے بھی ابالے جائیں گے۔اس صورت میں ہسپتالوں کے شعبہ غذا میں بہت توسیع کرنی پڑے گی۔ بلکہ خود ہسپتال، سینی ٹوریم اور ریستوران کا ایک ملا جلا روپ بن جائیں گے۔گویا آخر میں ہم اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ صحت اور بیماری دو الگ الگ چیزیں نہیں، ایک ہی صورت حال کے دورخ ہیں۔اس دور میں انسان کھائے گا اس لیے کہ بیماری سے بچا رہے اور آج کی طرح بیماری کے علاج کے لیے دوائیں نہیں کھاتا پھرے گا۔یہ وہ نکتہ ہے جس پر اہل مغرب خاص توجہ نہیں دیتے کیونکہ مغرب میں لوگ ڈاکٹر کے پاس اسی وقت جاتے ہیں جب وہ بیمار ہوتے ہیں۔صحت کی حالت میں وہ کبھی ڈاکٹر کے ہاں نہیں جاتے مگر اس دور کے آنے سے پہلے جب غذا، بیماریوں کی روک تھام کرے گی ہمیں کم از کم اتنا تو ضرور کرنا چاہیے کہ جسم کی پرورش کرنے والی دوا اور بیماری کا علاج کرنے والی دوا میں سارے امتیاز اٹھا دیں۔

میں نے عرض کیا کہ دوا اور غذا میں چینی لوگوں نے کوئی امتیاز روا نہیں رکھا اور وہ اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔اس کی بدولت ان کی دوائیں، دوائیں کم ہوتی ہیں اور ان کی غذا میں زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے۔اس میں زیادہ غذائیت آ گئی ہے۔چین کے نیم تاریخی عہد کی جو چیزیں ملی ہیں ان میں شکم پروری کے دیوتا کے مجسمے بھی ہیں۔یہ بات اہم ہے کہ کیونکہ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس دیوتا (تاؤایہہ) کی روح ہمارے معاشرے میں جاری وساری ہے۔اس کی بدولت ہماری طب کی کتابیں، کھانوں کی کتابیں معلوم ہوتی

ہیں اور ماکولات کے یہ دفتر، طب کی کتابوں کے مشابہ نظر آتے ہیں۔ اسی کی بدولت قدرتی سائنسوں میں حیاتیات اور علم حیوانات، دونوں فروغ پا کر ترقی نہیں کر سکے کیونکہ چینی سائنس دان سانپ یا بندر کے گوشت یا اونٹ کے کوہان کے ذائقوں کے بارے میں تو سوچتے رہے ہیں، ان کی ماہیت پر کبھی غور نہیں کر سکے۔ اسی لیے چین میں اگر کوئی علمی تجسس موجود ہے تو وہ صرف کھانے کی چیزوں کے بارے میں ہے اور بس۔

وحشی قبیلوں میں دوا اور جادو، دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ چین میں تاؤ فلسفے کے پیروکار ''زندگی کی نمو'' اور جادودانی یا طویل زندگی کو اپنا اصل اصول قرار دیتے ہیں اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ غذا اور دوا، دونوں انھیں لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ میں نے اس سے پہلے منگول دربار کے شاہی طبیب کی لکھی ہوئی کھانوں کی کتاب کا ذکر کیا تھا۔ اس کتاب میں کئی باب موجود ہیں جو بیماری کو دور رکھنے اور لمبی عمر پانے کے بارے میں ہیں۔ تاؤ فلسفے کے پیروکار فطرت کے سختی سے پرستار اور پیروکار ہیں اس لیے ان کتابوں میں عام طور پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان کو پھل پھول اور سبزیاں کھانی چاہئیں۔ مادی زندگی سے مکتی اور شعریت سے قربت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ ان لوگوں نے نیلوفر کے تازہ بیج کھانے کو اہلِ ذوق کے لیے سب سے بڑا ذریعۂ مسرت قرار دیا ہے۔ یہ بیج ایسے ہونے چاہئیں کہ شبنم نے انھیں تازہ تازہ مہکایا ہو۔ ان لوگوں کے اختیار میں ہو تو وہ زرِ نیلوفر کے بجائے شبنم ہی پی لیں۔ اس زمرے میں دیوار کے بیج، اراروٹ کے بیج اور چائنا روٹ کے بیج بھی آتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے کھانے سے عمر بڑھتی ہے۔ کیونکہ ان کے دل صاف اور روح پاکیزہ ہوتی ہے۔

چین کا علم الادویہ ایسا ہے کہ مغربی تحقیق کے لیے اس میں بڑی گنجائش موجود ہے۔ مغربی طب کا حال تو یہ ہے کہ ابھی بیس ایک برس ادھر یہ دریافت ہوا کہ کلیجی کھانے سے خون پیدا ہوتا ہے۔ چین میں ہمیشہ سے یہ خیال موجود ہے اور کلیجی کو بوڑھوں کے لیے بہت عمدہ ٹانک سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یہ شک ہے کہ مغربی ملکوں میں قصاب جب کسی جانور کو حلال کرتے ہیں تو وہ تمام ایسی چیزیں پھینک دیتے ہیں جو اپنے اندر بہت غذائیت رکھتی ہیں۔ ان میں گردے، اوجھری، آنتیں، خون، ہڈیوں کا گودا اور مغز وغیرہ شامل ہیں۔ مغرب میں اس بات کا انکشاف ہو رہا ہے کہ ہڈیوں کے اندر ہی خون کے سرخ ذرے پرورش پاتے ہیں لہٰذا بکرے یا گائے یا کسی اور جانور کی ہڈیوں کے پھینک دینے اور ان کی یخنی تیار نہ کرنے سے بے شمار غذائیت ضائع ہوتی ہے۔

مجھے کئی مغربی کھانے اور کھانے کی چیزیں پسند ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ترنجبین ہے اگر تاؤ فلسفے کے پیروؤں کو گریپ فروٹ (کمب) مل جاتا تو وہ اسے یقیناً آب حیات کا درجہ دیتے کیونکہ یہ لوگ عجیب و غریب پھلوں کی نادر بو باس کو تلاش کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ٹماٹر کا رس ہے جیسے بیسویں صدی کا بہت بڑا انکشاف قرار دینا پڑے گا۔ جس کا سہرا مغرب کے سر ہے۔ آج سے ایک صدی پہلے چینی لوگ بھی مغرب کے لوگوں کی طرح ٹماٹر کو کھانے کے قابل چیز نہیں گردانتے تھے۔ اس کے اگلے نمبر پر کچی سلیری کا نمبر ہے کہ ہرے بانس کی کونپلوں کی طرح ہی بھی، خاص مزہ رکھتی ہے۔ ایسپرگس اگر ہرا نہ ہو تو خوب ہے۔ مجھے یہ بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ انگلستان میں گائے کا گوشت جس طرح تلا جاتا ہے اور باقی قسموں کے گوشت بھی جس طرح روسٹ کیے جات ہیں وہ بھی مجھے بے حد پسند ہیں۔ اصل میں ہر چیز اگر اسی سرزمین میں پکائی اور کھائی جائے جہاں وہ ملتی ہے اور مناسب موسم میں کھائی جائے تو اچھی ہوتی ہے۔ امریکی گھروں میں میں نے جو کھانا کھایا ہے وہ مجھے ہمیشہ پسند آیا لیکن نیویارک کے بہترین ہوٹلوں کے کھانے سے مجھے کوئی مزہ نہیں ملا۔ یہ قصور نیویارک کے ان ہوٹلوں میں نہیں کیونکہ خود چینی ریستورانوں میں بھی اچھا کھانا نہیں ملتا۔ ہاں اگر آپ کھانے کا پہلے سے نوٹس دے دیں اور کھانا خاص طور پر تیار کرائیں تو دوسری بات ہے۔

اس کے باوجود یورپی اور امریکی پکوان میں بڑی زبردست کمیاں موجود ہیں۔ مغربی پکوان، بیکری کی چیزوں، میٹھے پکوانوں اور کھانے کے بعد کی میٹھی چیزوں میں بہت ترقی یافتہ سہی مگر مغربی پکوان بے حد محدود، بڑا بے مزہ اور جدت سے بالکل عاری ہے۔ آپ کسی ہوٹل یا بورڈنگ ہاؤس یا کسی جہاز پر تین ہفتے مغربی کھانا کھائیں۔ ہر بار پھر کر وہی چوزے کا گوشت، گائے کے سینے کے ٹکڑے، مٹن چاپ وغیرہ ملے گا اور ان کو کھاتے کھاتے آپ بیزار ہو جائیں گے۔ مغربی پکوان کا سب سے پسماندہ حصہ سبزیوں کا پکانا ہے۔ اول تو مغرب میں سبزیوں کی قسمیں ہی کم ہیں۔ ان پر طرہ یہ کہ ان سبزیوں کو پانی میں ابالا جاتا ہے اور تیسری بات یہ کہ ان کو اتنا پکایا جاتا ہے کہ یہ اپنا رنگ روپ کھو بیٹھتی ہیں اور بالکل حلوا بن جاتی ہیں۔ خصوصاً پالک سم کی سبزیوں کے ساتھ تو بڑی زیادتی کی جاتی ہے۔ حالانکہ اسے اگر روغن اور نمک کے ساتھ فرائی پین میں بھونا جائے اور خستہ رکھا جائے تو یہ بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ یہی حال سلاد کا ہے۔ شرط یہی ہے کہ ان کو فرائی پین میں زیادہ دیر نہیں رکھنا چاہیے، ورنہ ان کی خستگی جاتی رہے گی اور یہ بالکل ساگ بن جائیں گی۔ مغرب میں چوزے

کی کلیجی کو ایک نادر شے سمجھا جاتا ہے۔ یہی حال بکرے کے گردوں کے کباب کا ہے۔ مگر ان کے علاوہ ان جیسے اور بہت سے کھانے ہیں جن کے بارے میں مغرب والوں نے ابھی کوئی تجربہ نہیں کیا۔ مغرب کے کھانوں میں رنگارنگی اور تنوع کی جو کمی ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ مثلاً چین میں مرغ کا پوٹا (سنگداز) اور اس کے دل وجگر کو بھون کر کباب کرتے ہیں اور نمک چھڑک کر کھاتے ہیں۔ یہ بالکل عام چیز ہے۔ سیم مچھلی کا سر اور اس کے گلپھڑوں کے آس پاس کے نازک گوشت کو خاص طریقے سے تیار کر کے کھایا جاتا ہے۔ یہ دسترخوان پر بڑے تکلف اور خاصے کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اسی قسم کے اور کھانے بھی ہیں جن میں گائے کے گوشت کی دم پخت یخنی بھی ہے اور پھر گھونگا مچھلی ہے جو چین اور فرانس میں بڑی خاص چیز سمجھی جاتی ہے۔

شوربے کے معاملے میں جو اتنا کم تنوع ملتا ہے تو اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ سبزیوں کو گوشت کے ساتھ ملا کر پکانے کے سلسلے میں کم تجربے کیے گئے ہیں۔ خشک جھینگا مچھلی، کھمبی، ہرے بانس کی کونپلیں، کمرخ اور گوشت وغیرہ کو اگر نت نئی ترکیب اور ترتیب سے آمیز کیا جائے تو انھیں پانچ چھ چیزوں سے بہت سی قسموں کا شوربا تیار ہوسکتا ہے۔ ہری کمرخ سے مغرب میں شوربا تیار تو ضرور کیا جاتا ہے لیکن اسے اگر مختلف طریقوں سے بنایا جائے اور اس میں سوکھی ہوئی جھینگا مچھلی کا چھینٹا دیا جائے تو یہ گرما کے لیے نہایت عمدہ شوربہ بنتا ہے۔ تنوع نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ شوربہ بنانے کے سلسلے میں سمندری چیزوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ مغرب میں مثلاً صدفی مچھلی کو صرف فرائی کیا جاتا ہے لیکن اسے اگر سکھا لیا جائے تو یہ شوربا بنانے کے لیے نہایت عمدہ جزو ثابت ہوسکتی ہے مگر مغرب میں تو یہ حال ہے کہ جھینگا مچھلی پکی ہو تو اس میں جھینگوں کا نام نہیں ہوتا۔ سبز کچھوے کا سوپ ہو تو اس میں اس کے گوشت کا نشان نہیں ملتا۔ حالانکہ اسے اس طرح پکانا چاہیے کہ کھانے میں لب جڑ جڑ جائیں۔ سمندری غذا کو پکاتے ہوئے ایک بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ یہ روغن دار نہ ہونے پائے۔

چین کے لوگوں میں کھانے کا جو ستھرا مذاق ہے۔ اس کی مثال کے طور پر میں لی لی ونگ کے مضمون ''کیکڑے'' میں سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ یہ مضمون اس کی کتاب ''جینے کے فن'' میں غذا کے حصے میں ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''کھانے پینے کی چیزوں میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس کی باس اور سگندھ، میں پوری سمجھ

اور زورِ تخیل کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ مگر کیکڑوں کا معاملہ اور ہے۔ مجھے کیکڑے پسند ہیں۔ میرے کام و دہن ان کی لذت سے مزے اٹھاتے ہیں۔ میں انھیں زیادہ دیر تک کھانے بغیر رہ بھی نہیں سکتا اور نہ انھیں بھول سکتا ہوں۔ مگر میرے لیے لفظوں میں یہ بیان کرنا ناممکن ہے کہ مجھے کیکڑے کیوں پسند ہیں۔ اصل یہ ہے کہ کھانے کے معاملے میں کیکڑوں کا سالن میری کمزوری بن گیا ہے۔ اپنی جگہ یہ بھی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے۔ ہر سال کیکڑوں کا موسم آتا ہے اور میں ان کی خریداری کے لیے کچھ رقم مخصوص کر دیتا ہوں۔ میرے گھر والے کہتے ہیں کہ کیکڑے میری زندگی ہیں۔ اس لیے اس رقم کو میں اپنی ''بہائے زندگی'' قرار دیتا ہوں۔ جس دن سے کیکڑے منڈی میں آنے شروع ہوتے ہیں اس دن سے ان کا موسم ختم ہونے تک، میں ہر روز انھیں کھاتا ہوں۔ جو دوست میری اس کمزوری سے واقف ہیں وہ اسی موسم میں میری دعوتیں کرتے ہیں۔ اسی لیے میں اکتوبر اور نومبر کو ''کیکڑوں کی خزاں'' کہتا ہوں۔ میرے پاس ایک خادمہ تھی جو بڑا جی لگا کر کیکڑے پکاتی تھی۔ اسے میں نے ''کیکڑوں کی خادمہ'' کا لقب دے رکھا تھا۔ اب وہ جا چکی ہے۔ ہائے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی کیکڑوں کے آغاز و انجام سے وابستہ ہو چکی ہے۔''

اپنے مضمون کے آخر میں لی نے بتایا ہے کہ اس کے لیے کیکڑوں کی پسندیدگی کی وجہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیکڑے غذا کے اعتبار سے تین نہایت عمدہ خصوصیات کے مالک ہیں۔ یعنی ان کا رنگ، ان کی مہک اور لذت، تینوں لاجواب ہیں۔ کیکڑوں کے بارے میں عام چینی لوگوں کا بھی یہی خیال ہے۔

میرے نزدیک غذا کا فلسفہ محض تین باتوں پر مشتمل ہے۔ یعنی کھانے کی چیز وہی عمدہ ہے جو تازہ ہو، جس میں لذت اور مہک ہو اور جو ٹھیک طریقے پر پکائی جائے۔ دنیا کا بہترین باورچی اچھا کھانا اسی صورت میں پکا سکتا ہے کہ اسے پکانے کے لیے تازہ چیز ملے۔ اس لیے اچھے باورچیوں کا قول ہے کہ پکانے کے ہنر میں آدھا حصہ اچھی چیز خریدنے کا ہے۔ سترہویں صدی میں مشہور چینی شاعر یوآن ست سائی اپنی نفاستِ مزاج اور ذوق کے سلسلے میں سند مانا جاتا ہے۔ وہ اپنے رکابدار کی تعریف میں قصیدے لکھتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اگر چیز کا ٹھیک موسم نہ ہوتا تو اس کا رکابدار اسے پکانے سے یکسر انکار کر دیتا تھا۔ یہ رکابدار کچھ بدمزاج بھی تھا۔

مگر وہ محض اس لیے شاعریو پن کے ساتھ عمر بھر نباہ کرسکا کہ مالک کو ذائقے اور کھانے کی لذت کا صحیح ذوق اور اصلی قدر تھی۔ آج بھی چین کے شہزے چو آن میں ایک بہت ہی بوڑھا باورچی موجود ہے اگر اس سے کھانا پکوانا ہو تو ایک ہفتہ پہلے باقاعدہ طور پر اسے درخواست کیجیے۔ وہ کھانے کا سامان ایک ہفتے میں نہایت سخت جانچ پڑتال کے بعد جمع کرے گا اور اپنی مرضی کی چیزیں پکا کر کھلائے گا۔

خیر، یہ تو خاص لوگوں کا معاملہ ہے۔ عام لوگ اتنے مہنگے رکابدار اور اعلیٰ پائے کے باورچی نہیں رکھ سکتے۔ ان کے لیے یہ اصول کافی ہے کہ ہر چیز اپنے موسم ہی میں اچھی ہوتی ہے۔ گویا کھانے پینے کی صحیح لذت اٹھانے کے لیے تہذیب کے بجائے فطرت پر بھروسا کرنا چاہیے۔ جو لوگ اپنے لیے سبزیاں خود اگاتے ہیں یا جو لوگ دیہات میں رہتے ہیں انھیں کھانے پینے کے لیے بہترین اور خالص چیزیں ملتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اچھے باورچی ہوں یا نہ ہوں...... اسی وجہ سے کھانے کی کسی چیز پر حکم لگانے سے پہلے اس چیز کو اس ملک یا اس خطے میں جا کر کھانا چاہیے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے لیکن غالباً یہ مغرب میں ممکن نہیں۔ مغرب میں عام عورتیں تازہ چیزیں خریدنا جانتی ہی نہیں۔ شوہر بھی ایسے ہیں کہ کولڈ سٹوریج کے ذریعے سے محفوظ کی ہوئی سبزیوں اور کھانے کی دوسری چیزوں پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے ذائقے اور کھانے کی لذت اور کھانے کی نفاستوں کا ذکر بالکل بیکار ہے۔

پکے ہوئے کھانے کی صحیح صورت کے بارے میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔ پکا ہوا کھانا نرم ہونا چاہیے۔ اس میں لچک اور کرارا پن اور خستگی بھی ہونی چاہیے۔ یہ ساری باتیں اندازے سے تعلق رکھتی ہیں کہ کس چیز کو کتنی آگ پر کتنی دیر پکانا چاہیے۔ چینی ریستورانوں میں بعض کھانے کی چیزیں ایسی ملتی ہیں کہ جو گھر میں پک ہی نہیں سکتیں کیونکہ ان ریستورانوں میں نہایت عمدہ بند چولہے اور تنور ہوتے ہیں۔ رہا کھانے کا مزہ اور اس کی بو باس تو عام طور پر پکائی جانے والی چیزوں کی دو قسمیں ہوا کرتی ہیں۔ بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ اپنے پانی میں پکنی چاہئیں اور ان میں زائد نمک یا اور کوئی چیز نہیں ڈالی جائے اور بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ دوسری کے ساتھ ملا کر ان کا ذائقہ اور لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ قدرت نے ایسی چیزیں پیدا کر رکھی ہیں۔ جن کا آپس میں میل ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کھانے کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا کام صرف یہ ہے کہ دوسری چیز کے ساتھ ملا کر پکائی جائیں تاکہ یہ اسے اپنا ذائقہ اور اپنی مہک بخش دیں۔ اسی طرح کھانے کی بہت سی

چیزیں ایسی بھی ہیں (اور چینی ان کے بڑے شائق ہیں) جن کا اپنا ذائقہ اور مہک کچھ نہیں ہوتی بلکہ یہ دوسری چیزوں کے ذائقے اور مہک کی محتاج ہوتی ہیں۔

چین میں نہایت پر تکلف کھانوں کی تین خصوصیات قرار دی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ کھانے بے رنگ ہوں دوسری یہ کہ ان میں کوئی بو نہ ہو اور تیسری یہ کہ ان میں کوئی مہک نہ ہو۔ اس شق میں شارک مچھلی کے پر، پرندوں کے گھونسلے، اور ''سلور فنگس'' قسم کی چیزیں آتی ہیں۔ انھیں بے انتہا احتیاط سے ایسے سوپ میں پکایا جاتا ہے کہ ان پر بے حد زیادہ لاگت آتی ہے۔ ان میں کوئی بو باس، کوئی رنگ نہیں ہوتا، اس لیے ان کا مزہ نہایت اعلیٰ ہوتا ہے۔

8- مغرب کے کچھ عجیب دستور

مشرقی اور مغربی تہذیب میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ مغرب کے لوگ جب کسی دوسرے سے ملتے ہیں تو اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ سے ملاتے ہیں۔ مشرقی لوگ (چینی اور ہندو خصوصاً) جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اپنے ایک ہاتھ سے دوسرا ہاتھ ملاتے ہیں۔ مغرب میں جتنے فضول رواج ہیں ان سب میں زیادہ فضول رسم یہ مصافحہ کرنے کی ہے میں مغربی آرٹ، مغربی ادب، مغربی عورتوں کی لمبی ریشمی جرابوں، پیرس کی خوشبوؤں اور برطانیہ کے جنگی جہازوں تک کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ترقی کے متوالے مغربی لوگوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے کی یہ وحشیانہ رسم اب تک چھوڑی کیوں نہیں؟ میں جانتا ہوں کہ مغرب میں بھی بہت سے لوگ اس رسم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے وہ بیچارے ہیٹ پہننے اور کالر کا پھندا گلے میں ڈالنے کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں مگر ان کی سنتا کون ہے۔ ان کے سلسلے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ لوگ فضول ہی رائی کا پربت اور سوئی کا بھالا بنا رہے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر خواہ مخواہ وقت کھو رہے ہیں مگر میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں ہمیشہ سے چھوٹی چھوٹی چیزوں سے دلچسپی رہی ہے اور چینی ہونے کی حیثیت سے میں مغربی لوگوں کی بہ نسبت اس مغربی رسم کے خلاف زیادہ شدت سے احتجاج کرتا ہوں کیونکہ میں تو چین کے قدیم رواج کے مطابق لوگوں سے ملتے وقت یا ان سے رخصت ہوتے وقت ان کے بجائے اپنے ہاتھ جوڑ کر ہلانا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

شاید یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ مصافحہ کرنا یورپ کے وحشیانہ دور کی یادگار ہے جو اب تک قائم ہے۔ اسی

طرح کسی کو ہیٹ اتار کر سلام کرنا بھی دور جہالت ہی کی یادگار ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔اصل میں مصافحہ کرنے اور ہٹ اتار کر سلام کرنے کی ابتدایوں ہوئی تھی کہ ازمنہ وسطیٰ میں یورپ میں بڑے بڑے جاگیردار اور امرا ہوتے تھے۔ان میں اکثر کا کام محض غارت گری اور مار دھاڑ تھا۔اس وقت یہ دستور تھا کہ جب دوسرے پر یہ ظاہر کرنا ہو کہ ہماری نیت لڑائی کی نہیں یا یہ کہ ملاقات دوستانہ ہو رہی ہے تو وہ اپنا خود اتار کر دوسرے کو اپنا چہرہ دکھا دیتے تھے یا آہنی دستانہ دائیں ہاتھ سے اتار دیتے تھے آج کل نہ کوئی خود پہنتا ہے، نہ آہنی دستانے پہننے کی کوئی تک ہے لہٰذا ان دونوں کے اتارنے چڑھانے کی حرکتوں کا اعادہ آج کل کے زمانے میں کتنا فضول ہے مگر وحشیانہ رسموں کے نشان صدیوں کے مٹانے سے مٹتے نہیں، قائم ہی رہتے ہیں۔

حفظانِ صحت کے اصول کی رو سے بھی مجھے ہاتھ ملانے کی رسم پر اعتراض ہے۔اس کے علاوہ ہاتھ ملانا، انسانی جسم کے ملاپ کی ایک ایسی قسم ہے جس میں بہت سے درجے ہیں۔میں کہتا ہوں کہ کوئی ذہین طالب علم ''مصافحہ کرنے کی میعاد، اور ہاتھ ملانے کی حرکات کا مطالعہ'' کے عنوان سے ایک بڑا عمدہ مقالہ لکھ سکتا ہے اور اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے پیش کر سکتا ہے۔اس میں وہ یہ بتائے کہ مصافحہ کرنے میں کتنا ہاتھ دبایا جاتا ہے، اس کی میعاد کیا ہوتی ہے، مصافحے کی حرارت کیا ہے، جذباتی ردعمل کیا ہے۔اس کے علاوہ وہ مصافحے سے مصافحہ کرنے والوں کے قد و قامت کے اندازے، کھال کے رنگ، پیشے، سماجی منصب وغیرہ پر بھی بحث کر سکتا ہے۔اگر اس مقالے میں کچھ چارٹ وغیرہ بھی بنا دے اور کچھ اعداد و شمار بھی شامل کر دے تو مجھے یقین ہے کہ اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے میں کوئی دقت نہ ہو گی۔شرط یہ ہے کہ وہ اپنے مقالے کو ذرا پیچیدہ انداز میں لکھے، اسے طویل اور سخت غیر دلچسپ بنا دے تاکہ اسے عالمانہ سمجھا جائے۔

خیر، مصافحے کے بارے میں حفظانِ صحت والے اعتراض کو لیجیے۔شنگھائی میں جتنے غیر ملکی بستے ہیں ان کا قول ہے کہ چین کے تانبے کے سکے جراثیم کے ذخیرے ہیں۔وہ ان سکوں کو چھوتے تک نہیں لیکن یہی لوگ ہر زید، عمر، بکر سے ہاتھ ملانے میں کوئی باک نہیں محسوس کرتے۔یہ رویہ بڑا نامعقول ہے کیونکہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ جس شخص کے ساتھ آپ نے ہاتھ ملایا ہے ممکن ہے اس نے وہی تانبے کے سکے چھو رکھے ہوں جنھیں آپ زہر سمجھتے ہیں۔اس سے بھی ایک بدتر مثال سنیے: کئی بار آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایک شخص جو بظاہر دق کا مریض نظر آتا ہے وہ کھانستے ہوئے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیتا ہے کیونکہ اسے حفظانِ صحت کے اصول کا بڑا

خیال ہوتا ہے۔ مگر اگلے لمحے میں یہی شخص بڑی گرمجوشی سے آپ کے ساتھ وہی ہاتھ ملاتا ہے۔ اسی لیے میں تو عرض کروں گا کہ چین کے رسم ورواج بہت زیادہ سائنٹیفک ہیں کیونکہ ہمارے یہاں ملاقات کے وقت ہر شخص اپنے ہاتھ سے ہاتھ ملاتا ہے، دوسرے سے مصافحہ نہیں کرتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس رسم کی ابتدا کیسے ہوئی لیکن اس میں طبی اعتبار سے اور حفظان صحت کے لحاظ سے جو فوائد ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حفظان صحت کے اعتبار سے مصافحہ کرنے پر ان اعتراضات کے علاوہ مجھے اس پر جمالیاتی اور رومانی نوع کے اعتراض بھی ہیں۔ آپ جب کسی سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں تو پھر آپ کا ہاتھ دوسرے کے رحم وکرم پر ہے کہ وہ اسے جتنا چاہے، دبائے اور جب تک چاہے اسے گرفت میں رکھے۔ واضح رہے کہ ہاتھ جسم کے عمدہ ترین اور حساس ترین اعضا میں سے ہے۔ اس لیے ہاتھوں پر ہر قسم اور ہر نوع کا دباؤ ڈالنا ممکن ہے۔ مثلاً مصافحے کی ایک قسم ہے جسے میں ''وائی، ایم، سی، اے قسم'' کہتا ہوں۔ اس میں دوسرا شخص ایک ہاتھ سے آپ کا شانہ تھپکاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اتنے زور کا مصافحہ کرتا ہے کہ آپ کے جسم کا بند بند اور جوڑ جوڑ ٹوٹنے والا ہو جائے۔ اگر وائی، ایم، سی، اے کا سیکرٹری بیس بال کا کھلاڑی بھی ہو تو سبحان اللہ پھر تو اس سے مصافحہ کرنے والے غریب کو یہ پتا نہیں چلتا کہ مصافحہ کب شروع ہوا اور میرے جوڑ کب سے چٹخنے شروع ہوئے۔ نہ یہ ہی سمجھ میں آتا ہے کہ اس حال میں چیخ مار کر رو پڑیں یا ہنسیں۔ چنانچہ ان کا مصافحہ زبان حال سے کہتا ہے'' دیکھو! اس وقت تم میرے قبضہ قدرت میں ہو، لہٰذا اگر تم وائی، ایم، سی، اے کے اگلے جلسے کا ٹکٹ سیدھے ہاتھوں خرید لو، یا فلاں فلاں کتاب لے کر لو تو میں تمہارا ہاتھ چھوڑوں گا''......ایسی صورت میں، میں میں تو فوراً اپنی جیب سے پیسے نکال لیا کرتا ہوں۔

خیر، اس سے نیچے آئیں تو مختلف قسم کے مصافحوں کے سلسلے میں ہاتھ کا مختلف دباؤ ملتا ہے۔ ایک تو وہ بے پروائی کا مصافحہ ہے جس کا کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا پھر ایک ڈرتا، جھجکتا، معذرت خواہ قسم کا مصافحہ ہوتا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہاتھ ملانے والا آپ سے ڈرتا ہے۔ ان کے علاوہ اونچی سوسائٹی میں پھرنے والی خواتین کا باتکلف مصافحہ ہے جو بڑی مشکل سے اپنی انگلیوں کے پورے آپ کی مٹھی میں دیتی ہیں اور ان کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہاتھ ملانے کے بجائے ان کی انگلیوں کے رنگین ناخن ہی ملاحظہ کریں تو مناسب ہے!......گویا ہاتھ ملانے میں ہر قسم کے انسانی تعلقات کا عکس مل سکتا ہے۔ بعض ناول نویس کہتے ہیں کہ وہ کسی

شخص کے مصافحے کے طریقے سے اس کے کردار کا پورا نقشہ بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ بعض ہاتھوں کا مصافحہ زبردستی کا انداز رکھتا ہے، بعض ہاتھ کچھ ڈرے ڈرے سہمے سہمے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض ہاتھ بددیانت ہوتے ہیں اور بعض ہاتھ کچھ لجلجے سے، گیلے سے ہوتے ہیں جن سے یکا یک نفرت پیدا ہوتی ہے مگر میری دلی خواہش یہ ہے کہ ان مصافحوں، ہاتھوں کے دباؤ اور اس دباؤ سے ان کے جذبات کی گرمی یا ان کی سرد مہری کا اندازہ کرنے کی مجھے زحمت نہ اٹھانی پڑے اور نہ ان لوگوں کے کردار کے اندازے لگانے کی تکلیف کرنی پڑے۔

مصافحے سے کہیں زیادہ نامعقول بات ہیٹ اتار کر سلام کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں مجلسی آداب کے بڑے فضول قاعدوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مثلاً گرجے میں عبادت کے دوران میں خواتین کو اپنا ہیٹ نہیں اتارنا چاہیے۔ یا تیسرے پہر چائے کے وقت کمرے کے اندر بھی عورتوں کو ہیٹ سر پر رکھے رہنا چاہیے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ فضول رسم سینٹ پال کے اس حکم کی احمقانہ پیروی کی بدولت چل نکلی کہ عورتوں کو گرجوں میں ننگے سر نہیں بیٹھنا چاہیے اور مردوں کو اپنا سر ننگا رکھنا چاہیے۔ اس حکم کی بنیاد ہی ایشیا کے اس فلسفے پر ہے کہ عورت اور مرد کا درجہ برابر نہیں حالانکہ مغرب ایک عرصے سے اس فلسفے اور اصول کو جھٹلا چکا ہے۔ مردوں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر لفٹ میں خواتین بھی ہوں تو سر سے ٹوپی اتار لیں۔ اب بتائیے کہ اس بے معنی رسم کا کوئی جواز ہو سکتا ہے؟ اول تو یہ کہ لفٹ بھی برآمدے کا ایسا حصہ ہے جو اوپر نیچے آ جا سکتا ہے یعنی ہر لحاظ سے گزرگاہ ہے۔ اب اگر برآمدے میں خواتین کی موجودگی میں ٹوپی اتارنا مرد کے لیے فرض نہیں تو پھر لفٹ میں کیوں پابندی ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ لفٹ آخر سواری کا ایک ذریعہ ہے جیسے موٹر کار ہے۔ موٹر کار میں آپ اگر خواتین کی موجودگی میں ٹوپی پہنے رہتے ہیں تو پھر لفٹ میں ٹوپی سر پر رکھے رہنا کیوں ممنوع ہے؟

الغرض یہ ہماری دنیا بھی عجیب ہے مگر اس پر مجھے تعجب نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنے اردگرد انسان کی حماقتوں سے ہر قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ ان میں آج کل کے بین الاقوامی تعلقات جیسی احمقانہ چیز بھی ہے اور موجودہ طرز تعلیم ایسے نامعقول نظام بھی...... انسان اتنا ذہین سہی کہ اس نے ریڈیو اور وائرلیس، ٹیلی فون اور ایٹم ایجاد کر لیے ہیں کہ مگر انسان میں اتنی عقل نہیں کہ لڑائیوں کی روک تھام کر سکے اور نہ یہ عقل انسان کو کبھی آئے گی۔ اسی لیے معمولی چیزوں کے سلسلے میں انسان کی حماقتوں کو دیکھتا ہوں تو ان سے لطف اٹھاتا ہوں۔ اور بس۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

9- مغربی لباس

مغربی لباس آج کل ترکی، مصر، جاپان اور چین کے علاوہ ہندو پاکستان تک میں بے حد مقبول لباس ہے۔ ساری دنیا کے سفارت خانوں کا رسمی اور سرکاری لباس بھی یہی ہے پھر بھی میں اپنے چینی لباس میں مگن ہوں۔ میرے کئی ایک اچھے دوستوں نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں غیر ملکی لباس کے بجائے چینی لباس کیوں پہنتا ہوں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ لوگ میرے مزاج سے اتنے ناواقف ہیں لیکن میرے دوست کہلاتے ہیں۔ کل کو یہ ستم ظریف مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ میں دو ٹانگوں پر کھڑا کیوں ہوتا ہوں۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ دو ٹانگوں پر چلنے اور اپنا قومی لباس پہننے میں گہرا تعلق ہے مگر کیا یہ ضروری ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ''انسانی'' لباس پہننے کے لیے وجہ بھی بتائی جائے؟ جو شخص گھر کے اندر یا باہر پاجامہ، سلیپر پہنے پھرتا ہو اسے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ وہ کیوں گلا گھونٹنے والے کالروں اور چست واسکٹوں، پیٹی، بنیان، موزوں وغیرہ کا زندانی نہیں؟...... مغربی لباس کہیں محض اسے لیے معزز تو نہیں کہ اسے پہننے والی گوری قوموں کے پاس اعلیٰ درجے کے جنگی جہاز اور مشینیں ہیں؟ اصل یہ ہے کہ مغربی لباس کی برتری اسی کمزور بنیاد پر قائم ہے اور اس لباس کا جواز نہ تو جمالیاتی لحاظ سے کوئی ہے نہ اسے اخلاقی اصولوں یا حفظان صحت کے اصولوں یا کفایت کے اصولوں کی روشنی میں اچھا لباس کہا جا سکتا ہے۔ اس کی برتری کوری سیاسی برتری ہے اور بس۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ میرا یہ رویہ مخلصانہ ہے یا محض میں بن رہا ہوں؟ میرا خیال ہے اس شبہے کی کوئی گنجائش نہیں میرے اس رویے کی حمایت وہ تمام اشخاص کریں گے جو میرے ہم عصر ہیں اور اصابت رائے رکھتے ہیں۔ چین میں چینی شرفا کا لباس چینی لباس ہے۔ اس کے علاوہ تمام اہل علم، مفکر اور وہ لوگ جو کسی حیثیت کے مالک ہیں چین میں یہی لباس پہنتے ہیں۔ ان لوگوں نے یا تو کبھی مغربی لباس پہنا یہ نہیں یا اگر پہنا ہے تو صرف اتنی مدت کہ وہ سیاسی، مالی یا معاشرتی لحاظ سے کچھ بن جائیں۔ یہ مقام حاصل کرنے کے بعد وہ بڑی تیزی سے اپنے قومی لباس کی طرف پلٹ آئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مرحلے پر پہنچ کر انھیں اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو چکتا ہے، اپنے رتبے کا یقین ہو جاتا ہے اور اب اپنی غلط انگریزی یا ادنیٰ صلاحیت کو چھپانے کے لیے انھیں غیر ملکی لباس کی آڑ کی حاجت نہیں رہتی۔ شنگھائی میں اغوا کرنے والے جو گروہ مشہور ہیں وہ کسی غیر ملکی لباس میں ملبوس چینی کو کبھی اغوا کر کے نہیں لے جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسامیاں اس قابل

نہیں ہوتیں کہ ان کی آزادی کی قیمت کے طور پر اغوا کرنے والے ڈاکو روپیہ کما سکیں......آج چین میں غیر ملکی لباس میں کون لوگ نظر آتے ہیں، عام طور پر کالج کے طلبہ، کوئی سو روپے پانے والے کلرک لوگ، کچھ سیاسی قسم کے خواہ مخواہ لوگ جو ہر وقت کسی نہ کسی نوکری کی فکر میں رہتے ہیں......اسی طرح سیاسی پارٹیوں کے ورکر لوگ، نکھٹو اور نکمے لوگ اور کچھ بے دماغ......بس غیر ملکی لباس انہی تک محدود ہے۔ ان کے علاوہ، ہنری پو یوئی صاحب ہیں جو چین کے تخت کے حقدار بنے پھرتے ہیں اور ان کے ذوق اور عقل کی مثال یہ ہے کہ جناب نے غیر ملکی نام، غیر ملکی لباس اور ایک کالا چشمہ تک ''اختیار'' کر رکھا ہے۔ یہ حال اور یہ حلیہ ہی چین کے تخت پر بیٹھنے کے تمام امکانات ختم کرنے کے لیے کافی ہے، چاہے ان کے پیچھے دنیا جہان کی طاقتیں ہوں......آپ چینیوں کو کسی بھی جھوٹ سے دھوکا دے سکتے ہیں مگر انھیں اس بات پر کبھی راضی نہیں کر سکتے کہ غیر ملکی نام اور لباس والا کوئی شخص ان کا حکمران بھی ہو سکتا ہے۔

چینی لباس اور مغربی لباس کی حکمت میں بڑا فرق ہے۔ مغربی لباس انسانی جسم عیاں اور ظاہر کرنے کے لیے ہے اور چینی لباس انسانی جسم کو چھپانے کے لیے مگر انسانی جسم چونکہ بنیادی طور پر بندر کے جسم کی طرح ہے لہٰذا یہ جتنا کم عیاں ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ مغربی لباس صرف اسی دنیا میں قابل برداشت ہے جس کی آنکھیں حسن کے لیے اندھی ہو چکی ہیں۔ یہ بات بالکل عام ہو چکی ہے کہ خوبصورت اور متناسب انسانی جسم بہت نایاب ہے۔ کسی کو اس میں شک ہو تو سمندر کے ساحل پر جا کر نہانے والوں کے جسم ذرا دیکھے لیکن مغربی لباس اس طرز سے بنایا جاتا ہے کہ ہر شخص دیکھتے ہی بتا دے کہ آپ کی کمر 32 انچ ہے یا 38 انچ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر آپ کی کمر 32 انچ ہے تو آپ اس کا اشتہار کیوں دیتے پھریں؟ یا اگر آپ کی کمر جتنی ہونی چاہیے اس سے موٹی ہے تو بھی دنیا کو یہ کیوں معلوم ہو؟ یہ آپ کا بالکل ذاتی معاملہ کیوں نہیں ہے؟

اسی بنا پر میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ بیس اور چالیس برس کی عمر کے درمیان کی مناسب جسم والی عورتوں کے لیے مغربی لباس موزوں ہے۔ یہ لباس ان بچوں کے لیے بھی اچھا ہے جن کے جسم ہماری غیر مہذب زندگی کے تابع نہ ہوئے ہوں مگر مغربی لباس کا یہ مطالبہ کہ ہر مرد، ہر عورت دنیا کی آنکھوں کے سامنے اپنے جسم کی ساخت اور اس کے خطوط عیاں کر دے، بالکل غیر مناسب ہے۔ ایک نوجوان خاتون شام کے مغربی لباس میں رونق محفل نظر آتی ہے۔ وہ اس لباس میں اتنی اچھی لگتی ہے کہ مشرقی لباس تیار کرنے والوں کے خواب و خیال

میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی مگر ذرا چالیس برس کی ایک عام عورت کا تصور کیجیے جو ضرورت سے زیادہ کھاتی ہے اور ضرورت سے زیادہ سوتی ہے۔ یہ بے چاری شام کے لباس میں اگر کسی تھیٹر میں نظر آئے تو اتنی بھدی لگتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ یہ کریہہ نظارہ مغرب کی خاص ایجاد ہے۔ اس کے برعکس چینی لباس بھی بڑے چھوٹے، حسین اور کم رو کا فرق بالکل مٹا دیتا ہے۔ اس لیے چینی لباس، مغربی لباس کی بہ نسبت کہیں جمہوری لباس ہے۔

یہ تو ہوا جمالیاتی پہلو...... اب ذرا حفظان صحت اور عام معقولیت کے تقاضوں کی طرف آئیے۔ کوئی ذی ہوش انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریزی کالر جو کارڈینل رشلو اور سر والٹر ریلے کے وقتوں کی یادگار ہے جسم کی صحت کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر مغرب میں ہر صاحب فکر نے کالر کے خلاف ضرور آواز اٹھائی ہے۔ مغرب کے نسائی لباس نے گردن کے سلسلے میں کافی حد تک آرائش اور آرام کی وہ رعایتیں حاصل کر لی ہیں جو پہلے صنفِ نازک کو حاصل نہ تھیں مگر مرد کی گردن مغرب کی تعلیم یافتہ پبلک کے نزدیک اب بھی اتنی بد ہیئت اور کریہہ سمجھی جاتی ہے کہ اسے مجلسی زندگی کی نظروں سے کمر تک چھپایا جاتا ہے۔ کالر کی شیطانی بندش کی بدولت جسم کو گرمی میں مناسب ہوا نہیں لگ سکتی، سردی میں اس کی بدولت جسم کو سردی سے مناسب طور پر بچایا نہیں جا سکتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی وقت بھی اس کی بدولت انسان مناسب طور پر سوچ بچار نہیں کر سکتا۔

کالر کے نیچے آئیے تو مغربی لباس، معقولیت کے خلاف ایک مسلسل اور متواتر ظلم نظر آتا ہے۔ یہ ایک نہایت شرمناک زیادتی کا طویل افسانہ ہے۔ تیز فہم اہلِ مغرب بجلی کی نت نئی ایجادات اور نت نئی مشینیں بنانے میں بڑے ماہر ہیں مگر ان میں اتنی عقل نہیں کہ ان کے لباس کی بدولت ان کے جسم کا صرف ایک حصہ یعنی سر آزاد ہے اور باقی مقید...... زیادہ تفصیلات کا فائدہ نہیں مگر ملاحظہ ہو کہ سب سے نیچے تو نہایت چست بنیان اور جانگیہ پہنے جاتے ہیں جو جسم تک ہوا اور روشنی کا گزر نہیں ہونے دیتے۔ پھر چست صدری ہے اور نہایت سخت قسم کی پیٹی یا گیلس ہیں۔ یہ چیزیں نہ جسم کو جھکنے دیتی ہیں اور نہ غذائیت حاصل کرنے کی مختلف حالتوں میں کسی قسم کے سکڑنے یا پھیلنے کی اجازت دیتی ہیں۔ ان سب میں سے حد سے زیادہ نامعقول چیز واسکٹ ہے۔ جن لوگوں نے انسان کے ننگے جسم کی قدرتی حالتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر انسانی جسم بالکل تیر کی طرح سیدھا رہے تو پشت اور سامنے کے خطوط برابر ہوتے ہیں ورنہ کبھی اور کسی حالت میں یہ خطوط برابر نہیں ہوئے۔ جس کسی نے بھی کبھی کلف لگی قمیض پہنی ہو اسے تجربے نے بتا رکھا ہے کہ جب وہ ذرا آگے کو

جھکے گا تو اس کی قمیض فوراً آگے کو نکل آئے گی۔ مگر واسکٹ اس مفروضے پر بنائی گئی ہے کہ انسانی جسم کے عقبی اور سامنے کے خطوط ہمیشہ برابر رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی وجہ سے جسم کو ہمیشہ تیر کی طرح سیدھا رکھنا پڑتا ہے۔ چونکہ عملی طور پر اس معیار پر کوئی پورا نہیں اترتا۔ اس لیے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ واسکٹ کے کونے یا آگے کو نکلے رہتے ہیں یا اس جگہ گہری تہیں سی بن جاتی ہیں جو پیٹ اور کمر کو ہمیشہ دباتی رہتی ہیں۔ اگر کوئی بے چارہ بھاری بھر کم جسم رکھتا ہو تو واسکٹ ایک ابھری ہوئی قوس بن جاتی ہے اور اس قوس کے اگلے حصے جسم پر نہیں ہوا میں معلق ہوتے ہیں اور اس جگہ سے جہاں پیٹ کا گھیر کم ہونا شروع ہو پیٹی اور پتلون کی مصیبت شروع ہوتی ہے۔ اس نقشے کو ذرا ذہن میں رکھیے اور انصاف سے کہیے کہ انسانی دماغ نے اس سے بڑھ کوئی بے ہودہ اور مضحکہ خیز ایجاد کر رکھی ہے؟ تو پھر تعجب کی کیا بات ہے کہ مغرب ہی میں الف ننگے رہنے کی تحریک نے اتنی مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ تحریک انسانی جسم کی اسی مضحکہ خیز پابندی کے خلاف ایک ردعمل، ایک احتجاج ہے۔

اب ذرا پیٹی کے بارے میں دیکھیے۔ اگر انسانیت اب بھی چار ہاتھ پاؤں پر چلنے کے مرحلے پر ہوتی تو پیٹی کا پھر بھی کوئی جواز تھا۔ اس صورت میں یہ پیٹی اسی طرح انسانی جسم پر فٹ کی جاسکتی جس طرح گھوڑے کے زین کا تسمہ باندھا جاتا ہے۔ مگر انسان اگرچہ چار پاؤں پر چلنا چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو چکا ہے پھر بھی اس کے لیے پیٹی اس مفروضے پر تیار کی گئی ہے گویا ابھی تک وہ چوپایہ ہے۔ چوپایہ ہونے کی حالت میں انسانی جسم کا سارا بوجھ ریڑھ کی ہڈی سے وابستہ رہتا تھا۔ انسان کے سیدھا کھڑا ہو جانے کی بدولت جو تباہ کن نتیجے ہوئے وہ یہ ہیں کہ انسانی مائیں ہمیشہ اسقاط اور بچہ ضائع ہونے کے خطرے سے دوچار رہتی ہیں۔ حالانکہ جانور اس خطرے سے بالکل مبرا ہیں۔ دوسرا تباہ کن نتیجہ یہ ہے کہ مرد کے لباس کی پیٹی ہمیشہ نیچے کو کھسکتی رہتی ہے کبھی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کو اپنی جگہ پر رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ پیٹی کو خوب کس کر باندھا جائے مگر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنتوں کی قدرتی حرکت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ مغرب کے لوگ جب غیر ذاتی کاموں میں زیادہ ترقی کر لیں گے تو ایک نہ ایک دن وہ اپنے ذاتی کاموں میں بھی زیادہ وقت اور توجہ صرف کر سکیں گے۔ اس طرح لباس کے معاملے میں وہ زیادہ سمجھ بوجھ سے کام لے سکیں گے۔ لباس میں اپنی اس تبدیلی سے ڈرتے ہیں مگر مغربی عورتوں نے ایک مدت سے اپنے لباس میں سادگی اور معقولیت پیدا کر رکھی ہے۔ خیر آج سے دس بیس برس بعد ایک بات چھوڑیئے،

مجھے یقین ہے کہ آنے والی صدیوں میں مرد بھی اپنے لیے ایسا لباس ضرور بنالیں گے جو اان کے دو پایہ ہونے کے ساتھ پوری مطابقت رکھے گا، جس طرح عورتوں نے اپنے لیے ایسا لباس تیار کرلیا ہے اور رفتہ رفتہ پیٹی اور گیلس قسم کی تمام تکلیف دہ چیزیں ختم ہو جائیں گی اور مردوں کا لباس ایسا ہوگا کہ وہ ان کے شانوں سے نہایت موزونی اور حسن کے ساتھ نیچے کو لٹکے گا اور ان کے جسم پر پورا آئے گا۔ اب کی طرح پیڈ دے کرفٹ کیے ہوئے بے معنی شانے نہیں ہوں گے۔ کوٹ کے ہر رنگ ہر وضع کے فضول کالر نہیں ہوں گے اور موجودہ ڈیزائن کی جگہ لباس بہت زیادہ آرام دہ ہوگا۔ اس وقت عورتوں اور مردوں کے لباس میں بڑا فرق یہ ہوگا کہ مرد پتلون پہنیں گے اور عورتیں سکرٹ...... جہاں تک جسم کے بالائی حصے کا تعلق ہے عورتوں اور مردوں کے لباس میں ایک جیسی آسائش اور ایک جیسے آرام کا خیال رکھا جائے گا۔ مردوں کی گردنیں بھی کالروں وغیرہ سے ویسی ہی آزاد ہوں گی جس طرح عورتوں کی گردنیں آج ہیں۔ واسکٹ غائب ہو جائے گی اور مردانہ کوٹ بس اسی قدر استعمال ہوگا جس قدر آج کل کی عورتیں اپنا کوٹ استعمال کرتی ہیں۔ گویا، مرد بھی زیادہ تر کوٹ کے بغیر رہیں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل عورتیں زیادہ وقت کوٹ کے بغیر بسر کرتی ہیں۔

لیکن ان تبدیلیوں کے لیے ایک چیز ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ قمیض کے بارے میں موجودہ تصور کو یکسر بدلنا ہوگا۔ اب قمیض ایک ایسا کپڑا ہے جسے دوسرے موٹے کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے۔ نئے تصور کے مطابق قمیض ایک ایسی چیز ہے جو نیچے کے بجائے دوسرے کپڑوں کے اوپر پہنی جائے گی۔ یہ گہرے رنگ کے کپڑے کی ہوگی۔ یہ ہلکی سلک سے لے کر موٹے اونی کپڑے تک ہر قسم کے کپڑے سے بنائی جائے گی۔ موسم کے مطابق ہوگی اور اس طرح سی جائے گی کہ پہنی ہوئی اچھی معلوم ہو۔ اس قمیض کے اوپر کوئی چاہے تو رسماً نہیں، موسم کے تقاضے کی وجہ سے کوٹ بھی پہن لے...... ورنہ مجلسی زندگی میں یہی قمیض تسلیم شدہ اور موزوں لباس مانا جائے گا۔ ان پیٹیوں اور گیلس قسم کی مصیبتوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایک قسم کی ملی جلی قمیض اور پتلون بنائی جائے گی۔ آج کل عورتیں جس طرح سر پر سے کھسکا کر اپنا فراک وغیرہ پہن لیتی ہیں اسی طرح یہ ملی جلی اور پتلون بھی پہنی جائے گی۔ اس میں کمر کے گرد کچھ بٹن، کچھ حقیقی کچھ غیر حقیقی فٹنگ کی چیزیں ہوں گی تاکہ وہاں سے ذرا اسے فٹ کیا جاسکے اور اپنے جسم کی مناسب نمائش کی جاسکے۔

آج کل مردوں کے لباس کی جو وضع چل رہی ہے اس میں بھی پیٹی اور گیلس ختم کرنے کی خاطر کچھ

اصلاح ہوسکتی ہے۔ بنیادی اصول یہ ہے: سارا وزن شانوں سے متعلق ہو۔ شانوں سے یہ وزن ہر طرف یکساں طور پر بٹا رہے۔ اس وزن کو انسانی شکم کی عمودی دیوار سے محض چپکانے، رگڑنے اور دبانے کے بل پر ہرگز نہ کسا جائے۔ مرد کی کمر سے بوتل کے منہ کا جو کا کام لیا جاتا ہے اس سے اپنے نجات دلوائی جائے۔ نیچے پہننے کے کپڑے ایسے بنائے جائیں جو ڈھیلے ڈھالے اور آرام دہ ہوں اگر واسکٹ سے نجات حاصل کر کے ہم ترقی کی اس راہ پر گامزن ہو جائیں تو یہ ہوسکتا ہے کہ جس طرح بچوں کے نیکر وغیرہ قمیض کے ساتھ بٹن لگا کر پہنائے جاتے ہیں اسی طرح مردوں کی پتلونیں بھی ان کی قمیضوں کے ساتھ بٹن سے وابستہ ہوں۔ پھر وقت آنے پر قمیض اندر پہننے کے بجائے ہر چیز کے اوپر پہننے والا کپڑا بن جائے گی۔ اور اس کی تیاری میں آج کی بہ نسبت کہیں بہتر کپڑا استعمال ہونے لگے گا جو غالباً اسی رنگ اور اسی معیار کا ہو گا جس کی پتلون بنے گی، یا کم سے کم پتلون سے ہم آہنگ ہو گا اگر واسکٹ کو برقرار رکھنا منظور ہے تو اصلاح کی گنجائش یوں نکلتی ہے کہ واسکٹ اور پتلون ملی ہوئی ہوں۔ ان کی طرز وہی ہو جواب ہے مگر دونوں ایک ٹکڑے کی بنی ہوں اور واسکٹ کی پشت پر پورے کپڑے کے بجائے محض دو چوڑی بندیاں ہوں اور بس۔ اس کے علاوہ پیٹی اور گیلس سے نجات پانے کی فی الحال ایک صورت اور ہے کہ واسکٹ کے نیچے چھ چھوٹے چھوٹے تکمے لگے ہوں۔ چار سامنے اور دو پیچھے اور ان تکموں کو پتلون کے اندر کی طرف لگے ہوئے بٹنوں کے ساتھ لگا لیا جائے۔ اس طرح واسکٹ الگ کی الگ نظر آئے گی کیونکہ یہ پتلون سے باہر ہو گی۔ ایک دفعہ یہ جدتیں اور تبدیلیاں شروع ہو جائیں اور مردوں کو یہ خیال پیدا ہو جائے کہ ان کے لباس کی موجودہ وضع کائنات کی طرح اٹل اور باقی و جاوید نہیں تو پھر رفتہ رفتہ اس واسکٹ سے یوں پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے کہ اوپر نیچے ایک ہی ملا جلا کپڑا پتلون اور واسکٹ دونوں کا کام دے جو وضع میں آج کل کے اوور آل سے بہتر ہو مگر اسی اصول پر بنایا جائے۔

مختلف قسم کی آب و ہوا کے ساتھ مطابقت کے لحاظ سے بھی چینی لباس سب سے معقول لباس ہے۔ مغربی لباس کا یہ حال ہے کہ چاہے گرمی سو ڈگری سے زیادہ ہو یا سردی صفر سے بھی نیچے ہو، پھر بھی مغربی لوگوں کو بنیان جانگیے کے اوپر ایک قمیض، ایک واسکٹ اور ایک کوٹ ضرور پہننا پڑتا ہے۔ مگر چینی لباس میں موقع محل کے لحاظ سے کمی بیٹی کی بہت گنجائش ہے۔ چین میں یہ کہانی عام ہے کہ کوئی چینی ماں اپنے بچے کو بہت چاہتی تھی، چنانچہ جب وہ ایک بار چھینکتا تھا تو وہ اسے ایک چغہ نما کرتا پہنا دیتی تھی۔ دو چار چھینکنے پر دو کرتے اور تین بار

چھینگ مارنے پر تین کرتے پہنا دیتی تھی......کوئی مغربی ماں ایسا نہیں کرسکتی بلکہ تیسری چھینگ آنے پر مغربی ماؤں کے تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔بس زیادہ سے زیادہ ان کی دوڑ ڈاکٹروں تک ہے۔اور میرا تو اعتقاد ہوتا جارہا ہے کہ ساری چینی قوم کو تپ دق اور نمونیا جیسی بیماریوں سے فنا ہونے سے جو چیز بچاتی ہے وہ ان کا استر دیا ہوا چغہ ہے۔

10- مکان اور اس کی آرائش

لفظ ''مکان'' میں رہنے کے وہ تمام سامان یا مکان کا پورا گردوپیش شامل ہے۔مکان چنتے وقت یہ بات خاصی اہم ہوتی ہے کہ جب اس گھر کے اندر سے ہم باہر دیکھیں گے تو کن چیزوں پر نظر پڑے گی۔گویا، مکان کا ماحول اور گردوپیش بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔میں نے شنگھائی کے کئی امرا کو دیکھا ہے کہ اپنے مکان کے گرد پھیلے ہوئے چھوٹے سے پلاٹ پر ناز کرتے ہیں حالانکہ اس پلاٹ میں مچھلیاں پالنے کا دس فٹ کا ایک تالاب ہوگا اور ایک چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی ہوگی۔جس پر ایک چیونٹی کو چڑھنے میں بھی تین منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگ سکتا۔یہ لوگ ان بے شمار غریب لوگوں کا تصور نہیں کرسکتے جو کسی پہاڑی ڈھلان پر ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتے ہیں مگر اس کٹیا سے سارا کوہستانی نظارہ، دریا اور جھیل کے مناظر یوں نظر آتے ہیں گویا وہ ان کا اپنا پائیں باغ ہیں ......ان دو قسم کے مکانوں میں مقابلے کی کوئی گنجائش نہیں۔ایسے بھی مکان ہوتے ہیں جو بے انتہا خوبصورت منظر میں واقع ہوتے ہیں۔ایسی جگہ اپنے گھر کے اردگرد باڑ لگا کر سبزے کا چھوٹا سا قطعہ مخصوص کر لینے میں کوئی خوبی نہیں کیونکہ جو شخص ایسے منظر میں زندگی بسر کرتا ہے وہ اس سارے نظارے کا مالک ہے۔اس کا جہاں جی چاہے جائے۔وہ اس نظارے کی مادی چیزوں کے علاوہ ان بادلوں کا بھی مالک ہے جو پہاڑیوں کی چوٹیوں کو چھوتے رہتے ہیں،ان پرندوں کا بھی مالک ہے جو ان فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں،ان نغموں کا بھی مالک ہے جو گرتے ہوئے جھرنوں اور اڑتے طائروں کی منقاروں سے پیدا ہوتے ہیں......صحیح معنی میں یہی شخص امیر ہے۔شہروں میں رہنے والے کروڑ پتی اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔آسمان میں تیرنے والے بادل شہر والوں کو بھی نظر آتے ہیں مگر وہ انھیں دیکھتے کب ہیں اور جب کبھی ان کی نظر ان بادلوں پر پڑتی بھی ہے تو ان بادلوں کے پیچھے نیلی دھند میں لپٹی ہوئی پہاڑیاں نہیں ہوتیں۔جس کے بغیر بادلوں کی طرف دیکھنے والوں کا مزہ ہی کیا ہے؟

اس لیے مکان اور خانہ باغ کے بارے میں چینی تصور یہ ہے کہ مکان بذاتہ اردگرد کے منظر کی ایک جزوی تفصیل ہے اور بس۔ اس کی مثال اس نگینے کی ہے جو کسی زیور میں جڑا ہو اور اس زیور کی مجموعی خوبی اور حسن کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اسی لیے مکان کے سلسلے میں تمام وہ چیزیں جو باہر سے مصنوعی اور بناوٹی دکھائی دیں انھیں بڑی احتیاط سے چھپانا چاہیے۔ مثلاً دیواروں کے مستطیل نما خطوط، درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں سے چھپنے چاہئیں۔ مربع قسم کا مکان جو دیکھنے میں بہت بڑی پکی اینٹ کی طرح نظر آئے کسی کارخانے کے اندر لیے یہ اینٹ نما مکان چننا اپنے آپ پر ایسی زیادتی ہے جس کا کوئی جواز نہیں...... چینیوں کے نزدیک رہنے کے مکان کا مثالی نمونہ یہ ہے جو ایک ادیب نے بڑی چابکدستی سے بیان کیا ہے:

''باہر کے پھاٹک سے داخل ہوں تو ایک فٹ پاتھ ہو۔ مگر یہ سیدھا نہ ہو بلکہ لازمی طور پر پیچ وخم کھاتا ہوا ہو۔ اس کے موڑ پر باہر کا پردہ ہو جو سائز میں چھوٹا ہونا چاہیے...... اس پردے کے پیچھے ایک کھلا ہوا چبوترہ ہو۔ جو بالکل ہموار اور اس کے حاشیوں پر تازہ پھولوں کے پودے ہوں۔ ان پھولوں کی باڑ کے ساتھ ساتھ نیچی دیوار ہو۔ دیوار کے قریب دیوار کا ایک درخت ہو مگر یہ درخت بہت پرانا اور کہن سال ہو۔ اس درخت کی جڑ کے پاس عجیب بے ڈھنگی وضع کی چٹانیں رکھی جائیں۔ اس سے آگے بانسوں کے چھدرے درخت لگے ہوں اور ان سے آگے ایک الگ تھلگ گھر ہو۔ گھر کے پہلو میں ایک سڑک ہونی چاہیے جو پھٹ کر ایک طرف کو نکل جائے اور وہ جگہ جہاں کئی سڑکیں آ کر ملتی ہوں وہاں ایک پل ہونا چاہیے جس پر سے گزرنا کافی ہیجان خیز ہو۔ پل کے اس پار اونچے پیڑ ہوں اور ان پیڑوں کے سائے میں گھاس اگی ہو جو بالکل سبز ہو۔ اس گھاس کے قطعے سے اوپر بلندی پر پانی کی ایک نالی ہو جو بالکل پتلی ہونی چاہیے۔ یہ پانی کی نالی، اوپر بلندی پر ایک چشمے پر ختم ہو جو شور مچاتا ہوا بہتا ہو۔ اس چشمے سے اوپر ایک پہاڑی ہو۔ پہاڑی کے دامن میں ایک مربع ہال ہو اور اس ہال کے ایک کونے کے قریب سبزیوں کی پھلواڑی ہو جو رقبے میں کافی بڑی ہو۔ اس پھلواڑی میں ایک بگلا ہو جو ناچتا پھرے اور اپنی قیں قیں سے یہ بتائے کہ گھر میں اب کوئی مہمان آیا ہے۔ یہ مہمان کوئی بازاری آدمی نہ ہو۔ مہمان آئے تو اسے شراب پیش

کی جائے اور وہ شراب سے انکار نہ کرے۔ پینے کی محفل کے بعد مدہوشی چھا جائے اور اس مدہوشی میں مہمان یہ نہ کہے کہ مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ۔''

گھر کا سارا حسن اس کی انفرادیت میں پنہاں ہے۔ لی لی وتگ نے اپنی کتاب ''جینے کا فن'' میں مکانات اور ان کے اندرونی حصوں، کمروں اور آرائش وغیرہ کے بارے میں کئی باب لکھے ہیں۔ گھر کے سلسلے میں وہ اپنی بات یہیں سے شروع کرتا ہے کہ مکان ایسا ہو جس میں اجنبیت محسوس نہ ہو۔ بلکہ اپنائیت کا احساس ہو اور اس میں انفرادیت ہونی ضروری ہے۔ میرے نزدیک انفرادیت سے کہیں اہم اپنایت کی فضا ہے۔ کیونکہ مکان چاہے کتنا بڑا اور شاندار ہو لیکن گھر بھر میں صرف ایک کمرہ ایسا ہوا کرتا ہے جس میں آدمی واقعی رہتا ہے۔ اور لازمی طور پر یہ کمرہ سادہ اور مختصر ہوتا ہے۔ اس میں چیزیں بے ترتیبی سے بکھری پڑی رہتی ہیں۔ مگر یہ اپنائیت کی فضا سے معمور ہوتا ہے۔ لی کہتا ہے:

''انسان جس طرح کپڑوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح گھر کے بغیر بھی نہیں رہ سکتا۔ کپڑے گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم چاہئیں۔ یہ اصول مکان پر بھی صادق آتا ہے۔ ایک بہت بڑے گھر میں رہنا واقعی شان کی بات ہوگی۔ مگر ایسا صرف گرمیوں کے لیے مناسب ہوتا ہے، سرما کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ کسی بہت بڑے سرکاری دفتر میں جا کر کپکپی آ جاتی ہے کیونکہ اس کی وسعت ہی ایسی ہوتی ہے۔ اس کی مثال سمور کے ایسے کوٹ کی ہے جو بہت بڑا ہو اور جس کو کمر کے گرد کس کر باندھا جا سکے۔ اس کے برعکس ایک غریب آدمی کے مکان کو لیجیے جس کی دیواریں نیچی ہوتی ہیں اور جس میں پاؤں پھیلانے تک وسعت نہیں ہوتی مگر اس میں کفایت کا پہلو ہے اور یہ مکان اپنے مالک کے لیے موزوں ہے، ہاں مہمانوں کے لیے موزوں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی غریب اہل علم کے جھونپڑے میں جاتے ہیں تو ہمیں ممس کا احساس ہوتا ہے۔ میری آرزو ہے کہ حاکموں کے مکانات اتنے اونچے اور اتنے بڑے نہ بنائے جائیں کیونکہ مکان اور مکین کی ہم آہنگی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ایک تصویر میں ان کی ہم آہنگی کا خیال رکھا جاتا ہے جو مصور قدرتی مناظر کی تصویریں بناتے ہیں۔ انھوں نے تصویر کشی میں تناسب کا

ایک فارمولا بنا رکھا ہے۔ جو کچھ اس طرح ہے کہ ''ایک تصویر میں'' اگر دس فٹ اونچے پہاڑ ہوں تو ایک فٹ اونچے درخت ہونے چاہئیں۔ اور ایک انچ اونچے گھوڑے اور ماش کے دانے کے برابر اونچے آدمی ہوں۔'' اس لیے یہ بالکل غیر متناسب اور غیر موزوں ہوگا کہ دس فٹ کی پہاڑی پر دو یا تین فٹ اونچے درخت بنائے جائیں۔ چنانچہ اگر سرکاری افسروں کا قد نو دس فٹ ہو اور وہ بے شک بیس یا تیس فٹ اونچے مکانوں میں رہیں۔ موجودہ حالات میں تو یہ ہوتا ہے کہ عمارت جتنی اونچی ہو آدمی اتنا ہی کوتاہ اور حقیر نظر آتا ہے۔ اور مکان میں جتنی وسعت ہو مکین اتنا ہی دبلا اور مریل معلوم ہوتا ہے۔ کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ ان لوگوں کے جسم کچھ موٹے کر دیے جائیں اور ان کے مکان کچھ چھوٹے بنا دیے جائیں۔

میں نے بڑے بڑے اعلیٰ عہدہ داروں یا ان کے عزیزوں کو دیکھا ہے کہ ایک باغ بنانے پر ہزاروں روپے برباد کر دیتے ہیں اور باغ کی بنیاد ڈالنے سے پہلے ہی انجینئر کو ہدایت دیتے ہیں کہ ''مہتابی کے سلسلے میں فلاں فلاں مہتابی کا ڈیزائن لے لو۔ رہی تالاب کے پاس والی بارہ دری تو اس کے لیے فلاں فلاں بارہ دری کا نقشہ ٹھیک رہے گا۔'' جب یہ سب کچھ مکمل ہو جاتا ہے تو اس کا مالک لوگوں کو بڑے فخر کے انداز میں یہ بتاتا ہے کہ میرے باغ اور بنگلے کا سارا نقشہ عین مین فلاں مشہور باغ کا چربہ ہے اور اس میں ذرا سا بھی اختلاف یا فرق نہیں...... اس بات میں جو سوقیانہ پن اور رکاکت ہے، خدا اس سے محفوظ رکھے۔

اصل میں، تعمیر میں جن چیزوں سے لازمی طور پر بچنا چاہیے وہ یہی فضول شان وشکوہ اور عیش پرستی کا انداز اور حد سے بڑھی ہوئی لاگت ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سادگی کی خوبیوں کو اپنانا عام لوگوں کا ہی نہیں بلکہ شہزادوں اور صاحب اقتدار حاکموں کا بھی فرض ہے۔ رہنے کے مکان کے لیے اہم چیز شان وشکوہ نہیں بلکہ نفاست ہے، لمبی چوڑی زیبائش نہیں بلکہ وحدت اور حسن ہے۔ لوگ اپنے امیرانہ ٹھاٹ کی نمائش اس لیے نہیں کرتے کہ یہ نمائش

میں پسند ہوتی ہے بلکہ اس کی نمائش کی وجہ محض یہ ہوتی ہے کہ ان میں جدت خیال اور اپج موجود نہیں ہوتی۔ وہ کوئی نئی بات سوچ نہیں سکتے، کوئی نئی چیز اختراع نہیں کر سکتے۔ ان کی پرواز خیال اسی نمائش اور نمود تک محدود ہے اور اسی پر انھیں اکتفا کرنی پڑتی ہے۔ ذرا دو آدمیوں سے کہیے کہ وہ دو نئے لباس پہنیں۔ ایک لباس سادہ مگر عمدہ اور اپنی وضع میں منفرد ہو۔ دوسرا بہت قیمتی، نمائشی مگر عامیانہ ہو پھر دیکھیے کہ لوگوں کی نظریں اس عامیانہ لباس کی بہ نسبت اس سادہ مگر منفرد لباس کی طرف زیادہ اٹھی ہیں یا نہیں؟...... ریشم اور کمخاب اور آب رواں ایسے قیمتی کپڑے کون نہیں جانتا اور کس نے انھیں نہیں دیکھا؟ مگر ایک سادہ سا لباس جو وضع میں نفیس اور منفرد ہو ہمیشہ تماشائیوں کی توجہ کا مرکز بن کر رہے گا کیونکہ انھوں نے اسے یوں پہنا ہوا کبھی نہیں دیکھا۔''

لی، لی ونگ نے اپنی تصنیف میں مکانوں کی طرز اور ان کی اندرونی آرائش پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں اس نے کھڑکیوں، جالیوں کے پردوں، لیمپ، میز، کرسی، نادر اشیا، صندلی اور صندوقوں اور مسہریوں تک پر لکھا ہے۔ وہ خود بے حد منفرد اور طرار ذہن کا مالک تھا اور قدرت نے اسے ایجاد کا ملکہ بھی عطا کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ نئی بات ضرور بتائی ہے۔ باقی رہیں اس کی ایجادات تو وہ آج چینی روایات کا مستقل حصہ بن چکی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا عطیہ خط لکھنے کے کاغذ ہیں جو اس کی زندگی میں ایک خاص نام کے ''خط لکھنے والے کاغذوں'' کی حیثیت سے فروخت ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کھڑکیوں کی ایک کتاب وضع اور کمروں کی تقسیم کرنے والے پردوں کے خاص ڈیزائن ہیں۔ اس کی کتاب ''جینے کا فن'' آج کوئی ایسی معروف کتاب تو نہیں۔ مگر اسے مصوری کی ایسی ابتدائی کتاب کے سلسلے میں آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ جو مبتدیوں کے لیے بہت مفید ہے۔ اسی طرح وہ اپنے ''دس طربیہ'' ڈراموں کے لیے بھی مشہور ہے۔ کیونکہ وہ باکمال شخص بیک وقت ڈراما نگار، موسیقار، زندگی کا فنکار، لباس کا ڈیزائنر، افزائش حسن کی ترکیبوں کا ماہر اور موجد تھا۔

مسہری اور بستر کے بارے میں لی کے خیالات بالکل نئے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب کبھی میں کسی نئے گھر میں منتقل ہوتا ہوں تو سب سے پہلے بستر اور مسہری کی طرف توجہ دیتا ہوں۔ چین میں مسہری پردوں سے

گھری ہوئی، فریم میں جکڑی ہوئی ایسی چیز ہے جو بڑے سے صندوق یا چھوٹے سے کمرے سے مشابہ ہے۔ اس کے ساتھ ڈنڈے اور شیلف اور دراز بھی ہوتے ہیں جو کتابیں جوتے، چائے دانی اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں رکھنے کے کام آتے ہیں۔ لی نے اس میں یہ اختراع کی کہ اس مسہری میں پھول رکھنے کا ایک سٹینڈ ہونا چاہیے، چنانچہ اس نے پتلی لکڑی کا ایک چھوٹا سا شیلف بنایا جو ایک فٹ چوڑا مگر صرف دو تین انچ گہرا تھا اور اسے مسہری کے منقش پردے کے ساتھ لگا دیا۔ وہ کہتا ہے کہ اس چوبی گلدان کو اس طرح کھڑے ہوئے نفیس ریشم سے منڈھ دینا چاہیے کہ یہ ساری چیز ایک اڑتی ہوئی بدلی معلوم ہو...... اسی چوبی بڑھاؤ پر وہ پھولوں کے موسم میں پھول رکھتا تھا اور جب ان کا موسم نہ ہوتو مختلف قسم کی اعلیٰ چینی خوشبوئیں اور بخورات جلاتا تھا۔ وہ خود کہتا ہے۔ ''میرا جسم اب عام جسم نہیں رہا بلکہ تتلی بن گیا ہے جو پھولوں میں اڑتی پھرتی ہے، وہیں کھاتی ہے اور وہیں سوتی ہے (چین میں امرا کا دستور ہے کہ اگر محبوبہ کے ساتھ رتجگے کا جشن منا رہے ہوں تو خادمائیں انھیں اسی مسہری پر شراب اور کھانا پیش کرتی ہیں) اور اب میں عام آدمی نہیں رہا بلکہ پری بن گیا ہوں جو جنت میں چلتی پھرتی اور آرام کرتی ہے۔ چنانچہ ایک نیم بیداری کی حالت میں مجھ پر شفتالو کے شگوفوں کی خوشبو چھا گئی اور میرے گلے، میرے دانتوں اور میرے رخساروں پر یہ نازک باس جم کر رہ گئی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ مہک باہر سے نہیں آتی بلکہ خود میرے سینے سے پھوٹ رہی ہے۔ میرا جسم اتنا لطیف اور ہلکا ہو گیا کہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے اب میں اس فانی دنیا میں زندہ نہیں ہوں۔ بیدار ہونے پر یہ ماجرا میں نے اپنی بیوی سے بیان کیا۔ میں نے کہا ''دیکھو ہمیں ایسی مسرت محسوس کرنے کا کیا حق ہے؟ کیا اس طرح ہمیں مسرت کا جو حصہ دیا گیا ہے، ہم اسے کم تو نہیں کر رہے؟ (1) میری بیوی نے جواب دیا: شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ہمیشہ غریب اور محتاج رہتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو اس میں کوئی جھوٹ نہیں''......

چینی روایات میں لی کا سب سے نمایاں حصہ کھڑکیوں کی اختراعات ہیں۔ اس نے (جھیلوں میں چلنے والے ہاؤس بوٹ کے لیے) ''پنکھے جیسی کھڑکیاں'' ''منظریہ کھڑکیاں'' اور ''خوبانی کے پھولوں جیسے دریچے''

1- چین میں یہ عام خیال ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے، اسے قدرت کی طرف سے 'مقدر' یا خوشی کا ایک خاص حصہ ملتا ہے جو کسی صورت میں بدل نہیں سکتا۔ اس لیے جو شخص ایک چیز سے جی بھر کر لطف اٹھائے یا ایک معاملے میں زیادہ خوش نصیب ہو تو دوسرے معاملوں میں اس کی قسمت میں ''کمی'' کر دی جاتی ہے یا اس کی زندگی تھوڑی ہو جاتی ہے۔ (حاشیہ از مصنف)

وضع کیے۔ ہاؤس بوٹ کے دونوں طرف پنکھے جیسی کھڑکیاں رکھنے کا خیال چین کے اس قدیم دستور سے وابستہ ہے کہ پنکھیا پر تصویریں بنائی جاتی ہیں اور پھر ان مصور پنکھیوں کو جمع کر کے البم میں رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ لی کا خیال تھا کہ کشتی کی چوبی دیوار میں جب پنکھے جیسی کھڑکی نکالی جائے گی تو اس کشتی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ باہر کا نظارہ اور کناروں پر چلنے والے لوگ کشتی کے اندر کے جشن مے یا دعوت چائے کا نظارہ اس طرح کریں گے کہ گویا وہ کسی چینی پنکھیا پر بنائی ہوئی کوئی تصویر دیکھ رہے ہیں۔ اس طرح یہ پنکھے جیسی کھڑکی اصل منظر کے لیے ایک قسم کے فریم کا کام دے گی۔ کیونکہ دریچے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے باہر کے نظارے پر نظر ڈالی جائے۔ اسی لیے یہ محاورہ ہے کہ ''آنکھیں روح کے دریچے ہیں۔'' چنانچہ کھڑکی اس طرح ڈیزائن کرنی چاہیے کہ باہر کا منظر عمدہ سے عمدہ زاویے سے نظر آئے۔ اسی لیے لی نے کہا ہے کہ آپ باہر کے منظر کا بہترین ٹکڑا ''ادھار'' لے کر اسے دریچے کے ذریعے سے گھر کے اندر متعارف کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

''آدمی جب ایسی کشتی میں بیٹھا ہو تو کشتی کی دیوار میں پنکھے جیسی دریچے میں سے جھیل کے پانیوں کی چمک اور پہاڑیوں کا رنگ، مندر، بادل اور دھند، بانسوں کے جھنڈ، جھیل کے کناروں کے پیڑ، کناروں پر کام کرتے ہوئے لکڑ ہارے، گڈریے، پرانے شرابی اور سیر کرتی ہوئی خواتین اس طرح نظر آئیں گی جس طرح کوئی تصویر ہوتی ہے۔ یہ تصویر بالکل قدرتی تصویر ہوگی۔ جو دریچے کے فریم میں جڑی ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ تصویر زندہ اور باحرکت ہوگی جو ہر پَن بدلتی رہے گی۔ کشتی کے چلنے سے تصویر بدل جائے گی۔ ہر لحظہ ہمیں چپوؤں کی نئی حرکت اور لمبے پتواروں کا نیا منظر نظر آئے گا اور جب کشتی لنگر ڈال کر کھڑی ہو گی تو ہوا کے چلنے اور پانی کی نرم لہروں سے اس کی ہیئت اور ترکیب لحہ بہ لحہ بدلتی رہے گی ...... اس طرح ہم ایک دن میں اس پنکھے جیسے دریچے کی بدولت پہاڑیوں اور پانی کی ہزاروں خوبصورت تصویروں سے جی کو بہلا سکیں گے۔

میں نے پہاڑیوں کا منظر دیکھنے کے لیے بھی ایک دریچہ بنایا ہے۔ جسے میں نے ''منظریہ دریچے'' کا نام دیا ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں ''غیر ارادی تصویر'' کہہ سکتے ہیں ...... میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے یہ دریچہ کیسے بنایا ...... میرا کمرہ سفید جھاگ والا کمرہ (مراد

شراب پینے سے ہے) ہے۔ اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا ٹیلا ہے جو کوئی دس فٹ اونچا اور سات فٹ چوڑا ہوگا۔ یہ (مصنوعی) ٹیلا چھوٹے پیمانے پر ایک پہاڑی گاؤں کی پوری تصویر پیش کرتا ہے۔ اس میں لال چٹانیں اور نیلے پانی کی ننھی سی جھیل ہے۔ گھنا جنگل اور اونچے بانسوں کے جھنڈ ہیں...... گیت گاتے ہوئے پرندے اور گرتی ہوئی آبشاریں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پھونس کے جھونپڑے اور لکڑی کے پل ہیں...... اصل میں یہ سارا منظر اس طرح وجود میں آیا کہ مٹی سے مجسمہ بنانے والے ایک شخص نے میرا مجسمہ تیار کیا۔ اس مجسمے کے چہرے پر بڑا عجیب تاثر تھا۔ میرے نام لی ونگ کا مطلب ہے ایک ایسا بوڑھا آدمی جس نے سر پر بانس کے تنکوں کا بڑا ہیٹ پہن رکھا ہو۔ اس لیے مجسمے کو بھی ایک ماہی گیر کی شکل دی گئی جس کے ہاتھ میں مچھلیاں پکڑنے کی بنسی، ڈور تھی اور جو ایک چٹان پر بیٹھا ہوا تھا...... اس مجسمے کو دیکھ کر ہم نے سوچا کہ جب ایک چٹان موجود ہے تو پھر سامنے پانی بھی ہونا چاہیے اور پانی ہے تو پھر پہاڑی بھی ہونی چاہیے۔ پھر چونکہ پہاڑی اور پانی دونوں موجود ہیں تو اس بانس کے تنکوں کا ہیٹ پہنے ہوئے بوڑھے شخص کے لیے ایک پہاڑی کٹیا بھی ہونی چاہیے تا کہ وہ (روایتی طور پر) اپنے بڑھاپے کا وقت اس گوشے میں گزارے اور مچھلیاں پکڑنے میں جی بہلائے۔ چنانچہ اس طرح بتدریج یہ سارا منظر ہم نے تخلیق کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ مصنوعی پہاڑی، مٹی کے اس مجسمے کی وجہ سے بنائی گئی اور اس کے بنانے میں یہ خیال نہیں تھا کہ دریچے سے اس کا منظر نظر آئے گا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ پہاڑی اور اس کا سارا منظر اگر چہ بہت ہی مختصر اور ننھا منا ہے، لیکن جس کائنات کی طرف ان سے دھیان جاتا ہے وہ بے انتہا وسعت رکھتی ہے۔ اس سے میرے ذہن میں بودھوں کا یہ مشہور مقولہ آیا کہ رائی کا دانہ اور ہمالیہ پہاڑ، دونوں ایک جتنے بڑے ہیں چنانچہ میں دن بھر اپنی اسی ننھی سی پہاڑی کو دیکھتا رہا اور کھڑکی بند نہ کر سکا۔ ایک دن دھیان کی ایک لہر اٹھی اور میں نے اپنے آپ سے کہا ''اس پہاڑی کو ایک تصویر میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور اس تصویر کو دریچے میں بند کیا جا سکتا ہے۔ اس تصویر کو ''فریم میں جڑنے'' کے لیے صرف اتنی لاگت

آئے گی جتنے کی میں روز شراب پیتا ہوں۔ چنانچہ میں نے ایک ملازم لڑکے سے کہا کہ وہ موٹے کاغذ کے لمبے اور چوڑے کئی ٹکڑے کاٹے اور ان ٹکڑوں کو دریچے کے اوپر نیچے اور اطراف پر اسی طرح چپکا دے۔ جس طرح کسی سچ مچ کی تصویر کا فریم لگایا جاتا ہے چنانچہ یہ فریم مکمل ہو گیا اور عام طور پر فریم کے اندر اصلی تصویر کے لیے جتنی جگہ خالی ہوتی ہے وہ خالی رکھی گئی۔ اس خالی جگہ کو مصنوعی پہاڑی کے منظر نے پر کر دیا۔ اب بیٹھ کر دیکھا تو میرا دریچہ دریچہ نہیں رہا بلکہ اب ایک تصویر بن گیا تھا۔ وہ پہاڑی اب سچ مچ کی پہاڑی نہیں رہی تھی بلکہ تصویر میں بنائی ہوئی ایک پہاڑی بن چکی تھی اس پر میں قہقہہ مار کر ہنسا۔ بیوی بچوں نے میرے ہنسنے کی آواز سنی تو آ کر میرے قہقہے میں شامل ہو گئے۔ یہ ہے "غیر ارادی تصویر" اور "منظریہ دریچے" کے وجود کی داستان۔"

کرسیوں اور میزوں وغیرہ کے سلسلے میں بھی لی نے کئی نئی باتیں اختراع کیں۔ اس نے ایسی آرام کرسی ایجاد کی جو سردیوں میں گرم رکھی جا سکتی تھی۔ کمرے اگر سردیوں میں مناسب طور پر گرم نہ رکھے جا سکیں تو یہ ایجاد بڑی مفید اور قابل عمل ہے۔ اس کی شکل ایک لمبی چوبی مسہری کی سی ہے۔ جو ایک چوبی تخت میں بنی ہے۔ یہ تخت دو تین فٹ گہرا ہے اور اس کی اطراف پر لکڑی کے تختے لگے ہیں جو نیچی میز کے برابر اونچے ہیں۔ اس مسہری کے سامنے کی طرف دو چوبی دروازے بنے ہیں۔ اس تخت پر چڑھ کر دروازے بند کر دیجیے۔ یہ دروازے اطراف کے تختوں کے ساتھ مل کر میز کے بالائی تختے کے لیے عمدہ سہارا بن جاتے ہیں جیسے مرضی کے مطابق رکھا یا ہٹایا جا سکتا ہے۔ گویا بیٹھنے والا اس میز کے پیچھے بیٹھتا ہے۔ تخت میں ایک دراز بنا ہوتا ہے جس میں گرم راکھ اور خوب جلے ہوئے کوئلے دہکا کر ڈالے جاتے ہیں۔ مسہری ایسی ہے کہ بیٹھ کر چاہیں تو کام کریں اور تھک جائیں تو لیٹ جائیں۔ لی کا دعویٰ تھا کہ سارا دن اس طرح سکھ اور آرام سے کام کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ چار پانچ بڑے کوئلے چاہئیں۔ اس کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ اگر اس ساری مسہری جیسی کرسی کے ساتھ دو مضبوط بانس باندھ دیے جائیں۔ تو یہ قاعدہ تام جھام بن جاتی ہے اور سفر میں بھی کام آ سکتی ہے۔ اس میں پاؤں ٹھنڈے نہیں ہوں گے اور سفر کے دوران میں کھانے پینے کے وقت بھی سردی سے بچاؤ ہو سکتا ہے۔ اس نے گرمی کے موسم کے لیے بھی ایک کرسی بنانے کا خیال کیا تھا۔ جو ایک غسل کے ٹب میں ملتی جلتی ہو اور اس میں

پکی مٹی کا ایک ٹب لگا ہو جس میں ٹھنڈا پانی بھر دیا جائے جو نشست کے عقب تک آئے اور اسے ٹھنڈا رکھے۔

مغرب کے لوگوں نے ہر قسم کی مسہریاں، صوفے اور بال ترشوانے کے لیے بیٹھنے کی کرسیاں ایجاد کی ہیں۔ ان میں گھومنے والی مسہریاں، کرسیاں اور صوفے ہیں۔ تہ ہو جانے والے اور جسم کے مطابق نیچے اوپر کر کے آرام دہ حالت میں بٹھانے کے لیے کرسیاں اور صوفے بھی ہیں۔ ایسی مسہریاں بھی ہیں جن کو تہ کر کے کچھ کا کچھ بنایا جا سکتا ہے۔ مگر مغرب والوں کو نہ تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والی میزوں کی ایجاد کا خیال آیا ہے نہ ایسے سٹینڈ بنانے سوجھے ہیں جن پر نادرات رکھے جائیں اور جنھیں حسب ضرورت الگ الگ کیا جا سکے۔ چین میں یہ چیزیں ایک مدت سے رائج ہیں اور ان کی بناوٹ میں بڑی بڑی چابکدستی اور مہارت فن نظر آتی ہے ...... جس میز کے حصے الگ کیے جا سکتے ہیں۔ اسے ''ین چی'' کہا جاتا ہے۔ اس کا اصول اس چینی کھیل سے لیا گیا ہے جو مغربی بچوں کے کھیل، لکڑی کے مربع ٹکڑوں کے کھیل سے ملتا جلتا ہے۔ اس میں لکڑی کے مربع ٹکڑے ہوتے ہیں۔ جن پر عجیب و غریب جانوروں، برتنوں فرنیچر وغیرہ کی شکلیں بنی ہوتی ہیں اور ان ٹکڑوں کو باہم مختلف طریقوں سے ملانے سے کئی قسم کی شکلیں بنائی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ ''ین پی'' قسم کے میز سے جس میں چھ حصے ہوں، ان چھ حصوں کے ملانے سے کئی شکلوں کا ایک میز بھی بنایا جا سکتا ہے اور انھیں چھ حصوں سے مختلف شکلوں کی کی میز بھی بنائی جا سکتی ہیں جو مربع مستطیل یا ٹی (T) کی شکل کی ہوں یا ان کے اوپر کے تختے زاویوں پر رکھے ہوں۔ ان چھ حصوں سے تقریباً چالیس قسم کی میزیں جوڑی جا سکتی ہیں۔

اس قسم کے میزوں کی ایک اور قسم ''تائے چی'' ہے۔ ''تتلی کے مشابہ میز'' اس کے ٹکڑے مثلث اور عمودی ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان ٹکڑوں کو باہم جوڑنے سے جس جس قسم کی میزیں بن سکتی ہیں وہ شکل میں بہت زیادہ متنوع ہوتی ہیں۔ ین چی قسم کی میزیں عام طور پر کھانا کھانے یا تاش کھیلنے کے لیے مختلف سائز کی میزوں کے طور پر ایجاد کی گئی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی ترکیب اور ساخت میں یہ لحاظ رکھا جاتا تھا کہ عین درمیان میں شمعدان کے لیے جگہ خالی چھوڑی جائے مگر تائے پی قسم کی میزیں نہ صرف کھانا کھانے کی میزوں اور تاش کی میزوں کا کام دیتی ہیں بلکہ ان کے ٹکڑوں کو مختلف طریقوں پر جوڑنے سے پھول اور نوادر رکھنے کے سٹینڈ بھی بن جاتے ہیں۔ گویا اس کی ساخت میں زیادہ چیزیں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ تتلی نما میز تیرہ حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کو باہم جوڑنے سے مربع شکل کی میزیں مستطیل میز اور ہشت پہلو میز جن میں مختلف قسم اور تعداد کے سوراخ بھی ہوں، بنائی جا سکتی ہیں۔ ان ٹکڑوں کو باہم جوڑنے کی گنجائش اتنی ہے اور ان سے ایسی ایسی عجیب

چیزیں بنی ہیں کہ انسان دیکھا کرے۔ سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ گھر کی مالکن ذوق سے کام لے کر ان ٹکڑوں کی باہمی ترتیب سے کیا کچھ بناتی ہے۔

کیا مشرق، کیا مغرب، ہر جگہ گھر کی مالکہ کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کمروں کے اندر، آرائش اور آسائش کی چیزوں کو نت نئے انداز سے ترتیب دیتی رہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ بالاقسم کی میزیں اس کے لیے بے انتہا تنوع کا سامان مہیا کرسکتی ہیں...... ایسی میزوں کے ٹکڑوں کو جوڑ کر جو شکلیں بنتی ہیں اور وہ بالکل جدید مذاق کے مطابق ہوتی ہیں کیونکہ جدید فرنیچر میں بھی خم و پیچ کو چھوڑ کر سادگی اور خطوط کے سیدھے پن پر زور دیا جاتا ہے اور یہی خصوصیت چینی فرنیچر کی ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ سادگی بھی ملحوظ رہتی ہے اور اس میں بے شمار تنوع بھی پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اپنے فرنیچر کی نئی ترتیب کے لیے سیدھا سادہ سا نسخہ یہ ہے کہ جب آپ کوئی گول یا مربع میز بنوانے لگیں تو یہ دو ٹکڑوں پر مشتمل ہو مثلاً گول میز کے دونوں حصے نصف دائرے کی شکل کے ہوں اور مربع میز دو مثلثوں پر پر مشتمل ہو۔ یہ مثلثیں اپنے قاعدے پر مل کر ایک مربع بنائیں۔ جب یہ گول یا مربع میزیں تاش کھیلنے کے لیے درکار نہ ہوں تو ان کے دونوں ٹکڑے الگ الگ کر لیے جائیں اور انھیں کمرے کے کونوں میں اس طرح رکھ دیا جائے کہ مثلث کا بڑا ضلع یا نیم دائرے کا قطر دیوار کے ساتھ ہو۔ اب ان میزوں پر گلدان یا کتابیں یا نادر چیزیں رکھی جاسکتی ہیں۔ ایسی میزیں ضرورت کے مطابق چھوٹی یا بڑی بنائی جاسکتی ہیں۔ چائے کی میز اس طرح بنائی جاسکتی ہیں کہ وہ شکل میں دو ملحق مربعوں کی طرح نظر آئیں جو ایک کونے پر آپس میں ملتے ہوں۔ یا وہ انگریزی حرف ٹی (T) یا یو (U) یا ایس (S) کی شکل کے ہوں۔ اگر ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک چھوٹی سی محفل (U) کی شکل کی میز یا (S) کی شکل کی میز کے گرد کھانے کے لیے بیٹھی ہو تو بڑی عمدہ نظر آئے گی۔

ایسا بک کیس جس کے حصے الگ الگ کیے جاسکیں، اس کا ایک نہایت عمدہ نمونہ چانگ شو میں ملتا ہے۔ ویسے مغرب میں بھی ایسے بک کیس ہوتے ہیں جن کے ٹکڑے الگ الگ ہوں مگر اس چینی بک کیس کا کمال یہ ہے کہ اس کے ٹکڑے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ جب الگ الگ کیے جائیں تو ایک دوسرے کے اندر رکھے جائیں اور سارے بک کیس...... کا حجم ایک بڑے سوٹ کیس سے زیادہ نہیں بڑھتا۔ یہ قدیم چینی بک کیس ہے تاکہ اس کے ٹکڑے جب الگ کیے جائیں تو ان حصوں سے دو تین چھوٹے بک کیسے بن جائیں جو 12، 18 یا 24 انچ لمبے ہوں اور جنھیں بستر یا صوفوں کے سرہانے رکھ دیا جائے۔ پھر ان کی جگہ اس بڑے بک کیس کی

ضرورت نہیں رہے گی جو آج کل ہمیں ایسی جگہوں میں لامحالہ ہمیشہ نظر آتا ہے۔

اب کمرے کی اندرونی آرائش کے بارے میں عرض کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں چینی لوگوں کا خیال یہ ہے کہ سادگی اور گنجائش کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک عمدہ کمرے میں ہمیشہ فرنیچر کی چند چیزیں ہوں گی جو عام پر مہاگنی کی لکڑی کی ہوں گی۔ ان کا پالش نہایت عمدہ ہوگا ان کے خطوط سادہ ہوں گے اور سروں پر تھوڑا سا خم ہو گا۔ مہاگنی کے اس فرنیچر کو ہمیشہ ہاتھ سے پالش کیا جاتا ہے۔ پالش کے اس فرق کے مطابق فرنیچر کی قیمتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے کیونکہ ہاتھ کے پالش پر بڑی محنت ہوتی ہے۔ خیر، کمرے میں مہاگنی کی ایک لمبی میز جس میں دراز نہ ہوں، ایک طرف رکھی جاتی ہے۔ کمرے کے دوسرے کونے میں مہاگنی کے بنے ہوئے دو اور ایک سٹینڈ ہوں جن پر گلدان یا کچھ نادر چیزیں رکھی ہوں گی۔ وہ ایک سٹول بھی ہوں گے جو درختوں کی مڑی تڑی جڑوں جیسے پایوں پر کھڑے ہوں گے۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی الماری ہوگی جس میں کتابیں یا نوادر ہوں گے۔ اس الماری کے اندر کے تختے مختلف سائز کے ہوں گے جن سے ایک عجیب قسم کا جدید تاثر پیدا ہوگا۔ دیواروں پر ایک یا دو قطعے ہوں گے جو یا تو خوش خطی کے کمالات کا نمونہ ہوں گے یا ایسی تصویر ہوگی جس میں رنگ کم اور خیالی جگہ زیادہ ہوگی۔ اس تصویر کی طرح کمرہ بھی "خالی خالی اور زندہ ہوگا...... اسی لیے، چینی گھروں کی امتیازی خصوصیت پتھر کے فرش کا صحن ہے جو اپنے انداز میں ہسپانوی خانقاہوں سے ملتا جلتا ہے۔ یہی صحن سکون، خاموشی اور طمانیت کا مظہر ہوتا ہے۔"



دسواں باب

فطرت کے مزے

1- جنت گم گشتہ

ہماری اس زمین پر مخلوقات کا کوئی شمار نہیں مگر عجیب بات ہے کہ سارا عالم نباتات، فطرت کے مظاہرے کے بارے میں کوئی مخصوص رویہ نہیں رکھتا۔ عملی طور پر حیوان بھی قدرت کے بارے میں کسی ''رویے'' پر عامل نہیں۔ بس ایک انسان ایسی مخلوق ہے جسے اپنی ذات کا بھی شعور ہے اور جو اپنے ماحول کے بارے میں بھی باخبر ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کی ذہانت کائنات کے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتی ہے، کائنات کے چھپے بھیدوں کا کھوج لگاتی ہے اور اس کائنات کا مدعا اور مقصد دریافت کرتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات کے بارے میں ہمیں ایک تو سائنسی رویے اور دوسرے اخلاقی رویے سے سابقہ پڑتا ہے۔ سائنس کا آدمی، اس سرزمین کی اندرونی تہ اور بیرونی تہ کی کیمیائی ساخت اور ترکیب پر غور کرتا ہے، اس کائنات کے گرد جو فضا ہے اس کی موٹائی اور پھیلاؤ کا پتا لگاتا ہے، اس فضا کی بالائی تہوں پر جو کائناتی شعاعوں کی چھوٹ پڑتی ہے ان کی مقدار اور ان کی ماہیت کی تحقیق کرتا ہے، اس زمین کی پہاڑیوں اور چٹانوں کے اجزا کا پتا چلاتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ زندگی کن قوانین کی عام طور پر پابندی کر رہی ہے...... یہ سائنسی تحقیق اور دلچسپی کائنات کے بارے میں اخلاقی رویے سے تعلق ضرور رکھتی ہے لیکن اپنی جگہ، یہ صرف، معلوم کرنے اور تحقیق کرنے کی خالص امنگ کا نام ہے...... اس کے برعکس کائنات کے بارے میں اخلاقی رویہ بڑی مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ کبھی یہ فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کا نام ہے، کبھی فطرت کی تسخیر کرنے اور اپنا محکوم بنانے کی ایک شکل ہے۔ کبھی فطرت پر قابو رکھنے اور اس سے مفید کام لینے پر مشتمل ہے، اور کبھی محض فطرت اور گرد و پیش سے ایک متکبرانہ تحقیر ہے اور بس۔ اپنی دنیا سے یہ نخوت پسندانہ تحقیر، تہذیب اور مذہب کی ایک عجیب سی پیداوار ہے۔ س کا سرچشمہ اور منبع یہ کہانی ہے کہ ہم اپنی جنت کو کھو کر اس دنیا میں رہنے پر مجبور کیے گئے اور اس کہانی کا منبع

مذہبی روایات ہیں جو اس کہانی کو آج بھی سچا ثابت کر رہی ہیں۔

عجیب بات ہے کہ آج تک کسی نے اس گم شدہ بہشت کی کہانی کی سچائی پر اعتراض نہیں کیا۔ آخر وہ ''جنت عدن'' کتنی خوبصورت تھی؟ اور پھر ہماری یہ موجودہ دنیا کس حد تک بدصورت ہے؟ کیا آدم وحوا کی اس اولیں لغزش کے بعد زمین پر پھولوں نے کھلنا چھوڑ دیا ہے؟ کیا اللہ نے ایک انسان کے گناہ کی پاداش میں سیب کے درخت پر اپنی لعنت مسلط کر دی ہے؟ کیا یہ درخت اب پھلتا پھولتا نہیں؟ کیا اس کے شگوفوں کے رنگ اب برے اور بے نور ہیں؟ کیا زمین پر اب بلبل اور قمریاں اور گانے والے پرندے نغمہ سرا نہیں رہے؟ کیا اب پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے محروم ہیں اور جھیلوں میں ان کا سایہ نہیں پڑتا؟ کیا آج بھی غروب آفتاب پر شفق نہیں پھولتی؟ آسمانوں پر دھنک نہیں ہوتی، پہاڑی گاؤں پر نیلی دھند نہیں ہوتی، آبشاریں اور جھرنے گرتے نہیں، چشمے گنگناتے نہیں اور درختوں کا سایہ ٹھنڈا نہیں ہوتا؟...... پھر یہ کہانی کس کی اختراع ہے کہ ''جنت'' تو ہم سے چھن گئی اور اب ہم ایک بدہیئت دنیا کے باسی ہیں؟...... اصل یہ ہے کہ ہم خدا کی نہایت ناشکر گذار اور بگڑی ہوئی مخلوق ہیں۔

اس بگڑے بچے کے بارے میں ایک مثالیہ حکایت لکھنی لازمی ہوگئی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی دنیا میں رہتا تھا جس کا نام ہم ابھی نہیں بتائیں گے وہ خدا کے پاس آیا اور شکایت کی یہ دنیا اس کے رہنے کے قابل نہیں۔ اس نے خدا سے کہا: ''مجھے ایسی جنت چاہیے جس کے دروازے موتیوں کے ہوں۔ خدا نے آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ''کیا تمہارا دل بہلانے کو یہ کھلونا کافی نہیں......؟'' انسان نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر خدا نے اسے دور، نیلی پہاڑیاں دکھائیں اور پوچھا ''کیا ان کے خطوط دلآویز نہیں۔'' انسان نے کہا ''یہ عام اور اور معمولی چیزیں ہیں'' اس پر خدا نے اسے پھولوں کی پنکھڑیاں دکھائیں اور کہا ''تم ان مخملی پنکھڑیوں کو چھو کر دیکھو اور بتاؤ، کیا ان کے رنگ بے مثل نہیں؟'' انسان نے جواب دیا ''جی نہیں۔'' خدا نے اپنے بیکراں صبر سے کام لیتے ہوئے انسان کو اپنی آبی کائنات کا جائزہ دکھایا اور اس جگہ اس نے انسان کو جزیرہ ہوائی کی مچھلیوں کے گہرے خوبصورت رنگ اور ان کی عجیب وغریب شکلیں بھی دکھائیں ...... انسان نے کہا ''یہ سب بیکار ہے، مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں'' ...... پھر خدا انسان کو ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے لے گیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کو چلنے کا حکم دیا اور انسان سے پوچھا ''کیا تمھیں اس کا مزہ

نہیں آتا......؟''انسان نے جواب دیا۔''مجھ پران چیزوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔''اس کے بعد خدا اس انسان کو ایک پہاڑی جھیل پر لے گیا اس نے اس انسان کو جھیل کے پانی کی دمک دکھائی دیودار کے جنگل میں سے گزرتی ہوئی سنسناتی ہواؤں کا نغمہ سنوایا، چٹانوں کا سکون اور جھیل میں ان کا اور کئی دوسری چیزوں کا شاندار عکس دکھایا مگر انسان نے کہا''ان باتوں سے میرے دل میں کوئی گرم جوشی پیدا نہیں ہوئی۔''اس پر خدا نے سوچا کہ میری یہ مخلوق حلیم الطبع نہیں ہے اس لیے اسے زیادہ سنسنی خیز نظارے چاہئیں۔خدا اسے راکی پہاڑوں کی چوٹی اور اتھاہ غاروں کے دہانوں پر لے گیا۔اسے ریت کے بیکراں ٹیلے دکھائے، جلتے ریگستانوں میں جھلسی ہوئی نباتات کے نظارے کرائے، ہمالیہ کی لافانی برف اور دریائے یانگسی کے دہانے کی چٹانیں دکھائیں۔زرد پہاڑوں کی سنگین چوٹیاں اور نیاگرا آبشار کے خوفناک پانیوں کا نظارہ کرایا، اور پھر پوچھا''کیا میں نے اس سرزمین کو تمہاری آنکھوں، تمہارے کانوں اور تمہارے پیٹ کے لیے ایک خوبصورت ترین جگہ بنانے کے لیے ہر ممکن نعمت نہیں بخشی؟''مگر انسان نے پھر بھی شور مچایا۔''مجھے تو موتیوں کے دروازوں والی جنت چاہیے اور بس...... یہ سرزمین میرے لیے ٹھیک جگہ نہیں اور نہ یہ میرے لائق ہے۔''خدا نے اس پر جلال سے کہا ''کیوں اور ناشکرے اور گستاخ چوہے، میری یہ دنیا تیرے لیے اچھی جگہ نہیں؟ تو پھر تجھے دوزخ میں بھیجتا ہوں۔جہاں تم کبھی آسمان پر تیرتے ہوئے بادل، شگوفوں سے لدے ہوئے درخت، گاتے ہوئے جھرنے اور آبشار نہ دیکھ پاؤ گے، نہ ان کے نغمے سنو گے اور ہمیشہ اسی دوزخ میں رہو گے؟......چنانچہ خدا نے اس انسان کو شہر کے ایک تنگ کمرے میں رہنے کے لیے بھیج دیا......اس شخص کا نام''عیسائی''تھا۔

ظاہر ہے کہ اس انسان کو خوش کرنا بڑا مشکل ہے۔خدا اگر اس کی مرضی کے مطابق ایک جنت کی تخلیق کر دے تو یہ جنت بھی انسان کو شاید ہی مطمئن کر سکے۔انسان کو دولت کا جو جنون ہے اس کی بدولت وہ دوسرے ہفتے کے اندر ہی موتیوں کے دروازوں والی جنت سے بری طرح اکتا جائے گا اور خدا کو پھر اس ناشکر گزار اور بگڑے بچے کو خوش کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ نئی چیز تخلیق کرنی ہوگی مگر یہ یاد رہے کہ موجودہ علم ہیئت نے آنکھ سے نظر آنے والی کل کائنات کی تحقیق کرنے کے سلسلے میں یہ بتا دیا ہے کہ خود یہ زمین بھی ایک جنت ہے اور ہم جس جنت کے خواب دیکھتے رہتے ہیں وہ آخر کسی نہ کسی فضا اور مکان میں ہوگی۔لامکان میں نہیں ہو سکتی۔اس صورت میں یہ جنت فضائے آسمانی کے ان ستاروں اور سیاروں میں ہی کہیں ہونی چاہیے۔چنانچہ یہ جنت کسی

سیارے میں ہے۔ جس کے ساتھ کچھ چاند بھی ہوتے ہیں یا بعض ستاروں کے ساتھ ان کے اپنے چاند نہیں بھی ہوتے...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری اس زمین سے بہتر کون سا ایسا سیارہ ہے جس میں یہ جنت ہو سکتی ہے۔ یہ مانا کہ بعض سیاروں کے ساتھ کئی کئی چاند ہوتے ہیں۔ چلیے ہمارے برعکس وہاں ایک چاند کے بجائے ایک درجن چاند سہی جو گلابی قرمزی، نیلے، ہرے، نارنجی، غرض ہر رنگ کے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے یہاں کی طرح اس سیارے میں دھنک ایسی نایاب نہیں ہوگی بلکہ زیادہ سے زیادہ بار یہ دھنک دکھائی دیا کرے گی...... مگر مجھے یقین ہے کہ جو انسان ایک چاند سے خوش نہیں ہوتا وہ ایک درجن چاندوں سے بھی اکتا جائے گا اور جو انسان یہاں کبھی کبھار دکھائی دینے والی ایک دھنک اور کبھی کبھار کی برفباری سے مطمئن نہیں ہوتا اور بار بار دکھائی دینے والی ایک دھنک اور کبھی کبھار کی برفباری سے مطمئن نہیں ہوتا اور بار بار دکھائی دینے والی دھنک سے تو بہت جلد تنگ آ جائے گا۔ یہ بھی مانا کہ اس جنت یا اس سیارے میں چار موسموں کے بجائے سال میں چھ موسم ہوں گے اور بہار اور گرما، رات اور دن کا یہ حسین چکر بھی اسی طرح ہوگا۔ مگر اس سے فرق کیا پڑے گا؟ اگر ایک شخص اس دنیا کی بہار اور گرما سے لطف نہیں اٹھا سکتا تو وہ اس جنت کی بہار سے کیا اور کیسے لطف اٹھائے گا؟

ممکن ہے میری باتیں آپ کو بڑی احمقانہ، یا بے حد دانشمندانہ معلوم نہیں مگر میں بودھوں اور عیسائیوں کی طرح یہ نہیں کر سکتا کہ جنت کو ایک لامکان چیز اور خالصتاً روح کی ایک لطیف تعمیر تصور کر لوں اور انسانی حواس اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے فرار اختیار کر لوں...... جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنے اس سیارے، زمین پر رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ دنیا کا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہماری اس سرزمین کی زندگی غیر دلچسپ، یکساں اور بالکل بے مزہ ہے اگر کوئی شخص، زمین کے موسموں کے تنوع، آسمان کے بدلتے رنگوں، مختلف موسموں میں باری باری سے پکتے ہوئے پھلوں کی لاثانی مہک اور مختلف مہینوں میں کھلنے والے پھولوں کی شگفتگی سے مطمئن نہیں ہے تو اسے خودکشی کر لینی چاہیے۔ ہمیں ناممکن جنت کے کھوج میں سرگرداں نہیں ہونا چاہیے۔

بہرکیف زندگی کے حقائق سے ہمیں واسطہ ہے اور حقائق یہ ہیں کہ فطرت کے نظاروں اور اس کی آوازوں اس کی خوشبوؤں اور اس کے ذائقوں اور انسان کے دیکھنے سننے، سونگھنے اور چکھنے کے حواس کے

درمیان ایک نہایت مکمل، نہایت لطیف اور روحانی قسم کا تال میل موجود ہے۔ کائنات کے نظاروں اور آوازوں اور انسان کے حواس کے درمیان یہ تال میل اتنا مکمل اور ہمہ گیر ہے کہ اس سے غایت کے فلسفے (کہ کائنات کے تمام تغیرات کسی مقصد کے تحت ہوتے ہیں) کے لیے ایک نہایت پکی دلیل مل جاتی ہے۔ خیر اس غایت اور مقصد سے قطع نظر یہ ہوسکتا ہے کہ خدا نے ان نعمتوں کے لیے ہمیں دعوت دی ہو یا نہ دی ہو۔ چینی نقطہ نگاہ تو یہ ہے کہ ہم بلائے یا بن بلائے ہر طرح شریک دعوت ہو کر رہیں گے! جب دعوت میں رکھے ہوئے کھانے اتنے عمدہ ہوں اور ہمیں بھوک بھی لگی ہو تو پھر ان نعمتوں کا مزہ نہ لینا بڑی بے وقوفی کی بات ہے۔ فلسفیوں کو اپنی مابعد الطبیعیاتی تحقیقات میں لگے رہنے دیجیے اور یہ معلوم کرنے دیجیے کہ ان نعمتوں کے لیے ہماری حیثیت بلائے ہوئے مہمانوں کی ہے یا نہیں۔ عقلمند آدمی وہی ہوگا جو ان نعمتوں کے چھن جانے سے (کھانا ٹھنڈا ہونے سے) پہلے انھیں چکھ لے گا۔ کیونکہ بھوک کا تعلق ہمیشہ عملی سوجھ بوجھ سے ہوتا ہے۔

ہمارا یہ سیارہ، یہ زمین بہت اچھی جگہ ہے۔ پہلی خوبی اس میں یہ ہے کہ یہاں دن رات کا تغیر ہے۔ صبح اور شام میں فرق ہے۔ گرم دن کے بعد ٹھنڈی شام آتی ہے۔ ایک مصروف صبح سے پہلے ایک خاموش اور صاف صبح صادق ہوتی ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ دوسری خوبی گرما اور سرما کا ادل بدل ہے جو اپنی جگہ مکمل ہے۔ ان دونوں موسموں کو رفتہ رفتہ بہار اور خزاں بدلتی ہیں، اور اس تغیر سے کوئی چیز عمدہ نہیں...... تیسری بات یہ ہے کہ اس دنیا میں خاموش اور باوقار درخت اگتے ہیں جن سے ہمیں چھاؤں ملتی ہے۔ یہ درخت سرما میں سورج کی روشنی کو روکتے نہیں اور اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔ چوتھی خوبی یہ ہے کہ کھلتے ہوئے پھول ہیں اور مختلف مہینوں میں مختلف پھل پک کر تیار ہوتے ہیں اور اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ پانچویں خوبی یہ ہے کہ اس دنیا میں ابر آلود اور دھند کے دن صاف اور چمکیلے دنوں کے ساتھ باری بدل کر آتے ہیں اور ان سے بہتر اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ چھٹی خوبی یہ ہے کہ یہاں بہار کی بارشیں اور گرما کی گرج اور چمک کے ساتھ مینہ کے برستے جھالے ہیں۔ پھر خزاں کا خشک اور کرارا موسم آتا ہے اور ان کے بعد سرما میں برفباری ہوتی ہے اور اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔ ساتویں خوبی یہ ہے کہ اس دنیا میں طوطے اور مور، بلبلیں، پپیہے اور کناری اپنے نغموں سے ہمیں رجھاتے ہیں اور اس سے بہتر اور کیا بات ہے۔ آٹھویں خوبی یہ ہے کہ اس دنیا میں چڑیا گھر بھی ہے جس میں بندر، شیر، ریچھ، اونٹ، ہاتھی، گینڈے، مگرمچھ، دریائی گھوڑے، گائیں، گھوڑے، کتے، بلیاں،

گیدڑ، گلہریاں، کھٹ بڑھئی اور نہ جانے کیا کیا ہے اور نہ جانے یہ اور کن کن خوبیوں کا حامل ہے اور اس سے بہتر اور کیا چیز ہے۔ نویں بات یہ ہے کہ یہاں ہزاروں قسم کی مچھلیاں ہیں۔ دھنک مچھلی، سونٹا، لدھر، وھیل جھینگا، صدفی اور نہ جانے کن کن قسموں اور کن کن خوبیوں کی مچھلیاں ہیں اور اس سے بہتر اور کیا ہوگا...... دسویں خوبی یہ ہے کہ اس دنیا میں تناور دیودار، آگ اگلتے ہوئے آتش فشاں پہاڑ، مہیب غار، شاندار چوٹیاں، بلند و پست پہاڑیاں، خاموش پرسکون جھیلیں، بل کھاتے ہوئے دریا، سرسبز اور ٹھنڈے سایوں والے کنارے...... ہیں اور اس سے اور کیا بہتر چیز ہوگی...... گویا اس قدرت کی نعمتوں کی فہرست ایسی ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتی اور اس میں ہر مذاق اور ہر طبیعت کے شخص کے لیے پورا انتظام موجود ہے۔ بس عقلمندی اسی کا نام ہے کہ آگے بڑھ کر اس خوانِ نعمت میں شریک ہوجایئے اور زندگی کی یکسانیت اور بے رنگی کی شکایت چھوڑ دیجیے۔

2- عظمتِ آدم

فطرت، اپنی جگہ ہمیشہ سے ایک سینی ٹوریم ہے۔ یہ چاہے انسان کی کسی اور بیماری کا علاج کرے یا نہ کرے، اسے اپنی بڑائی کے خبط سے ضرور نجات دلوا دیتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کو بھی اس کی حد کے اندر رکھنا پڑتا ہے اور انسان کی اصلی حد، اس کی صحیح اوقات اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب اسے فطرت کے پس منظر میں دیکھیں اسی لیے چینی تصویروں میں جب مناظر فطرت دکھائے جاتے ہیں تو ان میں انسان کا پیکر بہت ہی چھوٹا بنایا جاتا ہے۔ ایک مشہور منظریہ تصویر ''برفباری کے بعد پہاڑ کا منظر'' کی مثال میرے سامنے ہے۔ اس میں وہ انسانی پیکر ڈھونڈنا دشوار ہوجاتا ہے جو برفباری کے بعد پہاڑ کا منظر دیکھ رہا ہے۔ بڑی احتیاط سے کھوج لگانے کے بعد یہ انسان ایک دیودار کے درخت کے نیچے نظر آتا ہے۔ اس کا پیکر زیادہ سے زیادہ ایک انچ کا ہوگا۔ حالانکہ یہ تصویر کوئی پندرہ فٹ اونچی ہوگی۔ سونگ خاندان کے وقت کی ایک اور تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ خزاں کے دور میں چار اہل علم ایک جنگل میں پھر رہے تھے اور سر اٹھا کر عظیم الشان تناور درختوں کی پیچدار شاخوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ درختوں کے مقابلے میں ان کے پیکر اتنے حقیر اور چھوٹے ہیں کہ کیا کہیے اور سچ یہ ہے کہ اپنے آپ کو چھوٹا محسوس کرنے میں بعض دفعہ بہتری ہوتی ہے اسی لیے چینی لوگوں کے نزدیک پہاڑوں کا ایک عظیم سلسلہ دیکھ کر انسان کے دل کی صفائی ہوجاتی ہے۔ اس کا دل فضول تمناؤں اور غیر ضروری تشویش اور اپنی بڑائی کے فالتو خیالات سے بالکل پاک ہوجاتا ہے۔

آدمی اکثر یہ بھول جایا کرتا ہے کہ وہ کتنا حقیر ہے اور کتنی بے کار مخلوق ہے۔ سومنزل اونچی عمارت کو دیکھ کر انسان کا دل غرور سے بھر جاتا ہے۔ اس ناقابل برداشت گھمنڈ کو دور کرنے کا بہترین طریقہ ہے کہ اس نام نہاد عظیم عمارت کو ایک پہاڑ کے دامن میں تصور کیجیے۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کس چیز کو عظیم کہنا چاہیے اور کسے عظیم نہیں کہنا چاہیے۔ جس طرح تالاب کے مقابلے میں سمندر کی بیکراں وسعت ہی ہمیں پسند آتی ہے۔ اسی طرح اس عمارت کے مقابلے میں پہاڑ کا بلند اور بڑا ہونا ہی ہمیں اچھا لگتا ہے۔ ہوانگ شان کے پہاڑوں اور زرد پہاڑوں میں ایسی ایسی چوٹیاں ہیں جو سرتاپا ایک ایک ہزار فٹ کی تنہا چٹان پر مشتمل ہیں اور کوئی آدھ آدھ میل پھیلاؤ میں چلی گئی ہیں۔ یہی وہ چوٹیاں ہیں جنھوں نے چینی آرٹسٹوں کے دل میں تخلیق کی امنگ پیدا کی۔ ان چوٹیوں کی سنگین عظمت اور ان کی ظاہری لازوال صورت اور ان کے سکوت نے چینی تصویروں میں چٹانوں کے لیے اتنی جگہ محبت پیدا کی۔ جب تک ہوانگ شان نہ جائیں یہ یقین نہیں آتا کہ دنیا میں اتنی بڑی چٹانیں بھی ہوں گی...... سترہویں صدی عیسوی میں چینی مصوروں کا ایک ہوانگ شان سکول بھی ملتا ہے جس نے انھیں سنگین چٹانوں کے سکون وسکوت سے تخلیق کی اپج اور امنگ حاصل کی۔

مگر فطرت کے ان عظیم مظاہر اور وسیع پہنائیوں کے ساتھ انسان اگر تعلق رکھے تو اس کے دل میں بھی سچی عظمت اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں پھر یہ ظرف پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ پھیلی ہوئی قدرت کے مظاہر کو ایک متحرک تصویر سمجھے اور جو تصویر اس سے چھوٹے پیمانے پر نظر آئے اس سے مطمئن نہ ہو۔ افق پر دوڑتے ہوئے کالے بادلوں کو زندگی کے سٹیج کا پس منظر خیال کرے اور اس سے کمتر درجے کے پس منظر سے اس کی تسلی نہ ہو۔ پہاڑوں پر پھیلے ہوئے جنگلوں کو اپنے خانہ باغ کے طور پر دیکھے اور ان جنگلوں سے چھوٹے کسی باغ پر مطمئن نہ ہو۔ سمندر کی امڈتی، گرجتی لہروں کی موسیقی سمجھ کر سنے اور اس سے کمتر اور ہلکی موسیقی اسے تسلی نہ دے سکے۔ پہاڑی ہواؤں کو کمروں کو ٹھنڈا کرنے والی مشینی ہوا کے طور پر خیال کرے اور پھر اسی نظام خنکی کے سوا اسے تسلی نہ ہو......! یہی عظمت ہے۔ وہی عظمت جو پھیلی ہوئی زمین اور اوپر تنے ہوئے آسمانی سائبان میں ہے۔ یوآن سی (210ء سے 263ء) نے جو چین کا پہلا رومانی شاعر تھا اسی چیز کو اپنے انداز میں کہا ہے کہ اس عظمت کے مل جانے سے ''ہم آسمان اور زمین کو اپنا گھر سمجھ کر آباد کرتے ہیں۔''

میں نے بہترین قدرتی ''منظر'' جو آج تک دیکھا وہ ایک شام بحر ہند میں نظر آیا تھا۔ یہ منظر حقیقی معنی

میں لامحدود تھا۔ اس ''منظر'' کا سٹیج ایک سو میل چوڑا اور تین میل اونچا تھا۔ اس سٹیج پر قدرت نے آدھے گھنٹے کا ایک ڈرامہ کھیلا۔ اس میں کبھی تو بڑے بڑے اژدہا حصہ لیتے تھے، کبھی مہیب رینگنے والے جانور جو اب صفحہ ہستی سے ناپید ہیں اور کہیں بڑے بڑے شیر تھے۔ یہ سب آسمان پر پھر رہے تھے۔ کبھی شیروں کے سر بڑھتے بڑھتے بہت بڑے ہو جاتے، ان کی ایالیں فضاؤں پر بجھ بجھ جاتیں، اژدہوں کی کمریں غصے سے بل کھانے لگتیں اور کبھی سفید اور خاکی وردیوں کی پلٹنیں آسمان پر دوڑنے لگتیں۔ ان میں طلائی نشانوں والے افسر بھی ہوتے۔ یہ فوجیں آپس میں ٹکراتیں۔ آگے بڑھ کر مارچ کرتیں۔ پھر پسپا ہو جاتیں۔ یہ لڑائی اور یہ تعاقب جاری تھا کہ سٹیج کی روشنیاں ایکا ایکی بدل گئیں۔ سفید وردیوں والے سپاہی اب نارنجی وردیوں میں ملبوس نظر آنے لگے اور خاکی وردیوں والی پلٹنیں سرخ وردی میں آگے بڑھیں۔ پس منظر پر پگھلے ہوئے سرخ سونے کا ایک لامتناہی پردہ آ گیا۔ پھر قدرت کے سٹیج کے کارکنوں نے رفتہ رفتہ سٹیج کی روشنیاں مدھم کرنی شروع کیں تو قرمزی رنگ بڑھ کر ہر نارنجی اور ہر سرخ رنگ پر چھا گیا اور پھر رفتہ رفتہ گہرے ارغوانی اور بھورے رنگوں میں گھلنے لگا۔ آخری پانچ منٹ میں اس رنگ نے ناقابل بیان المیے اور مکمل بربادی کا نقشہ پیش کیا اور پھر دھیرے دھیرے سٹیج کی روشنیاں بجھ گئیں۔ یہ زندگی کا سب سے عظیم، سب سے شاندار ڈرامہ ہے جو میں نے دیکھا اور اسے دیکھنے کے لیے میں نے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔

پھر پہاڑوں کا سکوت ہے جو ہر دکھ، دلدر کو دور کر سکتا ہے۔ خاموش چوٹیاں، خاموش چٹانیں، خاموش اشجار...... ہر چیز کی خاموشی میں وقار اور عظمت ہے۔ ہر اچھا پہاڑ اپنی جگہ ایک سینی ٹوریم، ایک صحت گاہ ہے۔ اس کی گود میں ایک بچے کی طرح آرام کرنے میں بڑی راحت اور سکون ملتا ہے۔ میں ویسے روحانی علاج کا قائل نہیں مگر میں پرانے تناور درختوں اور پہاڑی پر فضا مقامات کی روحانی صحت اور تاثیر کا سختی سے قائل ہوں۔ یہاں ٹوٹے ہوئے کندھوں کی ہڈیاں اور خارش زدہ کھال کا علاج نہیں ہوتا بلکہ دنیوی زندگی کی حرص و ہوس اور روح کی بیماریوں مثلاً بے ضرورت چوری کرنے کے خبط، اپنی بڑائی کے خبط، خود غرضی اور خود پسندی کے خبط، روحانی غلامی، روحانی حکمرانی کے خبط، دوسروں کی زندگی کو اپنے ماتحت رکھنے کے جنون، جنگ کے جنون، نفرت، تحقیر، سماجی نمود و نمائش کے جنون، عام بے سمجھی اور کوڑ مغزی اور ہر قسم کی بدتمیزی اور بداخلاقی کا علاج ہوتا ہے۔

3- دو چینی خواتین

فطرت کے مظاہر سے لطف اٹھانا ایک آرٹ ہے جس کا دارومدار اپنے انداز طبیعت اور اپنی شخصیت پر ہے۔ ہر آرٹ کی تکنیک بیان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہی حال اس آرٹ کا بھی ہے۔ لطف کی ہر چیز برجستہ اور قدرتی طور پر پیدا ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی دل ہی سے بات اٹھنی چاہیے۔ اس لیے کسی پیڑ یا پودے کو دیکھ کر حظ اٹھانے کا کوئی لگا بندھا قاعدہ بیان کرنا مشکل ہوگا۔ نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ایک منظر سے ایک خاص وقت میں کیسے لطف لیا جائے کیونکہ کوئی سے دو قدرتی مناظر ایک سے نہیں ہوتے ...... جو لوگ فطرت کی رمز کو جانتے ہیں وہ بتائے بغیر بھی اس سے حظ اٹھانے پر قادر ہیں ...... خلوت میں میاں بیوی کے باہمی اختلاط اور پیار محبت کے بارے میں مشہور ماہر جنسیات ہیولاک ایلس اور فان ڈرویلڈ لکھتے ہیں کہ اس اختلاط میں کن چیزوں کی اجازت ہونی چاہیے اور کون سی چیزیں ممنوع ہونی چاہئیں۔ یا اس اختلاط میں ذوق سلیم کیا ہے اور بدذوقی کو کن چیزوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام چیزیں قاعدوں، ضابطوں اور نہیں بتائی جا سکتیں۔ بس ان کا فیصلہ اس جوڑے کے صحیح وجدان اور سوجھ بوجھ پر ہے۔ قدرت سے لطف اٹھانے کے بارے میں بھی یہ مثال بالکل صادق آتی ہے۔ شاید اس سلسلے میں سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی زندگی کے حالات غور سے پڑھے جائیں جو فنون لطیفہ کا صحیح ذوق لے کر پیدا ہوئے تھے ...... اس افتادِ طبع کا شخص کہیں چھپتا تھوڑا ہی ہے اور جو ادیب قدرت کے مظاہر کا صحیح ذوق رکھتا ہے وہ اپنی کہانی کا سلسلہ یا پلاٹ کی ساری کڑیاں چھوڑ کر اکثر برفباری کے کسی خوبصورت منظر یا بہار کی کسی شام کے تذکروں میں، ان کے تفصیلی بیان میں کھو جایا کرتا ہے ...... عام طور پر اخبار نویسوں اور سیاسی ہستیوں کے خودنوشت سوانح حیات میں پرانے واقعات کی یادیں تازہ کی جاتی ہیں۔ میرے نزدیک ادبی شخصیتوں کے خودنوشت سوانح حیات میں زیادہ تر کسی خوشگوار رات، کسی دوست کے ساتھ کسی حسین وادی میں سیر کے تذکرے ہونے چاہئیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مجھے مشہور انگریز ناول نویس، شاعر اور افسانہ نگار، کپلنگ اور انشاء پرداز چسٹرٹن کی خودنوشت سوانح سے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی زندگی کی اہم چیزوں اور واقعات کو غیر اہم کیوں سمجھا اور غیر اہم واقعات کو اہم کیوں گردانا؟ ...... ان کتابوں میں ہر جگہ انسان، انسان اور بس انسان کا ذکر ہے اور کہیں پھولوں، پرندوں، پہاڑیوں اور چشموں کا ذکر موجود نہیں۔

چینی ادیبوں کے تذکروں اور ان کے خطوط اس لحاظ سے بڑے مختلف ہوتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ بات اہم ہے کہ اپنے خط میں دوست کو جھیل کنارے بسر کی ہوئی رات کا تذکرہ لکھا جائے اور خودنوشت سوانح میں یہ لکھنا تو بے حد لازمی ہے کہ خوشی کا کوئی دن کیسے اور کس طرح گزرا۔کچھ چینی ادیبوں نے تو خاص طور پر اپنی شادی کی متاہل زندگی کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ان میں ماؤ پچیانگ کی کتاب ''میری محبوبہ کی یادیں اور سوانح'' شین شان یو کی کتاب ''رواں زندگی کے چھ باب'' چیانگ مان کی کتاب ''چراغ کی روشنی میں گزری ہوئی زندگی کی چند یادیں'' اس قسم کی بہترین کتابیں ہیں ...... پہلی دو کتابیں شوہروں نے اپنی بیویوں کے انتقال کے بعد لکھیں اور آخری کتاب مصنف نے اپنے بڑھاپے میں لکھی۔جب ابھی اس کی بیوی زندہ تھی۔ہم اسی آخری کتاب ''چراغ کی روشنی میں گزری ہوئی زندگی کی چند یادیں'' سے کچھ اقتباس لیتے ہیں۔ان سطور کے روئے سخن ان کی ہیروئن مصنف کی بیوی چی یوفو کی طرف ہے ...... اس کے بعد میں ''رواں زندگی کے چھ باب'' میں سے ایک اقتباس پیش کروں گا۔جس کی ہیروئن یون ہے۔یہ دونوں خواتین طبع سلیم رکھتی تھیں اگرچہ دونوں کی دونوں زیادہ تعلیم یافتہ یا اتنی اچھی شاعرہ نہ تھیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔آخر کسی کو بھی غیر فانی شعر لکھنے پر ادھار نہیں کھا لینا چاہیے بلکہ یہ سیکھنا چاہیے کہ کسی اہم لمحے، کسی ذاتی موڈ کو نظم میں کیسے قلم بند کر لینا چاہیے یا یہ کہ نظم کی بدولت مظاہر فطرت سے لطف اٹھانے میں کیا مدد مل سکتی ہے۔تو اب پہلا تذکرہ ملاحظہ ہو:

i- چی یوفو

مجھ سے کئی بار چی یوفو نے کہا: ''آدمی کی زندگی کل سو برس کی ہوتی ہے اور اس میں آدھا حصہ نیند اور سپنوں کا ہوتا ہے۔بیماری اور غم کے اندیشے، باقی آدھا حصہ لے جاتے ہیں۔ادھر آدھا حصہ پوتڑوں کے دنوں میں (شیر خواری) اور پھر سخت بڑھاپے کے دنوں میں نکل جاتا ہے۔(1) گویا ہمارے پاس ان سو برسوں میں سے صرف پانچواں یا دسواں حصہ بچتا ہے۔اس کے علاوہ اگرچہ ہمیں بید مجنوں سے بنایا گیا ہے لیکن ہمیں سو برس جینے کی امید بھی نہیں رکھنی چاہیے۔''

ایک رات خزاں کا چاند پورے جوبن پر تھا۔پی یوفو نے خادمہ سے کہا کہ رباب لے کر میرے ساتھ

1- یہ چینی حساب کچھ ایسا ہی ہوتا ہے، پریشان ہونے کی بات نہیں (حاشیہ از مصنف)

چل، مغربی جھیل کے نیلوفر کے پھولوں میں کشتی چلائیں گے۔ میں اس وقت مغربی دریا سے گھر واپس آرہا تھا۔ میں گھر پہنچا تو پی یوفو کشتی کی سیر کو جا چکی تھی۔ میں نے کچھ خربوزے خریدے اور اس کے پیچھے گیا۔ ہماری ملاقات سوتنگ پو کے کنارے دوسرے پل پر ہوئی۔ پی یوفو ''محل میں خزاں کی آمد'' کا غمگین نغمہ ساز پر بجا رہی تھی۔ میں نے چیغہ سمیٹ لیا اور نغمہ سننے ٹھہر گیا۔ اس وقت گردوپیش پہاڑیاں شام کی دھند میں لپٹی ہوئی تھیں اور چاند تاروں کے ہلکے عکس پانی میں نظر آرہے تھے۔ کئی نغمہ طراز صدائیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ میں امتیاز نہیں کر سکتا کہ یہ ہوا کے جھونکوں کا نغمہ ہے یا سیپ کے ظروف کی جھنکار ہے۔ پی یوفو کا نغمہ ختم ہونے سے پہلے کشتی گھومتے پانیوں کے باغ کے کنارے آ لگی۔ ہم نے کشتی سے اتر کر ابر سفید کی خانقاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا کیونکہ وہاں کچھ راہبہ خواتین کو ہم جانتے تھے۔ ان راہبہ خواتین نے جلد تیار کر کے ہمیں تازہ نیلوفر کھلائے جو یخنی میں پکے ہوئے تھے۔ ان کا رنگ اور ان کی خوشبو، آنتوں کو سکون دینے کے لیے کافی تھی اور ان کا مزہ دنیا بھر کے گوشت اور روغنی سالنوں سے بالکل مختلف اور بالا تھا۔ واپسی میں ہم تو ان کے پل پر کشتی سے اترے۔ یہاں کنارے پر ہم نے بانس کی چٹائی بچھائی اور بڑی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے...... شہر کا دور سے آتا ہوا ہلکا شور کانوں کو پریشان کرتا تھا، جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں!۔

پھر رفتہ رفتہ آسمان پر تارے ماند ہوتے گئے اور جھیل پر گہری سفید دھند چھا گئی۔ شہر کی فصیل سے نوبت بجی اور ہمیں معلوم ہوا کہ چوتھا پہر (صبح کے تین بجے کے لگ بھگ) شروع ہو گیا۔ ہم نے ساز اٹھایا اور کشتی کھیتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

چی یوفو نے کیلے کا درخت بویا تھا اس کے پتے خوب بڑے ہو چکے ہیں اور ان کا سبز سایہ جھلملی پر پڑتا ہے۔ خزاں میں تکیے کے سہارے لیٹے ہوئے ان پتوں پر برستی بوندوں کا شور سن کر دل بے طرح بے کل ہو جاتا تھا۔ اس لیے میں نے مذاق مذاق میں ایک دن ایک پتے پر لکھا:

یہ پودا بویا کس نے ؟
صبح کو مچائے شور
شام کو بھی غوغا ہو

اگلے دن میں نے دیکھا کہ اسی پتے پر تین اور مصرعے لکھے ہیں، جو یہ تھے:

تم ہو تنہا جو بے کلی میں
کیلوں کے لیے یہ بیقراری؟
کیلوں کے لیے یہ شرمساری؟

مصرعوں کے حروف نازک نازک تھے اوران سے چی یوفو کی شوخی طرز صاف نمایاں تھی لیکن اس شوخی سے بھی مجھے کچھ نہ کچھ حاصل ہو گیا۔

ایک رات ایسی آئی کہ ہم نے باہر ہواؤں اور بارش کا شور سنا اور تکیوں اور بستر کی ٹھنڈک سے محسوس ہوا کہ یہ خزاں کی خنکی ہے۔ پی یوفو رات کے لیے لباس تبدیل کر رہی تھی۔ میں پاس بیٹھا تھا اور ایک البم کو دیکھ چکا تھا۔ جس میں سو پھول تھے۔ ان پھولوں کے لیے میں عنوانات تجویز کر رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے کئی زرد پتوں کو زمین پر گرتے سنا اور اس پر چی یوفو نے یہ مصرعے گا کر سنائے:

کل کا دن آج سے بہتر ہی گزارا میں نے ......
میں بھی ہوں سال گزشتہ سے معمر اس سال

میں نے ان غمگین مصرعوں پر اس کے دل کی تشفی کی۔ میں نے کہا ''کوئی شخص سو برس زندہ نہیں رہتا۔ ہمیں دوسروں کے آنسو پونچھنے (خزاں زدہ پتوں کا گرنا) کا وقت مل ہی کیسے سکتا ہے؟'' ......اور میں نے ایک آہ بھر کر موقلم اپنے ہاتھ سے رکھ دیا۔ پھر رات زیادہ آ گئی اور پی یوفو کچھ پینا چاہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ انگیٹھی میں آگ سرد پڑ چکی ہے اور ساری خادمائیں نیند کی وادی میں کھو چکی ہیں۔ میں نے لیمپ کو میز پر رکھا اور اس پر چائے کی چھوٹی کیتلی چڑھا دی اور اس میں کنول کے بیجوں کا عرق گرم کیا۔ اصل میں چی یوفو کو کوئی دس برس سے پھیپھڑوں کی تکلیف ہے۔ خزاں میں اسے کھانسی آتی ہے۔ اس موسم میں وہ بہت بڑے تکیے کے سہارے سو سکتی ہے۔ اس سال اس کی صحت کچھ بہتر ہے اور ہم اکثر آمنے سامنے کافی رات گئے تک بیٹھے رہتے ہیں۔ شاید اس کی صحت کی بہتری احتیاط اور اچھی غذا کی بدولت ہے۔

میں نے چی یوفو کے لیے ایک لباس تیار کیا۔ جس پر شفتالو کے پھول بنے تھے اور سارے بدن پر معطر برف کا سا سماں تھا۔ دور سے وہ شگوفوں کی پری نظر آتی تھی جو اس فانی دنیا میں اکیلی ہو اور بہار کے آخری دنوں تو یہ بھی ہوا کہ ایک دن وہ بالکنی میں کھڑی تھی اور اس کی بانہیں بالکنی کے جنگلے پر ٹکی تھیں، یہ بانہیں سبز کپڑے میں

لپٹی ہوئی تھیں، اس وقت تتلیاں اسے پھول سمجھ کر اس کے گرد منڈلا رہی تھیں۔

پچھلے برس (گرما کی نقیب) ابابیلیں دیر سے واپس آئیں۔ ان کے آنے تک شگوفے کھل بھی چکے تھے۔ ایک دن اتفاق سے ان کے گھونسلے کی مٹی گری اور ساتھ ہی ایک بچہ بھی زمین پر آ پڑا۔ پی یوفو کو خیال ہوا کہ کہیں کوئی بلی اس بچارے کو ہڑپ نہ کر جائے۔ اس نے اسے احتیاط سے اٹھالیا اور اس کے لیے بانس کے تنکوں کا الگ گھونسلا تیار کیا۔ اب کے سال وہی ننھی ابابیل بڑی ہو کر ہمارے یہاں گرما کی آمد کے ساتھ آ گئی ہے اور گھر بھر میں منڈلاتی اور چہچہاتی پھرتی ہے۔ کیا اسے اپنی جان بچانے والی یاد ہے؟

چی یوفو کو شطرنج کھیلنے کا بڑا شوق ہے۔ مگر کھیل اسے اچھی طرح نہیں آتا۔ ہر رات وہ مجھے شطرنج (یعنی انگلیوں کا تکلم) اپنے ساتھ کھیلنے پر مجبور کرتی تھی اور کبھی کبھی تو یہ کھیل صبح تک جاری رہتا تھا۔ ایک دن میں نے چو، چو چیا کا یہ مصرع دہرایا۔ ''بازیاں ہار دیں تم نے دونوں!'' اور کہا ''بولو، آج کی رات ہار کا کیا معاوضہ دو گی؟'' چی یوفو نے میرے سوال سے پہلو بچاتے ہوئے کہا ''تمھیں اتنا یقین کیوں ہے کہ میں جیت نہیں سکتی؟ اچھا، عقیق کا یہ شیر میں شرط بدتی ہوں!'' چنانچہ ہم نے کھیلنا شروع کر دیا۔ بیس یا تیس چالوں کے بعد اس کی بازی مات ہونے لگی تو اس نے بلی سے شطرنج کا تختہ الٹوا دیا۔ میں نے کہا ''تم اپنے آپ کو یانگ کیوای فی سمجھ رہی ہو گی۔ جس نے شہنشاہ تانگ منگ ہوانگ کے ساتھ یہی چال چلی تھی؟'' چی یوفو چپ رہی لیکن چاندی کے شمعدان کی روشنی اس کے پھول سے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے بعد شطرنج کھیلنے کی کسے سوجھتی۔

ہو پاؤ کے چشمے کے پاس تیج کے کئی پیڑ ہیں۔ جو چٹانوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ بہار کے دنوں میں ان زرد زرد پھول چشمے کی سنگین سیڑھیوں پر چھا جاتے ہیں اور ان کی خوشبو سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آسمانی خوشبوؤں کی وادی میں آ گئے ہیں۔ مجھے یہ پھول بڑے پسند ہیں اور کئی دفعہ میں نے انھیں پھولوں کے نیچے چائے بنائی ہے۔ اس وقت چی یوفو یہ پھول توڑ توڑ کر اپنے بالوں میں گوندھتی تھی مگر بعض دفعہ پھولوں کی شاخوں میں اس کے بال الجھ جاتے تھے یا ان شاخوں سے الجھ کر بکھر جایا کرتے اور انھیں چشمے کے پانی کی نمی سے سنوارا کرتا تھا۔ واپسی پر ہم کچھ شاخیں اپنے ساتھ گاڑی میں رکھ لاتے تھے تاکہ جب ہم بازاروں میں سے گزریں تو لوگوں کو نئی خزاں کے بارے میں تازہ ترین خبریں معلوم ہو جائیں۔

ii- یون

''رواں زندگی کے بارے میں چھ باب'' اصل میں ایک گمنام سے چینی مصور کی آپ بیتی ہے جس میں اس نے اپنی متاہل زندگی اور اپنی محبوب بیوی یون کے بارے میں لکھا ہے۔ میاں بیوی دونوں سادہ مزاج مگر لطیف طبع لوگ تھے۔ جو زندگی کی ہر اس خوشی کو جو انھیں حاصل ہو سکے۔ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ آپ بیتی نہایت ہی سادہ اور صاف انداز میں لکھی ہوئی ہے اور اسے پڑھنے کے بعد مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا ہے کہ کتاب کی ہیروئن یون چینی ادب کی سب سے خوبصورت عورت ہے۔ یون اور اس کے میاں کی زندگی آلام سے بھرپور تھی مگر یہی زندگی ایک عجیب طریقے سے نہایت خوشگوار اور پرمسرت بھی تھی۔ کیونکہ اس میں وہ مسرت، وہ سچی خوشی حصہ گیر تھی جو روح کی گہرائیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کے روحانی مشاہدات اور تجربات میں فطرت کے مناظر اور نیرنگیوں سے لطف اٹھانے کا بہت بڑا حصہ ہے۔ میں ذیل میں دو اقتباسات درج کرتا ہوں۔ ایک میں ساتویں مہینے کی ساتویں کے چاند اور ساتویں مہینے کی پندرہویں کے چاند کے جشنوں کا ذکر ہے۔ دوسرے اقتباس میں مصنف نے بتایا ہے کہ دونوں میاں بیوی نے سوچو، کے شہر میں گرمیاں کس طرح گزاریں۔ لیجیے پہلے ساتویں مہینے کی ساتویں کے چاند کا جشن ملاحظہ ہو:

> اس سال (1780ء) ساتویں مہینے کے ساتویں (1) رات کو یون نے کچھ عنبر ولوبان کے بخورات، کچھ شمعیں، کچھ پھل وغیرہ مہیا کیے تاکہ ہم آسمانی پوتے کی پرستش کے لیے جائیں۔ میں نے دو مہریں کندہ کر کے ایک اپنے پاس رکھی اور ایک یون کو دی۔ مہروں پر یہ عبارت تھی۔ ''ہم دونوں جنم جنم ایک دوسرے کے جیون تھی رہیں!'' یہ مہریں ہم نے اس لیے پاس رکھی تھیں کہ خط و کتابت کے موقع پر کام آئیں۔ اس رات چاند پر بڑا جوبن تھا اور جب میں نے خلیج کو دیکھا تو نرم رولہریں چاندنی میں سطح آب پر سنہری زنجیریں بناتی جا رہی تھیں۔ ہم دونوں نے ہلکے ریشم کا لباس پہن رکھا تھا اور ایک کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے

1- ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کے بارے میں یہ روایت ہے کہ سال بھر میں، صرف اسی دن آسمان کے مشہور عاشق و معشوق، یعنی (آسمان کے پوتے) اور دوشیزہ کو کہکشاں کے پار ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت دی جاتی ہے...... (مصنف)

جہاں سے خلیج صاف نظر آتی تھی۔ آسمان کی طرف دیکھا تو ہلکے بادل آسمان پر منڈلا رہے تھے اور ہر آن نئی صورت، نئی ہیئت بدلتے تھے۔ یکا یک یون نے کہا۔ ''یہ چاند ساری دنیا کے لیے چمک رہا ہے۔ خدا جانے ہماری طرح اس وقت کوئی دو محبت بھرے دل دنیا میں کہیں اور بھی چاند کو تک رہے ہیں یا نہیں؟'' ...... اور میں بولا ''اس خنک شام کو لطف تو بہت لوگ اٹھا رہے ہوں گے اور چاند کو بھی دیکھ رہے ہوں گے۔ بہت سی عورتیں بھی ہوں گی جو اپنے کمرے میں بیٹھی ان ہلکے بادلوں کا منظر دیکھ رہی ہوں گی یا ان میں سو سو عیب ڈال رہی ہوں گی لیکن جب کوئی شوہر اور بیوی ایک ساتھ چاند کو دیکھ رہے ہوں تو میرے خیال میں گفتگو کا موضوع بادل نہیں ہو سکتے!''

آہستہ آہستہ ساری شمعیں بجھ گئیں، اور چاند بھی ڈوب گیا۔ ہم نے پھل سنبھال کر رکھ دیے اور سو گئے۔

چاند کی پندرہویں کو ''روحوں کا دن'' تھا۔ یون نے تھوڑا سا کھانا تیار کر لیا تاکہ اس کے بعد ہم چاند کی ہمرکابی میں پی سکیں اور پیتے رہیں مگر جب رات ہوئی تو آسمان پر گہرے بادل چھا گئے۔ یون اداس ہو گئی اور بولی ''اگر قدرت کو یہ منظور ہے کہ ہم دونوں بال سفید ہونے تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں تو آج رات چاند ضرور نکلنا چاہیے...... میرا دل بھی بھاری تھا۔ کھڑکی میں سے خلیج پر نظر ڈالی تو جگنوؤں کی ہزاروں روشنیاں ادھر ادھر جلتی بجھتی نظر آئیں جو بید مجنوں اور سرکنڈوں کے درمیان چھپتی تھیں اور پھر ظاہر ہو جاتی تھیں اور ہم نے مل کر ایک نظم لکھنی شروع کر دی، ہر ایک، ایک وقت میں دو دو مصرعے کہتا تھا۔ ان مصرعوں کی صورت یہ تھی کہ پہلا مصرعہ کہہ کر تو دوسرے شخص کے دیے ہوئے مصرعے پر شعر پورا کرنا پڑتا تھا اور دوسرا مصرعہ نئے شعر کا آغاز کرتا تھا جس پر دوسرا شخص گرہ لگا کر شعر پورا کرتا تھا۔ بس چند قافیے باندھے ہوں گے کہ شعر بے معنی ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ساری نظم چوں چوں کا مربا ہو کر رہ گئی۔ یون کا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ آنکھوں سے بے تحاشا پانی بہہ رہا تھا اور وہ میرے سینے پر سر رکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھی۔ مجھے اس

کے بالوں سے آتی ہوئی چنبیلی کی متوالی خوشبو نے مدہوش کر دیا۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور مذاق سے بولا ''میرا خیال تھا چنبیلی کے پھول عورت کے بالوں کا حسن بڑھانے کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ پھول موتی کی طرح گول ہوتا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کی خوشبو عورت کے بالوں کی مہک اور اس کے غازے کی خوشبو کے ساتھ مل کر اتنی متوالی بن جاتی ہے کہ ترنج کی خوشبو بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔'' یون ہنستے ہنستے یکا یک سنجیدہ ہوگئی اور بولی ''ترنج، خوشبودار جھاڑیوں میں سب سے اعلیٰ درجے پر ہے کیونکہ اس کی باس اتنی لطیف اور نازک ہوتی ہے کہ مشکل سے محسوس ہوتی ہے۔ رہی چنبیلی تو وہ عام چیز ہے کیونکہ یہ دوسروں سے خوشبو ادھار بھی لے لیا کرتی ہے۔ اس لیے چنبیلی کی خوشبو تو کسی مسکراتے ہوئے خوشامدی کی طرح ہے......'' میں نے پوچھا ''تو پھر تم نے ترنج کی اعلیٰ اور ارفع خوشبو کو چھوڑ کر ایک عام خوشبو کیوں لگا رکھی ہے؟'' یون نے جواب دیا ''ایک عامیانہ سطح کی چیز اعلیٰ چیز کے ساتھ دیکھ کر کچھ لطف سا آتا ہے (اعلیٰ چیز سے مراد اس کی اپنی ذات تھی)

ہم اس طرح فقرہ بازی کرتے رہے اور آدھی رات آ گئی۔ پھر ہوا چلنے لگی اور اس نے آسمان سے سارے بدل بھگا دیے۔ پورا چاند جو رتھ کے پہیے کی طرح گول تھا نکل آیا۔ ہم دونوں کے دل بلیوں اچھلنے لگے اور ہم نے اسی دریچے کے پاس بیٹھے بیٹھے شراب پینی شروع کر دی۔ ابھی تین تین جام بھی ختم نہ کیے تھے کہ خلیج کے پل کے پاس سے شڑاپ کی آواز آئی جیسے کوئی پانی میں گر گیا ہو۔ دریچے سے جھانک کر دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ پانی کی سطح آئینے کی طرح صاف اور ساکت تھی۔ اور ہم نے محض ایک مرغابی کی آواز سنی تھی جو کنارے کی دلدل اور پانی میں پھڑ پھڑاتی پھر رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ سانگ لانگ کے ایوان کے پاس ایک بار کوئی شخص ڈوب گیا تھا اور اب اس کی روح وہاں پھرا کرتی ہے لیکن یون بڑے کمزور دل کی واقع ہوئی ہے۔ اس لیے میں زبان سے کچھ نہ بولا۔ یون نے یکا یک ایک ہلکی سی آہ بھری اور پوچھا ''ہائے افسوس، یہ آواز کہاں سے آئی ہے؟'' اور ہم

دونوں کانپ گئے......ہم نے جلدی سے دریچے کے پٹ بند کر دیے اور شراب کی صراحی اٹھا کر کمرے میں لے آئے۔ اس وقت لیمپ کی روشنی بہت ہلکی سی تھی۔ نیم تاریکی میں پردے سرسرا رہے تھے اور ہم دونوں لرز رہے تھے۔ ہم نے روشنی بجھا دی اور مسہری کے پردے ہٹا کر مسہری پر لیٹ گئے۔ یون کو تیز بخار ہو چکا تھا۔ بہت جلد مجھے بھی تپ آ گئی اور ہم دونوں کوئی بیس دن بیمار رہے...... سچ ہے جب خوشی کا جام لبالب بھر جائے تو مصیبت آتی ہے...... گویا یہ بھی ایک فال بد تھی کہ ہم دونوں بڑھاپے تک ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔''

یہ کتاب ایسی ہی نازک اور حسین عبارتوں سے بھرپور ہے اور ہر جگہ فطرت کے مظاہر کی محبت اس میں سے چھلکی پڑتی ہے۔ مگر گرمیاں گزارنے کے اس اقتباس پر اکتفا کرنی پڑے گی۔ ملاحظہ ہو:

''ہم نے سانگ می کے کوچے میں مکان لیا اور اس میں منتقل ہو گئے۔ ہم نے اپنی اپنی خواب گاہ کا نام ''مہمانوں کی خوشبو کا ایوان'' رکھا۔ اس میں یون کے نام کی رعایت مضمر تھی (چینی زبان میں یون ایک خوشبودار بوٹی کو کہتے ہیں) اور لیانگ ہونگ اور منگ کوانگ کی کہانی کی طرف بھی اشارہ تھا جو شوہر اور بیوی ہونے کی حیثیت میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ادب، قاعدے سے پیش آتے تھے جس طرح مہمانوں کی مدارت مقصود ہوتی ہے ہمیں یہ گھر کچھ ایسا پسند نہیں تھا۔ اس کی دیواریں بہت اونچی تھیں اور صحن بہت تنگ تھا۔ پشت پر ایک اور مکان تھا جس سے لائبریری کو راستہ جاتا تھا۔ پشت پر ایک کھڑکی تھی جس سے دیکھیں تو لو صاحب کا اجڑا باغ نظر آتا تھا۔ اسی لیے یون کے خیالات ابھی تک سانگ لانگ کے ایوان کے خوبصورت مناظر پر ہی مرکوز تھے۔

ان دنوں کینگ شیانگ کے شمال میں سنہرے پل کے پاس ایک بوڑھی کسان عورت رہا کرتی تھی۔ اس کی جھونپڑی کے چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے جن میں سبزیاں بوئی جاتی تھیں۔ جھونپڑی کا پھاٹک بید کی شاخوں کا تھا اور سا پھاٹک کے پاس کوئی تیس گز لمبا ایک تالاب تھا جس کے چاروں طرف درختوں کا ایک جنگل سا تھا۔ جھونپڑی کے مغرب

میں چند قدم پر ٹوٹی ہوئی اینٹوں کا ایک ٹیلا تھا جس پر چڑھ کر دیکھنے سے آس پاس کا سارا علاقہ نظر آ سکتا تھا۔ یہ علاقہ ہموار تھا اور بیچ بیچ میں کہیں خودرو پیڑ، گھانس پھونس اور بوٹیوں سے پٹے ہوئے رقبے بھی تھے۔ اس بڑھیا نے اپنے جھونپڑے کا ذکر ایک دفعہ یون سے کیا تھا۔ اور یون کو رہ رہ کر یہی جھونپڑا یاد آتا تھا۔ چنانچہ اس نئے مکان میں منتقل ہونے کے اگلے دن میں اس جھونپڑے کو دیکھنے گیا۔ میں نے دیکھا تو اس میں صرف دو کمرے تھے جن میں پردے لگا کر چار کمرے بنائے جا سکتے تھے۔ ان کمروں میں اگر موٹے گتے کے دریچے کھولے جائیں اور بانسوں کی چارپائیاں ہوں تو گرمیوں میں رہنے کے لیے یہ بڑی ٹھنڈی جگہ بن سکتی تھی۔

یہاں ہمارے واحد ہمسائے ایک بوڑھا بڑھیا تھے جو بیچنے کے لیے سبزیاں ترکاریاں اگاتے تھے۔ انھیں پتا چلا کہ ہم یہاں رہنے کے لیے آئے ہیں تو وہ ہم سے ملنے آئے اور بطور تحفہ تالاب کی مچھلی اور اپنے کھیتوں کی تازہ سبزیاں بھی لائے۔ ہم نے انھیں قیمت دینا چاہی تو انھوں نے لینے سے انکار کیا۔ چنانچہ یون نے ان کے لیے جوتوں کا ایک جوڑا تیار کیا جو بڑی مشکل سے انھوں نے قبول کیا...... یہ جولائی کا ذکر ہے۔ جب درختوں کے سبز سائے اس جھونپڑی کو آغوش لیے ہوئے تھے...... گرما کی ہوائیں تالاب کے اوپر سے ہوکر آتی تھیں اور نغمہ ریز پرندے دن بھر درختوں پر چہچہاتے تھے۔ ہوائیں ان نغموں سے گونجتی تھیں۔ ہمیں ہمارے بوڑھے ہمسائے نے مچھلی پکڑنے کے لیے کانٹا اور ڈور بھی بنا کر دی اور میں دن دن بھر درختوں کے سائے تلے تالاب میں بنسی ڈور سے مچھلیاں پکڑا کرتے تھے...... دن ڈھلتا تو ہم دونوں مغربی ٹیلے پر چڑھتے اور غروب آفتاب کا منظر دیکھتے اور جب طبیعت موزوں ہوتی تو شعر کہتے...... ایک شعر ابھی تک ذہن میں ہے:

سورج کو نگل لیتے ہیں بادل کے درندے
اور مہ کی کماں تاروں پہ ہے تیر چلاتی

تھوڑی دیر بعد چاند کا عکس تالاب کے پانی میں نظر آنے لگتا۔ ہر طرف جھینگر اور دوسرے

کیڑے مکوڑے شور مچاتے اور ہم باڑ کے پاس چارپائی بچھا کر بیٹھ جاتے یا لیٹ جاتے۔ پھر بڑھیا آ کر کہا کرتی تھی کہ شراب پینے کے لیے گرم کر دی گئی ہے اور کھانا تیار ہے اور پھر ہم چاند کی روشنی میں بیٹھ کر تھوڑی سی شراب پیتے، نہادھو کر ہم اپنے اپنے سلیپر پہنتے اور پنکھیا ہاتھ میں لے کر اسی چارپائی پر بیٹھ جاتے یا لیٹ جاتے اور ہمارا بوڑھا ہمسایہ ہمیں انتقام اور سزا و جزا کی پرانی داستانیں سناتا رہتا آدھی رات کے الگ بھگ ہم سونے کے لیے اٹھ کر اندر آ جاتے۔ ہمارے جسم خنک اور ہلکے پھلکے محسوس ہوتے اور یہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ ہم شہر میں رہتے ہیں۔

ایک دن ہم نے اپنے بوڑھے ہمسائے سے کہا کہ باڑ کے ساتھ ساتھ گل داؤدی لگا دیئے۔ یہ پھول سال کے نویں مہینے میں کھلتے ہیں اور انھیں کے لیے ہم نے دس دن تک اس جھونپڑے میں مزید قیام کیا۔ یہیں میری والدہ بھی مجھ سے ملنے آئیں اور اس فضا سے بہت خوش ہوئیں۔ ہم نے دن کا کھانا بھی انھیں پھولوں کے تختوں میں بیٹھ کر کھایا اور سارا دن وہیں گزارا۔ یون کو یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ اس نے کہا ''ہم بھی ضرور ایسی ہی ایک کٹیا یہاں بنائیں گے بس دس مرلے زمین کافی ہوگی۔ کٹیا کے اردگرد ہم سبزیاں بوئیں گے اور خربوزے بھی ...... تم تصویریں بنانا اور میں کشیدہ کاری کروں گی۔ بس ان دونوں چیزوں سے ہمیں شراب خریدنے کے لیے کافی رقم مل جائے گی اور کھانا پینا تو گھر کا ہوگا۔ اس طرح موٹے جھوٹے سادہ کپڑوں میں، سادہ غذا پر، ہم خوشی خوشی عمر گزار دیں گے اور کہیں آنے جانے کی ضرورت نہ ہوگی'' ...... میں اس سے پوری طرح متفق تھا۔

یہ جھونپڑا اب بھی وہیں ہے۔ مگر وہ جو میرے دل کی گہرائیوں سے واقف تھی اب اس دنیا میں نہیں ...... آہ! زندگی شاید اسی کا نام ہے۔''

4- چٹانیں اور درخت

سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کر کیا رہے ہیں۔ ہم قطار در قطار مربع نما مکان بناتے ہیں اور نہایت سیدھی سڑکیں بناتے ہیں۔ اب کہیں ٹیڑھے میڑھے بازار نظر نہیں آتے پرانے مکان نظر نہیں آتے، باغوں میں

کنوئیں دکھائی نہیں دیتے اور شہروں میں جو ذاتی باغ ہیں بھی وہ باغ تو کیا۔ باغ کا منہ چڑانے کے برابر ہیں۔ ہم نے فطرت کو اپنی زندگی سے بالکل اور بڑی کامیابی سے جلا وطن کر دیا ہے۔ مکانوں کا یہ حال ہے کہ چھتیں عجیب شکل اور ہیئت کی ہوتی ہیں کیونکہ چھتوں سے صرف سر چھپانے کا کام لیا جاتا ہے۔ یوں بھی چھتوں کی باری آتے آتے ٹھیکے دار بھی تنگ آ چکا ہوتا ہے اور وہ اپنا کام جلد از جلد ختم کرنا چاہتا ہے۔ آج کل کے مکانات کھیل سے اکتائے ہوئے بدمزاج بچے کے بنائے ہوئے لکڑی کے ڈبے معلوم ہوتے ہیں۔ مکمل ہونے سے پیشتر ہی جن سے بنانے والے کی طبیعت بھر چکی ہے موجودہ دور کے مہذب انسان کی روح فطرت تیاگ چکی ہے اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب انسان نے درختوں کو بھی مہذب بنانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ اگر ہمیں کبھی یہ یاد آ جائے کہ سڑکوں پر درخت لگانے چاہئیں تو ہم انھیں نہایت سیدھی قطار میں لگاتے ہیں۔ ان پر نمبر لگاتے ہیں، ان پر دوائیں چھڑک چھڑک کر ''جراثیم'' مارتے رہتے ہیں۔ انھیں کانٹ چھانٹ کر ایسی شکلیں اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں جو ہم انسانوں کے نزدیک دلکش اور حسین ہوتی ہیں۔

ویسے ہم پھول بھی لگاتے ہیں مگر اس طرح کہ گھاس کے ایک قطعے میں پھولوں کا تختہ یا تو گول دائرے کی شکل کا ہوگا، ایک ستارا بنا ہوگا، یا کسی حروف تہجی کی شکل کا ہوگا اور جب ہمارے لگائے ہوئے پھولوں کے پودے سیدھی قطار میں نہ اگیں تو ہمیں بڑا صدمہ ہوتا ہے۔ بالکل ویسا ہی صدمہ جو ملٹری اکیڈیمی کے کسی زیر تربیت نوجوان افسر کو قدم ملا کر نہ چلتا دیکھ کر ہمیں محسوس ہو سکتا ہے اور ہم ان بے راہرو پودوں کو قینچیوں سے کاٹتے پھرتے ہیں۔ میں نے پیرس کے پرانے دارالحکومت ورسائی میں یہ غضب بھی ہوتے دیکھا ہے کہ ایک گول دائرے کے گرداگرد یا ایک مستطیل کے چاروں ضلعوں پر مخروطی وضع کے کاٹے ہوئے درختوں کا جوڑا جوڑا اگایا جاتا ہے تا کہ تناسب قائم رہے اور دیکھ کر کوئی فوجی دستہ یاد آ جائے گویا وردی پوش سپاہیوں کو ''منظم'' کرے انھیں بھی سپاہیوں کی طرح ''تربیت یافتہ'' بنائے۔ درختوں کے ان جوڑوں میں اگر ایک درخت ذرا سا اونچا ہو جائے تو ہمارے ہاتھ کھجانے لگتے ہیں کہ ان کی اونچی پھنگیں کاٹ پھینکیں تا کہ ہمارے تناسب کے احساس، ہمارے اختیار اور ہماری شان کو ٹھیس نہ پہنچے، اسے بٹا نہ لگ جائے۔

دوسرے لفظوں میں اب جو بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ فطرت کو اس مصنوعی فضا سے آزاد کرایا جائے اور اسے اس کے صحیح مقام پر واپس لایا جائے۔ یہ مسئلہ کافی دردسری کی بات ہے۔ کیونکہ اگر شہر کے ایک

فلیٹ میں رہنا ہو اور طبع شاعرانہ پائی ہو تو پھر کیا کیا جائے؟......اور پھر اس عمارت کا کیا ہو گا کہ جائیدادیں کرائے پر چڑھی ہیں مگر دیکھنے کو ایک کنواں، ہرے بانسوں کا ایک جھنڈ یا سبز گھاس کا تختہ نہیں......اصل یہ ہے کہ سارا انظام سرے سے اتنا غلط ہے کہ اس کا کوئی مداوا نہیں......اس کی بدولت ہمیں دیکھنے اور عش عش کرنے کو دن میں فلک بوس عمارتیں ملتی ہیں اور رات کو ایک قطار میں روشن کھڑکیاں نظر آتی ہیں......اور رہ ہی کیا گیا ہے؟ ان فلک بوس عمارتوں، راتوں کو قطار اندر قطار جگمگاتے ہوئے ان دریچوں کو دیکھ کر انسان غرور سے پھولتا ہے۔ اپنی تہذیب کی طاقت اور اختیار پر نازاں ہوتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کتنا حقیر اور کس قدر بے قیمت ہے۔ اسی لیے تو میں اس مسئلے کو ناقابل حل سمجھتا ہوں۔

لہٰذا بحث کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر شخص کے پاس کافی زمین ہونی چاہیے۔ حیلوں اور اسباب کو چھوڑیے۔ جو تہذیب انسان کو زمین سے محروم کرتی ہے وہ سراسر غلط ہے۔ فرض کر لیجیے کہ آئندہ کسی تہذیب کے ماتحت ہر شخص کے پاس ایک ایکڑ زمین ہو گی۔ دوسرے لفظوں میں اس ایک ایکڑ زمین کی بدولت اس کے پاس اپنے درخت ہوں گے، اپنے پتھر اور چٹانیں ہوں گی۔ وہ ایسی زمین چنے گا یہاں پہلے سے قد آور، جوان درخت موجود ہوں اور اگر اس رقبے میں ایسے درخت موجود نہ ہوں تو وہ خود ایسے درخت لگائے گا جو بہت جلد بڑھتے ہیں۔ مثلاً بانس اور بید مجنوں کے پیڑ......پھر اسے آج کل کی طرح پرندوں کو پنجروں میں قید کر کے رکھنے کی ضرورت نہیں ہو گی کیونکہ پرندے خود بخود اس کے پاس آیا کریں گے اور وہ یہ انتظام کرے گا کہ ان پرندوں کے لیے آس پاس مینڈک، چھپکلیاں، کیڑے مکوڑے وغیرہ موجود ہوں صرف اسی صورت میں اس شخص کے بچے فطرت کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ سکیں گے اور فطرت کو عجائب خانے کی شیشوں والی الماریوں میں نہیں دیکھیں گے۔ کم سے کم یہ بچے یہ تو جان سکیں گے کہ انڈوں سے بچے کیسے نکلتے ہیں۔ وہ جنس اور جنسی معاملات اور بچوں کی پیدائش کے بارے میں اتنے کم علم اور ناواقف نہیں ہوں گے جس طرح آج کل کے اونچے اور مہذب خاندانوں کے عام بچے ہوتے ہیں۔ یہ بچے چھپکلیوں اور مکڑیوں کی باہمی لڑائی دیکھیں گے۔ کچھ گندے سندے پھریں گے اور خوش رہیں گے۔

چینیوں کو چٹانوں سے جو دلی لگاؤ ہے وہ اسی باب کی دوسری فصل میں عرض کر چکا ہوں۔ اسی کی بنا پر چینی مصوروں کی منظریہ تصویروں میں چٹانیں اور چوٹیاں ضرور دکھائی دیتی ہیں۔ اتنی بات تو سمجھ میں آ گئی۔

لیکن سے یہ وضاحت نہیں ہوسکی کہ چین میں مصنوعی پہاڑیوں کے باغات اور عام چٹانوں سے اتنی رغبت کیوں ظاہر کی جاتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ چٹانیں اتنی عظیم اور ٹھوس ہوتی ہیں کہ ان سے ابدیت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ چٹانیں خاموشی اور سکوت کی مظہر ہیں۔ انھیں حرکت دینا ممکن نہیں۔ ان میں کردار کی وہ قوت اور مضبوطی ہے جو بہت بڑے انسانوں میں ہوا کرتی ہے۔ چٹانیں اپنی مختار و مالک آپ ہیں اور اہل علم لوگوں کی طرح عام زندگی سے دور رہتی ہیں...... چٹانیں ہمیشہ کہنہ و قدیم ہوتی ہیں اور چینیوں کو ہر قدیم اور کہن سال چیز سے بڑی محبت ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آرٹسٹک نقطہ نظر سے چٹانوں میں عظمت اور شوکت ہے۔ ان میں ایک مخصوص کرختگی اور سنگلاخی ہے، ندرت اور یکتائی کی شان ہے۔ چینیوں کے نزدیک چٹانوں میں ''وائی'' کا جذبہ، جس کے لفظی معنی تو پرخطر ہیں مگر یہ لفظ ایسا ہے کہ اس کا ترجمہ ممکن نہیں۔ ذرا ایک اونچی چٹان کا خیال کیجیے جو عام سطح زمین سے ایک دم تین سو فٹ اونچی کھڑی ہو۔ اس میں مخصوص دلکشی ہوتی ہے کیونکہ اس کے ساتھ پرخطر ہونے کا خیال وابستہ ہے۔

مگر اس سے ذرا آگے چلیے۔ ہر روز ہر شخص پہاڑوں کو دیکھنے نہیں جا سکتا۔ گویا پہاڑوں کی چٹانوں کو اپنے گھر میں لے آنا لازم ہوا۔ چنانچہ چین میں یہی وتیرہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مغربی سیاح چین جاتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر چینی خانہ باغ میں پتھروں کے مصنوعی غار، پہاڑیاں اور پہاڑی باغیچے کیوں ہوتے ہیں۔ ان کی تہ میں بنیادی خیال یہ ہوتا ہے کہ اونچی چوٹیوں کی پرخطر سنگلاخی اور کرختگی کا ہلکا سا عکس پیش نظر رہے۔ ان کی عظمت کا نقشہ سامنے ہو۔ اصل میں مغربی سیاحوں کا بھی اتنا قصور نہیں۔ کیونکہ یہ مصنوعی پہاڑیاں عام طور پر بڑی بدذوقی سے بنائی جاتی ہیں اور ان سے کبھی پہاڑوں کی قدرتی عظمت اور شوکت کا خیال ذہن میں نہیں آ سکتا۔ مصنوعی غار اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ بڑے بڑے پتھروں کو سیمنٹ سے چنا جاتا ہے اور اس چنائی میں سیمنٹ صاف نظر آتا ہے۔ لہٰذا بات نہیں بنتی۔ ان مصنوعی پہاڑیوں کے حسن کا تناسب بھی اسی انداز کا ہونا چاہیے جس طرح ایک تصویر میں تناسب اور تفاوت کا خیال رکھا جاتا ہے ان مصنوعی پہاڑیوں سے اور منظریہ تصویروں سے اصل پہاڑوں کے حسن کا جو احساس پیدا ہوتا ہے اس کی نوعیت ایک ہی ہونی چاہیے۔ سونگ خاندان کے عہد میں مصوری فائی نے تو خاص خاص پتھروں کا تفصیلی بیان بھی ایک کتاب میں لکھا ہے اور اسی عہد کے ایک مصنف تو کوآن نے اپنی کتاب میں کوئی سو قسم کے پتھر بتائے ہیں جن سے مصنوعی پہاڑیاں

انسانوں کے مجسموں کی طرح فطرت کے مناظر کے مجسمے تھیں۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر عظیم ننگی چٹانوں کے لیے چینی مصوروں کے دل میں قدر کا یہ احساس پیدا ہو۔اس کے ساتھ ساتھ باغوں میں بھی مصنوعی پہاڑیاں بنانے کا شوق بڑھا اور اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ ان پہاڑیوں کا رنگ کیسا ہو، ان کی ترکیب اور ہیئت اور سطح کیسی ہو اور جب کسی چیز سے ان پتھروں پر ضرب لگائی جائے تو ان سے کیسی آواز پیدا ہونی چاہیے۔ پتھر جتنے چھوٹے ہوتے ان کی ترکیب اور ہیئت اور رنگ پر اتنی ہی زیادہ توجہ دی جاتی۔ چنانچہ نفاست، پتھروں کے رنگ، ان کی خوبی اور ان کی رنگت میں ہلکے اور گہرے ذروں کے امتزاج کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ آگے چل کر ان معمولی پتھروں کے بارے میں ستھرے ذوق کی بدولت سیپ اور یشب کی بنی ہوئی نسوار کی شیشی میں یہی نفاست ملحوظ رکھی گئی چنانچہ کسی عمدہ مہر یا نسوار رکھنے کی شیشی کی قیمت اڑھائی اڑھائی تین تین ہزار روپے تک پڑنے لگی۔

مکانوں کی تعمیر اور باغات میں پتھروں کے استعمال کے بارے میں پورا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں چینی خوش نویسی پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ خوش نویسی بھی خطوط کی ہم آہنگی اور تناسب اور حروف کی ترکیب و نشست کا نام ہے۔ چنانچہ چٹانیں وہ ہیں جو عام زندگی کے دھارے سے ایک رفعت، ایک علیحدگی کا احساس دیکھنے والے میں پیدا کریں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان چٹانوں کے خطوط تناسب کے اعتبار سے بالکل صحیح ہونے چاہئیں۔ خطوط سے مراد سیدھے یا مستقیم خطوط نہیں یا ایک دائرہ یا مثلث مراد نہیں بلکہ فطرت کے بنائے ہوئے کھردرے اور 'سخت کوش' خطوط مراد ہیں...... چینی فلسفی لاؤ تزے نے اسی لیے کہا تھا کہ فطرت کے مظاہر اپنے اصلی روپ ہی میں خوبصورت ہیں اور ان گھڑ پتھر کے حسن و خوبی پر اسی لیے اتنا زور دیتا تھا۔ ہمیں فطرت کی بنائی ہوئی چیزوں میں اپنی طرف سے ترمیم یا تبدیلی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ انسانی کوششوں کے حساب سے بھی بہترین فن پارہ مثلاً کوئی شاہکار نظم یا انشا کا نمونہ وہی ہے جس پر محنت اور عرق ریزی کا گمان تک نہ گزرے۔ وہ ایسی ہی رواں، برجستہ اور فطری چیز نظر آئے۔ جس طرح بل کھاتی ہوئی ندی یا آوارہ پھرتے ہوئے ایک لکہ ابر میں ہمیں فطری حسن اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ یہ قول آرٹ کے تمام پہلوؤں پر صادق آتا ہے گویا فن کی صحیح قدر اور صحیح ذوق یہ ہے کہ بے قاعدگی میں حسن ڈھونڈ لیا جائے۔ ان خطوط میں بھی آہنگ اور حرکت اور رمز کا لطف پا لیا جائے جو بے قاعدہ ہیں۔ اسی لیے بہت سے چینی باغوں میں جو مصنوعی پہاڑیاں اور

ٹیلے نظر آتے ہیں وہ ان گھڑ پتھروں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ پتھر بھی وہ جو جھیلوں اور غاروں میں ملتے ہیں جن میں ننھے ننھے ہزاروں سوراخ ہوتے ہیں اور جن کی ہیئت عجیب ٹیڑھی میڑھی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ شنگھائی اور سوچاؤ کے آس پاس باغوں میں یہ مصنوعی پہاڑیاں ان پتھروں سے بنائی جاتی ہیں جو تائے ہو جھیل میں ملتے ہیں۔ ان پتھروں پر صدیوں پہلے کے سمندری لہروں کے نشان ہوتے ہیں کیونکہ یہ جھیل کبھی سمندر کا ایک حصہ تھی۔ یہ پتھر اس جھیل کی تہ سے نکالے جاتے ہیں اور جب کبھی ان کے خطوط کو ''ٹھیک'' کرنے کی ضرورت سمجھی گئی تو انھیں تراش خراش کر مناسب شکل دی گئی اور سال دو سال کے لیے پھر جھیل میں رکھ دیا گیا تھا تا کہ ان کی سطح سے تراشنے کے نشانات پانی کی لہروں سے مٹ جائیں۔

یہ تو تھی چٹانوں اور پتھروں کے لیے چینی مزاج کی جذباتی کمزوری کی ایک جھلک...... رہے درخت تو ان کے لیے انسان کی پسندیدگی کو سمجھنا آسان تر ہے کیونکہ یہ پسندیدگی عالمگیر ہے۔ جن مکانوں کے اردگرد درخت نہ ہوں وہ عجیب ننگے منگے نظر آتے ہیں، کچھ ایسے ہی جیسے مرد عورت کپڑوں کے بغیر ہوں لیکن مکانوں اور درختوں میں ایک فرق یہ ہے کہ مکان خود تعمیر کیے جاتے ہیں اور درخت زمین کے سینے سے اگتے ہیں اور جو چیز اگی ہے وہ انسانی ہاتھوں سے تعمیر کی ہوئی چیز سے کہیں زیادہ حسین ہوتی ہے۔ ان مکانوں کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ یہ مانا کہ عملی اعتبار سے کچھ مصلحتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر ہمیں مکانوں کی دیواریں اور ان کی مختلف منزلیں بالکل سیدھی تعمیر کرنی پڑتی ہیں...... مگر مکانوں میں مختلف کمروں کے فرش ایک ہی سطح پر کیوں بنائے جائیں؟ کیوں نہ ہر کمرے کے فرش کی سطح دوسرے کمرے سے مختلف ہو؟...... بہر کیف مکانوں کی تعمیر میں مستقیم خطوط اور مربع شکلوں کی یکسانی درختوں کی موجودگی سے بڑی خوبی سے کم ہو سکتی ہے۔ پھر جہاں تک مکانوں کے رنگ کا سوال ہے ہم ان پر سبز رنگ پھیر دیں تو لوگ شاید جینے نہ دیں گے لیکن قدرت کا یہی رنگ ہے اور اس لیے اس نے اپنے درختوں کو ہرے رنگ میں پیدا کیا ہے۔ آرٹ کا کمال یہ ہے کہ ہنرمندی اور کاوش چھپ جائے مگر ہم ہیں کہ نمائش پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے میں مانچو عہد کے زبردست فاضل یوآن یوان کو خراج عقیدت پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ جب اپنے علاقے کا گورنر تھا تو اس نے مغربی جھیل کے عین درمیان ایک چھوٹا سا مصنوعی جزیرہ بنایا مگر اس جزیرے پر اس نے کوئی تعمیر، کوئی ایوان، کمرہ بلکہ کوئی یادگاری مینار تک نہیں بنوایا۔ اس نے ایک معمار کی حیثیت سے اپنی حیثیت کو لازوال بنانے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی

لیکن آج یہ جزیرہ گورنر یوآن کے جزیرے نام سے مشہور ہے اور مغربی جھیل کے سات پانیوں کے عین وسط میں نظر آتا ہے۔ اس جزیرے کا رقبہ مشکل سے کوئی سو گز رہو گا۔ پانی کی سطح سے اس کی اونچائی ایک فٹ سے زیادہ نہیں اور اس میں ہر طرف بید مجنوں کے پیڑ ہیں۔ جب کسی کہر بھرے دن کو اس جزیرے پر نگاہ ڈالیں تو یہ طلسماتی جزیرہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی پانی کے سینے سے ابھرا ہے۔ بید مجنوں کے جھنڈ جھیل کی سطح پر اپنا سرسبز عکس ڈالتے ہیں۔ اس ساکت سطح کی یک رنگی اور یکسانیت کو دور کرتے ہیں اور اس کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ گویا گورنر یوآن کا جزیرہ، فطرت کے ساتھ پوری ہم آہنگی اور مطابقت کا مظہر ہے، آنکھوں پر بار نہیں ہوتا لیکن اسی کے پاس امریکہ کے تعلیم یافتہ ایک صاحب نے روشنی کے مینار کی شکل کا ایک یادگاری مینار تعمیر کر رکھا ہے اور جب بھی میری نگاہیں اس پر پڑتی ہیں تو آنکھوں کے پپوٹوں میں سوزش اور چبھن شروع ہو جاتی ہے...... میں نے اعلانیہ طور پر یہ عہد کر رکھا ہے کہ اگر کبھی میں ڈاکو جرنیل بن گیا (جو کمیونسٹ چین کے قیام سے پہلے عام تھے...... مترجم) اور ہانگ چاؤ پر میرا قبضہ ہو گیا تو میں سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اس مینار کو توپ سے اڑا کر ریزہ ریزہ کر دوں گا۔

درختوں کی قسموں کا شمار نہیں ان میں سے چینی نقادوں اور شاعروں نے صرف چند ایک کو چنا ہے۔ جن کی شکل سے فنی حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان درختوں کی ہیئت اور ان کے خطوط ایسے ہیں کہ وہ چینی خطاطی کے نقطہ نظر سے فنی طور پر بہت ہی خوبصورت ہیں...... بات یہ ہے کہ یوں تو تمام درخت خوبصورت ہوتے ہیں مگر چند ایک درخت ایسے ہیں جن کو دیکھ کر خاص نفاست اور خوبی اور قوت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی ایمائی کیفیت کچھ نہیں سے مخصوص ہے۔ انھیں درختوں کو باقیوں سے ممتاز کر لیا گیا ہے اور ان کے ساتھ مخصوص جذبات وابستہ کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ ظاہر ہے کہ زیتون کے درخت کی ہیئت اور شکل میں کوئی کرختگی نہیں ہوتی۔ ادھر صنوبر کا درخت ہے کہ اس کے سارے خطوط ہی کرختگی اور کھردرے پن کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ بید مجنوں کا درخت اپنے بانکپن کے لیے مشہور ہے۔ اسے کسی عنوان "عظیم الشان" یا "پرشوکت" نہیں کہا جا سکتا۔ گویا چند ہی درخت ایسے ہیں جو تصویروں میں نظر آتے ہیں اور جن کا جمالیاتی حظ اس کی شان اور سربلندی میں مضمر ہے۔ پھر آلوچے کا پیڑ ہے جس میں خاص قسم کا رومانی حسن ہے بانس کا درخت ہے کہ اس کے خطوط بڑے نازک ہوتے ہیں اور اس کو دیکھ کر گھر کا خیال آتا ہے۔ بید مجنوں ہے جس کا بانکپن نازک اور کٹیلی نازنینوں کی یاد دلاتا

ہے۔

صنوبر کے درخت کو دیکھ کر جو سرور دل میں پیدا ہوتا ہے وہ بے حد واضح ہے اور شاعرانہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ درخت دوسرے درختوں کے مقابلے میں بالکل الگ انداز کی عظمت کا حامل ہے کیونکہ درختوں میں بھی (انسانوں کی طرح) عظمت انداز، اور وقار بھی ہوتا ہے اور بے مائیگی اور کم سوادی بھی...... چینی آرٹسٹ ہمیشہ سے صنوبر کی عظمت انداز کے مداح رہے ہیں۔ ان کا مطلب اور ان کی توصیف کا لہجہ وہی ہے جو انگریز نقاد اور شاعر میتھیو آرنلڈ کا ہے۔ جب وہ یونان کے اندھے شاعر ہومر کے انداز کی عظمت اور شوکت اسلوب کے گن گاتا ہے۔ یہ عظمت بیدِ مجنوں کے درخت میں ناپید ہے، اسی طرح جس طرح انگریز شاعر سوبرن کی نغمہ طرازی میں انداز کی عظمت ڈھونڈتی فضول ہے...... اصل یہ ہے کہ حسن کے انداز اور اس کی قسمیں ان گنت ہیں۔ نزاکت میں اپنا حسن ہوتا ہے۔ بانکپن اور لطافت کا اپنا حسن ہے۔ شوکت اور عظمت کا حسن الگ ہے۔ سادگی میں بھی حسن ہوتا ہے۔ کرختگی اور سنگلاخی، قوت اور قدامت ان سب میں بھی اپنا اپنا مخصوص حسن ہے۔ اسی قدمت کی بنا پر صنوبر کے درخت کو باقی سب درختوں میں ایک مخصوص مقام حاصل ہے کیونکہ اس میں گوشہ نشین عالموں کی قدامت پسندی کا پرتو ہے۔ اسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ یہ پرانا فاضل ڈھیلی ڈھالی عبا پہنے، ہاتھ میں بانس کی چھڑی لیے کسی پہاڑی راستے پر جا رہا ہے۔ جس طرح کسی عالم کی عزلت نشینی اور عظمت اسے عام انسانوں کی دنیا میں ایک مثالی انسان بنا دیتی ہے...... وہی حال صنوبر کا ہے۔ لی لی ونگ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ناشپاتیوں اور بیدِ مجنوں کے درختوں سے بھرے ہوئے ایک باغ میں بیٹھنا جہاں آس پاس کوئی صنوبر نہ ہو، ایسا ہے کہ آپ بچوں و رعورتوں کی مجلس میں بیٹھے ہیں اور کوئی بزرگ پاس نہیں جو ہماری رہنمائی کے قابل ہو۔ چنانچہ چینی لوگ صنوبر کو اچھا سمجھنے کے سلسلے میں صنوبر کے کہن سال درختوں پر گویا جان دیتے ہیں کیونکہ جتنا پرانا صنوبر ہوگا اتنا ہی پُر شوکت ہوگا۔ صنوبر کے درخت کے ساتھ دیودار کا بھی نام لیا جاتا ہے۔ جب اس درخت کی شاخوں کا رخ آسمان کی طرف ہو تو یہ امنگ اور جوانی کا اسم نظر آتے ہیں اور جب شاخیں زمین کی طرف مڑی ہوں تو یہی درخت بوڑھے بزرگ بن جاتے ہیں۔

صنوبر کے درخت کو دیکھ کر جو جمالیاتی تسکین ہوتی ہے وہ اتنی اہم اس لیے ہے کہ صنوبر خاموشی اور شوتک اور زندگی کے شور وشغب سے علیحدگی کی علامت ہے یعنی اس میں درویشی کی تمام صفات ہیں۔ اس لیے

چینی تصویروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ چٹانوں کے پاس صنوبر کے سائے میں بڈھے لوگ چپ چاپ کسی سوچ میں مگن ہیں اور ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ اس کے سائے میں کھڑے ہو کر یہ خیال آتا ہے کہ یہ درخت کتنا کہن سال کتنا پرشوکت اور اپنے حال میں کتنا مگن ہے۔ لاؤ نزے کہتا ہے کہ ''قدرت باتیں نہیں بناتی''......صنوبر کا پیڑ بھی باتوں کا قائل نہیں۔ یہ اپنی خاموشی اور اتھاہ سکوت میں سر اٹھائے کھڑا رہتا ہے۔ اپنی رفعت سے یہ ہم پر حقارت کی نظریں ڈالتا ہے، سوچتا ہے میں نے ان گنت بچوں کو ادھیڑ ہوتے اور ادھیڑ لوگوں کو بڈھا ہوتے دیکھا ہے۔ پرانے داناؤں کی طرح یہ پیڑ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور سب کچھ سمجھتا ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ یہی اس کی پراسرار عظمت کا راز ہے۔

آلوچے کے درخت کا رومانی حسن اس کی شاخوں کی ساخت اور اس کے پھولوں کی خوشبو میں پنہاں ہے......عجیب بات ہے کہ شاعرانہ ذوق کی تسکین کے لیے جو درخت چنے گئے ہیں ان میں سے صنوبر، آلوچے اور بانس کے پیڑوں کا تعلق موسم سرما سے رکھا گیا ہے اور انھیں ''سرما کے تین دوست'' کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بانس اور صنوبر تو سدا بہار ہوتے ہیں اور آلوچے کا درخت سرما کے ختم ہونے پر بہار کی آمد آمد کے ساتھ شگوفے لاتا ہے۔ اس لیے آلوچے کا پیڑ خاص طور پر کردار کی پاکیزگی کا مظہر ہے وہ پاکیزگی جو ہمیں سرما کی کراری اور ٹھنڈی ہوا میں ملتی ہے۔ اس کی شان میں سرد مہری نمایاں ہے۔ جتنی فضا ٹھنڈی ہوگی اتنا ہی یہ پھلے پھولے گا۔ دوسرے لفظوں میں خلوت اور تنہائی کی دلنوازی اس کے رگ و ریشہ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ سونگ عہد کے گوشہ نشین شاعر لین ہو چنگ نے اسی لیے کہا تھا کہ میں نے آلوچے کے درختوں سے شادی کر رکھی ہے اور میرا بیٹا ایک بگلا ہے......آج کوشان پہاڑوں میں اس کا حجرہ تنہائی شاعروں اور اہل علم کی زیارت گاہ ہے اور اس کی قبر کے پاس اس کے ''بیٹے'' یعنی بگلے کی قبر ہے۔

آلوچے کی پیڑ کی خوبی اس کی خوشبو ہے۔ اس کی ہیئت پر ایک چینی شاعر نے سات لفظوں کا ایک مصرعہ لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اس کی بھینی باس ہوا میں رچ جاتی ہے اور اس کا سایہ زمین کا سہارا لیتا ہے!''......

بانس کے پیڑ کو اس لیے پسند کیا جاتا ہے کہ اس کا تنا اور اس کے پتے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اسی نزاکت کی بنا پر اس سے لطف اٹھانے کی صحیح فضا، گھر کی مانوس فضا سمجھی جاتی ہے۔ اس کا حسن، مسکراہٹیں بکھیرتا

ہوا حسن ہے اور اسے دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے وہ بڑی معتدل اور ہلکی پھلکی ہوتی ہے۔ بانسوں کو دیکھنے کا لطف اسی وقت ہے جب وہ پتلے اور نازک ہوں اسی لیے وہ تین پیڑ ہی بانسوں کے جھنڈ کا کام دے جاتے ہیں۔ چاہے ان کی عکاسی تصویر کے پردے پر ہو یا جیتی جاتی زندگی میں ان کی موجودگی سے دل کو طراوت دینا مقصود ہو۔ تصویروں میں محض اس کی دو تین شاخیں دکھادی جاتی ہیں اور اس کے پتلے پتلے نازک خطوط چٹانوں کے کرخت خطوط کے ساتھ بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لیے چینی تصویروں میں بانسوں کے چند پیڑوں کے ساتھ دو تین چٹانیں ضرور دکھائی جاتی ہیں اور ان چٹانوں میں بھی لازمی طور پر چھریرا پن ہوتا ہے، موٹائی اور ضخامت نہیں ہوتی۔

رہا بید کا درخت تو یہ ہر جگہ اُگ سکتا ہے، خاص طور پر دریاؤں وغیرہ کے کناروں پر نظر آتا ہے۔ یہ سرتا سر نسائیت کا عکس ہے۔ اسی لیے چیانگ چاؤ نے کہا تھا کہ اس کائنات میں جو چار چیزیں مرد کے دل پر بہت گہرا اثر رکھتی ہیں، ان میں بید کا درخت بھی شامل ہے۔ اس درخت کو دیکھتے ہی مرد جذباتی ہو جاتے ہیں...... چینی خواتین...... کی پتلی کمروں کو ہمیشہ ''بید کی سی کمر'' سے تشبیہ دی جاتی ہے اور چین کی رقاصہ لڑکیاں ڈھیلے ڈھالے دامنوں اور آستینوں والے لباس پہن کر اپنے ناچ میں اسی طرح اپنے جسموں کو لہراتی اور جھکاتی ہیں جیسے بید کی شاخیں ہوا کے جھونکوں میں لہراتی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بید کا پیڑ آسانی سے اُگ آتا ہے۔ اس لیے چین میں بہت جگہوں پر میلوں تک بید ہی بید کے درخت نظر آتے ہیں۔ ان سے جب ہوا گزرتی ہے تو ہوا کی لچک اور بید کی شاخوں کا جھکاؤ مل کر چینی زبان میں ''لیولانگ'' کہلاتا ہے جس کا مطلب ہے ''بید کی لہریں'' یا ''بید کے جھونکے'' ...... اس کے علاوہ بید کی شاخوں اور زرد اور سیاہ پروں والے اوری اول جھولا جھولتے رہتے ہیں۔ اس لیے کیا تصویر، کیا حقیقت بید کو ہمیشہ انھیں پرندوں کے ساتھ دیکھا دکھایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی درخت ہیں جنھیں پسند کیا جاتا ہے اور اس پسندیدگی کی وجوہ بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً دو تونگ کا پیڑ ہے جس کی چھال بڑی عمدہ اور صاف ہوتی ہے۔ چینی لوگ اسے اس لیے بھی پسند کرتے ہیں کہ اس پر چاقو کے ساتھ بڑی آسانی سے شعر کندہ کیے جاسکتے ہیں...... چینیوں کو پرانی اور بڑی بڑی بیلوں سے بھی بڑی محبت ہے جو تناور درختوں کے ساتھ لپٹی رہتی ہیں۔ ان کے لپٹنے کے انداز اور گولائیاں، درختوں کے سیدھے تنوں کے ساتھ ایک عجیب تفاوت پیش کرتی ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ کسی اچھی سی گھنی بیل کو

دیکھ کر سوئے ہوئے اژدہے کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ چنانچہ اس سل کو اسی اژدہے کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اسی باعث یہ کہنہ پیڑ جن کے تنکے مڑے تڑے ہوں یا جھکے ہوں بے حد پسند کیے جاتے ہیں۔ سوچاؤ کے پاس تائے ہو جھیل پر ایک مقام موتو ہے یہاں ایسے ہی چار سرد کے پیڑ ہیں جنھیں پاکیزہ نادر، قدیم اور عجیب کے نام دیے گئے ہیں پاکیزہ نام کے درخت کا تنا بالکل سیدھا اور لمبا ہے اور بالکل چوٹی کے قریب پتوں کی ایک چھتری سی ہے۔ نادر کی یہ شکل ہے کہ اس کے تین ٹیڑھے میڑھے تنے زمین پر زیڈ (Z) کی شکل میں بچھے پڑے ہیں۔ قدیم کی چوٹی پر پتے بہت کم ہیں۔ یہ درخت چوڑا اور کوتاہ قد ہے اور اس کی شاخیں نیم خشک ہیں۔ جس طرح کسی بوڑھے آدمی کی انگلیاں ہوتی ہیں۔ عجیب کا تنا بل کھاتا ہوا ایک مخروط کی شکل میں اپنی اونچی اونچی پھننگوں تک پہنچتا ہے۔

......درختوں کا مزہ لینے اور اس سے لطف اٹھانے کا راز درختوں کی ذات ہی میں مضمر نہیں بلکہ درخت، فطرت کے دوسرے مظاہر مثلاً چٹانوں، بادلوں، پرندوں، کیڑوں اور انسانوں کے ساتھ اپنی وابستگی کی وجہ سے پسند آتے ہیں...... چانگ چاؤ کہتا ہے: ''پھولوں کے پودے لگانے کا مطلب تتلیوں کو دعوت دینا ہے۔ پتھر جوڑ جوڑ کر پہاڑیاں بنانا بادلوں کو بلانے کا بہانہ ہے۔ درخت لگاؤ تو ہوائیں آتی ہیں۔ کیلوں کے درخت بارش کو دعوت دیتے ہیں اور بید کے درخت لگاؤ تو گانے والے طیور آتے ہیں......'' گویا درختوں کے ساتھ آپ پرندوں کے نغموں سے بھی لطف اٹھاتے ہیں۔ چٹانوں کے ساتھ جھینگروں کے سنگیت کا مزہ بھی آتا ہے۔ کیونکہ پرندے وہیں نغمہ ریز ہوں گے جہاں درخت ہوں اور جھینگر وہیں بولیں گے جہاں پانی اور پتھر ہوں۔ چینی لوگ مینڈکوں، جھینگروں اور پرندوں کے نغموں سے جتنا لطف اٹھاتے ہیں اتنی خوشی انھیں بلیوں، کتوں یا ایسے ہی پالتو جانوروں کی محبت سے حاصل نہیں ہوتی۔ جانوروں میں انھیں صرف لق لق سے محبت ہے۔ وہ اس کو اسی زمرے میں جگہ دیتے ہیں جس میں صنوبر و شمشاد کے پیڑ ہیں کیونکہ لق لق بھی گوشہ نشینی کی علامت مانا جاتا ہے۔ کسی لق لق یا بگلے کو کسی تنہا تالاب کی دلدلی زمین میں بے حس و حرکت کھڑا دیکھیے۔ وہ وقار اور خوش وضعی کی تصویر نظر آئے گا...... چینی اہل علم کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ نقل کی یہ خوبیاں ان میں آجائیں۔

انسان کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی اور اس کی پر مسرت زندگی کی آخری تصویر چنگ پانچپاؤ کے لفظوں میں پیش کی جاتی ہے۔ چنگ (1693-1765ء) نے یہ عبارت ایک خط میں لکھی تھی۔ جس میں اس نے

پرندوں کو پنجروں میں قید رکھنے پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا تھا۔ یہ خط اس کے چھوٹے بھائی کے نام ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''میں نے لکھا ہے کہ پرندوں کو پنجروں میں بند کر کے نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے پرندوں سے محبت نہیں لیکن چاہت کا بھی ایک دستور ہوا کرتا ہے۔ پرندے رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ گھر کے اردگرد کوئی سوایک درخت لگا دیئے جائیں اور پرندوں کو ان کی سرسبز چھاؤں میں اپنی ایک الگ بادشاہت قائم کرنے، اپنے گھر بنانے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ چنانچہ جب اس صورت میں جب ہم صبح کو نیند سے بیدار ہوں گے اور ابھی بستر پر کروٹیں ہی بدل رہے ہوں گے تو ہمیں آسمانی نغمے کی طرح پرندوں کے ان گنت چہچہے سنائی دیں گے...... بستر سے اٹھنے کے بعد منہ دھوتے ہوئے یا کپڑے پہنتے ہوئے یا صبح کی چائے پیتے ہوئے ہمیں ادھر ادھر اڑتے ہوئے، پرندوں کے شاندار بال و پر نظر آئیں گے۔ ایک پر نظر نہیں جم جائے گی کہ دوسرا سامنے آجائے گا...... اور یہ وہ لطف ہے جو کسی ایک پرندے کو پنجرے میں بند کر کے رکھنے سے کسی طور حاصل نہیں ہوسکتا۔

زندگی کا لطف عام طور پر، اس انداز نظر سے حاصل کرنا چاہیے گویا یہ کائنات ایک باغ ہے۔ دریا اور جھیلیں اس باغ میں چھوٹے چھوٹے تالابوں کی مانند ہیں اور اس باغ میں ہر ذی روح اپنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرسکتا ہے۔ صرف اسی طرح گہری اور سچی خوشی حاصل ہوسکتی ہے۔ ذرا اس کا مقابلہ اس بے رحمی سے کیجیے جس کے ماتحت پرندوں کو پنجرے میں بند کر کے یا زندہ مچھلیوں کو شیشے کے مرتبان میں رکھ کر ان کے بال و پر، رنگ اور چہچہوں سے لطف حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''

5- پھول اور پھولوں کی ترتیب

پھولوں سے لطف اٹھانے اور پھولوں کی ترتیب کے بارے میں آج کل بڑی بے قاعدگی پائی جاتی ہے۔ حالانکہ جیسا کہ درختوں میں سے ہم نے چند ایک اعلیٰ درجے کے درخت اپنی پسندیدگی کے لیے الگ کر لیے تھے اسی طرح پھولوں کی چند اعلیٰ قسمیں بھی الگ کر لینی چاہئیں اور اپنی پسندیدگی کا آغاز انھیں سے کرنا

چاہیے اس سلسلے میں اپنے آپ میں ان قسموں کی درجہ وار منزلت کا احساس پیدا کرنا ہوگا اور خاص پھولوں کے ساتھ جو مخصوص جذبات اور مخصوص فضا وابستہ ہوتی ہے اس کا احساس کرنا پڑے گا۔ سب سے پہلی بات تو خوشبو کی ہے۔ بعض پھولوں کی خوشبو بہت تیز اور بڑی واضح ہوتی ہے۔ اس کی مثال چنبیلی ہے بعض کی خوشبو بڑی نازک ہوتی ہے۔ جیسے چینی نسترن کی پھر چینی نرگس کی طرح نہایت لطیف اور بے حد نازک و نفیس خوشبو بھی ہوتی ہے...... تو معیار یہ قرار پایا کہ جس پھول کی خوشبو جتنی لطیف ہو اور با آسانی معلوم نہ ہو سکے وہ پھول اتنا ہی ارفع و اعلیٰ سمجھا جائے۔ خوشبو کے بعد دوسرا خیال رنگ، شکل اور پھول کی دلکشی کا ہے۔ ان خصوصیات کے اعتبار سے پھولوں میں بہت زیادہ تنوع ملتا ہے۔ بعض پھول صحت مند جوان لڑکیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بعض بے حد نازک اور شاعرانہ مزاج کی خاموش طبع خواتین کی طرح نظر آتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جیسے تماشائیوں کے لیے اپنے جلوے لٹا رہے ہوں۔ بعض اپنی ہی خوشبو متوالے ہو کر اپنی مختصر زندگی کی گھڑیاں خوابوں میں گزارتے نظر آتے ہیں۔ بعض کا رنگ شوخ ہوتا ہے اور بعض رنگ کے معاملے میں سنجیدہ ذوق کے قائل ہیں...... خوشبو، رنگ اور شکل کے علاوہ ایک اور بات یہ ہے کہ پھولوں کو ہمیشہ آس پاس کی فضا اور کھلنے کے موسموں کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً گلاب کے پھول کا تعلق بہار کے ایک صاف اور چمکیلے دن کے ساتھ ہے۔ کنول کو گرما کی ایک خنک صبح سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ تج کے پھولوں کی سنگت فصلیں کاٹنے کے مہینوں اور موسم خزاں کے جشنوں کے ساتھ ہے۔ گل داؤدی کو خزاں کے آخری دنوں سے وابستہ خیال کیا جاتا ہے۔ آلوچے کے پھول کا ربط برف کے ساتھ ہے اور نرگس اور آلوچے کا پھول دونوں نئے سال کے جشن کا ایک حصہ ہوا کرتے ہیں یعنی ہر پھول اپنے قدرتی ماحول میں ہی مکمل ہوتا ہے۔ اسی لیے جو لوگ پھولوں سے محبت کرتے ہیں ان کے نزدیک پھول مختلف موسموں کی زندہ علامتیں بن جاتے ہیں۔ اس کی مثال ہالی کا پھول ہے جو کرسمس کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

صنوبر اور بانس کے درختوں کی طرح گل داؤدی، کنول اور نسترن کے پھولوں کو ان کی مخصوص خصوصیات کی بنا پر پھولوں میں ممتاز قرار دیا جاتا ہے۔ چینی ادب میں یہ تینوں پھول شرافت اور اعلیٰ نسبی کے مظہر خیال کیے جاتے ہیں۔ خاص طور پر نسترن کو اس کے والہانہ حسن کی وجہ سے بہت پسند کیا جاتا ہے۔ چینی شاعروں کو آلوچے کے پھولوں سے بے حد لگاؤ رہا ہے اور اس پر میں پچھلی فصل میں کچھ باتیں لکھ بھی چکا ہوں۔

آلوبچے کے پھول کو ''پھولوں میں اول'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ نئے سال کے ساتھ آتا ہے اور اس طرح سال بھر میں جو پھول کھلتے ہیں یہ پھول ان کے جلوس کا گویا رہنما ہے۔ پھر بھی پسند اور ذائقے کا اختلاف عام ہے اور شقائق (پی اونی) کے پھول کو بھی ''پھولوں کا بادشاہ'' کہا گیا ہے۔ خاص طور پر تانگ خاندان کے عہدِ حکومت میں یہی پھول سب سے عمدہ اور اعلیٰ مانا جاتا تھا۔ اس کا رنگ شوخ اور پتیاں گھنی ہوتی ہیں اور اسے امیر اور خوش باش شخص کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آلوبچے کا پھول شاعروں کا محبوب ہے کیونکہ یہ خاموش طبع اور غریب اہلِ علم کا مثیل ہے۔ گویا شقائق کا پھول اگر مادیت کا مظہر ہے تو آلوبچے کا پھول روحانیت کا۔ چین کے صرف ایک عالم نے شقائق کے لیے ہمدردی ظاہر کی ہے اور وہ بھی اس بنا پر کہ تانگ خاندان کی ایک ملکہ وو نے اسے اپنے باغات اور دارالحکومت سے جلاوطن کر دیا تھا۔ واقعہ یوں ہوا کہ یہ ملکہ بڑی خود پسند اور مغرور تھی۔ ایک دن اپنے اختیارات کے غرور میں اس نے حکم دیا کہ شاہی باغوں کے تمام پھول ایک خاص وقت تک کھل جائیں۔ یہ عین سردیوں کا زمانہ تھا۔ کہا جاتا ہے صرف شقائق کا پھول اتنا گستاخ ثابت ہوا کہ وہ اس مقررہ وقت سے چند گھنٹے بعد کھلا۔ ملکہ سخت برہم ہوئی اور اس نے اس پھول کے ہزاروں گملوں کو شاہی فرمان کے ذریعے سے اپنے دارالحکومت سیان سے جلاوطن کر کے لویانگ بھیج دیا۔ شاہی نظروں سے گر جانے کے باوجود اس پھول کی ہر دلعزیزی میں کوئی فرق نہ آیا۔ لویانگ کا شہر اس پھول کا گہوارہ بن گیا [illegible]

[illegible] گلاب تو چینی لوگ اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ رنگ اور شکل میں یہ بھی شقائق کے پھول کی طرح ہوتا ہے لیکن شقائق کے پھول کی شان اور رعنائی گلاب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے گلاب زیادہ اہم نہیں رہا۔ چینی ادب اور ثقافت میں شقائق کے پھولوں کی بہت بھرمار نظر آتی ہے۔ مثلاً بہت قدیم زمانے کی کتابوں سے بھی پتا چلتا ہے کہ شقائق کی کوئی نوے قسمیں ہوتی ہیں۔ ہر قسم کو نہایت شاعرانہ نام بھی دیا گیا ہے۔ [illegible]

شقائق کے برعکس نسترن عزلت اور تنہائی کی دلکشی کا مظہر ہے کیونکہ عام طور پر یہ ایسی وادیوں میں ملتا ہے جو الگ تھلگ اور سایہ دار ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ''اپنی دلکشی میں مست رہتا ہے'' اور اسے یہ پروا نہیں ہوتی کہ لوگ اس کی طرف دیکھتے ہیں یا نہیں۔ یہ پھول شہروں میں لائے جانے پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر لایا بھی

جائے تو یہ اپنی شرائط پر ہی پھول سکتا ہے اوران میں ذراسی ترمیم بھی کی جائے تو فوراً سوکھ جاتا ہے اس لیے چینی زبان میں یہ محاورہ عام ہے کہ فلاں حسینہ، نسترن کی طرح عزلت نشین ہے یا فلاں فاضل دنیوی شہرت اور عزت سے بے نیاز، پہاڑ کے کسی پرسکون گوشے میں اگے ہوئے نسترن کے پھول کی طرح خلوت نشین ہے۔ اس کی خوشبو اتنی لطیف ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ اپنی خوشبو سے سونگھنے والے کوخوش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا لیکن جب اس کا ذوق پیدا ہو جائے تو اس سے بڑھ کر دنیا کی کوئی خوشبو لطف اور حسین نہیں ہوتی اسی لیے یہ پھول سچی دوستی کی بھی علامت سمجھا جاتا ہے کیونکہ چین کی ایک نہایت قدیم کتاب میں لکھا ہے کہ ''اگر کسی گھر میں داخل ہوکر نسترن کے پھولوں کے ساتھ کافی دیر رہیں توان کی خوشبو محسوس نہیں ہوتی کیونکہ یہ خوشبو انسان کی ہستی پر اسی غیر محسوس طور پر چھا جاتی ہے جس طرح سچی دوستی۔ لی لی ونگ نے کہا ہے کہ نسترن کے پھولوں سے لطف اٹھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے ہر کمرے میں نہ رکھا جائے بلکہ صرف ایک کمرے میں یہ پھول رہیں اور اس کمرے میں آتے جاتے، ان پھولوں کی نفیس خوشبو سے شام جان کو معطر کیا جائے ......امریکی نسترن میں نفیس اور نازک خوشبو نہیں ہوتی مگر امریکی نسترن چینی نسترن سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کی شکل زیادہ شاندار ہوتی ہے اور اس کے رنگ زیادہ نظر فریب ہوتے ہیں۔ میرے آبائی شہر اور صوبے میں بہترین قسم کا نسترن ہوتا ہے۔ اسے فیوکن کا نسترن کہتے ہیں۔ اس کا رنگ ہلکا سبز ہوتا ہے اور اس میں قرمزی رنگ کے دھبے ہوتے ہیں۔ عام نسترن چھوٹا ہوتا ہے اور اس کی پنکھڑیاں ایک انچ سے ذراسی زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ نسترن کی بہترین قسم کو چن منگ لیانگ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کا رنگ اتنا نفیس ہوتا ہے کہ جب اسے پانی میں ڈبویا جائے تو نظر نہیں آتا۔ اس کا رنگ پانی کے ہم رنگ ہے۔

نسترن کا اگانا بڑا مشکل ہے۔ یہ پھول اتنا نازک اور نفیس ہوتا ہے کہ ہمیشہ اس کے کھلنے سے پہلے مرجھانے یا اس کے بالکل پیدا ہونے کا خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ شاید اسی بنا پر کردار کی نفاست اور عالی ظرفی اس پھول سے وابستہ کی گئی ہے۔ تمام پھولوں میں یہی پھول ہے جو ذراسی بے احتیاطی یا سخت ہاتھ لگنے سے مرجھا جاتا ہے اور بہت جلد ختم ہو جاتا ہے...... اسی لیے جن لوگوں کو اس پھول کا ذوق ہے وہ اس کی ذاتی طور پر نگہداشت کرتے ہیں اور نگہداشت اس جان سوزی سے کرتے ہیں جس طرح اپنے والدین کی خدمت کرتے ہیں۔ اس پھول کا نادر یا قیمتی قسم کا پودا دوسروں کے لیے اتنا ہی باعث رشک ہے جتنا کانسی کا کوئی نادر

بت یا گلدان باعث رشک ہوا کرتا ہے اگر کوئی شخص دوست کی درخواست پر اس کی کونپلیں نہ دے تو سمجھ لیجیے کہ گہری نفرت کا بیج اس کے دل میں بویا گیا۔ چینی روایات میں یہ حکایت موجود ہے کہ اگر چینی عالم کو اس کے دوست نے نسترن کی نئی کونپلیں مانگنے پر نہیں دیں تو اس نے یہ کونپلیں چرالیں اور اس چوری کی پاداش میں قید کی سزا بھگتی...... شن فو نے ''رواں زندگی کے بارے میں چھ باب'' میں ان جذبات کا اظہار بڑی خوبی سے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''نسترن سب پھولوں سے زیادہ محبوب اس لیے ہوتا ہے کہ اس کی خوشبو بھینی اور اس کا حسن بہت پاکیزہ ہے۔ لیکن اس کی عمدہ قسمیں مہیا کر لینا بہت مشکل ہے۔ جب لان پو کا انتقال ہوا تو اس نے مرتے وقت مجھے بہار کے نسترن کا ایک گملا تحفتاً دے دیا تھا۔ اس کی پنکھڑیاں نیلوفر کی پتیوں کی طرح تھیں۔ پھولوں کا مرکزی حصہ بڑا اور سفید تھا۔ پنکھڑیاں بڑی پاکیزہ تھیں۔ اور ڈنٹھل بڑے ہی نازک تھے۔ یہ قسم پرانی اور ٹکسالی تھی۔ میں نے اسے سیپ کے قدیم نوادر کی طرح سینے سے لگا کر رکھا۔ جب میں گھر سے باہر ہوتا تو میری بیوی یون ذاتی طور پر اس کا خیال رکھتی۔ یہ پودا بہت اچھی طرح پھلا پھولا مگر دو ہی برس بعد ایک دن یکا یک سوکھ گیا۔ میں نے کھود کر اس کی جڑیں دیکھیں تو مرمر کی طرح سفید ہو چکی تھیں مگر ان میں کوئی خرابی نہ تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ نادر نسترن کس طرح سوکھ کر رہ گیا۔ میں نے اسے اپنی بدبختی پر محمول کیا کہ قدرت نے مجھے ایسے پھول اگانے اور ان کی نگہداشت کے قابل نہیں سمجھا...... بعد میں مجھے پتا چلا کہ کسی نے اس پودے کے کچھ پھول مانگے تھے جو اسے نہیں دیے گئے تھے۔ اس نے انتقاماً کھولتا ہوا پانی ڈال کر اس پودے کو ہی مار دیا تھا۔''

شاعر تاؤ یوان منگ کا محبوب پھول گل داؤدی تھی اور شاعر لین ہو چنگ کا پسندیدہ پھول آلوچے کا پھول تھا۔ اسی طرح کنفیوشس فلسفے کے ماہر چاؤ لین چی کو نیلوفر سے بڑی محبت تھی...... گل داؤدی کے حسن میں جو شان ہے وہ شائق کے پھول کے حسن سے بہت مختلف ہے۔ اس کی ہزاروں قسمیں پائی جاتی ہیں۔ سونگ عہد کے نامور فاضل فان چنگ تا نے یہ رواج شروع کیا کہ گل داؤدی کی مختلف قسموں کو خوبصورت نام دے

دے کران کو باقاعدہ ریکارڈ رکھا جائے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنوع اور رنگارنگی گل داؤدی کی جان ہے۔اس کے کئی رنگ اوران گنت شکلیں ہیں۔ان میں سے سفید اور پیلے گل داؤدی کو''ٹکسالی قسم'' کہا جاتا ہے۔قرمزی اور سرخ کو ٹکسال باہر کی قسمیں شمار کیا جاتا ہے۔سفید اور پیلے ہونے کی وجہ سے ان قسموں کے بڑے شاعرانہ نام رکھے گئے مثلاً''جام سیمیں''،''سیم خام کی گھنٹی''،''زریں گھنٹی'' وغیرہ......بعض قسموں کو مشہور نازنینوں کے نام سے موسوم کیا گیا مثلاً''یانگ کیوفی'' اور''سی شی''......گل داؤدی کی شکل بدلتی بھی رہتی ہے۔بعض دفعہ یہ خواتین کے چھوٹے چھوٹے بالوں کے فیشن سے مماثل ہوتا ہے اور بعض دفعہ اس کی پنکھڑیاں لمبی لہراتی ہوئی زلفوں پر چغلی کھاتی ہیں۔بعض قسموں میں خوشبو زیادہ ہوتی ہے۔اس کی بہترین قسموں میں مشک کی سی خوشبو ہوتی ہے۔

کنول یا آبی نیلوفر اپنی نظیر آپ ہے......میرے نزدیک یہ دنیا کا حسین ترین پھول ہے یعنی پورے پھول کو اگر دیکھیں جس میں اس کا بانکا ڈنٹھل اور پانی کی سطح پر اس کی تیرتی پتیاں بھی ہیں تو اس کے حسن کا مقابلہ کوئی پھول نہیں کرسکتا......گرمیوں کا مزہ کنول کے بغیر نہیں آسکتا۔اگر گھر کے پاس کنول کے پھولوں کے لیے بڑا تالاب موجود نہ ہو تو یہ پھول پانی کے بڑے بڑے مٹکوں میں اگائے جاسکتے ہیں......اس طرح وہ خوبی تو پیدا نہیں ہوگی۔جو کنول کے پھولوں کے آدھ میل لمبے آبی تختے میں ہوسکتی ہے کیونکہ کھلے پانی میں آس پاس کی ہوا اس کی خوشبو سے شرابور ہوتی ہے۔اس کی سفید اور سرخ کلیاں چوڑے چوڑے سبز پتوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب نظارہ پیش کرتی ہیں اوران پتوں پر پانی کے سفید موتیوں کا حسن تو بیان سے باہر ہے۔سونگ عہد کے مشہور فاضل چاؤ نے ایک پورا مضمون لکھا تھا۔جس میں اس نے تفصیل سے بتایا تھا کہ اسے کنول کا پھول کیوں سب سے زیادہ پسند ہے۔وہ کہتا ہے کہ کنول کا پھول شریف زادے کی طرح گندے پانی سے ملوث نہیں ہوسکتا!......اپنی ماہیت میں یہ قول کنفیوشس کے فلسفے کے عین مطابق مگر افادی زاویہ نگاہ سے بھی کنول کا پھول سرتاپا مفید ہی مفید اس کی جڑ سے ٹھنڈا شربت بنتا ہے۔چوڑے پتوں میں پھل یا پکانے کی چیزیں باندھ کر بھاپ میں پکائی جاسکتی ہیں۔اس کے پھول اپنی خوشبو کے اعتبار بے حد دلنواز ہیں اوراس کے بیج (نیلوفر) کو چینی لوگ حوروں کی غذا قرار دیتے ہیں جسے یا تو بالکل کچا کھانا چاہیے یا خشک کر کے شکر کے ساتھ نوش جان کرنا چاہیے۔

چینی پھول ہائے تا نگ جوسیپ کے شگوفوں سے ملتا جلتا ہے، شاعروں میں بہت مقبول ہے مگر اس کی کئی وجوہ بیان کی جاتی ہیں کہ آخر شاعر تو فو نے اس کا کیوں نام نہیں لیا۔ حالانکہ وہ پھول اس کے وطن میں عام ہے۔ غالبًا یہ وجہ قابل قبول ہو سکتی ہے کہ اس کی ماں کا نام ہائے تا نگ تھا اور اس نے ماں کے نام کے احترام کی وجہ سے اس کا نام نہیں لیا۔

وہ پھول ایسے ہیں جن کی خوشبو کے لیے میں نسترن سے بھی ہاتھ اٹھا لینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ ہیں ترنج کا پھول اور نرگس...... نرگس میرے شہر کا خاص تحفہ ہے۔ کبھی اس کی لاکھوں کی مالیت کی پنیری امریکہ بھیجی جاتی تھی۔ مگر پھر ہمارے محکمہ زراعت نے یہ برآمد بند کر دی...... اس کی جڑیں بڑی سفید، بڑی پاکیزہ اور نتھری ستھری ہوتی ہیں اور پھول کے تو کہنے ہی کیا ہیں۔ چین میں ازے لا کے پھول کو المناک پھول سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس کا حسن سراسر تبسم ہی ہے مگر روایت یہ ہے کہ یہ پھول کوئل کے آنسوؤں سے پیدا ہوا تھا اور کوئل اصل میں ایک ننھا سا لڑکا تھی۔ جسے سوتیلی ماں نے گھر سے نکال دیا تھا اور جو اپنے گمشدہ بھائی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

پھولوں کا انتخاب اور ان کی درجہ بندی جتنی اہم ہے اتنی ہی اہم یہ بات ہے کہ ان پھولوں کو گلدانوں میں کیسے سجایا جائے۔ پھولوں کی ترتیب ایسا فن ہے جو چین میں گیارہویں صدی سے رائج ہے۔ ''رواں زندگی کے بارے میں چھ باب'' کے مصنف نے بتایا ہے کہ پھولوں کی ترتیب اس طرح کرنی چاہیے کہ وہ ایک عمدہ تصویر نظر آئیں۔ اس کتاب کے باب ''زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں'' میں وہ لکھتا ہے:

> ''ہر سال خزاں کے دنوں میں گل داؤدی سے مجھے جیسے عشق ہو جاتا تھا۔ میں ان پھولوں کو سو سو طرح سے گلدانوں میں سجاتا۔ میں انھیں کبھی گملوں میں نہ اگاتا تھا۔ میرے گھر میں اتنی جگہ نہ تھی کہ باغ لگ سکتا اور گملوں میں اگانا زحمت سے خالی نہ تھا بازار سے جو پھول خریدتا وہ قسم کے لحاظ سے عمدہ نہ ہوتے اور مجھے پسند نہ آتے...... خیر، گل داؤد کو گلدانوں میں سجاتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے کہ گلدانوں کی تعداد طاق ہو۔ جفت نہ ہو اور ایک گلدان میں صرف ایک رنگ کے پھول رکھنے چاہئیں۔ گلدان کا منہ کھلا ہونا چاہیے تا کہ پھول آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ رہیں۔ ایک گلدان میں چاہے آدھی درجن

سلیقے کی اہمیت

پھول ہوں یا تیس چالیس یا اس سے بھی زیادہ ہوں، انھیں اس طرح سجانا چاہیے کہ وہ گلدان کے دہانے سے ایک ساتھ باہر نکلیں تاکہ نہ تو پھولوں کی بھرمار ہو، نہ وہ زیادہ بکھرے ہوں۔ نہ گلدان کے منہ پر پڑے ہوئے نظر آئیں۔ اس فن کی اصطلاح میں "پھولوں کے ڈنٹھل پکے رکھنا" کہتے ہیں۔ بعض دفعہ انھیں یوں رکھیے کہ بالکل سیدھے کھڑے رہیں اور بعض کو یوں سجایئے کہ ایک خوشنما چھتری سی بن جائے۔ یکسانیت دور کرنے کے لیے پھولوں میں ان کی کلیاں شامل کیجیے اور اس طرح سجائیے کہ ترتیب میں بے ترتیبی جھلکے، بناوٹ کا شائبہ نہ ہو۔ پھولوں کے ساتھ سخت پتے نہیں ہونے چاہئیں اور ڈنٹھل بھی سخت نہیں ہونے چاہئیں۔ ایک میز پر تین سے لے کر سات گلدان رکھیے۔ ان کی تعداد میز کے سائز پر منحصر ہے کیونکہ اگر ایک میز پر زیادہ گلدان ہوں گے تو میز پر انبار لگا نظر آئے گا۔ جس طرح پھول منڈی میں ہوتا ہے۔ گلدان رکھنے کے پیالے مختلف سائز کے ہوں تو بہتر ہے۔ یہ پیالے تین چار انچ سے لے کر دو تین فٹ کے ہو سکتے ہیں تاکہ مختلف گلدان مختلف اونچائی پر نظر آئیں اور سارے منظر میں متوازن اور ویسی ہی ہم آہنگی پیدا ہو جائے جس طرح کسی تصویر میں ترکیبی اکائی اور وحدت مضمون کا تاثر پیدا کیا جاتا ہے۔ ایک طریقہ یہ دیکھا ہے کہ درمیانی گلدان کو اونچا رکھا جاتا ہے اور اس سے دونوں طرف دو گلدان نیچی سطح پر رکھے ہوتے ہیں یا یہ کہ سامنے نیچی سطح پر ایک گلدان ہو اور اس کے پیچھے ایک کو اونچا رکھا جاتا ہے یا یہ کہ گلدانوں کو تناسب کے اعتبار سے جوڑا جوڑا کر کے رکھا جاتا ہے۔ الغرض سارے دستور ایسے ہیں جنھیں عامیانہ زبان میں "شاندار فضولیات" کہا جاتا ہے۔ تو سب جانتے ہیں کہ گلدانوں کو مناسب جگہ پر رکھنے اور انھیں سجانے کا دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ آپ میں کسی تصویر کے ترکیبی عناصر کو ہم آہنگ کرانے کا مذاق ہے یا نہیں۔

بعض اوقات پھولوں کو کھلے پیالوں میں طشتریوں میں سجایا جاتا ہے۔ ان میں پھولوں کو سنبھالے رکھنے کا عام طریقہ یہ ہے کہ مصفا بروزے کو خاص قسم کی چھال، تیل اور منیرے میں ملائیں اور گرم کر کے پیالوں کو گرم کریں حتیٰ کہ یہ ایک قسم کی سریش بن جائے۔

اس سریش سے تانبے کے ایک ٹکڑے پر چند کیل چھپایئے اس طرح کہ کیلوں کو ٹوپیوں کی طرف سے چپکایا جائے اور اس کی نوکیں کھلی رہیں۔ پھر اس تانبے کے ٹکڑے کو گرم کر کے سریش کے ساتھ پھولوں کی طشتری یا پیالے میں چپکا دیجیے۔ ٹھنڈی ہو جانے پر پھولوں کو ایک ایک کیل کے ساتھ تار سے باندھ دیجیے یا ان کیلوں پر اڑس دیجیے پھولوں کو ایک طرف جھکا رہنے دیجیے۔ عین درمیان سے ان کا سیدھا تن کر کھڑا رہنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ پھولوں کے ڈنٹھل اور اس کے پتے ایک دوسرے کے ساتھ بہت زیادہ ملے ہوئے نہ ہوں۔ پھولوں کو اس طرح باندھنے کے بعد اس پیالے میں کچھ پانی ڈال دیجیے اور نیچے کی تانبے کی پلیٹ کو صاف ریت سے چھپا دیجیے۔ اس صورت میں پھول پیالے کے پیندے سے اگتے ہوئے معلوم ہوں گے۔

پھولدار درختوں کی شاخیں گلدانوں میں سجانے سے پہلے ان شاخوں کو کاٹنا چھانٹنا ضروری ہے۔ کیونکہ آپ خود ایسی شاخیں درخت سے کاٹ کر لانے سے تو رہے اور دوسروں کی لائی ہوئی شاخیں عام طور پر تسلی بخش نہیں ہوتیں۔ بہتر یہ ہے کہ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کو ہاتھ میں لے کر ادھر ادھر گھما کر دیکھیے۔ خیال رکھیے کہ کس طرح سے یہ دیکھنے میں زیادہ تاثر انگیز نظر آتی ہے۔ جب یہ زاویہ طے ہو جائے تو تمام فالتو ٹہنیاں چھانٹ دیجیے۔ یہ خیال رکھیے کہ یہ شاخ نیم شگفتہ اور کچھ عجیب سی خوبی اور تاثر کی حامل بن جائے پھر یہ سوچیے کہ شاخ کا زیریں حصہ گلدان میں کیسے رہے گا، کس زاویے پر جھکا ہو گا تاکہ جب اسے گلدان میں رکھا جائے تو شاخ کے پتے اور پھول عمدہ سے عمدہ تاثر پیدا کریں اگر دو چار شاخوں کو یونہی اٹھا کر ایک گلدان میں ٹھونس دیا جائے تو نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کے ڈنٹھل تنے رہیں گے۔ شاخیں آپس میں ملی ملی رہیں گی، پھول اور پتے غلط زاویوں پر ہوں گے اور کوئی حسن پیدا نہیں ہو گا اگر بالکل سیدھی شاخ کو ذرا سا ٹیڑھا کرنا ہو تو اس کے تنے کے عین وسط میں چاقو وں سے ذرا ایک شگاف دیجیے اور اس میں ننھا سا پتھر پھنسا دیجیے۔ یہ شاخ بڑے انداز سے جھک جائے گی اگر شاخ بہت نرم و نازک ہو تو اس کی جگہ مضبوطی کے لیے ایک دو پن

لگا دیں۔ اس طریقے سے بانس کی شاخیں، گھاس کی عام لمبی پتیاں اور جھاڑیوں کی شاخیں تک گلدانوں میں بھی نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ہرے بانس کی کسی شاخ کے ساتھ گوندنی کی شاخیں یا انگور کی ایک دو شاخیں اور اگر ان کی ترتیب ٹھیک ہو تو نہایت شاعرانہ تاثر پیدا کیا جاسکتا ہے۔''

6- یوآن چنگ لانگ کے گلدان

پھول سجانے کے بارے میں چینی زبان میں بہترین کتاب یوآن چنگ لانگ کی ہے۔ سولہویں صدی کے اواخر کا یہ مصنف کئی اعتبار سے میرا محبوب مصنف ہے۔ پھول سجانے کے بارے میں اس نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ینگ شیہ ہے۔ جاپان میں اس کتاب کی بڑی قدر ہے بلکہ وہاں تو پھولوں کی ایک خاص طرز آرائش ہے جو ''یوآن سکول'' کے نام سے مشہور ہے۔ اپنی کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے کہ خوش قسمتی سے پہاڑ، دریا، پھول اور بانس کے ہرے بھرے پیڑ، شہرت اور اقتدار کے بھوکوں کی زد سے باہر ہیں۔ یہ لوگ پہاڑوں، دریاؤں، پھولوں اور پیڑوں سے لطف اٹھانے کی نعمت سے اپنی مصروفیات کی بنا پر محروم ہو جاتے ہیں لہٰذا قدرت کی مہربانی ہے کہ گوشہ نشین اہل علم کو ان سے لطف اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے بلکہ ان کا تمام تر حسن و خوبی اہل علم ہی کے لیے مخصوص ہے۔ یوآن نے یہ تشریح بھی کر دی ہے کہ گلدانوں میں سجے پھولوں کا لطف اٹھانا کوئی قدرتی چیز نہیں۔ چونکہ جو لوگ شہروں میں رہنے پر مجبور ہیں وہ پودوں پر لگے پھولوں کا لطف اٹھانے سے محروم ہیں اس لیے وہ گلدانوں کے پھولوں پر اکتفا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ گلدانوں سے لطف اٹھانے میں انسان کو پہاڑوں اور جھیلوں کی جنت نظارہ کو بھول نہیں جانا چاہیے جو اصل چیز ہے۔

وہ کہتا ہے کہ اپنے کمرے میں پھول سجانے کے بارے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ بہت سی قسموں کے پھول کمرے میں رکھنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ کمرہ پھولوں سے عاری رہے۔ ان نے ان ابتدائی شرطوں کے بعد بھی تفصیل سے بتایا ہے کہ پھولوں کو کانسی اور مٹی کے کس کس قسم اور کس کس نوع کے گلدانوں میں سجانا چاہیے۔ ان میں دو قسمیں ممتاز کی گئی ہیں، کہ جو لوگ صاحب حیثیت ہوں اور جن کے پاس ہاں خاندان کے وقتوں کے نادر اور منقش گلدان موجود ہوں اور جن کے گھروں میں بڑے بڑے کمرے بھی ہوں انھیں لازم ہے کہ بڑے بڑے پھول اور لمبی لمبی شاخیں بڑے بڑے گلدانوں میں سجا کر رکھیں...... اس کے

برعکس اہل علم لوگوں کے یہاں چھوٹے گلدانوں کے اندر چھوٹی شاخیں اور مختصر پھول ہونے چاہئیں اور ان کا انتخاب بھی نہایت احتیاط سے کرنا چاہیے۔ یوآن نے صرف شقائق اور کنول کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں پھول بڑے ہیں۔ اس لیے ان کو بڑے گلدانوں میں ہی میں رکھنا مناسب ہوگا۔

پھولوں کو گلدانوں میں سجانے میں یوآن کے نزدیک ان باتوں کا خیال رکھنا لازم ہے:

''پھولوں کے سجانے میں زیادہ فراخ دلی اور بخل، دونوں سے احتراز لازم ہے۔ ایک گلدان میں زیادہ سے زیادہ دو یا تین قسم کے پھول رکھے جائیں۔ ان پھولوں کی باہمی بلندی اور پستی میں حسن ترتیب ایسا ہو جیسا کسی عمدہ تصویر میں ہوتا ہے۔ گلدانوں کو جوڑوں میں یا ایک ہی بلندی پر یا ایک ہی سیدھی قطار میں ہرگز نہ رکھیے۔ پھولوں کو دھاگے سے باندھنا بھی نہیں چاہیے۔ کیونکہ پھولوں کا حسن ان کی بے ترتیبی اور ان کے قدرتی انداز ترتیب میں ہے۔ گویا پھولوں کی ترتیب تو سنگ پو کی نثر کی طرح ہے جس کی روانی اپنی ہے اور جو، جہاں چاہتی ہے رک جاتی ہے۔ یا پھر لی پو کی نظموں کی طرح جن میں ضروری نہیں کہ قافیہ بند شعر ہی ہوں پھولوں کی ترتیب میں اصلی نفاست اسی کا نام ہے اگر محض پتے اور شاخیں ہی ایک دوسرے سے مطابقت رکھیں لیکن رنگوں کا لحاظ نہ کیا جائے۔ مثلاً سرخ کو سفید کے ساتھ رکھ دیا تو ترتیب میں نفاست کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے۔

شاخوں کے انتخاب میں یہ لحاظ رکھیے کہ شاخیں اعلیٰ اور نازک ہوں اور ان کو باہم گتھم گتھا کر کے نہ رکھیے۔ اس سلسلے میں یہ بھی خیال رہے کہ کوئی ایک پھول والی شاخ گلدان میں لگائیے اگر دو قسم کی دو شاخیں ایک گلدان میں رکھنی ہیں تو یوں رکھیے کہ دو رنگ کے پھول ایک ہی شاخ پر کھلے ہوئے معلوم ہوں۔ پھولوں کی مناسبت، گلدان کی وضع و رنگ کے ساتھ بھی ضروری ہے۔ پھولوں کے ڈنٹھل اتنے لمبے ہوں کہ گلدان سے چار پانچ انچ بڑے ہوں۔ یوں فرض کیجیے کہ گلدان دو فٹ اونچا ہے اس کی کمر چوڑی ہے اور پیندا بھی چوڑا ہے تو پھر پھول کے ڈنٹھل کی پوری لمبائی دو فٹ چھ انچ یا سات انچ ہونی چاہیے اگر گلدان لمبا اور پتلا ہے تو دو شاخیں لیجیے، ایک لمبی اور ایک چھوٹی، جو اس سے قوس کی شکل میں لہراتی

ہوئی نکلیں۔ اس صورت میں بہتر یہ ہے کہ پھولوں کے ڈنٹھل گلدان کی لمبائی سے کچھ چھوٹے ہوں۔ ایک بات سے ہر حال میں احتراز لازم ہے کہ گلدان، پھولوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اہم نظر آئے۔ پھولوں کا انبار لگا دینا بھی ٹھیک نہیں۔ چھوٹے گلدان میں پھول سجانے کے سلسلے میں خیال رکھیے کہ پھول گلدان سے کوئی دو دو انچ باہر نکلے نظر آئیں لیکن اس کے ڈنٹھل گلدان کی لمبائی سے دو انچ کم ہوں۔ مثلاً آٹھ انچ کے تنگ ساخت کے گلدان میں جو پھول لگائے جائیں ان کے ڈنٹھلوں کی لمبائی چھ انچ ہونی چاہیے لیکن اگر گلدان کی ساخت چوڑائی پر مائل ہو تو پھولوں کے ڈنٹھل اس سے کوئی دو انچ لمبے ہونے چاہئیں۔

جس کمرے میں پھول رکھے جائیں اس میں صرف ایک سادہ میز اور بید کا کوچ ہو۔ میز چوڑی ہو، موٹی اور عمدہ لکڑی کی ہو اور اس کی سطح نہایت صاف اور ہموار ہو۔ منقش میزیں جن کی جدولوں پر مینا کاری ہوئی ہو، سنہرے کام کے کوچ اور دوسٹینڈ جن پر گل بوٹے بنے ہوں ایسے کمرے میں ہرگز نہیں رکھنے چاہئیں۔''

پھولوں کو ''نہلانے'' یعنی ان کو پانی دینے کے سلسلے میں اسی مصنف نے پھولوں کے موڈ اور ان کے جذبات سے جس طرح گہری اور محبت بھری واقفیت کا ثبوت دیا ہے اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''پھولوں پر خوشی اور غم کے موقعے آتے ہیں اور پھولوں کے سونے کا بھی ایک وقت ہوتا ہے اگر پھولوں کو صبح اور شام کو مناسب وقت پر نہلایا جائے تو یہ پانی ان کے لیے ابر رحمت بن جاتا ہے...... ہلکے بادلوں اور ہلکی دھوپ کا دن، غرب آفتاب اور چاندنی، یہ سب ان کی ''صبحیں'' ہیں۔ شدید طوفان، مینہ کے برستے جھالے، سورج کی بے رحم تپش اور شدید سردی...... یہ پھولوں کے لیے ''شامیں'' ہیں...... جب ان کے ڈنٹھل پیاری دھوپ میں نہائیں اور ان کے نازک جسم تیز ہوا سے محفوظ ہوں تو یہ پھولوں کی خوشی کا وقت ہوتا ہے۔ جب وہ مخمور یا خاموش اور تھکے ہوئے نظر آئیں یا جب دن کو کہر بھرا ہو تو یہ پھولوں پر غم کا وقت ہوتا ہے...... اور جب ان کے ڈنٹھل ایک طرف کو جھک جائیں اور اس طرح لچکے

رہیں جیسے وہ سیدھے کھڑے نہیں رہ سکتے تو سمجھ لیجیے کہ پھول سپنوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں۔ جب پھول مسکراتے ہوئے نظر آئیں اور اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے معلوم ہوں تو یہ جانئے کہ پھول نیند سے بیدار ہو گئے......تو گویا ان کی ''صبحوں'' میں انھیں بڑے بڑے خالی ایوانوں میں رکھیے۔ ان کی ''شاموں'' میں انھیں چھوٹے کمروں یا تنہا گوشوں میں رکھیے۔ جب وہ مغموم ہوں تو انھیں چپ چاپ دم سادھے بیٹھنا چاہیے۔ جب خوش ہوں تو انھیں مسکرانا اور شور مچانا اور ایک دوسرے کو ستانا چاہیے۔ جب وہ نیند سے اٹھیں تو انھیں اپنا سنگار کرنا چاہیے۔ یہ سب کچھ اس لیے ضروری ہے کہ پھول خوش وخرم رہیں اور ان کے جاگنے، سونے کے وقت باقاعدہ ہو جائیں۔ ان کی ''صبحوں'' میں ان کا نہلانا سب سے بہتر ہے۔ اس سے دوسرے نمبر پر ''نہلانے'' کا اچھا وقت وہ ہے جب پھول سو رہے ہوں۔ اور سب سے آخری وقت وہ ہے جب پھول خوش ہوں۔ ان کی ''شاموں'' میں انھیں نہلانا یا ان کی غمگینی اور اداسی کے لمحوں میں انھیں غسل کرانا ان کو سزا دینے کے برابر ہے۔

پھولوں کو نہلانے کا طریقہ یہ ہے کہ چشمے کا تازہ اور میٹھا پانی لیجیے اور اسے دھیرے دھیرے ان پر ٹپکایئے۔ جس طرح ایک ہلکی بوچھاڑ یا پھوار کسی بدمست شخص کو جگانے کے لیے اس پر ڈالی جاتی ہے یا جس طرح ہلکی شبنم رات کو پودوں پر کے پھولوں کے نازک جسموں کے رگ و پے میں آہستہ آہستہ رچتی جاتی ہے۔ پھولوں کو ہاتھ سے چھونا نہیں چاہیے، نہ انھیں انگلیوں سے توڑنا چاہیے۔ یہ کام بے وقوف نوکروں یا گندی ماماؤں پر چھوڑنا بھی ٹھیک نہیں ......آلوچے کے پھولوں کو گوشہ نشین اہل علم نہلائیں تو بہتر ہے۔ ہائے تانگ کے پھولوں کو خوش رو اور خوش خو مہمان غسل دیں۔ شقائق کے پھولوں کو خوبصورت لباس والی نوجوان لڑکیاں، انار کے شگوفوں کو مہ جبین لونڈیاں، تیج کے پھولوں کو ذہین بچے اور کنول کے پھولوں کو دل ربا داشتہ عورتیں نہلائیں۔ گل داؤدی کو غسل دینا ان اہل کمال کا فرض ہے۔ جنھیں قدیم بزرگوں سے محبت ہو مگر جو پھول سرما میں کھلیں انھیں نہلانا نہیں چاہیے بلکہ

انھیں ریشم کی پتلی جالی اڑھا کر رکھنا چاہیے۔''

یوآن کا خیال ہے کہ پھول اور دوسرے پھولوں کے ساتھ ایک گلدان یا ظرف میں ان کے ''معاون'' یا ان کی ''لونڈی'' بن کر مناسب نظر آتے ہیں..... قدیم چین کی ایک معاشرتی خصوصیت یہ بن گئی تھی کہ کسی عالی خاندان کے ساتھ اس کی لونڈی عمر بھر نباہ کرتی تھی۔ اسی بنا پر یہ تصور پیدا ہوا کہ خوبصورت خواتین اسی وقت حسن کا مکمل نمونہ نظر آتی ہیں جب خوش گل لونڈیاں بھی لازم طور پر ان کی جلو میں ہوں۔ گویا شرط یہ ٹھہری کہ بیگمات اور لونڈیاں دونوں حسین ہوں مگر اس میں ذرا سا یہ بل تھا کہ بعض قسم کا حسن اور دلربائی، بیگم سے نہیں لونڈیوں سے مخصوص سمجھی جاتی تھی۔ جو لونڈیاں اپنے انداز اور اپنی صورت کے اعتبار سے اپنی بیگمات کے ساتھ اچھی نہ معلوم ہوتیں ان کی مثال ایسی تھی جیسے شاندار محل کے ساتھ بڑے اصطبل جوڑ دیے گئے ہیں..... یوآن نے اسی تصور کو پھولوں کے ساتھ بھی وابستہ کر دیا۔ اس نے قرار دیا کہ آلوچے کا پھول بیگم ہے اور اس کی لونڈی ''سدا بہار'' کا پھول ہے۔ ہائے تنگ کی لونڈی کا منصب سب کے شگوفوں اور سوسن کو حاصل ہے۔ یوآن نے اسی طرح شقائق اور گیندا اور باقی پھولوں (بیگمات) کے ساتھ ان کی ''لونڈیوں'' کی تخصیص کر دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر ''لونڈی'' کا اپنا انداز دلفریبی ہے اور وہ دلبری اور سحر طرازی میں اپنی ''بیگمات'' کی طرح ایک سے ایک الگ ہیں..... اس تقسیم سے یہ مراد نہیں کہ ان ''لونڈی'' قسم کے پھولوں کو ادنیٰ درجے کا شمار کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ پھول ان خادماؤں سے مقابلہ کرتے ہیں جو تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً نرگس، آسمانی دوشیزہ کی لونڈی لیا تنگ کی طرح سراسر آسمانی حسن کا مرقع ہے۔ اسی طرح گلاب اور سدا بہار، شیہ اور یانگ جیسے عالی مرتبت خاندانوں کی لونڈیوں سیا تنگ فنگ اور چنگ وان کی طرح شاداب اور جوان ہیں۔ اور شان فان کا پھول اسی طرح نفیس اور رومانی انداز کا ہے جس طرح مشہور راہبہ اور شاعرہ یوسوآنچی کی خادمہ تھی۔

یوآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جو شخص کسی شعبے یا کسی کام میں کمال پیدا کرتا ہے (چاہے وہ شطرنج کھیلنے کا کمال ہی کیوں نہ ہو) وہ اس کام سے جنون کی حد تک محبت کرتا ہے۔ یوآن نے اس بنیادی حقیقت کو پھولوں کی پسندیدگی اور پھولوں سے محبت کرنے کے سلسلے میں یوں منطبق کیا ہے:

''میں نے دیکھا ہے کہ جو لوگ گفتگو میں پھسڈی اور دیکھنے میں برے ہیں وہی لوگ ہیں جن کا کوئی مشغلہ نہیں ہوا کرتا اور جنھیں کسی چیز کا شوق نہیں ہوتا۔ قدیم بزرگوں کا یہ حال تھا

کہ اگر سن پاتے کہ فلاں جگہ پھولوں کی کوئی نادر قسم موجود ہے تو وہ بلند پہاڑیاں اور گہرے گھڈوں کو طے کرنے کی صعوبتیں خوشی سے برداشت کرتے۔ انھیں تھکن، گرمی یا سردی کا کوئی خیال نہ ہوتا۔ وہ اپنے جسموں سے بے پروا، کیچڑ اور مٹی میں لت پت سفر کرتے رہتے۔ جب کسی پودے میں کلیاں پھوٹتیں تو یہ پرانے قدر دان اس پودے کے پاس چار پائی بچھا کر سوتے یا اسی پودے کے نیچے محض ایک تکیہ لے کر آرام کرتے اور یہ دیکھتے رہتے کہ پھول، نو خیز کلی سے لے کر شگفتہ اور جوان ہونے تک کن منزلوں سے گزرتا ہے اور پھر کیسے اس پر کملاہٹ رفتہ رفتہ چھاتی ہے اور یہ بالکل مردہ کب ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ ان میں سے تھے جو یا تو ہزاروں قسم کے پھول اپنے باغوں میں لگائیں گے اور یہ مطالعہ کریں گے کہ ان میں کیا کیا اختلاف، کیا کیا مشابہت ہے یا اپنا شوق پورا کرنے کے لیے اپنے کمرے میں مختلف قسم کے پھول رکھیں گے۔ ایسے بھی لوگ تھے جو سونگھ کر پھول کا سائز بتا دیتے تھے اور بعض لوگ تو پودوں کی جڑیں دیکھ کر حکم لگا سکتے تھے کہ اس پودے پر کس کس رنگ کے پھول آئیں گے۔ یہ لوگ پھولوں کے سچے شیدائی اور اصلی قدر دان تھے۔''

پھولوں کی قدر دانی کے بارے میں وہ لکھتا ہے:

''پھولوں کا لطف چائے پینے کے وقت آتا ہے۔ اس کے بعد گفتگو کا نمبر ہے اور آخری درجے پر شراب ہے کہ مے نوشی کے ساتھ پھولوں کا مزہ ہے۔ ہر قسم کا بے مطلب شور وغوغا اور عامیانہ قسم کی فضول گفتگو پھولوں کی توہین ہے اور پھولوں کو ناراض کرنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ بے وقوف بن کر چپ چاپ بیٹھے رہو۔ پھولوں کا مزہ لینے کے لیے مناسب جگہ اور مناسب وقت ہوتا ہے۔ مناسب فضا اور حالات کے بغیر پھولوں سے لطف اٹھانے کی کوشش کرنا پھولوں کی بے حرمتی کرنا ہے۔ سرما کے پھولوں کا لطف برفباری کے آغاز میں آتا ہے یا جب برف گرنے کے بعد مطلع کھل گیا ہو یا جب چاند تازہ تازہ نکلا ہو یا پھر ان پھولوں کا مزہ گرم کمرے میں آتا ہے۔ بہار کے پھولوں کا لطف صاف دنوں یا ذرا سے خنک دنوں میں کسی خوبصورت کمرے میں آتا ہے۔ گرما کے پھولوں سے بارش کے بعد،

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں، عمدہ درختوں یا بانس کے پیڑوں کے سائے تلے، یا لب آب جو لطف اٹھانا چاہیے۔ موسم خزاں میں خنک چاندنی یا سنگین کمرے کے ایک سرے پر بیٹھ کر باغ کی کسی پگڈنڈی پر بیٹھ کر یا سنگین چٹانوں اور بیلوں کے پاس بیٹھ کر پھولوں کا لطف اٹھانا چاہیے اگر آپ پھولوں کو اس وقت دیکھیں جب آپ کو ہواؤں، سورج اور مختلف مقامات کو موزونی کا کیال کوئی نہ ہو یا آپ کے خیالات کہیں اور ہوں تو پھر سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ پھر قحبہ خانوں اور شراب خانوں کی فضا میں پھولوں کا ''لطف اٹھانے'' کی کوشش کرنے اور اس حالت میں کیا فرق رہ گیا؟''

یوآن نے اپنی کتاب میں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ شرطیں اور ''حالات'' کیا ہیں جن سے پھول خوش ہوتے ہیں۔ یہ 14 نکات ہیں پھر اس نے وہ 23 نکات بھی بیان کیے ہیں جن سے پھولوں کی توہین ہوتی ہے...... پہلے پھولوں کے لیے پسندیدہ ماحول کی 14 شرائط ملاحظہ ہوں:

☆ روشن دریچہ،
☆ صاف کمرہ،
☆ قدیم تپائیاں،
☆ سونگ عہد کے خاص پتھر،
☆ شمشاد کے درختوں پر ہوا کی لہریں اور دریا کا ہلکا شور،
☆ گھر کا مالک مشغلوں کا رسیا اور شعر وسخن کا شیدائی ہو،
☆ وہ چلتا پھرتا درویش اس گھر میں آئے جسے چائے کا صحیح ذوق ہو،
☆ چن چاؤ شہر کا باشندہ عمدہ شراب لے کر اس جگہ آئے،
☆ کمرے میں جو مہمان موجود ہوں وہ نہایت نفیس مزاج اور صورت دار ہوں،
☆ بہت سے پھول پوری طرح کھلے ہوں،
☆ گھر میں ایسا دوست آیا ہو کہ رنج اس کے پاس نہ پھٹکے،
☆ گھر کے لوگ ان پرانی کتابوں کی نقلیں تیار کریں جن میں پھولوں کی کاشت کا ذکر ہو،

☆ رات کے پچھلے پہر تک چائے کی کیتلی گنگناتی رہے،

☆ گھر کی بیوی پھولوں کی کہانیاں مرتب کرتی ہو۔

اب ذرا وہ حالتیں ملاحظہ ہوں(1) جو پھولوں کی ناراضگی اور توہین کا موجب بن سکتی ہیں:

☆ گھر کا مالک ہمہ وقت مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگا رہے،

☆ کوئی بے وقوف نوکر گلدان میں کچھ اور پھولوں والی شاخیں اڑس دے اور پھولوں کی ساری ترتیب خراب کر دے،

☆ گھر میں آمد و خرچ کے حسابات کیے جائیں،

☆ گھر میں کوئی شخص ایسا ہو جو قافیے ،لغت کی کتاب سے دیکھ دیکھ کر تک بندی کرتا ہو،

☆ گھر میں ادھر ادھر کتابیں بری حالت میں بکھری پڑی رہیں،

☆ عام قسم کے عبادت گزار بھی معروفت کی باتیں کریں،

☆ دریچے کے باہر کتے لڑتے رہیں،

☆ آوارہ لڑکے گلی میں گاتے پھریں،

☆ باہر سے عامیانہ گانوں کی آواز آتی رہے،

☆ بدصورت عورتیں پھول توڑ توڑ کر انھیں اپنے بالوں میں سجائیں،

☆ پھولوں کی موجودگی میں لوگ منصبی ترقی اور تنزل کی بات چیت کریں،

☆ پھولوں کی موجودگی میں جھوٹا اظہار محبت کیا جائے،

☆ پھولوں کی موجودگی میں فرمائشی نظمیں کہی جائیں،

☆ پھول کھلنے کا موسم آجائے اور مالک مکان نے اپنے قرض نہ اتارے ہوں،

1- چینی ادبا، معمولی حساب کی پروانہیں کرتے تعداد کا جب ذکر کرتے ہیں تو تخمینہ اور اندازہ ہی سامنے رکھتے ہیں۔ میں نے یوآن کی اس کتاب کے قریب قریب ہر اس نسخے کو دیکھا جو مجھے دستیاب ہوگا۔لیکن یہ 23 نکات گنتی میں پورے نہ ہو سکے اور پھر گنتی اتنی اہم چیز بھی نہیں۔ کیونکہ حسابی تعین چھوٹے ظرف اور گھٹیا دماغ کو ہی ستاتا ہے۔عالی ظرف لوگ اس کی پروانہیں کرتے۔(مصنف)

☆ پھولوں کے سامنے کیا نگ سو کی جعلی اور نقلی تصویریں رکھی جائیں،
☆ پھولوں کے سامنے چوہے اپنی منحوس تھوتھنیاں دکھائیں،
☆ کمرے میں کیڑوں کے رینگنے کے گندے نشانات ہوں،
☆ پھولوں کی موجودگی میں بدتمیز نوکر کمروں میں لیٹے رہیں،
☆ شراب کی محفل میں تفریحی کھیل شرع ہوں اور شراب ختم ہو جائے،
☆ اس کمرے میں پھول رکھے جائیں جو شراب کی دکان کا ہم دیوار ہو،
☆ کمرے میں ایسے قصیدے آویزاں ہوں جن میں جھوٹی خوشامد کی گئی ہو۔

7- چانگ چاؤ کے مقولے

یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ فطرت کے مظاہر سے لطف اٹھانا صرف آرٹ اور مصوری تک محدود نہیں۔ کیونکہ فطرت انسان کی ساری زندگی میں حصہ گیر ہے۔ فطرت کل آوازوں، رنگوں، صورتوں، کیفیتوں اور فضاؤں کا مجموعہ ہے۔ انسان، مشاہدہ کرنے والا یہ فن کار اپنی طبیعت کے مطابق فطرت کا کوئی منظر، اس کی کوئی آواز اس کا کوئی رنگ ڈھونڈ لیتا ہے جو اس کی طبیعت کے ساتھ میل کھائے اور پوری طرح اس سے ہم آہنگ ہو جائے۔ چین کے نثر نگاروں اور شاعروں کا فطرت کے بارے میں یہی نظریہ ہے۔ میرے نزدیک اس نظریے کا بہترین اظہار چانگ چاؤ کے اقوال، اس کی انشا میں ملتا ہے۔ سترہویں صدی کے درمیانی برسوں کا یہ ادیب اپنی کتاب یومن جنگ (میٹھے سپنوں کے سائے) میں اسی انداز نظر کے شاہکار پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب ادبی مقولوں کا مجموعہ ہے۔ ایسے کئی اور مجموعے بھی چینی زبان میں ملتے ہیں۔ مگر چانگ چاؤ کا کوئی حریف نہیں۔ اس کی یہ کتاب چینی ادب میں اتنی مقبول ہے کہ بہت سے چینی عالموں نے اس پر اسی کے انداز میں حاشیے لکھے ہیں اور یہ حاشیے بھی شگفتگی اور سادگی کے شاہکار ہیں۔ میں آپ کے سامنے چانگ چاؤ کے بہترین مقولوں کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ یہ مقولے خاص طور پر فطرت کے مظاہر کا لطف اٹھانے سے متعلق ہیں...... انسانی زندگی کے بارے میں بھی اس کے کچھ مقولے بڑے خوبصورت ہیں اور میرے موضوع سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے میں آخر میں ان کا ترجمہ بھی درج کر رہا ہوں۔

کیا کیا مناسب ہے

یہ بے حد ضروری ہے کہ پھولوں کے پاس تتلیاں، پہاڑوں سے چشمے اور جھرنے پھوٹیں اور چٹانوں پر کائی کی تہیں ہوں۔ اونچے درختوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی بیلیں لپٹی ہوں اور ہر انسان کسی نہ کسی مشغلے کا مالک ہو، کوئی نہ کوئی شوق رکھتا ہو۔

پھولوں کے پودے لگانا تتلیوں کو قریب آنے کی دعوت دینا ہے۔ چٹانوں کے انبار لگادیں تو بادل آتے ہیں۔ شمشماد اور صنوبر کے درخت لگائیں تو ہواؤں کو آنے کا موقع ملتا ہے۔ پانی کا تالاب بنائیں تو مرغابیوں کے چھپنے کے لیے سرکنڈے اگنے کا سامان ہو جاتا ہے۔ کیلے کا درخت بارش کے لیے دعوت نامہ ہے اور بیدِ مجنوں کا پودا لگانا نغمہ سنج پرندوں کو بلانے کا بہانہ ہے۔

کسی مینار کی چوٹی پر چڑھ کر پہاڑیوں کو دیکھیں تو ان کے متعلق اس وقت ہمارا تاثر بالکل مختلف ہوگا۔ شہر پناہ سے برفباری کو دیکھنا، شمع کی روشنی میں سے چاند کو دیکھنا، کشتی میں بیٹھ کر رنگین بادل دیکھنا، کمرے میں کسی خوبصورت عورت کو دیکھنا عام حالات کی بہ نسبت بالکل مختلف جذبات پیدا کرتا ہے۔

آلوچے کے پیڑ کے پاس جو چٹانیں رکھی جائیں وہ اگر دیکھنے میں بڑی پرانی معلوم ہوں تو مناسب ہے۔ جو چٹانیں صنوبر کے درخت کے پاس ہوں وہ دیکھنے میں سیدھی سادی نظر آنی چاہئیں۔ بانسوں کے پیڑ کے پاس چٹانیں کچھ لمبی اور ''چھریری'' معلوم ہوں تو ٹھیک ہے اور پھولوں کے بڑے گملے میں پتھر کے جو ٹکڑے رکھے جائیں وہ نہایت خوبصورت معلوم ہونے چاہئیں۔

سرسبز پہاڑیوں سے نیلا پانی آتا ہے کیونکہ یہ پانی انھیں پہاڑیوں سے اپنا رنگ مستعار لیتا ہے۔ عمدہ شراب اچھی نظمیں پیدا کرتی ہے کیونکہ شاعری شراب سے وجدان حاصل کرتی ہے۔

آئینہ کسی بدصورت کا سامنا کرتا ہے، کوئی نایاب پتھر جب کسی فضول اور بازاری شخص کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور جب عمدہ تلوار کسی گھٹیا جرنیل کے ہاتھ میں آتی ہے تو ان حالات کا کوئی مداوا نہیں ہوسکتا۔

ii- پھول اور عورتیں

پھولوں کو کملاتے، چاند کو افق کی گہرائی میں ڈوبتے اور خوبصورت عورتوں کو جوانی میں مرتے دیکھنا نہیں چاہیے۔

پھولوں کو اس وقت دیکھنا چاہیے جب وہ پوری طرح شگفتہ ہوں۔ چاند کے پورے ہونے کا انتظار کر کے اسے کامل صورت میں دیکھنا چاہیے۔ کتاب لکھنی شروع کرو تو اس کی تکمیل کا مرحلہ بھی دیکھو۔ اور مہ لقا عورتوں کی دید کا صحیح وقت وہ ہے جب وہ خوش ہوں ورنہ سارا مزہ ہوا ہو جاتا ہے۔

حسین عورتوں کو صبح کے وقت سنگار کرتے دیکھو جب انھوں نے رخساروں پر غازہ مل لیا ہو۔

ایسے چہرے بھی ہوتے ہیں جو بدصورت ہونے کے باوجود نظروں پر بار نہیں گزرتے۔ ایسے چہرے بھی ہیں جو کریہہ تو نہیں ہوتے لیکن ان کی طرف دیکھا نہیں جا سکتا۔ ایسی تحریریں بھی ہیں جو گرامر کی پابند نہ ہوتے ہوئے بھی بڑی پیاری اور دلآویز ہوتے ہیں۔ اور ایسی تحریریں بھی ہیں صرف ونحو کے اعتبار سے بالکل درست ہوتی ہیں لیکن ان سے گھن آتی ہے۔ یہ نکتہ سطحی لوگوں کو کیونکر سمجھاؤں؟

اگر آپ پھولوں سے بھی اسی طرح پیار کریں جس طرح حسین عورتوں کو چاہا جاتا ہے تو پھولوں میں خاص دلآویزی محسوس ہونے لگے گی اور اگر حسین عورتوں سے اسی طرح پیار کیا جائے جس طرح پھولوں سے کیا جاتا ہے تو انسان کے دل میں خاص قسم کی نزاکت احساس، نرمی اور شفقت پیدا ہو جائے گی۔

حسین عورتیں پھولوں سے کہیں بہتر ہیں کیونکہ وہ انسان کی زبان تو سمجھتی ہیں اور پھول حسین عورتوں سے اچھے ہیں کہ خوشبو دیتے ہیں اگر ایک ہی وقت میں یہ دونوں حاصل نہ ہو سکیں تو خوشبودار حسن کے بجائے متکلم حسن کو ترجیح دیجیے اور اسے اپنائیے۔

اگر پھولوں کو گہرے قرمزی رنگ کے ظروف اور گلدانوں میں سجانا ہے تو اس طرح سجائیے کہ گلدانوں کے سائز اور ان کے رنگ اور ان کی بلندی سے پھولوں کو مناسبت ہو اور ان کا رنگ پھولوں کے رنگ کے عین الٹ ہو۔

بہت سے پھول دلفریب اور حسین ہوتے ہیں مگر ان میں خوشبو نہیں ہوتی۔ جن پھولوں میں پتیوں کی تہوں پر تہیں ہوں وہ عام طور پر بناوٹ کے اعتبار سے خوش منظر نہیں ہوتے۔ افسوس ہے کہ کامل چیز بہت

نایاب ہے۔صرف کنول کے پھول میں یہ دونوں خوبیاں یکجا ہوگئی ہیں۔

آلوچے کا پھول انسان کو عالی خیال بناتے ہیں۔نسترن تنہائی کا احساس دلاتا ہے۔گلِ داؤدی ہمیں سادہ مزاج بناتا ہےاور کنول کو دیکھ کر انسان میں اطمینان کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔بہار میں کھلنے والا ہائے تانگ شہوانی جذبات پیدا کرتا ہے۔گل شقائق آدمی کے دل میں عورت کا احترام اوراس کی قدر پیدا کرتا ہے۔بانس اور کیلے کے پیڑ انسان کو دلنواز بناتے ہیں۔خزاں کا ہائے تانگ انسان میں بانکپن پیدا کرتا ہے۔صنوبر کا درخت انسان کے دل میں گوشہ نشینی کے خیالات کو جگہ دیتا ہے۔بید مجنوں آدمی کو جذباتی بنا دیتا ہے۔

اگر کسی مہ لقا عورت کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ، اس کی آواز پرندے کی طرح نغمہ ریز، اس کی روح چاند کی طرح حسین اوراس کے چہرے مہرے، چال ڈھال میں بید مجنوں کا سا بانکپن اور لچک ہو، اس میں وہ دلفریبی ہو جو خزاں کے موسم میں اتھاہ جھیلوں میں نظر آتی ہے، اس کی ہڈیاں سیپ کی طرح رنگین اوراس کی جلد برف کی طرح سفید اور پاکیزہ ہواوراس کا دل شعر کی طرح لطیف ہو تو میں مکمل طور پر مطمئن ہو جاؤں۔(چینی عالموں کی طرح اوراس کتاب پر حاشیہ لکھنے والوں کی طرح میں بھی یہ کہوں گا کہ ''میرا بھی صاد ہے بالکل بجا فرمایا آپ نے!''......مصنف)

اگر اس دنیا میں کتابیں نہ ہوتیں تو خیر دوسری بات تھی مگر کتابیں چونکہ موجود ہیں اس لیے ان کا پڑھنا ضروری ہے۔اگر دنیا میں شراب نہ ہوتی تو کیا کہا جاسکتا تھا مگر دنیا میں چونکہ شراب موجود ہےاس لیےاسے پینا چاہیے۔اگر دنیا میں مشہور پہاڑ نہ ہوتے تو بات اورتھی مگر اب کہ یہ پہاڑ موجود ہیں تو ان کو جا کر دیکھنا لازم ہے۔ اگر دنیا میں پھول اور چاند نہ ہوتے تو کچھ کہنے کی کوئی گنجائش نہ تھی مگر دنیا میں پھول بھی ہیں اور چاند بھی اس لیے دونوں کا لطف اٹھانا چاہیے۔اگر دنیا میں صاحبِ کمال اور ذی فہم مرد اور حسین عورتیں نہ ہوتیں تو کیا عرض کیا جاسکتا تھا لیکن دونوں کا وجود چونکہ اس دنیا میں ہے اس لیے ان عورتوں سے محبت اور ان مردوں کی حفاظت لازم ہے۔

آئینہ بدصورت عورتوں کا دشمن کیوں نہیں؟ اس لیے کہ آئینہ جذبات سے عاری ہے۔اگر اس میں جذبات ہوتے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے۔

گملے میں لگا لگایا اچھا پھول خریدیں تو اس کے لیے بھی دل میں جگہ ہوتی ہے۔تو پھر ''متکلم پھولوں''

(عورتوں) کے لیے دل میں کتنی جگہ، کتنی نزاکت احساس ہونی چاہیے؟

شراب اور شعر کے بغیر پہاڑوں اور چشموں کا وجود بیکار ہوتا ہے۔ خوبصورت عورتوں کی موجودگی کے بغیر پھول اور چاندنی، دونوں بے مصرف تھے۔ وہ لوگ جن میں جوہر ہو اور جنھیں خدا نے حسن صورت بھی عطا کیا ہو، اور وہ خوبصورت عورتیں جو عالم بھی ہوں کبھی زیادہ عمر نہیں پاتیں۔ نہ صرف اس لیے کہ دیوتا ان سے حسد کرتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ ایسے لوگ ایک نسل کے لیے اور ہر زمانے اور ہر دور کے لیے بھی مایہ ناز ہوتے ہیں۔ اس لیے خدا انھیں دنیا میں زیادہ دیر رہنے نہیں دیتا مبادا ان کی توہین یا بے حرمتی ہو۔

iii- پہاڑ اور پانی

کائنات میں جو چیزیں انسان پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہیں، یہ ہیں:

آسمان پر چمکتا ہوا چاند اور موسیقی، پرندوں میں کوکو کرنے والی کوئل اور پودوں میں بید مجنوں کا پیڑ۔

چاند کے ساتھ مل کر بادلوں کا اندیشہ کرنا، کتابوں کے ساتھ ایک ہو کر کاغذ چاٹنے والے کیڑے کی فکر، پھولوں کے ساتھ مل کر طوفانوں کا ڈر اور صاحب جوہر آدمیوں اور خوبصورت عورتوں کے ساتھ تقدیر کی گردشوں کا خوف کرنا اپنے سینے میں مہاتما بدھ کا دل رکھنے کے برابر ہے۔

اگر دنیا میں ایک بھی ہم نفس دوست یا ہمدم و ہمدرد میسر آجائے تو انسان اطمینان سے مر سکتا ہے۔

ایک پرانے ادیب کا قول ہے کہ اگر دنیا میں پھول اور خوبصورت عورتیں نہ ہوتیں تو میں اس دنیا میں پیدا ہونے کی خواہش ہی نہ کرتا میں یہ اضافہ کروں گا کہ اگر دنیا میں قلم دوات، شطرنج اور شراب نہ ہوں تو مجھے مرد پیدا ہونے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔

پہاڑوں کی سرسبزی، پانی کا گنگنانا، چاندنی کا رنگ، پھولوں کی خوشبو، ادیبوں کی دلفریب شخصیتیں اور حسین عورتوں کا حسن دید ایسی چیزیں ہیں جو لفظوں میں سما نہیں سکتیں اور نہ اظہار ہی میں آسکتی ہیں۔ آدمی ان کا خیال کرتے کرتے انھیں کے سپنے دیکھنے میں کھو جاتا ہے اور ان کے تصور میں اس کی بھوک پیاس بھی مٹ جاتی ہے۔

برف کو دیکھ کر ذہن میں عالی خیال عالم کا خیال آتا ہے۔ پھول حسین عورتوں کی یاد دلاتے ہیں۔ شراب تلوار کے دھنی کی یاد دلاتی ہے اور چاند دلی دوستوں کی یاد دلاتا ہے۔ پہاڑ اور بہتا پانی عمدہ شعر اور اچھی

نثر کی یاد دلاتے ہیں۔

قدرتی مناظر اس زمین پر بھی ہیں، تصویروں میں بھی ہیں، ہمارے خوابوں میں بھی ہیں اور ہمارے سپنوں میں بھی ہیں۔ اس سرزمین کے قدرتی مناظر کا حسن، گہرائی اور خطوط کی بے قاعدگی میں پنہاں ہے۔ تصویروں میں قدرتی مناظر کا حسن، آزادی اظہار اور رنگوں، موقلم اور سیاہی کی شوخی ادا اور شکوہ انداز میں پنہاں ہے۔ سپنوں میں قدرتی مناظر کے حسن کا راز ہر آن بدلتی ہوئی کیفیت میں ہے اور جو قدرتی مناظر ہمارے سپنوں میں ہیں ان کا حسن اس بات میں مضمر ہے کہ ہر چیز اپنی اپنی مناسب جگہ موجود ہے۔

سفر کرتے ہوئے جن مقامات سے گزریں ان کے حسن و خوبی کے سلسلے میں زیادہ میں میخ نکالنے کی ضرورت نہیں مگر جہاں زندگی بھر رہنا ہو ان جگہوں کے حسن و خوبی کو بڑے اعلیٰ معیار پر پرکھنا چاہیے۔ کیونکہ ان جگہوں کا تو ہر وقت سامنا رہے گا۔

بانس کی کونپل سبزے میں اپنی نوعیت کی واحد چیز ہے۔ لیچی کا پھل پھلوں میں منفرد ہے۔ آبی جانوروں میں کیکڑا انوکھی چیز ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں شراب عجیب وغریب چیز ہے۔ آسمان پر چاند اپنی وضع کا تنہا مالک ہے۔ پہاڑوں اور پانیوں میں مغربی جھیل منفرد ہے۔ سونگ عہد کا ارباب آلات موسیقی میں اور یوآن کی ڈرامائی نظمیں ادب میں انوکھی چیزیں ہیں……

مشہور پہاڑوں اور دریاؤں کو دیکھنے کے لیے قسمت چاہیے۔ جب تک مقدر کو منظور نہیں ہوتا ہمیں ان کو دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا، چاہے یہ چیزیں ہم سے صرف دس بارہ میل دور ہوں۔

آئینے میں جو عکس پڑتے ہیں وہ پورے رنگوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ لیکن جو عکس (یعنی سائے) چاندنی میں پڑتے ہیں وہ یک رنگی تصویریں ہوتے ہیں۔ آئینے میں نظر آنے والے عکس ایسی تصویریں ہیں جن کے خطوط ٹھوس ہوتے ہیں۔ اور چاند کی روشنی میں نظر آنے والے عکس ''بے ہڈی کی (غیر مرئی) تصویریں'' ہیں۔ چاند کی روشنی میں پہاڑوں اور دریاوں کے عکس، آسمان پر جغرافیے کے باب ہیں اور پانی میں چاند تاروں کے عکس، زمین پر فلکیات کا مطالعہ۔

iv- بہار وخزاں

بہار، آسمان کی طبیعت کا قدرتی رنگ ہے اور خزاں اس طبیعت سے تلون کا ایک کرشمہ ہے۔ پرانے

لوگ سرما کو باقی کے تین موسموں کے لیے ''فالتو'' یا ''زائد'' (یعنی آرام کا) موسم گردانتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ گرمیوں کو ''تین فالتو موسموں کا موسم'' سمجھنا چاہیے۔ گرما کی صبح کو اٹھنا، رات کا فالتو حصہ ہے۔ گرما کی رات کو زیادہ دیر بیٹھے رہنے اور نہ سونے کو دن کا زائد حصہ گردانتا چاہیے۔ اور سہ پہر کو نیند، سماجی میل جول کا زائد حصہ ہے۔ مجھے واقعی بقول شاعر ''گرما سے محبت ہے۔''

اپنے آپ پر خزاں کی مانند قابو ہونا چاہیے اور ہر معاملے کو بہار کے انداز میں سلجھانا چاہیے۔

اچھی نثر اور نظمیں، خزاں کی روح سے شرابور ہونی چاہئیں اور اچھے سازوں میں ڈرامائی نظموں میں بہار کی روح مچلتی ہوئی ہونی چاہیے۔

۷- آوازیں

پرندوں کا نغمہ بہار کے موسم میں اور جھینگروں کا گیت گرما میں سننا چاہیے۔ خزاں میں ننھے منے کیڑوں کی آوازیں اور سرما میں برفباری کی صدا سننا چاہیے۔ دن میں شطرنج کھیلنے کی آواز، چاندنی رات میں بانسری کا نغمہ، پہاڑوں پر صنوبر کے درختوں کی سرسراہٹ اور لب دریا لہروں کے ہلکوروں کی آواز سننی چاہیے اگر یہ صدائیں آپ سن لیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ کا جینا اکارت نہیں گیا لیکن جب کوئی بازاری شخص بازار میں جھگڑا کرے اور شور غوغا مچائے یا جب گھر کی بی بی، میاں کی خبر لینی شروع کرے تو ان آوازوں کو سننے کے بجائے بہرا بن جانا بہتر ہے۔

مرغابیوں کی صدائیں سننے سے یہ احساس ہوتا ہے گویا ہم نانکنگ میں ہیں۔ چپوؤں کی شپاشپ سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جھیل کنارے کے شہروں مثلاً سوچاؤ چانگ چاؤ اور ہوچاؤ میں بیٹھے ہیں ...... ساحل پر موجوں کا شور سن کر ایسا خیال آتا ہے کہ ہم چی کیانگ میں ہیں ...... اور دبلے گھوڑوں کے گلے کی گھنٹیاں بجتی سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ سیان کی سڑک پر جارہے ہیں۔

ساری آوازوں کو ذرا فاصلے سے سننا چاہیے۔ صرف ساز کی آواز ایسی ہے جسے دور قریب دونوں طرح سنا جاسکتا ہے۔

صنوبر و شمشاد کے سایوں تلے ساز کی موسیقی سننا کانوں میں امرت ڈالنے کی طرح ہے۔ چاندنی رات میں بانسری کی میٹھی آواز، چشمے کے پاس آبشار کا شور اور پہاڑوں میں بودھوں کے مذہبی بھجن سننا بھی یہی

کیفیت رکھتا ہے۔

پانی کی آواز چار طرح کی ہے۔ آبشاروں کا شور، مچلتے چشموں کا شور، جھرنوں کا شور اور نالوں کا شور ...... ہوا کی صدائیں تین قسم کی ہیں۔ صنوبر کے درختوں پر سرسراہٹ خزاں زدہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ اور دریا پر آندھی کا طوفان ...... بارش کی صدا دو طرح کی ہے۔ پتوں اور کنول کے پھولوں پر برستی بوندوں کی آواز اور مکان کے چھجوں سے بانس کی بالٹیوں میں پانی کے گرنے کی آواز۔

vii- بارش

یہ چیز جسے بارش کہتے ہیں اس سے دن چھوٹے اور راتیں طویل معلوم ہونے لگتی ہیں۔

بہار کی تلاش اسی شاہی فرمان کی طرح ہے جو انسان کو اعزاز بخشے۔ گرما کی بارش واجب القتل مجرم کے لیے جیسے معافی کا پروانہ ہے اور خزاں کی بارش بین اور مرثیے کی مثل ہے۔

بہار کے موسم میں برشگال کا دن مطالعے کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ گرما میں برستی بارش کا دن شطرنج کھیلنے کے لیے مناسب ہے اور خزاں کی برکھا کے دن میں پرانے صندوقوں اور سامان کے کمروں میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینا، انھیں ترتیب دینا موزوں ہوگا۔ سرما میں بارش کا دن صرف شراب پینے کے لیے موزوں ہے۔

میں میگھ دیوتا کو خط لکھوں گا اور اسے بتاؤں گا کہ بہار میں بارش پہلے چاند کی پندرہویں تاریخ کے بعد ہونی چاہیے (جب شمعوں کا جشن ختم ہو چکا ہو) جو دس دن متواتر ہوتی رہے بلکہ وقتاً فوقتاً تیسرے چند کے تیسرے دن تک ہوتی رہے تاکہ اس وقت تک شفتالو کے شگوفے کھل جائیں۔ پھر چاول بونے کے وقت بھی بارش ہونی چاہیے اور یہ کہ گرما میں ہر مہینے کے پہلے دس دنوں اور آخری دس دنوں میں پانی ضرور برسنا چاہیے (درمیانی دنوں میں اس لیے نہیں کہ ہم پورے چاند کی تابانی سے لطف اٹھا سکیں) ...... خزاں کے موسم میں ساتویں اور نویں مہینے کے پہلے اور آخری دس دن بارش ہونی چاہیے (آٹھواں مہینہ فصل کی کٹائی کے لیے مخصوص ہے) لیکن سرما کے تین مہینوں میں بارش کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

viii- چاند، ہوائیں اور پانی

پہلی رات کا چاند جلد ڈوب جاتا ہے اور ہمیں اس پر غصہ آتا ہے۔ تیسرے ہفتے کے زوال پذیر چاند پر

اس لیے غصہ آتا ہے کہ وہ اتنی دیر سے طلوع ہوتا ہے۔

چاندنی رات میں بودھ تعلیمات کا وعظ سننا انسان کے ذہن میں بے لوثی اور ہر چیز سے علیحدگی کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ چاندنی میں شمشیر بازی کے تذکرے جرات آموز ثابت ہوتے ہیں۔ چاندنی میں شعر وسخن کی باتیں، تنہائیوں میں زیادہ حسن، زیادہ رنگ پیدا کر دیتی ہیں اور چاندنی میں حسین عورتوں کو دیکھنے سے ہیجانی جذبات میں گہرائی پیدا ہوتی ہے۔

چاند کے ساتھ ''کھیلنا'' یہ ہے کہ نیچی جگہ بیٹھ کر صاف اور چمکیلے چاند کی طرف سر اٹھا کر دیکھا جائے۔ اور جب چاند دھند میں لپٹا ہوا اور مکدر ہو تو اسے اونچی جگہ سے دیکھا جائے۔

بہار کی ہوائیں شراب کی طرح ہیں۔ گرما کی ہوا چائے کی طرح ہے۔ خزاں کی ہوائیں دھوئیں کی مثل ہیں۔ اور سرما کی ہوائیں ادرک کی طرح تیز اور تند ہیں۔

ix- فراغت اور دوستی

جو لوگ ان کاموں پر توجہ نہیں دیتے جن پہ دوسرے لوگ دن رات توجہ دیتے ہیں، صرف وہی لوگ ان کاموں پر دن رات توجہ دے سکتے ہیں جن پر دوسرے لوگ توجہ نہیں دیتے۔

فراغت سے بڑھ کر انسان کو کوئی چیز مرغوب نہیں۔ فراغت کا یہ مطلب نہیں کہ فراغت کے لمحوں میں انسان بالکل بے کار رہا کرتا ہے۔ فراغت کی بدولت انسان کتابیں پڑھتا ہے، مشہور مقامات کا سفر کرتا ہے اور اچھے لوگوں سے عمدہ دوستی کر سکتا ہے۔ فراغت ہی کی بدولت انسان شراب پی سکتا ہے اور کتابیں لکھ سکتا ہے۔ اور ان سے زیادہ بڑی مسرتیں اور کون سی ہو سکتی ہیں؟

بادل پر سورج کی کرنوں کو چھوٹ پڑے تو بادل رنگین ہو جاتا ہے۔ بہار کا چشمہ چٹان سے ہو کر بہے تو آبشار بن جاتا ہے۔ گویا نئے تعلق سے نام بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوستی اتنی گراں مایہ چیز ہے۔

پہلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو ''شمعوں کا جشن'' مناتے ہوئے آدمی کو لاابالی دوستوں کے ساتھ شراب پینی چاہیے! پانچویں مہینے کی پانچویں تاریخ کو ''بجروں کا جشن'' مناتے وقت خوش وضع اور وجیہہ دوستوں کے ساتھ شراب نوشی کرنی چاہیے۔ ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کو ''آسمانی گوالے اور آسمانی دوشیزہ کے ملاپ'' کی تقریب کے موقع پر دلنواز اور دلکش دوستوں کی معیت میں مے نوشی کرنی چاہیے۔ خزاں کے وسط میں ''جشن خزاں''

کے موقع پر جب کٹائی کا چاند پورا چمک رہا ہو تو خاموش طبع اور حلیم دوستوں کے ساتھ شراب پیو اور نویں مہینے کے نویں دن اونچے پہاڑوں پر چڑھتے ہوئے رومانی مزاج کے دوستوں کے ساتھ مے نوشی کا لطف ہے۔

فاضل دوستوں کے ساتھ بات چیت کرنا نادر کتابیں پڑھنے کی طرح ہے۔ شاعر مزاج دوستوں کے ساتھ گفتگو کرنا بلند پایہ شاعروں کی نظمیں اور عمدہ نثر نگاروں کی انشا کا مطالعہ کرنے کے برابر ہے۔ محتاط اور نہایت مہذب وشستہ دوستوں کے ساتھ بات کرنا ایسا ہے جیسے پرانے عارفوں اور حکما کی ادبیات عالیہ پڑھی جا رہی ہوں ...... اور ظریف طبع دوستوں کے ساتھ باتیں کرنا کوئی عمدہ ناول یا رومانی داستان پڑھنے کی طرح ہے۔

ہر خاموش طبع، گوشہ گیر اہلِ علم کے چند قریبی دوست ضرور ہوتے ہیں۔ ''قریبی'' دوستوں سے میری مراد یہ نہیں کہ ان لوگوں نے عمر بھر کی دوستی اور نباہ کی قسمیں ہی اکٹھا رکھی ہوں۔ عام طور پر دلی دوست وہ ہوتے ہیں جو اگر چہ ہم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر ہوں پھر بھی انھیں ہماری ذات پر پورا اعتماد ہوتا ہے اور وہ ہمارے خلاف کسی قسم کی افواہ پر یقین نہیں کرتے اور جب وہ کوئی افواہ سنتے ہیں تو ہر ممکن طریقے پر اس کی وضاحت، اس کا جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ وقت پڑنے پر ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے اور ہمیں کس بات سے احتراز لازم ہے۔ یہ لوگ ضرورت کے وقت ہماری امداد کو آتے ہیں اور بعض دفعہ ہمارے علم کے بغیر اپنی رضا و رغبت سے ہمارا کوئی قرضہ بے باق کر دیتے ہیں، کوئی تصفیہ کر دیتے ہیں اور انھیں یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ ایسا کرنے میں کہیں ان پر یہ الزام عائد نہ کر دیا جائے کہ وہ ہمارے مفاد کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو رہے ہیں۔

عام دوستوں میں سے دلی دوست (جو ہمارے دل سے واقف ہوں) ڈھونڈنا آسان ہے لیکن بیوی اور محبوباؤں کے جھرمٹ میں سے دلی دوست ڈھونڈنا مشکل ہے۔ حاکم اور وزرا کے تعلق میں دلی دوست کی تلاش مشکل تر ہے۔

''غیر معمولی'' یا ''ممتاز کتاب'' وہی ہے جس میں ایسی باتیں ہوں جو پہلے نہیں کہی گئیں اور ''دلی دوست'' وہ ہے جو ہمیں اپنے سارے خاندانی معاملات اور راز بتا سکے۔

دیہات میں رہنے کا لطف جبھی ہے کہ اچھے دوست بھی ساتھ ہوں۔ان علاقوں میں آدمی کا سابقہ کسانوں اور لکڑہاروں سے پڑتا ہے اور ان سے آدمی بہت جلد تنگ آجاتا ہے کیونکہ یہ بیچارے زیادہ سے زیادہ مختلف قسم کے اناج پہچان سکتے ہیں یا موسم کے بارے میں کچھ اندازے کر سکتے ہیں۔ دوستوں کو بھی متعدد قسمیں ہوتی ہیں۔ان میں سب سے اچھی قسم کے دوست وہ ہیں جو نظمیں لکھ سکیں۔ان سے دوسرے درجے پر اچھی باتیں کرنے والے دوست ہیں۔تصویر بنانے والے دوست تیسرے نمبر پر ہیں۔گانے والے دوستوں کا نمبر چوتھا ہے اور جن دوستوں کو مے نوشی کی محفل میں مختلف قسم کے کھیل آتے ہوں ان کا نمبر سب سے آخر میں آتا ہے۔

x- کتابیں اوران کا مطالعہ

جوانی میں کتابیں پڑھنا ایسا ہے جیسے آپ کسی درز میں سے چاند کو دیکھ رہے ہوں۔ادھیڑ عمر میں کتابوں کا مطالعہ ایسا ہے جیسے کھلے آنگن میں چاند کو دیکھا جائے۔اور بڑھاپے میں کتاب بینی ایسی ہے جیسے اونچی ہموار جگہ سے چاند کا نظارہ کیا جائے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مطالعے سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں ان کی گہرائی اپنے ذاتی تجربے کی گہرائی کے تناسب سے بدلتی رہتی ہے۔

جو شخص بے لفظ کتابیں پڑھ سکے (یعنی کتاب زندگی کا مطالعہ کر سکے) صرف وہی شخص حسین اور لاجواب باتیں کر سکتا ہے۔ وہ سچائی جو لفظوں میں سما نہیں سکتی اگر کسی کی سمجھ میں آجائے تو صرف وہی شخص بدھ مت کی حکمت اعلیٰ کا ادراک کر سکتا ہے۔

پرانے باکمالوں اور موجودہ ادیبوں کی لکھی ہوئی غیر فانی کتابیں خون اور آنسوؤں سے لکھی گئی ہیں۔

شوائی ہو کی کتاب ''سارے انسان بھائی بھائی ہیں'' غیظ و غضب کا آئینہ ہے۔سی یو چی کی تصنیف ''بندر کی رزمیہ داستان'' روحانی بیداری کا افسانہ ہے اور چن پی انگ مئی کا فحش ناول ''طلائی گلدان اور آلوچے کا پھول'' انسانی آلام کی داستان ہے۔

ادب وہ منظر ہے جو میز پر رکھا ہے اور منظر وہ ادب ہے جو زمین پر بکھرا ہوا ہے۔

مطالعہ سب سے بڑی مسرت ہے پھر بھی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے خوشی نہیں حاصل ہوتی بلکہ ناانصافیوں پر غصہ آتا ہے لیکن اس غصے میں بھی کتنا مزہ ہے۔

ادبیات عالیہ کی کتابیں سردیوں میں پڑھنی چاہئیں۔ کیونکہ ان دنوں ذہن اور توجہ دونوں ان پر مرکوز ہو سکتی ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ گرما میں کریں کیونکہ ان دنوں آدمی کے پاس وقت کافی ہوتا ہے۔ پرانے فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ خزاں میں کریں کیونکہ ان کے خیالات دلکش ہوتے ہیں اور بعد کے ادیبوں کی تمام کتابیں بہار میں پڑھنی چاہئیں کیونکہ ان دنوں فطرت میں پھر جان آ جاتی ہے۔

جب ادیب لوگ فوجی معاملوں پر گفتگو کرتے ہیں تو وہ کمرے میں بیٹھ کر جنگی سائنس پر بحث کرتے ہیں (لفظی ترجمہ یہ ہے کہ کاغذ پر سپاہیوں کی بات چیت کرتے ہیں۔ مصنف) اور جب فوجی جرنیل ادب پر بات کرتے ہیں تو ان کی باتیں سنی سنائی افواہوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتیں۔

جو شخص مطالعہ کرنا جانتا ہے وہ جہاں جاتا ہے اس کے لیے ہر چیز کتاب بن جاتی ہے۔ پہاڑ اور دریا بھی کتابیں ہی ہیں۔ شطرنج اور شراب بھی کتابیں ہیں اور چاند اور پھول بھی کتابیں ہیں۔ سفر کا رسیا یہ جانتا ہے کہ جہاں کہیں وہ جائے ہر چیز فطرت کا ایک نادر نظارہ بن جاتی ہے۔ کتابیں اور تاریخ بھی مناظر ہیں، شراب اور شعر بھی منظر ہیں، چاند اور پھول بھی مناظر ہیں۔

کسی قدیم مصنف کا قول ہے کہ ''میں چاہتا ہوں دس برس کتابوں کا مطالعہ کرتا رہوں، دس برس سفر کرتا رہوں اور دس برس اپنی چیزوں کی ترتیب اور حفاظت میں خرچ کروں۔'' میرا خیال ہے کہ اس آخری کام کے لیے دس برس بہت زیادہ ہیں۔ بس دو تین برس کافی ہونے چاہئیں۔ رہا مطالعہ اور سفر تو دس برس کیا اس سے دگنی مدت بھی میرے دل کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ ہوانگ چی ین کے بقول تو اس کے لیے تین سو برس کی عمر ہونی چاہیے۔

پرانے لوگوں کا قول تھا کہ اچھی شاعری اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہنے والا دنیا میں ناکام ہو اور/ یا بالکل غریب ہو جائے (1)...... اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ناکام شخص کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے اور وہ اپنی زندگی کی مثال بڑی خوبی سے پیش کر سکتا ہے امیر اور کامگار لوگوں کی شاعری اچھی نہیں ہو سکتی کیونکہ نہ وہ غربت پر آہیں بھر سکتے ہیں، نہ ناکامی اور تنزل کی بدبختی کا ماتم کر سکتے ہیں وہ تو صرف ہواؤں اور بادلوں اور چاند اور شبنم پر شعر کہہ سکتے ہیں۔ بھلا یہ سطحی چیزیں اچھی کیونکر ہوں گی؟ ایسے شخص کے لیے عمدہ نظمیں لکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ سفر کرے تاکہ وہ اپنے سفر کے دوران میں پہاڑوں اور دریاؤں کے علاوہ عام لوگوں کے رسم و رواج،

ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کا مطالعہ کر سکے۔ شاید اس طرح جنگ یا قحط کی ماری ہوئی دنیا کے آلام اس کی نظموں میں بار پا سکیں۔ اس طرح اپنے گیتوں اور اپنی آہوں کے لیے دوسروں کے آلام مستعار لینے سے اچھی شاعری ہو سکتی ہے اور اس کے لیے افلاس اور ناکامی کا انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا۔

xi- کچھ زندگی کے بارے میں

جذبہ کائنات کی بنیاد ہے اور ذہن رسا کائنات کی چھت ہے۔

شرفا کی نفرت کا نشانہ بننے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ عام لوگوں کی توہین کا نشانہ بن جائیں۔ کوئی مشہور فاضل اگر آپ کی ذات سے لاعلم ہے تو اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ معمولی سرکاری ممتحن آپ کو فیل کر دے۔

آدمی وہ جس کی زندگی یوں ہو جیسے کوئی نظم ہوتی ہے، اور چیز وہ جو تصویر نظر آئے۔

دنیا میں ایسے مناظر بہت ہیں جن کا تذکرہ تو بے حد نفیس ہوتا ہے مگر حقیقت میں یہ مناظر بہت اداس اور تنہا ہوتے ہیں۔ مثلاً دھند یا بارش کے مناظر۔ بعض حالات کا تذکرہ سنیں تو بڑے شاعرانہ معلوم ہوتے ہیں لیکن در حقیقت انھیں برداشت کرنا امکان سے باہر ہوتا ہے۔ مثلاً بیماری اور غریبی کے حالات۔ بعض آوازیں ایسی ہیں کہ ان کا ذکر سنو تو بڑی حسین معلوم ہوں گی لیکن وہ سخت عامیانہ ہوتی ہیں۔ مثلاً پھول بیچنے والی لڑکیوں کی آوازیں

میں خود کسان نہیں بن سکتا، صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ اپنے باغ کو خود پانی سے سینچ دوں۔ میں لکڑہارا نہیں بن سکتا، صرف اپنے باغ سے جھاڑ صاف کر سکتا ہوں۔

جن چیزوں سے مجھے کوفت ہوتی ہے وہ گنتی میں دس ہیں:

1- کتابوں کو آسانی سے کیڑا لگ جاتا ہے۔
2- گرما کی راتوں کا سارا لطف مچھروں کی بدولت غارت ہو جاتا ہے۔
3- مہتابی کی ہلکی چھت بہت جلد ٹپکنے لگتی ہے۔
4- گل داؤدی کی پنکھڑیاں مرجھا جاتی ہیں۔
5- صنوبر کے درختوں پر بڑی بڑی چیونٹیاں ہوتی ہیں۔
6- بانس کے پیڑوں سے اتنے زیادہ پتے گرتے رہتے ہیں۔

7- تیج اور کنول کے پھول اتنی جلدی مرجھاتے ہیں۔

8- پائی لو کے پودے میں اکثر سانپ چھپا ہوتا ہے۔

9- لکڑی کی جالیوں پر پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔

10- سینہ یا خار پشت کھانے میں زہریلے ثابت ہوتے ہیں۔

پھولوں میں سوآن کا پھول بنو جسے 'دافعِ آلام'' کا نام دیا گیا ہے لیکن پرندوں میں کویل نہ بنو کیونکہ وہ خون کے آنسو بہاتی ہے جن سے پھول اگتے ہیں۔

میرے نزدیک مکمل اور مثالی زندگی یہ ہے کہ ایسے مقام پر پیدا ہوں جہاں امن وامان ہو، پہاڑیاں اور جھیلیں ہوں اور وہاں کا حاکم انصاف پسند اور دیانت دار ہو...... ہم ایسے خاندان کے رکن ہوں جس کے مالی حالات اطمینان بخش ہوں ہمیں ایسی بیوی ملے جو عقل مند ہو اور ایسے بیٹے پیدا ہوں جو ذہین اور اچھے ہوں۔

اگر آپ کے سینے میں پہاڑوں اور وادیوں کے مناظر محفوظ ہیں تو آپ شہر میں بھی اسی طرح رہ سکتے ہیں گویا پہاڑ کے گھنے جنگلوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔

خاموش رات کو اکیلے بیٹھے رہنا، چاند کو اپنے دل کے آلام کی داستان سنانا، پرفضا رات کو تنہا رہنا اور رات کے جھینگروں کو اپنا رازداں جاننا...... یہ ہے زندگی۔

جو شخص شہر میں رہتا ہو اسے چاہیے کہ تصویروں کو قدرتی مناظر سمجھے، گملوں کے پھولوں کو اپنا باغ جانے اور کتابوں کو اپنا سچا دوست خیال کرے۔

کسی مشہور عالم سے یہ کہنا کہ وہ آپ کے بچوں کو تعلیم دے، کسی اچھے پہاڑ پر جا کر امتحانی جواب مضمون لکھنے کی مشق کرنا اور کسی مشہور ادیب کو اپنا ادبی استاد ٹھہرانا۔ یہ تینوں چیزیں سر بسر غلط اور نامناسب ہیں۔

پجاری کے لیے یہ لازم نہیں کہ شراب سے پرہیز کرے، اسے صرف عامیانہ پن اور بازاری باتوں سے احتراز لازم ہے۔ سرخ لباس والی نازنینوں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ انھیں ادب کی سمجھ ہو۔ ان کے لیے یہی کافی ہے کہ جو چیز آرٹسٹک ہو وہ اس کا ذوق رکھتی ہوں۔

اگر ٹیکس وصول کرنے والے کی آمد سے کوفت ہوتی ہو تو زمین کا مالیہ وغیرہ پہلے سے ادا کر دیں اگر آپ کو بدھ مت کے بھکشوؤں سے مذہبی بحث میں لطف آتا ہے تو آپ ان کی خانقاہوں کے لیے کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہیں۔

ہر چیز بھول جانا آسان ہے، صرف شہرت کا خیال نہیں بھلایا جا سکتا۔ ہر چیز سے بے پروائی برتنا بھی مشکل نہیں، البتہ شراب کے تین پیالوں سے کون بے نیاز ہوسکتا ہے؟

شراب، چائے کی جگہ لے سکتی ہے لیکن چائے شراب کی جگہ نہیں لے سکتی۔ نظمیں، نثر کی جگہ پر کر سکتی ہیں لیکن نثر نظم کی جگہ نہیں پر کر سکتی...... ڈرامائی تنظیمیں، گیتوں کی جگہ لے سکتی ہیں لیکن اس کا الٹ ممکن نہیں۔ چاند، شمعوں کی جگہ لے سکتا ہے لیکن شمعیں، چاند کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ قلم، زبان کی جگہ لے سکتا ہے لیکن زبان، قلم کی جگہ نہیں لے سکتی۔ خادمہ کی جگہ مرد ملازم کام کر سکتا ہے لیکن وہ خادمہ کی کمی پوری نہیں کر سکتا۔

سینے میں بے انصافی کے دکھ کو شراب میں غرق کیا جا سکتا ہے لیکن دنیا میں بہت بڑی بے انصافی کو صرف تلوار ہی سے غرق کیا جا سکتا ہے۔

مصروف آدمی کا باغ اس کے گھر کے پاس ہونا چاہیے اور بافراغت شخص کا باغ اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر......

دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کو کسی پہاڑی غار میں رہنے والے عارف کی سی مسرتیں مل سکتی ہیں مگر جنھیں ان مسرتوں کی کچھ خبر نہیں۔ ان میں مچھیرے، لکڑہارے، باغبان اور کسان شامل ہیں۔

درد کا برداشت کرنا آسان ہے لیکن کھجانے کی خواہش کو دبانا مشکل ہے۔ کڑوا کسیلا ذائقہ برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن کھٹی چیز ہر کوئی نہیں کھا سکتا۔

فراغت والے شخص کا قلمدان بڑا خوبصورت ہونا چاہیے لیکن مصروفیت والے شخص کا قلمدان خوبصورت ہونا لازم ہے۔

سفید بگلوں کو دیکھ کر رومانی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ گھوڑا انسان میں شجاعت کا انداز پیدا کرتا ہے۔ نسترن گوشہ نشینی کا میلان پیدا کرتا ہے اور صنوبر بزرگانہ وقار پیدا کرتا ہے۔

یہ خدا کی مرضی کے خلاف ہے کہ لطیف غذاؤں کو جلد جلد زہر مار کیا جائے، شاندار مناظر سے عجلت میں گزر جائے، گہرے جذبات کا اظہار سطحی ہو، خوبصورت دن کو کھانے اور شراب پینے میں غارت کیا جائے اور اپنی دولت کو نمائشی عیاشی پر صرف کیا جائے۔



گیارہواں باب

سفر کے مزے

1- سیر و سیاحت

کبھی سفر ذریعہ مسرت تھا لیکن اب یہ بھی کاروبار بن گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل ہمیں سفر کی وہ سہولتیں حاصل ہیں جو آج سے سو برس پہلے نہ تھیں۔ حکومتوں نے سفر کے سرکاری دفاتر کھول کر سیاحوں کے کاروبار سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ جدید زمانے کا انسان اپنے باپ دادا کی نسبت کہیں زیادہ سفر کرنے پر قادر ہو گیا ہے، اور مجموعی طور پر کرتا بھی ہے۔ پھر بھی سفر ایسا فن ہے جو اب ختم ہو گیا ہے۔ اس آرٹ کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ نقلی سفر کی مختلف صورتوں پر روشنی ڈالی جائے۔

نقلی سفر کی پہلی قسم یہ ہے کہ ''اپنے ذہن کو بہتر بنانے کے لیے سفر'' اختیار کیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ ذہن اور خیالات کی بہتری پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا چکا ہے اور اس کی اہمیت کو حد سے بڑھا دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر انسان کا ذہن اتنی آسانی سے بہتر بنایا جا سکے تو بات کیا ہوتی کم از کم ان ''بہتر'' ذہنوں کا نمونہ مجھے کلبوں اور درسگاہوں میں تو کہیں نظر نہیں آیا۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ہم فی الواقع اپنے ذہن کو بہتر بنانا چاہتے ہوں تو ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنی تعطیلات کے زمانے میں چند ماہ کے لیے اپنے ذہن کو بالکل خالی رکھیں اور اُسے مکمل چھٹی دیں۔ معلومات میں اضافہ کرنے کے غلط تصور نے سیاحوں کے لیے گائیڈ جیسی چیز پیدا کر دی ہے جو میرے نزدیک ''مان نہ مان میں تیرا مہمان'' قسم کی نہایت معقول، مغز چاٹ مخلوق ہے۔ آپ کسی دوسرے شہر میں سیاحت کے لیے گئے ہوں تو آپ کسی باغ، کسی یادگاری بت، کسی لاٹ سے اس مخلوق کی بکواس سنے بغیر آگے نہیں جا سکتے۔ گائیڈ ضرور آپ کو یہ بتا کر چھوڑے گا کہ یہ فلاں مشہور شخصیت کا بت ہے جو ۲۳ اپریل ۱۷۹۲ء کو پیدا ہوا تھا اور اس کا انتقال ۲ دسمبر ۱۸۵۲ء کو ہوا۔ غالباً اسی زمرے میں انگریزی سکولوں کی سِسٹر قسم کی اُستانیاں بھی آتی ہیں جو سکول کے بچوں کو کسی قبرستان میں لے جائیں گی اور کسی کتاب

سے کسی قبر میں سونے والے کی تاریخ وفات پڑھ کر سنائیں گی، یہ بتائیں گی کہ اس نے کس تاریخ کو شادی کی اور یہ کہ اس کی بیوی کا نام، عمر وغیرہ کیا تھی۔ وہ اپنی انہی احمقانہ معلومات کی بنا پر بچوں کی ساری سیر غارت کر کے دم لیتی ہیں۔ سیاحوں کی صورت میں اچھے خاصے پکی عمر کے لوگوں کو بھی بچہ بننا پڑتا ہے کیونکہ ان کا گائیڈ انھیں بڑی شدومد سے ہر غیر متعلق بات پر لیکچر دیتا ہے جو انھیں سننا ہی پڑتا ہے۔ اِن سیاحوں میں جو لوگ ذرا محتاط قسم کے ہوتے ہیں وہ سکول کے اچھے بچوں کی طرح نوٹ بک نکال کر کچھ یادداشتیں بھی لے لیتے ہیں۔ دنیا بھر کے سیاحوں کا یہی حال ہے۔ چینی سیاح اگر ریڈیو سٹی جائیں تو انھیں بھی امریکی سیاحوں کی طرح یہ عذاب اٹھانا پڑتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ چینی گائیڈ پیشہ ور لوگ نہیں ہوتے بلکہ پھل بیچنے والے، کمہار اور کسان بچے ہوتے ہیں۔ ان کی مہیا کردہ معلومات غلط ضرور ہوتی ہیں مگر ان کی اپنی شخصیت پیشہ ور گائیڈوں کی نسبت بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ میں سُو چاؤ میں ''ہو چی اونی'' پہاڑی دیکھنے گیا۔ واپس آیا تو دماغ میں تاریخی واقعات بن اور تاریخوں کا عجیب مربا بنا ہوا موجود تھا۔ یہ ساری ''معلومات'' شاندار پل کے بارے میں تھیں جو ''تلوار کے تالاب'' کے اوپر پانی کی سطح پر چالیس فٹ اونچا معلّق ہے۔ میرے خودساختہ گائیڈ نے جو سنترے بیچنے والا ایک لڑکا تھا مجھے بتایا تھا کہ پل کی سنگین سِلوں میں دو گول سوراخوں میں سے ایک تلوار اژدہے کی طرح اڑ کر اوپر آئی تھی اور یہ وہ جگہ ہے جہاں مشہور حسینہ، سی شیہ اپنا سنگار کیا کرتی تھی (حالانکہ اس کے سنگار کی روایتی جگہ یہاں سے دس میل دور ہے) میرا یہ گائیڈ لڑکا بس سنترے بیچنا جانتا تھا مگر اس کی اِن ''معلومات'' سے مجھے اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ لوک کہانیاں کس طرح بنتی بگڑتی ہیں اور ان کی شکل اور ان کے بیان میں کیا کیا تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔

نقلی سیاحی کی دوسری صورت یہ ہے کہ بعد میں ڈینگیں مارنے اور باتیں کرنے کے لیے سفر اختیار کیا جائے۔ ہانگ چاؤ کے پاس ہُو پاؤ ایک جگہ ہے جو چائے اور چشمے کے پانی کے لیے مشہور ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ وہاں جا کر چائے پیتے ہوئے اپنی تصویریں کھنچواتے ہیں۔ ہو پاؤ میں چائے پیتے ہوئے تصویر کھنچوانا اور اسے اپنے دوستوں کو دکھانا بڑا آرٹسٹک سمجھا جاتا ہوگا لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ وہاں کی چائے کے ذائقے پر کم توجہ دیتے ہیں اور تصویر کھنچوانے پر زیادہ توجہ مرکوز کرتے ہیں......اور پھر یہ جذبہ جنون کی حد تک بھی دیکھا گیا ہے۔ خصوصاً جن سیاحوں کے پاس کیمرے ہوتے ہیں اُن کی کچھ نہ پوچھیے۔ ذرا لندن یا پیرس میں

سیاحوں کی کسی ٹولی کو دیکھ لیجے جو خاص بسوں میں سفر کرتی پھرتی ہو۔ یہ سیاح اپنے کیمروں سے تصویر کھینچنے میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ وہ تصویر کے اصل موضوع کی طرف آنکھ بھر کے دیکھتے بھی نہیں۔ یہ تسلیم کہ گھر پہنچ کر اِن مشہور مقامات کو تصویر کے پردے پر دیکھ سکتے ہیں۔ تو پھر سفر کی کیا ضرورت ہے۔ لندن کے ٹرافالگر سکوئر یا پیرس کے کسی مشہور مقام کا فوٹو تو نیویارک یا شنگھائی یا کلکتہ کہیں بھی مل سکتا ہے...... پھر یہ تاریخی مقامات موضوعِ گفتگو بن جاتے ہیں اور یہ ایسے مقامات نہیں رہتے جنھیں دیکھنا چاہیے یا جو واقعی قابل دید ہیں۔ چنانچہ کوئی شخص جتنے زیادہ مقامات کی سیر کرے گا اس کی یادداشت اتنی ہی زیادہ ہوگی اور اس طرح زیادہ سے زیادہ مقامات اس کی گفتگو کا موضوع بن سکیں گے۔ گویا ''علم'' کی یہ خواہش سیاح کو ایک دن میں زیادہ تاریخی عمارتیں، یادگاریں اور مقامات دیکھنے پر مجبور کرے گی۔ اس کے ہاتھ میں اِن تمام جگہوں کی ایک فہرست ہے، اور ایک مقام یا عمارت دیکھ لینے کے بعد وہ اس فہرست پر نشان بنا دیتا ہے کہ یہ مقام تہ تیغ ہو گیا...... آپ ہی انصاف کریں کہ یہ کیا سیاحت ہے۔

اس قسم کا احمقانہ سفر ایک تیسری قسم کی سیاحت کو جنم دیتا ہے اور وہ یہ کہ ایک الگ بندھے پروگرام کے مطابق سیاحت کی جائے۔ اس پروگرام کی رو سے سیاح صاحب کو پہلے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لندن سے وی آنا کتنے بجے پہنچیں گے اور وہاں کتنے گھنٹے ٹھہریں گے اور بوڈاپسٹ میں ان کا قیام کتنا ہوگا۔ اس قسم کا سیاح گھر سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے سفر کا مکمل گوشوارہ تیار کر لیتا ہے اور اس پر سختی سے کاربند رہتا ہے۔ یہ شخص گھر میں بھی گھڑی اور کلینڈر کا بال بندھا غلام ہوتا ہے اور گھر سے باہر بھی گھڑی اور کلینڈر ہی کے ہاتھوں میں اس کی مہار ہوا کرتی ہے۔

نقلی سیاحت کی تین صورتیں میں نے عرض کر دی ہیں جو آج کل عام ہیں۔ میرے نزدیک سیر وساحت کے اصل مقاصد اور ہیں...... سیاحت کا اوّلیں مقصد یہ ہونا چاہیے کہ آدمی اپنی ہستی کو گم کر دے، نامعلوم اور اجنبی بن جائے۔ زیادہ شاعرانہ زبان میں یوں سمجھے کہ ہمیں خود کو بھلانے کے لیے سفر کرنا چاہیے! ہر شخص اپنے شہر میں معزز اور ذمہ دار شہری ہوتا ہے۔ چاہے اُسے اعلیٰ طبقے کے لوگ کچھ ہی سمجھتے ہوں۔ ایک بینکر کو لیجیے اسے اس کے شہر میں ایک معمولی انسان نہیں سمجھا جا سکتا۔ کوئی شخص اور وہ خود، یہ بھی یہ بھول نہیں ہو سکتا کہ وہ بینکر ہے۔ میرے نزدیک سفر کا صحیح مقصد یہ ہے کہ یہ بینکر سیاحت کے دوران میں اور سفر کی بدولت

اپنے آپ کو ان لوگوں کے درمیان پائے جہاں اسے بینکر کے بجائے ایک عام انسان سمجھا جائے۔ جو لوگ کاروبار کی غرض سے سفر کرتے ہیں وہ تعارفی خطوط ساتھ لے کر جاتے ہیں مگر کاروباری سفر خالص سیاحت کے زمرے میں نہیں آتا اگر آپ سیاحت پر روانہ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو مختلف شہروں میں رہنے والے لوگوں کے نام تعارفی خطوط سے لیس کرلیں گے تو پھر آپ ایک انسان کی حیثیت سے سفر نہ کریں گے۔ نہ کبھی آپ پر یہ آشکار ہو سکے گا کہ سماجی درجے کی مصنوعی تقسیم سے الگ ہو کر آپ خدا کے پیدا کیے ہوئے ایک انسان کی حیثیت سے کیا ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر آپ تعارفی خطوط لے کر غیر ملک کی سیاحت کو جائیں تو وہاں یہ متعارف لوگ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور بڑی مستعدی سے اپنے طبقے کی دلچسپیوں اور مصروفیات میں آپ کی رہنمائی بھی کریں گے۔ لیے لیے بھی پھریں گے لیکن سنسنی پیدا کرنے والی کیفیت ہے جو جنگل میں بچھڑے ہوئے ایک سکاؤٹ کی ہوتی ہے جسے اپنا راستہ خود ڈھونڈنا ہے۔ ایسے موقع پر انسان اپنے نفس کے سامنے یہ ثابت کرسکتا ہے کہ وہ کسی اجنبی شہر میں، وہاں کی زبان جانے بغیر محض اشاروں سے ہوٹل کے بیرے کو بھنی ہوئی مرغی لانے کا آرڈر بھی دے سکتا ہے اور جاپانی زبان جانے بغیر ٹوکیو کے کسی سپاہی سے راستہ بھی دریافت کرنے پر قادر ہے۔ ایسا سیاح جب گھر آئے گا تو وہ پہلے کی طرح اپنے شوفر اور اپنے بیرے کا محتاج رہے گا۔

سچا سیاح ہمیشہ آوارہ گرد ہوتا ہے۔ اس کی مسرتیں، اس کی کمزوریاں، اس کی مہم جوئی اور قسمت آزمائی کے ولولے وہی ہوں گے جو آوارہ گرد سے مخصوص ہیں۔ میرے نزدیک سفر اور سیاست یا تو آوارہ گردی ہے یا پھر کچھ نہیں۔ سیاست کی روح یہ ہے کہ آپ کے فرائض کچھ نہ ہوں۔ آپ مقررہ وقت کے پابند نہ ہوں۔ آپ اپنی ڈاک سے بے نیاز ہوں۔ آپ دخل در معقولات دینے والے ہمسایوں کی زد میں نہ ہوں۔ آپ کے پاس ملنے والے وفد نہ آئیں اور آپ کی منزل کوئی نہ ہو...... سچا سیاح وہ ہے جسے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں جائے گا اور مکمل سیاح وہ ہوتا ہے جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں سے آیا ہے، وہ تو اپنا نام اور اپنا لقب بھی بھول جاتا ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جس پر تو لنگ نے اپنے مثالی مسافر، ہنگ لیاؤزے کی رُوداد میں اتنا زور دیا ہے (اس کا کچھ ترجمہ میں اگلی فصل میں پیشِ خدمت کروں گا۔) سچے سیاح کا اجنبی ملک میں کوئی دوست نہیں ہوتا لیکن

ایک چینی راہبہ کے قول کے مطابق سچا سیاح ''کسی ایک شخص کی پروانہیں کرتا بلکہ عام انسانیت کا مجموعی طور پر خیر خواہ ہوتا ہے''...... چنانچہ کسی ایک شخص کو دوست نہ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اس کا دوست ہے۔ اسے عام انسانیت سے محبت ہوتی ہے وہ عام انسانوں میں گھل مل جاتا ہے اور عام لوگوں کی دلنواز شخصیت اور ان کے رسم ورواج دیکھتا پھرتا ہے...... یہ وہ فوائد ہیں جن سے ''قابلِ دید مقامات'' کی سیر کرنے والے سیاح قطعی طور پر محروم رہتے ہیں۔ یہ لوگ تو ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں اور اپنے ہی ہم وطن مسافروں سے بات چیت کرتے ہیں۔ اس کی مثال پیرس میں امریکی سیاحوں کی ہے جو سب کام چھوڑ کر صرف ان ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں جو امریکی سیاحوں کے لیے دل پسند ہوٹل ہیں۔ یہاں انھیں ان تمام مسافروں سے بار بار سابقہ پڑتا ہے جو انھیں کے ساتھ جہاز میں ہم سفر تھے۔ یہاں وہی کھانا ملے گا جو وہ وطن میں کھاتے تھے اور اس کا مزہ عین بعین وہی ہوگا جو وطن میں ہوتا تھا۔ شنگھائی میں آنے والے انگریزوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بڑی تحقیق کے بعد انگریزی ہوٹل میں قیام کریں گے جہاں ناشتے میں خالص انگریزی ناشتہ یعنی بیکن اور انڈے، مربا اور توس مل سکے۔ یہ انگریز مسافر کاک ٹیل بار کے اردگرد منڈلاتے پھریں گے اور کشا کی سیر سے ہزار حیلے بہانے کر کے جان چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ ایسے مسافر اور ایسے سیاح کبھی اجنبی ملک کے لوگوں سے گھلنے ملنے کی کوشش نہیں کرتے اور اس طرح سفر کے ایک بہت بڑے فائدے، ایک عظیم نعمت سے قطعی طور پر محروم رہتے ہیں۔

اس کے برعکس اگر آوارہ گردی کی اسپرٹ پیدا کرلیں تو سفر میں فطرت سے قریب تر ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ سچے سیاح موسم گرما میں صرف ان صحت افسز امقامات پر جائیں گے جہاں لوگ کم سے کم جاتے ہوں تاکہ وہاں انھیں صحیح معنی میں سکون اور آرام میسر آسکے اور فطرت سے قریب تر ہونے کا موقع اور وقت مل سکے۔ اس قسم کے سیاح سفر کی تیاری کے سلسلے میں دکانوں پر مارے مارے نہ پھریں گے کہ گلابی یا نیلے غسل کے لباس کی خریداری کرسکیں البتہ خواتین کے سلسلے میں لپ سٹک کی اجازت ہے کیونکہ سیر وسیاحت کا ہر دلدادہ رسو کا پیرو ہوتا ہے۔ اور روسو کہتا ہے کہ اپنی فطرت کے قریب تر رہو، اور کوئی خاتون اچھی لپ سٹک کے بغیر ''قدرتی'' عورت نظر نہیں آسکتی...... سفر میں بناوٹ کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چھٹی منانے والے لوگ ایسے تفریحی مقامات میں ہجوم کرتے ہیں جہاں ہر کوئی جاتا ہے۔ اس لیے قدرت سے قریب تر ہونے کی شرط بالکل فراموش ہو جاتی ہے۔ ان مقامات پر انھیں لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے جن سے بھاگ کر وہ ان مقامات کی

سیر کو گئے تھے۔ وہاں انھیں لوگوں سے ملنے جلنے اور پارٹیوں کا زور بندھتا ہے اور ساری تفریح ساری سیر غارت ہو جاتی ہے۔

سیر و سیاحت کی ایک اور قسم بھی ہے اور یہ وہ ہے کہ کچھ نہ دیکھنے اور کسی سے ملاقات نہ کرنے کے لیے سفر کیا جائے۔ بس جنگل کے جانوروں، گلہریوں وغیرہ اور بادلوں اور درختوں کو دیکھنے کے لیے سفر کیا جائے...... یہ ''کچھ نہ دیکھنا'' ذرا وضاحت طلب ہے۔ اس چینی تصور کی وضاحت ایک واقعے سے ہو سکتی ہے جو میری ایک امریکی دوست نے مجھ سے بیان کیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ چینی دوستوں کے ساتھ اسے ہانگ چاؤ کے پاس کے پہاڑیوں میں ''کچھ نہ دیکھنے'' کے لیے جانا پڑا...... اُس دن صبح کو گہری دھند چھا رہی تھی اور جوں جوں وہ لوگ پہاڑی پر چڑھتے گئے دھند گہری ہوتی گئی۔ گھاس کی پتیوں پر نمی کی بوندوں کے گرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ہر طرف دُھند ہی دھند تھی، کچھ نظر نہ آتا تھا۔ امریکی خاتون کچھ اکتا سی گئی۔ بولی ''اوپر کیا ملے گا'' ...... اس کی چینی سہیلیوں نے کہا ''نہیں بہن، چلی آیئے، چوٹی پر پہنچ کر نہایت ہی خوبصورت منظر دیکھنے میں آئے گا۔''

تھوڑی دیر وہ ان کے ساتھ طوعاً و کرہاً چلتی گئی۔ کچھ چڑھائی چڑھنے کے بعد اسے ایک بھدی سی چٹان نظر آئی اور جو بادلوں سے ڈھپی ہوئی تھی۔ یہی وہ بے نظیر منظر تھا جس کی اتنی دھوم تھی۔ اس نے پوچھا ''یہ کیا ہے آخر؟'' جواب ملا ''یہ معکوس نیلوفر'' ہے۔ امریکی خاتون جل گئی۔ وہ واپس مڑنے کو تھی کہ ساتھیوں نے پھر اصرار کیا ''آپ تو اس قدر جلد گھبرا گئیں، ذرا چوٹی تک پہنچیے پھر دیکھیے گا'' ...... اُس وقت تک بچاری کا لباس نمی سے شرابور ہو چکا تھا۔ لیکن وہ مردہ بدستِ زندہ پھر چڑھائی چڑھنے لگی۔ آخر خدا خدا کر کے یہ لوگ چوٹی پر پہنچے۔ دیکھا کہ ہر طرف دھند کے بادل چھائے ہیں، کہرے کے انبار لگے ہیں اور دور اُفق پر کچھ پہاڑوں کی چوٹیاں دھندلی دھندلی نظر آ رہی ہیں...... امریکی خاتون نے جل کر کہا۔ ''یہاں تو دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں!'' ...... جواب ملا ''یہی تو نکتہ ہے۔ ہم لوگ یہاں ہیں'' کچھ بھی نہیں'' دیکھنے آئے تھے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اشیا کا نظارہ کرنے اور ''کچھ نہ دیکھنے'' میں بہت فرق ہے۔ بہت سے سیاحوں کا یہ حال ہے کہ وہ بہت سی چیزیں دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتے اور جو کچھ نہیں دیکھتے وہی لوگ بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ یہ سنا ہے کہ فلاں مصنف اپنی نئی کتاب کا ''مواد اکٹھا کرنے فلاں غیر ملک کی سیر کر

رہا ہے۔'' مجھے ہمیشہ اس ابوالعجبی پر ہنسی آتی ہے۔ دوسرے ملک کو اس خاطر تو کوئی جب جائے کہ وہ اپنے ملک، اپنے شہر میں بسنے والی مخلوق کی زندگی کا ہر پہلو دیکھ چکا ہو اور اس کے تمام پہلوؤں کو کھنگال بھی چکا ہو۔ جس شخص کو اپنے ملک، اپنے شہر میں کچھ نظر نہیں آیا (اپنے ملک، اپنے شہر میں دیکھنے کا اتنا سامان ہوتا ہے کہ ساری عمر اسے دیکھنے کے لیے ناکافی ہے) اسے دوسرے ملک میں کیا نظر آئے گا؟

اس بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیر و سیاحت کی غایت، اس کا فلسفہ یہ ہے کہ دیکھنے کی صلاحیت سے کام لیا جائے۔ اس صورت میں یہ امتیازی اٹھ جاتا ہے کہ سیر و سیاحت کے لیے کسی دوسرے ملک کا سفر کیا جائے یا اپنے ہی قصبے کے آس پاس، فراغت کی ایک سہ پہر کو کھیتوں کی سیر کی جائے۔ اِن دونوں کی غایت اور ماہیّت میں کوئی فرق نہیں۔

چینی ادیب چن شِنگ تان نے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں۔ مسافر کے پاس سب سے ضروری سامان یہ ہونا چاہیے کہ ''اس کے دل میں ایک خاص جذبہ، ایک خاص ذوق ہو اور اس کی آنکھوں میں خاص بصیرت ہو۔'' یعنی لازم یہ ہوا کہ محسوس کرنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھ اصل زادِ سفر ہیں اور بس اگر مسافر اور سیاح ان دونوں سے بے بہرہ ہے تو اس کا پہاڑوں پر جانا اپنا وقت خراب کرنا ہے اور روپیہ ضائع کرنا ہے۔ اس کے برعکس اگر ''اس کے دل میں خاص جذبہ خاص ذوق موجود ہے اور اس کی آنکھوں میں بصیرت کی روشنی بھی ہے'' تو وہ پہاڑوں پر جائے بغیر بھی سفر، سیر و سیاحت کے حقیقی لطف اٹھا سکتا ہے۔ وہ گھر میں بیٹھ کر یا کھیت میں پھر کر کسی آوارہ بدلی، کسی کتے یا کسی اکیلے درخت کو دیکھ کر بھی یہ سارا مزہ حاصل کر لے گا۔

گویا سفر کا حقیقی آرٹ چن شنگ تان کے لفظوں میں یہ ہے:

> ''میں نے لوگوں کے سفر نامے پڑھے ہیں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ سفر اور سیاحت کے حقیقی آرٹ سے واقف ہیں۔ جو شخص سفر کرنا جانتا ہو وہ آسمان اور زمین، سمندر اور خشکی کے لامتناہی مناظر کو دیکھنے، ان کی عظمت، اُن کے اسرار کی تہ تک پہنچنے کے لیے لمبے سے لمبے سفر سے نہ گھبرائے گا۔ لیکن اس کے دل کا جذبہ حقیقی اور اس کی آنکھوں میں بصیرت کی روشنی اُسے بتا دے گی کہ فطرت کے مظاہر کے حسن و خوبی اور اسرار کو دیکھنے کے

لیے خوبصورت مقامات کو جانا ہی ضروری نہیں۔ایک دن یہ سیاح اپنی ٹانگوں کی بہت سی طاقت خرچ کر کے، اپنی آنکھوں اور اپنے ذہن کی بہت سی صلاحیتیں خرچ کر کے کسی غار کو دیکھنے کے لیے جاتا ہے۔اگلے دن وہ پھر اپنی ٹانگوں کا کس بل، اپنے ذہن، اپنی آنکھوں کی طاقت خرچ کر کے کسی اور خوبصورت مقام سے لطف اٹھانے جاتا ہے۔اب جو لوگ اس شخص کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے یہی کہ اٹھیں گے ''بھائی! کیا مزے لے رہا ہے یہ شخص کہ ہر روز ایک نئی جگہ، ایک نئے مقام کی سفر کو جاتا ہے۔آج ایک غار کو دیکھا تو کل کوئی اور خوبصورت جگہ گیا۔'' یہ وہ لوگ ہیں جن کی سمجھ میں اصل نکتے کی بات بالکل نہیں آسکتی۔نکتہ یہ ہے کہ یہ سیاح جن دو مقامات کو دیکھنے گیا تھا وہ ایک دوسرے کے پاس پاس تو نہ تھے۔ کون جانتا ہے کہ اِن دو جگہوں میں بیس یا تیس میل کا فاصلہ تھا، سات آٹھ میل کا، دو ایک میل کا، یا صرف آدھ ہی میل کا فاصلہ تھا......اور یہ فاصلہ ہی تو اصل چیز ہے کیونکہ اس شخص کے دل میں خدا نے جو ذوق پیدا کیا ہے اور اس کی آنکھوں کو بصیرت کی جو روشنی عطا کی ہے اس کی بدولت اس شخص نے اس درمیانی فاصلے کو بھی انہیں آنکھوں اور اسی دلی ذوق وشوق سے دیکھا ہوگا جس طرح اُس نے اس چٹانی غار یا اس خوبصورت منظر پر نظر ڈالی تھی۔''

''مجھے تسلیم ہے کہ اِس چٹانی غار کی ہیبت اور خوبصورت منظر کی عظمت میں ایسا عنصر ہوتا ہے جو آنکھ کو خوف زدہ کرتا ہے اور ان چیزوں کو دیکھ کر یکا یک ہماری روح حیرت کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے کہ مادرِ فطرت نے اپنی لازوال قوت، دانش اور کارسازی کی بدولت کیسی کیسی چیزیں بنائی ہیں مگر اِن پر شکوہ چیزوں سے قطع نظر میں نہ تو بارہا کسی معمولی سے پودے بلکہ کسی پرندے کے ایک پر، کسی مچھلی کے ایک فلس، کسی پھول کی ایک پنکھڑی، گھاس کی ایک پتی کو غور سے دیکھا ہے اور یہی پایا ہے کہ مادر فطرت نے کسی مہارت، کس دانشِ عظیم، کس بے پناہ قوت سے اِن بظاہر معمولی چیزوں کو تخلیق کیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ جنگل کا شیر کسی مست ہاتھی یا کسی معمولی سے جانور پر حملہ کرنے میں ایک سی قوت استعمال کرتا ہے۔ اصل میں یہی خاصہ مادرِ فطرت کا ہے کہ وہ ہر بڑی سے بڑی اور معمولی سے معمولی چیز کی

تخلیق میں ایک سی قوت ومہارت خرچ کرتی ہے۔ مادرِ فطرت کی عظیم چٹانی غار، کسی خوبصورت منظر کی تخلیق کرنے میں سارا زور لگا دیتی ہے اور وہ کسی چھوٹے سے پرندے، کسی مچھلی، کسی پھول، گھاس کی کسی پتی بلکہ پرندے کے ننھے سے پر، مچھلی کے فلس، پھول کی پنکھڑی اور چھوٹے سے چھوٹے پتے کی تخلیق میں بھی پوری قوت صرف کرتی ہے۔ اس لیے چٹانی غار یا کوئی خوبصورت منظر ہی تنہا وہ چیزیں نہیں جو آنکھوں اور دل پر اپنی ہیبت کا سکہ جماتی ہیں بلکہ اس کائنات کی معمولی سے معمولی چیز کا یہی عالم ہے۔

''اس کے علاوہ کیا ہم نے یہ کبھی سوچا ہے کہ یہ چٹانی غار اور یہ خوبصورت منظر کس طرح وجود میں آئے۔ چونگ زے نے کیا خوب کہا ہے۔ ''گھوڑے کے مختلف اعضا کو سمجھنے کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم گھوڑے کے وجود کو سمجھ گئے کیونکہ جسے ہم گھوڑا کہتے ہیں وہ ان اعضا سے پہلے بھی موجود تھا۔'' ایک اور مثال لیجیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑی بڑی جھیلوں کے اردگرد گھنے جنگل اُگے ہوئے ہیں، اور بڑے پہاڑوں پر درختوں اور پتھروں نے چھاؤنی چھاتی ہے...... سیاح تو یہ دیکھ کر خوش ہتا ہے کہ ان گھنے جنگلوں، لاتعداد پتھروں اور چٹانوں کو جمع کر کے جھیلیں اور بڑے بڑے پہاڑ بنائے گئے لیکن یہ یاد رہے کہ سر بلند چوٹیاں چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے مجموعے سے بنتی ہیں اور بڑے بڑے آبشار ننھے ننھے نالوں اور جھرنوں سے مل کر بنتے ہیں اگر ہم ان چوٹیوں کو ایک ایک کر کے دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ان کو وجود میں لانے والے پتھر عام طور پر ہاتھ کی ہتھیلی سے بڑے نہیں ہوتے، اور آبشاروں کو وجود میں لانے والے نالے پانی کی معمولی دھاریں ہیں اور بس۔ اسی لیے فلسفی لاؤتزے نے کہا تھا ''تیس تار کسی چکر یا پہیے کے دھرے کے اردگرد جمع کیے جاتے ہیں اور جب یہ اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں تو ایک پہیہ اور پھر چلتی ہوئی ایک گاڑی وجود میں آتی ہے۔ ہم مٹی کو گوندھ کر ایک برتن بناتے ہیں۔ مٹی اپنا وجود کھو دیتی ہے تو ایک کارآمد برتن ہمیں ملتا ہے۔ ہم دیواروں میں شگاف کرتے ہیں کہ ان میں کھڑکیاں اور دروازے نکالیں جب یہ کھڑکیاں اور دروازے اپنا وجود گم کرتے ہیں (خلا بن جاتے ہیں) تو ہمیں

رہنے کے لیے گھر ملتا ہے۔

اسی طرح جب ہم کسی چٹانی غار یا کسی خوبصورت مقام کو دیکھتے ہیں، گودی سر بلند چوٹیاں دیکھتے ہیں، عمودی پہاڑوں میں سے گزرتے ہوئے درے اور باٹیں دیکھتے ہیں، ان دروں کو دیکھتے ہیں جو آہستہ آہستہ اوپر اٹھتے اٹھتے پہاڑ کی اندھی عمودی گھاٹی بن جاتے ہیں، ان دروں کو دیکھتے ہیں جو نیچے ہوتے ہوتے ایک جگہ پہنچ کر دریا بن جاتے ہیں، ان دروں کو دیکھتے ہیں جو نشیب میں آتے آتے بالکل ہموار سطح مرتفع بن جاتے ہیں، ان دروں کو دیکھتے ہیں جو دو گھاٹیوں کو اس طرح ملاتے ہیں گویا ان پر پل باندھ دیا گیا ہو اور پھر ان دروں کو دیکھتے ہیں جو آپس میں ملتے ملتے کسی گہرے پہاڑی نالے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ان تمام کو دیکھ کر ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ چاہے۔ یہ اپنی عظمت اور اپنے پراسرار شکوہ میں کتنے ہمہ گیر اور کتنے ہمہ رنگ کیوں نہ ہوں، یہ عصمت اور یہ شکوہ اسی وقت پیدا ہوا جب انھوں نے اپنی انفرادی شخصیت کھوئی، اپنا الگ وجود مٹایا اور ایک کل میں مل کر ایک ہو گئے۔ کیونکہ جب یہ اپنا وجود کھو بیٹھے تو پھر کو درّہ، کوئی گھاٹی، کوئی دریا، کوئی سطح مرتفع، کوئی نالا نہ رہا، ایک منظر رہ گیا...... اور ان کے اپنی انفرادیت مٹا دینے اور کل میں مدغم ہونے کا یہ کرشمہ ہے کہ ہمارے سینوں میں ذوقِ جمال اور ہماری آنکھوں میں نورِ بصیرت پیدا ہوا اور اس ذوق اور بصیرت کو آسودگی اور نظارے کی آزادی ملی اور چونکہ ہمارے دلوں کا یہ ذوق اور آنکھوں کا یہ نورِ بصیرت نظارہ کرنے میں اتنا آزاد ہوا کہ ان کے سامنے مظاہر فطرت نے اپنا انفرادی وجود مٹا دیا تو پھر ہمیں کوئی خاص چٹانی غار یا کوئی خاص خوبصورت مقام دیکھنے کے لیے جانے کی ضرورت کیا رہی؟ اب تو ہر جگہ اور ہر مقام پر یہ ذوق جمال اور نور بصیرت آسودہ ہو سکتا ہے۔

''گویا میرے سینے کے ذوقِ جمال اور میری آنکھوں کے نور بصیرت کو یہ آزادی مل گئی کہ جہاں چاہے نظارہ کرے اور جو چاہے دیکھے کیونکہ ان مظاہر نے اپنی انفرادیت، اپنا الگ وجود ختم کر دیا تو پھر کیا۔ یہ بالکل غیر ضروری نہیں کہ میں لازم طور پر کسی چٹانی غار اور ایک

خوبصورت مقام کو دیکھنے کے لیے جاؤں؟...... کیونکہ ان مقامات کے درمیانی فاصلے میں، ان بیس تیس میلوں میں یا ایک آدھ میل کی مسافت ہی میں کیا ہر قدم پر ایسی چیزیں موجود نہیں جو اپنا وجود کھو کر کسی کل میں مدغم ہیں؟ کیا اس مسافت میں کوئی چھوٹا سا خمیدہ پل، کوئی تنہا ٹڑا مڑا پیڑ، کہیں بہتا پانی، کوئی چھوٹا سا گاؤں، کوئی جانور کیا یہ سب بھی اسی طرح کے مظاہر نہیں؟...... مجھے کیا معلوم ہے کہ اس چٹانی غار یا اس خوبصورت مقام کا پر اسرار حسن، اس کی عظمت صرف اسی سے مخصوص ہے؟...... کیا وہی پر اسرار حسن اور وہی عظمت ان دوسرے مظاہر میں نہیں؟''

''ایک بات اور بھی ہے...... یہ بھی لازم نہیں کہ ہمارے سینوں میں وہ خاص ذوقِ جمال اور ہماری آنکھوں میں وہ خاص نور بصیرت ہو اگر چلنے پھرنے اور سیر کرنے کے لیے ان دو خوبیوں کی ضرورت ہے تو پھر دنیا میں شاید ایک بھی شخص ایسا نہ ملے گا جو سفر کے آرٹ کو سمجھتا ہوگا۔ بندہ چن شنگ تان یہ عرض کرتا ہے کہ نہ کوئی خاص ذوق جمال ہوتا ہے جو چلنے پھرنے کے لیے ضروری ہے، نہ کوئی خاص نور خاص نورِ بصیرت چاہیے، جو ہمیں آزادی سے سیر کرائے...... می فائی نے چٹانوں کی خوبیاں معلوم کرنے کے لیے یہ معیار قرار دیا تھا کہ ان میں خطوط کی نزاکت، لہروں کا سا حسن، صفائی اور نفاست ہونی چاہیے۔ میں پوچھتا ہوں، کیا راستے میں جو پانی کا چھوٹا سا جوہڑ، کوئی گاؤں، کوئی پل، پیڑ، یا کوئی کتا دیکھتے ہیں۔ ان سب میں یہی خصوصیات موجود نہیں ہوتیں؟ اگر ہمیں ان میں یہ خوبیاں نظر نہیں آتیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں ان کی طرف اس طرح دیکھنا، ان کا اس طرح مشاہدہ کرنا نہیں آتا جس طرح فی فائی نے چٹانوں کا مشاہدہ کیا تھا اگر ہمیں ان میں بھی خطوط کی نزاکت، ترکیب کا حسن، حدود کی وضاحت نظر آ جائے تو ہمیں ان کی تکمیل پر بھی حیرت ہو گی اور ہمارا ذوقِ جمال اور نورِ بصیرت انہی کے گرد گھومے گا اور آسودہ ہو سکے گا۔ آخر چوٹیوں، پہاڑی سلسلوں اور پہاڑ کے دروں، گھاٹیوں، دریاؤں، ڈھلانوں، پلوں، گہرے کھڈوں، چٹانی غاروں اور خوبصورت مقامات کی عظمت اور پر اسرار حسن میں نفاست،

لہراؤ، وضاحت اور نزاکت کے سوا اور ہے کیا؟......"

"اسی لیے جو لوگ محض چٹانی غاروں اور خوبصورت مقامات دیکھنے پر مصر ہیں وہ راہ میں بہت کچھ بے دیکھے چھوڑ جاتے ہیں...... سچ یہ ہے کہ انھوں نے کچھ بھی نہیں دیکھا ہوتا۔ کیونکہ وہ لوگ جو کسی جھاڑی یا کسی کتے کی خوبی اور پراسرار حسن کو نہیں دیکھ سکتے وہ چٹانی غاروں اور خوب صورت مقامات میں بھی صرف وہ عناصر دیکھ پائیں گے جن کا عظمت، خوبی، اور پراسرار حسن سے کوئی واسطہ نہ ہوگا۔"

"میرے دوست توَ شان نے کہا "انسان کی تاریخ میں سفر کا آرٹ صرف ایک ہستی کو معلوم تھا اور وہ کنفیوشس کی ہستی تھی۔ اس کے دوسرے درجے پر چنبیلی خطاطی کا استاد دانگ سی چپہ ہے......" میں نے وضاحت چاہی تو توَ شان نے کہا "مجھے اس کا اندازہ کنفیوشس کے بارے میں دو فقروں سے ہوا کہ کنفیوشس کے نزدیک "چاول کبھی اتنے سفید نہیں تھے جتنے ہونے چاہئیں اور گوشت کا قیمہ کبھی اتنا عمدہ نہ تھا جتنا ہونا چاہیے"...... رہا وانگ تو مجھے اس کے سچے ذوقِ سفر کا اندازہ اس کی خطاطی سے ہوا ہے۔"

"میں نے کہا: "دوست تم جو کچھ کہا ہے اس سے باقی انسانیت کے ذوق اور سمجھ بوجھ کا تو دیوالا نکل گیا"۔"

"چنانچہ ایک دفعہ توَ شان نے بتایا "استاد وانگ سی چپہ کا یہ حال تھا کہ جب وہ گھر میں ہوتا تو سارا سارا دن اپنے آنگن میں پھولوں کی ہر شاخ کے ہر پھول کی ہر پتی، ہر رگ و ریشہ گنتا رہتا اور اس انہماک سے کہ دن دن بھر کس سے کلام نہ کرتا۔ بیچارے شاگرد سارا دن آس پاس تولیے اور رومال لیے کھڑے رہتے"...... میں نے پوچھا "اس کا ثبوت کیا ہے؟" اس نے کہا "مجھے اس کا ثبوت میرے دل نے مہیا کیا ہے......"

"یہ ہے توَ شان، میرا دوست۔ مگر افسوس ہے کہ دنیا نے اسے پہچانا نہیں، نہ اس کے زبردست تخیل کی قدر کی ہے۔"

2- مِنگ لیاؤ زے کے سفر

(یہ ایک چینی اسکیچ کا ترجمہ ہے۔اس میں مرکزی کردار وہ آوارہ گرد، آزادہ رو شخص ہے جسے چینی ادب اور ثقافتی روایات نے اپنی تہذیب کے لیے مایہ ناز سمجھا ہے۔ یہ پارہ خوش باشی اور بے فکری کے نظریہ زندگی کا آئینہ ہے۔ایسی زندگی جو محبت، آزادی اور آوارہ گردی سے عبارت...... یہ پارہ، تو لنگ کا لکھا ہوا ہے جو سولھویں صدی کے اواخر میں زندہ تھا۔تُو لنگ کو بھی سُو دین چانگ،یُو چُنگ لانگ۔لی چاؤ وغیرہ جیسی عظیم شخصیتوں کی طرح چین کے تنگ نظر نقادوں نے بھی وہ رتبہ نہیں دیا جس کے وہ ہر لحاظ سے مستحق ہیں......اب ترجمہ ملاحظہ ہو۔)

i- فرار

''مِنگ لیاؤ زے ایک سرکاری اہلکار تھا۔اسے اپنی سرکاری زندگی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ اپنے ضمیر کے خلاف اور اپنی مرضی کے خلاف عمل کرتے کرتے تنگ آ چکا تھا۔''ضمیر کے خلاف عمل کرنا'' یہ ہے کہ مہمان اور میزبان ایک دوسرے کے ساتھ نہایت تکلف سے ملتے ہیں اور موسم کے بارے میں چند ایک سرسری باتیں کرنے کے بعد زبان نہیں کھول سکتے۔

کئی حضرات زندگی میں پہلی دفعہ ہم سے ملتے ہیں، ان کا تپاک اور گرم جوشی قابل دید ہوتی ہے۔ وہ بات بات میں ہمیں دلی دوست کہہ کر مخاطب کرتے ہیں لیکن پیٹھ پھیرتے،ہم اور وہ، دونوں ایک دوسرے کے وجود سے قطعی غافل اور بے پرواہو جاتے ہیں۔

ہم کسی شخص کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور جونہی وہ جاتا ہے ہم اسی کی برائی اور عیب جوئی کرتے کرتے اسے بدترین شخص کہہ ڈالتے ہیں۔

اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ ہم لوگ آپس میں بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں تو خاص قسم کا رکھ رکھاؤ قائم رکھتے ہیں۔ حالانکہ ہم ایک دوسرے سے نہ جانے کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ہم گفتگو کے دوران میں بڑی اونچی اونچی باتیں کرتے ہیں لیکن ہمارے ذاتی اخلاق کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہمیں ڈر ہوتا ہے کہ ہم نے دل کی بات کہہ دی تو سچ کھل جائے گا اور سچی بات کڑوی ہوا کرتی ہے۔اس لیے ہم اصل بات اصل خیال کو پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں اور نہایت معمولی موضوعات پر الٹی سیدھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بعض

دفعہ تو ہم اپنے اصل خیالات چھپانے کے لیے اداکاری کے سہارا لیتے ہیں، جھوٹی آہیں بھرتے ہیں، اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ حتی کہ ہمارے کان، آنکھیں، ذہن، ناک، کچھ بھی ہمارا نہیں رہتا۔ ہمارا غصہ، غصہ نہیں ہوتا۔ ہماری ہنسی جھوٹی ہوتی ہے۔ ہماری نرمی اور ملایمت بالکل مصنوعی ہوتی ہے۔

سماج کی یہ پرانی ریت ہے اور اسے کسی طرح سدھارا نہیں جا سکتا۔ خیر یہ تو ہوئیں اپنے ضمیر کے خلاف باتیں۔ اپنی عزتِ نفس اپنی خودداری کے خلاف ہمیں کیا کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا؟

ہمیں اپنے برابر کے لوگوں کی خواہ مخواہ عزت کرنی پڑتی ہے اور دن دن بھران کے آگے پیچھے پھرنا پڑتا ہے۔ بعض لوگوں سے ہم اپنے تعلقات بلاوجہ ختم کر دیتے ہیں اور ان سے اتنا دور ہو جاتے ہیں گویا وہ ہمارے جانی دشمن ہیں۔ اسی طرح بلاوجہ ہم کچھ لوگوں کے قریب تر آنا چاہتے ہیں حالانکہ ان میں اہم میں کوئی قدر مشترک نہیں پھر یہ کہ جونہی کوئی صاحب اختیار حاکم زبان کھولتا ہے ہم پوری آوازی سے اس کے ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ حالانکہ یہ حاکم صرف ایک اشارے سے ہماری زندگی ختم کر سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ بڑی خصوصیت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے جاتے ہیں حالانکہ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کیا پرانے بادشاہوں نے یہ سماجی قانون اس لیے بنائے تھے کہ ہم اس صورت میں ان کی پابندی کریں؟...... ہم سرکاری لباس پہنتے ہیں، پیٹی اور بکلس لگا کر قیدی بندر کی طرح اکڑتے ہیں اور جسم پر کہیں کھجلی ہو تو مارے تمیز اور آداب کے ہاتھ بڑھا کر کھجا بھی نہیں سکتے۔ حد یہ ہے کہ جب بازاروں کی سیر کرتے پھرتے ہوتے ہوں اس وقت بھی ہم سماج کے سخت گیر قوانین، اخلاق کے ضابطوں اور آداب کے تقاضوں کی پابندی کرنے پر مجبور ہیں...... ہماری آنکھیں ہماری ناک تک تو دیکھ سکتی ہیں لیکن دور تک دیکھنے کی جرات اور تاب نہیں رکھتیں اگر دیکھیں تو دوسرے فوراً یہ کھول لگانے کی کوشش کریں گے کہ ہمارا مقصد کیا ہے؟ کہیں چل پھر رہے ہوں یا بیٹھے ہوں تو ضروری حاجت کے لیے بھی معذرت کے بغیر ہم نہیں جا سکتے اور اونچے افسروں کا تو عجب حال ہے۔ ان کے سامنے ہر وقت تلوار منڈلاتی رہتی ہے اور لوگوں کی نکتہ چینیاں ان کا پیچھا کرتی ہیں۔ سردی گرمی، انھیں پریشانی کرتی ہے، مال جمع کرنے کی حرص اور نقصان کا ڈر ان کے دلوں کو کھائے جاتا ہے۔ اور یہی فکر انہیں لے ڈوبتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ نہایت عالی دماغ اور عالی ظرف لوگ جب حاکم بنائے گئے تو انھیں بھی اسی چکر میں گرفتار ہونا پڑا۔

اپنے دل اور اپنی روح کو انھیں بندھنوں سے آزاد کرانے کے لیے منگ لیاوَ زے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ یہی اس کے سفر کی بنیادی وجوہ ہے۔

اس مرحلے پر شاید یہ اعتراض ہو کہ ''تاوَ (قانونِ فطرت) کے پیروؤں کو دیکھو۔ وہ تنہا رہتے ہیں اور تنہائی محسوس نہیں کرتے۔ ہجوم میں زندگی بسر کرتے ہیں لیکن ہجوم کا شور انھیں پریشان نہیں کرتا۔ یہ لوگ دنیا میں رہتے ہیں مگر دنیا سے بالکل الگ جہان بساتے ہیں۔ وہ کسی بندھن، کسی قید کے زندانی نہیں ہوتے مگر انھیں آزادی کی بھری ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے سکون واطمینان کا یہ حال ہے کہ بہت جلد ان کی بائیں بغل سے بیدِ مجنوں کا پودا اگ آتا ہے اور کوئی پرندہ ان کے بالوں میں گھونسلا بنالیتا ہے اور شانتی اور آنند کی معراج یہی ہے۔ برتن مانجھنا اور خاکروبی کرنا لوگوں کے نزدیک سب سے گھٹیا درجے کے کام ہیں لیکن درویش ان سے گھبراتا نہیں۔ تم بتاوَ کہ تم جو سرکاری زندگی کی قیود سے گھبراتے ہو اور اَن دیکھے مقامات کا سفر اختیار کر کے جسم کو آزادی دینا چاہتے ہو اس کی بدولت کیا تم اپنی روح کو اپنے جسم کا غلام تو نہیں بنا رہے؟''

اور منگ لیاوَ زے جواب دیتا ہے۔ ''جو شخص قانونِ فطرت کا عارف ہے وہ اگر پانی میں کودے تو اس کا دامن تر نہ ہوگا، آگ میں کودے تو آگ اسے نہ جلائے گی، وہ ٹھوس چیزوں پر ایسے چل سکتا ہے جیسے خلا میں اڑ رہا ہے، اور خلا میں ایسے چل سکتا ہے جیسے ٹھوس زمین پر چل رہا ہے۔ یہ اس کے لیے بالکل معمولی باتیں ہوں گی مگر میں اس قانونِ فطرت کا عارف نہیں۔ میں اس کا شیدائی، اس کا متوالا ضرور ہوں۔ جو شخص اس کا عارف ہے اسے اپنے آپ پر پوری قدرت ہوتی ہے اور ساری کائنات کے اسرار اس کے لیے حل کر دیئے جاتے ہیں۔ اسے ہجوم کے شور اور گندگی میں پھینک دیجیے تو وہ کنول کے پھول کی طرح نظر آئے گا اور جو میلے اور گندے پانی میں بھی اُگ سکتا ہے۔ یہ پانی اسے چھوتا ضرور ہے لیکن اسے گندہ نہیں بنا سکتا چنانچہ قانونِ فطرت (تاوَ) کے عارفوں کو دنیا میں کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر میں اتنا اونچا نہیں ہوں۔ میری مثال بیدِ مجنوں کی ہے جو ہوا کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ جب ہوا ساکن ہو تو یہ بھی ساکن ہوتا ہے، جب ہوا چلتی ہے تو یہ بھی جھومنا شروع کر دیتا ہے۔ میں تو پانی میں ریت کی طرح ہوں اگر پانی صاف ہو تو ریت بھی صاف ہوگی، پانی گدلا اور مٹیالا ہوگا تو ریت بھی گندی ہوگی۔ کئی بار مجھے پاکیزگی اور شانتی ملی ہے اور یہ کیفیت پورا پورا دن رہی ہے لیکن پھر پل جھپکتے ہی میں غائب ہوگئی ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہو سکا کہ ہر چیز کو اس کے حال

پر رہنے دوں اور مادّی ماحول مجھے پریشان نہ کر سکے۔ تاؤ کے قانونِ فطرت پر عمل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی اگر شہنشاہ اس پر عمل کر سکتے تو پھر چاؤ فو، سُو یو جیسے لوگوں کو دنیا چھوڑ کر چی کی پہاڑیوں میں گوشہ نشینی کیوں اختیار کرنی پڑی، شہزادے اِس پر عمل کر سکتے تو ساکی مُنی کو ہمالیہ کی کھو میں کیوں دنیا سے کنارہ کرنا پڑا؟ اگر حکومت کے کارندے تاؤ کے قانونِ فطرت پر عمل کر کے اسی دنیا میں رہ سکتے تو پھر یو آن مِنگ کو اپنا عہدہ کیوں چھوڑ کر جانا پڑا؟...... اسی لیے میں اپنے دل کو دنیوی بندھنوں سے آزاد کرانا چاہتا ہوں، اپنی روح کو ان سے رستگاری دلانا چاہتا ہوں اور ہمیشہ کے لیے بےفکری کی دنیاز میں سفر کرنا چاہتا ہوں۔

مِنگ لاؤزے کا جواب سن کر اس کا دوست کہتا ہے ''اچھا اپنے سفر کے حالات مجھے لکھتے رہنا۔'' مِنگ لیاؤزے جواب دیتا ہے:

''جو شخص سفر کرتا ہے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُس کی آنکھیں اور کان اور اس کی روح آسودہ ہو۔ وہ ملک ملک کی سیر کرتا ہے تاکہ ''مدعائے حقیقی'' کو پالے، ان عارفوں اور درویشوں سے ملے جو قانون فطرت پر حاوی ہیں۔ وہ ہوا کے دوش پر سوار وہاں جاتا ہے جہاں ہوائیں اسے لے جاتی ہیں۔ ان سیاحتوں سے وہ جب واپس آتا ہے تو وہ حجرے میں بند ہو جاتا ہے اور سکون سے اپنی موت کا انتظار کرتا ہے۔ میں تاؤ کے قانونِ فطرت پر حاوی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری روح میرے جسم کے اندر ہی رہے۔ میں اپنی خوبیوں کو علم اور نرمی سے اجاگر کرنا چاہتا ہوں اور خلا بن کر خلا ہی میں مل جانا چاہتا ہوں مگر ابھی میں اس پر قادر نہیں میں نے کوشش کی تھی کہ میری روح، میرے جسم کا ساتھ دے مگر میری روح میرے جسم سے کہیں غائب ہو گئی۔ میں نے اپنی خوبیوں کو علم اور نرمی سے اجاگر کرنا چاہتا مگر میں یکا یک جذباتی طوفانوں میں گھر گیا۔ میں نے چاہا تھا کہ فضا میں تحلیل ہو جاؤں مگر لطافت کے بجائے مجھ میں کثافت پیدا ہو گئی۔ شانتی اور سکون ڈھونڈنے سے نہ ملا تو میں نے باہر کی دنیا، اپنے گرد و پیش کا سہارا لیا کہ شاید اسی طرح روح کو سکون ملے۔ مجھے خوشی اپنے دل میں نہ ملی تو میں نے خارجی دنیا سے ایک خوبصورت منظر مانگ لیا کہ میں خوش ہو سکوں۔ اسی لیے میرے سفر عجیب وغریب تھے۔''

ii- سفر کا طریقہ

''میں اپنے ایک دوست کے ساتھ سفر پر روانہ ہوتا ہوں جسے پہاڑوں کے کہروں سے بڑی محبت ہے۔ہم دونوں کے پاس ایک ایک کمنڈل ہے۔ہم نے لمبے کرتے پہن رکھے ہیں اور ہمارے پاس ایک سو روپے نقد ہیں۔ہمیں اس سے زیادہ رقم کی ضرورت بھی نہیں۔ہم ضرورت کے وقت کام آنے کے لیے بس سو روپے ہی رکھتے ہیں۔شہروں اور دیہات سے گزرتے ہوئے ہم مانگ کر گزارا کرتے ہیں۔ہم سرخ ڈیوڑھیوں، سفید محلوں، تاؤ کے مندروں اور پجاریوں کے جھونپڑوں کے آگے، ہر جگہ خیرات کے لیے صدا کرتے ہیں۔ یہ خیال بھی ضرور کرتے ہیں کہ مانگا کیا جائے۔مثلاً ہم صرف چاول مانگتے ہیں، شراب نہیں۔ خیرات میں سبزیاں طلب کرتے ہیں، گوشت نہیں۔مانگنے کا لہجہ عاجزی کا ہوتا ہے مگر اس میں کوئی دکھ درد نہیں جھلکتا۔لوگ اگر دے دیں تو بھی ہم چلے جاتے ہیں اور اگر نہ دیں تو بھی ہم آگے بڑھ جاتے ہیں مانگنے کا سارا مقصد تو یہ ہے کہ ہم بھوک اور فاقے کو اپنے سے دور رکھیں اگر ہم سے لوگ سختی اور درشتی سے پیش آتے ہیں تو بھی ان سے جھک کر رخصت ہوتے ہیں۔بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آس پاس کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں سے ہمیں کچھ خیرات مل سکے۔پھر ہم مجبور ہو کر اپنے سو روپے میں سے ایک دو روپے خرچ کر ڈالتے ہیں اور جب بھی ممکن ہو سکے یہ سو روپے پھر پورے کر لیتے ہیں لیکن جب تک بہت مجبور نہ ہو ہم اس میں سے کچھ خرچ نہیں کرتے۔''

''سفر میں ہماری منزل کوئی نہیں۔ جہاں جی چاہا ٹھہر گئے۔ ہمارے سفر کی رفتار بہت ہی دھیمی ہے۔ کچھ پتا نہیں کہ دن بھر میں ہم کتنے میل طے کر لیتے ہیں۔مگر زیادہ سفر نہیں کرتے کہ کہیں مارے تھکن کے چور ہو کر رہ جائیں۔راستے میں اگر کہیں پہاڑ یا ندی نالے آجائیں تو چشمے، چٹانیں، مرغابیاں، اور پہاڑی پرندے ہم پر جیسے جادو سا کر دیتے ہیں۔ہم دریا کنارے یا کسی ٹاپو میں کوئی بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور پتھر پر بیٹھ کا فاصلوں پر نظریں جما لیتے ہیں۔سفر کرتے ہوئے راستے میں اگر لکڑ ہارے، مچھیرے، دیہاتی لوگ یا بوڑھے کسان مل جائیں تو ہم ان کا نام نہیں پوچھتے، نہ اپنا نام بتاتے ہیں۔نہ کبھی موسم ہی کی بات معلوم کرتے ہیں۔ بلکہ ان سے دیہاتی زندگی کی دلفریبی پر بات کرتے ہیں۔بس کچھ دیر باتیں کر کے ہم خوشی خوشی آگے چل دیتے ہیں۔

سخت سردی اور سخت گرمی میں ہمیں سائے یا پناہ گاہ کی ضرورت پڑتی ہے تا کہ کہیں موسم اپنا برا اثر نہ ڈالے اگر ہم سڑک پر جا رہے ہیں تو دوسروں کو پہلے راستہ دیتے ہیں۔ کشتی میں دریا پار کرنا ہے تو دوسروں کو کشتی میں پہلے سوار ہونے دیتے ہیں لیکن اگر طوفان آ رہا ہے تو ہم دریا پار کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہاں اگر دریا پار کرتے کرتے طوفان آ جائے تو ہم اپنے دلوں کو تسلی دیتے ہیں اور زندگی کے راز کو سمجھتے ہوئے اپنا معاملہ قسمت پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں ''اگر اس طوفان کی وجہ سے ہم ڈوب جائیں تو ظاہر ہے خدا کی مرضی یہی ہوگی، فکرمندی اور پریشانی ہمیں بچا تو نہیں سکتی۔ چنانچہ اگر ہم سلامت پار نہیں اتریں گے تو سمجھیے ہمارا سفر یہیں ختم ہوگیا اور اگر خوش بختی سے ہم بچ گئے تو ہم پہلے کی طرح پھر چل کھڑے ہوں گے۔'' اسی طرح راستے میں ہمیں کوئی جھگڑالو نوجوان مل جائے یا راہ چلتے چلتے اس سے بھڑ جائیں تو ہم معافی مانگ کر الگ ہو جاتے ہیں اگر دوسرا فریق ہماری معذرت قبول نہ کرے اور لڑائی جھگڑا گلے پڑ جائے تو ہمارا سفر رک گیا لیکن اگر اس جھگڑے سے ہم بچ گئے تو ہماری راہ نوردی پھر شروع ہو جائے گی...... ہم دونوں میں سے اگر ایک ساتھی بیمار ہو جائے تو ہم رک جاتے ہیں تا کہ بیمار ساتھی کی تیمارداری کی جا سکے۔ صحت مند ساتھی، علاج کے لیے کچھ رقم مانگ لاتا ہے اور دل میں تشویش کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ وہ اپنے من کے اندر دیکھتا ہے اور موت سے نہیں ڈرتا۔ چنانچہ اس اعتماد کی بدولت ساتھی کی سخت بیماری معمولی بیماری میں بدل جاتی ہے اور یہ معمولی بیماری بہت جلد ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اگر قسمت کا لکھا یہی ہے کہ ہمارا وقت آ گیا تو سمجھ لو کہ سفر ختم ہو گیا لیکن اگر بچ گئے تو حسبِ سابق ہمارا سفر پھر شروع ہو جاتا ہے۔

قدرتی بات ہے کہ ہماری راہ نوردی میں پولیس کے سراغ رساں اور سپاہی ہمیں مشتبہ سمجھیں اور ہمیں جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیں...... ایسا موقع آنے پر ہم کبھی تو چالاکی سے کام نکالتے ہیں، کبھی خلوص سے اگر اس کے چنگل سے نکل سکیں تو سفر ختم ہو گیا اور اگر بچ گئے تو سفر پھر شروع ہو جاتا ہے۔

راتوں کو ہم کسی جھونپڑے، کسی غار میں ٹھہر جاتے ہیں۔ ایسی جگہ نہ ملے تو کسی مندر کی ڈیوڑھی میں پڑ رہتے ہیں، کسی شخص کے گھر کے باہر سو جاتے ہیں یا اونچے درختوں کے نیچے رات گزار لیتے ہیں۔ کون جانے کہ پہاڑوں کی روحیں، شیر اور بھیڑیے ہمارے کھوج میں لگے رہتے ہوں مگر ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟ روحیں تو خیر کوئی گزند نہیں پہنچاتیں مگر شیروں اور بھیڑیوں سے اپنا بچاؤ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں چونکہ قسمت خدا

کے ہاتھ میں ہے اس لیے ہم اپنا معاملہ فطرت کے اٹل قانون پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اپنا چہرہ مہرہ تک، اس رنگ روغن تک نہیں بدلتے (چھپنے کے لیے۔ مصنف) اگر جنگلی جانور ہمیں کھا جائیں گے تو گویا تقدیر میں یہی لکھا ہوا ہوگا اور اس طرح ہمارا سفر یہیں ختم ہو جائے گا لیکن اگر ہم بچ جائیں تو ہمارا سفر پھر شروع ہو جائے گا۔''

iii- پاکیزہ بلندیاں

''میری منزل کیا ہے؟...... میں عام طور پر پانچوں مقدس پہاڑوں اور چاروں مقدس دریاؤں کو دیکھنے جاتا ہوں۔ ان تیرتھوں کی یاترا بھی کرتا ہوں جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہیں۔ ان کے علاوہ میں شمالی اور وسطی چین کی نو ریاستوں کے مشہور پہاڑ اور دریا دیکھنے کے لیے بھی سفر کرتا ہوں لیکن عام طور پر میں نو ریاستوں کے صرف ان علاقوں میں جاتا ہوں جہاں سے انسان کے قدم گزرے ہوں۔ جہاں تک چین کی آسمانی سلطنت سے باہر کے علاقوں کا تعلق ہے مثلاً ہمالیہ پہاڑ یا چینی سمندر کے دس چھوٹے اور دس بڑے جزیرے تو میں شاید ہی جگہیں دیکھنے جا سکوں کیونکہ پرواز کے لیے پر میرے پاس نہیں ہیں...... سیاحت کے دوران میں مجھے امید ہوتی ہے کہ میں ان شائقینِ علم سے ملوں جو پہاڑوں میں اور جھیلوں کے کنارے رہتے ہیں، یا ان صوفیہ سے ملوں جو غاروں میں چلّہ کش ہیں...... لیکن جہاں تک زندہ جاوید ہستیوں کا تعلق ہے میں ان سے شاید ہی مل پاؤں کیونکہ خود میرا جسم فانی ہے امر نہیں......''

''جب میں پانچوں مقدس پہاڑوں پر جاتا ہوں تو میں آسمانی ہواؤں سے بلند چوٹیوں پر کھڑا ہو کر چاروں سمندروں سے آگے نظر دوڑاتا ہوں۔ اردگرد اَن گنت چوٹیاں کیڑوں کی طرح سر اٹھائے نظر آتی ہیں۔ اَن گنت دریا بل کھاتی ہوئی دھاریوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور اَن گنت درخت بند گوبھی کے پھولوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اب بلندی پر کہکشاں میرے کالر سے لپٹی پڑتی ہے، سفید بدلیاں میری آستینوں سے کھیلتی ہیں اور شاہین اتنے نزدیک معلوم ہوتے ہیں کہ اگر ہاتھ بڑھاؤں تو انہیں چھو لوں سورج اور چاند میرے رخساروں کو چھوتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ ایسی بلندی پر میں بہت ہی ہلکی آواز میں بات کرتا ہوں۔ اس ڈر سے نہیں کہ پہاڑوں کی روحیں ناراض ہوں گی بلکہ اس ادب سے کہ خدائے برتر اپنے تخت پر بیٹھا کہیں میری آواز سن لے۔ اوپر آسمان کی چھت ہوتی ہے، فضا کی وسعتوں میں غبار کا شائبہ تک نہیں ہوتا اور نیچے رعد کے کڑکے اور بارش کے جھالے اور طوفان در دامن تاریکی ہوتی ہے لیکن اس بلندی پر ہمیں رعد کی گرج یوں سنائی دیتی

ہے جیسے کوئی بچہ غوں غاں کر رہا ہے۔ اس بلندی پر میری آنکھیں روشنی سے چندھیا جاتی ہیں اور میری روح، زمان ومکان کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتی ہے ہیں محسوس کرتا ہوں کہ میں دور دور کا سفر کرنے والی ہواؤں کی دوش پر سوار ہوں لیکن یہ نہیں جانتا کہ کہاں جاؤں۔ سورج مغرب میں چھپ جاتا اور مشرقی افق کے بطن سے چاند ابھرتا ہے تو بادلوں کی روشنی ہر طرف پھیل پھیل جاتی ہے۔ آسمان پر قرمزی اور لاجوردروشنی کے سوتے پھوٹ نکلتے ہیں اور آن کی آن میں دور اور قریب کی چوٹیاں گہرے رنگوں کا چولا اتار کر بالکل ہلکے رنگوں میں نہا جاتی ہیں یا پھر آدھی رات کو عجیب سماں ہوتا ہے۔ میں مندروں کی گھنٹیوں کی آواز اور شیر کی گرج سنتا ہوں پھر ہواؤں کی سائیں سائیں کان میں آتی ہے۔ بڑے مندر کا بڑا دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے۔ میں کپڑے پہن کر باہر آتا ہوں اور نکلتے ہی خرگوش کی روح (چاند) پر نظر پڑتی ہے۔ اوپر کی ڈھلانوں پر بچی کھچی برف کی تہیں ابھی باقی ہیں۔ رات کی ہلکی روشنی ان کے بے شکل تودوں کی صورت میں ڈھال دیتی ہے۔ دور کے پہاڑ دھندلی دھندلی سی لکیروں کی صورت میں نظر آتے ہیں...... اس وقت میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا جسم ٹھنڈی ہواؤں میں گھل گیا ہے اور ساری جسمانی خواہشیں ختم ہو کر رہ گئی ہیں...... پھر میں ان مقدس پہاڑوں کے دیوتا کو دربار لگاتے دیکھتا ہوں جہاں کمتر درجے کی روحیں باریاب ہو رہی ہیں۔ ہر طرف شامیانوں کے دل کے دل ہیں اور فضا روشن چوکی اور نوبت نقاروں کے نغموں سے گونج رہی ہے۔ محل کی چھتیں بادلوں کی چادر میں ملبوس ہیں اور مُہروں کے نمکیرے ہر طرف سر بلند ہیں۔ اس سارے محل یا دربار کی ہر چیز، ہر خط گہرا اور واضح بھی ہے، دھندلا اور نامعلوم بھی...... کبھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور کبھی یہ منظر آنکھوں سے دور ملعوم ہوتا ہے...... آہ! دیوتاؤں کا سنگیت سننا کتی بڑی سعادت ہے لیکن ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا یکایک اسے کیوں ختم کر دیتا ہے!

''ان پانچ مقدس پہاڑوں کے علاوہ کچھ اور مشہور پہاڑ بھی قابل دید ہیں۔ مثلاً ''زے منگ، چن ہُوا، کواسونگ، چن ننگ، ژُویی، چن نان، لوفو، موشان'' وغیرہ اور ایسے تیرتھ تو ان گنت ہیں جنھیں پریوں اور روحوں کی آماجگاہ کہا جاتا ہے۔ میں اِن تیرتھوں کو دیکھنے کے لیے لکڑی کی کھڑاویں اور بانس کی چھڑی لے کر نکلتا ہوں۔ سارے تیرتھوں کو تو جا نہیں سکتا لیکن جتنوں کی بھی یاترا ہو جاتی ہے کر لیتا ہوں۔ راستے میں چشمے کا پانی اور بنا پتی کھا پی لیتا ہوں۔ کوئی اونچی اور دشوار گزار چوٹی آجاتی ہے یا کوئی معلق گھاٹی راستہ روک لیتی ہے

جس پر کوئی آدمی چڑھ نہ سکا ہو تو میں اپنے آپ کو رسے سے باندھ کر کسی نہ کسی طرح چڑھ ہی جاتا ہوں۔ پتھر کے کسی ٹوٹے ہوئے پل یا کسی پرانی عمارت کے کھلے پھاٹک پر پہنچ کر رُکتا نہیں بلکہ میں بے جھجک اندر چلا جاتا ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی گہرا غار سامنے آجائے جس میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو اور صرف اس کی چھت میں سے روشنی کی ایک آدھ کرن کسی درز سے اندر آرہی ہو تو میں تنکوں وغیرہ کی مشعل جلا کر بے خوفی سے اس غار میں داخل ہو جاتا ہوں۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ شاید اس غار میں قانونِ فطرت یعنی تاؤ کا کوئی عارف کامل مل جائے یا شاید یہاں کوئی امر بوٹی اُگی ملے یا شاید ان عارفوں کی ہڈیاں مل جائیں جو اس دنیا کو چھوڑ چکے ہیں۔''

''میں مشہور دریاؤں اور چشموں کو دیکھنے بھی جاتا ہوں۔ پانی کے یہ گہرے ذخیرے مچھلیوں، اژدہوں اور آبی روحوں کے ٹھکانے ہیں۔ ہوا ساکن ہو اور پانی آئینے کی طرح ساکت ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ آسمانی اژدہا سکون سے سو رہا ہے۔ جب چمکتے چاند کی روشنی میں پانی کا رنگ آسمان کے رنگ میں گھل کر ایک ہو جاتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب اژدہوں کے بادشاہ کی شہزادی اور دریاؤں کی ملکہ اپنی پالکی میں سوار باہر آئے گی۔ اس کے ہاتھ میں بانسری ہوگی، وہ زرّیں ریشم میں ملبوس ہوگی اور اس کے زرّیں پاپوش چمکتی ہوئی لہروں کو روندتے ہوں گے۔ یہ جلوس کئی لمحے گزرتا رہے گا، پھر نظروں سے غائب ہو جائے گا۔ ہائے کتنی ٹھنڈک کتنی خنکی ہوتی ہے اس وقت''

''یا پھر وہ وقت ہے کہ طوفانی ہوائیں پانی کو کوڑے مارتی ہیں اور پرشور لہریں اٹھتی ہیں۔ ہمیں پتا چل جاتا ہے کہ سمندر کا عفریت، چی یہ کی روح سے مل کر یہ طوفان اٹھا رہا ہے۔ پھر یہ پھیلی ہوئی دھرتی چکی کی طرح گھما دی جاتی ہے، ہمارے گھر تنکوں کی طرح کانپتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ بوڑھا اژدھا چانگ اپنے نو بیٹوں کو ساتھ لے کر زمین سے آسمان کو پرواز کر رہا ہے...... وہ سماں کتنا مہیب، کتنا پرعظمت ہوتا ہے......

''اگر ہمیں عمدہ لباس پہننے والی عورتوں کا حسن پسند ہے تو پھر ہانگ چاؤ کی مغربی جھیل سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ جھیل کے کنارے بیدِ مجنوں کی قطاریں ہیں اور آلوچے کے شگوفے پانی میں اپنا عکس ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ شہنشاہ کی محبوب لی ہوا اپنا سنگاردان کھولے سنگار کر رہی ہے پھر کنول کے پھولوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ پی چو اور ہُوتہ جیسی حسینائیں ابھی ابھی نہا کر بال نچوڑتی ہوئی پانی سے نکلی ہیں۔ آسمان

صاف ہواور سورج چمک رہا ہوتو ساری جھیل پر خیرہ کن حسن کی تابانی ہوتی ہے اور صبح صبح لوگ اپنے اپنے مینار کی بالکونی سے جھک کر جھیل کو دیکھتے ہیں اور شام کو جھیل میں رنگین پتواروں والی کشتیاں چلاتے ہیں تو ہر طرف کیوفی کا افسانوی تبسم چھا جاتا ہے...... جب جھیل پر دھند چھا جائے، بارش تلی کھڑی ہو اور پہاڑیاں بھورے بادلوں میں چھپ جائیں تو دل کو اس وقت بھی بے پایاں خوشی ہوتی ہے کیونکہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ دُور شہنشاہ کی ملکہ سی شبیہہ کی تیکھی چتون پر بل آ گئے ہیں۔''

iv- واپسی

پھر مِنگ لیاؤزے آہستہ آہستہ چلتا ہوا، سی لنگ کے چھ پلوں سے ہوتا ہوا تیان چو اور لنگ چیاؤ پہنچتا ہے۔ یہاں وہ چند قدم فاضلوں کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے، پھر بادلوں میں چھپے ہوئے کسی غار میں (وحشی بگلے) ڈِنگ کا کھوج لگاتا ہے۔ اس کے بعد پُولو کا نمبر ہے جو مِنگ لیاؤزے کا روحانی گھر ہے کیونکہ اسی جگہ رحم کی دیوی کا مندر ہے۔ منگ لیاؤزے یہاں کنول کے پھول لینے اور پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھنے جاتا ہے جو بہت بڑی مسرت کا سرچشمہ ہے۔

اس طرح راہ نوردی اور دشت پیمائی میں منگ لیاؤزے کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ وہ خوش ہے اور پاپیادہ سیکڑوں ہزاروں میل طے کر ڈالتا ہے اور اگر کسی جگہ وہ کوئی ایسی چیز دیکھتا ہے جو کانوں کو خوش آئند محسوس ہو یا آنکھوں کو بھلی معلوم ہو تو وہ وہاں دس دن کے لیے ٹھہر جاتا ہے۔

وہ کسی مندر میں ارواحِ ثلاثہ پر غلبہ پانے کے لیے آسن جما کر بیٹھ جاتا ہے۔

تاؤ چنگ کے پانچ ہزار لفظ...... کیا یہ فلسفہ نہایت لطیف اور بے حد دقیق نہیں...... تاؤ (قانونِ فطرت) کی کتابیں...... فو سانگ کی ''کتاب زبرجد'' ین فو کی ''کتاب الاشا''...... کیا ان سب کے اسرار منگ لاؤزے پر کھلے نہیں؟ احکم الحاکمین اس کے زرخیز ذہن کی رہنمائی کرتا ہے اور مہاتما بدھ اس کی روحانی دانش کا راہبر ہے۔ چنانچہ منگ لیاؤزے جب بدلتی ہوئی دنیا کی علت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے گیان دھیان میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا، اس کے راہبر اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔

بودھ مندر میں مہاتما بدھ کا سنہری بت رکھا ہے جس کے گرد نورانی ہالوں کا حلقہ ہے۔ شمعیں جلا دی گئی ہیں اور لُوبان کا خوشبودار دھواں ہوا میں پھیل رہا ہے۔ تاؤ کے پجاری پھونس کی چٹائیوں پر درجہ بدرجہ بیٹھے

ہیں۔ وہ چائے پی رہے ہیں، پھل کھا رہے ہیں اور قدیم کتابوں کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ جب وہ تھک جاتے ہیں تو اپنا سانس روک لیتے ہیں اور پوری شانتی میں کھو جاتے ہیں۔ بڑی دیر کے بعد وہ اپنے آسن سے اٹھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ چاند دریچوں میں سے جھانک رہا ہے، ساری کائنات خاموشی میں کھو چکی ہے، مندر کا دربان اپنی پیشانی زمین پر رگڑ رہا ہے اور ملازم لڑکا انگیٹھی کے پاس پڑا سو رہا ہے ایسے موقع پر کوئی مادی خیال ذہن میں کیونکر آ سکتا ہے؟

پھر باہر کھلی زمین پر منگ لیاؤزے دیکھتا ہے کہ دیہات میں نیچی دیواریں کچے جھونپڑوں کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان پر سرکنڈوں کی چھتیں ہیں۔ تند و تیز ہوائیں چل رہی ہیں اور سورج جنگلوں پر ہلکی ہلکی دھوپ بکھیر رہا ہے مال مویشی اور بھیڑ بکریاں پہاڑی چراگاہوں سے باڑوں کو پلٹ رہی ہیں اور بھوکے پرند کھیتوں پر منڈلاتے ہوئے شور مچا رہے ہیں۔ ایک بوڑھا کسان پھٹے پرانے کپڑے پہنے، بال الجھائے شہتوت کے درخت کے نیچے ڈھوپ تاپ رہا ہے۔ ایک بوڑھی عورت مٹی کا کٹورا ہاتھ میں تھامے اسے روٹی کھلا رہی ہے۔ سارا منظر اداس ہے، ہم بھی اداس ہیں۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر چیز ایک تصویر کی طرح ہے۔ اگر کوئی تاؤ کا پیرو سفر میں ایسے مناظر کو معمولی سمجھتا ہو تو پھر اسے سفر ہی نہیں کرنا چاہیے۔

پھر کوئی بھی بڑا شہر آتا ہے جہاں بازاروں میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے اور گاڑیاں اور گھوڑے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ منگ لیاؤزے گاتا ہوا جا رہا ہے۔ وہ لوگوں کو دیکھتا ہے، دکانداروں، قصائیوں، موسیقاروں، جواریوں اور کھلاڑیوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور جب اس کا دل چاہتا ہے تو وہ کسی ہوٹل میں داخل ہو جاتا ہے۔ تیز شراب، سوکھی مچھلی اور پکی سبزیوں کا آرڈر دیتا ہے اور وہ اور اس کا ساتھی مل کر کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ جب نشے کی لہر اٹھتی ہے تو دونوں امر بوٹی کا گیت گاتے ہیں اور طمانیت و سکون کی نظروں سے دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ لوگ ان دونوں کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ یہ دو شخص پھٹے حالوں بھی اتنے خوش، اتنے دلکش نظر آتے ہیں۔ انھیں شک گزرتا ہے کہ وہ دونوں اِنسان نہیں بلکہ پریاں ہیں جو انسانوں کا قالب اختیار کر کے یہاں آ گئی ہیں تھوڑی دیر اِسی طرح موج میلا منانے کے بعد دونوں ساتھی آگے چل دیتے ہیں۔

اور اُدھر، بڑے پھاٹکوں والے محلوں میں امیر الامرا اور شہزادے یا بڑے بڑے عہدہ دار جشن منا رہے ہیں۔ قیمتی پلیٹوں میں کھانا لایا جا رہا ہے اور میز پر حسین عورتوں کا ہجوم ہے۔ ہال میں آرکسٹرا بج رہا ہے اور

نغموں کی جھنکار بادلوں کو چیرتی ہوئی آسمان تک پہنچ رہی ہے۔ باہر پھاٹک پر بوڑھا دربان بید کا ڈنڈا لیے کھڑا ہے۔ یینگ لیاؤزے پھاٹک کے اندر جا کر کھانے کے کمرے میں پہنچتا ہے کہ کھانا مانگے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں اور وہ بلند آواز میں حاضرین سے بڑی تمکنت سے کہتا ہے..... ''حاضرین والا۔ ذرا یہ شور بند کیجیے اور پھولوں پر شبنم کے قطروں والا گیت سنئے جسے تاؤ کا یہ حقیر پیرو پیش کرتا ہے:

پھولوں پر یہ اوس کے قطرے
کیسے چمکتے ہیں دیکھو!
تیز ہوا کا خوف نہیں ہے
آنے والی کل سے ڈرو!
پُورب اور رواں ہے دریا
کہکشاں جائے پچھم کو
محل منارے کل تھے جس جا
آج وہاں پر کھیتی ہو
اِک مُنکم ، انجانی کل ہے
آج کا یہ دن اچھا ہے
جام بدست گزارو اس کو
عیش کرو! بس عیش کرو!

پھولوں پر یہ اوس کی بوندیں
دیکھو کتنی تاباں ہیں
ان کی آب سے ان کی ہستی
جیسے پیارے پیارے موتی
صبح کی ضو میں لرزاں ہیں
تنے بیڑ جنگل بن ، بھی

آبادی کے گورستاں ہیں
ویراں رات، ہوا کی چیخیں
اُلو بولے ، گیدڑ روئیں
تند ہوائیں پتے رولیں
چشمے ان کو سمو لیں
راج محل پر کائی جمی ہے
عیش کرو! بس عیش کرو

مِنگ لیاؤزے نے جب گیت ختم کیا تو ایک مہمان بڑھک اٹھا۔ بولا ''یہ کون تاؤ کا پجاری رنگ میں بھنگ ڈالنے آ ٹپکا؟...... دو اِسے روٹی کا ایک ٹکڑا اور اسے رخصت کرو۔ مِنگ لیاؤزے نے روٹی لے لی، اور چلا گیا لیکن ایک دوسرے مہمان نے ملازم سے کہا ''جلدی جاؤ اور اسے واپس بلا کر لاؤ......'' پہلے مہمان نے کہا ''مگر یار وہ خواہ مخواہ بدمزہ کر رہا تھا ہمیں۔ اس لیے میں نے اسے روٹی دے کر بھیج دیا۔ اب اسے واپس بلا کر کیا کرنا ہے؟'' دوسرے مہمان نے کہا ''معلوم ہوتا ہے کہ قانونِ فطرت کے اس پیرو میں کچھ غیر معمولی باتیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ واپس آئے تو غور سے اُسے دیکھوں!'' پہلے نے کہا ''واہ، وہ تو ایک معمولی بھکاری ہے۔ اس میں غیر معمولی بات کیا ہوگی۔ اُسے تو بچا کھچا کھانا چاہیے اور بس......'' اتنے میں ایک اور مہمان کہتا ہے ''جو گیت اُس نے گایا، اس سے تو پتا نہیں چلتا کہ وہ بس ایک معمولی بھکاری ہی ہے۔

اس موقع پر ایک رقاصہ لڑکی جس نے سُرخ ریشم کا شفاف لباس پہن رکھا ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور کہتی ہے: ''میری ناقص رائے میں یہ شخص، انسان نہیں تھا، آسمان کا فرشتہ تھا کہ زمین پر آ گیا۔ اُس کی آنکھوں اور اس کی پیشانی سے نفاست ہویدا ہے۔ اس کی آواز صاف اور پاٹ دار ہے۔ اس نے صرف بھکاری کا تو بہروپ بھر رکھا ہے۔ اس کے رکھ رکھاؤ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عالی کے خاندانی آدمی ہے۔ جو گیت اس نے گایا وہ بھی خوبصورت اور پُر معنی ہے۔ یہ گیت فانی اِنسانوں کے گیتوں سے نہیں، آسمانی گیتوں سے لگا کھاتا ہے......کون بھکاری ایسا گیت گا سکتا ہے بھلا؟ ...... میں پھر عرض کروں گی کہ یہ شخص اصل میں فرشتہ ہے جو انسانی بہروپ میں ہمارے درمیان آیا۔ آپ لوگ اسے ضرور واپس بلایئے تاکہ اسے ہم کھو نہ

بیٹھیں۔''

آخری مہمان نے جواب دیا ''اس لمبی چوڑی بات کا فائدہ؟ دو گھونٹ شراب کی بات ہے۔ ہم اسے واپس بلاتے ہیں اور شراب پلاتے ہیں۔ بس معلوم ہو جائے گا کہ وہ بازاری آدمی ہے یا عالی نسب ہے۔''

سُرخ لباس والی حسینہ نہیں مانتی۔ وہ پھر کہتی ہے ''خیر، میں تو یہی کہوں گی کہ ہم لوگوں کی قسمت میں نہیں تھا کہ ایسی جاوداں مخلوق سے جی بھر کر مل لیتے'' پھر سبز لباس والی ایک حسینہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہے اور کہتی ہے ''آپ حضرات مجھ سے شرط لگائیں گے؟..... کوئی جا کر تاؤ کے اس پجاری کو واپس بلا لائے اگر وہ عارف کامل ثابت ہو تو وہ لوگ شرط جیت گئے جو اسے غیر معمولی انسان کہتے ہیں اور اگر ہم نے دیکھا کہ وہ معمولی بھکاری ہے تو وہ حضرات شرط جیت جائیں گے جو اسے معمولی انسان کہتے رہے ہیں'' سب لوگ اس تجویز پر اتفاق کرتے ہیں۔

اس پر یہ لوگ ایک خادم کو منگ لاؤزے کو واپس لانے کے لیے بھیجتے ہیں مگر وہ غائب ہو چکا ہے۔ اور واپس آکر جب خادم ساری محفل کو یہ بتاتا ہے کہ سُرخ لباس والی لڑکی کہتی ہے ''افسوس، وہ جادوانی مخلوق ہمارے ہاتھ سے نکل گئی! کمال ہے۔ ابھی وہ دروازے سے باہر گئے تھے اور یکا یک بالکل غائب بھی ہو گئے۔''

اپنی دھن میں من لاؤزے چھڑی اٹھائے، ٹہلتا ٹہلتا شہر کے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔ اس سفر میں وہ کوئی درجن بھر شہروں کے پاس سے ہو کر نکلتا ہے، مگر کسی شہر کے اندر نہیں جاتا۔ آخر وہ ایک ایسے شہر کے قریب پہنچتا ہے جس کی فصیل، کوہستان کے ساتھ ساتھ استوار ہے۔ فصیل پر نہایت عمدہ برج اور دمدمے بنے ہیں۔ شہر میں بڑے بڑے مندر سر اٹھائے کھڑے ہیں اور پانی کا بہت بڑا تالاب ہے۔ یہ بہار کا نہایت خوبصورت دن ہے۔ شاندار درختوں پر پرندے نغمہ ریز ہیں اور ہر طرف پھول کھلے ہیں۔ شہر کے مرد عورت نئے کپڑے پہنے، خوبصورت گاڑیوں میں سوار یا پھلدار کاٹھیوں والے گھوڑوں پر چڑھے بہار کا جشن منانے شہر سے باہر آئے ہیں۔ کچھ لوگ اونچے پیڑوں کے سامنے میں مجلس جمائے پی رہے ہیں۔ کچھ نے خوشبودار لمبی گھاس پر قالین بچھا رکھے ہیں۔ کچھ لوگ اونچے میناروں پر نظارہ کرنے چڑھے ہوئے ہیں۔ کچھ نے ہر پل ایسی کشتیوں پر سیر کی ٹھان رکھی ہے..... بہت سے لوگ شانہ بشانہ سواری کرتے پھول دیکھنے جا رہے ہیں۔ کچھ

من چلے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے گاتے پھرتے ہیں۔ منگ لیاوُزے فرطِ مسرت سے از خود رفتہ ہو جاتا ہے اور بہت دیر تک وہاں پھرتا رہتا ہے۔

آخر روشن روشن چہرے والا ایک عالم لمبا چغہ پہنے، وقار اور تمکنت سے چلتا ہوا قریب پتا ہے اور منگ لاوُزے کے سامنے آداب بجالا کر کہتا ہے ''کیا عارف بھی بہار کا جشن دیکھنے تشریف لائے ہیں؟...... میرے ساتھ چند دوست ہیں جو دریا کے پار اس چھوٹے سے برج کے قریب چیری کے درختوں کے سائے میں پک نک منا رہے ہیں...... سب خوش باش لوگ ہیں اگر آپ شریک محفل ہوں تو بڑی بندہ پروری ہوگی۔''

منگ لیاوُزے خوشی خوشی اس نوجوان عالم کے ساتھ چلا تا ہے۔ وہاں پہنچ کر دیکھتا ہے کہ چھ سات اہل علم لوگ کہ سب کے سب خوبصورت اور نوجوان ہیں، بیٹھے ہیں۔ پہلے نوجوان نے ان سب سے تعارف کرایا ہے۔ وہ کہتا ہے ''دوستو یہ بہار کا جشن ہے اور راستے میں مجھے تاؤ کے یہ پیرو مل گئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ عالی نسب ہیں اس لیے میں یہ تجویز کروں گا کہ انھیں بھی مے نوشی میں شریک کرلیا جائے'' سب حاضرین اتفاق کرتے ہیں اور سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں منگ لیاوُزے سب سے آخر میں بیٹھتا ہے۔ شراب کے دور چلتے ہیں اور کافی دور چلنے کے بعد ہر شخص نشے کی ترنگ میں جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ باتیں زیادہ دلچسپ اور خوبصورت ہوتی جاتی ہیں۔ یہ لوگ مختلف لوگوں کے بارے میں، امر کے بارے میں چست فقرے اور کڑی چھبتیاں کستے ہیں۔ کوئی نظمیں پڑھ کر سناتا ہے جن میں بہار کا رنگ وآب ہے تو کوئی دربار کی سیاست پر رائے زنی کرتا ہے۔ کوئی پھول چننے کے گیتوں کی تان اڑاتا ہے تو کوئی پہاڑوں اور جنگلوں کے خاموش حسن کی تعریف میں قصیدے پڑھتا ہے۔ غرض باتوں کا دھارا پورے زور شور سے رواں ہے اور ہر شخص فقرہ بازی میں دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر منگ لیاوُزے چپ چاپ بیٹھا چاول کھاتا رہتا ہے۔ آخر وہ پہلا نوجوان بول اٹھتا ہے ''قانونِ فطرت کے عارف میں باتیں بھی سننی چاہیں، دوستو!'' اور منگ لاوُزے کہتا ہے ''آپ حضرات جو دانائی اور نکتے کی باتیں کر رہے ہیں میں ان سے خوب محظوظ ہو رہا ہوں بلکہ بہت سی باتیں تو اتنی اعلیٰ پائے کی ہیں کہ میری سمجھ میں بھی نہیں آئیں...... بھلا اس گفتگو میں مجھ ایسا حقیر شخص کیا حصہ لے سکتا ہے۔

کچھ دیر بعد حاضرینِ مجلس دھان کے کھیتوں کی سیر کو نکل جاتے ہیں۔ راستے میں کچھ لوگ پھول

توڑتے ہیں تو کوئی بیدِ مجنوں کی شاخیں توڑتا ہے۔ ہر طرف سبزے کی بہار اور بہار کا حسن ہے۔ ہر طرف شقائق اور می ڈو کی جھاڑیاں پھولوں سے لدی ہوئی نظر آتی ہیں۔ منگ لاؤزے سب سے الگ، ایک پہاڑی پگڈنڈی پر ہو لیتا ہے اور بڑی دیر کے بعد واپس آتا ہے۔ ایک صاحب پوچھتے ہیں "آپ اکیلے کیوں گئے تھے؟" منگ لیاؤزے جواب دیتا ہے "میں اکیلا تو نہ تھا، میرے ساتھ دو سنگترے اور ایک شراب کی بوتل تھی، پھر میں پرندوں کا نغمہ سننے گیا تھا......" اس پر ایک کہتا ہے "بھئی یہ شخص عجیب باتیں کرتا ہے اور واقعی عجیب آدمی معلوم ہوتا ہے"...... منگ لیاؤزے اس کے جواب میں بڑے انکسار سے کہتا ہے "بندہ کس قابل ہے، سب آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

مجلس پھر جمتی ہے۔ ایک شخص کہتا ہے "اس پک نک کے بعد کچھ نظمیں لکھے بغیر گھر جانا کفر ہے۔" دوسرا شخص تائید کرتا ہے۔

بہت جلد ایک نوجوان یہ نظم مکمل کر کے پڑھتا ہے:

نشۂ ابر سے مدہوش ہیں بیدِ مجنوں
آب و تاب ہر گُل خوش رنگ کی ہے مستانہ
کوئی اندیشہ نہیں، جام اگر خالی ہے
پار دریا کے، وہ دیکھو، وہ رہا میخانہ

اتنے میں ایک اور صاحب اپنی نظم ختم کر چکتے ہیں:

ان پہاڑوں کا یہ سبزہ، مرے گھر تک پہنچا
درودیوار برستی ہوئی بوندوں سے ہیں تر
موسمِ گل میں بھی جو پی نہ سکا، اس کے لیے
آنے ہی والے ہیں یخ بستہ، زبوں شام وسحر

ان حضرات کے جو مصرعے قطعوں کے بعد منگ لیاؤزے سے فرمائش کی جاتی ہے کہ وہ بھی کچھ سنائے .... وہ اٹھ کر سرو قد کھڑا ہو جاتا ہے اور کچھ انکسار، کچھ اصرار کے بعد گاتا ہے:

ریگِ ساحل مرے قدموں میں بچھی جاتی ہے
روپ پانی کا روپہلا ہے، سنہرا بادل

میرے قدموں کی دبی چاپ سے پریاں چونکیں
چھپ گئیں رُخ پہ طلسمات کے لے کر آنچل

ظاہر ہے کہ یہ قطعہ پہلے دونوں قطعات سے ہر طرح خوبصورت ہے۔ حاضرین کو اس کے حسن پر بڑا اچنبھا ہوتا ہے۔ وہ اٹھ کر منگ لیاؤزے کے آگے آداب بجالاتے ہیں اور کہتے ہیں..... ''سبحان اللہ، ہم جانتے تھے کہ آپ وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔ بھلا ایسے اشعار کوئی معمولی شخص کہہ سکتا ہے؟

پھر وہ اس کا نام اور لقب وغیرہ پوچھنے لگتے ہیں لیکن منگ لاؤزے جواب نہیں دیتا، مسکراتا رہتا ہے۔ وہ مزید اسرار کرتے ہیں تو منگ لیاؤزے کہتا ہے ''میرا نام جان کر آپ کیا کریں گے۔ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں جو بادلوں اور دریاؤں کا سیلانی ہے۔ آپ مجھے، ''بادلوں اور دریاؤں کا دیہاتی مسافر'' کہہ کر پکار سکتے ہیں۔'' اس سے حاضرین کا اشتیاق اور بھی بڑھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں'' آیئے ہمارے ساتھ شہر چلئے۔'' لیکن منگ لیاؤزے مسکرا کر جواب دیتا ہے۔ ''میں فقیر آدمی ہوں آزاد گھوم پھر رہا ہوں اور یہ ساری دنیا میرا گھر ہے مگر آپ اتنا کرم فرماتے ہیں تو چلئے میں تیار ہوں۔''

چنانچہ سب لوگ شہر آتے ہیں اور منگ لیاؤزے باری باری سب کے گھروں میں قیام کرتا ہے۔ مہمانی کے ان دنوں میں کبھی تو وہ بہت ہی امیر آدمی کے محل میں ہوتا ہے، کبھی کسی چھوٹے سے کمرے میں۔ کبھی ادیبوں کے ساتھ دورِ جام میں شریک ہوتا ہے۔ تو کبھی ناچ اور گانے سے لطف اٹھاتا ہے۔ وہ ہر جگہ جہاں اسے بلایا جائے، جاتا ہے۔ شہر کے لوگ اس ''بادلوں اور دریاؤں کے دیہاتی مسافر'' کا حال سنتے ہیں تو پارٹیوں اور دعوتوں کے رسیا لوگ اسے بار بار دعوتوں میں بلاتے ہیں اور وہ ہر جگہ جاتا ہے۔ لوگ شراب پیتے ہیں تو وہ بھی پیتا ہے۔ لوگ شعروادب پر بحث کرتے ہیں تو وہ بھی ان سے شعروادب کی باتیں کرتا ہے۔ لوگ جب باہر سیاحت کے لیے جاتے ہیں تو وہ ان کے ہمراہ جاتا ہے مگر جب وہ اس کا نام اور لقب پوچھتے ہیں تو وہ صرف مسکرادیتا ہے، جواب نہیں دیتا۔ شعروادب کی بحث میں وہ قدما اور جدید ادیبوں پر بڑی نپی تلی باتیں کہتا ہے اور ان کے اسلوب اور انداز کا گہرا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ قدیم بادشاہوں کے سیاسی نظام پر بھی بات کرتا ہے اور حالات حاضر پر بھی اپنی رائے ظاہر کردیتا ہے۔ وہ اپنے چُست فقروں سے تو لوگوں کو بے حد

محظوظ کرتا ہے۔منگ لیاؤزے ''روح کی بالیدگی'' کے بارے میں تاؤ (قانونِ فطرت) کی تعلیم دینے کا بڑا ماہر ہے۔بعض دفعہ وہ کوئی عامیانہ ناچ یا پست مذاقی کا گانا سنتا ہے یا لوگ اس کے سامنے الٹی سیدھی باتیں کہتے ہیں تاکہ ان چیزوں کے بارے میں اس کے خیالات معلوم کرسکیں تو وہ یہی ظاہر کرتا ہے اسے بڑا لطف آرہا ہے لیکن ایسی محفلوں میں جب ناچ گانے کے شمعیں گل کرنے کا وقت آتا ہے اور میزبان اسے کہتا ہے کہ وہ بھی کسی رقاصہ لڑکی کے ساتھ ناچے اور ساری محفل پر یہی رنگ چھا جاتا ہے تو منگ لیاؤزے چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔اس کے چہرے کی درشتی سے کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیسا آدمی ہے۔رات کے سوتے وقت وہ میزبان سے بھوسا بھرا ہوا تکیہ مانگ لیتا ہے اور اس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔تھک جائے تو اسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھ جاتا ہے۔اِس بنا پر اس کے بارے میں لوگوں کا تعجب اور لوگوں کی توصیف بڑھتی جاتی ہے۔

ایک مہینے سے زیادہ عرصہ ٹھہرنے کے بعد وہ یکایک کسی دن الوداع کہہ دیتا ہے اور لوگوں کے مسلسل اصرار پر بھی مزید قیام منظور نہیں کرتا۔اس کے دوست اسے روپیہ اور کپڑے دیتے ہیں،الوداعی نظمیں کہتے ہیں اور اسی کی الوداعی دعوت میں سب معزز لوگ شریک ہوتے ہیں۔وہ بڑے افسوس اور رنج سے اسے خدا حافظ کہتے ہیں۔کئی ایک حضرات تو آنسو تک بہاتے ہیں۔منگ لیاؤزے رخصت ہوکر شہر کے آخری دروازے تک پہنچتا ہے اور صرف سو روپے نقد پاس رکھ کر باقی تمام تحفے، کپڑے، روپیہ غریبوں میں تقسیم کردیتا ہے اور آگے چل دیتا ہے۔اس کے دوست یہ سن کر آہ بھرتے ہیں اور ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔وہ نہیں جانتے کہ اس آدمی کو کیا سمجھیں۔

v- فرار کا فلسفہ

مِنگ لیاؤزے پہاڑی راستوں پر چلتے چلتے اونچے سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان پہنچ جاتا ہے۔ان پہاڑوں پر ہزاروں پرانے پرانے درخت ہیں جن پر بیلیں چڑھی ہیں۔ان کا سایہ اتنا گھنا ہے کہ ان کے نیچے چلتے ہوئے آسمان نظر نہیں آتا۔انسان کے قدم یہاں تک نہیں پہنچے۔دور دور تک اِنسانی آبادی کا پتا نہیں۔کوئی لکڑہارا، کوئی گوالا بھی نظر نہیں آتا۔منگ لیاؤزے کو صرف پرندوں اور بندروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔تند اور سرد ہوا کا ایک جھونکا جسم کو کپکپا دیتا ہے۔مِنگ لیاؤزے اپنے دوست کے ہمراہ دیر تک چلتا رہتا ہے۔یکایک ایک پیر مرد سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔جس کی اونچی پیشانی، نازک خط وخال بڑے شاندار ہیں اور جس کی

آنکھوں کی پتلیوں پر ہلکی ہلکی رگیں دکھائی دے رہی ہیں۔ اس کے بال اس کے شانوں پر پڑے ہیں اور وہ اپنے گھٹنوں کو اپنے سینے سے لگائے ایک چٹان پر براجمان ہے۔ منگ لیاؤ زے آگے بڑھ کر سلام کرتا ہے۔ پیر مرد کھڑا ہوا جاتا ہے اور دیر تک کچھ کہے بغیر منگ لیاؤ زے کو دیکھتا رہتا ہے۔ منگ لیاؤ زے اس کے سامنے دوزانو ہو کر پوچھتا ہے۔ ''بزرگ باپ نے یقیناً تاؤ کے قانونِ فطرت کا عرفان حاصل کر لیا ہے ورنہ اس پہاڑ کی تنہائی میں آپ کے قدم کیونکر آتے...... آپ کا یہ غلام آج تک آدھی عمر گزارنے کے باوجود تاؤ کو پا نہیں سکا۔ اِس زندگی کی بے مائیگی پر میرا دل غمگین ہے کیونکہ یہ زندگی چقماق کے شعلے کی طرح بھڑک کر ختم ہو جاتی ہے...... بزرگ باپ مجھ پر کرم کیجیے اور میری جہالت کو مجھ سے الگ کر دیجیے۔''

پیر مرد یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس نے منگ لیاؤ زے کی بات سنی ہی نہیں لیکن منگ لیاؤ زے کے اصرار پر وہ چند باتیں کہتا ہے جو غموں سے آزاد اور شانتی سے بھرپور زندگی اور بے عملی کے فلسفے کے بارے میں ہیں، پھر اپنی راہ لیتا ہے۔ جب تک پیر مرد نظروں سے غائب نہیں ہو جاتا منگ لیاؤ زے کی آنکھیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ کوئی بتائے کہ ان تنہا پہاڑوں میں یہ پیر مرد کہاں سے آیا؟

مِنگ لیاؤ زے اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ ایک پرانے دوست سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے، جب اسے یہ خیال آ جائے کہ کتنے لوگوں سے اس کی دوستی نثر اور نظم کے ذوق کی بنا پر یا ایک دوسرے کے احترام کی بنا پر استوار ہوئی یا کتنے لوگوں سے اس کے کاروباری تعلقات ہیں یا کتنے لوگ اس کے دل کے قریب ہیں تو منگ لیاؤ زے کا دل چاہتا ہے کہ فوراً ان دوستوں سے ملاقات کرے۔ چنانچہ منگ لیاؤ زے اس دوست کے گھر پہنچتا ہے۔ وہ کوئی بہروپ نہیں بھرتا۔ دوست اسے خوش آمدید کہتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ منگ نہایت عجیب کپڑے پہنے ہے۔ اس سے مختلف سوالات کرتا ہے۔ منگ یہ جواب دیتا ہے کہ ''میں نے دنیا ترک کر دی ہے۔ میرا گرو اب تنگ منگ کا بزرگ چی چن ہے۔'' دوست سے پوچھتا ہے۔ ''سب بچوں بچیوں کی شادیوں سے فراغت پالی کیا؟'' ...... ''نہیں ابھی نہیں۔ البتہ جب سب کی شادی ہو جائے گی تو میں دریا کے زرد کے پانیوں کی طرح آزاد ہو جاؤں گا۔ تاؤ کا سب سے بڑا عارف تو دنیا چھوڑ گیا تھا اور آخر آسمان کو چلا گیا تھا لیکن میں کبھی نہ کبھی اپنے وطن واپس جاؤں گا اور اپنے وطن کے مناظر کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر زندگی بسر کروں گا۔'' میزبان اسے سبزی ترکاری کھلاتا ہے اور دونوں بیس تیس برس ادھر کے زمانے کے تذکروں میں

کھو جاتے ہیں۔ گزشتہ واقعات پر انھیں ہنسی آتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہر چیز ایک خواب تھی۔ اس کے بعد دوست آہ بھرتا ہے اور کہتا ہے ''مجھے تمھاری بے فکری اور آزادہ روی کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اس دنیا کو دولت اور اقتدار کے بھنور نے غرق کر رکھا ہے۔ میں کئی بار دیکھتا ہوں کہ کوئی سفید بالوں والا پیر مرد جس کی کمر میں خم آچکا ہے ابھی تک اپنے منصبی عہدے سے چمٹا ہوا ہے اور اپنی دولت اور حکومت کو ہاتھ سے دینے پر رضامند نہیں اگر کسی دن وہ اپنے عہدے سے سبک دوش ہو گیا تو اس دن بھی وہ ماتھے پر شکن ڈال کر چپراسی سے پوچھے گا۔ ''گاڑی تیار ہے؟'' پھر بڑی بے دلی سے دفتر چھوڑے گا۔ اپنے گاؤں جانے کے لیے طوعاً وکرہاً ہی شہر کے دروازوں سے باہر نکلے گا۔ گاؤں پہنچ کر وہ دھان یا دال سبزی بونے کو اپنی توہین جانے گا اور صبح وشام یہی پوچھتا رہے گا کہ دارالخلافے کی کیا خبریں ہیں؟'' یا وہ دارالخلافے میں اپنے دوستوں کو خط لکھ لکھ کر تازہ ترین حالات سے آگاہی حاصل کرے گا اور وہ انھیں خیالات میں دم واپسیں تک الجھا رہے گا ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاہی فرمان اس کے عہدے پر بحالی کے لیے پہنچتا ہے مگر اس بدنصیب کی جان لبوں پر ہے اور بعض اوقات تو یہ شاہی فرمان اس کی موت کے چند گھنٹے بعد پہنچتا ہے ذرا انصاف کرو۔ ایسی حرص وہوا کس کام کی؟ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ان دنیوی خواہشوں پر کسی طرح قابو پا لیا ہے اور نہایت مناسب وقت پر مایا کے جال سے کیونکر رہائی حاصل کر لی ہے؟''

منگ لاؤزے کہتا ہے ''میں نے زندگی پر اپنی فراغت میں پوری دلجمعی سے نگاہ ڈالی اور اس کا مشاہدہ کیا۔ میرا خیال ہے جب زندگی کے المیے کا احساس میرے دل میں پیدا ہوا تو میری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے...... میں نے آسمانوں کی طرف دیکھا ہے اور مجھے حیرت ہوئی ہے کہ سورج، چاند، تارے اور کہکشاں رات دن مغرب کی سمت سخت مصروف لوگوں کی طرح رواں دواں ہیں۔ آج کا دن گزر گیا اور یہ دن کبھی واپس نہیں آتا۔ کل کا دن آتا ہے مگر وہ ''آج'' نہیں ہوتا۔ یہ سال کبھی واپس نہ آنے کے لیے جاتا اور اگرچہ اگلا سال آتا ہے مگر وہ یہ سال نہیں ہوتا۔ گویا فطرت کا زمانہ اور اس کی عمر بتدریج طول پذیر ہے لیکن میری عمر کے سال کم سے کم تر ہوتے جاتے ہیں۔ میرے حصے میں شاید ۲۶ ہزار صبحیں ہیں۔ ان کے سوا زمان ومکان میں جتنا ''وقت'' اور ''وقفہ'' ہے وہ میرا نہیں۔ فطرت کی طویل عمر کے ساتھ رفتہ رفتہ سامنے آتے ہیں۔ مگر میری عمر کے سال رفتہ رفتہ کم ہوتے جاتے ہیں حتیٰ کہ زیادہ سے زیادہ ایک سو برس مجھے ملتے ہیں۔ ان ایک

برسوں کے بعد کے سال میرے نہیں ہوتے...... پھر ستم یہ ہے کہ ''ایک سو سال'' یا کہنے کو یہ ''۲۶ ہزار صبحیں'' ویسی نہیں ہوتیں جیسی ہم چاہتے ہیں۔ انھیں دونوں اور برسوں میں زیادہ تر دن اور برس ایسے ہیں جو برے موسم، اداسی، تشویش اور بھاگم بھاگ میں کٹتے ہیں...... ایسے لمحے کتنے آتے ہیں کہ دن خوبصورت ہوں، پر لطف محفل جمی ہو، چاندنی اور ہوا خوش گوار ہو، ہمارا دل مسرت سے لبریز اور روح طمانیت سے بھرپور ہو، نغمے اور شعر ہوں، شراب اور سرخوشی ہو اور ہم اِن نعمتوں کا مزہ اٹھاتے ہوئے اطمینان سے وقت گزار سکیں؟

''چاند، سورج اپنی اپنی گردش میں رہتے ہیں۔ ان کی برق رفتار میں گولی کی سی تیزی ہوتی ہے اور جب وہ مغربی گھاٹیوں میں ڈوبنے کو ہوتے ہیں تو اس دنیا کا قوی ترین شخص بھی ان کا راستہ روک نہیں سکتا نہ انھیں واپس مشرق کی طرف جانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ سوچن اور چانگ پی کی تمام تر فصاحتوں کا زور بھی انھیں مشرق کا سفر پھر سے اختیار کرنے پر رضامند نہیں کر سکتا۔ چولی زے اور ین ینگ کی ظرافت اور حکمت بھی ان کا ارادہ بدل نہیں سکتی۔ چنگ وئی نے اپنے کومل جسم کو دھنک سے ٹکرایا تھا اور اسے ایک پرندے کا قالب ملا جو اپنی رنجوری کا سمندر کنکریوں سے بھرتا رہتا ہے اس بے چاری کا بے پایاں خلوص اور صاف دلی بھی ڈوبتے چاند، سورج کے دل پر اثر نہیں کر سکتی اور انہیں پھر سے مشرق کا سفر اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ہر زمانے میں ادیبوں اور شاعروں نے اس بارے میں بحث کی ہے اور یہ مسئلہ دردمند دلوں کے لیے ازلی رنجوری کا باعث بن چکا ہے۔

''اور میں نے اس زمانے پر بھی نگاہ ڈالی۔ اس زمین پر ٹیلے آہستہ آہستہ گہری وادیاں بن گئے ہیں اور گہری وادیاں الٹ کر پہاڑ بن گئی ہیں۔ اس زمین کے دریا، چشمے، ندی نالے، جھیلیں، سب کا پانی ازلی ابدی طور پر مشرق کی طرف بہتا ہوا سمندر میں گر جاتا ہے۔ اور فانگ ینگ پری کا کہنا ہے کہ اس نے سمندر کو تین بار شہتوت کے میدانوں میں بدلتے دیکھا ہے۔

''پھر میں نے اس زمین کے جانداروں پر نگاہ ڈالی اور مشاہدہ کیا کہ کس طرح یہ جاندار پیدا ہوتے ہیں، بوڑھے ہوتے ہیں، بیمار پڑتے ہیں، پھر مر جاتے ہیں اور ین اور یانگ (کرم اور مایا) کی چکی میں پستے ہیں...... تیل کی طرح کہ نیچے آگ جلائی جائے تو جلد ہی جل کر سوکھ جاتا ہے...... شمع کی طرح کہ ہواؤں سے مدھم ہوتی ہے اور جلد ہی بجھ جاتی ہے...... کشتی کی طرح کہ کھلے سمندر میں اسے اکیلا چھوڑ دیا گیا ہے اور ہر موج

اسے کنارے سے دور ہی دور لے جاتی ہے اور یہ کشتی انجانی سمتوں کی طرف بہتی ہی چلی جاتی ہے۔''

''اس کے علاوہ انسان کی سات خواہشیں، برابر گھن کی طرح اسے کھاتی رہتی ہیں۔ جسمانی لذتیں اسے گھلاتی رہتی ہیں۔ انسان کبھی بہت ہی مایوس ہوتا ہے کبھی حد سے زیادہ خوش مگر عام طور پر اسے اندیشے کھائے جاتے ہیں...... حد سے حد سو برس کی عمر اس کا مقدر ہے مگر وہ ہزار برس کی زندگی کے منصوبے بناتا ہے۔ اس کی مثال تو اس تیل کی ہے جو آگ پر رکھا ہے لیکن اس کے خواب، اس کی حرص اور امنگیں کائنات کی وسعتوں سے بھی وسیع ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے کہ بڑھاپا آتے ہی انسان کی حالت بہت جلد ابتر ہو جاتی ہے۔ زندگی کی اصلی قوت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی روح اس فانی قالب کو چھوڑ کر رخصت ہو جاتی ہے؟''

''میں نے شہزادوں اور بڑے بڑے امیران کبیر، جرنیلوں اور وزیروں کو دیکھا ہے۔ ان کے محلوں کی چھتیں بادلوں سے باتیں کرتی ہیں۔ کھانے کا وقت آتا ہے تو ہزاروں آدمی ان کے دسترخوان پر ہوتے ہیں...... صبح کو ان کے محلوں کے پھاٹک کھلتے ہیں تو ملاقاتیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ دن رات ان کے یہاں جشن منائے جاتے ہیں۔ ان کے دیوان خانوں میں سجی بنی عورتوں کے پرے کے پرے نظر آتے ہیں...... قریب سے کوئی پروہت یا پجاری نکل جائے تو یہ لوگ اس پر پھبتیاں کستے ہیں اور اس بے چارے میں ہمت نہیں ہوتی کہ آنکھ اٹھا کر ان کی طرف تو کیا ان کے محلوں کی طرف بھی دیکھ جائے مگر یہی پروہت یا پجاری کوئی بیس یا تیس برس بعد ادھر سے پھر گزرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ محلوں کی جگہ جنگلی گھاس اگی ہے، ٹوٹی ہوئی اینٹوں پر گہرا اور شبنم ہے، سورج کی ہلکی دھوپ کھنڈر پر چمکتی ہے اور ماتم کناں ہوا بے بام و در کھنڈروں سے روتی ہوئی گزرتی ہے...... وہ جگہ جو کبھی نغموں اور شادیانوں، ناچ رنگ اور جشن طرب سے معمور تھی۔ اب ویران ہے اور وہاں، گوالوں کے چند لڑکوں کے سوا کوئی نہیں جاتا۔ جب یہ امرا اور بڑے آدمی اپنے اقتدار کی معراج پر تھے، ہر طرف ان کا طوطی بول رہا تھا اور وہ اپنے جشنوں اور ہمہموں میں ہمہ تن کھوئے ہوئے تھے تو کیا انھیں کبھی یہ خیال آیا تھا کہ کبھی یہ دن بھی آئے گا؟ پھر دل پوچھتا ہے...... آخر اس دنیا کی شان و شوکت، پلک جھپکتے ہی کیوں خواب و خیال ہو جاتی ہے؟''

''فرصت کے دنوں میں میں نے شہر کے باہر جا کر دیکھا کہ ہر طرف چھوٹی بڑی قبریں ہیں...... یہ کن لوگوں کی قبریں ہیں؟ امراء اور شاہوں کی، اہل علم اور شاعروں کی؟...... یا یہ لوگ ان کے معمولی ملازموں اور

چوبداروں کی قبریں ہیں؟...... یہ لوگ ہیرو تھے یا محض مسخرے؟......مگر اس پیلی مٹی سے مجھے ان کے بارے میں کیا معلوم ہوسکتا ہے؟......اور مجھے خیال آیا کہ جب یہ لوگ زندہ تھے تو دنیوی شان وشوکت، دولت اور عزت کے کتنے بھوکے تھے، ان کی اُمنگیں اور خواہشیں کس طرح ایک دوسرے سے متصادم رہتی تھیں، کس طرح یہ لوگ شہرت کے متوالے تھے۔ کیسے کیسے منصوبے تیار کرتے تھے جو کبھی پورے نہ ہوں کیسی کیسی چیزیں جمع کرتے تھے۔ جنھیں یہ لوگ کبھی کام میں نہ لاسکیں۔ ان میں کون ایسا تھا کہ تشویش کا شکار نہ تھا، غم فکر سے آزاد تھا؟ کون ایسا تھا جس نے لمبے چوڑے منصوبے نہ بنائے تھے اور ہر آن سرتوڑ کوشش میں زندگی بسر نہ کی تھی؟ مگر ایک صبح کو ان کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں اور اُن کے سارے اندیشے، منصوبے یہیں رکھے رہ گئے۔''

''اور میں بڑے بڑے حاکموں کے بنگلوں پر بھی ٹھہرا ہوں۔ اور کئی بار میں نے سوچا ہے کہ اس خاص مکان میں نہ جانے کتنے لوگ رہنے کے لیے آئے اور باری باری چل دیے۔ میں نے دفتروں کی مثلیں دیکھی ہیں اور یہ خیال آیا ہے کہ ان مثلوں سے نہ جانے کتنے نام کتنی دفعہ کاٹے گئے اور ان کی جگہ کتنے نئے ناموں نے لے لی...... میں نے پہاڑی راستوں کو بھی دیکھا ہے اور دریائی کشتیوں کے گھاٹ بھی دیکھے ہیں۔ پہاڑوں پر چڑھ کر نیچے میدانوں پر بھی نگاہ ڈالی ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ سڑکوں اور گھاٹوں پر گاڑیوں اور کشتیوں کی قطار ختم نہیں ہوتی...... سوچتا ہوں ان گاڑیوں اور ان کشتیوں میں کتنے مسافروں نے سفر کیا ہوگا...... زندگی کی اس رواداری پر میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور ان نظاروں سے دل کی خواہشیں ٹھنڈی راکھ میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔''

منگ لیاؤزے کا دوست جواب دیتا ہے''میں نے سنا ہے، ین زے اس حقیقت پر مسرور ہوا تھا کہ موت کوئی چیز نہیں میں نے یہ بھی سنا ہے، بادشاہ چنگ اس بات پر آنسو بہایا کرتا تھا کہ زندگی کا انجام موت ہے، اور دانا لوگ اس پر طعنہ زن تھے کہ بادشاہ زندگی کے عرفان سے اتنا بیگانہ کیوں ہے...... میرا خیال ہے کہ تمہارا بھی یہی حال ہے...... تم بھی وقت کے تیزی سے گزر جانے اور زندگی کی بے ثباتی پر آنسو بہاتے ہو اور اداس اور محزوں رہتے ہو...... تم میں ان لوگوں کی دانش نہیں جو زندگی کے راز کے محرم ہیں...... ٹھیک ہے نا؟''

منگ لیاؤزے کہتا ہے۔''نہیں یہ بات نہیں۔ زندگی کی بے ثباتی کے احساس نے مجھے غمگین ضرور کیا

ر اسی غمگینی نے مجھ میں شعور پیدا کیا، میری آنکھیں کھول دیں۔ بادشاہ چنگ کو یہ خوف تھا کہ اس کا اقتدار اور
ں کی حکومت اس کی شان وشوکت عارضی ہے۔ وہ اس سے اب تک لطف اٹھانا چاہتا تھا اور انسانی خوشیوں
ے سرچشمے کو خشک کر دینا چاہتا تھا...... اس کے برعکس میں تو دولت اور اقتدار کی ناپائیداری کو خوب جانتا
ں۔ اس لیے ان کو اپنے سے دور رکھتا ہوں تاکہ میری زندگی جتنی ہے اتنی رہے اور ٹھیک گزرے...... گویا ہم
نوں کے مقاصد میں بڑا فرق ہے......''

''کیا تم نے تاؤ کے قانونِ فطرت کا عرفان حاصل کر لیا ہے؟''

''نہیں...... یہ عرفان ابھی مجھے حاصل نہیں ہوا...... ابھی تو میں صرف اسی قابل ہوا ہوں کہ میں قانونِ
رت کو محبوب جانوں، اور بس......''

''تو پھر تم یہ صحرا نوردی اور آوارہ گردی کیوں کرتے ہو؟''

منگ لیاؤزے کہتا ہے ''بھائی میری آوارہ گردی کو تاؤ کے قانونِ فطرت کے ساتھ نہ الجھاؤ۔ میں تو
کاری عہدہ داری زندگی، اس کی پابندیوں اور دنیوی مکروہات سے اکتا گیا تھا۔ چنانچہ میں سفر کرتا رہتا ہوں
ہ اپنے آپ کو ان پابندیوں، ان مکروہات سے آزاد رکھوں...... جہاں تک زندگی کے انجام (موت) کا تعلق
ہے مجھے اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا کہ میں اپنے سفر سے واپس آ جاؤں اور گوشہ نشین ہو جاؤں۔'' دوست پوچھتا
ہے ''اس گدڑی میں کمنڈل ہاتھ میں لے کر تم اپنا پیٹ بھرنے کے لیے بھیک مانگتے ہوں...... پھر اپنے سفر پر
انہ ہو جاتے ہو...... یہ زندگی تمہیں پسند ہے؟ کیا تم اس حاصل میں خوش ہو؟''

منگ لیاؤزے کہتا ہے ''میرے مرشد کا قول ہے، مسرت کے حصول کا راز یہ ہے کہ اپنی مسرتوں کو
سول اور محدود بناؤ۔ لوگ بڑی بڑی دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں تو ان کے سامنے قسم قسم کے گوشت، لذیذ
ھانے اور انوکھی نعمتیں رکھی جاتی ہیں بکرے اور گائیں ان دعوتوں کے لیے کاٹی جاتی ہیں۔ زمین اور سمندر کی
ں ماکولات پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے پہل سب کو ان کا مزہ آتا ہے اور جب پیٹ بھرنے لگتا ہے تو انہی
ھانوں سے نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ اس لیے سب سے اچھا کھانا ابلے چاول اور تازہ سبزیاں ہیں کہ تاثیر
ں ہلکا اور سادہ ہے اور صحت کے لیے مفید بھی ہے...... اسی کھانے کا مزہ عمر بھر آتا ہے اور اسی کی عادت ہو جاتی
ہے...... ناچ رنگ کی محفلوں کو دیکھیے جن میں حسین عورتیں اور خوش رو لڑکے ہوں۔ پہلے پہل ان کا بہت لطف

آتا ہے کہ کوئی دف بجاتا ہے، کہیں طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہے، کوئی گا رہا ہے، کوئی ساز بجا رہا ہے لیکن کیفیت جلد گزر جاتی ہے اور جب ان محفلوں سے لوگ اٹھتے ہیں تو ان کا دل بھاری ہوتا ہے۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہے کہ لوبان سلگا لیا، کتاب کھول لی اور چپ چاپ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ اس طرح روح کو شانتی ملتی ہے اور پڑھتے پڑھتے دل کو زیادہ سے زیادہ سرور حاصل ہوتا جاتا ہے۔ کبھی میں بھی ایک ذمہ دار افسر تھا لیکن میری کل دولت چند کتابیں تھیں اور بس ...... پہلے پہل میں ان کتابوں کو ساتھ لے کر سفر کرتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ پانی کی روحیں ان پر رشک نہ کھائیں۔ چنانچہ میں نے ان کتابوں کو پانی میں پھینک دیا اور اب اس جسم کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

''اب کہ میرا سارا بوجھ ہلکا ہو چکا، آس پاس کی فضا، میرا ماحول پرسکون ہے۔ جسم آزاد اور روح شانت ہے تو کیا زندگی کا زیادہ لطف نہیں؟ اب میں اپنی گدڑی اور اپنے کمنڈل کے ساتھ جہاں چاہتا ہوں جاتا ہوں۔ جہاں دل چاہتا ہے ٹھہر جاتا ہوں اور جو ملتا ہے کھاتا ہوں۔ کسی جگہ قیام کروں تو مالک کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا اور جاتے وقت اپنا نام نہیں بتاتا اگر سردیوں میں مجھے کھلی جگہ ٹھہرنا پڑے تو تکلیف نہیں ہوتی اور جب کبھی شور وشغب کی محفل میں گھر جاؤں تو مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا میری آوارہ گردی، میری مستقل سیاحت کا مقصد یہی ہے کہ میں تاؤ کے قانونِ فطرت کا شعور حاصل کروں، اسے اچھی طرح سیکھ لوں۔''

دوست نے یہ سن کر کہا ''تمہاری باتیں سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جسم کو ٹھنڈک پہنچانے والی دوا پی لی ہے۔ مجھے جو بے اطمینانی کا بخار چڑھا ہوا تھا وہ غیر محسوس طور پر اتر گیا ہے۔''

''اِس بیان کے بعد چین کے تینوں مذاہب کی یکسانی پر ایک طویل بحث کی گئی ہے اور خدا، بودھ مہاتما اور جنوں پریوں کے وجود کے ثبوت دیے گئے ہیں ...... مصنف''

پھر ایک نوجوان آتا ہے اور منگ لیاؤزے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے۔ 'جاؤ میاں جاؤ ...... فقیر کو چاہیے کہ کھانا مل جائے تو چلا جائے اور اگر تم اسی طرح فضول بک بک کرتے رہے تو میں تمہیں پکڑ کر حاکم کی عدالت میں لے جاؤں گا اور تم پر جادو ٹونا کرنے کا مقدمہ چلاؤں گا۔''

نوجوان غصے میں آستینیں چڑھا لیتا ہے جیسے مِنگ لیاؤزے کو مارنے ہی والا ہے مگر مِنگ مسکراتا رہتا ہے۔ آخر کچھ راہ گیر بیچ بچاؤ کرتے ہیں اور منگ لیاؤزے گاتا ہوا اپنی راہ لیتا ہے۔ وہ رات کو ایک سرائے میں

قیام کرتا ہے۔ جہاں ایک خوش لباس عورت دروازے سے جھانکتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ قریب آتی ہے اور منگ لیاؤزے کو چھیڑنا شروع کر دیتی ہے۔ منگ لیاؤزے سوچتا ہے کہ یہ عورت ضرور کوئی روح بد ہے اور چپ چاپ تنہا بیٹھا رہتا ہے۔ عورت کہتی ہے۔ ''میں ایک پری ہوں اور تمہیں بچانے آئی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم تاؤ کے قانونِ فطرت کا ادراک کرنے کے لیے بڑی ریاضت کر رہے ہو اس کے علاوہ پچھلے جنم میں میری تمہاری ملاقات کا وقت مقرر تھا مجھ پر شک نہ کرنا۔ میں تمہارے ساتھ طلسمات کی دنیا کو چلوں گی'' ......منگ لیاؤزے کو فوراً یاد آتا ہے کہ جب چنگ زے چنگ شان کے مقام پر قانونِ فطرت کی ریاضتوں میں مشغول تھا تو اسے بھی اسی طرح بہکایا گیا تھا اور آخر شیطان نے اسے اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اس کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی تھی۔ اور وہ عرفان کے حصول کے بغیر ہی مرا تھا۔ گویا یہ ضروری ہے کہ جب بدروحیں انسان کو بہکائیں تو وہ اس کی زندگی تباہ کرتی ہیں۔ اس لیے ان سے بچنا چاہیے اگر صوفی لوگ اور درویش ان کے فریب میں غلطی سے آ جائیں تو یہ ان کے لیے اچھا نہیں۔ روح کی بقا اور نفس پر غالب آنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اِس لیے منگ لیاؤزے اپنے دھیان میں مست بیٹھا رہتا ہے اور وہ عورت یکا یک نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ کون جانے وہ کس کا بھوت تھی یا بہکانے والی بدروح تھی؟

اِس طرح تین برس تک منگ لیاؤزے اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور لگ بھگ ساری دنیا میں گھومتا رہتا ہے۔ جن چیزوں کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جو آوازیں وہ اپنے کانوں سے سنتا ہے یا جو چیز اپنے ہاتھوں سے چھوتا ہے، جن حالات کا سامنا کرتا ہے، جن جن لوگوں سے ملتا ہے وہ سب اس کی خودی کی تربیت میں کام آتے ہیں اور اس سیاحت، اس آزادہ روی کا اصل مقصد یہی ہے پھر وہ گھر واپس آ جاتا ہے اور زے منگ کی پہاڑیوں میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بناتا ہے جہاں سے پھر وہ کہیں نہیں جاتا۔



بارہواں باب

ثقافت کے مزے

1- علم اور ذوق سلیم

تعلیم یا ثقافت کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ہم میں علم کے سلسلے میں ذوقِ سلیم اور اطوار کے سلسلے میں خوبی پیدا ہو۔ضروری نہیں کہ صرف اسی شخص کو شستہ یا مہذب یا دوسرے لفظوں میں مثالی طور پر تعلیم یافتہ قرار دیا جائے جو بہت پڑھا لکھا ہو اور بڑا عالم فاضل ہو۔تعلیم اور تہذیب کا آئینہ تو اسی شخص کو قرار دیں گے جو پسند کے قابل چیزوں کو اچھا سمجھے، اور ان چیزوں کو ناپسندیدہ سمجھے جو پسند کرنے کے قابل نہیں ہیں..... گویا علم کا مذاقِ صحیح اور علم کی خوش ذوقی یہ جاننے میں ہے کہ کن چیزوں سے محبت کی جائے اور کن سے نفرت کی جائے۔آپ متعدد ایسے حضرات سے تقریبات میں ملے ہوں گے جن کا دماغ تاریخی شخصیتوں، واقعات، ان کے سال وقوع وغیرہ کا ذخیرہ ہوتا ہے اور یہ لوگ کسی غیر ملک مثلاً روس یا مثلاً چیکوسلویکیہ کے تازہ ترین حالات کے بارے میں بڑے باخبر ہوتے ہیں لیکن ان ''عالم'' حضرات کا اندازِ نظر نقطۂ نگاہ سراسر غلط ہوتا ہے۔ان لوگوں سے مل کر جو کوفت ہوتی ہے۔اس کا آپ کو خوب اندازہ ہوگا..... ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق مجھے بھی ہو چکا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ جہاں کہیں کسی موضوع پر بات چھڑی ان کتاب کے کیڑوں نے متعلقہ حقائق اور اعداد و شمار کا انبار حاضرین کے سامنے پیش کر دیا لیکن حال یہ تھا کہ ان کا اندازِ نظر، ان کا رویہ سراسر غلط تھا...... اِن حضرات میں، علم وفضل کی کمی نہیں ہوتی لیکن یہ لوگ بصیرت یا مذاق سلیم دونوں سے بالکل ''پاک'' ہوتے ہیں..... اس کی وجہ یہ ہے کہ معلومات وسیع کرنے (عام معنی میں علم وفضل) کے لیے صرف محنت سے رٹنے اور یاد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔رہا مذاقِ سلیم اور بصیرت تو اس کا حصول کہیں مشکل ہے اور اس کا دارومدار فنکارانہ پرکھ تمیز اور سمجھ پر ہے چنانچہ چینیوں کا قاعدہ ہے کہ کسی صاحب علم کا ذکر کریں گے تو اس کے علم وفضل، اس کے اخلاق یا بصیرت میں ہمیشہ امتیاز کریں گے۔خصوصاً مورخوں کے بارے میں یہ امتیازات ضرور

روا رکھے جاتے ہیں۔ اس کی مثال یہ دی جاتی ہے کہ تاریخ کی ایک کتاب ممکن ہے بڑی جانکاہی اور محنت سے لکھی گئی ہو۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس میں بصیرت اور سمجھ بوجھ سرے سے غائب ہو اور مصنف نے اتنی محنت کے باوجود تاریخی شخصیتوں یا تاریخی واقعات کی جو تعبیریں پیش کی ہوں یا ان واقعات سے جو نتائج اخذ کیے ہوں وہ بالکل سطحی ہوں، ان میں کوئی گہرائی نہ ہو، ان میں کوئی نئی بات نہ ہو، ہر چیز بالکل پیش پا افتادہ اور فرسودہ ہو۔ ہم اہل چین کے خیال میں ایسے مصنفین علم کے سلسلے میں ذوقِ سلیم سے بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ معلومات کی وسعت، واقعات اور تفصیلات کا علم حاصل کر لینا بالکل معمولی چیز ہے۔ تاریخ کا کوئی دور اٹھا کر دیکھیے۔ اس دور کے واقعات کو ذہن میں محفوظ کر لینا، رٹ کر انھیں یاد رکھنا کوئی مشکل نہیں لیکن اس دور کے اہم اور نتیجہ خیز واقعات کا کھوج لگانا، پھر انھیں اپنے ذہن میں محفوظ کرنا بہت مشکل چیز ہے۔ ان نتیجہ خیز واقعات کا انتخاب صرف آپ کے اندازِ نظر پر منحصر ہے اور یہی اندازِ نظر اصل چیز ہے!

اِس لیے وہی شخص تعلیم یافتہ کہلائے گا جس کی پسند اور ناپسند ٹھیک ہوں گی۔ جسے ٹھیک چیزیں مرغوب ہوں گی اور غلط چیزوں سے نفور ہو گا۔ یہی وہ چیز ہے جسے عام لفظوں میں ذوق کہا جاتا ہے اور ذوق ہی سے دل کشی جنم لیتی ہے۔

اب اِس سے آگے چلیے جس شخص کو صحیح ذوق ملا ہو یا جو شخص بصیرت سے بہرہ ور ہو اس کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اس میں ہر چیز کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت ہو۔ وہ اپنی رائے اور پرکھ میں قطعی طور پر آزاد اور غیر جانبدار ہو اور وہ کسی قسم کے مجلسی، سیاسی، ادبی، فنکارانہ یا علمی دباؤ، تگی بندھی باتوں، ابلہ فریبی اور تنگ نظری کا شکار نہ ہو سکے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہم بالغوں کی زندگی ایک نہیں، قسم قسم کی فضولیات سے گھری ہوئی ہے۔ کہیں شہرت کا سراب ہے تو کہیں دولت کا، کہیں وطنیت جی کا روگ بنی ہے تو کہیں سیاسی بھوت سر پر سوار ہے۔ کہیں ڈیکٹروں نے جان عذاب میں کر رکھی ہے تو کہیں نفسیات کے ماہروں نے...... آج کل ہمیں تحلیل نفسی کے ماہرین یہ بتاتے ہیں کہ بچپن میں ہماری آنتوں کے فعل پر ہماری آئندہ زندگی کی امنگوں، ہمارے احساس فرض اور ہماری جارحیت کا دارومدار ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس شخص کو دائمی قبض رہے وہ بخیل اور کنجوس ہو جاتا ہے...... آپ اِنصاف کریں کہ یہ باتیں سن کر صاحبِ ذوق مسکرا کر چپ ہو رہنے کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ یاد رکھنے کی بات تو صرف یہ ہے کہ جب کوئی شخص غلطی پر ہو تو اسے غلط سمجھو...... اس کے نام کی عظمت سے خوف

کھانے اور مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔

نہ اس خیال سے مرعوب ہونے کی ضرورت ہے کہ اس نے بہت سی ایسی کتابیں پڑھ رکھی ہیں جو ہم نے کھول کر بھی نہیں دیکھی۔

اِس بات سے یہ نتیجہ نکلا کہ ذوقِ سلیم اور جرأت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اِسی لیے تو چین کے فلسفی سپہ (بصیرت، عرفان، شعورِ حقیقی) اور تان (بہادری، جرأت، بے باکی) کو ہمیشہ لازم وملزم قرار دیتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جرأت یا دوسرے لفظوں میں رائے کی خودمختاری انسانوں میں کتنی کم یاب ہے۔ دنیا کے ہر بڑے فلسفی اور ادیب کی زندگی سے پتا چلتا ہے کہ شروع ہی سے یہ لوگ اسی ذہنی بے باکی اور رائے کی اسی خودمختاری سے بہرہ ور تھے۔ ایسے لوگ اپنے عہد کے نہایت مشہور اور مرد ہر دلعزیز شعرا کو اس وقت تک پسند نہ کرتے تھے جب تک ان کا دل ان کا دماغ ایمانداری سے اس شاعر کے کلام سے متاثر نہ ہو۔ گویا ان کی پسندیدگی ان کی ذاتی پرکھ کا آئینہ ہوتی ہے...... یہی وہ چیز ہے جسے ادب کا مذاق صحیح کہا جاتا ہے۔ ایسا شخص آرٹ کے کسی خاص دبستان، کسی خاص مروج انداز کو اس وقت تک قابل اعتنا نہ سمجھے گا جب تک اس کا ذوقِ سلیم اس کے حسن وخوبی کی شہادت نہ دے اگر آرٹ کا کوئی مروجہ انداز اس کے ذوق پر بار گزرے تو وہ ہرگز اس پر صاد نہیں کر سکتا۔ یہی وہ ملکہ ہے جسے آرٹ میں سچے ذوق اور صحیح وجدان کا نام دیا جاتا ہے۔ ایسا شخص فلسفے کے کسی خاص نہج، کسی فیشن ایبل نظریے سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ چاہے ان نظریات کے ساتھ بڑے بڑے مفکرروں کا نام وابستہ ہو...... جب تک اس کا دل متاثر نہ ہو وہ کسی مصنف سے متاثر نہیں ہوتا اگر کوئی مصنف اس صاحبِ ذوق کو متاثر نہ کر سکے تو سمجھ لیجیے کہ مصنف غلطی پر ہے۔ یہی وہ منزل ہے جسے ذوقِ سلیم کی منزل کہنا چاہیے...... یہ تسلیم کہ ایسی جرأت رائے کی ایسی غیر جانبداری کے لیے اپنے آپ پر بچپن کا سا اعتماد ہونا چاہیے طبیعت میں سادگی اور بھولپن ہمارا سب سے بڑا سہارا ہے۔ کوئی طالب علم جب اپنی ذاتی پرکھ کا حق چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ وہ دنیا بھر کی فضولیات کا شکار ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ کنفیوشس یہ جانتا تھا کہ علمیت کے بغیر غور وفکر اتنا خطرناک نہیں جتنا غور وفکر کے بغیر علمیت کا ہونا خطرناک ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے:

"علمیّت کے بغیر سوچ بچار انسان کا دماغ ہلا دیتی ہے لیکن غور وفکر کے بغیر علمیّت اسے

تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔''

اُس نے اپنے زمانے میں ایسے طالبانِ علم ضرور دیکھے ہوں گے جو سوچ سمجھ سے کام نہ لیتے تھے، محض علم کا بوجھ اٹھائے پھرتے تھے۔ اِسی لیے تو اس نے اتنی شدید تنبیہ کی ضرورت محسوس کی۔ میں سمجھتا ہوں ہمارے جدید زمانے کے سکولوں میں بھی اِس قسم کی سخت تنبیہ کی نہایت سخت ضرورت ہے۔ یہ حقیقت اب واضح ہو چکی ہے کہ جدید تعلیم اور ہمارے سکولوں کا نظامِ تعلیم عام طور پر ''علم'' حاصل کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے، بصیرت اور سوجھ بوجھ کی ترقی کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ اِس نظامِ تعلیم کا خاصہ ہے کہ طالب علم نے بہت سادہ معلومات رٹ رٹا کر دماغ میں محفوظ کر لیں اور بس لیکن بھلا ''علم'' کا بوجھ اور معلومات کا یہ انبار کس بے علم کو تعلیم یافتہ بنا سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ سکولوں میں سوچ بچار اور غور و فکر کی ہمت افزائی کیوں نہیں کی جاتی؟ آخر اس نظامِ تعلیم نے علم حاصل کرنے کی سہانی کوششوں کو بگاڑ کر، انھیں مسخ کر کے محض واقعات اور معلومات کو بے سوچے سمجھے حفظ کرنے کی ایک لگی بندھی اور بیزار کن مشینی چیز کیوں بنا دیا ہے؟...... آخر غور و فکر کے بجائے معلومات کے حصول کو زیادہ اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟...... ہم کسی گریجویٹ کو تعلیم یافتہ ہونے کا لقب کیوں دیتے ہیں؟ صرف اس لیے کہ اس نے 'نفسیات' قدیم تاریخ، منطق وغیرہ کو یاد کرنے میں کچھ گھنٹے اور ہفتے صرف کر لیے ہیں؟ ہمارے سکولوں میں امتحانات کے نمبروں کا رواج کیوں ہے؟ ڈپلومے اور سندیں کیوں دی جاتی ہیں؟ اِن سندوں اور ڈگریوں نے تعلیم کے سچے مقصد کی جگہ کیونکر لے لی؟ ہمارے طلبہ تعلیم کا مقصد انہی ڈگریوں اور سندوں کے حصول کو کیوں سمجھتے ہیں؟

ان تمام باتوں کی بنیادی وجہ بڑی سیدھی سادی ہے...... یہ نظامِ تعلیم اس لیے ہم پر مسلط ہوا کہ ہم لوگوں کو تھوک کے بھاؤ تعلیم دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کی مثال مشینی کارخانے کی ہے جس میں ہر کام نہایت صحیح مگر بے جان غیر متنوع طریقے سے انجام پاتا ہے چنانچہ ہر سکول اپنے نام کی لاج رکھنے اور اپنے ''فارغ التحصیل'' طلبہ کا معیار ایک سار کھنے کے لیے سندیں اور ڈپلومے دیتا ہے۔ ڈپلومے دینے کے ساتھ یہ لازم ہو جاتا ہے کہ درجہ بندی کی جائے اور درجہ بندی امتحانی نمبروں کو جنم دیتی ہے اور یہ نمبر حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے امتحانات اور ٹیسٹ دینے پڑتے ہیں۔ یہ سارا نظام نہایت پختہ منطقی تسلسل اور ترتیب کی بنیاد پر

قائم ہے۔ اس کی پختگی سے کوئی مفر نہیں لیکن ان مشینی قسم کے امتحانوں اور ٹیسٹوں وغیرہ کا نتیجہ بڑا مہلک ہے۔ اتنا مہلک ہے کہ ہم اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ کیونکہ امتحانات کی بدولت واقعات اور کتابی معلومات کے زبانی یاد کرنے کو زبردست اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور مذاقِ سلیم کی تربیت یا پرکھ اور جانچ کی صلاحیت پیدا کرنے کا کوئی سوال نہیں رہتا۔ مجھے اِس نظام کا پورا تجربہ ہے کیونکہ میں خود سکول میں استاد رہ چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ تاریخی واقعات پر سوالات کا پرچہ بنانا بہت آسان ہے لیکن مبہم معاملوں، مبہم نظریوں کے بارے میں سوالات قائم کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ پھر ان امتحانی پرچوں کو دیکھ کر نمبر لگانا تو بہت ہی آسان کام ہے۔

خطرہ اس بات کا ہے، یہ نظام رائج کرنے کے بعد کہیں ہم یہ بھول جائیں کہ ہم تعلیم کے اصلی اور سچے نصب العین سے دور ہٹ سکتے ہیں اور بارہا ہم اس نصب العین سے دور ہو بھی چکے ہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک تعلیم کا سچا نصب العین یہ ہے کہ علم کے سلسلے میں صحیح اور سچا ذوق پیدا کیا جائے۔ اس مرحلے پر بھی کنفیوشس کا قول یاد رکھنا چاہیے کہ:

''وہ علمیّت جو محض معلومات کو یاد رکھنے کا نام ہے کسی کو اُستاد بن جانے کا اہل نہیں بنا سکتی۔''

گویا تعلیم کے لیے ''لازمی مضامین'' اور ''لازمی کتابوں'' کی کوئی قید نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ شیکسپیئر پڑھنا بالکل ''لازمی'' ہے...... ہمارے سکول اِس حماقت میں مبتلا ہیں کہ تاریخ اور جغرافیہ کا ایک بنیادی نصاب ہر شخص کو پڑھنا لازمی ہے۔ کیونکہ یہ بنیادی نصاب ہمارے خیال میں تعلیم یافتہ ہونے کی اوّلین شرط ہے...... میری تعلیم اچھی خاصی ہوئی ہے پھر بھی مجھے آج تک یہ پتا نہ چلا کہ سپین کا دارالحکومت کون سا شہر ہے اور ایک وقت میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ ہوانا ایک ایسا جزیرہ ہے جو جنوبی امریکہ کی ریاست کیوبا کے پاس واقع ہے چنانچہ تعلیم کا لازمی نصاب قرار دینے میں بڑا عیب یہی ہے کہ جو شخص اس نصاب کو جوں توں کر کے ختم کر لے اس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو کسی تعلیم یافتہ شخص کو آنا چاہیے وہ اسے آتا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ بڑا عبرت انگیز ہے اور وہ یہ ہے کہ گریجویٹ لوگ امتحان پاس کرنے کے بعد علم حاصل کرنا یا کوئی کتاب پڑھنا بالکل ترک کر دیتے ہیں کیونکہ جو کچھ انہیں علم حاصل کرنا تھا اپنے خیال میں وہ کر چکے ہوتے ہیں۔

چنانچہ خیال سرے سے ترک کرنا پڑے گا کہ کسی شخص کے علم کو کسی طرح ناپنا ممکن ہے یا اسے کسی نہ کسی

کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ چونگ زے نے کہا ہے ''افسوس میری عمر محدود ہے اور علم لامحدود!'' ...... علم کا حصول تو کسی نئے براعظم کی دریافت اور اس کی سیاحت کی طرح ہے اسی لیے اناطول فرانس نے کہا تھا ''علم حاصل کرنا روح کا ایک تجربہ ہے، ایک مہم ہے!'' اس لیے اگر تحقیق، تجسس اور کھول کی روح قائم رہے اور ذہن تجربوں اور معلومات حاصل کرنے کا انداز بھی برقرار رکھے تو علم کا حصول آج کی طرح عذاب نہیں بن سکتا بلکہ ایک نہایت خوش گوار کام ہوگا۔ علم یہ نہ ہوگا کہ جو معلومات ہمیں گھول کر پلا دی جائیں ہم انہیں پی لیں، جو کچھ یکسانیت کے ساتھ ہمیں سکھا دیا جائے سیکھ لیں اور بندھی ٹکی چیزیں بتا دی جائیں انھیں یاد کرلیں۔ بلکہ علم انفرادی مسرت کا ایک مثبت ذریعہ، ایک انفرادی نصب العین ہوگا...... چنانچہ اگر سندیں اور ڈگریاں منسوخ کر دی جائیں، امتحانی نمبروں کا طریقہ ختم کر دیا جائے یا ان کو کوئی اہمیت نہ دی جائے تو علم کا حصول ایک مثبت کام بن جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں طالبِ علم بار بار اپنے آپ سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر مجھے ڈگری حاصل نہیں کرنی ہے اور امتحانی نمبر وغیرہ فضول چیزیں ہیں تو میرے علم حاصل کرنے کا مقصد کیا ہے؟ ......لیکن موجودہ صورت احوال میں یہ سوال طالب علم کے ذہن میں پیدا نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو اس کا جواب گھڑا گھڑایا موجود ہے۔ کہ نچلی جماعتوں کے بعد اونچی جماعتوں میں جانا ہے، چنانچہ پڑھنا پڑے گا اور امتحان بھی دینے ہوں گے...... مگر علم کے حصول کے یہ اسباب خارجی ہیں اور ان کو ترک کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ علم کا حصول ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اس میں کسی دوسرے کا عمل دخل کسی خارجی سبب کی لاگ نہیں ہونی چاہیے۔ اور آج کل یہ حالت ہے کہ بہت سے طلبہ تو یونیورسٹی کے رجسٹرار کے ڈر سے پڑھتے ہیں اور جو نیک لڑکے ہیں وہ اپنے والدین یا اپنے استادوں یا اپنی ہونے والی بیویوں کے لیے علم حاصل کرتے ہیں تاکہ وہ ان والدین کے سامنے احسان ناشناس نہ ٹھہرائے جائیں جو انہیں تعلیم دلوانے پر اتنا خرچ اٹھا رہے ہیں یا وہ اس استاد کے سامنے اچھے بنیں جو ان سے مہربانی کا سلوک کرتا ہے اور انہیں محبت سے پڑھاتا ہے یا یہ کہ وہ تعلیم ختم کر کے کسی اچھی جگہ ملازم ہو جائیں اور اچھی تنخواہ پائیں تاکہ اپنے اپنے خاندان کی کفالت کر سکیں......

میرے نزدیک یہ سارے تصورات اخلاق سے گرے ہوئے ہیں...... علم کا حصول ایک ذاتی مسئلہ ہونا چاہیے جس میں کسی دوسرے کا، یا کسی خارجی سبب کا کوئی عمل دخل نہ ہو...... صرف اسی صورت میں تعلیم مفید اور مثبت طاقت بن سکتی ہے اور علم کا حصول عذاب کے بجائے گہری مسرت بن سکتا ہے۔

2- آرٹ: تفریح اور شخصیت

آرٹ، تخلیق بھی ہے اور تفریح بھی۔ مگر میرے خیال میں آرٹ، تفریح کی حیثیت سے یا روحِ انسانی کے خالص کھیل کی حیثیت سے زیادہ اہم ہے...... میں تخلیقی کام کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ چاہے یہ تخلیق مصوری کی صورت میں ہو یا تعمیر کی صورت میں یا ادب کی صورت میں سامنے آئے...... پھر بھی میرا خیال ہے کہ سچے آرٹ کی روح اسی صورت میں عام ہوگئی اور معاشرے کے رگ و پے میں سما سکے گی کہ بہت سے لوگ آرٹ سے بطور تفریح حظ اٹھائیں۔ وہ آرٹ کی تخلیق کریں لیکن ان میں سے کسی کو بھی زندہ جاوید بن جانے کی امید نہ ہو۔ آج کل یہ صورت ہے کہ ہر کالج ایسا کھلاڑی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ملک بھر کے لیے مایہ ناز ہو۔ میرے نزدیک زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کالج کا ہر لڑکا ٹینس یا فٹ بال معمولی طریقے پر کھیل سکے اور کالج خواہ کوئی نامور کھلاڑی پیدا نہ کرے۔ اسی طرح یہ بات زیادہ اہم ہے کہ ایک ملک کے تمام بچے اور سب بالغ لوگ مشغلے کے طور پر کچھ نہ کچھ تخلیق کر سکیں۔ یہ اہم نہیں کہ ایک پوری قوم صرف ایک عظیم فن کار پیدا کر دکھائے۔ میں یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ سکول کے ہر بچے کو کوزہ گری اور مجسمہ سازی سکھائی جائے اور ہر کاروباری شخص، ہر اقتصادی ماہر، ہر ملازم اپنے لیے خود عید کارڈ قسم کی چیزیں بنا لے۔ یہ کوئی بات نہیں کہ چند آرٹسٹ پیشے کے طور پر پوری قوم کے لیے یہ چیزیں تیار کرتے رہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ میں زندگی کے ہر شعبے میں ''شوقیہ مہارت'' کا قائل ہوں، پیشہ ورانہ کمال کا حامی نہیں۔ میں عطائی فلسفیوں، شوقیہ گانے والوں، شوق کی خاطر شاعری کرنے والوں، فوٹوگرافروں، جادو کے کھیل اور کرتب دکھانے والوں، حیاتیات کے شوقیہ ماہروں اور ہوابازی کے شوقینوں اور معماروں کو دل سے پسند کرتا ہوں...... ایک دوست کسی شام کے دھندلکے میں کوئی نغمہ معمولی طریقے سے بھی بجا کر سنائے تو مجھے اتنا ہی لطف آئے گا جتنا وہی نغمہ کسی نہایت صاحبِ کمال پیشہ ور ساز نواز سے سننے میں آ سکتا ہے۔ رہے جادو کے کھیل تو ہر شخص اپنے دوست کے کرتبوں سے خوب لطف اٹھاتا ہے۔ والدین اپنے بچوں کے ڈرامے دیکھتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے بلکہ انہیں شیکسپیئر کا کوئی ڈرامہ اسٹیج پر دیکھ کر بھی اتنی خوشی نہیں ہوتی ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شوقیہ کاموں اور خصوصاً شوقیہ آرٹ میں بے ساختگی زیادہ ہوتی ہے اور سچے آرٹ کی بنیادی خوبی یہی برجستگی ہے۔ چین میں اسی لیے مصوری کو اہلِ علم کا شوق سمجھا جاتا ہے اور

اسے پیشہ ور آرٹسٹ کا کام نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ اگر کھیل اور شوق کا جذبہ قائم رہے تو آرٹ تجارتی اور کاروباری نہیں ہونے پاتا ورنہ دوسری صورت میں ہر کام کی طرح اس میں بھی کاروبار دخیل ہو جاتا ہے۔

کھیل کا خاصا ہے کہ اسے بلا وجہ کھیلا جائے اور اس کی کوئی وجہ، کوئی جواز موجود نہ ہو۔ کھیل کا بنیادی سبب خود کھیل ہے۔ انسانی ارتقا کی ساری تاریخ اس نظریے کا ثبوت ہے۔ حسن وہ چیز ہے کہ اسے بقا کی کش مکش سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ حسن کی ایسی صورتیں بھی ہیں کہ وہ خود جانوروں کی برادری کے لیے بھی تباہ کن ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بارہ سنگے کے خوب بڑھے ہوئے سینگ اپنی جگہ حسن کی تصویر ہوں گے لیکن اس جانور کے لیے تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہوں گے۔ ڈارون کو یہ بات سوجھ گئی تھی، نباتات اور حیوانات کی دنیا میں اتنا حسن موجود ہے کہ اس کا سائنسی سبب نہیں بتایا جا سکتا۔ اس لیے اس نے جنسی انتخاب کا مسئلہ وضع کیا اور ارتقا کے اصول میں اسے ایک ثانوی مگر اہم سبب قرار دیا چنانچہ اگر آرٹ کو ہم انسان کی جسمانی اور ذہنی قوتوں کا ایک زائد (ضرورت سے بھی زائد) حصہ نہ سمجھیں اور محسوس نہ کریں کہ آرٹ بذاتہ ایک آزاد، غیر پابند چیز ہے اور محض اپنی خاطر زندہ ہے تو آرٹ کے معنی ہماری سمجھ میں کبھی نہیں آ سکتے۔ یہ وہی رسوائے زمانہ نظریہ ہے جسے ''فن برائے فن'' کا نام دیا گیا ہے۔

میں اسے ایسا مسئلہ نہیں سمجھتا جس پر سیاستدانوں کو کچھ کہنے سننے کا حق حاصل ہو۔ میں اسے ایک ایسی ناقابل تبدیل حقیقت گردانتا ہوں جو یہ ثابت کرتی ہے کہ ہر فنی تخلیق کا ماخذ، منبع اور مبدا جسمانی قوت ہے اور بس۔ ہٹلر نے اپنی قوت کے زعم میں جدید آرٹ کی بہت سی قسموں کو اخلاق سے گری ہوئی قرار دے دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں جن مصوروں نے اس ڈکٹیٹر کو خوش کرنے کے لیے اس کی تصویریں بنائیں اور جرمنی کے آرٹ میوزیم میں ان کی نمائش کی گئی وہ مصور اخلاق کے لحاظ سے بے حد گھٹیا لوگ تھے۔ کمرشل آرٹ بھی صحیح فنی تخلیق کی روح کا طوق ہے مگر سیاست تو آرٹ کو بالکل مردہ کر دیتی ہے کیونکہ آزادی آرٹ کی روح ہے۔ مگر ہمارے موجودہ زمانے کے آمر حکمران سرکاری حکم دے کر سیاسی آرٹ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اُنھیں یہ معلوم نہیں کہ جس طرح طوائف سے سچی محبت خریدنا ممکن نہیں اسی طرح تلوار کی نوک پر آرٹ کی تخلیق کرانا بھی ممکن نہیں۔

آرٹ کی روح کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم آرٹ کو انسانی قوت کا ایک وافر حصہ سمجھ لیں اور

اس کے جسمانی اسباب پر غور کریں۔ یہی وہ چیز ہے جسے آرٹ کی تخلیقی اپج کا جوہر کہا جاتا ہے۔ آرٹ کی تخلیق کے سلسلے میں عام طور پر سنا جاتا ہے کہ اس کا منبع وجدان ہے اور یہ کہ: ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں'' گویا آرٹسٹ خود نہیں جانتا کہ وہ تخلیقی امر، وہ جذبہ کہاں سے دل میں در آیا۔ یہ اسی طرح کی ایک داخلی اکساہٹ ہوتی ہے جو سائنس دان کے دل میں حقیقت کے انکشاف کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ سیاح کے دل میں نت نئے جزیروں کی دریافت کے لیے چٹکیاں لیا کرتی ہے...... اس کا اظہار مشکل ہے نہ اس کی ماہیت ہی بیان کی ہے۔

آج ہمیں حیاتیات کے علم کی بدولت یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہماری ذہنی زندگی کا نظام اُن ہارمون (ذرات) کی کمی بیشی اور تقسیم سے ترتیب پاتا ہے جو ہمارے خون میں ہوتے ہیں۔ یہ ذرات مختلف اعضا پر اثر ڈالتے ہیں اور ان اعصاب کو متاثر کرتے ہیں جو ہمارے اعضا کو کنٹرول کرتے ہیں۔ غصہ اور خوف بھی خون میں انہیں ذرات کی کمی بیشی سے پیدا ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں، غیر معمولی فطانت یہی ہے کہ بعض انسانی جسموں کے غدود خاص قسم کا لعاب زیادہ پیدا کرتے ہیں اور ایسا انسان نطین جی نی لیس کہلاتا ہے۔ چین کے ایک نیم گمنام ناول نگار نے کہا تھا ''انسانی جسم کی حرکت اور اس کا سارا کام اس وجہ سے ہے کہ انسانی جسم میں بعض جگہ ''کیڑے'' ہوتے ہیں۔ اس بچارے کی رسائی جدید زمانے کی طبعی معلومات اور خونی ذرات تک نہ تھی مگر اس نے اِن ''کیڑوں'' کا پتا چلا ہی لیا جو ہر انسانی فعل کے ذمہ دار ہیں۔ مثلاً خود زِنا کیا ہے۔ یہی نا کہ خاص قسم کے کیڑے ہماری آنتوں کو کھاتے رہتے ہیں اور انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی نفسانی خواہش پوری کر کے رہے۔ پھر ہر انسان کو بڑا بننے کی خواش ہوتی ہے۔ انسان کو دوسروں پر فوقیت جتانے کا بھی خبط ہے۔ انسان کے دل میں شہرت اور اقتدار کی بھوک بھی ہوتی ہے۔ یہ سب کیا ہیں۔ یہ انھیں ''کیڑوں'' کا معاملہ ہے جو اس وقت تک آسودہ نہ ہوں گے جب تک انسان اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو جائے گا...... کسی کتاب کی تصانیف بھی کیڑوں کی ایک خاص قطم کی بدولت ہے جو مصنف کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ کسی وجہ کے بغیر لکھتا ہی رہے...... اس لیے ہارمون اور ''کیڑوں'' کے درمیان انتخاب کا معاملہ درپیش ہو تو میں ''کیڑے'' کی اصطلاح زیادہ پسند کروں گا کہ یہ زیادہ واضح اور سادہ ہے۔

جس شخص میں اِن 'کیڑوں' کی خاص مقدار ہوگی۔ یا معمول سے زیادہ مقدار ہوگی وہ کچھ نہ کچھ تخلیق،

کرنے پر مجبور ہوگا کیونکہ اب وہ تخلیق کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی بچے کو دیکھیے اگر اس میں عمر کی رعایت سے زیادہ ہمت ہوتو وہ چلنے کے بجائے کود پھاند زیادہ کیا کرتا ہے۔ یہی وافر قوت اگر بڑے آدمی میں ہوتو اس لیے کہ اس میں افادیت کے خیال سے (جمالیاتی نقطہ نظر سے نہیں) قوت زیادہ خرچ ہوتی ہے اور نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔ ناچنے والا کمرے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنے کے لیے سیدھا چلنے کے بجائے نیم دائرے کی صورت میں پینترے بدلتا ہوا جاتا ہے۔ پھر بھی ناچ ایسا آرٹ ہے کہ کوئی شخص ناچتے ہوئے حب الوطنی کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر کسی شخص کو حکم دے دیا جائے کہ وہ سرمایہ دارانہ یا فاشی نظام یا اشتراکی نظریے کے مطابق رقص کرے تو رقص تے تفریح کا سارا عنصر غائب ہو جائے گا اور وہ حسین بے ساختگی نہ رہے گی جو ناچ کا اصل مقصد ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کمیونسٹ سیاسی مقصد حاصل کرنا چاہیے۔ یا پارٹی سے اپنی وفاداری ثابت کرنا چاہیے تو ایسے موقع پر اسے قدم قدم چلنا چاہیے، ناچنا ہرگز نہ چاہیے۔ اصل میں ہمارے کمیونسٹ بھائی کام اور محنت کے تقدس کو تو خوب سمجھ گئے ہیں مگر کھیل کا مقدس ہونا ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ ایک مہذب آدمی آج کل مہذب دنیا میں پہلے سے ہی ضرورت سے زیادہ کام کر رہا ہے۔ آج کل کا انسان جتنا کام کرتا ہے حیوانات میں کسی نوع، کسی نسل کا جانور اتنا کام نہیں کرتا۔ آج کل کے انسان کے پاس فرصت اور فراغت کا وقت بہت کم ہے۔ کھیل اور آرٹ کے لیے اسے اس سے بھی بہت کم وقت ملتا ہے۔ اس پر ان چند لمحات کے لیے بھی یہ کہہ دیا جائے کہ انھیں اس عفریت، یعنی حکومت کے سپرد کر دیا جائے تو اس سے بڑھ کر زیادتی اور کیا ہوگی۔

سو قرار پایا کہ آرٹ کی ماہیت اصلی اور اس کی حقیقت کھیل ہے اور صرف کھیل (مشغلہ) اس نظریے کی روشنی میں آرٹ اور اخلاقیات کا تعلق سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ حسن، محض حسن ترکیب یا حسن عمل ہے اور یہ حسن چال چلن، برتاؤ کے علاوہ اچھی تصویر یا کسی خوبصورت پل میں بھی نظر آتا ہے۔ آرٹ مصوری، موسیقی، اور رقص سے کہیں زیادہ وسیع ہے کیونکہ دنیا کی ہر چیز میں حسن ترکیب ممکن ہے۔ کسی دوڑ میں دوڑنے والے کو دیکھیے۔ اس میں بھی حسن ترکیب نظر آئے گا۔ کوئی شخص اگر بچپن اور جوانی سے پختہ عمری اور بڑھاپے تک حسن ترکیب سے زندگی بسر کرے تو یہ حسن ترکیب نمایاں اور ناقابل تردید ہوگا۔ انتخابی مہم اگر اچھی لڑی جائے تو اس میں بھی حسن ترکیب نمایاں اور اگر ہنسی اور تھوکنے میں اسی نفاست کا لحاظ رکھا جائے جس طرح پرانے چین کے عہدہ دار رکھتے تھے۔ تو اس میں بھی حسن ترکیب نظر آئے گا۔ ہر انسانی فعل ہیئت اور اظہار سے

رکب ہے اور اظہار کی ہر صورت آرٹ کی تعریف میں آتی ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ اظہار کا آرٹ کو محض موسیقی، رقص اور مصوری کے گنے چنے شعبوں ہی تک محدود کر دیا جائے۔

آرٹ کی یہ ایک عمومی تعریف ہوئی لیکن اس کے مطابق یہ طے پا گیا کہ اخلاق اور رکھ رکھاؤ میں حسن ترکیب اور آرٹ میں حسین شخصیت، دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور دونوں کی ایک جیسی اہمیت ہے۔ اس کے مطابق یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری ہر جسمانی حرکت میں وہی نفاست ہو جو کسی نظم کی حرکت وغنا میں ہوتی ہے۔ پس اگر ہم میں قوت کا وافر حصہ موجود ہے تو ہم جو کچھ کریں گے اس میں ایک خوش اسلوبی، ایک حسن ادا، ایک حسن ترکیب ضرور ہوگا۔ یہ خوش اسلوبی اور لطافت جسمانی قوت کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے دل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ میں کوئی کام دوسروں سے بہتر طریقے پر...... یعنی زیادہ حسین انداز میں...... کر سکتا ہوں...... نظریاتی اعتبار سے ہمیں یہی حسن ہر شخص کے کام میں نظر آئے گا جو اچھا کام کر رہا ہو۔ گویا کسی کام کو عمدہ اور صاف طریقے پر کرنے کی خواہش جمالیاتی اپج قرار پائی۔ اس نظریے کے مطابق عمدگی سے کیا ہوا قتل، خوبی سے انجام کو پہنچائی جانے والی سازش بھی حسین چیز ہوگی۔ چاہے یہ کام اپنی جگہ کتنے ہی برے اور قابل مذمت کیوں نہ ہو...... زندگی کی ٹھوس تفصیلات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے کاموں میں خوش اسلوبی، حسن ادا، اور صلاحیت سب کا مظاہرہ موجود ہے یا کیا جا سکتا ہے۔ کسی چیز کی یا کسی شخص کو اچھی طرح اور مناسب داد دینا ایک حسین داد کہلائے گا۔ اور جس ادا سے بدمذاقی جھلکتی ہو اسے داد نہیں بیداد کہیں گے۔

چین میں تیسری اور چوتھی صدی میں چن خاندان حکمران رہا۔ اس خاندان کے عہدِ حکومت کے آخر میں گفتار، زندگی اور ذاتی آرام کی برکتیں عروج پر نظر آتی ہیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جس ''بافراغت گفتگو'' کا فیشن چلا تھا اور تکلف اور نفاست کی انتہا نسائی ملبوسات پر ہوئی تھی۔ حسین لوگوں کی بھی کمی نہ تھی۔ بڑی خوبصورت ڈاڑھیاں رکھنے کا بھی رواج ہوا اور مرد اِن ڈاڑھیوں کے ساتھ اور بے حد ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں نظر آنے لگے۔ یہ لباس اس طرح کا تھا کہ اگر جسم کے کسی حصے کو سہلانا یا کھجانا چاہیں تو ہر حصے تک ان کپڑوں میں سے ہاتھ جا سکے۔ ہر کام میں خوش اسلوبی اور نفاست در آئی تھی۔ اِسی زمانے میں چو (مورچھل) کا رواج ہوا۔ وضع یہ تھی کہ گھوڑے کی دم کے بال ایک لکڑی کے سرے پر نفاست سے باندھ دیئے جاتے ہیں اور اس سے مکھیاں

اور مچھر اڑانے کا کام لیا جاتا۔ یہ مورچھل گفتگو کے موقع پر بڑی اہم چیز تھی کہ باتیں ہو رہی ہیں اور ہاتھوں میں مورچھل ہل رہے ہیں۔ چنانچہ آج بھی اطمینان اور فراغت کی گفتگو کو چوتان، ''مورچھل کی گفتگو'' کہا جاتا ہے۔ دستور یہ تھا کہ گفتگو کے دوران میں چو (مورچھل) ہاتھ میں رہے اور اسے بڑی نفاست سے ہوا میں ہلاتے ہیں...... یہی حال پنکھیا کا ہے کہ پنکھیا بھی گفتگو کا ایک حسین لازمہ ہوگئی۔ بات کرنے والا اسے کھولتا، ہوا میں ہلاتا پھر بند کر لیتا۔ چنانچہ کیا چو کیا پنکھیا، دونوں گفتگو کے انداز میں اسی طرح حصہ گیر ہوتے ہیں۔ جیسے سیر کا اسلوب ہاتھ کی چھڑی کا سہارا لیتا ہے۔

مغرب میں زندگی کی نفاستوں میں سب سے اعلیٰ نفاست مجھے یہ نظر آئی کہ پرشیا (جرمنی) کے رئیس زادے دیوان خانوں میں کسی خاتون کا سامنا کرتے ہیں۔ ایڑیاں فوجی انداز میں ملا کر جھک جاتے ہیں اور جرمن لڑکیاں ایک ٹانگ دوسری ٹانگ کے پیچھے لے جا کر بڑے حسین انداز میں کورنش بجالاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ بڑی خوبصورت چیز ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کا رواج کچھ کچھ اٹھتا جا رہا ہے۔

خوش تمیزی اور آداب کے بہت سے طور طریقے چین میں بھی رائج ہیں۔ اس سلسلے میں انگلیوں ہاتھوں اور بازوؤں کی حرکت کو بڑی احتیاط اور محنت سے رواں کیا جاتا ہے۔ مانچو لوگوں میں سلام کا طریقہ بڑا حسین ہے۔ مثلاً ایک شخص آپ سے ملنے کمرے میں آیا ہے۔ وہ ایک بازو سیدھا جسم کے ساتھ لگا دے گا، ایک ٹانگ کو ذرا سا جھکائے گا اور سارا بند فوراً جھکا کر سیدھا کر لے گا اگر کمرے میں آپ کے علاوہ اور حضرات بھی موجود ہیں تو وہ اسی حالت میں اپنی سیدھی ٹانگ کی ایڑی پر گھومے گا اور اس طرح حاضرین کی خدمت میں مجموعی طور پر آداب بجالائے گا۔ رہی ہاتھوں اور انگلیوں کی حرکتوں میں نفاست تو چین میں کسی اعلیٰ شاطر کو ذرا شطرنج کے تختے پر مہرے رکھتے، اٹھاتے دیکھیے...... اِسی طرح قدیم چین کے افسر طبقے کے لوگ غصے کے وقت نہایت خوبصورت حرکتیں کرتے تھے۔ وہ نہایت حسن وخوبی سے اپنی آستین جھٹکتے اور دایاں بازو یا دونوں بازو ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل جاتے تھے۔

کسی چینی عہدہ دار کا اندازِ گفتگو بھی سننے کی چیز ہے۔ لفظ اس کے منہ سے عجیب خوش الحانی سے ادا ہوتے ہیں اور پیکنگ کے لہجے کا حسین آہنگ اس کی ادائی میں موسیقی کے پورے زیر و بم لیے ظاہر ہوتا ہے۔ الفاظ کی حرف ومخرج وہ نہایت واضح طور پر اور آہستگی سے ادا کرتا ہے اور اگر یہ عہدہ دار صحیح معنوں میں عالم بھی

ہوتو پھر کیا کہنا۔ وہ فقرے میں چینی ادب کے شہ پارے پیش کرنے پر قادر ہوگا پھر اس افسر طبقے کی ہنسی اور تھوکنے کا انداز تو خاصے کی چیز ہے۔ خصوصاً ہنسی تو بڑی غنائی لے کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔ اس میں تھوڑا سا تصنع، تھوڑا سا تکلف بھی جھلکتا ہے مگر اس کا اختتام بڑا بھرپور ہوتا ہے اور اگر اس ہنسی کے ساتھ اس حاکم کے سفید ڈاڑھی بھی ہوتو اس کا لطف واثر دوبالا سمجھیے۔

یہ ہنسی اداکاروں کے لیے ان کی تمام تر اداکاری کا بہت اہم حصہ ہے۔ ان اداکاروں کی ہنسی بڑی احتیاط، بڑی مشق کا نتیجہ ہوتی ہے اور جب چینی اسٹیج پر کوئی اداکار نہایت خوبصورت طریقے پر ہنسی ادا کرے تو تماشائی بے ساختہ تحسین وآفرین کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ ہنسی ہے بڑی مشکل چیز...... کیونکہ ہنسی کی ایک نہیں کئی قسمیں ہیں: مثلاً مسرت کا قہقہہ، کسی کو دھوکا دے کر اپنے جال میں پھنسا لینے پر فتح مندی کی ہنسی، استہزا اور حقارت کا زہرخند وغیرہ۔ ان میں سب سے مشکل مایوسی کی تلخ ہنسی ہے۔ یہ اس شخص کی ہنسی ہے جسے حالات کی زبردست قوت نے بالکل بے دست وپا کر کے رکھ دیا ہو۔ چین میں تھیٹر کے شوقین اِن چیزوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اداکاروں کے ہاتھوں کی حرکات، ان کے قدموں کی چاپ کیا ہے اور کیسی ہے۔ بازوؤں کی ہر حرکت، گردن کا ہر خم، سر کا ہر خفیف سے خفیف سے جھکاؤ، کمر کا خم، کھلی آستینوں کا لہرانا، چال کا ہر ہر قدم چینی اداکاروں کی زبردست مشق اور مہارت کا آئینہ دار ہوگا۔ چینی روایات کے مطابق اداکاری کے دو حصے ہیں۔ ایک تو گانا اور دوسرے کوری اداکاری۔ چنانچہ ''گانے'' کے ڈرامے الگ ہوتے ہیں اور ''اداکاری'' کے ڈرامے ان سے مختلف۔ ''اداکاری'' سے مراد انسانی جسم، ہاتھ پاؤں، چہرے کے حرکات سکنات سے انسانی جذبات کی عکاسی اور اظہار ہے۔ چینی اداکاروں کو یہ سیکھنا پڑتا ہے کہ ناراضی میں سر کیونکر ہلایا جاتا ہے، شک کی حالت میں بھویں کس طرح تنتی ہیں اور اطمینان وسکون کے لمحوں کی ڈاڑھی پر ہاتھ کس طریق سے پھیرا جاتا ہے۔

اس اس مرحلے پر پہنچ کر آرٹ اور اخلاقیات کی بحث شروع ہوتی ہے۔ فاشی ملکوں اور اشتراکی ملکوں میں آرٹ اور پراپیگنڈے کو کچھ بے طرح گڈمڈ کر دیا گیا ہے اور بعض جمہوری ملکوں میں بہت سے اہل دماغ اور دانشور لوگوں نے پراپیگنڈے اور آرٹ کے اس غیر قدرتی ملاپ کو بڑے بھولپن سے قبول کر لیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس مسئلے پر صاف صاف اور واضح بحث کی جائے تا کہ اہل ذوق تمیز کر سکیں۔ فاشی نظام

اور اشترا کی نظام دونوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ فرد کو نہ تو تخلیقی شخصیت مانتے ہیں اور نہ اس کو تخلیق کی منزل سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس سے پوری طرح چشم پوشی کرتے ہیں اور فرد کے بجائے یا تو ریاست یا کسی معاشرتی طبقے کی تخلیق کی منزل اور تخلیق کا منبع قرار دیتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ آرٹ اور ادب، دونوں کی بنیاد اور دونوں کی تعمیر ذاتی اور انفرادی جذبات پر ہوتی ہے۔ مگر اشترا کی اور فاشی، دونوں نظریے ایک ہی طبقے کی جذباتی کش مکش پر زور دیتے ہیں۔ یا صرف ایک معاشرتی گروہ کے جذبات کو قابل اعتنا سمجھتے ہیں اور مختلف افراد کے جذبات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ ان کی حقیقت کو ماننے سے انکاری ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فرد کی شخصیت مردود قرار پاتی ہے اور آرٹ اور اخلاقیات کے مسئلے پر معقولیت سے بات کرنے کا سوال بحث سے خارج ہو جاتا ہے۔

یہ یاد رہے کہ آرٹ اور اخلاقیات کا آپس میں ناتا صرف اسی حد تک ہے جس حد تک کسی فن پارے کی انفرادی خصوصیت فن کار کی شخصیت کا اظہار ہے اور بس۔ چنانچہ عظیم شخصیت رکھنے والا فن کار عظیم آرٹ تخلیق کرتا ہے اور بے چین حقیقت شخصیت کا فنکار صرف بے مایہ اور ہیچ مدان فن پیش کر سکتا ہے۔ جس فن کار کی شخصیت جذباتی ہوگی وہ جذباتی آرٹ کی تخلیق کرے گا۔ عشرت پسند آرٹسٹ ایسا آرٹ پیش کرے گا جس سے جسمانی اور تعیش اور لذتوں کا رنگ پھوٹ پھوٹ کر نکلے۔ نفاست اور نرمی جس فن کار کی شخصیت کے جوہر ہوں گے۔ وہ نفیس، نرم و نازک اور لطیف آرٹ ہی تخلیق کر سکے گا...... گویا آرٹ اور اخلاقیات کا ناتا مختصر طور پر یہ ہے جو میں نے عرض کیا...... اس لیے اخلاقیات ایسی چیز نہیں جسے کسی جابر حکمران کی خواہش پر یا پراپیگنڈے کے اعلیٰ افسر کے ہر آن بدلتے ہوئے اخلاقی اصولوں کے مطابق آرٹ پر باہر سے ٹھونسا جا سکے۔ اخلاقیات آرٹ کے باطن ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ فنکار کی روح تخلیق، اس کی وجدان کا قدرتی ذریعہ اظہار ہے پھر یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں کہ اس میں انتخاب کا اختیار ہمیں حاصل ہو بلکہ اس کی حیثیت ایسی حقیقت کی ہوتی ہے جس سے کسی طرح کا عنصر، کوئی گریز ممکن نہیں۔ کمینہ فطرت کا فنکار ہرگز ہرگز کوئی عظیم تصویر نہیں بنا سکتا۔ اِس طرح بڑے دل والا فنکار کبھی گھٹیا تصویر نہیں بنا سکتا، چاہے اس کی زندگی خطرے میں ہو۔

چینی نظریہ یہ ہے کہ آرٹ میں ایک ایسا عنصر ہے جسے پی اِن کہا جاتا ہے۔ اِسی چیز کو فرد کی شخصیت (چن پی اِن) بھی کہا جاتا ہے۔ یا اسی کو کردار کی انفرادی خصوصیت (پی اِن کہہ) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب

اِس شخصیت کواس کرداری انفرادیت وغیرہ کے کسی گریڈ میں اور کسی شخص کی شخصیت کے بارے میں، اس کے معیار کے بارے میں لفظوں اور ترکیبوں کا ایک پورا دفتر موجود ہے۔ مثال کے طور پر جو جواری کھیلتے ہوئے بدتمیزی اور چڑ چڑے پن کا مظاہرہ کرے اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ ''بری جواری شخصیت'' کا مالک ہے۔ کوئی پینے والا پی کر خرمستیوں پر اتر آئے تو اسے ''مے نوشی کی بری شخصیت'' کا مالک ٹھہرایا جاتا ہے۔ شطرنج کے بارے میں بھی ایسی ہی اصطلاحیں موجود ہیں اور شعروادب یا آرٹ میں بھی اسی طریقے کو اہم گردانا جاتا ہے...... چین میں شعری تنقید کی سب سے پہلی کتاب ''شاعری کی شخصیتوں'' کے نام سے معروف ہے۔ جسے ۵۰۰ عیسوی کے لگ بھگ چنگ یونگ نے لکھا۔ اب بھی آرٹ کی تنقید کو ''مصوری کی شخصیتیں'' قرار دیا جاتا ہے۔

چنانچہ چین میں یہ مسلمہ ہے کہ فن کار کا کام اس کی اپنی شخصیت کے تابع ہے۔ اِس ''شخصیت'' میں اخلاق اور فن کارانہ، دونوں خصوصیتیں اور دونوں کے تقاضے شامل ہیں۔ اِس شخصیت'' کی بدولت ہی انسانی برادری کو سمجھنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے، عالی خیال پیدا ہوتی ہے، زندگی کو ایک خارجی نقطہ نظر سے دیکھنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ دل سے گھٹیا پن طبیعت سے تنگ خالی اور عامیانہ پن دور ہو جاتا ہے۔ اِن معنی میں یہ ''شخصیت'' وہی چیز ہے جسے انگریزی تنقید میں ''انداز'' اور ''اسلوب'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک بے راہ رو یا جدت پسند آرٹسٹ آزاد اور غیر قدامت پسند قسم کے ''اسلوب'' کا مالک ہوگا۔ دلکش شخصیت کا مالک اپنے آرٹ میں بھی وہی دلکشی اور نزاکت سمو دے گا اور ذوقِ سلیم کا مالک عظیم فن کار کبھی کسی خاص ڈھب، کسی خاص ''اسلوب'' کا غلام ہو کر نہ رہے گا...... ان معنی میں شخصیت آرٹ کی ''روحِ رواں'' ہے۔ اہل چین کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ اگر مصور کی اخلاقی اور جمالیاتی شخصیت عظیم نہیں تو وہ کبھی عظیم مصور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ خطاطی اور مصوری دونوں کا اندازہ کرتے وقت کمالِ فن کی سب سے بڑی شرط یہ نہیں ہوتی کہ آرٹسٹ کی تکنیک اچھی ہے یا نہیں بلکہ معیار یہ ہے کہ آرٹسٹ کی شخصیت ارفع اور اعلیٰ ہے یا نہیں...... اہل چین جانتے ہیں کہ کوئی فن پارہ اعلیٰ تکنیک کا مظاہرہ کر سکتا ہے مگر یہ اعلیٰ تکنیک بھی آرٹسٹ کی گھٹیا شخصیت کو نہیں چھپا سکتی۔ (اگر وہ گھٹیا ہے تو!)...... اِس صورت میں کہا جائے گا کہ بقول انگریزوں کے اِس فن پارے میں کوئی ''خوبی کردار'' نظر نہیں آتی......

اب ہم آرٹ اور تمام فنونِ لطیفہ کے مرکزی اور سب سے اہم مسئلے تک آ گئے ہیں۔ چین کے ایک

بڑے جرنیل اور وزیر اعظم سنگ کو فان نے اپنے ایک خط میں کہیں لکھا ہے کہ خطاطی میں آرٹ کے دو زندہ اصول کارفرما ہیں، یعنی ہیئت اور اظہار۔ اس عہد کے سب سے بڑا خطاط ہوساؤ چی نے جرل سنگ کے اس نظریے کی تائید کی ہے۔ اور اس کی بصیرت کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ چونکہ فنون لطیفہ تمام کے تمام ٹھوس حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ان کے سلسلے میں ایک مشینی مسئلہ درپیش رہتا ہے اور یہ مسئلہ تکنیک کا ہے اور تکنیک کی مہارت ہر حال میں ضروری ہے مگر آرٹ چونکہ صرف تکنیک کا نام نہیں بلکہ آرٹ روح کا جوہر بھی ہے۔ اس لیے تخلیق فن کے ہر شعبے کے لیے ذاتی اظہار بڑا ضروری عنصر ہے۔ فنکار کی انفرادیت ہی وہ چیز ہے جو اس کی تکنیک کے مقابلے میں اس کے فن پارے کی نمایاں خصوصیت بنتی ہے۔

اس اصول کو اگر انشا پردازی پر لاگو کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ کسی کتاب میں سب سے اہم چیز مصنف کا ذاتی اسلوب، اس کے ذاتی احساسات ہیں جو اس کی پسند، ناپسند، اس کے نظریوں اور خیالات کے روپ میں آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں...... چنانچہ فن کار کے لیے ہمہ وقت یہ خطرہ موجود ہے کہ یہ ذاتی اظہار یا ''شخصیت'' کہیں تکنیک ہی میں دب کر نہ رہ جائے۔ مبتدیوں کے لیے کیا انشاء، کیا مصوری، کیا اداکاری، ہر سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہوا کرتی ہے کہ اپنے آپ کو ''اس فن پارے میں کھو کیونکر دیں۔'' اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مبتدی ہمیشہ ہیئت اور تکنیک سے خوفزدہ رہتا ہے لیکن یہ یادرہے کہ کوئی تکنیک، کوئی ہیئت، ذاتی ''عنصر'' کے بغیر کام کی نہیں۔ ہیئت کا حسن خاص لچک رکھتا ہے اور یہی لچک دیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ چاہے یہ گالف کھیلنے والے کے ڈنڈے کی جنبش کا بانکپن ہو یا فٹ بال کھیلنے والے کا کھیل ہو۔ یہ لچک اپنے اندر روانی اور برجستگی رکھتی ہے اور اظہار کے لیے روانی ہی ایک ضروری چیز ہے۔ اظہار کی قوت کے سامنے تکنیک رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ بلکہ یہ قوت تکنیک کی حد بندیوں کے اندر بڑی آزادی اور خوش اسلوبی سے حرکت کیا کرتی ہے۔

گویا ہر آرٹ کے لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ اس میں ''قوت کردار'' ہو۔ یہ قوت کردار کیا چیز ہے؟ یہ وہی عنصر ہے جو کسی فن پارے سے فنکار کی شخصیت یا اس کی روح یا اس کے دل کے بارے میں (یا بقول اہل چین ''فنکار کے سینے'' کے بارے میں) عیاں ہوتا ہے۔ اس ''قوتِ کردار'' اور اس ''شخصیت'' کے بغیر وہ فن پارہ بے جان ہے۔ تکنیک کا کوئی حسن، اس کا کوئی کمال اِس فن پارے کو بے جان اور بے روح ہونے سے بچا نہیں

سکتا۔یعنی انفرادیت کی اس معراج کے بغیر جسے ''شخصیت'' کہتے ہیں خود حسن بھی فرسودہ اور پیش افتادہ ہو جاتا ہے۔ جو حسین لڑکیاں دن رات ہالی وڈ کی اسٹار بننے کے خواب دیکھا کرتی ہیں وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ حُسن انفرادیت کی معراج کا نام ہے۔ یہ بے چاری کسی نامور اداکارہ مثلاً جین ہارلو یا مارلن ڈیٹریچ کے انداز کی نقل کر کے خوش ہو لیتی ہیں اور جو ڈائریکٹر نئے چہروں کی تلاش میں پھرتے ہیں وہ ان نقال لڑکیوں کو دیکھ کر سخت بیزار ہوتے ہیں۔ اِسی لیے ہم اپنی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ انفرادی حسن کم کم نظر آتا ہے۔بس وہی ایک ہی قسم کی، ایک ہی سانچے میں ڈھلتی ہوئی، فرسودہ سی خوش شکل عورتیں بہت ہیں جن میں کوئی تازگی، کوئی انفرادیت نہیں ہوتی۔ فنونِ لطیفہ ایک ہیں اور ہر ایک کا بنیادی اصول ایک ہے، یعنی اظہار اور شخصیت۔ چاہے یہ آرٹ اداکاری ہو، تصویر کشی ہو، یا ادبی کاوشیں ہوں۔ عظیم اداکاروں کی اداکاری دیکھ دیکھ کر کوئی چاہے تو نثر نگاری کے تمام اسرار ورموز سیکھ سکتا ہے۔ گویا شخصیت کی دلکشی ہر آرٹ کے لیے بنیادی طور پر ضروری ہے کیونکہ آرٹسٹ چاہے کچھ کرے اس کی شخصیت اور اس کا کردار اس کے آرٹ میں ضرور جھلکتا ہے۔

شخصیت کی تہذیب اخلاقی اور جمالی، دونوں لحاظ سے ضروری ہے اور اس کے لیے علمیت اور شائستگی، دونوں لازمی ہیں۔ شائستگی ایسی چیز ہے جو ذوقِ سلیم کے قریب تر ہے۔ ممکن ہے کہ ذوقِ سلیم کے ساتھ ہی طبیعت کی یہ شائستگی کہ کسی فن پارے کو دیکھنے یا کسی کتاب کو پڑھنے کا لطف جبھی آتا ہے کہ اس لطف کے پیچھے علمیّت موجود ہو...... خطاطی اور مصوری کے سلسلے میں یہ بات بڑی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ چینی خطاطی کے عمدہ نمونوں کو دیکھ کر ہی پتا چل سکتا ہے کہ فنکار قدیم خطاطی کے شاہکاروں سے وقاف ہے یا نہیں اگر وہ اِن سے واقف ہوگا تو اس کی علمیّت کی بدولت اس کی خطاطی میں انداز کی عجیب سی قدامت آجائے گی مگر اس کے علاوہ اسے اپنے فن پارے میں اپنی شخصیت، اپنی روح بھی ڈالنی پڑے گی جو قدیم اسلوب سے بالکل مختلف نظر آئے گی۔ اس طرح خطاطی اور مصوری دونوں میں جمالیاتی خصوصیتوں یا مختلف قسم کے حسن کا بڑا ہمہ گیر تنوع نظر آتا ہے اور کوئی شخص ان فن پاروں کو فن کار کے حسن طبیعت سے الگ نہیں کر سکتا۔ ان فن پاروں میں کبھی من کی ترنگ، کبھی تلون کے کرشمے نظر آئیں گے، کبھی آزادہ روی کا حسن دکھائی دے گا، کبھی قوت کا احساس ٹپکے گا، کبھی جرات اور جیوٹ کا حسن ہوگا، کبھی رومانی فضا کا پراسرار جمال ہوگا، کبھی ضبط کا سنجیدہ روپ ہوگا، کبھی بانکپن کی لچک ہوگی تو کبھی سادگی کا نور، کبھی بھولپن اور سادگی کی دلکشی ہوگی، کبھی باقاعدگی اور تناسب کی دل

.بائی تو کبھی تیزی اور طراری کی ادا کبھی مصنوعی کم روئی کی دلکشی ہوگی۔

بس فن پاروں میں صرف ایک قسم کا ''حُسن'' بارنہیں پا سکتا کیونکہ اس حسن کا وجود ہی نہیں......اور یہ ہے محنت اور مشقت اور سخت با مشقت زندگی کا وہ ''حُسن'' جو آج کل ہمیں گمراہ کر رہا ہے۔

3- پڑھنے کا فن

کتابوں کے مطالعے کو مہذب زندگی کی ایک برکت، ایک دلکشی سمجھا جاتا ہے اور جو لوگ اپنے آپ کو اِس لطف سے اکثر محروم رکھتے ہیں یا مطالعے کی سعادت انھیں کبھی کبھار ہی نصیب ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس کو ٭زت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور مطالعہ کرنے والوں پر رشک کیا کرتے ہیں اگر ہم مطالعہ کرنے والے اور طالعہ نہ کرنے والے لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو اس کی وجہ صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ جس شخص میں طالعے کی عادت نہیں وہ اپنی محدود دنیا، اردگرد کی گھٹی ہوئی فضا کا زندانی ہے۔ وہ مکان اور زمان، دونوں کا یدی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ایک بندھے ٹکے قاعدے کی پابند ہوتی ہے۔ اس کی دوڑ چند ملاقاتیوں، چند وستوں تک ہوتی ہے اور اس کی آنکھیں زیادہ سے زیادہ کچھ دیکھتی ہیں جو اس کے قریبی گردوپیش میں ہو رہا و......اسے اِس قید خانے سے کہیں مفر نہیں۔ لیکن جونہی یہ شخص کتاب اٹھاتا ہے وہ ایک مختلف دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اگر یہ کتاب اچھی ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ دنیا کے ایک بہترین صاحبِ گفتار کے حضور میں آگیا...... یہ صاحبِ گفتار (کتاب کا مصنف) اُس قاری کو اپنے ساتھ ایک مختلف ملک یا تاریخ کے ایک مختلف دور میں لے بائے گا یا اس کے سامنے اپنی ذاتی ناکامیوں کے تذکرے کرے گا یا زندگی کے کسی شعبے، کسی خاص پہلو پر تیں کرے گا۔ اور یہ باتیں ایسی ہوں گی جن کے بارے میں اس قاری کو بہت کم معلومات ہوں گی۔ اگر کتاب کا مصنف کوئی قدیم زمانے کا ادیب ہے تو وہ قاری کو گزری ہوئی صدیوں کی روح سے روشناس کرائے گا اور کتاب پڑھتے پڑھتے اس نئے زمانے کے قاری کو پتا چلتا جائے گا کہ وہ قدیم مصنف کس وضع کا انسان ٭ا، اس کی شکل شباہت کیسی تھی اور وہ کیسا آدمی تھا۔ چین کے دو عظیم تاریخ دانوں میں سے آس اور سیما چی ان نے عین بعین یہی بات کہی ہے۔ چنانچہ حال کی مکروہات کے بارہ گھنٹوں میں سے صرف دو گھنٹے ایک مختلف دنیا ٭ں سانس لے سکنا اور حال کو بھول سکنا ایسی نعمت ہے جس پر اپنے ماحول اور اپنے جسم کے زندانی ضرور رشک کریں گے۔ ماحول کی یہ تبدیلی نفسیاتی لحاظ سے انسان پر بالکل وہی خوش گوار اثر رکھتی ہے جو صرف سفر اور

سیاحت سے ممکن ہے۔

لیکن مطالعے کا یہی ایک فائدہ نہیں...... مطالعہ کرتے ہوئے قاری تخیل اور تفکر کی دنیا میں پہنچتا ہے۔ کتاب چاہے دنیا کے ٹھوس واقعات سے تعلق رکھتی ہو، ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا، اس میں زندہ رہنا اور بات ہے اور ان واقعات کا بیان کتاب میں پڑھنا بالکل مختلف چیز ہے کیونکہ تحریر میں آ کر ٹھوس واقعات ایک تماشے، ایک نظارے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور قاری اِن واقعات کا تماشائی بن جاتا ہے، ان کا ایک حصہ ایک جزو نہیں رہتا۔ لہٰذا بہترین تحریر وہی ہے جو غور وفکر پیدا کرے، قاری کو سوچنے، سمجھنے پر مجبور کرے۔ یہ نہیں کہ وہ واقعات کی سیدھی سادھی رپورٹ پیش کر دے اور بس۔ ہماری دنیا میں اخبار بینی پر جو اتنا وقت صرف کیا جاتا ہے میں اسے مطالعے میں شمار نہیں کرتا۔ کیونکہ اخبار پڑھنے والے عام لوگ دنیا کے واقعات اور حالات کے بارے میں خبریں، تازہ اطلاعات جاننا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک فکر اور سوچ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

مطالعے کے مقصد کے بارے میں بہترین بات ہوانگ شانکو نے کہی ہے۔ سُونگ عہد کا یہ شاعر کہتا ہے:

> ''کوئی صاحب علم اگر تین دن تک مطالعہ نہ کرے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی باتوں میں کوئی دلکشی، کوئی مزہ نہیں رہا۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ (آئینے میں) اس کا چہرہ اب نہایت نفرت انگیز نظر آتا ہے۔''

ہوانگ کا مطلب یہ ہے کہ مطالعے اور کتاب بینی سے انسان میں دلکشی اور رنگ وآب پیدا ہوتا ہے جو مطالعے کا اصل مقصد ہے۔

چنانچہ جس مطالعے کا مقصد یہ ہوگا صرف وہی مطالعہ آرٹ کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ نہ کہیے کہ انسان اپنے ''ذہن کو بہتر بنانے'' کے لیے کتابیں پڑھتا ہے کیونکہ جب آپ نے مطالعے کا یہ مقصد ٹھہرا لیا تو اس کا سارا مزہ ہی کر کرا ہو گیا۔ جو شخص ''معلومات کی زیادتی'' اور ''ذہنی بہتری'' کے لیے کتابیں پڑھتا ہے وہ اپنے آپ کو عام طور پر یہ تلقین کرتا ہے:

> ''مجھے شیکسپیئر کے تمام ڈرامے اور نظمیں پڑھنی چاہئیں، قدیم یونانی ڈرامہ نویس اور فلسفی

سوفوکلیز کو پڑھنا چاہیے، پھر ڈاکٹر ایلیٹ کی تمام کتابیں پڑھنی چاہئیں (جو پانچ فٹ لمبے شلیف پر بھی نہیں سما سکتیں) تاکہ میں بھی تعلیم یافتہ اور صاحبِ علم بن سکوں۔''

میں عرض کروں گا کہ ایسا شخص کبھی تعلیم یافتہ نہیں ہوسکتا۔ وہ بے چارہ کسی شام، مارے باندھے، شیکسپیئر کا شاہکار، ہملٹ پڑھے گا اور بڑی مشکل سے اسے ختم کر کے اطمینان کا سانس لے گا کہ یہ عذاب بھی ختم ہوا اور اب کہنے کو یہ کہہ سکیں گے کہ ''ہاں بھائی ہم نے بھی ہملٹ پڑ رکھا ہے''...... یاد رکھیے کہ جو شخص کسی مجبوری کے احساس سے کوئی کتاب پڑھتا ہے اسے مطالعے اور کتاب بینی کے فن سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ کسی کاروباری قسم کا مقصد سامنے رکھ کر کوئی کتاب پڑھنا بالکل اسی قسم کا مطالعہ ہے جس طرح اسمبلی کے ممبر حضرات ایوان میں تقریر کرنے سے پہلے رپورٹوں اور فائلوں کی ورق گردانی کیا کرتے ہیں۔ یہ کاروباری مشورے اور کاروباری معلومات کا ایک بہروپ ہے، مطالعہ ہرگز نہیں ہے۔

گویا ہوانگ کے نزدیک مطالعے کی جائز صورت صرف ایک ہے کہ شخصیت کی دلکشی بڑھانے اور گفتار کا لطف زیادہ کرنے کے لئے کتاب بینی کی جائے۔ شخصیت کی اس دلکشی کو جسمانی خوبصورتی سے ممتاز کرنا پڑے گا۔ ہوانگ نے کہا ہے کہ تین دن تک کوئی کتاب نہ پڑھنے سے اہل علم کا چہرہ نفرت انگیز ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب نہیں کہ وہ واقعی کریہہ اور گھناؤنا بن جاتا ہے کیونکہ جسمانی بدصورتی میں بھی خاص قسم کی دلکشی دیکھی گئی ہے اور میں نے تو ایسے ایسے حسین چہرے بھی دیکھے ہیں جو بالکل بے نمک اور دیکھنے میں پھیکے سیٹھے نظر آتے ہیں۔ جسمانی بدصورتی کا تعلق دلکشی سے بہت کم ہے۔ مثلاً میرے ایک محترم دوست کا سر بالکل بم کی شکل کا ہے لیکن مجھے اسے دیکھنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے اور مغربی مصنفوں میں (جہاں تک تصویروں کا تعلق ہے) میرے نزدیک سب سے خوبصورت چہرہ مشہور انشاپرداز جی، کے، چسٹرٹن کا ہے۔ میں نے اس کی تصویر دیکھی تو بڑی زبردست مونچھوں کا ایک انبار نظر آیا، اوپر یہ بڑا چشمہ لگا تھا، بھویں خاصی الجھی ہوئی تھیں اور بھوؤں کے درمیان دو تین گہری لکیریں بھی تھیں مگر اس تصویر کو دیکھ کر ہی پتا چلتا تھا کہ اس اونچی پیشانی کے پیچھے نہ جانے کتنے خیالات آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں جو نہ جانے کس وقت ان تیز، عقابی آنکھوں سے پھوٹ نکلیں گے۔

یہی وہ چیز ہے جسے ہوانگ نے حسین چہرہ قرار دیا ہے وہ حسن صورت جو پاؤڈر اور روژ کا ممنون احسان

نہیں بلکہ جسے تخیل کی قوت نے حسین بنایا ہے۔

رہا گفتار کا مزہ تو اس کا دارومدار پڑھنے کے طریقے پر ہے۔ اگر گفتار میں لطف ہے یا گفتار بے مزہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ مطالعے کا طریقہ کیا ہوگا۔ اگر قاری کتابوں سے کچھ لطف کچھ خوشبو اخذ کرتا ہے تو یہی خوشبو اس کی گفتار میں بھی ظاہر ہوگی۔ اور اگر اس میں گفتار میں خوشبو ہوگی تو اس کی تحریر میں بھی وہی لطف، وہی خوشبو لازماً جھلک اٹھے گی۔

اِس لیے میرے نزدیک خوشبو یا ذوق ہی مطالعے کی بنیاد ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر شخص کا ذوق اپنا ہوتا ہے اور پسند اپنی۔ یعنی جو حال کھانے کا ہے وہی حال مطالعے کا ہے۔ کھانے کا سب سے زیادہ صحت مند طریقہ یہ ہے کہ جو پسند ہو وہ کھایئے تاکہ معدہ اسے خوشی سے قبول کرے اور ہضم بھی کرے۔ مطالعے کا بھی یہی حال ہے۔ کھانے میں گوشت اگر آپ کے لیے مفید ہے تو میرے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے۔ مطالعے کے سلسلے میں بھی کوئی استاد شاگردوں کو مجبور نہیں کرسکتا کہ جو کتابیں اسے پسند ہیں وہ شاگردوں کو پسند آئیں۔ نہ والدین کو یہ امید رکھنی چاہیے کہ ان کے بال بچوں کا وہی مذاق ہوگا جو اُن کا ہے۔ اسی لیے یوان چنگ لانگ نے حکم لگا دیا تھا ''جو کتابیں پسند نہ آئیں انھیں رہنے دو تاکہ انھیں دوسرے لوگ پڑھیں۔'' گویا اس نظریے کے مطابق دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جسے پڑھنا ہر کسی کے لیے ضروری ہو۔ ہمارے ذہنی میلانات اور دلچسپیاں درختوں کی طرح پھیلتی پھولتی ہیں اور دریا کی طرح رواں دواں رہتی ہیں۔ جب تک درخت کو مناسب خوراک ملتی رہتی ہے وہ بڑھتا پھولتا ہے اور جب تک ندی نالوں کا دھارا تازہ رہتا ہے پانی رواں رہتا ہے۔ پانی کے راستے میں جب چٹان آجاتی ہے تو وہ اس کے گرد گھوم کر نکل جاتا ہے، کوئی نشیبی خوبصورت وادی ملتی ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے، کچھ دیر مزے سے ستاتا ہے اور بہتے بہتے جب کسی گہرے پہاڑی تالاب یا جھیل میں آنکلتا ہے تو وہ اطمینان سے وہیں ٹھہر جاتا ہے۔ جب اسے آبشاریں ملتی ہیں تو وہ تیزی سے سفر کرنا شروع کردیتا ہے۔ اسی طرح کسی کوشش کے بغیر یا کسی لگے بندھے مقصد کے بغیر یہ پانی ایک نہ ایک دن ضرور سمندر تک پہنچ جاتا ہے...... چنانچہ اس دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جسے پڑھنا سب کے لیے اشد ضروری ہو۔ ہاں ایسی کتابیں ضرور ہیں جنھیں ہمیں، آپ سب کوئی کسی خاص وقت، کسی خاص مقام، خاص حالات کے تحت اور عمر کے کسی خاص حصے پر پڑھنا چاہیے۔

مجھ سے پوچھیے تو مطالعہ بھی اسی طرح تقدیر کے تابع ہے جس طرح شادی۔ بالفرض اگر ایسی کوئی کتاب (مثلاً انجیل مقدس) موجود ہے جسے پڑھنا سب کے لیے لازم ہے تو اس کا بھی ایک معین وقت ہوا کرتا ہے۔ اگر آپ کے خیالات اور تجربات پختگی کے ایک خاص درجے تک نہ پہنچے ہوں تو دنیا کے بڑے بڑے ادبی شاہکاروں کا مطالعہ بھی فضول ہوگا۔ کنفیوشس نے کہا تھا ''پچاس برس کی عمر کو پہنچو تو نیرنگیوں کی کتاب پڑھو۔'' مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب پینتالیس برس کی عمر میں ہرگز نہ پڑھنی چاہیے۔ کنفیوشس کے اپنے اقوال میں جو دانائی، جو پختگی پنہاں ہے وہ صرف اسی وقت سمجھ میں آ سکتی ہے جب پڑھنے میں خود وہی پختگی موجود ہو۔

اس کے علاوہ اگر ایک ہی کتاب زندگی کے مختلف مرحلوں پر مطالعہ کر کے دیکھی جائے تو ہر بار اس کا لطف مختلف ہوگا۔ اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ کتاب کے مصنف سے اگر ذاتی ملاقات کے بعد اس کی کتاب پڑھیں تو زیادہ مزہ آئے گا۔ ذاتی ملاقات نہ سہی تو تصویر میں اس کا چہرہ مہرہ، خط وخال دیکھ لیں تو کتاب کے مطالعے کا کچھ مزید ہی لطف اٹھایا جا سکتا ہے اور جب اس مصنف سے آپ کے ذاتی تعلقات منقطع ہو جائیں تو پھر وہی کتاب پڑھیے۔ اس مرتبہ مزہ بالکل مختلف ہوگا...... رہا عمر کے مختلف حصوں میں ایک ہی کتاب پڑھنے کا معاملہ تو نیرنگیوں کی کتاب چالیس برس کی عمر میں پڑھیے تو اور ہی لطف ہے اور یہی کتاب پچاس برس کی عمر میں پڑھ کر دیکھیے تو اور ہی لطف ہے کیونکہ اب آپ نے زیادہ زندگی اور زندگی کی زیادہ تبدیلیاں دیکھ لی ہیں......

اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ ہر اچھی کتاب کو ایک بار پڑھنے کے بعد دوسری بار بھی پڑھنا چاہیے۔ اس سے نیا لطف، نئے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں مجھے چارلس کنگز لے کا مشہور ناول ''جانبِ مغرب'' پڑھنے کے لیے دیا گیا۔ اسی زمانے میں میں نے وکٹورین زمانے کی مشہور مصنف تھیکرے کا شاہکار ''ہنری السمینڈ'' بھی پڑھا تھا۔ اپنی عمر کے تقاضے کے مطابق میں نے سمندری مہموں اور دلدوز محبت کا ناول ''جانب مغرب'' تو بہت پسند کیا لیکن میری سمجھ میں اُس وقت یہ نہ آیا کہ ''ہنری السمینڈ'' میں آخر کیا بات ہے جو اسے اتنا سر چڑھایا جاتا ہے۔ بعد میں میں نے یہی ناول پھر پڑھا اور مجھے محسوس ہوا کہ اس کا اصل لطف مجھے زندگی کے اس دور میں نہ آ سکتا تھا۔

گویا مطالعہ ایک ایسا کام ہے جس کے دو فریق ہیں۔ اور یہ فریق کتاب کا مصنف اور کتاب کا قاری ہیں۔ کتاب کو پڑھنے سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اس میں قاری کی بصیرت، اس کے تجربے کا بھی اتنا ہی حصہ

ہے جتنا خود مصنف کی بصیرت اور مشاہدات کا ہے۔ اسی لیے کنفیوشس کی کتاب الاقوال کے بارے میں کنفیوشسی فلسفی چنگ یی چون آن نے کہا ہے ''قاری اور قاری میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بعض لوگ کتاب الاقوال کو پڑھ کر کچھ تبدیلی محسوس نہیں کرتے، بعض قاریوں کو اس کی ایک دو سطروں سے مزہ آتا ہے اور بعض قاری ایسے ہوتے ہیں کہ کتاب الاقوال پڑھتے ہی ان پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر ناچ ناچ اٹھتے ہیں۔''

میرے نزدیک اپنے محبوب مصنف کا کھوج لگا لینا ذہنی ترقی کا نہایت نازک اور نہایت اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ اِس دنیا میں ہم مذاقی اور دو روحوں کی باہمی کشمکش بڑی چیز ہے۔ اس لیے پرانے اور نئے مصنفوں کی صفوں میں اس ایک مصنف کو ڈھونڈ لینا چاہیے جس کی روح آپ سے ہم آہنگ ہو۔ مطالعے سے کوئی فائدہ اٹھانے کی بنیادی شرط یہی ہے مگر اپنے محبوب مصنف کی تلاش میں آزادی رائے اور خود اختیاری سے کام لینا چاہیے۔ یوں یہ بتانا یا معین کرنا بہت مشکل ہے کہ میرا محبوب مصنف کون ہے۔ کیونکہ یہ بھی ''پہلی نظر پر محبت ہو جانے والا معاملہ ہے۔ قاری سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اِس مصنف کو پسند کرو لیکن جونہی کوئی خاص مصنف سامنے آیا قاری کو جیسے خود بخود پتا چل جاتا ہے کہ میرا محبوب مصنف یہی ہے...... مصنفین کا یہ کھوج ایسا ہے جس کے واقعات سے ''تاریخِ ادب'' بھری پڑی ہے کئی بار یہ واقعہ گزرا ہے کہ قاری اور مصنف کے درمیان صدیوں کا فاصلہ حائل تھا مگر ان کا انداز خیال، ان کے احساسات، اتنے ہم آہنگ، اتنے مماثل تھے کہ جونہی کسی کتاب کے صفحوں پر دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی قاری نے یہ محسوس کر لیا کہ اس نے اِس کتاب میں اپنا عکس کو پالیا ہے۔ چینی روایات میں ایسی ہم آہنگ روحوں کے ملاپ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ قاری اور مصنف دونوں ایک ہی روح کے دو قالب تھے۔ چینی ادب میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ سوتنگ پو کو چونگ زے کا نیا ''قالب'' کہا جاتا تھا اور یوآن چنگ لانگ کو پو کی روح کا ایک نیا پیکر قرار دیا گیا تھا۔ خود سوتنگ پو کہتا ہے کہ جب میں نے پہلی بار چونگ زے کی تصانیف کو پڑھا تو مجھے یوں احساس ہوا گویا میں بچپن ہی سے یہی باتیں سوچتا آیا ہوں اور یہی نظریات قائم کرتا رہا ہوں۔ یوآن چنگ لانگ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ ایک رات اُس نے اتفاقاً اپنے ایک گمنام معاصر سُو ون چانگ کی نظموں کا مجموعہ پڑھا۔ اضطرار کے عالم میں وہ پلنگ سے کود کر فرش پر آ رہا اور اس نے اپنے ایک مہمان دوست کو جگایا۔ دوست نے جب یہ نظمیں پڑھیں تو

دونوں کی داد نے گھر کو سر پر اٹھالیا۔ دونوں مل کر پڑھتے رہے اور جی کھول کر داد دیتے رہے۔ نوکر بے چارے حیران تھے کہ اتنا شور و غوغا آخر کس لیے برپا کیا جا رہا ہے۔ انگریز خاتون ناول نویس جو جارج ایلیٹ کے قلمی نام سے زندہ جاوید شہرت رکھتی ہے روسو کو پہلی بار پڑھ کر از خود رفتہ ہوگئی تھی۔ جرمن فلسفی نشطے نے پہلی بار شوپن ہار کو پڑھا تو اسے محسوس ہوا جیسے ایک برقی لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شوپن ہار بہت زیادہ مایوس گرو تھا اور نطشے شاگرد کی حیثیت سے بہت زیادہ طوفانی مزاج کا آدمی تھا اور اسی لیے بعد میں نطشے نے بغاوت کر کے اپنے گرو کے بالکل متضاد، سخت کوشی کا فلسفہ پیش کیا۔

میں پھر عرض کروں گا کہ اپنے محبوب مصنف کا کھوج لگانا اور اس کی کتابیں پڑھنا ہی وہ چیز ہے جس سے قاری کو کچھ فائدہ ہوسکتا ہے۔ جس طرح اپنے سپنوں کی رانی کی پہلی نظر دیکھنے ہی سے انسان مر مٹتا ہے اور ہر چیز ایک نئے معنی کی حامل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ عورت ہوتی ہے جو عاشق کے نزدیک ہر خوبی، ہر حسن کا پیکر ہے۔ انسان کا قدِ رعنا، اس کا مکھڑا، اس کی زلفیں، اس کی آواز، اس کا اندازِ کلام، اس کا تبسم۔ سب کچھ وہی ہوتا ہے جو دل میں پہلے سے بسا ہوا تھا۔ یہی حاصل اپنے محبوب مصنف کے مل جانے کا ہے۔ اس کا اندازِ بیان، اس کا ذوق، اس کا نقطہ نظر، سوچنے کا انداز، ہر چیز قاری کے دل کو لگتی ہے اور وہ اس کی لکھی ہوئی ہر ہر سطر، ہر لفظ کو آنکھوں اور دل میں بسا لیتا ہے اور چونکہ مصنف اور قاری دونوں کے درمیان روحانی یگانگی ہوتی ہے۔ اس لیے قاری اس مصنف کی ہر بات کو ذہن میں جذب کرتا ہے اور ہر چیز کو سمجھتا ہے۔ یہ مصنف اس پر جادو کر دیتا ہے اور قاری اس جادو، اس سحر سے مسحور ہو کر خوش ہوتا ہے...... وقت گزرنے پر قاری کی اپنی آواز، اس کا انداز، اس کے مسکرانے کا ڈھنگ، اس کا بات کرنے کا طریقہ وہی ہوتا ہے جو اس کے محبوب مصنف کا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ہستی اپنے ادبی محبوب کی ہستی میں گم کر دیتا ہے اور اس کی کتابوں سے اپنی روح کی غذا حاصل کرتا ہے۔ چند برس اسی طرح گزر جاتے ہیں پھر قاری اپنے ادبی محبوب سے تنگ سا آ جاتا ہے اور وہ نئے محبوب تلاش کرتا ہے۔ اس طرح وہ دو چار ادبی محبوبوں سے نپٹ لیتا ہے اور ان کی ہستی سے حاصل کرنے کی ہر چیز حاصل کر لیتا ہے تو وہ خود مصنف بن نکلتا ہے۔

مگر یہ خیال رہے کہ بہت سے قارئین کسی مصنف کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے...... آخر دنیا میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایسی ہیں جو محض دل لگی کرتی پھرتی ہیں اور کسی ایک ہستی سے گہرا دلی تعلق پیدا نہیں

کر سکتیں۔ ایسے لوگ ہر مصنف کی ہر کتاب پڑھ سکتے ہیں، ہر رطب و یابس کا مطالعہ کر سکتے ہیں...... مگر انھیں اس مطالعے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

میں نے مطالعے کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں وہ مطالعہ ہرگز شامل نہیں جو بامرِ مجبوری کیا جائے یا جو فرض قرار پایا ہو۔ چین میں یہ رواج تھا کہ طالب علم کو سخت محنت سے پڑھنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ ایک عالم کی کہانی مشہور ہے کہ رات کو مطالعہ کرتے وقت وہ اپنی پنڈلی میں زنبور ڈال لیتا تھا تا کہ کتابیں پڑھتے پڑھتے نیند نہ آئے۔ ایک اور صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ خادمہ کو پاس کھڑا رکھتے اور اسے ہدایت تھی کہ جونہی میں سو جاؤں مجھے فوراً جگا دیا جائے تا کہ کتاب بینی میں حرج نہ ہو!...... میرے نزدیک یہ بڑی فضول بات ہے...... اگر کتاب آپ کے سامنے ہو اور کوئی قدیم مصنف اِن صفحات کے واسطے سے آپ کے ساتھ ہم کلام ہو اور آپ پر غنودگی طاری ہو جائے تو پھر اس کا علاج یہی ہے کہ کتاب بند کیجیے اور بستر پر لیٹ کر سو جائیے۔ کیونکہ مصنوعی طریقوں سے اپنے آپ کو بیدار رکھ کر پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جن لوگوں نے علم و ادب میں نام پیدا کیا ہے وہ کتاب کو "محنت سے رٹنے" اور "یاد کرنے" سے عمر بھر ناواقف رہے ہیں۔ ان کے دل میں کتابوں کی سچی محبت موجود ہوتی ہے۔ اور وہ اس لیے پڑھتے رہتے ہیں کہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔

یہ مسئلہ طے ہونے کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ مطالعے کا وقت کون سا ہو اور کہاں مطالعہ کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں مطالعے کا وقت اور جگہ، دونوں کا کوئی وجود نہیں۔ جب مطالعے کو جی چاہے تو ہر جگہ بیٹھ کر پڑھا جا سکتا ہے اگر مطالعے کا ذوق دل میں ہو تو سکول میں اور سکول سے باہر اور سکول کی پابندیوں کے باوجود کتاب بینی ہو سکتی ہے۔ سنگ کوفان کے بارے میں مشہور ہے، اس کے چھوٹے بھائی نے اسے لکھا کہ شہر آ کر علم حاصل کیجیے کیونکہ شہر میں بہتر درسگاہیں موجود ہیں۔ سنگ کوفان نے جواب میں لکھا "اگر دل میں علم کا شوق ہو تو دیہات میں بلکہ صحرا میں یا کسی بازار میں بھی علم حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ گڈریا بن کر یا لکڑہارا بن کر بھی علم حاصل کرنا ممکن ہے اور اگر دل میں علم کا شوق نہ ہو تو نہ صرف دیہاتی سکول ناموزوں ہے بلکہ دیہات کی خاموش فضا میں ایک الگ تھلگ مکان یا کسی طلسماتی جزیرے میں بھی رہ کر علم حاصل نہیں ہو سکتا۔"

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو میز پر کتاب لے کر بڑے ٹھسے سے بیٹھے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ پڑھنا ممکن نہیں کیونکہ کمرہ اتنا ٹھنڈا ہے اور کرسی اتنی سخت ہے اور روشنی کی چمک زیادہ ہے، وغیرہ...... ایسے

ادیب بھی ہیں جو اکثر یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ کمرے میں مچھر بہت ہیں، لکھیں تو کیونکر لکھیں؟ کاغذ بہت زیادہ چکنا ہے، لکھا نہیں جاتا۔ بازار کا اتنا شور کمرے میں آتا ہے، بھلا اس شور میں لکھنا ممکن ہے؟ مگر کرنے والے سب کچھ کرتے ہیں۔ سونگ عہد کے مشہور فاضل اویانگ سی یو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تین جگہوں پر بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔ یا تو تکیے پر یا گھوڑے پر یا بیت الخلا میں اور ایک اور مشہور فاضل کے بارے میں یہ مسئلہ بات مانی گئی ہے کہ وہ کنفیوشس کے فلسفے کی کتابیں گرمیوں میں مادرزاد ننگا ہو کر پڑھتا تھا۔ اس کے برعکس اگر پڑھنے سے دلچسپی نہ ہو تو سال بھر میں کوئی موسم کوئی مقام مطالعے کے لیے سازگار نہیں ہوتا...... وجہ بھی ملاحظہ ہو:

موسمِ گل میں کتابیں نہ پڑھو
موسمِ گل سے یہ ہے غداری
گرمیاں آئیں تو سوتے ہی رہو
اسی موسم کی ہیں نیندیں پیاری
برف گرتی ہے زمستاں میں یہاں
موسمِ گل کی کرو تیاری

آپ پوچھیں گے کہ جب یہ بات ہے تو پھر پڑھنے کا اصلی فن کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب پڑھنے کو جی چاہے تو کتاب لے کر بیٹھ جایئے۔ اسی مطالعے کا لطف آئے گا جو کوشش کے بغیر کیا جائے، جس میں تازگی اور ازخود رفتگی کی کیفیت ہو۔ کسی سہانے دن عمر خیام کی رباعیات اٹھا لیجیے اور اپنی محبوب کے ساتھ کنار دریا پہنچ جایئے اگر خوبصورت بادل چھائے ہوں تو پھر کتاب چھوڑ دیجیے بادلوں کا مطلب کیجیے یا کتاب اور ابر دونوں کا بیک وقت مطالعہ کرتے رہے۔ بیچ بیچ میں پائپ پی لینا یا چائے پینا مطالعے کے لطف کو دوبالا کر دے گا یا پھر سرما کی ایک رات آتشدان کے سامنے بیٹھ کر دس بارہ موضوعات پر کتابیں پاس رکھ لیجیے۔ چائے کی کیتلی آگ پر رکھی ہو، دل پسند تمباکو کی تھیلی پاس پڑی ہو اور فلسفہ اقتصادیات، شاعری، سوانح وغیرہ پر کتابیں سامنے ہوں۔ ایک ایک کر کے کتابیں اٹھایئے، ورق الٹیے پھر جس پر توجہ مرکوز ہو جائے اس کا مطالعہ کرتے رہیے۔ چن سنگ تان کا کہنا ہے کہ ''برفباری کی رات میں، بند دروازوں کے پیچھے کسی ضبط شدہ کتاب کو پڑھنا

زندگی کی بہت بڑی مسرت ہے۔'' رہا مطالعے کا موڈ تو چن چی جو کا یہ قول یادر ہے:

''قدما کا قول ہے کہ کتابیں بے دست و پا اجسام ہیں اور تصویریں نازک اجسام''

...... چنانچہ کتاب کا مطالعہ کرنے یا تصویروں کا البم کھولنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ فراغت اور اطمینان سے انھیں دیکھا جائے۔''

فراغت اور اطمینان کے لمحوں میں ہر چیز کے لیے برداشت اور صبر کا مادہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے''اہل علم لوگ کتاب پڑھتے ہوئے کتاب یا طباعت کی غلطیوں کا برا نہیں مانتے۔ اچھا سیاح بھی پہاڑ پر چڑھتے ہوئے برے راستوں کو برداشت کرتا ہے۔ جو شخص برف کا منظر دیکھنے جا رہا ہو وہ راستے میں کچے اور نازک پلوں خاطر میں نہیں لاتا۔ جو شخص دیہات کی کھلی فضا میں رہنا چاہے وہ جاہل لوگوں کی صحبت سے گھبراتا نہیں اور جو شخص پھولوں کو دیکھتا ہو وہ بری شراب کو بھی برداشت کر لیتا ہے......''

مطالعے سے جو لطف حاصل ہوتا ہے اس کا بہترین اظہار چین کی سب سے بڑی شاعرہ لی چنگ چاؤ نے اپنے سوانح حیات میں کیا ہے۔ اس کے شوہر کو جب شاہی دارالعلوم کے طالب علم کی حیثیت سے ماہانہ وظیفے کی رقم ملتی تو دونوں میاں بی بی کسی ایسے مندر میں چلے جاتے جہاں پرانی کتابیں اور کتبوں کے چربے فروخت ہوتے تھے۔ وہ جو پسند آتا خرید لیتے اور واپسی میں کچھ پھل بھی خریدتے۔ گھر پہنچ کر وہ یہ پھل کھاتے ہوئے کتبوں کے چربوں کا معائنہ کرتے جاتے ہیں یا چائے پیتے اور مختلف کتابوں کے نسخوں کا باہم مقابلہ کرتے...... چنانچہ وہ اپنے بارے میں لکھتی ہے:

''میرا حافظہ بڑا اچھا ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں کمرے میں بیٹھ جاتے اور چائے دم کرنے کے لیے رکھ دیتے۔ پھر الماری میں چنی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کر کے ایک دوسرے سے پوچھتے کہ فلاں عبارت کس کتاب کے کس صفحے کی کونسی سطر سے شروع ہوتی ہے۔ جس کا اندازہ صحیح ہوتا اسے چائے کا پہلا پیالہ پینے کے لیے ملتا تھا اور جب کسی کا اندازہ بالکل ٹھیک ہوتا تو ہم چائے کی پیالی اٹھائے ہمارے کپڑوں ہی پر گر جاتی اور پینے کو نہ بچتی...... ہم دونوں اسی زندگی پر قانع اور خوش تھے اور چاہتے تھے کہ ساری عمر اسی طرح گزر جائے۔ اس لیے ہمارے سر فخر سے بلند رہتے حالانکہ ہماری غریبی اور محتاجی

کی حد نہ تھی...... رفتہ رفتہ ہمارے پاس کتابوں کا ذخیرہ بڑھتا گیا۔فن پاروں کی گنتی بھی بڑھتی گئی اور میزوں، کرسیوں، بستر، ہر جگہ کتابیں اور نوادر ہی نظر آنے لگے۔ہم ان سے اپنی آنکھوں اور اپنے ذہنوں سے لطف اٹھاتے تھے اور ان کے بارے میں بحث مباحثے کرتے تھے۔ ہماری مسرت ان مسرتوں سے کہیں ارفع اور گہری تھی جو امیر لوگوں کو کتے پالنے، گھوڑے رکھنے، رقص وسرور کی محفلیں منعقد کرانے سے حاصل ہوتی ہے......''

شاعرہ لی نے یہ اسکیچ بڑھاپے میں لکھا تھا۔اس کا محبوب مر چکا تھا اور اس کو اِس بے چارگی اور بڑھاپے میں ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھاگنا پڑ رہا تھا کیونکہ ان دنوں شمالی چین پر چن قبیلوں کی یلغاریں جاری تھیں اور کسی کے لیے کہیں کوئی جائے امان نہ تھی۔

4- لکھنے کا فن

انشا پردازی کا فن، فنِ تحریر محض یا انشاء کی تکنیک سے کہیں وسیع تر ہے۔ بلکہ مبتدیوں کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ وہ پہلے تو انشا کی تکنیک کا ہوّا دل سے دور کریں اور ایسے سطحی معاملوں سے درگزر کر کے اپنی روح کی گہرائیوں کو ٹٹولیں تاکہ وہ اپنی سچی ادبی ''شخصیت'' کو پروان چڑھا سکیں اور ادب کی اصلی بنیاد ہے۔ جب یہ بنیاد مناسب طور پر قائم ہو جائے اور سچی ادبی ''شخصیت'' پروان چڑھ جائے تو ''اسلوب تحریر'' خود بخود وجود میں آجاتا ہے اور تکنیک کے چھوٹے موٹے معاملے خود بخود طے ہو جاتے ہیں اگر یہ ادیب فصاحت و بلاغت اور گرامر کے بارے میں کچھ بے پروا، کچھ بے خبر سا معلوم ہوتا تو پروا نہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ واقعی اچھی چیزیں لکھے۔ ہر اچھے ناشر کے پاس ایسے پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں جو عبارت کے اِن معمولی قواعد کا لحاظ رکھتے ہیں اور زیرِ طبع کتابوں کی عبارتوں میں ایسے ہی وقف خاص، وقفِ لازم اور اعراب وغیرہ درست کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص گرامر کا بڑا ماہر ہے اور اسلوب آرائی کا بھی اسے ملکہ حاصل ہے مگر سچی ''ادبی شخصیت'' کی تہذیب و ترقی کے لیے اس نے کوئی کوشش نہیں کی تو وہ کبھی ادیب نہیں بن سکتا۔ بوفون کا مشہور قول ہے ''اسلوب ہی شخصیت ہے'' چنانچہ اسلوب لکھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں۔ اسلوب تحریر کی کسی خاص نہج کا نام نہیں، نہ تحریر کی زیب و زینت کا نام ہے۔ اسلوب وہ مجموعی تاثر ہے جو قاری کو ایک ادیب کے ذہن کے بارے میں حاصل ہوتا ہے۔ اس میں ادیب کی فکری گہرائی یا اس کا اوچھاپن، اس کی بصیرت یا اس کی کورنگاہی،

اس کی باقی خصوصیات مثلاً ظرافتِ طبع، خوش مذاقی، تیز اور تیکھی طنز، اس کی سوجھ بوجھ، نزاکتِ احساس اور نزاکتِ ادراک، شفقت سے بھرپور کلبیت یا کلبیت سے بھرپور شفقت، کوڑمغز بی عملی سمجھ اور شعور اور دنیا کے معاملوں کے متعلق اس کا عام رویہ...... سب کچھ شامل ہیں۔ ظرافت کی تکنیک پیدا کرنے کے لیے کوئی ''ہدایات کی کتاب'' نہیں مل سکتی...... نہ ''عملی سوجھ بوجھ کے پندرہ قاعدوں'' کا کورس بازار میں چھپا چھپایا ملے گا۔ نہ ''نزاکتِ احساس پیدا کرنے کے دس گیارہ قاعدوں'' پر مشتمل کوئی ہدایت نامہ ہی مل سکتا ہے۔ یہ چیزیں سکھانے سے نہیں آتیں، تہذیب نفس سے پیدا ہوتی ہیں۔

فنِ تحریر کے سطحی مسئلوں کو چھوڑ کر گہری نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس فن میں ادب، تفکر، نقطہ نظر، جذبات، مطالعہ اور تحریر، سب کچھ شامل ہے۔ میں نے چین میں ایک ادبی تحریک چلائی تھی جسے میں نے اظہار نفس کے نئے دبستان کا نام دیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ چینی نثر میں زیادہ شگفتہ، زیادہ انفرادی اسلوب کو فروغ دیا جائے۔ اس سلسلے میں مجھے اسلوب اور فن تحریر پر متعدد مضامین لکھنے پڑے...... پھر میں نے سگار کی راکھ کے عام عنوان کے تحت کچھ ''ادبی مقولے'' بھی لکھے۔ جن میں انہی اسلوب و انداز، بیان و اظہار پر اپنے خیالات کو لفظوں میں بیان کیا گیا تھا۔ چند ایک اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ میرے نقطہ نظر کی صحیح ترجمانی انہی سے ہو سکتی ہے:

i- تکنیک اور شخصیت

انشا پردازی سکھانے والے استاد ادب کے بارے میں یوں بات کرتے ہیں جیسے بڑھی آرٹ کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ نقاد لوگ ادبی مضامین کا تجزیہ تحریر کی تکنیک کے راستے سے کرتے ہیں۔ مثال وہی ہے کہ انجینئر قطب نما لے کر تائے شان کی بلندی اور اس کی عمارت کا تخمینہ لگانے بیٹھ جائیں۔

انشا کی تکنیک کوئی چیز نہیں...... میرے نزدیک جو چینی ادبی کسی مقام کے مالک ہیں۔ ان کا قول بھی یہی ہے۔ انھوں نے تکنیک کی کبھی پروا نہیں کی۔

انشا کے لیے تکنیک کا وجود ویسا ہے جیسے تہذیب کے لیے، فقہ کے لیے لمبے چوڑے قوانین۔ یہ مسائل ادنیٰ درجے کے لوگوں سے مخصوص ہیں۔

مبتدیوں پر تکنیک کی بحث کا بڑا رعب پڑتا ہے۔ ناول کی تکنیک، ڈرامے کی تکنیک، موسیقی کے قواعد،

اداکاری کے ضابطے۔ یہ سب مبتدیوں کی آنکھیں چندھیا دیتے ہیں۔ مبتدی بے چارہ نہیں جانتا کہ انشاء کی تکنیک کا کسی ادیب کی پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ اداکاری کے قواعد بھی عظیم اداکار کے وجود میں آنے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ مبتدی بچارے کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ ''شخصیت'' بھی کوئی چیز ہے جو آرٹ اور ادب میں ہر کامرانی، ہر عظمت کی اصل بنیاد ہے۔

ii- ادب کی پرکھ

جب آپ بہت سے ادیبوں کی کتابیں پڑھ چکیں اور یہ پتا چل جائے کہ فلاں ادیب منظر کشی میں ماہر ہے تو دوسرا نزاکت ونفاست سے مالا مال ہے، تیسرا کہنے کی بات نہایت البیلے پن سے کہتا ہے، چوتھا ناقابل بیان دل کشی کا مالک ہے۔ پانچویں کی تحریر عمدہ وہسکی کی طرح سرور انگیز ہے اور چھٹے میں وہ سرخوشی، وہ رسیلا پن ہے جو اعلیٰ شراب میں ہوتا ہے تو پھر آپ کو بلاخوف وخطر یہ کہہ دینا چاہیے کہ مجھے فلاں فلاں ادیبوں کی کتابیں پسند ہیں اور میں انھیں پرکھ بھی سکتا ہوں۔ مطالعے کی اتنی وسعت کی بدولت، قاری میں یہ ملکہ پیدا ہو چکتا ہے کہ وہ تحریر میں اعتدال اور نرمی، رسیلے پن اور زورِ بیان، قوتِ اظہار اور طباعی کا کمال، براقی اور تیزی، نزاکت اور دلکشی میں امتیاز پیدا کر سکے اور ان کی امتیازی خصوصیات کو الگ الگ سمجھ سکے۔ جب وہ ہر انداز، ہر اسلوب کا بھیدی ہو جاتا ہے تو وہ تنقیدی ہدایات کی کوئی کتاب پڑھے بغیر بھی یہ بتا سکتا ہے کہ اچھا ادب کون سا ہے۔

ادب کے مطالعے علم کے لیے سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ مختلف تحریروں کی چاشنی میں امتیاز کرنا سیکھے۔ ادب کی بہترین چاشنی نرم روی اور رسیلا پن ہے لیکن یہ وہ خوبیاں ہیں جو کسی مصنف کے لیے اپنی تحریر میں پیدا کرنی بہت مشکل ہیں کیونکہ نرم روی اور سپاٹ پن میں بڑا لطیف پردہ حائل ہے۔

جس ادیب میں گہرائی اور اپج نہ ہوگی وہ سادہ اور آسان اسلوب میں لکھنے کی لاکھ کوشش کرے اس سے کچھ نہ بنے گا۔ الٹا اس کا انداز پھیکا سیٹھا ہو کر رہ جائے گا۔ قاعدے کی بات ہے کہ تازہ مچھلی ہی کو اس کے اپنے روغن میں پکایا جا سکتا ہے۔ باسی مچھلی کو تو نمک مرچ اور مسالوں سے مزیدار بنایا جاتا ہے، بلکہ جتنا مسالہ ڈالیں، اتنا ہی بہتر ہے۔

اچھا ادیب یانگ کیونی کی اس بہن کی طرح ہے جو اپنی خوبیوں اور فنی کمالات کی بدولت شہنشاہ کے سامنے غازے اور پاؤڈر کی زینت کے بغیر بھی جانے کی جرات رکھتی تھی۔ حالانکہ محل کی باقی تمام حسیناؤں کو

غازے اور آرائش کی سخت محتاج تھی۔اسی لیے دنیا میں بہت ہی کم لکھنے والے ایسے ہیں جو بڑی سادہ زبان میں کچھ لکھنے کی جرات کرتے ہیں اور اس میں کامیاب رہتے ہیں۔

iii- اسلوب اور خیال

تحریر میں اگر دل کشی اور حسن ہے تو تحریر اچھی ہے۔اگر تحریر ان سے عاری ہے تو بری ہے......اس ''دل کشی'' کے لیے کوئی قاعدہ، ضابطہ نہیں۔تحریر کی دلکشی اس طرح تحریر سے پھوٹ نکلتی ہے جس طرح بخوردان سے خوشبو کا دھواں یا جیسے پہاڑ کی چوٹی سے گھٹا امنڈتی ہے جو یہ نہیں جانتی کہ وہ کدھر جائے گی۔گویا بہترین اسلوب ''امنڈتی ہوئی گھٹا اور بہتے ہوئے پانی'' کی طرح ہے۔

اسلوب زبان، خیال اور شخصیت سے مرکب ہے مگر بعض اسالیب ایسے ہیں جن کا سارا مدار زبان کے زور پر ہے۔

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ واضح خیالات غیر واضح زبان کے قالب میں دیکھے جائیں۔زیادہ تر یہی دیکھا گیا ہے کہ بڑی واضح زبان میں بہت ہی مبہم باتیں کہی جاتی ہیں۔

واضح خیالات نہایت غیر واضح زبان میں بیان کرنا ایسے مصنف کا بندھا ٹکا اسلوب ہوتا ہے جو عمر بھر مجرد رہنے کا تہیہ کر چکا ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے اپنی زندگی میں یہ تجربہ ہوا ہی نہیں کہ اپنی بیوی کے سامنے چیزوں اور باتوں کی وضاحت کیونکر کی جاتی ہے۔اس کی مثال مشہور جرمن فلسفی عمانویل کانٹ ہے۔ناولسٹ سموئل بٹلر بھی اسی طرح مبہم باتیں کر جاتا ہے۔

ہر شخص کے اسلوب پر اس کے ''ادبی محبوب'' کا بڑا اثر پڑتا ہے کیونکہ وہ اپنے محبوب مصنف کے اندازِ فکر اور طرزِ بیان کو زیادہ سے زیادہ پسند کرتا رہا ہے۔اصل میں مبتدی کے لیے اسلوب پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے۔زندگی کے پختہ دور میں پہنچ کر آدمی اپنے آپ کو پالیتا ہے اور اس طرح خود بخود اپنے خاص اسلوب کو بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔

کسی مصنف سے نفرت ہو تو اس کی کتاب سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔کاش سکول کے استاد اس کو پیش نظر رکھیں۔

ہر انسان کا کردار کسی حد تک پیدائشی ہوتا ہے۔یہی حال اس کے اسلوب کا ہے۔باقی کا حصہ اس تاثر پر

مبنی ہے جو وہ دوسروں سے لیتا ہے۔

جس شخص کا کوئی محبوب مصنف نہیں وہ راہ گم کردہ ہے۔ اس کے ذہن، اس کی ہستی میں کوئی زرخیزی نہیں۔

دنیا میں ہر شخص کے لیے اس کا محبوب مصنف موجود ہوتا ہے۔ صرف وہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرتا۔

کتاب کو یوں جانیے کہ کسی شہر یا زندگی کی تصویر ہے۔ ایسے بھی قاری ہیں جو نیو یارک اور پیرس کی تصویریں ہی دیکھتے ہیں، خود کبھی نیو یارک اور پیرس نہیں جاتے۔ عقلمند آدمی وہ ہے جو کتابیں بھی پڑھے اور زندگی کا بھی مطالعہ کرے۔ کائنات بہت بڑی کتاب ہے اور زندگی بہت بڑی درسگاہ۔

اچھا قاری، مصنف کے تار پود تک دیکھ لیتا ہے، اس کا سیدھا الٹا چھان مارتا ہے۔

بعض مصنف اپنے قاری کو ہر وقت چھیڑتے یا تحریک دلاتے رہتے ہیں۔ ان کی مثال یہ ہے جیسے لباس میں کوئی پتنگا کبھی یہاں کبھی وہاں گدگدیاں کرتا ہے۔ گدگدی کتنی بڑی بات ہے۔

کسی موضوع کے بارے میں مطالعہ کرنے کا بہترین طریقہ ہے کہ سب سے پہلے وہ کتابیں پڑھی جائیں جو اس موضوع کے بارے میں مخالفانہ رائے رکھتی ہیں۔ اسی صورت میں قاری کا ذہن اس بات کے لیے تیار ہو سکے گا کہ وہ فضول باتیں کسی طور پر قبول نہ کرے۔ جب قاری اس موضوع کے بارے میں مخالفانہ کتابیں پڑھ لے گا۔ تو وہ اس کے حق میں ہر بات کو اچھی طرح سمجھ سکے گا۔ تنقیدی ذہن پیدا کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔

ہر مصنف کو لفظوں میں قدرتی طور پر دلچسپی ہوتی ہے۔ اصل میں ہر لفظ کی اپنی ایک شخصیت اور اپنی ایک شخصیت اور اپنی ایک زندگی ہے۔ عام طور پر لغت کی کتابیں لفظوں کی اس پنہاں شخصیت اور زندگی سے عاری نظر آتی ہیں لیکن پاکٹ آکسفورڈ ڈکشنری یا مختصر آکسفورڈ ڈکشنری جیسی لغت کی عمدہ کتابیں ہیں۔ اس خصوصیت سے مالا مال ہیں اور لغت کی عمدہ کتاب ہر وقت پڑھی جا سکتی ہے جیسے پاکٹ آکسفورڈ ڈکشنری۔

زبان کی کانیں دو ہیں، ایک نئی، ایک پرانی...... پرانی کان کتابوں میں ہے۔ اور زبان کی نئی کان عوام کی زبان ہے۔ دوسرے درجے کے فنکار بار بار پرانی کان کو کھودیں گے مگر اعلیٰ درجے کے فنکار نئی کان سے

بہت کچھ حاصل کر پاتے ہیں۔ پرانی کانوں کی دھات پگھلا کر صاف کرنی پڑتی ہے مگر نئی کان کی دھات کچی اور تازہ ہوتی ہے۔

وانگ چنگ نے (پہلی صدی عیسوی) ''ماہرین'' اور ''فضلا'' میں امتیاز رکھا ہے۔ اسی طرح اس نے ادیبوں اور مفکروں کو بھی علیحدہ علیحدہ شمار کیا ہے۔ مجھ سے پوچھیے تو ''ماہرین'' کا علم جب وسیع تر ہو جائے تو وہ ''فاضلوں'' کی صف میں آجاتے ہیں۔ اور جب کسی ادیب میں تجربے اور فکر کی پختگی آجائے تو وہ مفکر بن جاتا ہے۔

جو لوگ بڑے عالم فاضل بنتے ہیں ان کی تحریر سراسر مانگے تانگے کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ جتنے اساتذہ اور ماہرین کی سند پیش کریں اور ان کے اقوال جتنے زیادہ اپنی تحریر میں شامل کریں اتنے ہی عالم فاضل سمجھے جاتے ہیں مگر ایک مفکر سارے جگ سے بے نیاز ہو کر اپنے ہی ذہن کی گہرائیوں سے فکر کے موتی نکالتا ہے۔

کتابی عالموں کی مثال اس کوے کی ہے کہ جو، کچھ کھاتا ہے اسے چبا کر اگلتا ہے اور اپنے بچوں کی چونچ میں چونچ ڈال کر یہی اُگلا نوالا انہیں کھلاتا ہے۔ مگر مفکر تو پیلۂ ریشم کی مثال ہے جو شہتوت کے پتے کھاتا ہے مگر ریشم اگلتا ہے۔

تحریر میں آنے سے بیشتر خیالات کا بھی ایک ''زمانہ حمل'' ہوتا ہے۔ ویسے ہی جیسے ماں کے رحم میں بچہ پیدا ہونے سے پہلے، جنین کی صورت میں قرار پاتا ہے جب آپ کے محبوب مصنف نے آپ کے دل میں خیالوں کا شعلہ روشن کر دیا اور آپ کے رگ و پے میں ان خیالوں کی بجلی سی دوڑنے لگی تو اس وقت کو ''زمانہ حمل'' کا مترادف سمجھے لیکن اس مدت میں اگر کمی واقع کر دی جائے اور کوئی شخص مناسب وقفے کے گزرنے کا انتظار کیے بغیر ہی چھپنا شروع ہو جائے تو اسے ''اسہال'' کی شکایت سمجھیے۔ اب یہ نہ ہوگا کہ درد اٹھے اور خیالات ایک نوزائیدہ جیتے جاگتے ''بچے'' کو جنم دیں...... پھر جب کوئی ادیب اپنا ضمیر بیچ دے اور اپنے معتقدات کے خلاف چیزیں لکھنی شروع کر دے تو اس کی مثال مصنوعی اسقاط سے دی جاتی ہے کہ جنین ہمیشہ مردہ ہی پیدا ہوگا مگر جب کوئی ادیب اپنے ذہن میں سخت بے چینی اور برقی اضطراب کی شدید کروٹیں محسوس کرے اور جب تک وہ اپنے خیالات کو کاغذ پر منتقل نہ کر لے اسے چین نہ آئے اور کاغذ پر ان خیالات کے منتقل ہونے پر اسے بے پایاں سکون محسوس ہو تو سمجھ لیجیے کہ اس نے کوئی ادبی شہ پارہ پیدا کیا ہے۔ اسی لیے سچے

تہذیب و اخلاق، سمجھ بوجھ، تجربہ اور تعصبات کے ایک مجموعے کا نام ہے۔ یہ مجموعہ کچھ تو فطری دویعت ہے، کچھ تمدن کا پیدا کردہ ہے۔ یعنی اس کا کچھ حصہ قدرت کی گود سے لے کر ہم پیدا ہوئے تھے اور باقی حصہ تہذیب نے ہم میں پیدا کیا ہے...... کسی شخص کی فطرت اس کی پیدائش بلکہ پیدائش کے پہلے سے متعین ہوتی ہے۔ بعض لوگ فطری طور پر سنگدل اور کمینے ہوتے ہیں اور بعض فطری طور پر صاف گو، کھلے دل والے، جرات منداور عالی ظرف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو فطری طور پر نرم دل اور کمزور کردار کے ہوتے ہیں یا ایسے لوگ کہ فضول، بات بے بات پریشان ہوتے ہیں۔ یہ کرداری خصوصیات اصل میں ہماری ''ہڈیوں کا مغز'' ہیں۔ اچھے سے اچھے والدین اور عمدہ سے عمدہ استاد کسی کی شخصیت کی نوع بدل نہیں سکتا۔ یہ تو فطری باتیں ہیں مگر ان سے الگ وہ خصوصیات بھی ہیں جو ہم میں پیدائش کے بعد پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا منبع تعلیم اور زندگی کے تجربات ہیں...... یہ یاد رہے کہ فرد اپنے خیالات اور نظریات اور تاثرات بہت ہی مختلف ذریعوں سے حاصل کرتا ہے۔ اس کی زندگی کے مختلف حصوں میں اس پر مختلف اثرات ہوتے ہیں۔ وہ مختلف جگہوں سے اپنے خیالات، اپنے نظریات، اپنے تعصبات اکٹھے کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس کے نظریات، اس کے خیالات اور اس کے نقطہ نظر میں اتنی عدم مطابقت، اتنا تضاد، اتنا پھیر ہوتا ہے کہ دیکھنے والا پریشان ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایسے شخص ملتے ہیں کہ کتوں کو بہت چاہتے ہیں مگر بلیوں سے ڈرتے ہیں اور انہیں کے بھائی بند بلیوں کو چاہتے ہیں مگر کتوں سے ان کی جان جاتی ہے۔ اسی لیے انسانی شخصیت کی جتنی قسمیں پائی جاتی ہیں ان کا مطالعہ سب سے پیچیدہ علم ہے۔

''اظہار ذات'' کے دبستان کا یہ بنیادی تقاضا ہے کہ تحریر میں صرف اپنے خیالات اور اپنے محسوسات، اپنی سچی چاہتیں اور سچی نفرتیں، ڈر اور مشغلے پوری ایمانداری سے آئیں۔ پھر یہ کہ ان کے اظہار میں برے کو اچھے سے چھپانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اظہار کے خلوص کے سامنے یہ خدشہ نہ ہو کہ دنیا میرا مذاق اڑائے گی۔ یہ بھی ڈر نہ ہو کہیں میں پرانے داناؤں یا ہم عصر استادوں کی رائے کو جھٹلا نہ بیٹھوں۔

اس دبستان کے ادیب کسی مضمون میں سب سے اچھا حصہ وہ سمجھتے ہیں جو لکھنے والے کا نمائندہ ہو، اس حصے میں سب سے پسندیدہ فقرہ وہ سمجھیں گے جو لکھنے والے کی خصوصیات کا آئینہ دار ہو اور اس جملے میں اچھی ترکیب وہ سمجھیں گے جو لکھنے والے کی شخصیت کی مخصوص طور پر عکاس ہو۔

ادیب کو اپنی ادبی اولاد سے ماں کی سی محبت ہوتی ہے...... یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ تحریر یا ادبی تخلیق وہی اچھی معلوم ہوتی ہے جو اپنی ہو اور عورت وہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے جو دوسرے کی ہو۔

ادیب کا قلم موچی کی سوئی کی طرح مشق سے تیز ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ کشیدہ کاری کی عمدہ سوئی کی طرح تیز ہو جاتا ہے لیکن خیالات مشق سے ملائم ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی کیفیت کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ اگر نیچی چوٹی سے بلند چوٹیوں پر چڑھتے جائیں اور بلندی پر منظر گولائی میں نظر آئے۔

کسی ادیب کو کسی شخص سے سخت نفرت ہو اور وہ اس کے خلاف نہایت زہر آلود ہجو لکھنے کے لیے قلم اٹھانے کی سوچ رہا ہو مگر ابھی تک وہ اس شخص کی خوبیوں سے واقف نہ ہو تو ادیب کو چاہیے کہ قلم ہاتھ سے رکھ دے کیونکہ ابھی وہ اس شخص کے خلاف زہر آلود ہجو لکھنے کے قابل نہیں۔

iv- اظہارِ نفس کا دبستان

لکھنا اپنی فطرت یا اپنے کردار کے اظہار کا نام ہے، اپنی روح کا ایک مظہر ہے۔ وہ چیز جسے ''آسمانی الہام'' کہا جاتا ہے وہ اپنی ہی روح، اپنی ہی خودی کا ایک پرتو ہے اور اس کی وجہ جسمانی طور پر یہ ہوتی ہے کہ ''صاحب الہام'' کے خون میں سرخ ذرات ضرورت سے زیادہ موجود ہوتے ہیں اور یہ زائد ''قوت'' لفظوں میں ڈھل کر ادبی الہام ہو جاتی ہے۔

کسی پرانے استاد کی بنائی ہوئی تصویر دیکھیے یا کسی قدیم مصنف کی کتاب پڑھیے۔ دونوں ان استادوں کی روحوں کے جواہر اصلی کی مظہر ہیں۔ جب روح کی یہ قوت، یہ جوہر کم ہو جائے یا اس کا سوتا خشک ہو جائے تو بہترین خطاط، مصور یا ادیب کے فن پارے بھی بے جان ہو جاتے ہیں۔

ادب میں ''آسمانی الہام'' کا ہنگام وہ ہے کہ صبح کے وقت آپ میٹھے سپنوں کی نیند سے تازہ دم خود بخود بیدار ہوں۔ پھر چائے کا ایک پیالہ پی لیں اور اخبار دیکھیں جس میں کسی خبر سے آپ کو پریشانی نہ ہو پھر آپ آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں آجائیں اور ایک روشن دریچے کے سامنے صاف ستھری میز پر بیٹھ جائیں۔ باہر سورج کی سہانی دھوپ ہو اور ہلکی ہوا چل رہی ہو۔ یہی وقت ہے کہ ادیب اچھے مضامین، عمدہ نظمیں، اچھے خطوط لکھ سکتا ہے، فن کار اچھی تصویریں بنا سکتا ہے اور ان کے عمدہ عنوانات قائم کر سکتا ہے۔

جس چیز کو ''ذات''، ''نفس'' یا ''شخصیت'' کہا جاتا ہے وہ اعضا، پٹھوں اعصاب، معقولیت، جذبات،

اِس دبستان کا ادیب کوئی منظر، کوئی احساس، کوئی واقعہ بیان کرے گا تو وہ اس منظر اسی طرح بیان کرے گا جس طرح خود اس نے دیکھا۔ احساس کا اظہار وہ اسی طرح کرے گا جس طرح اس نے محسوس کیا۔ واقعے کا بیان وہ اسی طرح کرے گا جس طرح اس نے سمجھا...... جو تحریر اس کسوٹی پر پوری اترے وہی ادب ہے اور جو اس پر پوری نہ اترے وہ ادب نہیں۔

''سرخ شبستان کے سپنے'' میں جولڑکی کی لین تائے یو ہے وہ بھی ہمارے اسی دبستان کی ایک فرد ہے کیونکہ وہ کہتی ہے ''اگر کسی شاعر نے کوئی اچھا مصرعہ کہا ہو تو اس کی فکر نہیں کہ اس کے الفاظ کا آہنگ کتابی قوانین کے مطابق ہے یا نہیں۔

یہ دبستان سچے جذبات کا بڑا قائل ہے۔ چنانچہ پرتکلف اسلوب کو شدید بدمذاقی سمجھتا ہے۔ اسی لیے یہ دبستان ایسے اسلوب کا حامی ہے جو سادگی اور پرکاری میں اپنی مثال آپ ہو۔ یہ دبستان فلسفی مین سی آس کے اس مقولے کے حکم گردانتا ہے، ''تحریر کا واحد مقصد یہ ہے کہ تحریر پر معنی ہو اور بس''......

ادبی حسن محض معنی خیزی کا نام ہے۔

اِس دبستان کے اصولوں پر چلنے میں ایک خطرہ یہ ہے کہ کہیں لکھنے والے کا اسلوب بالکل سپاٹ نہ ہو جائے (مثال: یوآن چنگ لانگ کی تحریریں) یا ادیب کہیں الٹے سیدھے خیالات کے بھنور میں نہ پھنس جائے (مثال: چن شنگ تان) یا لکھنے والے کے نظریات، مسلّہ اصولوں کے بہت ہی مخالف نہ ہو جائیں (مثال لی چاؤ) اسی لیے اس دبستان سے کنفیوشسی خیال کے نقادوں کو بڑی نفرت تھی مگر سچ یہ ہے کہ انہیں جدت نگار ادیبوں نے چینی ادب کو موت جیسی یکسانیت اور مردنی سے بچالیا۔ آئندہ زمانہ بھی انھیں کا ہے۔

سچا ادب کائنات اور انسانی زندگی کے بارے میں سراسر حیرت کا ایک احساس ہے اور بس۔

جو شخص اپنی نگاہ کو آلودہ نہیں ہونے دیتا اس میں حیرت کا یہ احساس زندہ رہتا ہے پھر اسے یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ حقیقت کو مسخ کر کے پیش کرے تاکہ وہ تعجب انگیز چیز نظر آئے۔ اظہارِ نفس کے اس دبستان کے خیالات اور ان کا نقطہ نظر اسی لیے اتنا نیا اور عجیب نظر آتا ہے کیونکہ قاری مسخ شدہ مناظر کے عادی ہو چکے ہیں۔

اِس دبستان کے نقادوں کو ادیبوں کی کمزوریاں اچھی لگتی ہیں۔ اس دبستان کے تمام ادیب قدما کی نقالی یا معاصرین کی نقالی اور ادبی قاعدوں، ضابطوں کے سخت مخالف ہیں۔ اِس دبستان کی بنیاد رکھنے والے یوآن

بھائیوں کا خیال تھا کہ ''ادب میں سب سے اہم چیز سچائی ہے''...... لی لی ونگ نے یہ بھی کہا ہے کہ ''ادب میں اہم چیز دلکشی اور دلچسپی ہے''۔ یوآن ست سائی کا کہنا ہے'' لکھنے میں تکنیک کا کیا کام!'' اور سونگ عہد کے ایک ابتدائی مصنف کا خیال تھا کہ ''تحریر میں ہیئت تو اتفاقاً در آتی ہے جیسے لکڑی میں کیڑوں کے کھانے سے چھید پڑ جاتے ہیں......''

v- بے تکلف اسلوب

بے تکلف اسلوب کا مالک ادیب لگی لپٹی نہیں رکھتا۔ وہ کھری بات کہتا ہے۔ وہ صاف صاف اپنی کمزوریاں آپ پر واضح کر دیتا ہے۔ اور اس لیے آپ کا تکلف بھی قائم نہیں رہنے دیتا۔

قاری اور مصنف کا باہمی تعلق یہ نہ ہونا چاہیے جو کسی خشک استاد اور اس کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔ دونوں کا باہمی ربط بے تکلف دوستوں کا سا ہونا چاہیے۔ صرف اسی صورت میں قاری اور مصنف کے درمیان گرم جوشی پیدا ہو سکتی ہے۔

جو شخص اپنی تحریر میں ''میں'' کا لفظ استعمال کرنے سے ڈرتا ہے وہ کبھی اچھا ادیب نہیں بن سکتا۔

میں ایک چھوٹے ادیب کو سچی بات کہنے والے سے زیادہ پسند کرتا ہوں اور جو ادیب جھوٹا بھی ہو اور عاقبت نا اندیش بھی وہ عاقبت اندیش اور مصلحت بین جھوٹے سے کہیں بہتر ہے کیونکہ یہ عاقبت نا اندیشی اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے قاری سے بہت زیادہ محبت رکھتا ہے۔

میں ایک عاقبت نا اندیش احمق شخص پر اعتبار کرتا ہوں لیکن ہر وکیل کو شبہے کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

یہی عاقبت نا اندیش احمق اپنی قوم کا بہترین سفارتی نمائندہ اور مدبر ہے کیونکہ وہ لوگوں کے دل موہ لیتا ہے۔

میرے خیال میں اچھا رسالہ وہ ہے جو پانزدہ (۱۵) روزہ ہو اور کیا یہ جائے کہ نہایت عمدہ باتیں کرنے والے چند لوگ ایک کمرے میں جمع کر دیے جائیں اور انہیں باتیں کرنے دیا جائے۔ قاری یہ باتیں سنتا رہے۔ یہ کوئی دو گھنٹے کی صحبت ہو۔ قاری یہ باتیں سننے کے بعد آرام سے بستر پر دراز ہو کر سو جائے اور اگلی صبح کو جب وہ بیدار ہو اور اپنے معمول کے کام کاج کے لیے کسی بینک میں یا کسی سکول میں جائے تو گزشتہ شب کی باتوں کی خوشبو اس کے گالوں پر موجود ہو۔

ایسے ریستوران بھی ہوتے ہیں جن کے طلائی فریموں کے آئینوں سے سجے ہوئے دعوت کے کمروں میں بڑی شاندار اور پر تکلف دعوتیں دی جاتی ہیں اور پھر ایسے ریستوران بھی اکثر ملتے ہیں جہاں بیٹھ کر تھوڑی بہت پی جاسکتی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ دو تین دوستوں کے ساتھ ایسے ہی کسی چھوٹے سے ریستوران میں جا بیٹھوں اور بڑے اور امیر لوگوں کی پر تکلف دعوتوں میں شریک نہ ہوں۔ ایک معمولی سے ریستوران میں بیٹھ کر کھانے پینے کا جو لطف آتا ہے، ایک دوسرے کو چھیڑنے اور ستانے، پیالے اور پلیٹیں اوندھانے اور کپڑے پر مشروب گرانے سے جو مزہ آتا ہے وہ اعلیٰ پائے کی دعوتوں میں شریک ہونے والے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ وہ ان مزوں کو جانتے ہی نہیں۔

امیر لوگوں کے پاس باغات اور ایوان ہیں مگر پہاڑوں کی گودی میں چھپی ہوئی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ان پہاڑی مکانوں کو بھی سجانے والے بڑے ذوق اور بڑی نفاست سے سجاتے ہیں۔ ان کا ماحول امرا کے ان ایوانوں سے بہت مختلف ہوتا ہے جن میں قرمزی دروازے اور سبز کھڑکیاں ہوتی ہیں، نوکروں اور باندیوں کی ایک فوج خدمت کو متعین ہوتی ہے مگر ان بظاہر معمولی پہاڑی مکانوں میں داخل ہو جایئے تو کوئی بھونکتا ہوا کتا آپ کا استقبال نہیں کرتا، اندر آنے پر نک چڑھے بیروں اور دربانوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور جب اِن کے مکینوں سے مل کر رخصت ہوں تو پھاٹک پر پتھر کے دو واہیات شیر اپنی بے نور آنکھوں سے آپ کو نہیں گھورتے۔ سترھویں صدی کے ایک ادیب نے اس صورت حال کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتا ہے "اگر ایسے بے تکلف مکانوں میں تین عالم آپس میں بیٹھے بڑے تہذیب و تکلف سے عالمانہ بحث کر رہے ہوں اور کوئی صاحب ذوق اس کمرے میں نیم برہنہ آ جائے یا ننگے پاؤں درانہ گھس آئے تو یہ لوگ ناک بھوں نہیں چڑھاتے، وہ تو خوشی کے مارے تالیاں بجائیں گے اور ایک دوسرے سے جی کھول کر مذاق کریں گے۔ دیکھنے والوں کو شاید حیرت ہو لیکن یہ حضرات ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں اور اسی لیے ان کی خاموش نظریں، معنی خیز ہوتی ہیں۔"

vi- حُسن کیا ہے؟......

وہ چیز جسے ادب میں حسن کہا جاتا ہے اور جسے عالم اشیا میں حسن قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا مدار بڑی حد تک تبدیلی اور حرکت پر ہے اور اس کی بنیاد زندگی ہے...... جو چیز زندہ ہے اس میں تغیر اور حرکت دونوں ہوں گی

اور جس چیز میں تغیر اور حرکت ہو گی اس میں قدرتی طور پر حسن بھی ہوگا۔ اب بتایئے کہ لکھنے یا ادب کے لیے بندھے ٹکے قواعد کس طرح ہو سکتے ہیں؟ کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور گھاٹیوں، چشموں اور دریاؤں میں بے راہ روی، آزادگی، اور سنگینی کا حسن موجود ہوتا ہے...... وہ حسن جو انسان کی بنائی ہوئی نہروں میں نظر نہیں آتا حالانکہ ان نہروں کو انجینئروں کی مہارت اور ان کے حساب نے جنم دیا ہے۔ تاروں کی سبھا آسمان کا ادب ہے۔ اونچے پہاڑ اور بڑے بڑے دریا زمین کا ادب ہیں۔ ہوائیں چلتی ہیں اور بدلیاں رنگ بدلتی رہتی ہیں اور ان کی بدولت ہمیں اطلس کی سی رعنائیاں ملتی ہیں۔ پھر کہرا آتا ہے اور درختوں کے پتے گرنے لگتے ہیں اور ہمیں اس تبدیلی کی بدولت خزاں کے رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اب ذرا یہ غور کیجیے کہ ستارے اور سیارے اپنے اپنے محور کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ کیا وہ کبھی سوچتے ہیں کہ انہیں دیکھنے والے ہم زمینی اِنسان کتنا حسین سمجھتے ہیں؟ پھر بھی ستاروں کے مختلف جھمکے جو ہم نے دریافت کر لیے تو یہ محض اتفاق امر تھا۔ اب زمین کو لیجیے زمین کی سطح کبھی سکڑتی ہے کبھی پھیلتی ہے، اور اس طرح کبھی اونچے پہاڑ بن جاتے ہیں، کبھی گہرے سمندر...... کیا ہماری دھرتی نے جان بوجھ کر پانچ مقدس پہاڑ تخلیق کیے تھے کہ ہم ان کی پوجا کیا کریں؟؟ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ تائی ہوا اور کیون لون کے پہاڑ اپنے عظیم الشان سلسلوں کا آہنگ لیے ہمارے سامنے سر بلند ہیں اور سیپ کی دوشیزہ اور غِلمان دونوں ہیبت دلانے والی برفانی چوٹیوں کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں کہ ہم دیکھیں اور دیکھ کر لطف اٹھائیں۔ یہ خالقِ اکبر، کائنات کے سب سے بڑے استادِ فن کے موقلم کی بے پروا جنبشیں ہیں اور بس۔ جو بانکی بدلیاں پہاڑی چوٹیوں سے اٹھاتی ہوئی نکلتی ہیں اور آگے بڑھ کر طوفانی پہاڑی ہواؤں کے بے رحم طمانچے کھاتی ہیں ان کے پاس کیا اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ ہم دیکھنے والوں کے لیے اپنا ملبوس اپنا آنچل درست کیا کریں؟...... مگر یہی بدلیاں سجتی سنورتی بھی ہیں، کبھی مچھلیوں کے فلس کا روپ دکھاتی ہیں، کبھی اطلس بن جاتی ہیں، کبھی بگٹٹ دوڑتے ہوئے تازی کتوں کی شکل بناتی ہیں، کبھی دہاڑتے شیروں، ناچتے ققنس، اینڈتے اڑتے گھوڑوں کے قالب بدلتی ہیں اور کبھی حسن وخوبی میں ایک ادبی شاہکار نظر آتی ہیں۔ ذرا خزاں زدہ درختوں کو دیکھیے، انہیں گرما کے تھپیڑوں نے مارا اب سردی اور پالا مار رہا ہے اور یہ پیڑ اب آہستگی سے سانس لے رہے ہیں تاکہ سرما کے لیے اپنی قوت محفوظ کر سکیں کیا انہیں اتنی فرصت ہے کہ پرانی شاہراہ پر چلنے والے راہی کی نظروں کے لیے بن سنور سکیں؟ مگر یہی پیڑ ہمیں کتنے مطمئن اور پاکیزہ اور ملول اور تنہا نظر آتے ہیں اور یہی پیڑ وانگ وئی اور می نی کی تصویروں سے کس قدر

ارفع اور اعلیٰ معلوم ہوتے ہیں!

یعنی اس کائنات کی ہر زندہ چیز میں اس کا ادبی حسن پنہاں ہے۔ تاک کی سوکھی ہوئی بیل کا حسن وانگ سی چی کی خطاطی سے کہیں اعلیٰ ہے۔ سر بلند چٹان کی سنگینی اُن کتبوں سے کہیں زیادہ شاندار ہے جو کسی شہنشاہ کے مقبرے پر ایستادہ ہوں۔ اشیا کا ادبی حسن تو ان کی فطرت سے پیدا ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اپنی فطرت کے تقاضوں کی نگہبانی کریں، انہیں پروان چڑھائیں وہ اپنے وجود کو حسین ترین خطوط کی نرالی کائنات میں سمو لیتے ہیں۔ گویا خطوط اور ہیئت کا حسن ایک داخلی چیز ہے، خارجی لازمہ نہیں...... گھوڑے کے سم دیکھیے، انھیں تیز گامی کے لیے بنایا گیا ہے۔ شیر کے پنجوں کو اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے یہ شکل دی گئی ہے۔ بگلوں کی لمبی ٹانگیں دلدلوں میں پھرنے کے لیے خاص طور پر بنائی گئیں۔ ریچھ کے پنجے برف پر دھپ دھپ چلنے کے لیے ہیں...... کیا گھوڑا یا شیر، بگلا یا ریچھ کبھی اپنی بناوٹ کے حسن اور تناسب پر غور کرتے ہیں؟...... ان میں سے ہر جانور زندگی میں اپنا کام یا فطری تقاضا پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے مطابق حرکت کا ایک مناسب طریقہ اختیار کر لیتا ہے لیکن اگر ہم اپنے نقطہ نظر سے دیکھیں تو گھوڑے کے سم، شیر کے پنجے، بگلے کی ٹانگوں اور ریچھ کے پنجے میں کتنی موہنی ہے۔ کوئی اپنے خطوط کے بھرے پن کی وجہ سے اچھا لگتا ہے، کوئی ایسا ہے کہ دیکھتے ہی اس کی مستور قوت کا احساس ہو جائے، کوئی اپنے خطوط کی نفاست مگر استقلال کے لیے نمایاں ہے، کوئی ایسا ہے کہ جوڑوں کی سنگینی کی وجہ سے ممتاز ہے۔ ان کے علاوہ ہاتھی کے پاؤں، شیر کی ایال، گائے کی ٹانگیں وغیرہ خطاطی کے مختلف اسالیب کی علامتیں اور مظاہر کی بنیاد ہیں۔ ان کا حسن، ان کی نشستِ ترکیب اور حرکت میں ہیں۔ ان کی مخصوص جسمانی ساخت ان کے جسم کے انفعال کا نتیجہ ہے اور لکھنے کے حسن کا راز بھی یہی ہے کہ جب حرکت کا ایک خاص انداز لکھنے پر مجبور کرے تو لکھنے کی اس خواہش کو دبانا نہ چاہیے اور جب حرکت کا اندازہ لکھنے کا محرک نہ ہو تو لکھنا بند کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ ادبی شاہکار فطرت کے کسی مظہر کی طرح ہے کہ اپنی بے ہیئتی میں ہیئت، بے ترتیبی میں ترتیب رکھتا ہے۔ اس کی دل کشی، اس کا حسن شعوری نہیں بے اختیار ہوتا ہے۔ کیونکہ حسن تو حسن حرکت کا نام ہے، جامد تناسب کا نام حسن نہیں۔ ہر وہ چیز جو زندہ ہے اور جو حرکت کرتی ہے اس میں اس کا اپنا حسن، اپنی قوت، ہیئت اور خط کا اپنا جمال موجود ہوتا ہے۔



تیرھواں باب

خدا سے ناتا

1- مذہب کا احیا

اس دنیا میں بے شمار لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ خدا اور خدا کی رضا اور خدا کی ناراضگی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ میں جو کچھ عرض کروں گا اسے کچھ لوگ کفر قرار دیں گے اور بعض اسے ''پیغمبرانہ باتوں'' سے تعبیر کریں گے۔ مطلب کی بات دونوں صورتوں میں ضبط ہو جائے گی مگر اندازہ کیجیے کہ ہم انسان جو اس زمین کے موجودات کا کروڑواں حصہ بھی نہیں اور ہماری زمین جو کل کائنات کے کروڑویں حصے سے بھی کہیں فرومایہ ہے، ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا کو جانتے ہیں؟

یہ یاد رہے کہ جب تک ہم اپنے گرد و پیش کی کائنات میں پھیلی ہوئی روح حیات سے اپنے آپ کو پوری طرح اور تسلی بخش طریقے پر ہم آہنگ نہ کر لیں اس وقت تک زندگی کا کوئی فلسفہ مکمل نہیں کہلا سکتا، نہ انسان کی روحانی زندگی کا کوئی تصور ہی بھرپور قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ مانا کہ انسان بہت اہم مخلوق ہے، اتنی اہم کہ وہی ہمارے مطالعے کا اہم ترین موضوع ہے اور انسان پرستی کا تقاضا بھی یہی ہے مگر یہ نہ بھولیے کہ انسان ایک بہت ہی شاندار کائنات میں رہتا ہے۔ یہ کائنات اتنی ہی شاندار ہے جتنا خود انسان ہے۔ اس لیے انسان کے گرد پھیلی ہوئی ایک عظیم کائنات میں رہتا ہے۔ یہ کائنات اتنی ہی شاندار ہے جتنا خود انسان ہے۔ اس لیے انسان کے گرد پھیلی ہوئی ایک عظیم کائنات کو جو شخص قابل اعتنا نہیں سمجھتا، اس کائنات کے مبدا، اس کی منزل پر غور نہیں کرتا اس کی زندگی صحیح معنی میں زندگی نہیں۔

مذہب جس صورت میں ہم تک پہنچا ہے اس میں تاریخی ارتقا کے ساتھ ساتھ ایسی بہت سی چیزیں شامل ہوتی گئی ہیں جو مذہب کی اخلاقی حدوں سے صحیح معنوں میں باہر ہیں۔ ان میں طبیعات بھی ہے اور طبقات الارض کا علم بھی تصورات بھی ہیں اگر مذہب اخلاقی حدود تک رہتا تو مذہب کے احیا کا کام اتنا زبردست اور

کٹھن نہ ہوتا جتنا ہو چکا ہے۔

عین دوسری جانب سائنس ہے جو آج کل کے انسان کے سامنے کائنات کے اسرار کا ایک نیا اور زیادہ گہرا احساس پیدا کر رہی ہے اور مادے کو ایک ایسی چیز قرار دے رہی ہے۔ جسے قوت کا مترادف کہا جا سکتا ہے پھر جہاں تک خدا کے وجود کا تعلق ہے۔ سائنس دان سر جیمز جین کے الفاظ مذہبی تصورات کو نئے معنی پہنا رہے ہیں کہ ''کائنات ایک بہت بڑی مشین کے وجود کے بجائے ایک بہت بڑے تصور کے قریب تر آ رہی ہے!'' ......اعلیٰ ریاضی کی رو سے بھی اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کائنات میں اس سے ارفع ایک ایسی ہستی بھی ہے جس کا اندازہ ریاضی کی رو سے ناممکن ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مذہب بہت سے حیاتی میدانوں سے ہٹ جائے۔ قدرتی سائنسوں کے بارے میں مذہب جو کچھ کہتا رہا ہے اس کے بارے میں بھی یہ ماننا ہوگا کہ یہ باتیں مذہب کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔ روحانی مشاہدات کا جواز ان باتوں میں نہ ڈھونڈا جائے جن کا مذہب سے کوئی واسطہ نہیں، مثلاً یہ بات کس طرح مذہب کے روحانی تصرف سے متعلق ہے کہ انسانیت کی عمر چار ہزار سال ہے یا دس لاکھ سال ہے یا یہ کہ زمین کی شکل چپٹی ہے یا گول ہے، یا زمین ایک چائے کی میز کی طرح کھولی، بند کی جا سکتی ہے یا یہ کہ ہندو مت کی رو سے زمین ہاتھی یا گائے کی پشت پر دھری ہے یا چینی کچھوؤں کی پیٹھ پر کھڑی ہے۔

مذہب کو صرف اخلاقیات سے واسطہ رکھنا چاہیے اور یہی اسے کرنا بھی ہوگا۔ اخلاقیات بھی اتنی ہی باوقار چیز ہے جتنی پھولوں کی نشو ونما یا مچھلیوں کی پرداخت کے سائنسی علوم ہیں یا فلکیات کی تحقیق ہے۔ اسی طرح اگر مذہب کو طب اور علم الاجسام سے الگ کر دیا جائے تو اس میں سراسر مذہب کا فائدہ ہے۔ اسی طرح اگر مذہب کو فلکیات، حیاتیات اور طبقات الارض کے علوم میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے اور لوگوں کے قدیم رسم ورواج کے تحفظ کی کیا پڑی ہے اگر مذہب جدید علوم کے بارے میں خاموش رہے تو اس کے احترام اور اس کے وقار میں بے حد اضافہ ہو سکتا ہے۔

گویا جدید زمانے کی زندگی کے تقاضوں کے مطابق ہر فرد کو مذہب کے رسمی تصورات سے اپنے لیے خود مذہب اخذ کرنا پڑے گا کیونکہ آج کل مذہبی کلیسا اور عقیدے جس طور پر رائج ہیں ان کے لیے تو دل میں حقارت ہی پیدا ہوتی ہے۔ سائنسی زمانے کا فرد جب اپنے لیے ایک سیدھا سادہ مذہب ڈھونڈنے پر قادر ہو جائے گا تو

جس خدا کی وہ پرستش کرے گا وہ ایسا خدا نہ ہوگا جسے روز کے چھوٹے موٹے تحفوں سے خوش کیا جا سکتا ہو۔ وہ اس اپنے بندے کی خواہش پر ہوا کو شمال کے رخ چلنے کا محض اس لیے حکم نہ دے گا کہ اس کا بندہ شمال کے رخ جہاز میں جا رہا ہے۔ ہوا کی سازگاری کے لیے خدا کا شکر بجالانا بڑی گستاخی اور سخت بدتمیزی اور خودغرضی ہے۔ اس شکرانے کا مطلب یہ ہے کہ خدا ان بندوں سے بالکل محبت نہیں کرتا جو جنوب کے رخ جہازوں میں روانہ ہوئے تھے۔ چونکہ اس کا یہ خاص الخاص اہم بندہ شمال کی طرف جا رہا تھا محض اس لیے اس نے صرف شمال کی طرف ہوا کو چلنے کا حکم دے دیا۔ حالانکہ خدا اور بندے کے ناتے کی شرط یہ ہے کہ دونوں کے درمیان روحانی یگانگی ہو اور ایک فریق دوسرے سے بھیک ہی مانگتا نہ رہے۔ موجودہ صورت میں عالی خیال انسان آج کے مروجہ مذہب کو سمجھنے سے عاجز ہے۔ وہ نہیں جان سکتا کہ مذہب کے روحانی رشتوں کی یہ کایا پلٹ کیونکر ہوگی۔ وہ مذہبوں کی موجودہ صورتوں کی کوئی جامع تعریف پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ مذہب، انسان اور خدا کے ازلی ابدی ناتے کا اعلیٰ مظہر ہے جس میں روحانی وجدان بھی شامل ہے؟ یا مذہب چند اخلاقی سچائیوں کا نام ہے جن پر مذہبی رہنماؤں نے اسرار کا ایسا پردہ ڈالا ہے، ان میں ایسی ایسی اختراعات کر رکھی ہیں اور انھیں اس طرح دوسری سے بے کار باتوں میں چھپا دیا ہے کہ یہ مذہبی رہنما اس سے روٹی کما سکیں یا مذہب ایک نادیدہ اور انسانی علم سے بالاتر ہستی کے سلسلے میں محض ہمارے ذہنی کرتبوں کا نام ہے؟ کیونکہ جو چیزیں دیکھی نہ جا سکیں، جنھیں سمجھنا انسانی عقل سے باہر ہو ان کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائی آسان ہوا کرتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اعتقاد کی بنیاد علم پر رکھنی چاہیے یا جہاں علم کی سرحد ختم ہوتی ہے عقیدہ وہیں سے شروع ہوتا ہے؟ اور کیا مذہب ایسی چیز ہے کہ ہر شخص اسے ہر ایرے غیرے کے سامنے پیش کر سکتا ہے؟ یا کیا مذہب، آرائی، یا نوردی، خون کی بقا کا حیلہ ہے؟ یا محض طلاق اور ضبط تولید کی مخالفت کا نام ہے اور اس کی رو سے ہر معاشرتی مصلح کو 'اشتراکی' اور 'سرخا' کہہ کر ذلیل کیا جا سکتا ہے؟ کیا یسوع نے روسی ادب کونٹ ٹالسٹائی کو واقعی ایک شدید برفباری کے بعد اپنے آغوش میں لے لیا تھا جب کلیسائے یونان اسے مرتد قرار دے چکا تھا؟

ان تمام سوالات کے بعد ایک احساس باقی رہ جاتا ہے۔ یہ احساس شاید دوسروں کے لیے کچھ بے چینی کا موجب ہو مگر میرے نزدیک بے حد اطمینان بخش ہے۔ یہ احساس یہ ہے کہ مذہب کا جتنا اور جو کچھ عنصر

ہماری زندگی میں باقی ہے وہ زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کے حسن اور اس کے مہتم بالشان اسرار کے لیے احترام کا ایک نہایت سادہ احساس ہے اور بس گویا مذہب سے وہ تمام پرانے اور خوش آئند قسم کے ایقان اور عقیدے چھٹ جائیں گے۔ اس صورت میں مذہب ایک سادہ چیز رہ جاتا ہے اور بہت سے جدید لوگوں کے لیے بے حد کافی و وافی ثابت ہوتا ہے۔ قرون وسطیٰ کے روحانی تسلط کا زمانہ تو سمجھیے کہ لد گیا۔ رہا یہ سوال کہ مذہب کی اپیل انسان کو زندہ جاوید بنانے پر بھی مبنی تھی۔ سو اس کا زمانہ بھی نہیں رہا۔ کیونکہ جدید زمانے کا آدمی موت آجائے تو مر جانے پر بالکل راضی ہوتا ہے۔

انسان کو امر ہو جانے سے جو انہماک اور دلچسپی رہی ہے اس کا کچھ نہ کچھ تعلق انسانی امراض کے علم سے ہے۔ فانی انسان کو امر ہو جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ بات سمجھ میں بھی آسکتی ہے لیکن عیسائیت کے اثر نے اس تصور کو ہمارے ذہنوں پر اس بری طرح سے سوار کیا کہ انسان کی بہت سی توجہ اسی طرح مرکوز رہی...... ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ فانی انسانوں کے دل میں امر ہو جانے کی خواہش ایک ناممکن سپنے کی طرح چٹکیاں لیتی رہتی، ایک ایسا تصور بن جاتی جو افسانہ اور حقیقت کی درمیانی دنیا سے تعلق رکھتا ہو مگر ہوا یہ کہ امر ہو جانے کا خیال ہمارے لیے بے حد اہم اور زندگی موت کا مسئلہ بن گیا بلکہ پادریوں کے لیے تو موت کا خیال یا موت کے بعد کی زندگی کا تصور ان کی زندگی کا پیشہ بن کر رہ گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ پچاس سے اوپر پہنچ کر بہت سے لوگ (عیسائی یا کافر) موت سے نہیں ڈرتے۔ اسی لیے وہ جنت اور دوزخ کی فکر سے بھی آزاد رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زبان سے ہم یہ بھی سنتے ہیں کہ بھائی میری قبر پر یہ کتبہ لگانا، اور قبر کا ڈیزائن اس طرح کا ہو تو اچھا رہے گا بلکہ ان لوگوں کو ہم یہ بحث کرتے ہوئے بھی سنتے ہیں کہ مردے کو دفن کرنے سے اس کا جلانا بہتر ہے۔ میری مراد صرف ان لوگوں سے نہیں جن کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ سیدھے جنت میں جائیں گے بلکہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ زندگی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی شمع بجھنے کے بعد روشنی نہیں دے سکتی۔ جدید زمانے کے بہت سے صاحبان کمال نے انسانی زندگی کے جاودانی ہونے پر شک ظاہر کیا ہے بلکہ وہ اس جھنجھٹ ہی کو فضول سمجھتے ہیں۔ ان میں ایچ جی ویلز، حکیم آئن سٹائن اور سر آرتھر کیتھ جیسی ہستیاں بھی شامل ہیں لیکن موت کے خوف پر غالب آنے کے لیے اعلیٰ درجے کا ذہن خاص ضروری بھی نہیں۔ اس خوف پر ہر کوئی غالب آسکتا ہے۔

انسانی زندگی اور فرد کے امر ہونے کے تصور کے بجائے بہت سے لوگوں نے ایک اور نوع کے بقائے دوام کا تصور پیش کیا ہے جو زیادہ یقین آمیز ہے۔ اس میں کسی کی نسل کی بقا، کسی کے کام اور اس کے اثر کی بقا شامل ہیں۔ مثلاً ایک فرد (ہم آپ) مر جائیں تو مضائقہ نہیں۔ لیکن ہم جو کام اپنے پیچھے چھوڑے جا رہے ہیں وہ زندہ رہتا ہے اور ہمارے معاشرے کے افراد پر برابر اثر ڈالتا رہتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم شاخ سے پھول توڑ کر، اس کی پتیاں نوچ کر زمین پر پھینک دیتے ہیں مگر اس پھول کی خوشبو ہوا میں رچی رہتی ہے۔ گویا فرد کے عمل اور اس کے اثر کی بقا فانی انسان کے امر ہو جانے کے تصور سے کہیں زیادہ معقول، زیادہ بے لوث چیز ہے۔ ان معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوئی پاس ٹیئر اور موجد طامس ایڈیسن اب تک ہمارے درمیان زندہ ہیں کیونکہ ان کا کام زندہ ہے۔ ان کے جسم مردہ ہو چکے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ انسانی ''جسم'' چند کیمیائی اجزا کا ہر آن بدلتا ہوا ایک تصوراتی مظہر ہے اور بس!...... عمل کی اس پائندگی کے پیش نظر انسان اپنی زندگی، اپنی ہستی کو، مجموعی حیات کے بہتے دریا کا ایک قطرہ شمار کرتا ہے اور اس مجموعی زندگی کی بہتری کے لیے جو کچھ بن پڑے کرنے سے دریغ نہیں کرتا اور اگر انسان ذرا سا کم خود غرض ہو تو اس کے لیے یہی بہت ہے۔

2- اپنی کہانی

یہ اگر کفر ہے، پھر کیا ہے ''مسلماں'' ہونا!

میرے نزدیک مذہب بالکل انفرادی اور ذاتی چیز ہے۔ ہر شخص کو لازم ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں اپنا نقطہ نظر خود معین کرے اور اگر اس کا دل ریا سے پاک اور اس کی نیت صاف ہے تو خدا اسے ملزم نہ ٹھہرائے گا۔ ہر شخص کا مذہبی تجربہ صاف اسی کے لیے ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اس پر بحث اور حجت کی گنجائش نہیں پھر بھی مذہبی مسئلوں کے بارے میں ایک دیانت دار اور خوش نیت دل کی کش مکش کی کہانی دوسروں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے...... اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مذہب کے بارے میں عمومی باتوں کو چھوڑ کر اپنی کہانی بیان کروں۔

عام معنی میں مجھے لامذہب کہا جا سکتا ہے۔ آپ کہیں گے یہ تو عیسائیت کے خلاف بغاوت ہوئی مگر میں عرض کروں گا کہ ''بغاوت'' کا لفظ ذرا سخت ہے اور اس سے میرے دل و دماغ کی صحیح کیفیت بھی ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ میں بہت ہی آہستہ آہستہ عیسائیت کے دین سے دور ہٹا ہوں مگر اس انحراف کے زمانے میں بھی پورے

دلی خلوص اور تقویٰ کے ساتھ ان مذہبی رسوم اور احکام کا پابند رہا ہوں جو آہستہ آہستہ میری گرفت سے دور ہو رہے تھے۔ میرے دل میں اپنے دین کے احکام یا معتقدات کے خلاف کبھی نفرت پیدا نہیں ہوئی۔ اس لیے بغاوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں ایک پادری کے گھر میں پیدا ہوا۔ میری تربیت بھی اس طرح کی گئی کہ بڑا ہو کر پادری بنوں۔ اس لیے قدرتی طور پر مذہبی کشمکش کے دوران میں میرے جذبات مذہب کے خلاف نہیں، مذہب کے حق میں رہے۔ جذبات اور عقل سلیم کے اس تصادم کے دوران میں ایک زمانہ وہ آیا کہ میں نے دین عیسائیت کے ایک اہم عقیدے، شہادت مسیح کی بدولت انسانیت کی نجات، سے مکمل انکار کر دیا تھا...... یہ وہ پوزیشن ہے کہ ایک لامذہب یا کافر کی ہو سکتی ہے، اسی ذہنی حالت میں مجھے سکون ملا اور میرا ذہنی خلجان دور ہو گیا۔ یہ سارا کام کچھ اس قدرتی طریقے پر انجام پایا کہ جس طرح بالکل قدرتی طریقے پر وقت آئے تو بچے کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے یا جب سیب پک جائے تو خود بخود زمین پر گرتا ہے۔ میں نے اتنا کیا کہ جب سیب کے پک کر گرنے کا وقت آیا تو میں نے اس کے گرنے میں رکاوٹ نہ ڈالی...... تاؤ (قانون فطرت) کے فلسفے میں اس رویے کو تاؤ کے مطابق زندگی بسر کرنا قرار دیا جاتا ہے۔ مغرب میں اسی چیز کو اپنے ساتھ سچائی اور خلوص برتنے اور اپنی سمجھ کے مطابق اس کائنات کے ساتھ مخلص رہنے کا نام دیا جاتا ہے...... میرا ایمان ہے کہ کوئی شخص جب تک اپنے ساتھ ذہنی طور پر مخلص نہیں وہ خوش نہیں رہ سکتا اور نہ فطرت کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ فطرت کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام ہی جنت ہے اور لامذہب ہونے کا مطلب اور مدعا ہی یہ ہے۔

واضح ہو کہ لامذہبیت محض کوئی اصطلاح نہیں جس طرح ''دین مسیح کا پیرو'' یا عیسائی ہونا محض ایک اصطلاح ہے اور بس ...... ''لامذہبیت'' محض نفی اور انکار ہی کا نام نہیں۔ عام لوگ یہی سمجھیں گے لامذہب ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ فلاں شخص عیسائی نہیں اور چونکہ ''عیسائی ہونے'' کا صحیح اور واضح مطلب معین نہیں اس لیے ''عیسائی نہ ہونے'' کا مطلب بھی اتنا ہی مبہم ہے اگر آپ یہ کہیں، لامذہب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فلاں شخص خدا اور خدا کے دین پر اعتقاد نہیں رکھتا تو میں پوچھوں گا کہ خدا کی ہستی سے آپ کے نزدیک کیا مراد ہے؟ اور خدا کا دین یا ''زندگی کے بارے میں مذہبی نقطۂ نظر'' کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ

جولوگ اپنی ''لامذہبی'' کی بدولت مشہور ہوئے ہیں وہ ہمیشہ فطرت کے مقاصد اور فطرت کے مظاہر کو بڑا پاک اور بڑا مقدس سمجھتے تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے لہٰذا ہمیں ''لامذہبیت'' کے لفظ کو اس کے قدیم اور لغوی معنی میں لینا پڑے گا۔ لامذہب آدمی سے وہ آدمی مراد لینا ہوگا جو گرجے نہیں جاتا، (یہ رسم بڑی خوبصورت ہے اور میں اب سے لطف اندوز ہوسکتا ہوں) اور دین مسیح کے کسی فرقے کا پابند نہیں اور اس کے کٹر عقائد کو تسلیم نہیں کرتا۔

''لامذہب'' آدمی جن چیزوں کی نفی اور انکار کرتا ہے وہ اوپر بیان ہوئیں۔ اب ذرا ان باتوں کی طرف آیئے جس میں ایک لامذہب چینی (اور میں گہری واقفیت کے بل پر صرف اسی قسم کے لامذہب انسان کی بات کرسکتا ہوں!) اعتقاد رکھتا ہے۔ اس کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ہماری یہ ارضی زندگی ہی وہ زندگی ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے اور ہمیں اسی سے سروکار ہے۔ وہ اس زندگی کو بہت بامزہ اور بہت بھرپور گزارنا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں بارہا اس فانی زندگی کی گہری غمگینی کا احساس چٹکیاں لیتا ہے مگر وہ بخوشی اس کا سامنا کرتا ہے۔ انسانی زندگی میں حسن اور نیکی جہاں کہیں نظر آئے اس کا دل دیکھتے ہی موم ہو جاتا ہے۔ اور وہ نیکی کرنے کو ایسا کام سمجھتا ہے جو اپنا صلہ اور بدلہ آپ ہے...... وہ ان ''پابند مذہب'' لوگوں کو کچھ رحم، کچھ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جو جنت میں جانے کے لیے نیکی کرتے ہیں اور اگر انھیں جنت کا لالچ نہ دیا جائے تو یا دوزخ سے ڈرایا نہ جائے تو شاید ہرگز نیکی، ثواب کا کوئی کام نہ کریں اگر لامذہبیت یہی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک میں بے شمار ''لامذہب'' لوگ موجود ہیں۔ مگر انھیں خود معلوم نہیں کہ وہ کیا ہیں...... گویا ان معنی میں آزاد خیال مذہب پرست اور لامذہب شخص ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ان میں خدا کے بارے میں بحث نہ چھڑ جائے۔

مجھے مذہبی جذبے کی گہرائی کا حال خوب معلوم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دینیات کا عالم ہوئے بغیر بھی یہ تجربہ ہر شخص کو حاصل ہوسکتا ہے اور اگر یہ بات نہیں تو پھر یا تو عیسائیت کا دن بیکار ہے اور یا اس کی بے حد بری تاویلیں پیش کی گئی ہیں۔ مجھے ایک بادین اور ایک لامذہب شخص کی روحانی زندگی میں جو فرق نظر آتا ہے وہ سادہ لفظوں میں یہ ہے:

مومن ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جس پر خدا کی حکمرانی ہے اور جس کا خدا کو ہر دم خیال رہتا ہے۔ اس

خدا کے ساتھ مومن کا ایک مستقل ذاتی رابطہ قائم ہے۔ گویا وہ ایسی دنیا کا باسی ہے جس پر ایک مہربان باپ کی مستقل نگرانی قائم ہے۔ اس کا رکھ رکھاؤ اور کردار کبھی کبھار اس اونچے معیار کو بھی چھو لیتا ہے جو خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے ممکن ہے۔ بلاشبہ یہ معیار حاصل کرنا یا اسی معیار پر ساری زندگی قائم رہنا مشکل ہے بلکہ اس معیار کے مطابق ایک ہفتہ بلکہ ایک پورا دن زندگی بسر کرنا بھی کٹھن ہے۔ گویا اس مومن کی روزمرہ کی زندگی بشریت اور مومنیت، دوحدوں کے درمیان کانٹا بدلتی رہتی ہے......

اس کے برعکس بچارا لامذہب اس دنیا میں ایک یتیم کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے یہ احساس ڈھارس دینے کے لیے موجود نہیں کہ آسمان پر ایک ذات عالی اس کی محافظ اور نگران ہے اور جب نماز اور دعا کے ذریعے سے اس ذات کا رشتہ مجھ سے قائم ہو جائے گا تو یہ ذات عالی میری ذاتی بہبود اور فلاح کی بھی ضامن بن جائے گی...... مجموعی طور پر یہ بے چارا ایسی دنیا میں رہتا ہے جو مومن کی دنیا سے کہیں کم خوشگوار اور کم خوش آئند ہے مگر اس یتیم کو وہ وقار، وہ فائدے حاصل ہیں جو صرف ایک بے یار و مددگار انسان کے حصے میں آ سکتے ہیں۔ ضرورت اسے خودمختاری اور اعتماد نفس سکھاتی ہے، اپنی حفاظت آپ کرنا سکھا دیتی ہے اور اسے ہر یتیم کی طرح زیادہ پختہ کار اور پختہ خیال بھی بنا دیتی ہے...... میرے معاملے میں یہ ہوا کہ دنیا میں خدا کی محبت کے بغیر جینے کے احساس بلکہ تصور ہی نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح جو پیدائشی طور پر مسیحی دین کے پیرو ہوں مجھے یہی خیال بار بار ستاتا رہتا تھا کہ اگر میرے دل میں میرے ذاتی خدا کی ہستی موجود نہ ہو گی تو یہ جانے یہ ساری دنیا تہ و بالا ہو جائے گی۔ اس کی وجہ خوداعتمادی اور پختہ کاری کا فقدان تھا اور بس۔

خیر ان باتوں کے باوجود ایک مرحلہ آ سکتا ہے کہ ایک لامذہب، مومن کی بظاہر خوش آئند دنیا کو محض بازیچہ طفلاں بلکہ نیم بالغ اور خامکار دنیا کے روپ میں بھی دیکھ لے۔ مومن کے تصورات کی دنیا، مفید اور عملی دنیا سہی، مگر جب تک اعتماد کا پردہ آنکھوں پر پڑا رہے یہ مفید اور عملی نظر آتی ہے۔ ورنہ بلبلے کی طرح یہ سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ خوش اعتقادی کی یہ دنیا زیادہ رنگین بھی ہے مگر اپنی رنگ آمیزی کی وجہ سے ٹھوس اور سچی نہیں۔ اس لیے بے مایہ بھی ہے۔ میں ذاتی طور پر ہمیشہ یہ سمجھتا رہا ہوں کہ جو چیز رنگیں زیادہ ہو اور اس میں ٹھوس سچائی کم ہو وہ نکمی ہے۔ سچائی کو جاننے کے لیے ہمیشہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ جو کچھ ہو سو ہو ہمیں سچائی کو جاننا ہی چاہیے۔ نفسیاتی طور پر یہ معاملہ ایک قاتل کے معاملے سے ملتا جلتا ہے۔ یعنی اگر کسی نے قتل کرنے کی

حماقت کی ہے تو بہترین راستہ یہی ہے کہ اس قتل کا اعتراف کر لے...... اسی لیے میں کہتا ہوں کہ لامذہب بننے کے لیے جرات اور ہمت درکار ہے لیکن ایک دفعہ جب بری سے بری چیز کو صبر سے اور خوشی سے قبول کر لیا جائے تو انسان کے دل سے خوف اور خطر، دونوں نکل جاتے ہیں اور اسے مکمل ذہنی سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ذہنی سکون اس حالت کا نام ہے جس میں آپ نے بڑی مصیبت کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔

میرے دل میں جو لامذہب چھپا بیٹھا تھا اس نے عیسائیت کو غرور اور عاجزی، دونوں کی وجہ سے تج دیا تھا۔ یہ غرور جذباتی غرور تھا اور عاجزی، ذہنی انکسار سے عبارت تھی مگر مجموعی طور پر میں نے عیسائیت کو غرور کی وجہ سے کم اور عاجزی کے باعث زیادہ چھوڑا۔ جذباتی غرور کی تفصیل یہ ہے: ہم لوگ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بڑے اچھے بنتے ہیں۔ وجہ یہ کہ مذہب کا حکم یہی ہے۔ مجھے اس خیال سے بڑی نفرت ہے۔ آخر ہم لوگ محض انسان ہونے کی حیثیت سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیوں نہیں کر سکتے اور اچھے بن کر کیوں نہیں دکھا سکتے......؟ نظریاتی لحاظ سے اسے ''انسان پرستی'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ میرے ''ذہنی غرور'' کا ذکر تھا جو بحیثیت ایک انسان میری ذات میں جاگزیں تھا رہا عاجزی کا معاملہ، تو عرض یہ ہے کہ جدید علوم نے ہم پر فلکیات کی پراسرار دنیائیں منکشف کر دی ہیں۔ اس کی بدولت میں یہ نہیں مان سکتا تھا کہ انسان، خالق اکبر کی نظر میں اتنا ہی اہم ہے جتنا وہ اپنے آپ کو اہم سمجھتا ہے کیونکہ ایک انسان، ایک فرد کی حیثیت سے، اس کرہ زمین کا ایک ہیچ مقدار ذرہ ہے اور بس۔ اور اس کی یہ زمین خود نظام شمسی کا ایک بہت ہی حقیر حصہ ہے اور یہ نظام شمسی کل کائنات کے شمسی نظاموں میں ایک ذرے سے زیادہ بڑا نہیں۔ جب انسان کی ہستی کا اس کائنات میں یہ حال ہے تو انسان کی گستاخی، تکبر اور شوخ چشمی ملاحظہ ہو کہ اپنے آپ کو کتنا بڑا، کتنا اہم سمجھتا ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ مخلوق سمجھنے کا ہمیں کیا حق ہے؟ اور ہمیں اس ذات کبریا کا نائب بن جانے کیا حق ہے۔ حالانکہ اس کی قدرت اور اس کی تخلیق کا کروڑواں حصہ بھی ہم نہیں دیکھ سکتے اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر ہمیں اس ذات عالی کے بارے میں نظریے قائم کرنے اور حکم لگا دینے کا کیا حق ہے؟

عیسائیت کا ایک بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ انسان ایک فرد کی حیثیت سے بڑا اہم ہے لیکن اسی عقیدے نے روزمرہ کی زندگی میں انسان کے دل میں جو غرور، جو تکبر پیدا کیا ہے اس پر ہنسی آتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

میری والدہ کے جنازے اور تدفین سے چار دن پہلے سخت بارش ہوئی۔ جولائی کے مہینے میں چانگ
پاؤ میں یہ موسم کا معمول ہے۔ ڈر یہ تھا کہ یہ بارش اگر جاری رہی تو شہر میں سیلاب آجائے گا اور جنازہ اسی
رح رکھا رہ جائے گا۔ جنازے میں شرکت کرنے والے اکثر لوگ شنگھائی سے آئے تھے اور اگر تدفین میں
یادہ دیر ہوتی تو سب کا آنا فضول جاتا اور سب کو کوفت ہوتی۔ میری ایک رشتہ دار خاتون جو بڑی کٹر مذہبی
ورت تھیں بولیں ''مجھے خداوند یسوع پر بھروسا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے بچوں کا خیال رکھیں گے'' چنانچہ انھوں نے
عائیں مانگیں اور بارش بند ہوگئی۔ ظاہری طور پر بند ہوگئی۔ ظاہری طور پر اس کا مطلب یہ لیا گیا کہ ایک چھوٹا سا
بسائی خاندان اپنے ایک مرحوم عزیز کو آرام سے سپرد خاک کر سکے لیکن اس اعتقاد کی تہ میں جذبہ یہ نظر آتا تھا
کہ بصورت دیگر خدا شہر چانگ چاؤ کے ہزاروں باشندوں کو بڑی بے پروائی سے سیلاب کا لقمہ بننے دیتا۔ گویا
ں ہزاروں باشندوں کو اجل کا لقمہ بننے سے بچانے کے لیے بارش بند نہیں کی بلکہ بارش محض اس لیے بند کی گئی
کہ ایک گھرانے کے چند افراد کو جنازے اور تدفین میں تکلیف ہوتی۔ میرے نزدیک یہ ایسی خود غرضی ہے کہ
س کی مثال نہیں ملتی اور میں ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتا کہ خدا اپنے خود غرض بندوں کے لیے یہ کچھ کرے گا۔

دوسری مثال ایک عیسائی پادری کی ہے۔ اِس نے اپنی سوانح لکھی اور قادر مطلق کی قدرت کے کرشمے
اِن کرنے کے سلسلے میں بہت جگہ یہ ''ثبوت'' دیا کہ اس کی ساری زندگی میں خدا کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ ایک
ثبوت'' یہ تھا کہ ''میں نے 500 چاندی کے ڈالر جمع کیے تاکہ اس رقم سے امریکہ جاسکوں۔ آخر وہ دن آیا تو
ں دن خدا نے سکے کی شرح مبادلہ کم کر دی اور مجھے (''خدا کے ایک اہم بندے کو'') آسانی سے زیادہ روپیہ
اصل ہوگیا۔'' اب فرمائیے کہ شرح مبادلہ کم ہو جانے سے اس بھلے مانس کو زیادہ سے زیادہ دس بیس ڈالر کا
ئدہ ہوا ہوگا مگر خدا نے اسے دس بیس ڈالر کا فائدہ پہنچانے کے لیے پیرس اور لندن اور نیویارک کی کرنسی
رکیٹ تہ و بالا کر دی۔ کرنسی کے ہزاروں بیوپاریوں کا کاروبار ختم کر دیا۔ اس لیے کہ اس کے اس
خاص الخاص'' بندے کو دس یا بیس ڈالر کا فائدہ ہو جائے۔ یہ بھی یاد رہے کہ خدا کی عظمتوں کے گن گانے کا یہ
ریقہ عیسائی پادریوں اور عام عیسائی دنیا میں بڑا عام ہے۔

آپ نے دیکھا، انسان جس کی عمر زیادہ سے زیادہ روایتی لحاظ سے ''تین بیسی اور دس سال'' قرار دی
ئی ہے کتنا متکبر، کتنا خود پسند ہے......

ہوسکتا ہے کہ انسانیت مجموعی طور پر کسی نمایاں یا قدرے اہم تاریخ کی بھی مالک ہو مگر انسان ایک فرد کی حیثیت سے تو بالکل بے مایہ ہے۔ سوتنگ پو نے ٹھیک کہا، انسان کی مثال یہ ہے کہ ایک بے کراں سمندر میں ایک دانہ یا ایک ایسا کیڑا جو صبح کو پیدا ہوا اور شام کو مر بھی گیا۔ اس کائنات کے مقابلے میں اس کی زیست، اس کی ہستی بس اتنی ہے۔ اس پر بھی عیسائیت کے پیرو عاجزی اور فروتنی سے کام نہ لیں گے۔ وہ اس حقیقت سے مطمئن نہ ہوں گے کہ زندگی کا یہ بڑا دریا مجموعی طور پر جاوداں ہے اور وہ اسی دریا کا ایک قطرہ ہیں ...... یہ در ازل سے ابد کی طرف برابر بہہ رہا ہے۔ ایک ایسے چشمے کی طرح جو ایک بہت بڑے سمندر میں گر کر اپنی ہستی بدل دیتا ہے اور یہ ہستی اس سمندر کے وجود میں قائم بھی رہتی ہے۔

ذرا ملاحظہ ہو کہ مٹی کا برتن کمہار سے پوچھتا ہے۔ ''مجھے تم نے یہ شکل کیوں بخشی اور مجھے اس طرح کیوں بنایا کہ میں ٹوٹ جاؤں؟'' ...... مٹی کا برتن اس بات پر مطمئن نہیں کہ جب وہ ٹوٹ جائے گا تو اپنے پیچھے اپنی قسم کے کچھ چھوٹے چھوٹے برتن ((بچے!) چھوڑ جائے گا۔ انسان کو اتنا شاندار، اتنا حیرت انگیز جسم عطا کیا گیا۔ مگر انسان اس پر مطمئن نہیں۔ وہ اس فانی جسم سے تنگ ہے۔ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے اس لیے وہ خدا کو چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔ وہ ضرور نمازیں پڑھے گا، دعائیں مانگے گا، اس قادر مطلق سے روز کچھ نہ کچھ مانگتا ہی رہے گا، مطمئن کبھی نہ ہوگا، قناعت نہیں کرے گا۔

ایک چینی فاضل کا ذکر ہے کہ بدھ مت پر اس کا اعتقاد نہیں تھا مگر اس کی والدہ بڑی کٹر بدھ تھی۔ دن رات میں ہزار بار مہاتما بدھ کے نام کا وظیفہ پڑھتی اور ثواب حاصل کرتی مگر جونہی وہ مہاتما بدھ کا نام لیتی بیٹا فوراً ''پکارتا'' اماں جی ...... ذرا سنیے'' ...... ماں کو غصہ آ جاتا ...... اور وہ تنگ آ جاتی۔ اس پر ایک دن بیٹے نے کہا ''اب یہی دیکھ لیجیے کہ میں ایک دفعہ آپ کو پکارتا ہوں تو آپ چڑ جاتی ہیں۔ آپ مہاتما بدھ کو دن رات میں ہزار بار پکارتی ہیں اگر وہ واقعی سن لیں تو انھیں کتنی کوفت ہو''

ان باتوں کے بعد اب میں پھر اپنی کہانی کی طرف لوٹتا ہوں۔ میرے ماں باپ دونوں سخت پابند مذہب عیسائی تھے۔ میرے والد جس طرح کھانے سے پہلے شام کی دعا دہرایا کرتے تھے اسے سن لینا ہی کافی تھا۔ میں بڑا حساس مذہبی خیالات کا بچہ تھا۔ ایک پادری کے لڑکے کی حیثیت سے مجھے مشنری سکولوں کی تعلیم کی تمام سہولتیں میسر آئیں۔ میں نے اس طریقہ تعلیم کی خوبیوں سے بہت فائدہ اٹھایا اور اس کی کمزوریوں سے

نقصان بھی پایا۔اس سے جو فائدے حاصل ہوئے ان کے لیے میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔اور جہاں تک اس کی کمزوریوں کا تعلق ہے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے میں نے اپنے دل کی قوت سے رجوع کیا۔ کیونکہ چینی فلسفے کی رو سے بری اور اچھی تقدیر کوئی چیز نہیں۔ ہر چیز ایک سی ہے۔

والدین نے مجھے چینی تھیٹر دیکھنے سے منع کر رکھا تھا۔چین کے بھاٹوں کے عوامی گیت سننے کی بھی مجھے اجازت نہ تھی۔ میری زندگی چین کی عظیم عوامی روایات اور اس کی دیو مالا سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ بڑا ہو کر جب میں ایک مشنری کالج میں پہنچا تو جو تھوڑی بہت کلاسیکی چینی زبان میرے والد نے مجھے پڑھائی تھی اسے بھی طاق پر رکھ دیا گیا۔ ایک طرح یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ اس طرح میں بالکل مغربی انداز کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی قومی روایات سے اس طرح روشناس ہوا جس طرح کوئی مغربی شخص مشرق کے عجائبات کو تازگی خیال، اور دلی انبساط سے زندگی میں پہلی بار دیکھتا ہے۔ اپنے کالج کے دنوں میں، میں نے جو کچھ لکھا وہ انگریزی قلم (فاؤنٹین پن) سے لکھا اور چینی زبان لکھنے کے لیے جو موقلم چاہیے میں نے بلوغ کے زمانے میں اور جوانی تک اس کی شکل نہ دیکھی۔ یہ بڑی خوش نصیبی ثابت ہوئی۔ اس کی بدولت مشرق کے ذہن اور اس کے کارناموں کی تازگی میرے لیے برقرار رہی بلکہ ایک لحاظ سے میں ان روایات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بالکل تیار ہو چکا تھا...... اس کی مثال یہ سمجھ لیجیے کہ اٹلی کا آتش فشاں پہاڑ دے سووی آس ہزاروں برس پہلے ایک شام اپنا لاوا نہ اگلتا تو پومپی آئی کا شہرہ تباہ نہ ہوتا مگر اس لاوے نے پومپی آئی کے تمام آثار اپنے غلاف میں محفوظ رکھے۔حتیٰ کہ آج ہمیں لاوے کی تہ ہٹانے پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پومپی آئی میں جو گاڑیاں چلتی تھیں ان کے پہیے کیسے تھے اور پہیوں کا درمیانی فاصلہ کیا تھا کیونکہ ان گاڑیوں کے نشانات لاوے کی تہ سے عین بعین تازہ برآمد ہوئے۔ میرے لیے بھی مشنری کالج کی تعلیم آتش فشاں پہاڑ دے سووی اس کا لاوا ثابت ہوئی۔

مجھے تلقین یہ تھی کہ سوچنا خطرناک چیز ہے بلکہ غور و فکر کا تعلق شیطان ہے۔ میرے بلوغ کا زمانہ جو کالج کی تعلیم کا زمانہ تھا میری عمر کا بہت زیادہ مذہبی دور تھا مگر اسی دور میں ایک کشمکش بھی جاری تھی۔ یہ کشمکش میرے دل و دماغ کے درمیان برپا تھی۔ میرا دل عیسائی زندگی کے حسن اور پاکیزگی کا متوالا تھا اور دماغ ہر چیز کی تہ تک پہنچنے کے لیے دیسوں اور منطق کا رسیا تھا مگر عجیب بات ہے کہ اس دور میں مجھے وہ روحانی اذیت، وہ مایوسی نہ ہوئی جس نے کونٹ ٹالسٹائی جیسے حکیم کو قریب قریب خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک مکمل

مسیحی سمجھتا تھا جس کے اعتقادات میں کوئی بل، کوئی پھیر نہ تھا۔ بس میں ذرا آزاد خیال زیادہ تھا اور دینیات کے اصول ذرا کم تسلیم کر سکتا تھا۔ تاہم کچھ بھی ہو میں ہر وقت عیسائیت کے اصل اصول یعنی ''حضرت عیسیٰ کے پہاڑی کے خطبے'' پر ہمیشہ تکیہ کر سکتا تھا۔ اس کا حسن، عالمگیر اور گہری سچائی ہر وقت میرے لیے ڈھارس بن سکتی تھی اور سچی عیسائیت کے اس داخلی شعور ہی نے میری ہمت بندھائی اور مجھے تقویت بخشی۔

لیکن مذہبی عقائد سے میرا ایمان اٹھتا جا رہا تھا۔ پہلے پہل سطحی اصولی باتیں ناگوار گزریں۔ مذہبی کتابوں میں یہ لکھا تھا کہ پہلی صدی عیسوی میں حضرت مسیح بھی زندہ اپنی قبر سے اٹھیں گے اور ان کے پیغمبر (یوحنا، متی وغیرہ) بھی جی اٹھیں گے۔ مگر یہ بات نہ ہوئی۔ اس پر بھی مسیح کے زندہ قبر سے اٹھنے کا عقیدہ جوں کا توں موجود تھا۔ ایسی ہی باتوں پر مجھے شک پیدا ہوا۔

پھر میں دینیات کی کلاس میں آ گیا۔ گویا اس میں تقدس سے معمور فضاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ اسی جماعت میں آ کر میں نے دوسرے عقائد کا بغور مطالعہ کیا۔ مثلاً میں نے یہ پڑھا کہ علما کو کنواری مریم کے مسیح کو جنم دینے پر بھی شک ہے اور بہت سے امریکی دینی عالم اس بارے میں مختلف رائے رکھتے ہیں۔ مجھے یہ پڑھ کر غصہ آیا۔ کیونکہ چینی عیسائیوں کو یہ تلقین تھی۔ وہ بلا چون و چرا اس عقیدے کو مان لیں ورنہ انھیں بپتسمہ نہ دیا جائے گا۔ ادھر اسی کلیسا کے غیر ملکی علما کو اتنی آزادی تھی کہ وہ اس عقیدے کو محل نظر سمجھ سکیں اور اس پر بحث بھی کر سکیں۔ مجھے یہ بات بڑی غیر مخلصانہ معلوم ہوئی۔

دینیات کی بے مقصد موشگافیوں کی مزید تعلیم کے بعد میں اور بھی اس ذمہ داری سے آزاد محسوس کرنے لگا کہ ان مذہبی مباحث اور بے مقصد علمیت کو سنجیدگی کی نظر سے دیکھوں۔ نتیجہ یہ کہ میں امتحانات میں اچھا ثابت نہ ہوا۔ میرے پروفیسروں کا خیال تھا کہ میں عیسائی پادری بننے کے لیے فطری طور پر لائق نہیں اور ہمارے لاٹ پادری نے مجھے کہہ دیا کہ یہ کام تمہارے بس کا نہیں، بہتر ہوگا تم کالج چھوڑ دو۔ وہ مجھ پر اپنی تعلیم ضائع نہ کرنا چاہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی اچھی یہ بات ثابت ہوئی اگر میں دینی تعلیم جاری رکھتا اور فضیلت کی سند لے کر پادری بن جاتا تو آگے چل کر اپنے ساتھ دیانتداری نہ برت سکتا اور اپنے آپ کو ہر ہر قدم پر دھوکے دیتا رہتا۔ لیکن ''بغاوت'' کی بنیاد یوں پڑی کہ دینیات کے عالم کے عقائد تو کچھ اور ہوتے تھے لیکن عام عیسائی سے کچھ اور عقائد پر چلنے کا حلف لیا جاتا تھا۔ اس تفریق ہی نے مجھ میں ایسا احساس پیدا کیا

جسے ''بغاوت'' کے قریب قریب ایک احساس قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس وقت تک میرا یہ خیال پختہ ہو چکا تھا کہ عیسائی علما ہی عیسائی دین کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سخت متضاد باتیں میرے سامنے بار بار آتی تھیں اور میں ان پر غلبہ نہیں پا سکتا تھا۔ ایک طرف تو یہ بات تھی کہ عیسائی عالموں نے عیسائیت کے دین کی تعمیر اس سیب (دانہ گندم؟) کی بنیاد پر کھڑی کر رکھی تھی۔ جسے آدم نے جنت میں چکھ لیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر آدم یہ سیب نہ کھاتے تو گناہ اولیں کا وجود نہ ہوتا اور اگر یہ گناہ نہ ہوتا تو نجات اور شفاعت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا...... اس منطق کے تمام اسرار مجھ پر واضح تھے۔ چاہے سیب کا مطلب کچھ بھی لیا جائے مگر اس عقیدے کے عین الٹ خود مسیح کی تعلیمات تھیں جنھوں نے اپنے وعظ، اپنی تعلیم میں ایک بار بھی آدم کے اس گناہ اول کا نام نہ لیا تھا، یہ کبھی نجات و شفاعت کا ذکر کیا تھا...... خیر کچھ بھی ہو اب گناہ اولیں کے اس احساس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ نہ مجھے اس پر اعتقاد رہا...... اب میں جانتا ہوں کہ اگر خدا کو مجھ سے میری ماں کے مقابلے میں آدھی محبت بھی ہے تو وہ مجھے دوزخ میں نہ ڈالے گا۔ یہ وہ حقیقت ہے جو میرا شعور اور میرا ادراک مجھے بتاتا ہے اور میں کسی مذہب کی خاطر اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔

خیر...... اس سے بھی زیادہ ایک اور مضحکہ خیز تصور تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ جنت میں آدم وحوا دونوں نے صرف ایک سیب (دانہ گندم؟) کھایا تو خدا اتنا ناراض ہوا کہ اس نے اس لغزش کی پاداش میں آدم وحوا کی اولاد کو نسل در نسل زمین پر مصیبتیں اٹھانے کی سزا دے دی۔ مگر آدم وحوا کی اسی اولاد نے جب خدا کے بیٹے حضرت یسوعؑ کو قتل کر دیا تو خدا اتنا خوش ہوا کہ اس نے سب کو معاف کر دیا۔ آپ چاہیں اس مسئلے کے بارے میں کوئی دلیل پیش کریں، یہ جھوٹ مجھے تو ہضم نہیں ہو سکا اور یہی وہ چیز تھی جو اس زمانے میں میرے دل کو کھائے جاتی تھی۔

تاہم کالج سے ڈگری لینے کے بعد بھی میں ایک پر جوش عیسائی تھا اور میں نے پیکنگ کے ایک غیر مسیحی کالج میں اتوار کو دینیات کی کلاسیں منعقد کرنی شروع کر دیں۔ اس پر میرے ساتھیوں کو کچھ کوفت بھی ہوئی مگر میں نے اپنے جذبے کی دھن میں کچھ پروا نہ کی۔ اس دینیات کی جماعت کا سب سے کٹھن مرحلہ وہ تھا جب کرسمس کے مواقع پر مجھے چینی بچوں کے سامنے، ولادت مسیحؑ کے وقت فرشتوں کے روحانی نغموں کی کہانی سنانی پڑتی تھی کیونکہ اس کہانی پر خود میرا کوئی اعتقاد نہ تھا۔ تاہم میں نے ہر شک کو دلیل سے دور کر لیا اور میرے دل میں صرف مذہب کی محبت اور خوف باقی رہ گئے اور خدا کے لیے ایک چاہت سی محسوس ہونے لگی۔ جس نے

میرے دل کو سکون اور مسرت مل گئی۔ یہ خیال بھی آنے لگا کہ اگر یہ محبت میرے دل میں پیدا نہ ہوتی تو میرے دل کو سکون اور مسرت دونوں سے محروم رہنا پڑتا اور میں ان کے بغیر یتیموں کی طرح دنیا میں بھٹکتا پھرتا۔

آخر میری نجات کا دن بھی آ گیا...... ایک دن ایک ساتھی استاد سے بحث کے دوران میں، میں نے کہا ''اگر خدا کا وجود نہ ہو تو لوگ نیکی کرنا چھوڑ دیں اور دنیا تہ و بالا کر رہ جائے!''

میرا ساتھی کنفیوشس کا پیرو تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے بولا ''ہمیں نیکی اور اچھائی کی زندگی خدا کے لیے نہیں بلکہ صرف اس لیے گزارنی چاہیے کہ ہم اچھے انسان ہیں...... بس!''

انسان کی شرف اور اس کی خودداری کا یہ حوالہ ایسی چیز تھی جس نے عیسائیت کے ساتھ میرا آخری ناتا بھی توڑ دیا۔ پھر میں وہ کچھ ہو گیا جسے کبھی ''لا مذہب''، کبھی ''ملحد''، کبھی ''بے دین'' کہا جاتا ہے۔

اور آج مجھ پر یہ ساری بات کھل چکی ہے۔ اب میں جانتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ عرف عام میں جس شخص کو ''کافر'' قرار دیا جاتا ہے اس کے عقیدوں کی دنیا ایک سادہ دنیا ہے۔ یہ دنیا کوئی دعویٰ نہیں کرتی، کوئی دلیل، کوئی ''حجت'' پیش نہیں کرتی کیونکہ اسے اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ زندگی کی نعمتوں کی زندگی ہی کی مدد سے اور زیادہ دل نشین اور دل کش بناتی ہے۔ نیکی کا جواز اس کے نزدیک یہ ہے کہ نیکی کرنے کے لیے کسی جواز، کسی بہانے کی ضرورت ہی نہیں اور نیکی کرنے کا اس سے بہتر جواز مل ہی نہیں سکتا۔ یہ ''عقیدے'' کسی انسان سے یہ نہیں کہتے کہ تم نیکی کرو۔ ورنہ تمہاری سزا یہ ہو گی یا نیکی کرنے کی جزا یہ ملے گی۔ ایسے مفروضات اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ اس دنیا میں گناہ، نجات اور صلیب کوئی چیز نہیں۔ یہ تمام عقیدے الجھے ہوئے ہیں۔ منطق ان کا سیدھا اور بلا واسطہ ثبوت دینے سے عاجز ہے...... ''بے دین'' کی یہ دنیا صرف سیدھی اور سادہ باتوں سے عبارت ہے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ بات تسلیم کر لے کہ نیکی کرنا اپنا جواز آپ ہے تو پھر نیکی کی زندگی گزارنے کے لیے مذہب نے جتنے انعامات کے لالچ دے رکھے ہیں وہ اس کے لیے بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان محبت آخری اور قطعی حیثیت بن جانی چاہیے۔ ہم میں یہ صلاحیت پیدا ہونی چاہیے کہ ہر انسان کو ہم پیار کی نظروں سے دیکھیں اور یہ باہمی چاہت خدا کے ڈر سے نہ ہو بلکہ ایک قدرتی اور عام جذبہ ہو مگر میں نے یہ دیکھا ہے کہ عیسائیت نے اخلاقیات کو غیر ضروری طور پر مشکل چیز بنا رکھا ہے اور گناہ کو ایسی خوبصورت چیز بنا دیا ہے جسے دیکھ کر ہر کسی کی رال ٹپک پڑے اور وہ

اسے بالکل فطری اور موزوں کام سمجھے۔ اس کے برعکس ''کفر'' ہی وہ چیز ہے جو مذہب کو دینیات اور الٰہیات کے چنگل سے چھڑا سکتا ہے اور مذہب میں پھر سے اعتقاد کا حسن اور سادگی اور جذبے کی گہرائی کا وقار پیدا کر سکتا ہے جو مذہب کی اصلی روح ہے۔

اب میں اس حقیقت کو پا گیا ہوں کہ عیسائیت کہ پہلی، دوسری اور تیسری صدیوں میں دینیات کی ایسی الجھنیں پیدا ہوئیں کہ حضرت عیسیٰ کا وہ مشہور ''خطبہ کوہ'' سادہ سچائیوں کے بجائے ایک بہت ہی محدود اور خود کفیل ساڈھانچہ بن گیا اور پاپائیت اور پادریوں کے ایک بنے بنائے طبقے کی پشت پناہ بن کر رہ گیا۔ اس کی ساری وجہ ایک لفظ اور صرف ایک لفظ یعنی الہام تھا...... اس لفظ کی رو سے یہ لازم ہوا کہ خدا اپنے پیغمبر پر کائنات کے کوئی خاص اسرار، ایک خاص قسم کے روحانی نظام کے بھید الہام کے ذریعے سے کھول دیتا ہے۔ ''الہام'' کا یہ دروازہ خدا کے دوسرے برگزیدہ بندوں مثلاً ولیوں وغیرہ پر بھی کھلا رہتا ہے۔ ہر مذہب کے لیے ''الہام'' کی یہ شرط ضروری ہوگئی تاکہ ہر مذہب آخرت میں انسان کی بخشش کے لیے اپنا ایک خاص الخاص فارمولا بنا سکے جو دوسرے مذہب کے انسانوں کے لیے میسر نہ آسکے چنانچہ ہر مذہب کے ملا، پادری، پروہت اسی ''الہام'' کے بل پر زندہ ہیں۔ حضرت عیسیٰ نے پہاڑ پر اپنے خطبے میں جو بنیادی اور سادہ سچائیاں بیان کی تھیں اسے یہ لوگ ضرور بڑھا چڑھا کر، نمک مرچ لگا کر، پورے مصنوعی انداز میں پیش کریں گے۔ جس نرگس کی خلقت پر انھیں اتنی حیرت ہوئی تھی اس پر مذہبی پیشوا اپنا رنگ ضرور چڑھائیں گے...... محض اس لیے کہ اپنا کام چلتا رہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے ''پہلے آدم'' اور ''دوسرے آدم'' وغیرہ کی کہانیاں وضع کیں۔

عیسائیت کی ابتدا میں ولی پال کی منطق لوگوں کے لیے بڑی زوردار اور قابل قبول تھی لیکن آج کل انسان کا تنقیدی شعور اتنا بیدار ہو چکا ہے کہ اب یہی دلیلیں بودی اور بے حقیقت نظر آتی ہے...... ایشیا کی منطق، استخراج کی بنیاد پر عمارت بناتی ہے۔ اس منطق کی سختی اور جدید زمانے کے آدمی کے ذہن میں بڑا حل ہے کیونکہ ہمارا آپ کا ذہن سچائی کو قبول کرنے کے سلسلے میں زیادہ لچکیلا، زیادہ وسیع ہو چکا ہے۔ اس فرق کی بدولت ہی ''الہام'' میں وہ اپیل نہیں رہی۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اب پھر ''بے یقینی'' اور ''کفر'' کو لوٹ چلیے۔ ''الہام'' سے منکر ہو جائیے تاکہ ایک بار پھر آپ کا ذہن اس عیسائیت کو قبول کر سکے جو ابتدائی اور اصلی تھی اور جو میرے نزدیک زیادہ تسلی بخش مذہب ہے۔

گویا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ''کافر'' کا کوئی دین نہیں ہوتا۔ وہ اسی حد تک لامذہب ہے کہ الہام کی کسی خاص قسم اور نوع پر اعتقاد نہیں رکھتا مگر اسے خدا پر ہمیشہ یقین ہوتا ہے۔ وہ اس اعتقاد کو زبان پر نہیں لاتا، مبادا لوگ کچھ کا کچھ مطلب نکال لیں۔ چین میں جتنے ''لامذہب'' اور ''کافر'' لوگ ہیں سب کے سب خدا پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں۔ چینی ادب میں خالق کے لفظ سے بار بار واسطہ پڑتا ہے مگر فرق یہ ہے کہ چینی لامذہب بڑی دیانتداری سے خالق کائنات کو بھیدوں کے پردوں میں چھپا رہنے دیتا ہے اور اس خالق کے لیے اپنے دل میں عظمت، تقدس اور تقویٰ کے جذبات بھی رکھتا ہے...... یہی جذبات اس کے لیے کافی ہیں مگر چینی ''لامذہب'' اس اعتقاد کے ساتھ ساتھ اس کائنات کے بے پایاں حسن، ستاروں کی پراسرار چشمکوں، کائنات کی ان گنت چیزوں میں صناعی کے کمال اور روح انسانی کے وقار کا بھی اتنا ہی گہرا شعور رکھتا ہے اور یہ شعور بھی اس کے لیے اطمینان کا باعث ہے۔ وہ موت کو اسی طرح (ایک حقیقت) کے طور پر قبول کرتا ہے۔ جس طرح درد اور آلام کو چپ چاپ سہنا چاہیے۔ وہ موت اور دکھ درد کے مقابلے میں یہ سوچتا ہے کہ ہمیں زندگی کی سی بڑی نعمت ملی ہے، تازہ ہواؤں اور پہاڑوں کی صاف چاندنی جیسے گراں بار نظارے عطا ہوئے ہیں اس لیے شکایت کرنے کی کیا گنجائش ہے۔ لہٰذا وہ دکھ درد کی شکایت نہیں کرتا۔ خدا کی رضا کے آگے سر جھکانا اس کے نزدیک مذہب کی پابندی اور تقویٰ ہے اور وہ اس تسلیم و رضا کو تاؤ (قانون فطرت) پر عمل کرنے کا نام دیتا ہے اگر خالق کائنات کی رضا یہ ہے کہ وہ ستر سال کی عمر میں مر جائے تو وہ خوشی خوشی ستر برس کی عمر میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کا یہ پختہ اعتقاد ہے کہ دنیا میں دیر ہے اندھیر نہیں اور تقدیر خداوندی کا چکر برابر چلتا رہتا ہے، ایک جگہ قائم نہیں رہتا۔ اس لیے دنیا میں کوئی ظلم، کوئی ناانصافی، مستقل لعنت بن کر نہیں رہتی، اپنے وقت پر مٹ ہی جایا کرتی ہے اور اس لیے جو کچھ اسے میسر ہے وہ خدا سے اس سے زیادہ طلب نہیں کرتا۔



چودہواں باب

سوچنے کا فن

1- سوچ میں انسانیت پرستی کی ضرورت

سوچنا سائنس نہیں، آرٹ ہے۔ چینی اور مغربی علمیت میں بڑا فرق اس بات کا بھی ہے کہ اہل مغرب میں علم کی کسی شاخ یا شعبے میں مہارت حاصل کرنے کا رواج تو ہے لیکن ان کے غور وفکر، ان کے علم میں انسان پرستی کا شائبہ نہیں۔ ادھر چین کا یہ حال ہے کہ سارا زور زندگی بسر کرنے کے معاملوں پر مسئلوں پر دیا جاتا ہے، اور کوئی علم کسی الگ سائنس کی حیثیت سے موجود نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب میں انسان کی زندگی سے تعلق رکھنے والے علوم میں بھی ''سائنسی'' انداز کا غور وفکر در آیا ہے۔ ان میں بھی تخصیصی مہارت کی چھاپ آ چلی ہے اور سائنسی یا نیم سائنسی اصطلاحات کا زور بندھ رہا ہے۔ میرا مطلب اس سائنسی غور وفکر سے نہیں جو صحیح معنی میں سائنسی ہو۔ میرا مطلب اس لفظ کے استعمال سے وہی ہے جو آج کل کے عام معنی سے آشکار ہے۔ کیونکہ سچا سائنسی غور وفکر، عقل سلیم اور سوجھ سے اور خاص طور پر انسان کی قوت تخیل سے کسی صورت الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ادھر آج کل کے ''سائنسی'' تفکر کا حال یہ ہے کہ یہ اپنے اصول اور طریقے اور حدود میں بے حد منطقی، نہایت غیر جانبدار، اور بے حد خصوصی ہو چکا ہے...... گویا مشرق کی علمیت اور مغرب کی علمیت میں جو فرق ہے وہ اصل میں منطق اور فراست کے بنیادی تضاد پر جا ختم ہوتا ہے۔ اگر منطق کو سمجھ بوجھ یا فراست سے محروم کر دیا جائے تو منطق انسانی چیز نہیں رہتی۔ ادھر فراست اور سوجھ بوجھ سے اگر منطق کا کوئی واسطہ نہ رہے تو وہ فطرت کی نیرنگیوں کے اسرار سمجھنے کے قابل نہیں رہتی......

چینی ادب اور فلسفے پر نظر دوڑائیں تو ہمیں کیا بات نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ چینی لٹریچر میں سائنسی علوم نہیں ہیں، انتہا پسندانہ نظریے بھی نہیں، اور فلسفے کے ایسے دبستان بھی نہیں جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف یا متضاد ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چین کی ازلی فراست نے اور چین کی معقولیت نے نظریہ بازی اور کٹر

اصول نوازی کا جھگڑا ہی ختم کر رکھا ہے۔اس موقعے پر شاعر یو چوئی کی مثال سے بات واضح ہو جائے گی کہ اس کی طرح ہر چینی اہل علم ''کنفیوشس کے دین سے اپنے سبھاؤ کو ٹھیک کرنے کا کام لیتا تھا، بودھ مت کے ذریعے سے اپنا دل صاف کرتا تھا۔ پھر تاریخ اور مصوری، پہاڑوں اور دریاؤں سے اور شراب، موسیقی اور شعر سے اپنی روح کو سکون دیتا تھا''...... گویا وہ اس دنیا کا باسی ہوتے ہوئے بھی اس دنیا سے ملوث نہ تھا۔

اس صورت میں چین کی سرزمین وہ سرزمین ہے۔ جہاں کوئی شخص شدت سے غور وفکر میں الجھنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ہر شخص زندگی بسر کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔اس سرزمین میں خود فلسفہ بھی معمولی سمجھ بوجھ کی سادہ سی چیز بن جاتا ہے۔ جسے بڑی آسانی سے ایک موٹی کتاب کے صفحوں میں یا اتنی ہی آسانی سے دو مصرعوں کے ایک شعر میں بھی بند کیا جا سکتا ہے۔چین کی سرزمین میں فلسفے کا کوئی نظام موجود نہیں۔اور وسیع معنی میں کوئی منطق'' کوئی تصوف یا بعد الطبیعیات، اور علمی اصطلاحات کا کوئی انبار موجود نہیں۔ اس سرزمین میں اہل مدرسہ کی تنگ نظری اور ملائیت نہیں۔ علمی یا عملی تعصبات یا تشدد کا وجود نہیں۔ ایسی اصطلاحات موجود نہیں جن کی حیثیت محض تصوری یا تجریدی ہو۔ ایسے لفظ نہیں جو بڑے بڑے اور لمبے لمبے ہوں۔اس سرزمین میں کوئی میکانکی قسم کی عقلیت پرستی پیدا نہیں ہوسکتی اور ہر شخص کو اس چیز سے بڑی نفرت ہے جسے جدید فلسفے نے ''منطقی ضرورت'' کا نام دے رکھا ہے۔چین کی سرزمین، کاروبار میں، وکیلوں سے پاک ہے اور فلسفے میں منطقیوں کا وجود نہیں رکھتی۔ یہاں فلسفے کے تفصیلی نظام تو رائج نہیں لیکن زندگی کے بارے میں ایک گہرا اور شدید احساس ضرور ہے۔چین میں کوئی کانٹ، کوئی ہیگل نہیں۔ وہاں صرف انشا پرداز ہیں، مقولوں اور مثالی کہانیوں کے مصنف ہیں۔ بدھ مت کی پہیلیوں کے مفسر اور تاؤ کی کہانیوں کے شارح موجود ہیں اور بس۔

مجموعی طور پر چین کا لٹریچر چھوٹی چھوٹی نظموں اور چھوٹے چھوٹے مضامین کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔اس شخص کو یہ ذخیرہ واقعی ناقابل اختتام معلوم ہوتا ہے جو انھیں پسند کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا لیکن یہی نظمیں اور یہی مضامین، رنگا رنگی اور تنوع سے اتنے بھرپور ہیں جس طرح فطرت کا کوئی نظارہ بے پایاں حسن کا مالک ہوتا ہے اور ہمارے یہاں ایسے انشا پردازوں اور خطوط لکھنے والوں کی کمی نہیں جو زندگی کے بارے میں اپنے احساس کو ایک مختصر سی عبارت یا زیادہ سے زیادہ تین چار سو لفظوں کے ایک مضمون میں لکھ دینا

چاہتے ہیں۔ یہ مضامین عام مغربی لڑکوں کے جواب مضمونوں سے بھی مختصر ہوتے ہیں۔ انھیں وقتی تحریروں، خطوط، روزنامچوں، ادبی حاشیوں اور باقاعدہ مضامین میں کہیں تو قسمت کی بے رحم گردشوں کا ذکر ملے گا، کہیں کسی ایسی عورت کا ذکر ہوگا جس نے پاس کے گاؤں میں خودکشی کی تھی اور کہیں بہار کی کسی پرلطف دعوت یا برف کے کسی جشن یا چاندنی میں کشتی کی سیر کے تذکرے بھی مل جائیں گے۔ انھیں ایسی ایک شام کا بھی ذکر ملے گا جب باہر سخت طوفان آرہا تھا اور لکھنے والے نے وہ شام ایک مندر میں گزاری تھی اور وہ گفتگو بھی لکھی ہوگی۔ جس کی وجہ سے یہ شام اس کے ذہن میں محفوظ رہی۔ چینی ادب میں ہمیں ان گنت انشا پرداز ایسے ملیں گے جو شاعر بھی ہیں۔ ایسے شاعر بھی ہیں جو انشا پرداز بھی تھے مگر جنھوں نے کبھی پانچ سات سو الفاظ سے زیادہ لمبی چیز لکھی ہی نہیں اور اسی مختصر سے پیمانے میں، بلکہ کبھی تو ایک مصرع میں زندگی کے مکمل فلسفے کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔

بس اسی وجہ سے چین میں فلسفے کے دبستان اور فلسفے کے نظام رائج نہ ہو سکے۔ چین میں ذہنی صلاحیتوں کو معقولیت پسندی اور اس سے بھی زیادہ فنکارانہ احساس گرفت میں رکھتا ہے اور سچ یہ ہے کہ چین میں ذہن اور عقل پر اعتماد بھی کم ہی کیا جاتا ہے۔

یہ جتانے کی ضرورت شاید نہیں کہ منطقی صلاحیت انسانی ذہن کا نہایت لاجواب ہتھیار ہے۔ اور اسی کی وجہ سے سائنس نے اپنی تمام فتوحات حاصل کی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مغرب میں انسانی ترقی کی باگ دوڑ بنیادی طور پر اب بھی عقل سلیم ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس پر تنقیدی جوہر کا حکم بھی چلتا ہے جو منطقی جوہر سے عظیم تر ہے۔ منطقی جوہر وہ چیز ہے جسے مغرب میں انسانی تفکر کی معراج خیال کیا جاتا ہے۔ یہ تسلیم کر لینا بھی چنداں ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ چین کی نسبت مغرب کا تنقیدی شعور کہیں زیادہ بیدار ہے، لیکن منطق کی خرابی کا ذکر کرتے ہوئے میرا اشارہ مغربی تفکر کی ایک مخصوص کمی کی طرف ہے۔ یہ تسلیم کہ منطق میں بھی خوبیاں ہیں اور میرے نزدیک جاسوسی اور سراغ رسانی کی کہانیوں کو مغرب نے جو ترقی دی ہے وہ مغرب کے منطقی ذہن کی ایک بڑی دلچسپ پیداوار ہے۔ ادب کی یہ صنف چین میں کسی عنوان رائج نہ ہو سکی، نہ ترقی کر سکی لیکن میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ منطق پر زیادہ توجہ دینا اور اسی کو ہر بات کی بنیاد سمجھنا یا تفکر کو منطق کا غلام بنا دینا ایسی چیز ہے جس میں بہت سے عیب ہیں۔

مغربی علمیت کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مغرب کے لوگ علم کے کسی خاص شعبے میں خصوصی مہارت

حاصل کرتے ہیں اور اس طرح انسانی علم کو مختلف شعبوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ منطقی فکر، اور خصوصی مہارت کی حد سے بڑھی ہوئی ترقی، فنی اصطلاحوں کی بھرمار کا شاخسانہ یہ ہے کہ موجودہ تہذیب نے فلسفے کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اس تہذیب میں سیاسیات اور اقتصادیات کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ عام آدمی فلسفے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ حد تو یہ ہے کہ اس غلطی پر اس کا ضمیر اسے کوئی ملامت نہیں کرتا۔ جدید تہذیب میں عام آدمی بلکہ ایک تعلیم یافتہ آدمی کا خیال یہ ہے کہ فلسفہ ایک ایسا ''مضمون'' ہے جس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔

جدید تہذیب کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ فلسفہ جسے انسان کے جینے اور انسان کے جینے کے ساتھ اتنا قریبی ربط ہونا چاہیے اب انسانی زندگی سے اتنا دور ہو چکا ہے۔ یونانیوں و رومنوں کی تہذیبوں میں یہ حال نہ تھا۔ نہ کبھی چین میں یہ اندھیرا ہوا تھا کیونکہ چین میں ہمیشہ سے زندگی کا مشاہدہ اور مطالعہ (فلسفہ) اہل علم کا خاص مشغلہ رہا ہے...... اب جو فلسفے کو طاق پر بٹھا دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو جدید زمانے کے لوگوں کو جینے کے مسائل سے دلچسپی نہیں رہی (اور یہی فلسفے کا اصل موضوع ہیں) یا ہم فلسفے کے اصلی تصور سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ جدید زمانے میں علم کا احاطہ اتنا وسیع ہو گیا ہے اور علوم کے شعبے (اپنے اپنے خصوصی ماہرین کی شدید نگرانی میں) اتنے بڑھ گئے ہیں کہ فلسفہ اب انسانی علوم کا سردار نہیں رہا۔ اب یہ ایک ایسا علم رہ گیا ہے جس میں کوئی شخص خصوصی مہارت حاصل نہیں کرتا...... اب یہ حال ہو گیا ہے کہ فلسفے کے طالب علموں کو اقتصادیات کے پروفیسروں کے لیکچر سننے کے لیے خاص طور سے اجازت دی جاتی ہے۔ فلسفہ جو انسانی علوم کا سرتاج تھا۔ اب طوائف الملوکی کے زمانے کے چینی شہنشاہ کی طرح ہے جو اتنا کمزور تھا کہ اپنے باج گزار والیوں سے خراج نہ لے سکتا تھا۔ روز بروز اس کا اختیار کم ہوتا جا رہا تھا، علاقے چھن رہے تھے اور اس کی وفاداری کا کلمہ صرف چند شریف خاندان پڑھتے تھے جو بے حد وضعدار مگر بے حد غریب بھی تھے۔

تو گویا، انسانی تہذیب اب اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں علوم الگ الگ خانوں میں بند ہیں، علم بذات خود کوئی چیز نہیں رہا۔ اب تو بس ''خصوصی مہارت'' رہ گئی ہے۔ تکمیل اور فضیلت، دونوں خواب وخیال ہو گئے ہیں۔ اب علم کے کسی خاص شعبے کے ماہرین ملتے ہیں لیکن دانائی کے پیکر، حکیم اور مفکر نہیں ملتے۔

کسی علم میں خصوصی مہارت کا اب جو زور بندھا ہے اس پر مجھے ایک کہانی یاد آئی ہے۔ کبھی چینی شہنشاہوں کے شاہی باورچی خانوں میں بھی مہارت کا یہی زور تھا۔ ایک دفعہ حکومت کا تختہ الٹا اور ایک خاندان

کی جگہ دوسرے خاندان نے تخت پر قبضہ کرلیا۔ اس انقلابی زمانے میں ایک امیر چینی کو ایک ایسی خادمہ ہاتھ لگ گئی جو کبھی شاہی باورچی خانے میں کام کیا کرتی تھی۔ چینی امیر کو اس خادمہ پر فخر ہوا اور اس نے اپنے دوستوں کی دعوت کی تاکہ وہ انھیں اس خادمہ کے ہاتھ کا کھانا کھلائے جسے وہ اپنے خیال میں شاہی باورچن سمجھتا تھا۔ دعوت کا دن آیا تو امیر نے خادمہ سے کہا کہ وہی کھانے پکیں جو شاہی دسترخوان پر ہوتے تھے۔ خادمہ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا ''میں تو کھانا نہیں پکا سکتی۔''

امیر نے پوچھا ''تو پھر تم کرتی کیا تھیں؟''

جواب ملا ''میں رات کے کھانے کے لیے سموسے بنانے میں مدد دیا کرتی تھی۔''

امیر نے کہا۔ ''بہت بہتر تو تم میرے مہمانوں کے لیے عمدہ سموسے ہی تیار کرلو۔''

خادمہ نے جواب دیا۔ ''سرکار میں نے کب کہا کہ میں سموسے بنایا کرتی تھی۔ میں نے تو شاہی دسترخوان کے سموسوں میں بھرنے کے لیے پیاز کاٹنے میں مہارت حاصل کی تھی۔''

آج بھی انسانی علم اور درسی تعلیم کے میدان میں حالات کچھ ایسے ہی ہیں ...... مثلاً ایک صاحب حیاتیات کے عالم ہیں۔ وہ انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے بارے میں تھوڑا سا جانتے ہیں پھر ایک صاحب نفسیات کے ماہر ہیں جو انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے متعلق چند باتیں جانتے ہیں پھر طبقات الارض کے ماہر ہیں جو کائنات اور انسان کی ابتدائی تاریخ کے چند دوروں سے واقف ہیں۔ پھر علم الارتقا کے ماہر ہیں جو وحشی انسان کی فطرت کے متعلق ہی جانتے ہیں باقی کچھ نہیں۔ پھر ایک تاریخ دان ہیں جو اگر صاحب ذوق ہوئے تو شاید ہمیں انسانیت کی گزشتہ تاریخ کے آئینے میں دیکھ کر انسانی دانائی اور حماقت کے متعلق کام کی دو چار باتیں بتاسکیں، ورنہ خیر سلا پھر نفسیات انسانی کے ماہر ہیں جو اکثر ہمیں انسانی چلن کے سمجھنے میں کچھ مدد دیتے ہیں مگر اکثر اوقات ایسی فضول قسم کی گوہر افشانی فرماتے ہیں کہ انسانی دیکھتا رہ جائے۔ یہ حضرات جب اپنی تجربہ گاہوں سے باہر آتے ہیں تو بڑی تحقیق کے گل کھلاتے ہیں مثلاً یہ کہ اونچی آواز کا اثر چوزوں پر یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل دھڑکنے لگتے ہیں۔ تعلیمی نفسیات کے ماہرین تو ان سے بھی آگے ہیں کہ جب وہ غلط بات کہتے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتی اور جب وہ ٹھیک بات کہتے ہیں وہ بھی ہماری سمجھ سے بالا ہوتی ہے۔

موجودہ زمانے میں ایک ایک علم کے کئی کئی شعبوں میں خصوصی مہارت کا حال تو یہ ہے مگر اس خصوصی

مہارت کے ساتھ کاملیت کا کہیں وجود نہیں۔ یہ کوئی نہیں کرتا کہ مختلف قسم کے علوم اور ان کے تمام پہلوؤں کو ملا کر ایک اکائی، ایک کل بنا دیا جائے پھر اس کل سے جسے حکمت و دانش کہہ سکتے ہیں مقصد حیات کی خدمت کا کام لیا جائے۔ اس بات کی ضرورت جدید انسان کو محسوس ہونے بھی لگی ہے۔ چنانچہ امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ژیل میں انسانی تعلقات کا باقاعدہ شعبہ قائم ہے۔ اسی طرح امریکہ کی ایک اور اعلیٰ یونیورسٹی ہارورڈ میں بھی اس موضوع پر خاص لیکچروں کا نصاب موجود ہے لیکن یہ یاد رہے کہ مغربی سائنس دان، علوم کے انتشار کو پھر سے ایک جگہ جمع کرنے کے لیے جب تک زیادہ سادہ اور کم منطقی طریق فکر سے کام نہ لیں گے، کچھ نہ بنے گا۔ انسان کی حکمت و دانش یہ نہیں کہ علم کے مختلف شعبوں میں خصوصی مہارت کا نصاب جمع کر دیا جائے تو حاصل جمع حکمت و دانش ہوگی ...... حکمت و دانش صرف بصیرت سے حاصل ہو سکتی ہے، عام سوجھ بوجھ، عقل سلیم اور فراست کی ترقی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے زیادہ سلامت طبع اور زیادہ سادہ مگر پر کار وجدان کی ضرورت ہے۔

منطقی فکر اور فکر معقول میں بہت فرق ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ خشک سوچ اور شاعرانہ سوچ میں جو فرق ہے وہی ان میں بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں علمی اور خشک قسم کا تفکر تو بہت ہے مگر شاعرانہ فکر بہت ہی نادر ہے، ارسطو اور افلاطون جدید زمانے کے مفکرین نظر آتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ قدیم یونانی لوگ آج کل کے لوگوں سے مشابہت رکھتے تھے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارسطو اور افلاطون، دونوں جدید فلسفے کے آبا تھے۔ ارسطو کا نقطہ نظر بڑی حد تک انسانی تھا۔ اور اس نے اعتدال کے سنہری راستے کا فلسفہ بھی بتایا ہے پھر ارسطو آج کی نصابی کتابوں کا باپ ہے کیونکہ ارسطو ہی نے انسانی علم کو مختلف الگ الگ شعبوں میں بانٹا تھا۔ اسی نے طبیعات سے حیاتیات تک اور سیاسیات سے اخیاقیات تک، علوم کے مختلف شعبے مقرر کیے تھے۔ اس کے علاوہ ارسطو ہی کی ذات سے ''علمی اصطلاحات'' کا وہ لمبا سلسلہ شروع ہوا جو عام آدمی کی سمجھ سے بالکل بالاتر ہے۔ ہونا بھی یہی تھا اور آج امریکی پروفیسر اور ماہرین کیا معاشرتی علوم، کیا نفسیات دونوں میں ایسی ایسی اصطلاحات وضع کر رہے ہیں جو ارسطو کو بھی مات کر دیں۔

رہا افلاطون تو اس میں انسانی بصیرت تو ضرور موجود تھی لیکن اس طرح افلاطون ہی مجرد اور مطلق تصورات کی اس پرستش کا ذمہ دار ہے جو اس کے نو افلاطونی پیروؤں میں نظر آتی ہے۔ ان بے چاروں میں

افلاطون کی سی بصیرت نہیں لیکن ان کے پیرو مصنفین اور مفکرین کسی خیال یا کسی نظریے کے بارے میں یوں بحث کیا کرتے ہیں جیسے ان تصورات اور نظریات کا اپنا ٹھوس وجود بھی ہے۔ جدید نفسیات ہی ایک ایسا علم ہے جس نے حال ہی میں ''عقل''، ''قوت ارادی''، ''جذبہ'' وغیرہ کی الگ حیثیت اور ان کے انفرادی وجود کا تصور ختم کرنا شروع کیا ہے۔ اور اسی کی بدولت ہم ''روح'' کے تصور سے بھی آزاد ہو رہے ہیں جسے قرونِ وسطیٰ کے عالمانِ دین نے ایک حقیقی چیز بنا کر دنیا کے ذہن پر آج تک سوار رکھا۔

مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے سینکڑوں قسم کے سماجی اور سیاسی نعرے اور اصطلاحیں گھڑ رکھی ہیں (مثلاً ''انقلابی''...... ''انقلاب دشمن''...... ''بورژوا''، ''سرمایہ دار سامراجی''، ''فراری'' وغیرہ) اور یہ نعرے اور اصطلاحیں انسانی فکر پر اپنا چنگل جمائے ہیں۔ ہم نے تصور ہی کے ذریعے سے ''طبقہ''، ''قوموں کا نصب العین'' اور ''مملکت یا ریاست'' کے وجود تخلیق کر رکھے ہیں اور ہم نے بڑی ظالم منطق سے کام لے کر ریاست کو ایک ایسے عفریت کی شکل دینا شروع کی ہے جو فرد کو ہڑپ کیے جا رہا ہے۔

گویا آج کل غور و فکر کے ایک نئے انداز، ایک نئی طرز کی شاعرانہ سوچ بچار کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ اندازِ فکر ایسا ہونا چاہیے جو زندگی کا مستقل مزاجی سے مشاہدہ کر سکے اور زندگی کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھ سکے۔ مرحوم جیمز ہاروے روبن سن نے ٹھیک کہا تھا ''کئی ایک محتاط مبصرین کی دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ تفکر کو اگر اب کے مقابلے میں زیادہ عالی رتبہ نہ دیا گیا اور سوچ میں رفعت پیدا نہ کی گئی تو موجودہ تہذیب کو بہت بڑا دھکا لگے گا......'' پروفیسر روبن سن نے یہ بھی کہا تھا کہ ''احتیاط اور بصیرت بظاہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں دوستی بھی ہو سکتی ہے!'' جدید اقتصادیات اور نفسیات کے ماہرین احتیاط اور دیانت کے تو پتلے ہوتے ہیں مگر ان میں بصیرت کی بڑی کمی ہے۔

انسانی مسائل میں منطق کی ٹانگ اڑانا نہایت خطرناک چیز ہے۔ لیکن موجودہ دور میں سائنسی تفکر کی قوت اتنی ہے اور اس کی قدر ایسی ہے کہ بار بار متنبہ کرنے کے باوجود تفکر کی یہ خطرناک قسم فلسفے کی دنیا پر چھاپا مارنے سے باز نہیں آتی اور ہر دفعہ اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت کا مطالعہ اور جائزہ اسی طرح آسانی اور بندھے ٹکے قاعدے سے کیا اور لیا جا سکتا ہے جس طرح زمین دوز نالیوں کے جال کو نقشہ دیکھ کر انجینئر لوگ سمجھ لیتے ہیں اور سر یا انسانی فکر کو بھی اسی طرح ناپا جا سکتا ہے جس طرح ریڈیائی لہریں ناپی جا رہی ہیں۔ اس

کے نتیجے روزمرہ کی سوچ بچار میں جو ہوں سو ہوں مگر عملی سیاسیات میں اس کے نتائج تو بڑے تباہ کن ہیں۔

2- عقل سلیم کی طرف واپسی

چینیوں کو ''یہ منطقی طور پر لازم ہوا'' جیسے فقروں سے سخت نفرت ہے کیونکہ انسان کے مسائل میں ایسی کوئی لازم چیز موجود نہیں۔ منطق پر چینیوں کو جو بے اعتمادی ہے وہ اصل میں لفظوں کی بے اعتباری سے شروع ہوتی ہے۔ پھر اس میں کسی لفظ، چیز یا اصطلاح کی تعریف سے نفرت شامل ہوتی ہے۔ اور آخر میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کے ''نظام فکر'' اور ہر قسم کے ''نظریے'' سے چینی لوگوں کو فطری طور پر نفرت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ الفاظ، تعریف اور نظام ہی کی بدولت فلسفے کے مختلف دبستان وجود میں آ سکے ہیں۔ فلسفے کی خرابی اور زوال اسی دم شروع ہوا تھا جب فلسفہ الفاظ کے پھیر میں الجھ کر رہ گیا۔ اس لیے چینی مصنف کونگ تنگنان لکھتا ہے کہ ''دانا اور عارف لوگ باتیں نہیں کرتے صرف ذی لیاقت لوگ باتیں کرتے ہیں اور احمق لوگ بحث کرتے ہیں'' یہ اس شخص کا مقولہ ہے جو خود بحث کا بڑا دلدادہ تھا۔

فلسفے کا حال یہی ہے کہ فلسفی لوگوں کا تعلق اہل گفتار سے ہوتا ہے، خاموش طبعوں سے نہیں۔ ہر فلسفی اپنی آواز اور صرف اپنی آواز سننا چاہتا ہے۔ اور تو اور خود لاؤ تزے جس نے ہمیں پہلے پہل یہ سکھایا کہ خالق اکبر (اس کے لفظوں میں ''وہ عظیم ذات خاموش'') بولتا نہیں، آئندہ نسلوں کے لیے کوئی پانچ ہزار الفاظ چھوڑ گیا اور اس کے بعد پہاڑوں میں عزلت نشیں ہوا تا کہ خلوت اور سکون میں زندگی کے بقیہ دن گزارے۔ صاحب گفتار فلسفی کی ایک خاص مثال کنفیوشس کی ذات ہے جو 72 سلطنتوں میں گیا تا کہ وہاں کے شاہوں کے سامنے اپنے خیالات بیان کر سکے۔ اس کی ایک مثال سقراط کی ہے جو ایتھنز کے بازاروں میں پھرا کرتا تھا اور راہ گیروں سے باتیں کرتا تھا تا کہ وہ ان کی باتوں کے نہایت دانشمندانہ جواب دے سکے۔

اس لیے چینی ادیب کا یہ مقولہ کہ ''عارف لوگ باتیں نہیں بناتے'' ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر بھی عارف اور ذی لیاقت آدمی، دونوں میں فرق ہے کیونکہ عارف اور دانا اس زندگی کے بارے میں بات کرتے ہیں جس کے بارے میں انھیں بلاواسطہ عرفان حاصل ہے اور ذی لیاقت لوگ انھیں داناؤں کی باتوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ رہے احمق لوگ تو وہ ان ذی لیاقت لوگوں کی باتوں کے بارے میں دلیلیں دیتے ہیں اور بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ خالص گفتار کے غازیوں کی سب سے عمدہ مثال یونانی سوفسطائیوں کی

ہے کہ یہ لوگ الفاظ کے باہمی میل اور الٹ پھیر ہی کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ فلسفہ جو دانش وحکمت کی محبت کا نام تھا، الفاظ کی محبت بن کر رہ گیا، اور جوں جوں یہ سوفسطائی دلیل بازی کا رجحان بڑھتا گیا فلسفے اور زندگی میں زیادہ سے زیادہ دور ہوتی گئی۔ وقت گزرنے پر یہ حال ہو گیا کہ فلسفی لوگ زیادہ سے زیادہ الفاظ اور لمبے سے لمبے فقرے استعمال کرنے کے ماہر ہو گئے۔ مقولوں کی جگہ طویل فقروں نے لے لی، فقروں کی جگہ دلیلیں آ گئیں، دلیلوں نے رسالوں کا روپ بدلا، پھر رسالوں کے بجائے شرحیں اور تفسیریں آئیں اور شرحوں نے لفظی تحقیق کو رواج دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لفظوں کی شرح کرنے اور لفظوں کے معنی بتانے، لفظوں کی تعریف متعین کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ لفظوں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ فلسفے کے جو دبستان قائم ہو چکے تھے ان سے ختلاف کرنے اور ان سے ہٹ کر اپنی راہ نکالنے کے لیے زیادہ سے زیادہ دبستان فکر قائم ہونے لگے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا اور اب یہ حال ہے کہ جینے کا سچا احساس، اپنی حیات کا مخلصانہ شعور نگاہوں سے بالکل وجھل ہو گیا ہے۔ اب جب فلسفی بات کریں تو ایک عام آدمی کو یہ پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ ''آپ کس چیز کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔''

مگر تاریخ فکر میں چند خود مختار روحیں بھی نظر آتی رہی ہیں اور ان مفکرین نے زندگی کا بلاواسطہ ربط اپنے فکر و خیال سے محسوس کیا ہے۔ ان میں کوئی گوئٹے، کوئی سیموئل جانسن، کوئی ایمرسن، کوئی ولیم جیمز بھی ملتا ہے اور ہر ایک نے فلسفیوں کی زبان میں بات نہیں کی اور ہر ایک نے علم کی درجہ بندی کی سخت مخالفت کی ہے۔ یہی وہ دانشور ہیں جن کی بدولت فلسفے کی اصل روح، اس کا اصلی معنی محفوظ رہا ہے۔ فلسفہ، دانش، حیات اور بس...... زیادہ تر صورتوں میں ان مفکرین نے دلیلوں اور حجتوں کو ہاتھ نہیں لگایا، مقولوں سے کام لیا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ لطائف اور مقولوں میں دل کی بات کہنے کی صلاحیت نہ ہو تو انسان اپنی بات کہنے کے لیے ایک پورا پیراگراف لکھتا ہے۔ جب وہ اپنا مفہوم ایک پورے پیراگراف میں واضح نہ کر سکے تو استدلال کی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے اور جب اس سے بھی وہ اپنا مطلب واضح نہ کر پائے تو وہ پوری ایک کتاب لکھ مارتا ہے۔

لفظوں کی محبت، جہالت کی جانب پہلا قدم ہے اور اصطلاحات اور لفظوں کی منطقی تعریف، دوسرا قدم ..... جتنا زیادہ اور جتنا گہرا تجزیہ کیا جائے گا۔ لفظوں، اصطلاحوں اور ترکیبوں کی زیادہ سے زیادہ منطقی تعریفوں کی ضرورت ہو گی، اور زیادہ سے زیادہ منطقی تعریف کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ انسان قانونی کمال کے اس

نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے جو خیالی بھی ہے اور ناممکن بھی ...... چنانچہ قانونی کمال تک پہنچنے کی یہ کوشش ہی جہالت کی سب سے بڑی نشانی ہے...... الفاظ ہمارے خیالات کی بنیاد، ان کا ساز و برگ سہی۔ اس صورت ان کی منطقی تعریف کی کوشش بھی مستحسن سہی کیونکہ یورپ میں ہر چیز کی منطقی تعریف کرنے کا یہ جنون سقراط نے اسی لیے پھیلایا تھا مگر مصیبت یہ ہے کہ ان لفظوں کا شعور ہوتے ہی (جن کی ہم منطقی تعریف کرتے ہیں) ہمیں ان تشریحی لفظوں کی بھی منطقی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ اور آخر یہ سلسلہ یہاں تک پہنچتا ہے کہ ہمارے الفاظ وہ نہیں رہتے جو زندگی کی تشریح یا زندگی کی وضاحت کرتے ہیں۔ ہمارے پاس صرف لفظوں کی ایک فہرست رہ جاتی ہے جو دوسرے الفاظ کی منطقی تعریف یا تشریح پیش کرتے ہیں اور بس...... ہر طرف لفظوں کا ایک انبار رہ جاتا ہے اور فلسفی اسی انبار میں کھوئے رہتے ہیں۔

میرے نزدیک الفاظ کی بھی دو قسمیں ہیں۔ مصروف الفاظ اور نکمے الفاظ۔ مصروف اور کارآمد الفاظ وہ ہیں جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں کام آتے ہیں۔ نکمے الفاظ وہ ہیں جو صرف فلسفیوں کی بحثوں میں کام آتے ہیں...... منطقی تعریفوں میں بھی فرق ہے۔ سقراط اور فلسفی بیکن کی منطقی تعریفیں اور ہمارے جدید پروفیسروں کی وضاحتیں ایک دوسرے سے کہاں لگا کھاتی ہیں۔ شیکسپیئر کو زندگی کا گہرا اور سچا احساس ودیعت ہوا تھا۔ اسے کسی چیز کی تشریح یا منطقی تعریف کی ضرورت نہیں پڑی۔ اصل میں اس نے یہ حماقت کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے الفاظ ''جسم'' رکھتے تھے، اس کی زبان میں انسانی المیے کا وہ ذی شان احساس، وہ عظیم روح جاری و ساری تھی۔ جو آج کل نہیں ملتی۔ ہم اس کے الفاظ کو ایک معنی کا پابند نہیں کر سکتے، نہ ان کو ایک خاص عمل کی علامت بنا سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم شیکسپیئر کو عورتوں کے بارے میں کسی خاص نظریے کا حامی نہیں ٹھہرا سکتے...... وجہ یہ ہے، منطقی تعریف کا فطری خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ ہمارے خیالات کا گلا گھونٹتی رہے اور ہمارے تفکر کو اس آب و تاب، اس تخیلی رنگ روپ سے محروم کر دے جو خود زندگی کا خاصہ ہے۔

الفاظ، اظہار کے دوران میں ہمارے خیالات کا تیا پانچا کر دیتے ہیں۔ ان میں قدرتی روانی اور تسلسل نہیں رہنے دیتے۔ یہ بڑی مجبوری ہے۔ اسی طرح کسی ایک نظام فکر کی لگن بھی زندگی کے شعور کے لیے بڑی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ آخر نظام فکر ہے کیا؟...... بس حقیقت کے چہرے کا کوئی آڑا ترچھا روپ۔ اور جو نظام فکر بہت زیادہ منطقی ہوگا اس میں ذہنی کجی اور کج روی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان حقیقت کا

صرف ایک پہلو دیکھنا چاہتا ہے اور یہ وہ پہلو ہے جس پر اس کی نظر پڑتی ہے۔ اسی کو وہ ذرا بڑھا چڑھا کر ایک نظامِ فکر بنا دیتا ہے جو اس کے خیال میں بے حد منطقی ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہمارا فلسفہ زندگی سے بالکل اجنبی ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص سچائی کے بارے میں بات کرتا ہے وہ محض اپنی بات سے حقیقت مجروح کرتا ہے۔ جو منطقی دلیل سے حقیقت کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی دلیلیں حقیقت کو مفلوج کرتی ہیں۔ اس کا حلیہ بگاڑ دیتی ہیں اور جو ظالم، حقیقت کو کسی ایک لیبل، کسی خاص عنوان اور خصوصاً کسی دبستانِ فکر کا غلام بنانے کی کوشش کرتا ہے وہ حقیقت کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ ان سے بدتر وہ شخص ہے جو اپنے آپ کو سچائی کا پرستار کہتا ہے۔ کیونکہ یہی پرستار اپنی غلط بینی سے حقیقت کو اپنے ہاتھ سے دفن کرتا ہے۔ گویا ہر وہ حقیقت جسے کسی نظامِ فکر کا پابند بنایا گیا ہو اس کی موت واقع ہو چکی اور اسے دفن بھی کر دیا گیا اور یہ لوگ، اپنے اپنے نظامِ فکر کے زندانی، حقیقت کی موت پر جو مرثیہ پڑھتے ہیں وہ یہ ہوتا ہے:

''جو میں کہتا ہوں وہ ٹھیک ہے اور تمہاری بات سراسر غلط ہے!'' اس طرح حقائق اپنے حامیوں کے ہاتھوں موت کی گود میں جا سوتے ہیں۔ فلسفے کے تمام قدیم اور جدید دبستان، فلسفیوں کے تمام قدیم اور جدید دھڑے ایک ہی بات کو ہر پھر کر ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں کہ ''جو میں کہتا ہوں وہ ٹھیک ہے اور تمہاری بات سراسر غلط ہے......'' اس سلسلے میں جرمن فلسفی سب سے بڑے محروم ہیں۔ لیکن یہ فکری بیماری مغرب کے ہر مفکر کو لاحق رہی ہے۔

اس غیر انسانی منطق کا نتیجہ ہو ہوا ہے کہ ہم نے حقیقت کو بھی غیر انسانی بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج ہمارا فلسفہ زندگی سے قطعی طور پر بے تعلق ہے۔ یہ فلسفہ قریب قریب یہ اعلان کر چکا ہے کہ وہ، ہمیں زندگی کا اصلی مفہوم اور دانشِ حیات سکھانے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس فلسفے میں زندگی کے لیے وہ گہرا اور سچا شعور، حیات کے لیے وہ لگن بالکل مفقود ہے۔ جسے ہم نے فلسفے کی جان قرار دیا تھا۔ زندگی کا یہی گہرا اور سچا شعور ہے جسے ولیم جیمز نے ''تجربات کی دنیا'' قرار دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں وقت گزرنے پر ولیم جیمز کا فلسفہ اور اس کی منطقی دلیلیں مغربی فلسفے اور مغربی اندازِ فکر کے لیے زیادہ سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوتی جائیں گی مگر مغربی فلسفے کو انسانی فلسفہ بنانے سے پہلے، ہمیں مغربی منطق کو انسانی منطق بنانا ہوگا۔ ہمیں ایسے اندازِ فکر کو زندہ کرنا ہوگا جو صحیح اور منطقی اور مسلسل ہی نہ ہو بلکہ حقیقت اور زندگی اور انسانی فطرت کے قریب تر آنے کے لیے بے قرار ہو۔ مغرب کے

غلط انداز فکر کے نمائندے منطقی ڈے کارٹ کا مشہور مقولہ ہے کہ ''میں سوچ سکتا ہوں، اس لیے میں موجود ہوں''، ہمیں اس کے بجائے امریکی شاعر اور مفکر والٹ وٹمین کا یہ زیادہ انسانی، زیادہ معقول معقول مقولہ رائج کرنا ہوگا کہ ''میں جو کچھ ہوں، ٹھیک ہوں اور کافی ووافی ہوں!'' کیونکہ زندگی کو اپنا آپ ثابت کرنے کے لیے منطق کی مرہون منت ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ولیم جیمز نہیں جانتا تھا کہ وہ چینی انداز فکر کو صحیح ثابت کرنے اور اسے معقول انداز فکر میں منوانے کے لیے اپنی ساری زندگی صرف کر رہا ہے۔ ایک ذرا سا فرق بس یہ تھا کہ اگر ولیم جیمز مغربی ہونے کے بجائے چینی ہوتا تو وہ اپنی بات منوانے کے لیے اتنے ہزار الفاظ سے کام نہ لیتا بلکہ وہ اپنے فلسفے کو دو چار سو الفاظ کے ایک مضمون میں قلم بند کر دیتا یا اپنے روزنامچے میں دو چار صفحے لکھ دیتا کہ ''میں یہ سمجھتا ہوں اور میرا یہ خیال ٹھیک ہے'' وہ اگر چینی ہوتا تو الفاظ سے کچھ کتراتا، کچھ جھجکتا رہتا۔ اسے یہ ڈر ہوتا کہ میں جتنے زیادہ الفاظ استعمال کروں گا غلط فہمی کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

لیکن ولیم جیمز طبعی اعتبار سے بالکل چینی تھا، زندگی کے گہرے شعور اور انسانی تجربات کے اعتبار سے بالکل چینی تھا۔ اس نے مشینی قسم کی منطق پرستی کے خلاف بغاوت کی۔ خیالات کے بہاؤ اور تسلسل کا وہ بے حد قائل تھا۔ اسے ان لوگوں سے سخت چڑ تھی جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف انھیں نے اس کائنات کی اہم ترین اور قطعی ''سچائی'' کا کھوج لگایا ہے اور اس حقیقت کو انھوں نے ایک خود کفیل قسم کے نظام فکر میں حلقہ بند کر دیا ہے۔ یہ تمام طبعی خاصے چینیوں کے ہیں اور ولیم جیمز اس اعتبار سے بھی چینی تھا کہ وہ کہتا تھا ''آرٹسٹ میں حواس اور ادراک کے ذریعے سے حقیقت کو پہچاننے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ یہی ادراک حقیقت فنکار کے لیے ضروری ہے، تصوری حقیقت اس کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہے۔'' ولیم جیمز کے نزدیک فلسفی وہ شخص ہے جو اپنے ادراک اور احساس کو ہر پل زندگی پر مرکوز رکھے اور زندگی کے عظیم الشان دھارے کا برابر مشاہدہ کرتا رہے۔ وہ ہر آن اس بات کے لیے تیار رہے کہ زندگی نت نئی اور محال سے محال چیزیں اس کے سامنے پیش کرتی رہے، وہ ایسے ایسے عجیب وغریب واقعات اور مشاہدات کے لیے تیار رہے جو بظاہر مہمل اور ناممکن نظر آئیں لیکن درحقیقت بالکل صحیح ہوں اور وہ زندگی کی متضاد باتوں، لگے بندھے اصولوں اور قانونوں سے ہٹی ہوئی چیزوں، استثنائی صورتوں کے لیے ہمیشہ دلچسپی محسوس کرے۔ اس لحاظ سے ولیم جیمز وہ شخص ہے کہ کسی نظام فکر کا

پابند ہونے سے منکر ہے۔ وہ کسی نظام فکر کو غلط نہیں کہتا بلکہ محض اس کی پابندیوں کی وجہ سے اس کا مخالف ہے۔ اسی لیے اس کے خیالات نے مغربی فلسفے کے ہر نظام فکر کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس کا قول ہے کہ فلسفے کی تاریخ میں سب سے اہم سنگ میل یہ ہے کہ کائنات کے متعلق دو نظریوں میں امتیاز کیا گیا۔ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ کائنات میں ایک ہی وجود جاری و ساری ہے اس لیے مادے اور روح کی تفریق غلط ہے کیونکہ یہ دونوں ایک ہیں اور دوسرا نظریہ اس کے عین الٹ، یعنی کثرت وجود کا نظریہ ہے۔ اسی لیے ولیم جیمز کی بدولت مغربی فلسفہ اپنے طلسماتی ہوائی قلعوں کو چھوڑ کر زندگی سے ایک بار پھر قریب آ سکا تھا۔

کنفیوشس نے کہا ہے ''سچائی اور حقیقت انسانی فطرت سے دور نہیں جا سکتی۔ اگر جس چیز کو حقیقت کہا جاتا ہے وہ انسانی فطرت سے الگ ہو جائے تو وہ سچائی نہ ہوگی، کوئی اور چیز ہوگی!''......ایک جگہ اس نے اپنی چیز کو ذرا مزاح کے لہجے میں یوں کہا ہے کہ ''حقیقت سے انسان عظیم نہیں ہوتے بلکہ انسان حقیقت کو عظیم بناتا ہے'' میرے خیال میں وہ فقرہ ولیم جیمز کی زبان سے بھی ادا ہو سکتا تھا۔

ہماری یہ دنیا کوئی منطقی نتیجہ، کوئی منطقی دلیل نہیں۔ یہ ایک جیتی جاگتی چیز ہے۔ کائنات بولتی نہیں مگر کائنات زندہ ہے۔ کائنات دلیلوں میں نہیں الجھتی لیکن اصلیت کی منزل کو پہنچ جاتی ہے۔ ایک نہایت ذہین انگریز ادیب نے کہا ہے:

> ''کائنات کے اسرار میں عقل محض ایک چھوٹی سی چیز کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کو اپنے شعور اور ادراک کے گہرے سے گہرے غرور کے وقت بھی دل کی گہرائیوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی عقل اور اس کی حیرت دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر شرمندہ رہتے ہیں۔ شک اور امید وہ جڑواں جذبے ہیں جو ہمیشہ سے ہماری فطرت میں کارفرما رہے ہیں اور اسی کش مکش کی بدولت اصل حقیقت دھری رہ جاتی ہے۔''

میرا خیال ہے کہ مغربی منطق پرستوں کو کچھ فروتنی اور انکسار کا خیال ہو جائے، کچھ اپنی بے مائیگی کا احساس پیدا ہو جائے تو وہ ٹھیک ہو جائیں۔ ان کی نجات اور فلاح کا راستہ یہی ہے کہ ہیگل کی جدلی مادیت نے ان کے سروں میں جو سودا بھر دیا ہے، اس کا کوئی علاج کر دے۔

3- معقولیت

منطق کے مقابلے میں عملی سوجھ بوجھ ہے جسے آپ معقولیت کا جذبہ کہہ لیجیے تو بہتر ہوگا۔ میرے نزدیک معقولیت کا جذبہ انسانی تہذیب اور تمدن کی معراج کمال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرد معقول ہی مہذب اور صحبت یافتہ انسانوں میں سب سے بہتر اور ارفع انسان ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کبھی مکمل انسان نہیں ہوسکتا۔ انسان یہی کرسکتا ہے کہ پسندیدہ اور معقول آدمی بن جائے اور بس۔ جو قومیں معقول ہوتی ہیں وہی نہایت امن و آشتی کی زندگی گزارتی ہیں، اور جو میاں بیوی معقولیت سے کام لیتے ہیں وہ خوش رہتے ہیں۔ اسی لیے میں اپنی بیٹیوں کے لیے مناسب بر تلاش کرنے میں صرف ایک بات کا خیال رکھوں گا کہ کیا وہ نوجوان معقول آدمی ہے؟ کیونکہ ایسے میاں بیوی اس دنیا میں نہیں سنتے جن میں کبھی جھگڑا نہ ہو۔ ہاں ایسے شوہروں اور بیویوں کا تصور ضرور کیا جاسکتا ہے جو معقولیت سے آپس میں جھگڑا کریں اور معقولیت سے اس جھگڑے کو پھر نمٹا بھی لیں۔ گویا صرف معقول انسانوں کی دنیا میں امن اور مسرت کا دور دورہ ہوسکتا ہے اور اگر کبھی معقولیت کا دور آیا تو یہی دور دنیا کے لیے امن کا دور ہوگا۔ کیونکہ اس دور کی روح رواں معقولیت ہوگی۔

معقولیت ہی وہ چیز ہے جو چین، مغرب کی خدمت میں پیش کرسکتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ چین اس جذبے سے مالا مال ہے۔ میں صرف اتنا عرض کر رہا ہوں کہ یہ چینی تمدن کا بہترین جوہر ہے اور عمدہ ترین پہلو ہے۔ میرے اس انکشاف (یا دعوے) کا ثبوت اتفاقاً دو امریکیوں نے دیا ہے جو بڑی مدت چین میں رہے۔ ان میں سے ایک صاحب تیس سال سے چین میں قیام پذیر تھا۔ انھوں نے کہا کہ چین کی معاشرتی زندگی کی بنیاد ایک لفظ (چیا نگ لی) پر ہے جس کے معنی ہیں ''معقول بات کرنا''...... چینی لوگوں کے جھگڑوں میں آخری بات یہ ہوتی ہے: ''بھئی انصاف کرو، کیا یہ معقول بات ہے؟''...... اس کے برعکس چین میں سب سے بڑی مذمت اور سب سے زیادہ عیب کی بات یہ ہے کہ فلاں شخص ''نامعقول بات'' کرتا ہے۔ چنانچہ جو شخص غیر معقول بات کا مرتکب ہونا مان لے وہ ہر جھگڑے میں منہ کی کھاتا ہے۔

میں نے اپنی کتاب میرا وطن اور میرے ہم وطن میں لکھا ہے، مغربی لوگوں کے لیے یہ کافی ہوتا ہے کہ فلاں بات منطقی طور پر بڑی پختہ ہے۔ چینی کے لیے یہ کچھ نہیں کہ کوئی چیز منطقی لحاظ سے ٹھیک ہو۔ چینی کے نزدیک ٹھیک وہی ہے جو منطقی طور پر ٹھیک ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت کے بھی مطابق ہو، اس کے

متضاد نہ ہو۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ چینی کے نزدیک یہ بات زیادہ اہم ہے کہ زیر بحث مسئلہ یا کوئی معاملہ فطرت انسانی کے عین مطابق بھی ہے یا نہیں''

مہذب اور باتمیز آدمی وہ ہے جو انسان کے دل کو سمجھے اور فطرت کے قوانین کا درک رکھتا ہو۔ کنفیوشس کے پیروؤں کا دعویٰ ہے کہ وہ انسان کے دل اور فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق زندگی بسر کر کے عرفان کی آخری منزل پر پہنچ سکتے ہیں لیکن عارف بھی وہی شخص ہوا کرتا ہے جو بے حد معقول آدمی ہو۔ اس کی مثال خود کنفیوشس کی ہے جس کی سب سے بڑی خوبیاں یہ مانی جاتی ہیں کہ وہ عملی سوجھ بوجھ اور ذوق سلیم کے علاوہ ''فطری خوبیوں سے مالا مال تھا'' یعنی بے حد ''انسان'' آدمی تھا۔

تفکر میں انسان پرستی جس چیز کو کہتے ہیں وہ اصل میں معقول سوچ کا دوسرا نام ہے۔ منطقی آدمی ہمیشہ اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ انسان نہیں ہوتا اور اسی لیے وہ ہر بات میں غلط ہوتا ہے۔ برعکس اس کے معقول آدمی کا یہ شیوہ ہے اسے ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں میں ہی غلطی پر نہ ہوں۔ اسی لیے وہ ہمیشہ ٹھیک بھی ہوتا ہے۔ معقول آدمی اور منطقی آدمی میں جو فرق ہے اس کا بڑا عجیب مظاہرہ خطوں کے آخر میں دیکھا کیجیے کہ سارا خط ختم ہو گیا تو لکھنے والے کو کچھ اور خیال آیا اور اس نے ''مکرر'' کا لفظ لکھ کر اس کے نیچے وہ تمام معقول باتیں، بعد کے سوچ، ہچکچاہٹ، مزاح، طنز، سوجھ بوجھ کا ایسا ثبوت دے دیا اوپر خط میں لکھی ساری باتوں کی تردید ہو گئی۔ اصل میں معقول مفکر وہی ہے جو کسی دعوے کو لمبی چوڑی دلیلوں سے ثابت کرتے کرتے یکا یک یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی دلیلیں غلط ہیں اور اس عملی سوجھ بوجھ کا وہ یوں مظاہرہ کرتا ہے کہ یکا یک اپنی غلطی مان لیتا ہے اور اپنی ساری پیش کردہ دلیلوں کو اس طور آن واحد میں ایک فقرے سے فنا کر دیتا ہے۔

گویا منطقی آدمی تو خط کے متن میں ہی سب کچھ لکھ دیتا ہے۔ اس کے برعکس معقول شخص کو صحیح معنی میں انسانیت سے بہرہ ور ہوتا ہے، خط کی آخری زائد عبارت (جو ''مکرر'' کے عنوان کے نیچے آتی ہے) میں اپنے دل کی بات کہتا ہے۔ ایک باپ کا تصور کیجیے جو اپنی بیٹی کے نام ایک خط میں لکھ رہا ہے کہ میں تمہیں کالج میں نہیں پڑھا سکتا کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہارے تین بھائی کالج میں زیر تعلیم ہیں، ان کا خرچ میں اٹھا رہا ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تمہاری ماں کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی، اس کی دیکھ بھال کے لیے تم گھر آ جاؤ تو بہتر ہے۔ وغیرہ...... یہ تمام دلائل بڑے منطقی ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب کوئی رد یا توڑ ممکن نہیں۔ لیکن یہ

معقول باپ اسی منطقی خط کے اختتام پر اپنے دستخط کرنے کے بعد ایک جذباتی فقرے میں (''مکرّر'' کے زیرِ عنوان) یہ لکھ دیتا ہے۔ ''بیٹی، یہ سب دلیلیں فضول ہیں، تم کالج میں تعلیم پانے کی تیاری کرو۔ میں جیسے بن پڑے گا سب انتظام کرلوں گا۔''

یا ایسے شوہر کا خیال کیجیے جو اپنی بیوی کے نام خط میں لکھتا ہے کہ ''میں تم سے علیحدہ ہونے اور تمہیں طلاق دینے کا حتمی فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور میں اس کی قطعی وجوہ بھی لکھتا ہوں...... پہلی وجہ یہ ہے کہ مجھے تمہاری وفاداری پر ہمیشہ شک رہا۔ دوسرے یہ کہ جب میں گھر آتا ہوں تو مجھے کبھی گرم اور تازہ کھانا نہیں ملا۔ وغیرہ'' یہ وجوہ اپنی جگہ بڑی ٹھوس اور جائز ہیں بلکہ کوئی بھی انھیں جھٹلا نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ اگر یہ شوہر طلاق کے سلسلے میں کسی وکیل کی خدمت حاصل کرلے تو اس کے منطقی وجوہ اور بھی مضبوط اور جائز ہو جائیں گے لیکن اس خط کے ختم کرنے کے بعد اسی شوہر کے دل میں ایک خیال آتا ہے اور وہ ''مکرّر'' کا عنوان لکھ کر ٹوٹے پھوٹے حروف میں یہ فقرہ لکھ دیتا ہے۔ ''لاحول ولا یہ سب کیا بکواس ہے، تم برا نہ ماننا جانم...... میں خود بھی کوئی اچھا آدمی نہیں۔ بہرکیف میں گھر آجاؤں گا اور تمہارے پسندیدہ پھول بھی لاؤں گا۔''

ان دونوں خطوں کی مندرجہ دلیلیں بڑی ٹھوس اور جائز ہیں لیکن ان خطوط کے متن میں انسان نہیں، منطق بول رہی ہے۔ معقولیت صرف ان خطوط کے آخر کی ان عبارتوں میں ہے جو ''زائد عبارت'' کہلاتی ہیں اور ''مکرّر'' کے زیرِ عنوان لکھی جاتی ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ ایک انسان باپ، ایک انسان شوہر بول رہا ہے۔ منطق نہیں بول رہی۔ کیونکہ ذہنِ انسانی کا یہ فرض نہیں کہ بڑی احمقانہ قسم کی منطقی دلیلیں گھڑ گھڑ کر حاضر کرتا رہے بلکہ ذہنِ انسانی کا کام یہ ہے کہ انسانی خواہشوں، جذبوں اور من کی موج کے ہر آن بدلتے ہوئے اور آپس میں ٹکراتے ہوئے طوفانوں کے درمیان توازن قائم رکھے۔ رہی سچائی تو اس کی کیفیت یہ ہے کہ انسانی معاملوں میں ہم جس چیز کو چاہیں حقیقت ٹھہرا لیں۔ منطق کی کڑی سے کڑی اور لاجواب سے لاجواب دلیل کا جوب حلم اور بردباری، شفقت اور محبت سے دیا جاسکتا ہے لیکن منطقی جواز کو محبت بالکل ہیچ ثابت کرسکتی ہے۔ انسانی معاملوں میں عام طور پر غیر منطقی طور طریقہ ہی جی کو لگنے والی بات ہوتی ہے۔ خود ہمارا عدالتی قانون بھی یہ مانتا ہے کہ وہ سو فیصد اور بالکل قطعی قسم کا انصاف کرنے کا مدعی نہیں۔ کیونکہ عدالتی قانون متعدد صورتوں میں اپنی دفعات کی ایک ''معقول تشریح'' کا سہارا لیتا ہے۔ پھر اپنے سب سے بڑے جج یا سب سے بڑے حاکم کو

ہر جرم کی سزا معاف کر دینے کا اختیار دیتا ہے۔اور یہ بھلا کہاں کی منطق ہے؟

معقولیت کا یہ جذبہ ہمارے ہر سوچ، ہمارے سارے تفکر کو انسانی زندگی کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔اور ہمیں اپنے ہر بار صحیح ہونے کا جھوٹا بھروسا نہیں رہتا۔معقولیت ہمارے خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھال کر شائستہ بنا دیتی ہے اور ہمارے انداز، ہمارے برتاؤ کی تمام بے قاعدگیاں دور کر دیتی ہے۔معقولیت کے عین الٹ، کٹر پن، تشدد پسندی اور عقیدت کی تنگ نظری ہیں۔چاہے یہ خصوصیات خیالات سے تعلق رکھتی ہوں یا ہمارے انداز اور برتاؤ سے متعلق ہوں، ہماری انفرادی زندگی میں ہوں یا ہماری قومی زندگی پر چھائی ہوں، شادی کے سلسلے میں ہوں یا مذہب اور سیاسیات پر حاوی ہوں، یہ ہیں غیر معقول۔

میرا دعویٰ ہے کہ چین میں ذہنی قسم کی کٹر تشدد پسندی اور تنگ نظری بہت کم پائی جاتی ہے۔ایک چینی ہجوم بہت جلد مشتعل ہو جاتا ہے۔لیکن معقولیت کی ایک عام روہی نے ہماری منصبی زندگی، ہمارے مذہب اور عورتوں سے ہمارے مبینہ ''ظالمانہ سلوک'' کو بڑی حد تک وسیع النظر زم بنا رکھا ہے۔میں مانتا ہوں کہ یہ دعویٰ کچھ نہ کچھ شرائط کے ساتھ ماننا چاہیے مگر اس دعوے میں حقیقت ضرور ہے۔معقولیت کے اس جذبے کی بدولت ہی ہمارا شہنشاہ جاپانیوں کے شہنشاہ کی طرح نیم دیوتا نہیں مانا جاتا تھا۔اسی لیے چینی، تاریخ دانوں نے یہ نظریہ وضع کیا تھا کہ بادشاہ ''آسمانی فرمان'' کی بدولت حکمرانی کرتا ہے اور جب وہ اچھی طرح حکومت نہیں کرتا تو یہ ''خدائی فرمان'' خود بخود منسوخ ہو جاتا ہے۔چین کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی چینی باشندے کسی شہنشاہ کی بدعنوانی سے تنگ کرتا ہے۔چین کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی چینی باشندے کسی شہنشاہ کی بدعنوانی سے تنگ آ گئے تو انھوں نے بغاوت کی، اس خاندان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اس شہنشاہ کا سر قلم کر دیا۔ایسا ایک دفعہ نہیں، بہت دفعہ ہوا ہے۔شاہی خاندانوں کی اس درگت اور بدعنوان بادشاہوں کے ساتھ اس سلوک نے چینی قوم میں یہ فضول خیال کبھی پیدا نہیں ہونے دیا کہ بادشاہ ''خدا کا سایہ'' ہیں یا ''آسمانی مخلوق'' ہیں یا کم سے کم ''نیم دیوتا'' ضرور ہیں......یہی حال ہمارے رشیوں منیوں کا ہے۔انھیں دیوتا نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایسے حکما اور دانشمند لوگ سمجھا جاتا ہے جن کی بدولت ہمیں اچھی باتیں حاصل ہوئیں، زندگی کے اسرار کی آگاہی حاصل ہوئی۔رہے چینیوں کے دیوتا تو وہ کمال کے مظہر نہیں بلکہ بشر کی سی کمزوریاں رکھتے ہیں۔انھیں بھی سرکاری افسروں کی طرح رشوت دے کر منت سماجت کر کے راضی کیا جا سکتا ہے اور ان سے اپنی من مانی کرائی جا سکتی

ہے..... چینی قوم کا مزاج یہ ہے کہ جو چیز معقولیت کی حد سے گزر جائے اسے برا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ''فطرت انسانی سے ہٹی ہوئی'' چیز ہے۔ چنانچہ جو شخص بہت زیادہ صوفی، صافی ہو یا کمزوریوں سے بالکل مبرا اور نیکیوں کا پتلا ہو اسے غدار سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ نفسیاتی لحاظ سے نہیں یا چینی معنی میں غیر معقول ہے۔

یورپ کی سیاسیات پر نظر ڈالیں تو منطق کی بدولت وہاں انسان کا ذہن اور انسان کا عام برتاؤ بے حد غیر انسانی نظر آتا ہے۔ میں اشتراکیت یا فاشزم کے نظریوں سے نہیں ڈرتا مگر مجھے تعصب اور تشدد، کٹرپن اور تنگ نظری کی اس روح سے بڑا خوف آتا ہے جو ان نظریوں کی تہ میں کارفرما ہے اور جس کی بدولت انسان اپنے ان نظریوں کو ان کے منطقی مہملات کی منزل تک پہنچانے میں کس شدومد اور کس ہٹ دھرمی سے کام کرتے ہیں..... اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی قدریں، مغربی دنیا میں، بالکل الجھ کر رہ گئی ہیں۔ سیاسیات کو انسان کے علم الارتقا کے ساتھ عجیب طرح ملا دیا گیا ہے۔ اس علم الارتقا کی بدولت ایک قوم نسلی طور پر اپنے آپ کو دوسری سے اعلیٰ ثابت کرنے کی فکر میں رہتی ہے، حالانکہ مقصد سیاست ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔ اسی کٹرپن اور تعصب کی بدولت آرٹ کو پراپیگنڈے سے خلط ملط کر دیا گیا ہے اور سب سے بڑا اندھیر یہ ہے کہ حکومت کے اختیارات اور ایک فرد کی آزادی اور اس کے اختیارات میں جو مناسب تعلق اور توازن ہونا چاہیے اسے بالکل چوپٹ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ کوئی مجنون ہی ریاست کو ایسا خدا بنا کر رکھ سکتا ہے جس کی قربان گاہ پر فرد کے سوچنے کا حق، محسوس کرنے کا حق، اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کا حق بھینٹ چڑھایا جائے۔

اشتراکیت اور فاشزم دونوں ایک ہی جنونی ذہن کی پیداوار ہیں۔ البرٹ پوفیلے نے واقعی ٹھیک کہا تھا ''دائیں بازو کے انتہائی خیالات رکھنے والا ذہن انتہائی بائیں بازو کے ذہن کے بالکل مماثل ہوتا ہے'' اور حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت اور فاشزم، دونوں قسم کی حکومتوں اور نظریات کی خصوصیات بالکل ایک سی ہیں۔ دونوں اندھی طاقت اور اقتدار پر بھروسا رکھتے ہیں۔ میرے نزدیک مغربی ذہن کا سب سے سطحی اور احمقانہ مظاہرہ یہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اشتراکیت اور فاشزم دونوں منطقی طور پر کسی چیز کی ضرورت، کسی چیز کے لازم ہونے پر استوار ہیں۔ اس ''منطقی لزوم'' کی بنیاد مارکس کی جدلیات پر ہے۔ جس کی بنیاد جرمن فلسفی ہیگل کی منطق ہے..... کاش اس بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں بھی کوئی صاحب دل یہ سمجھ لے کہ

نسانیت اپنے اجداد کی منطق کے ان گناہوں کی کیا سزا بھگت رہی ہے جو سینکڑوں برس پہلے ان بزرگوں سے سرزد ہوئے تھے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یورپ میں معقولیت کا راج نہیں۔ معقولیت کا تو کیا یورپ میں عقل کی بھی حکمرانی نہیں۔ بلکہ آج کا یورپ...... تعصب کے چنگل میں گرفتار ہے۔ یورپ کے حالات کو دیکھ کر کچھ کچھ ڈر ور بے چینی سی محسوس ہوتی ہے۔ اس بے چینی کی وجہ یہ نہیں کہ یورپی ملکوں کی قومی امنگیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، ان کی سرحدیں متصادم ہیں اور ان کے نوآبادیاتی عزائم ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اس کی وجہ ن لوگوں کی ذہنی حالت ہے جو آج کل یورپ کے حاکم ہیں۔ اس بے چینی اور ڈر کی مثال یہ ہے کہ آپ کسی جنبی شہر میں ایک ٹیکسی میں سوار ہو جائیں اور یکایک آپ کو ٹیکسی ڈرائیور پر بے اعتمادی پیدا ہو جائے اگر ڈرائیور کو یہ معلوم نہ ہو کہ آپ جس جگہ جائیں گے اس کا صحیح اور چھوٹا راستہ کون سا ہے تو اتنی تشویش کی بات نہیں ہوتی لیکن جب آپ کو ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد یہ پتا چلے کہ ڈرائیور آپ ہی آپ کچھ اول فول بک رہا ہے تو آپ کو اس کے ہوش و حواس پر شک گزرنے لگتا ہے۔ آپ کو شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ نشے میں ہے اور یہ احساس آپ کو سہا سا سا دیتا ہے اور اگر یہ نشے میں دھت ڈرائیور پستول سے مسلح ہو اور آپ کسی عنوان موٹر سے باہر نہ نکل سکتے ہوں تو بے چینی اور خوف دونوں بڑھ جاتے ہیں۔

تاہم یہ یقین کرنے کی کافی گنجائش موجود ہے کہ آج کل یورپ کے حاکموں کا ذہنی خاکہ ذہن انسانی جیسی عظیم الشان چیز کا ایک مضحکہ خیز چربہ ہے اور کچھ نہیں۔ یہ جنونی اور ہذیانی کیفیت انسان کی تاریخ میں ایک عارضی دور ہے اور انسانیت سے یہ انحراف، یہ عارضی پاگل پن ایک وبا کی طرح خود بخود ختم ہو کر رہے گا۔ فانی انسان کے ذہن کی صلاحیتیں بڑی وسیع ہیں اور ان پر اعتماد رکھنے کے لیے کافی وجوہ موجود ہے۔ ذہن انسانی چاہیے کتنا محدود ہو وہ یورپ کے ان اندھے ڈرائیوروں کے ذہن سے کہیں زیادہ ارفع اور اعلیٰ چیز ہے۔ آخر وہ وقت بھی آئے گا جب دنیا کے تمام انسان امن اور آشتی کی زندگی بسر کر سکیں گے کیونکہ انسان اس وقت معقولیت سے سوچنا بھی سیکھ چکا ہوگا۔



تتمہ

''ڈاکٹر لین یوتانگ نے ''جینے کی اہمیت'' پہلی بار 1937ء میں شائع کی تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ اس سے دو برس بعد 1939ء کے آخر میں شروع ہوئی اور چھ برس کے اندر اندر دنیا کا سیاسی نقشہ اور نظریاتی ڈھانچہ تلپٹ ہو گیا۔ یورپ 1939ء سے پہلے کارخانہ اور سرمایہ پرستی کے چکر سے نکل کر اب نیشنل سوشلزم (جرمن نازیت) اور کہیں آمرانہ قومیت (اطالوی فاشزم) کی مطلق العنانی کا زندانی تھا۔ ان چھ برس میں یورپ نے ان دو نظریوں کی زبردست فوجی طاقتوں کا ملیا میٹ ہوتے دیکھا، غداری اور وفاداری، بزدلی اور شجاعت کی وہ وہ مثالیں ان چھ برسوں میں یورپ نے دیکھیں جو انسانی تصور میں نہیں آسکتیں۔ انھیں چھ برسوں کی خوں ریز کش مکش کے بعد یورپ ایک طرف سرخ روس کے چڑھتے سیلاب کا حلقہ بگوش ہوا تو دوسری جانب امریکہ کی مشینی تہذیب کی لامتناہی قوتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ انسان کی امیدیں بدل گئیں، زندگی کی فضا اور مرنے کا ماحول بدل گیا، لفظوں کے مفہوم بدل گئے، پرانے معانی کے نئے نئے لفظوں کے قالب ایجاد ہوئے اور پرانے لفظوں کے لیے مطالب کا ایک نیا انبار تیار کر دیا گیا۔

ڈاکٹر لین یوتانگ نے جینے کے عملی فلسفے کے سلسلے میں ان برسوں میں اپنی تحقیقی کوششیں جاری رکھیں اور جنگ کے اس انوکھے ماحول میں بھی زندگی پر اور زندگی کے مقصد پر اسی ژرف نگاہی سے قلم اٹھایا جو ان جیسے صاحبان بصیرت ہی کا حصہ ہے۔

اسی لیے ان کے اس تازہ مضمون کو ''جینے کی اہمیت'' کے تتمے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔''

مختار صدیقی

ندگی کا مقصد...... جینا

انسانی تہذیب کی تاریخ بتاتا ہے کہ فن ادر مارنے کا فن (زندگی کردن اور جنگ آزمودن)
نوں ساتھ ساتھ موجود رہے ہیں۔ کسی بھی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تین سو برس کا
رصہ خانہ جنگی یا غیر ملکی یلغاروں سے خالی ہو۔ گویا امن کا زمانہ زیادہ سے زیادہ دو تین سو برس رہا، پھر وہی
ن ریزی شروع ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایسا جاندار (حیوان) ہے جو جنگ جو بھی ہے اور صلح
ل بھی۔ انسان میں جنگ آزمائی کی اور امن پسندی کی جبلت بڑے عجیب طریقے سے آمیز ہوئی
ہے۔ میں جنگ آزمائی کی جبلت کو گوشت خوری اور امن پسند کو سبز خوری کی جبلتیں قرار دیتا ہوں۔

جنگ اور امن کی اس آمیزش سے یہ سمجھ لیجیے کہ انسان کوئی ناقص اور نامکمل مخلوق ہے۔ بھلا ایسی
ہذیب جس میں انسان کو اس قدر مسکین اور پالتو بنا دیا گیا ہو کہ بس جنگ جوئی کا جذبہ ہی باقی نہ رہے کس
ام کی ہو سکتی ہے؟ کشمکش کا زندگی سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ابھی چاہیے اگر جدوجہد، کشمکش اور سخت
وشی زندگی سے دور ہو جائے تو پھر نسل انسانی کو تنزل لگ کھن لگ جاتا ہے اور چند پشتوں کے مختصر عرصے میں
ری نسل اسی طرح بیکار ہو جاتی ہے جس طرح کوئی امیر خاندان چند پشتوں کے بعد نکمے اور کم کوش افراد کو جنم
ینا شروع کر دیتا ہے۔

آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں جنگ کو جائز قرار دے رہا ہوں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ
یاتیاتی لحاظ سے ہمارا ورثہ یہی ہے...... ذرا اپنے سامنے پھیلے ہوئے مظاہر پر نظر دوڑائیے۔ فطری لحاظ
سے جنگ جوئی کی جبلت، جیسے جانے کی جبلت ہی کا دوسرا رخ نظر آئے گا۔ حیاتیاتی جبلتیں جو بڑی حد
تک حیوانی ہیں انسان کے عارضی آدرشوں اور سیاسی عقیدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ حیات کی دنیا میں
ن ریز لڑائیاں ہمیشہ سے ننھے بچوں کی محبت کے لازوال مظاہروں اور محبوب کو لبھانے کے جتنوں کے
اتھ ساتھ موجود رہی ہیں۔ حیوانی دنیا میں اپنے محبوب کا جی لبھانے کے یہ جتن وہ ہیں جو فطرت نے چہرے کا

حسن اور نکھار ہیں اور انھیں کو ہم کبھی پھولوں کا رنگ و بو، کبھی عندلیب کا نغمہ، کبھی "پپنی کہاں" کہتے ہیں۔

قدرت کے بھیدوں کے طالب علم کو یہ دیکھ کر غالباً دلی تکلیف پہنچتی ہے بظاہر پرسکون جنگل میں زمین کے اوپر اور زمین کے نیچے، دن رات، ایک نہایت شدید جنگ جاری ہے۔ اسے یہ سوچ کر بھی تکلیف ہوتی ہے کہ یہ سفید براق بگلا، جو ڈوبتے سورج کی روشنی میں چپ مراقبے میں ہے ابھی ابھی ایک نہایت معصوم اور بے گناہ مچھلی کے خون سے فارغ ہوا ہے لیکن قدرت کے بھیدوں کو جاننے والے اس حقیقت سے واقف ہیں کہ قدرت کے ان مظاہر میں زندگی کا زبردست جذبہ چھپا ہوا ہے اور یہ مظاہر ایک بہت بڑی تباہی کے بعد نئی زندگی شروع کرنے یا پھر سے جی اٹھنے کی زبردست رکھتے ہیں۔

آج ایک بار پھر، یورپ لڑائی کی تباہیوں کا نشانہ بن چکا ہے کے عہد نامے کے بعد حالات حاضرہ پر نظر رکھنے والے ہر شخص کو یقین تھا کہ لڑائی ہو کر رہے گی کیونکہ کے بعد امن، جنگ سے کچھ اس طرح مماثل ہو گیا تھا کہ ایک عام فرانسیسی یا ایک عام انگریز کے نزدیک عارضی صلح، جنگ سے کہیں زیادہ تباہ کن تھی اور اب؟ اب یہ حال کہ لڑائی کی آگ کے لگانے والے امن کے متوالے بن بن کر دنیا کے سامنے آتے ہیں اور وہ جنھوں نے خود دوسروں پر جارحانہ کارروائیاں کیں اب اپنے مغلوب حریفوں کو "جنگ بازوں" کے لقب سے مطعون کر رہے ہیں

یہ سب کچھ کیا ہے؟...... کیا انسان میں امن پسند زندگی بسر کرنے کی جو جبلت تھی اس میں عارضی طور پر جنگ جوئی کی جبلت نے اپنا زہر گھول اس پر اپنا منحوس سایہ ڈال دیا ہے؟ یا اس امن پسندی کو سرے سے ختم کر دیا ہے...... کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تہذیب (انسان کے فنون، اس کے مذاہب، انسانیت کے مشترکہ عقیدے، سائنس کی جدید فتوحات اور زندگی بسر کرنے کے فن ......) کیا یہ جدید انسانی تہذیب تباہ و برباد ہو جائے گی؟

میرا خیال ہے اس مسئلہ پر پہلے بحث کرنا مناسب ہوگا۔

آج کی دنیا میں بہت سے لوگ اس حقیقت سے کانپ اٹھتے ہیں کہ جنگ میں بے شمار شہروں کو ہوائی بمباری نے ملیامیٹ کر دیا۔ اسی لیے آج کے اکثر بڑے بڑے مفکروں کا خیال یہ ہے کہ عصر حاضر کی تہذیب مٹ جائے گی

ئبس ان مفکرین سے اختلاف کی معذرت چاہتا ہوں۔

یہ طے ہے کہ جنگ جوئی کی جبلت، جینے کی جبلت ہی کا دوسرا رخ ہے۔ میرا یہ بھی ایمان ہے کہ جنگ
ہانے والے کسی بھی شخص نے کبھی جیے جانے کی جبلت کو یک قلم ترک نہیں کیا۔ اسی لیے میں یہ سمجھتا ہوں
جیے جانے اور جینے کی جبلت، جنگ آزمائی کی جبلت سے کہیں زیادہ قوی ہوتی ہے، اس کا مٹا دینا ناممکن
چونکہ جینے کی جبلت کا مٹانا ناممکن ہے اس لیے تہذیب بھی (جو زندگی بسر کرنے کے فنون کا مجموعہ ہے)
نہیں جاسکتی..... لیکن پھر بھی اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ جنگ جدید تہذیب کو مٹا دے گی تو اس سے ہماری مراد
وتی ہے؟

یہ ضرور ہے کہ جنگ سے فنون اور سائنسوں (علم وحکمت) کو ظاہری طور پر اور کچھ عرصے کے لیے
ن پہنچے گا لیکن جنگ کبھی نہ کبھی ختم بھی ہوا کرتی ہے اور جنگ کے بعد مرغیاں انڈے بھی دیں گی اور انسان
ڈوں سے آملیٹ جیسی چیز بنانا بھی نہ بھولیں گے۔ بھیڑوں کی پشم بھی ہوگی اور انگریزی کارخانوں سے
ا جواب پشم کے بنے ہوئے کپڑے بھی تیار ہو کر دنیا کو ملیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ نہایت تباہ کن بمباری کے
ی شہر کے ظاہری آثار بدل جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس بمباری سے کسی شہر کی لائبریری میں کچھ پرانے
نسخے یا برٹش میوزیم میں انگلستان کا میگنا کارٹا کا فرمان شعلوں کی نذر ہو جائے۔ ممکن ہے لڑائی میں کچھ
ز شاعر اور فرانسیسی سائنس دان گولہ باری سے مارے جائیں۔ تجربہ گاہوں کا کچھ قیمتی سامان تلف ہو جائے
اری کی ساری آکسفورڈ یونیورسٹی تباہ ہو جائے لیکن ان تمام تباہ کاریوں کے باوجود زیر زمین بورڈلین
ری تباہ نہیں ہوسکتی، سائنسی طریقہ تحقیق تباہ نہیں ہوسکتا، اور یہ بھی ناممکن ہے کہ جنگ میں دنیا جہان کی
ں کی کتابیں اور تحقیقاتی رسالے تلف ہو جائیں۔ جنگ یہ سب کچھ تباہ نہیں کرسکتی۔ گراموفون ریکارڈ اور
ں کے نغمے جنگ کی آگ سے بچ نکلیں گے کیونکہ موسیقی کی لگن کو جنگ ختم نہیں کرسکتی۔

یہ ہوسکتا ہے کہ کسی قوم کے بہترین سپوت جنگ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جانے سے اس قوم کی
لی میں نمایاں فرق آجائے لیکن جب تک کسی قوم کو نہایت تباہ کن قسم کی ہوائی بمباری سے بالکل ملیامیٹ
کر دیا جاتا، جدید تہذیب اور فنون اور علم وحکمت کے چراغ جلتے ہی رہیں گے۔ جنگ اور جنگ کی تباہ
یوں کے بعد پرامن زندگی کی فراخدلانہ فضا، انسانی چابک دستی اور تر دماغی کی تحقیقی قوتیں یورپ کو بہت جلد

نئے سرے سے بحال کر سکتی ہیں۔

جسمانی تشدد اور تباہ کاری سے کبھی کچھ نہیں بنتا۔ یہ سبق چین کی جدید تاریخ سے ظاہر ہے۔ د عالمگیر جنگ میں جاپانیوں نے چینی سکولوں، دانشگاہوں اور ثقافتی اداروں کو بڑی بے دردی اور بڑے قاعدہ طریقے سے ختم کر دیا تھا لیکن یہ کہنا سراسر زیادتی ہوگی کہ جدید چینی ثقافت اس طرح ختم ہوگئی۔ آپ کے سامنے ہے کہ چی کیانگ کی ایک یونیورسٹی کے پروفیسر اور طالبان علم جاپانیوں کی تباہ کاریوں بعد جنوب مشرق کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور ایک ہزار میل کا سفر طے کر کے انھوں نے جنوب مغربی میں اپنی دانش گاہ پھر سے شروع کر دی۔

گویا آدمی ختم نہ ہو تو کچھ نہیں بگڑتا...... یہ مانا کہ چین کی پرانی تہذیب کے رسیا ماتم کناں رہیں۔ 1859ء میں پیکنگ پر فرانسیسی اور انگریزی دستوں کی یلغار اور شہر کی لوٹ کے وقت شاہی کتب خانہ جل ...... لیکن ان کا اثر چینی قوم پر مجموعی حیثیت سے کیا ہوا؟...... آخر چین کے ایک ڈکٹیٹر پی ان شیہ ہوانگ (کی دیوار اعظم کے معمار) نے کنفیوشس مت کی ساری کتابیں کس بے دردی سے جلوا دی تھیں اور اس کے ماننے والوں پر کیا کیا مظالم نہ توڑے تھے پھر بھی یہ ثقافت ختم نہ ہو سکی۔

یہیں اس بحث کے غیر جسمانی پہلو کا آغاز ہوتا ہے۔ بحث کا یہ پہلو لطیف تر ہے اور اسی کو انسانی کا مثبت رخ قرار دیا جا سکتا ہے...... یوں سمجھ لیجیے کہ تہذیب جن عناصر سے بنی ہے اگر وہ ختم ہو جائیں تو جدید تہذیب تباہ ہو جائے گی۔ ہم ان عناصر کو گویا بندھی ٹکی چیز سمجھتے ہیں۔ تہذیب کے یہ عناصر کیا عقیدے کی آزادی، ایک فرد کے حقوق اور اس کی آزادی و اختیارات اور عام آدمی کی صلاحیتوں پر وہ یقی اب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جنگ کے بغیر بھی آمرانہ نظام اور مملکت، تہذیب کو تباہ کرنے کے کام کا آغاز ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو انسان کو تہذیب کی ان نعمتوں سے محروم کر رہا ہے اور ایک انسان کو اپنے بھا حرکات و سکنات پر جاسوسی کرنے کے لیے متعین کر چکا ہے لیکن جو قوم اتنی آسانی سے آمرانہ نظام کی باندھی غلام نہ بن سکے اور جس قوم کے لوگوں کی روح آزاد ہو اس کے ہوتے ہوئے تہذیب کو کوئی جنگ نہیں سکتی۔

اصل یہ ہے کہ اگر کوئی تہذیب پر امن زندگی کی جبلت کو مرنے مارنے کی جبلت کا مکمل طور پر تا

دے تو وہ اپنے آپ کو بڑی آسانی سے ختم بھی کر سکتی ہے۔انسانی زندگی کی سادہ قدروں کی اگر جی جان سے حفاظت نہ کی جائے اور انسان کی سادہ آزادیوں اور حقوق کو شعوری طور پر محسوس نہ کیا جائے تو تہذیب کی تباہی عین ممکن ہے اور خطرہ اسی بات کا ہے کہ کیونکہ جدید فکر اور جدید انسانی میں جینے کے یہ عام اور سادہ سے حقوق زیادہ سے زیادہ مملکت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائے جا رہے ہیں۔ذرا یورپ کی آمرانہ مملکتوں کو دیکھیے ،ان کے شہروں نے جینے اور سوچنے کے دو حقوق کھو دیے ہیں جو افریقہ کے وحشی انسانوں کو ہمیشہ سے حاصل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم عام معنی میں تہذیب سے بہت دور نکل آئے ہیں۔قدرت تو آرام کرتی ہے مگر تہذیب نے آ کر انسان کو جینے اور رہنے سہنے کے کچھ آرام، کچھ آسائشیں مہیا کیں اور اس کے بدلے میں انسان کی کچھ آزادیاں چھین لیں، کچھ آزادیوں پر پابندیاں لگا دیں۔ان پابندیوں کو عام طور پر ''فرض کا احساس'' کہا جاتا ہے مگر انسان کے برعکس ذرا حیوانوں کو دیکھیے ،گھوڑے کو کوئی ''احساس فرض'' دامن گیر نہیں۔قاصد کبوتر ''احساس فرض'' کے تحت گھر واپس نہیں آتا وہ صرف اس لیے گھر آتا ہے کہ گھر اسے پسند ہے اور انسان کا یہ حال ہے کہ تہذیب نے اسی کو اور صرف اسی کو کام کرنے پر مجبور کیا ہے۔

پہلے پہل انسان کو یہ بتایا گیا کہ اسے کھانے کمانے کے لیے کام کرنا ہوگا پھر اسے جینے کے لیے جنگ کرنے پر مجبور کیا گیا تا کہ اس کا ''کام کرنے کا حق'' محفوظ رہے۔پھر ہمیں یہ بتایا گیا کہ کھانے کی کسی عمدہ چیز مثلاً مکھن سے توپ بندوق اعلیٰ اور اہم ہے۔ہمیں یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ جنگ میں کمر بستہ مارا جانا بستر میں آرام سے لیٹ کر مرنے کی نسبت کہیں ارفع قسم کی موت ہے۔دوسرے لفظوں میں ہمارا حال اب یہ ہے کہ ہم پھر فطری زندگی کی طرف لوٹنا چاہ رہے ہیں مگر ہمیں فطری زندگی کی فطری آزادیاں حاصل نہیں۔اب انسان کے پاس پیٹ بھرنے کا ذریعہ ایک راشن کارڈ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ احساس فرض۔اس چیز نے انسان کو انسان نہیں رہنے دیا، مشین بنا دیا ہے۔اب چند لاکھ مشینی انسانوں کو یہ ٹریننگ دی جاتی ہے کہ وہ ایک ہی بات سوچیں اور اگر ان کا مالک کہے کہ سوویت یونین کی مدح کرو تو یہ سکھائی پڑھائی مشینیں اس کی مدح کرتی ہیں اور اگر وہ کہے کہ سوویت یونین کو برا کہو تو وہ اسے برا کہتی ہیں۔

گویا تہذیب کو بذات خود جنگ سے کوئی خطرہ نہیں، نہ جنگ کی تباہ کاریوں سے تہذیب کو کوئی خطرہ ہو ہی سکتا ہے۔تہذیب کو تو اصل میں زندگی کی قدروں کے ان بدلتے تصورات سے سخت خطرہ لاحق ہے جو بعض

قسم کے سیاسی عقیدوں کا نتیجہ ہیں۔ یہ سیاسی عقیدے انسان کے سادہ اور فطری حقوق زندگی پر براہ راست چھاپا مارتے ہیں اور ان حقوق و مراعات کو اجتماعی طور پر مرنے مارنے کی ''قومی ضرورت'' کا تابع کر دیتے ہیں۔ اس صورت مرنے مارنے کی اہمیت، جینے کی اہمیت پر، فوقیت پالیتی ہے۔ اور ہر آمرانہ نظام کا یہی بنیادی نکتہ ہے۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایک ایسی مملکت کے نقطہ نظر سے آمرانہ نظام کی حمایت میں سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ جس نے جنگ اور فتوحات ملکی کے لیے تنظیم پائی ہو لیکن اگر تہذیب کا مقصد آخری یہ ہے کہ فرد اس سے متمتع ہو اور زندگی کی عام نعمتوں کے مزے اٹھائے تو پھر فرد کے نقطہ نظر سے آمرانہ نظام کی مخالفت میں سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ جدید تہذیب مشینوں یا جنگ سے تباہ نہیں ہو رہی۔ جدید تہذیب کو یہ بات تباہ کر رہی ہے کہ فرد اپنے زیادہ سے زیادہ حقوق ریاست یا مملکت کے حوالے کرتا جا رہا ہے اور ریاست کا تصور جدید فلسفہ و نظر میں بہت اہم اور قومی عنصر شمار کیا جا رہا ہے۔

غالباً روما کی قدیم سلطنت کو جنگ کے بجائے چوہوں نے یا مچھروں نے، اور پایان کار قوم کے نوجوانوں کے جسمانی تنزل نے تباہ کیا تھا چنانچہ یہ ممکن ہے کہ جدید تہذیب کو بھی ایک ایسا زمانہ امن ہی تباہ کر دے جو اسی قسم کا نسلی تنزل پیدا کر سکتا ہو۔ اب چاہیے یہ نسلی تنزل، پروفیسر ہوٹن کے قول کے مطابق، جسمانی تنزل ہو، یا عام انسانی حقوق و آزادی کے فقدان کی صورت میں ایک روحانی تنزل کی شکل اختیار کر لے..... جہاں تک جسمانی تنزل کا تعلق ہے، آج کے انسان کو ذرا گیس ماسک پہنے ہوئے دیکھیے، اس کی تھوتھنی اتنی خوفناک ہے کہ ہزاروں برس پہلے کا غار میں رہنے والا انسان بھی اس سے کانپ اٹھے گا۔ رہا روح کا معاملہ تو مجھے شبہ ہے کہ بہت سے ملکوں میں آج کا انسان روحانی طور پر اس سے بھی کم دلفریب ہے۔

ایک عام فرد کی یہ تحقیر حد سے گزر چکی ہے۔ آج کی دنیا آمریت کی دنیا ہے، اس دنیا میں آزادی کے پرستار امریکی شاعر والٹ وٹمین کا ''کھلی شاہراہ کا گیت'' ایک بھولے ہوئے خواب کی طرح معلوم ہوتا ہے:

قدم بڑھائے جا رہا ہوں شاہراہ پر
نہ دل پہ بارِ غم، نہ بوجھ ہے دماغ پر
نہیں ہیں بندشیں کوئی مرے دل و نگاہ پر

اس ایک شاہراہ سے، تمام راہیں کائنات کی
مرے لیے کھلی ہوئی ہیں ......جس طرف بھی چاہوں، جا سکوں

غالباً والٹ وٹمین کی یہ تنبیہ آج کل اور بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ:

اے مری راہ گزر، اپنے مسافر سے کہے گی کہ نہیں ؟
''تو مجھے چھوڑ کے جانا نہ کہیں!''
اے مری راہ گزر، اپنے مسافر سے یہ کہہ دو ......''راہی
چھوڑ کر مجھ کو چلے جانے میں ہے گمراہی!!''

گویا تہذیب حاضرہ کو جو خطرہ گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے وہ اسی صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ انسانی آزادی کے بھولے ہوئے خواب کو پھر سے حقیقت کا جامہ پہنایا جائے اور ایک عام فرد کو جینے کا جو حق اور جو آزادی حاصل ہے اسے پھر سے بحال کیا جائے۔ اس کی وہی قدر و منزلت، وہی اہمیت برقرار کی جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ آج میں پہلے سے کہیں زیادہ یہ اعتقاد رکھتا ہوں کہ انسان کا نصب العین وہ آزادہ رو، آوارہ گرد، سیلانی اور سیر سپاٹے کا رسیا انسان ہے جو اپنی آزادیوں کا شمہ برابر قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ میرا اعتقاد ہے کہ یہی شخص انسانیت کا نجات دہندہ ثابت ہو سکتا ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ جنگ جوئی کی جبلت اور پرامن طور پر زندگی بسر کرنے کی جبلت ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ یہ خیال غالباً کم لوگوں کو آتا ہے کہ ایک نوجوان جو محاذ جنگ پر جانے کے لیے فوج میں بھرتی ہوتا ہے اس کے دل میں ایک نئی دنیا میں، نئی مہموں کا مزہ اٹھانے کی جبلت اسی طرح موجزن ہوتی ہے جس طرح (جنگ جوئی کی جبلت کے تحت) توپ کا لقمہ بن کر موت کی نیند سونے کی خواہش ہو سکتی ہے۔

کسی محاذ جنگ کے بارے میں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سپاہی کو دشمن کے سپاہی کے قید ہونے کی خبر سے زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے اور اسی مورچے پر کوئی بھولا بھٹکا مرغی کا چوزہ پکڑ لینے سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ سچائی اس کے عین الٹ ہے۔ کھلی جگہوں میں یکا یک دل میں یہ احساس بیدار ہوا کرتا ہے کہ زندگی ایک زبردست نعمت ہے۔ محاذ جنگ پر موت کی عام ارزانی میں اس بات کا اور بھی خیال ہوتا ہے کہ زندگی بڑی خوش آئند بڑی میٹھی چیز ہے۔ خندقوں میں بیٹھ کر انسان دشمن کے بارے میں تاریک خیالات کا تانا بانا نہیں بنا

کرتا۔ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی دن نفرت کا شدید احساس اسے انہی دشمنوں کو ختم کرنے پر اکساتا بھی ہے۔

خندقوں میں بیٹھ کر ہی ایک دن یکا یک یہ احساس ہوتا ہے کہ زندگی کی تمام اچھی چیزیں مثلاً صبح کو کافی کا پیالہ، تازہ اور خوش گوار ہوا، سہ پہر کی سیر، حتیٰ کہ صبح وقت پر دفتر پہنچنے کے لیے بس پکڑنا اور راہ میں ملنے والے دوستوں سے آنکھیں چرانا یہی سب کچھ تہذیب کا تار و پود ہیں کیونکہ یہی سب وہ باتیں ہیں جن سے زندگی عبارت ہے۔ جنگ وہ چیز ہے جو ہمیں ایسی معمولی چیزوں کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے جن سے عام طور پر ہم بے خبر رہتے ہیں۔ ذرا جنگ سے واپس آنے والے کسی سپاہی کو کسی عمدہ سیلون میں شیو کراتا دیکھیے۔ وہ اس شیو سے اتنا لطف اٹھائے گا کہ آپ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

گویا جینا اور صرف جینا ہی زندگی کا مقصد ہے۔ یہ بات اتنی عیاں اور واضح ہے کہ ہمیں اس کا کبھی خیال نہیں ہوتا بلکہ پر امن زندگی کے دنوں میں تو ہم اس بات کو مشکوک بھی سمجھتے ہیں اور اس پر اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ اخلاقی قدروں کے علم بردار عام طور پر بیکار لیٹے رہنے کو سخت تحقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مذہبی رہنماؤں کا تو یہ حال ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنے آپ کو تکلیف دینا بہت بڑی نیکی اور سعادت سمجھتے رہے لیکن محاذ جنگ پر جو سپاہی لڑ رہا ہوا سے ایک نہ ایک دن یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ بستر پر بیکار پڑے رہنا تہذیب کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور بستر پر لیٹ کر مرنا، کمر بستہ ہو کر لڑائی میں باوردی مرنے سے زندگی کا کہیں زیادہ عمدہ انجام ہے۔



جینے کی اہمیت

⊙

دانا لوگ کبھی کسی سے نہیں جھگڑتے نہ ہی مقابلہ کرتے ہیں لٰہذا کائنات میں کوئی شخص ان کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتا۔

⊙

تشدّد سے کام لینے والے کسی ایک شخص کا نام لیجیے جس کا انجام ٹھیک ہُوا ہو۔ میں اس کو اپنا مُرشد اپنا اُستاد ماننے کو تیار ہو جاؤں گا۔

⊙

کوئی صاحبِ علم اگر 3 دن تک مکالمہ نہ کرے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی باتوں میں کوئی دل کشی، کوئی مزہ نہیں رہا۔

⊙

''علمیت کے بغیر سوچ بچار انسان کا دماغ ہلا دیتی ہے لیکن غور و فکر کے بغیر علمیت اسے تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔''

